سالنامہ

جنوری ۱۹۷۹ء

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

ماہنامہ

جلد (۱۲) ۱۹۷۹ء شمارہ (۱)

سالنامہ ۷۹ء

ایڈیٹر

مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت

منظور احمد • حمایت اللہ • مسیح انجم

مجلسِ مشاورت: راجندر سنگھ بیدی ★ بھارت چند کھنہ ★ خواجہ عبدالغفور ★ نریندر لوتھر ★ مجتبیٰ حسین

جنرل منیجر: سمیع جلیل

[illegible]: سلام خوشنویس [illegible]

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چار کمان۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

جلد سازی: [illegible] بائنڈنگ ورکس [illegible] حیدرآباد ۲

سالانہ (۲۰) روپے بیرونی ممالک سے (۲۵) شلنگ

فی پرچہ: Rs. 2/75

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۲ / [illegible] معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ
کراچی بیکری
معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد فون : 43502
ڈسٹری بیوٹرز برائے :
١۔ موہن میکن بریوریز
٢۔ انڈین پیسٹ کمپنی، لمیٹڈ
٣۔ ہمدرد، روح افزا
۴۔ پانی پت فوڈ پراڈکٹس
۸۔ ڈبرو فوڈ پراڈکٹس
۶۔ کیننگ انڈسٹریز۔ ٹریچور
۷۔ سورنا فوڈ پراڈکٹس
۹۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
١٠۔ میڈونا کیننگ کمپنی۔ وغیرہ
سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف ولذت کی انتہا ہے یہ
کشمیری قوام
نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچئے، اور
اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لئے
اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے
تیار کنندگان:
پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس
INDIA
کشمیری قوام

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ماہنامہ شگوفہ کا تاریخی و دستاویزی اہمیت کا حامل

شائع ہو چکا ہے

مہمان مدیر : ساگر سرحدی

مضامین

ڈرامائی مشکرے

تراجم

فکر تونسوی

میرا پہلا اور آخری ___ صدارتی خطبہ

صاحبِ صدر (جو میں خود ہوں) اور حضرات!

ابھی ابھی میرے گلے میں جو پھولوں کے ہار ڈالے گئے ہیں، میں انھیں نہیں اُتاروں گا تاکہ میں آپ پر یہ مسلسل ثابت کرتا رہوں کہ میں آپ سے الگ چیز ہوں یعنی صدر ہوں۔ سنا ہے طبقاتی نظام اسی طرح جنم لیتا ہے۔

مجھے کئی دنوں سے شبہ ہو رہا تھا کہ میرے ساتھ کوئی نہ کوئی ہنگامی حادثہ ہونے والا ہے۔ ایک آدمی جب نانا یا دادا یا دونوں بن جائے تو اُسے یا تو بلڈ پریشر ہو جاتا ہے یا اُسے کسی محفل کا صدر بنا دیا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے زندہ دلانِ حیدرآباد کو میری اس ڈبل خصوصیات کا علم ہو گیا۔ ورنہ آج تک وہ سنگل خاصیت پر ہی گزارا کرتے رہے تھے — بلکہ دو برس پہلے تو انھوں نے مجتبیٰ حسین کو صدر بنا دیا تھا جسے اپنی سنگل خصوصیت پر بھی ہمیشہ شبہ رہا۔

حضرات! ڈبل خصوصیت کے صدر آج کل کہاں ملتے ہیں۔ ملک میں قحطِ غمِ الفت تو خیر ہے ہی مگر قحطِ خصوصیات اور بھی زیادہ ہے۔ دو تین برس پہلے میں نے ایک مشاعرے کے صدر کو دیکھا تو پوچھا "ان میں کونسی خاصیت ہے؟"

جواب ملا " یہ صدارت کے بدلے میں ایک سو ایک روپے دیں گے "

میں نے پوچھا : " مگر پوسٹر میں تو آپ نے جناب رونق علی کا اعلان کیا تھا "

" ہاں ! لیکن وہ اکیاون روپے سے آگے بڑھتے ہی نہیں تھے اور یہ صاحب ہیں ایک سو ایک روپے دے ڈالے اس لئے ہمیں یہ بہتر صدر لگے "

دوسرے دن میں نے دیکھا ، جناب رونق علی صاحب چمڑے کے ایک کارخانے کی افتتاحی تقریب کی صدارت فرما رہے تھے۔

میں نے ان سے استفسار کیا۔ " قبلہ ! آپ نے کل مشاعرے کی صدارت قبول کیوں نہیں فرمائی "

وہ بولے۔ " اجی ، ہم خاندانی صدر ہیں ، سو پشت سے اکیاون روپے دیتے آرہے ہیں۔ ہم صدارت ترک کرسکتے ہیں ، اپنا اصول نہیں اور پھر ہماری ' باقاعدہ ڈیمانڈ رہتی ہے ۔ اب دیکھ لیجئے مشاعرے کی صدارت ترک کی تو چمڑے کے کارخانے کی صدارت مل گئی۔

میں نے پوچھا : " آپ نانا یا دادا بھی بن چکے ہیں ؟ "

بولے : " نہیں "

پوچھا : " کیا آپ کو ہائی بلڈ پریشر بھی ہے ؟ "

" بالکل نہیں "

میں نے دل میں کہا " آپ زندہ دلان حیدرآباد کے اجلاس کے صدر زندگی بھر نہیں بن سکتے ۔ کیونکہ ایک تو آپ کو مشاعرے اور چمڑے کے کارخانے میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا اور دوسرے آپ مشاعرے میں بھی وہی اچکن پہن کر جاتے ہیں جو چمڑے کے کارخانے میں ۔ نہ آپ کا اصول بدلتا ہے نہ اچکن ۔ آپ کی اچکن بھی آپ کے اصول کی طرح بوسیدہ ہے "

لیکن زندہ دلان حیدرآباد نے نہ اصول دیکھا نہ کھنک دیکھی کیونکہ وہ مزاح باز لوگ ہیں ۔ مزاح جیسے نقادان کرام ادب عالیہ نہیں مانتے بلکہ زیادہ سے زیادہ اُسے فکر تونسوی مانتے ہیں ۔ اور اسے صدر کی کرسی پہ لاکر بٹھا دیتے ہیں ' بالکل ایسے جیسے کسی گائے کا دودھ سوکھ جائے تو اُسے گئو شالہ میں بھیج دیا جاتا ہے ۔

لہٰذا ۔۔ انھوں نے سوچا دودھ سوکھنے کا یہ موقع غنیمت ہے آئندہ سال تک کہیں یہ موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے بلکہ فکر تونسوی ہی ہاتھ سے نہ نکل جائے لہٰذا اُسے اسی سال ہی صدر بنا دو ۔

جناب عالی ! اب تک میں نے جو عرض کیا۔ وہ میرے خطبۂ صدارت کا دیباچہ تھا ۔ اب اصلی خطبۂ صدارت پیش کرتا ہوں جو دیباچے سے دو تہائی چھوٹا ہوگا ۔ یہ آرٹ میں نے طنز نگار برنارڈ شا سے حاصل کیا ہے کیونکہ ہم ہندوستانی دوسروں کی نقل کرنا ہی اپنے شایان شان سمجھتے ہیں ۔ اوریجنل بننے کے لئے کچھ سوچنا اور محسوس کرنا پڑتا ہے ۔ ہمیں چونکہ ترقی یافتہ ممالک کی سطح تک پہنچنے کی ذرا جلدی ہے ۔ اس لئے ہم کمرے کی ڈیکوریشن سے لے کر برتی پنکھے سے ہوتے ہوئے امتحانی پرچے اور ادب عالیہ تک میں اُن کی ہوبہو نقل کرتے ہیں ۔ سوچنا اور محسوس کرنا قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ وہی یہ دیکھیں کہ ہمارا کونسا پیراگراف ، کونسا تھیم ، کونسا شعر اور کونسا مزاحیہ " ٹکڑا " ترقی یافتہ ممالک کے کونسے گوشے اور کونسی تحریک سے نقل کیا گیا ہے ۔ گذشتہ ہفتہ

←— — — —

میرے ایک دوست نے مجھے پنجابی زبان میں ایک لطیفہ سنایا کہ ہمارے گاؤں کا ایک کسان امرسنگھ شہر سے ایک گھڑی خرید لایا۔ دو چار دن بعد وہ گھڑی بند ہو گئی۔ اس نے گاؤں میں ایک پڑھے لکھے نوجوان کو وہ گھڑی دکھائی۔ نوجوان نے گھڑی کا ڈھکنا کھول کر دیکھا تو اس میں ایک مکھی مری پڑی تھی۔ نوجوان بولا "امر سنگھ! یہ گھڑی کیسے چلے؟ اس کا تو ڈرائیور ہی مر گیا ہے"

لطیفہ سُن کر میں پچیس فیصدی ہنسا۔ دوست نے کہا "تم سو فیصدی کیوں نہیں ہنسے۔ میں نے جواب دیا کیونکہ یہ لطیفہ ہمارے گاؤں کا اوریجنل لطیفہ نہیں ہے۔ میں اُسے انگریزی کی ایک لطائف کی کتاب میں پڑھ چکا ہوں۔ تم نے اُسے نقل کر کے "پنجابیا" دیا ہے۔ اور نقل پر پچیس فی صدی سے زیادہ نہیں ہنسا جا سکتا ــــ تم اوریجنل مزاح کیوں نہیں پیدا کرتے؟

وہ بولا: میرے پاس ٹائم نہیں ہے"

مگر میرا خیال ہے ہمارے پاس ٹائم تو اتنا زیادہ ہے کہ ہم آٹھ آٹھ گھنٹے روزانہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کیوُ (QUE) میں کھڑے رہتے ہیں اور مائنڈ نہیں کرتے۔ دراصل ہماری قوم کے پاس ہنسنے کے لئے ٹائم نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس ہنسنے کا تمدن ہی نہیں ہے۔ یہاں ہنسنا بد تہذیبی سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کسی میاں بیوی کو ایک دوسرے کے سامنے ہنستے نہیں دیکھا۔ اگر بدقسمتی سے ہنس بھی رہے ہوں تو بچوں کے آتے ہی چُپ ہو جاتے ہیں۔ کہ کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں ــــ بس اسی خطرے، اسی سنجیدگی کے بارے میں ہماری پوری قوم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہے۔ فنِ مزاح میں بھی شاید اسی لئے ہم اوریجنل نہیں بن سکے۔ ہم ایک ہنسی ہوئی مگر سنجیدہ تہذیب کے نمائندے ہیں۔ سچ کا پرچار کرتے ہیں مگر سچ کہنے سے کنی کاٹ جاتے ہیں۔ ہم چور کو بھی چور نہیں کہتے مبادا وہ کسی وزیر کا پی۔اے نکل آئے ــــ اور اس مبادا کو ہم قوّتِ برداشت کہتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف یہی قوت برداشت ہی "اوریجنل" ہے۔ ورنہ باقی سب کچھ "امپورٹڈ" ہے۔ مگر حضرات! اوریجنل بننا بھی بڑا رسک ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اپنے کالم میں طنز و مزاح پیدا کرنے کے بعد کتنی بار اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر جھولتے دیکھا ہے۔ کس طرح سینے پر جبر کی سِل رکھ کر عیاری سے ہنسانے کے جتن کئے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ اخبار کے شعبۂ اشتہارات کے منیجر نے مجھے بُلایا اور کہا "فکر صاحب! پرسوں ہمارے اخبار میں ایک بھینس کی گمشدگی کا اشتہار چھپا تھا ــــ میں نے کہا "چھپا تھا"

وہ بولے: "اور آپ نے اس اشتہار کو بُنیاد بنا کر اپنا مزاحیہ کالم قلمبند کر ڈالا"

میں نے کہا: "جی ہاں ــ کر ڈالا"

کہنے لگے: "مگر آج وہ اشتہار دینے والا غیض و غضب کے ساتھ دفتر میں آیا بولا کہ ایک تو میں نے آپ کو اشتہار کے پچاس روپے ادا کئے اس پر آپ کے کالم نویس نے میری بھینس کا مذاق اڑا دیا۔ میرے روپے واپس کیجئے ورنہ میں تو ہین کا مقدمہ کراؤں گا ــــ اس لئے فکر صاحب! آئندہ قلم اُٹھاتے وقت ذرا احتیاط کیا کیجئے"

میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ کبھی بھینس کے آگے بین نہیں بجاؤں گا۔ اس ملک کے انسان ہی نہیں بھینسیں بھی بڑی سنجیدہ ہوتی ہیں۔

ہاں حضرات! احتیاط ہی ہمارا ادب ہے۔ میں نے ایمرجنسی میں بڑے بڑے اہلِ قلم کو بڑی احتیاط برتتے دیکھا ہے بلکہ تحریر میں قلم کم اور احتیاط زیادہ دیکھی ہے کیونکہ ایک کا نیشنل تک میں مسکراتے دیکھتا تھا۔ تو ٹمٹیا تمیں بند کر دیتا تھا

کہ مجرم میرے گھر کے ڈبلے پر ہنس رہا تھا جو مجھے نس بندی کیمپ سے ملا تھا۔

حضرات! اب میں خطبۂ صدارت کو ختم کر رہا ہوں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ چند سکنڈ بعد مجھے ہُوٹ کرنے والے ہیں۔ ہُوٹ ہونے سے پہلے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے ایسی محفلیں منعقد کر کے، ہندوستان کی تاریخ طنز و مزاح میں پہلی بار اوریجنل بننے کی طرف قدم اُٹھایا ہے۔ محفلوں کا یہ آئیڈیا اوریجنل ہے جس سے طنز نگاروں میں بھی مجبوراً اوریجنل تخلیقوں کا رجحان پیدا ہوگیا ہے ـــــ ہندوستان میں کسی زمانے اور کسی زبان میں طنز و مزاح کی ایسی باقاعدہ محفلوں کا وجود نہیں ملتا۔ اُردو میں پہلی مرتبہ، زندہ دلانِ حیدرآباد نے طنز و مزاح کو ایک زندہ تحریک بنادیا ہے اور میں یہ دیکھ کر بظاہر حیران اور بباطن خوش ہوا ہوں کہ حیدرآباد کی دیکھا دیکھی کبھی بھوپال میں مزاحیہ محفل ہورہی ہے، کبھی پٹنہ میں، کبھی بمبئی میں اور کبھی دہلی میں بلکہ گذشتہ دنوں تو امروہہ سے مجھے دعوت نامہ موصول ہوا کہ ہم بھی ایک "محفل" منعقد کر رہے ہیں تشریف لائیے۔

یعنی سارا ہندوستان حیدرآباد کی نقل پر تُل گیا ہے۔ اوریجنل ہونے کے باوجود ہم نقل کرنے کی خُو نہیں بدلتے، ہنستے ہیں تو بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ مگر شکر ہے ہنسنے تو لگے ہیں۔

اُمید ہے، زندہ دلانِ حیدرآباد میری اس تحسین پر خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے۔ لیکن میری عرض ہے کہ ان کی اوریجنلیٹی کا یہ خیال میرا ذاتی خیال ہے اور کہ میں ایک وزیر کی طرح اس کی تردید بھی کر سکتا ہوں کہ میں نے ایسا نہیں کہا تھا، میرے خیال کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ ■■

ایک پردیسی کا سفرنامۂ ہندوستان

(دوسرا ایڈیشن)

یوسف ناظم

دنیا کی سیر ضرور کرنی چاہئے لیکن ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جب بھی سفر پر نکلو تو ہوائی جہاز پر سوار ہو کر نکلو۔ ریلوے استعمال کی جانے سے بچنے کی یہی ایک ترکیب ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ عجیب عجیب سواریوں کے ذریعے لمبے لمبے سفر کیا کرتے تھے معلوم نہیں انھیں اپنے گھر میں ایسی کیا تکلیف تھی کہ انھیں گھوڑے پر سوار ہو کر سفر پر نکل جانا بہتر معلوم ہوتا تھا۔ آپ ہی بتلائیے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کرنا کوئی سفر ہوا۔ ایک تو مذکورہ پیٹھ کافی سخت ہوتی ہے اور اس پر زین کسی جائے تو یہ اور سخت ہو جاتی ہے۔ (اس لیے ہم نے کسی بھی جاکی کو ریس میں حصہ لیتے ہوئے کبھی زین پر بیٹھے نہیں دیکھا۔ جاکی ہمیشہ زین سے کم از کم تین انچ اوپر رہا کرتا ہے۔ زین کو وہ گھوڑے کی زینت کے لیے استعمال کرتا ہے) اس کے علاوہ گھوڑے کی خوراک گھوڑے کے مالک کی خوراک سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ خاص طور پر سیاحت پر روانہ ہونے والے گھوڑے کی خوراک (ان چند مخصوص لوگوں کی بات اور ہے جو بہت زیادہ خوش خوراک ہوتے ہیں) گھوڑے کو ساتھ لیکر سفر کرنے میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ گھوڑے کو نہلانا پڑتا ہے اور غسل دیتے وقت کافی کھرچنا بھی پڑتا ہے۔ گھوڑے کے کھانے اور غسل میں اتنا وقت صرف ہو جائے تو آدمی سفر کب کرے گا اور کب اپنا سفر نامہ لکھے گا۔ (اکثر سفر ناموں سے ہم بدگمان ہیں)

سمندری جہاز کے سفر سے بھی سیاحت تھوڑے ہی ہوتی ہے ہاں ہوا خوب کھانے کو ملتی ہے لیکن یہ تو آدمی گھر بیٹھے بھی کھا سکتا ہے۔ اور بات تو وہی ہوئی۔ جہاز کی سواری اور گھوڑے کی سواری میں تھوڑا ہی سا فرق ہے بلکہ گھوڑے کی سواری بہتر ہے۔ گھوڑا بگڑ جائے تو اسے منایا جا سکتا ہے لیکن جہاز کسی بہلاوے میں نہیں آتا۔ ریل کے سفر میں ایک سہولت تو یہ ہے کہ ریلوں کا چلنا اور دوڑنا کسی ٹائم ٹیبل کا پابند نہیں ہے لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ ریلوں میں اب تھری ٹائیر ڈبے رائج ہو گئے ہیں۔ ان ڈبوں میں مسافروں کے سونے کے لئے ایک ایسی برتھ بھی ہوتی ہے جو درمیانی برتھ کہلاتی ہے اس برتھ پر سونے میں وہی مزہ آتا ہے جو بچوں کو جھولے میں سونے میں آتا ہے۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر رک بھی جائے تو یہ برتھ ہلتی ہی رہتی ہے۔ اس لیے جب بھی سفر کرنا ہو ہوائی جہاز سے سفر کرنا چاہیے۔ اب تو ایئر بسیں بھی نکل گئی ہیں (ایئر بس کیا

نام سن کر ہمارے ایک دوست نے پوچھا کیا یہ بھی ڈبل ڈیکر ہوتی ہے اور اس میں کتنے مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے)

ہمیں ہندوستان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمیں گھر بیٹھے (ہمارا گھر پرشین گلف میں ہے) کچھ ہندوستانیوں کے ذریعے ہندوستان میں تجارت کرنے کا موقعہ مل گیا (یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس قسم کی تجارت کو ہندوستان میں اسمگلنگ کہا جاتا ہے (یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی)۔ جب اس تجارت میں کافی منافع ہوا اور ہم اس قابل ہوئے کہ آدمی کے بجائے ٹورسٹ کہلائیں تو ہم نے ہندوستان کے سفر کا ارادہ کیا اور ایک دن اُڑ گئے۔

سفر شروع ہوا تو ہم بہت خوش تھے (ہم جب بھی گھر سے باہر جاتے ہیں بہت خوش رہتے ہیں) ہوائی جہاز پر ہم اس سے پہلے بھی چڑھے تھے لیکن اس وقت ہوائی جہازوں نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اب ایر ہوسٹیس مسافروں کی طرف دیکھ کر کچھ مسکرانے بھی لگی ہیں۔ پہلے ان کی مسکراہٹ صرف کریو (crew) کے لیے ہوا کرتی تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں میں بھی کانوں میں رکھنے کی روئی اور منہ میں رکھنے کی سونف بالکل فریش ملنے لگی ہے۔ ٹکٹ کے دام بھی پہلے کے مقابلے میں صرف دگنے ہوئے ہیں۔

ہمارا پلین زمین سے کافی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ سمجھیے یہی کوئی دس بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر۔ (اتنا اونچا تو آدمی کو اڑنا ہی چاہیے) یکایک شور سنائی دیا۔ تعجب ہوا کہ اتنی بلندی پر شور۔ ایسا معلوم ہوا کہ کئی لوگ ایک جگہ جمع ہیں اور ہنگامہ مچا ہوا ہے ہم سوچ ہی رہے تھے کہ پلین میں اتنا شور پہلے تو نہیں ہوا کرتا تھا۔ اتنے میں مائیکروفون پر اعلان ہوا کہ ہم ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔

ہم نے یہ ضرور سنا تھا کہ ہندوستان میں لوگ بہت باتیں کرتے ہیں اور کافی اونچی آواز میں بات کرتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم آسمان میں بھی ان کی آواز سن سکیں گے۔ (ہم دوسروں کی قابلیت کی طرف ہمیشہ مشکوک رہتے ہیں)

چند ہی منٹ میں ہم دہلی کے ایرپورٹ پر تھے۔ ایرپورٹ اچھا خاصہ معلوم ہوا۔ ہونا بھی چاہیے۔ دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے اور چند ہی منٹ میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ زمانہ الیکشن کا ہے۔ کسی نے ہمیں بتایا کہ اس مرتبہ ریاستی اسمبلیوں کی نشستوں کے لیے جن امیدواروں نے درخواستیں دی تھیں ان کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ (ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ ہندوستان میں بے روزگاری زیادہ ہے۔ اس کا ہمیں اندازہ نہ تھا)

ہندوستان کے بارے میں ہمیں معلوم تھا کہ یہ ایک آزاد ملک ہے۔ آزادی کا تصور ہمارے ذہن میں کچھ اور تھا۔ لیکن یہاں کی آزادی ہمیں بہتر نظر آئی۔ ہر شخص مکمل طور پر آزاد دکھائی دیا۔ دلّی میں کوئی شخص بھی کیو میں کھڑے رہنے کا پابند نہیں ہے ٹیکسیاں چلتی ہیں لیکن ٹیکسی ڈرائیور کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے گاڑی میں بٹھائے جسے چاہے نہ بٹھائے۔ اسے کسی خاص سمت میں جانے پر بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ٹیکسی میں میٹر ضرور لگے ہوتے ہیں لیکن شوقیہ آرائش رہتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور آزاد ہیں کہ اپنی مرضی سے کرایہ حاصل کریں۔ دلّی میں سیکلیں بھی بہت ہیں یعنی اتنی کہ شاید پورے ہندوستان میں بھی نہ ہونگی لیکن پھر بھی کم ہیں۔ مجبوراً ایک سائیکل پر بوقت واحد میں تین افراد سوار ہوتے ہیں۔ سائیکلوں پر آدمیوں کا گلدستہ ہم نے دلّی ہی میں دیکھا۔ (بعد میں ایسے منظر سرکس میں بھی دکھائی دیئے لیکن اس کا ٹکٹ خریدنا پڑا تھا)

دلّی خوب صورت شہر ہے۔ سڑکیں بے حد کشادہ ہیں۔ اور اس لئے بھی کشادہ نظر آتی ہیں کہ ان پر چلتا کوئی نہیں ہے۔

یہ یونہی پڑی رہتی ہیں۔ لوگ گھروں میں رہتے ہیں۔ پارکوں میں بھی لوگ صرف مجبوری کی وجہ سے جاتے ہیں۔ قطب مینار بھی دیکھا۔ اور اسے دیکھ کر معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز اتنی بلندی پر کیوں اڑا کرتے ہیں۔ کئی لوگ قطب مینار کو گردن اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعد میں انھیں گردن پر مساج کروانا پڑتا ہے ورنہ کئی دن تک گردن ٹیڑھی رہتی ہے۔ قطب مینار پر لوگ چڑھتے بھی ہیں۔ یہ اصل میں ہمالیہ پہاڑ پر چڑھنے کی تیاری ہوتی ہے۔ قطب مینار کو ٹریننگ کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمیں آثار قدیمہ سے زیادہ دل چسپی نہیں ہے۔ لیکن اکثر چیزیں دیکھنی اس لیے ضروری ہوتی ہیں کہ نہ دیکھو تو لوگ ہنستے ہیں کہ اتنی دور گئے اور یہ نہیں دیکھا اور وہ نہیں دیکھا۔ (ارے بھئی ہم نے نہیں دیکھا تو آپ دیکھ آئیے)

دلی کا زو بھی دیکھا۔ (لوگ یہاں زو کو چڑیا گھر کہتے ہیں۔ اس زو میں ہر قسم کی چڑیائیں مثلاً ہاتھی، شیر، گینڈے، دریائی گھوڑے اور بن مانس رکھے جاتے ہیں) یہ چڑیا خانہ ہمیں بہت پسند آیا۔ جانور کافی مہذب اور متین نظر آئے (تھوڑا سا تعجب بھی ہوا) زو کیا ہے اچھی خاصی چراگاہ ہے۔ میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ گاڑیاں اندر نہیں جا سکتیں۔ اس لیے یہ زو صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کی ٹانگیں مضبوط ہوں ــــ کمزور اور ناتواں لوگوں کے لئے گھومتا ہوا چڑیا خانہ بنانا چاہیے۔ ــــ کسی نے ہمیں بتایا کہ لکھنؤ کا چڑیا خانہ اس سے بھی اچھا ہے اور یہ کہ اگر اصلی وائلڈ لائف دیکھنی ہو تو گجرات اور ہاتھیوں کے جلسے میں شرکت کرنی ہو تو میسور جانا چاہیے۔ (ہاتھیوں کا سالانہ اجلاس سوائے میسور کے دنیا میں اور کہیں نہیں ہوتا)۔

جنتر منتر کی عمارت بھی دیکھی کسی نے کہا تھا یہ بچوّں کی دل چسپی کی جگہ ہے اس لیے یہاں بچے نظر آئے۔ اچھی خاصی عمر کے لوگ گھومتے دکھائی دیئے۔ جو کافی خوش تھے۔ آدمی فطرتاً گردش میں رہنے کا شوقین ہے۔ کہتے ہیں ہندوستان میں کسی جگہ بھول بھلیاں نام کی عمارت بھی ہے۔ اس عمارت میں آدمی داخل ہو جائے تو گائیڈ کی مدد کے بغیر باہر نہیں آ سکتا۔ بلکہ یہاں تک مشہور ہے کہ کئی گائیڈ بھی وہاں کھو گئے ہیں۔

نئی عمارتوں میں سپریم کورٹ کی عمارت بے حد شان دار ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں خاموشی بہت ہے۔ انصاف سے کون نہیں ڈرتا۔ یہاں ہر شخص دبے پاؤں چلتا نظر آیا۔ لوگ بات بھی کرتے ہیں تو آنکھوں آنکھوں میں۔ اس قسم کے مقامات کی ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے ــــ عمارت پر ترازو کی تصویر بنی ہوئی ہے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں انصاف تول کر بکتا ہے کیونکہ یہ لوگ ترازو کو صرف تجارت کی علامت سمجھتے ہیں ــــ ایسا سمجھنا نادانی ہے۔

پارلیمان کی عمارت بھی بہت وسیع اور غیر معمولی شان و شوکت دار ہے۔ (ہندوستان میں عمارتوں کو شوکت دار نہیں کیا جاتا صرف شان دار کہا جاتا ہے) شور سننا ہو تو پارلیمان جانا چاہیے۔ اس عمارت کی چھت کی تعمیر پر بکثرت روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ کب کی اڑ چکی ہوتی۔ سب دیواروں کے کان ہوا کرتے ہیں لیکن اس عمارت کی دیواروں کے کان نہیں ہیں۔ اگر ہیں بھی تو ان کے پردے پھٹ چکے ہیں۔

لال قلعہ میں داخل ہوتے وقت ہمیں تھوڑا سا ڈر لگا کیونکہ ہم نے سن رکھا تھا کہ لوگ ایک مرتبہ قلعہ میں داخل ہو جاتے ہیں تو برسوں باہر نہیں آتے تھے۔ لیکن اس قلعہ میں ہمیں قلعہ سے باہر جانے والے تعداد میں زیادہ نظر آئے ہمارے گائیڈ نے کچھ ہی دیر میں ہمیں تاریخ ہند کے پورے مغلیہ دور سے واقف کروا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مغلیہ دور کے صفحے اسے زبانی یاد تھے۔ اس نے کچھ ایسی باتیں بھی بتائیں کہ دل لرز گیا۔ یہ باتیں ہمارے سفرنامے میں زیب نہیں دیتیں

(یہ کسی معقول آدمی کے سیاحت نامے میں لکھی جانی چاہئیں)
جمنا ندی کا نظارہ کیا - یہ بڑی دریا ہے لیکن دریائے گنگا کی چھوٹی بہن کہلاتی ہے - یہ دونوں دریائیں اتنی بڑی اتنی بڑی ہیں کہ ہمارا خیال تھا پورے ہندوستان کے لئے کافی ہوں گی - لیکن ہمکا نیڈ کہہ رہا تھا یہاں دریاؤں کی کمی نہیں - وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہاں دریاؤں میں ہر سال سیلاب آتا جاتا ہے - اس قسم کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں - ہندوستان میں اور خاص طور پر دلی میں ہمیں دو چیزوں کی بہتات نظر آئی سیاست اور فنونِ لطیفہ - یہاں لوگ بات بات پر لطیفہ سناتے ہیں اور آپ لطیفہ سمجھیں یا نہ سمجھیں آپ سے ہاتھ ضرور ملاتے ہیں - یہ یہاں کا عام طریقہ ہے - یہاں ہر بڑے آدمی کے بارے میں لطیفے ضرور کہے جاتے ہیں چاہے وہ بڑا آدمی عورت ذات ہی کیوں نہ ہو ــــ فنونِ لطیفہ میں لطیفہ گوئی کے علاوہ ادب بھی دکھائی دیا - (ادب کے بارے میں ہم اپنی رائے کچھ دن بعد لکھیں گے ابھی تو ہم بوکھلائے ہوئے ہیں) سیاست تو یہاں جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہے -

ہم اصل میں ہندوستان پہنچے ہی ایسے وقت جب یہاں سیاسی سرگرمیوں کا پارہ بہت چڑھا ہوا تھا - نئی حکومت تازہ تازہ قائم ہوئی تھی - ہمارے دوستوں نے (جو سیاسیات پر بحث کئے بغیر کھانا وغیرہ نہیں کھایا کرتے ہیں) ہمیں بتایا کہ یہاں کی وزیر اعظم کے الیکشن میں کچھ گڑبڑ تھی (جی تو چاہا کہ پوچھیں کہ گڑبڑ کہاں نہیں ہے) اور معاملہ عدالت تک پہنچا تھا - الٰہ آباد ہائیکورٹ نے وزیر اعظم کے الیکشن ہی کو رد کر دیا تھا - یہ بات ہم نے پرشین گلف میں بھی سنی تھی اور ریڈیو وغیرہ پر اس فیصلے کی بڑی دھوم تھی - اور اس فیصلے کو ساری دنیا میں ایسے سراہا جا رہا تھا جیسے اس سے پہلے یہاں کبھی انصاف ہوا ہی نہیں تھا - لیکن یہاں آنے کے بعد ہم نے جو تفصیلات سنیں اور جتنی بھی ہماری سمجھ میں آسکیں اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وزیر اعظم کے الیکشن کو ناجائز قرار دینے والی عدالتیں بہت کم ہوا کرتی ہیں اور ہوا بھی یہی یہ فیصلہ آخری فیصلہ نہیں تھا - آخری فیصلہ تو اس عمارت میں ہوا کرتا ہے جس کا ذکر ہم پہلے آپ سے کر چکے ہیں - کہتے ہیں کہ وزیر اعظم تو ہائی کورٹ کے فیصلے کو بھی مان لینے والی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ ہائی کورٹ بھی معقول عدالت ہوتی ہے اور اس کے فیصلے کے آگے سر جھکانے میں کسی کی سبکی نہیں ہوتی لیکن کہتے ہیں کہ ان سے یہ کہا گیا کہ اگر ان عدالتوں کے فیصلے یونہی مانے جاتے رہے تو پھر سپریم کورٹ قائم کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا ــــ وزیر اعظم کو بھی سوچنا پڑا اور کہتے ہیں کہ ان کے وفادار دوستوں نے ان کی طرف سے ایک اپیل سپریم کورٹ میں داخل کر دی - مقدمہ اتفاق سے مضبوط تھا یا ممکن ہے عدالت کی توجہ کسی خاص اور اہم قانونی نکتے کی طرف مبذول کرائی گئی ہو - بہر حال یہ اپیل منظور ہو گئی - عدالتوں کی شکل یہ ہے کہ ان میں سرکاری دفتروں کی طرح کارروائیاں ملتوی نہیں کی جا سکتیں - اور نہ ان کارروائیوں کو ایک میز سے دوسرے میز پر یا دوسرے میز سے تیسرے میز پر اور پھر تیسرے سے پہلے میز پر گشت کروایا جا سکتا ہے - انتظامیہ اور عدلیہ میں فرق یہی ہے - انتظامیہ میں فیصلہ جتنے لمبے عرصے تک ملتوی رکھا جاتا ہے انتظامیہ اتنا ہی مضبوط اور مستحکم کہلائے گا جب کہ عدلیہ میں پہلی فرصت میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور آخری فیصلہ تو اور بھی جلد کرنا پڑتا ہے۔

کہتے ہیں کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے لوگ، جنہیں یہاں عوام کہا جاتا ہے خوش نہیں تھے بلکہ بعض لوگ تو بہت ناراض تھے کیونکہ ہمیں یہ بتایا گیا کہ ہندوستان میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو عورتوں کی حکومت تو بڑی بات ہے ان کی صحبت بلکہ صورت تک سے گھبراتے ہیں - خیر یہ الگ مسئلہ ہے - جس پر ہم آئندہ کبھی تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کریں گے - بہر حال اس

فیصلے کے بعد یہاں کی سب سیاسی جماعتوں نے جنہیں حزب مخالف کہا جاتا ہے، طے کیا کہ اب تو ہم کو متحد ہونا چاہیے (ہندوستان میں ہر پانچ سال بعد اتحاد کی تحریک ضرور چلتی ہے) اس سے پہلے یہاں کی سیاسی جماعتیں صرف دوسری سیاسی جماعتوں ہی سے نہیں خود اپنے آپ سے بھی لڑتی رہتی تھیں (اس سے مشق برقرار رہتی ہے)

اس مشغلۂ محبت کے نتیجے میں ہر سیاسی جماعت میں کم سے کم تین شاخیں نمودار ہوگئی تھیں (یہاں کسی بھی شعبۂ حیات میں پیداوار کی کمی نہیں) عام طور پر شاخیں پھوٹا کرتی ہیں لیکن یہ شاخیں خود ایک پھوٹ کا نتیجہ تھیں۔ ہمیں ہندوستان آکر معلوم ہوا کہ پھوٹ یہاں ایک میوہ بھی ہے جسے شاید سردہ بھی کہتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ سردہ خربوزے کی ادنیٰ یا اعلیٰ ذات ہے۔ ذات بھی یہاں ہر چیز کی ہوا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ یہاں شاعر بھی ذات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں میں پھوٹ پڑنے سے داہنے، بائیں اور درمیانی لوگوں کی ولادت عمل میں آئی۔ درمیان ٹھہر جانے والے لوگ سنٹرسٹ کے پیارے نام سے نوازے گئے۔ ہر گروہ نے پھر اپنے نام کے آگے اپنا اپنا حرف شناخت لگالیا۔ (حرف شناخت اختصار کے کام آتا ہے۔ چند صورتوں میں یہ حروف کا مجموعہ بھی ہوتا ہے)

مختلف سیاسی جماعتوں کا اس طرح اچانک کسی ایک مسئلے پر متفق ہو جانا بیسویں صدی کا غیر معمولی حیرت ناک واقعہ ہے اور خاص طور پر ہندوستان میں تو ایسے واقعے کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہاں تو کہا جاتا ہے اسمبلیوں کے ممبر بھی، اسمبلی ہال میں پہلوانی کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ (یہاں جب بھی کوئی مسئلہ دماغ سے نہیں طے پاتا ہے پہلوانی طے کردا دیتی ہے)

دوسرے ملکوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لوگ جب ایک سیاسی جماعت کے ممبر بن جاتے ہیں تو پھر اسے چھوڑتے نہیں (یہ تو اچھی خاصی ضد ہوئی) ہندوستان میں لوگ اتنے ضدی نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ اپنی غلطی درست کرتے رہتے ہیں (ہونا بھی یہی چاہیے) ایک سیاسی جماعت سے رشتہ توڑ کر دوسری سیاسی جماعت سے رشتہ جوڑنا یہاں معمولات میں داخل ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو عوام بدظن ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی زبان میں لوگ اس عمل کو دل بدلی کہتے ہیں۔ یہ ترکیب ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ آیا رام گیا رام کا بھی محاورہ سننے میں آیا۔ یہ محاورہ تو اور بھی گیا گذرا معلوم ہوا۔ ہماری رائے ہے کہ اس آمد و رفت کا کوئی اچھا سا عنوان ہونا چاہیے (اصل میں یہاں عنوانات کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ بے عنوانی کا رواج زیادہ ہے)

دل بدلی کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ یہاں ایک قانون بھی نافذ کیا جانے والا ہے (ہندوستان میں قانون ہیں بھی بکثرت۔ لوگ فرمائشیں کر کرکے قانون نافذ کرواتے اور اس کی خلاف ورزیاں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر قانون نافذ نہیں ہوگا تو ہم خلاف ورزی کس بات کی کریں گے۔ ہمارے دوستوں نے ہم سے یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں نشہ بندی کا قانون خاص طور پر اسی لئے نافذ کیا گیا ہے کہ شراب کی تجارت میں اور چند مخصوص لوگوں کی آمدنی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو ——— (کہیں نہ کہیں تو ترقی ہونی چاہیے) دل بدلی کے قانون کی کیا نوعیت ہوگی ابھی تک کچھ پتہ نہیں لیکن ہم سے کسی نے کہا کہ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد، ہر شخص کو اپنی سیاسی زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ تو دل بدلی کرنی ہی ہوگی ورنہ اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائیگی کیا کارروائی ہوگی اسکے بارے میں ہم خاموش رہنا پسند کریں گے۔ لیکن ہمیں یقین نہیں آتا کہ دل بدلی کو بھی یہاں لازمی قرار دیا جائے گا۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ ہاں ؟؟ تک بات

لازمی نس بندی وغیرہ کے قانون تو بن سکتے ہیں، لیکن لازمی دل بدلی چہ معنی دارد۔ اور یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ کیا سیاسی لوگ اپنے لئے بھی قانون بنا سکتے ہیں؟

خیر ہمیں ان سب باتوں سے کیا لینا دینا ہے۔ ہم ٹھہرے مسافر آدمی۔ سیاحت سے دل بھر جائے گا تو کہیں نکل پڑیں گے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے دل بھر جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی کیونکہ یہاں تو ہر بات پر دل بھر آتا ہے۔ ہم اصل میں آپ سے کہہ رہے تھے۔ یہاں کے سیاسی جماعتوں کے یکایک متحد ہونے کی بات۔ جب سب سیاسی جماعتیں اپنے فیصلے کے مطابق متحد ہو گئیں تو حکمران سیاسی جماعت کو بھی سنجیدہ ہو جانا پڑا (حکمران جماعت کے لئے سنجیدگی اختیار کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ کیوں ۲۷ سال تو یونہی تفنن طبع میں گزر گئے تھے) جب کسی ملک کی حکومت سنجیدہ ہو جاتی ہے تو صرف گرجتی نہیں، برستی بھی ہے۔ (یہ خیال ہمارا نہیں ہے کہیں سے ماخوذ ہے) اس مقولے کا ہندوستان میں بھی خیال رکھا گیا اور سیاسی جماعتوں کے متحد ہونے کی خوشی میں یہاں اچانک ایک دن —— ایک دن نہیں بلکہ ایک رات ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ ایمرجنسی کیا ہوتی ہے ہمیں بالکل معلوم نہ تھا لیکن ہمارے دوستوں نے ہمیں بتایا کہ ایمرجنسی اس خوشگوار فضا کا انگریزی نام ہے جس میں حکمران طبقہ آسانی سے سانس لے سکتا ہے۔ ہر حکمران طبقہ کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ سانس لے سکے۔ دوسروں کی حد تک البتہ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ سکتی ہے (طبی نقطۂ نظر سے ہونا بھی یہی چاہیئے ورنہ اوپر کی سانس نیچے اور نیچے کی اوپر ہو جائے تو کیا آدمی تہہ و بالا نہیں ہو جائے گا) ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ایمرجنسی عام طور پر رات ہی میں نافذ کی جایا کرتی ہے۔ اس کے لیے یہی وقت مناسب رہتا ہے۔ جب یہاں ایمرجنسی نافذ ہوئی تو کہتے ہیں اس وقت مخالف جماعتوں کے تمام سیاسی لیڈر عوام الناس کے ساتھ گہری نیند سو رہے تھے ("کے ساتھ" سے مراد کی طرح ہے۔ یوں بھی سیاسی لیڈروں کی نیند ہی نہیں ہر چیز گہری ہوتی ہے)

ایمرجنسی سے پہلے مخالف جماعتوں کے لیڈر اور کارکن اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ ایمرجنسی کے نافذ ہوتے ہی معلوم نہیں ان کے دل میں کیا سمائی کہ سب کے سب راتوں رات جیلوں میں منتقل ہو گئے۔ جو جس وقت بھی نیند سے بیدار ہوا جیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ کہتے ہیں ان لوگوں سے بہت کہا گیا کہ یہ کوئی وقت نہیں ہے جیل جانے کا۔ لیکن ان لوگوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور اپنی من مانی کرتے رہے۔ (حکومت کو پریشان کرنے کا یہ نہایت نامناسب طریقہ تھا) لیڈروں کی دیکھا دیکھی اور بہت سے لوگ بھی اپنے اپنے گھر چھوڑ کر سرکاری مہمان بن گئے۔ ان سب لوگوں کے اس طرح جیل چلے جانے کی وجہ سے حکومت کے خزانے پر کافی بار پڑا۔ (یہ سن کر ہمیں تعجب ہوا کہ غریب ملکوں میں بھی حکومت کا خزانہ ہوا کرتا ہے) کہا جاتا ہے جب انگریز ہندوستان سے رخصت ہوئے تھے تو اس وقت بھی حکومت کے خزانے پر کافی بار پڑا تھا لیکن اس بُرے وقت میں بھی سب نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔ اور انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے کی خوشی میں سب لوگ آپس میں کئی دن تک قتل و خون کا جشن مناتے رہے۔ اس جشن کو معلوم نہیں یہاں کیوں فسادات کا نام دیا جاتا ہے (غلط قسم کے عنوانات کا کچھ یہاں شوق معلوم ہوتا ہے)

ایمرجنسی کے نافذ ہونے سے پہلے، شاید یہاں یہ ہوا تھا کہ سب مخالف جماعتوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ عجیب بات ہے یہاں تخت کو تختہ کہا جاتا ہے۔ حکومت تو جہاں تک ہمیں معلوم ہے تخت پر بیٹھ کر ہوتی ہے۔ تختہ تو اور کسی کام آتا ہے۔ بہرحال ہمیں کہاں فرصت ہے کہ ہم یہاں

تو ہو سکتا ہے اس کی کوئی معقول وجہ بھی ہو ۔ لیڈروں کے جیلوں میں چلے جانے کی وجہ سے ایک تو جیلوں کی حالت خراب ہو گئی۔ حکومت نے جیلوں کی اصلاح کے لیے جو بھی انتظامات کئے تھے سب درہم برہم ہو گئے۔ جرائم پیشہ لوگ الگ پریشان ہوئے۔ ان کو بھی ان لیڈروں کے ساتھ رہنا پڑا۔ جس میں انھیں کافی زحمت اٹھانی پڑی۔ سیاسی لیڈروں کے ساتھ رہنا اٹھنا بیٹھنا کافی دقت کا کام ہے۔ جرائم پیشہ لوگ اس کے بالکل عادی نہ تھے۔ انھیں سیاسی لیڈروں اور ناپسندیدہ اجنبیوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کر کے، ان کے ساتھ سراسر زیادتی کی گئی ۔ لیکن زمانہ ایمرجنسی کا تھا وہ بیچارے دم سادھ کر رہ گئے۔

مرد تو خیر جیلوں میں چلے گئے تھے، عورتیں بھی چلی گئیں ۔ (عورتیں ہمیشہ مردوں کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی ہیں) عورتوں نے ایک علٰحدہ ہی قسم کا رویّہ اختیار کیا۔ چند نے اصرار کیا کہ وہ رہیں گی تو پاگل اور نیم پاگل عورتوں کے ساتھ رہیں گی اور چند نے اصرار کیا کہ وہ ایسی عورتوں کے ساتھ رہیں گی جو متعدی امراض میں مبتلا ہوں۔ حکومت کو یہ سب باتیں ماننی پڑیں۔ کچھ لیڈر حکومت کو پریشان کرنے کے لیے اس بات پر اڑ گئے کہ ہم 'تخلیہ' میں رہیں گے۔ تخلیہ کو غالباً یہاں قید تنہائی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ نہ تو وہ اخبار پڑھیں گے اور نہ ریڈیو سنیں گے۔ اور تو اور عزیز و اقارب سے بھی ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر ہم ان سے ملیں گے بھی تو جیل کے عہدہ داروں کی موجودگی میں ملیں گے کیونکہ معلوم نہیں کون سا عزیز اور کون سا اقارب کس وقت کیا کر دے ۔ ان لوگوں نے اس قسم کے بیسیوں مطالبات کئے اور حکومت کو مجبوراً ان کی مرضی کے مطابق جھکنا پڑا۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی کہا جاتا ہے یہ لوگ جتنے دن بھی اپنی خوشی سے جیل میں رہے بات بات پر شور مچاتے اور دوسروں کا سکون برباد کرتے رہے۔ جیل کے کسی سپاہی یا کارندے کی انگلی بھی انہیں چھو جاتی تو طوفان کھڑا کر دیتے۔ مطلق نہ سوچتے کہ یہ مادر وطن کی جیل ہے اس کا کچھ احترام بھی کرنا چاہیئے۔

کہتے ہیں کہ ایمرجنسی کے نافذ ہونے کے بعد بلکہ اس کے نافذ ہوتے ہی ہندوستان میں پوری طرح امن و امان قائم ہو گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی دوسرا ہی ملک ہے۔ کئی لوگ تو اس بات کا افسوس کرتے تھے کہ یہ نسخہ پہلے کسی کے ذہن میں کیوں نہیں آیا ــــــ لیڈر تو سارے جیل چلے گئے تھے ۔ (ہم پھر یاد دلانا چاہتے ہیں کہ یہ سب لوگ اپنی مرضی سے جیل گئے تھے) رہ گئے عوام ۔ تو عوام یا تو مخلص لوگ ہوتے ہیں یا مفلس۔ انھیں کچھ دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت کی باگ ڈور کس کے ہاتھ ہے۔ (کیوں کہ ان کے حالات تو ایک سے رہتے ہیں) کچھ لیڈر جنہیں عوام کی مفارقت منظور نہیں جیلوں سے باہر تھے۔ لیکن انھوں نے منہ کا مزا بدلنے کے لیے عوام الناس بننا پسند کر لیا تھا۔ اس لیے انھیں بھی کوئی شکایت نہ تھی۔ ایمرجنسی میں کچھ نئے لیڈر پیدا ہو گئے تھے جو عوام کو پسند بھی آئے تھے ان میں اور عوام میں اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں، سارے ملکی اور خانگی معاملات بخیر و خوبی سلجھائے جا رہے تھے اور کسی کو کوئی تکلیف نہ تھی لیکن معلوم نہیں کیوں اور کس طرح ان دنوں الیکشن کا اعلان کر دیا گیا۔ الیکشن یہاں پنچسالہ فنکشن ہے اور بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے ۔ حکومت چاہتی تو اس الیکشن کو ۱۰، ۱۲ سال کے لئے ملتوی کر سکتی تھی کیونکہ عوام کا تو اس بارے میں کوئی اصرار نہ تھا ــــــ الیکشن کے اعلان کے ساتھ ساتھ دوسری رعایت یہ کی گئی کہ جیلوں میں جتنے بھی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے ان سے کہا گیا جاؤ اور جا کے تم بھی الیکشن میں حصہ لو۔ اس الیکشن نے کہتے ہیں کانگریس کی کھٹیا کھڑی کر دی ۔ یہ محاورہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا لیکن یہ محاورہ یہاں اتنا استعمال کیا جاتا ہے کہ ہمیں ڈر لگنے لگا کہ اگر ہم نے اس بات چیت میں اس محاورے پر کبھی اعتراض کر دیا تو کوئی ہماری کھٹیا کھڑی کر دے گا (سیاحت کے موقع پر ایسا رسک نہیں لینا چاہیئے)

ہمارا خیال تھا یعنی ناقص خیال تھا کہ ہم اپنے اس سیاحت نامے میں سب باتیں تاریخ وار لکھ رہے گئے اور

تسلسل کا خیال رکھیں گے لیکن ہندوستان میں سیاسی اور معاشی واقعات کی رفتار کچھ اتنی تیز ہے کہ ہر لمحہ انقلابی، ہر لحظہ التہابی اور ہر ثانیہ طوفانی ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب یہاں پارلیمان، راجیہ سبھا اور اسمبلی کے اجلاس ہو رہے ہوں تو کافی گہما گہمی اور دلچسپی رہتی ہے۔ ہم نے تو یہ بھی سنا کہ کسی ایک صوبے کے اسمبلی ہال میں ایک صاحب بالکنی سے نیچے کود پڑے۔ یعنی ہال ہی میں کود پڑے ہمیں کافی حیرت ہوئی لیکن ہمیں ہمارے دوستوں نے بتایا کہ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں جادو کے زور سے رسی کو نہ صرف خلا میں بلا کسی سہارے کے کھڑا کر دیا جا سکتا ہے بلکہ اس رسی پر لوگ چڑھ بھی سکتے ہیں۔ (اسی لئے ہندوستان میں رسی جل جاتی ہے لیکن اس کا بل نہیں جاتا) اس لئے بالکنی سے اگر کوئی شخص نیچے کود دے تو کوئی حرج نہیں (افسوس تو اس کا ہے کہ کوئی زخمی نہیں ہوا)

یہاں کے لوگوں کی خوش مزاجی کا ایک نیا واقعہ سننے میں آیا کہتے ہیں یہاں کے وزیر اعظم ایک صوبے کے کسی مقام پر دورے پر گئے یہ وہاں ایک زمانے کے بعد گئے تھے اس لئے لوگوں میں بڑا جوش و خروش تھا اور خاص طور پر وہاں کے نوجوانوں نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ وہ کس قدر جوشیلے ہیں۔

بے حد مخلص اور بے انتہا خوش و خرم نوجوانوں نے فرط مسرت میں وزیر اعظم کی موٹر کے گرد ناچنا شروع کر دیا وہ اتنا بے تحاشا ناچے کہ ان کی چپلیں ان کے پاؤں سے نکل کر ہوا میں اڑنے لگیں اور اتفاق سے ان چپلوں کا رخ بھی وزیر اعظم کی موٹر کی طرف تھا۔ (ہوا ہی کچھ ایسی چل رہی تھی) کچھ لوگ تو عالم سرخوشی میں موٹر کے اگلے حصے پر چڑھ گئے اور وہیں رقص کرنے لگے (عقیدت اونچ نیچ نہیں دیکھا کرتی) ــــ پروگرام کے بخیر و خوبی ختم ہو جانے کے بعد سنا ہے چند لوگ وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے معذرت چاہی کہ رقص و سرود کا یہ پروگرام وسیع پیمانے پر نہیں پیش کیا جا سکا۔

ہندوستان میں آکر ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ یہاں زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ کچھ کم ہے۔ یہ خیال ہمارے ذہن میں اس لئے آیا کہ یہاں اجناس کی قیمتیں ہمیشہ آسمان پر رہتی ہیں۔ اتنی تیزی سے ان قیمتوں کے آسمان پر پہونچ جانے میں یقیناً کوئی راز ہے (نظام شمسی کی جانچ کرنی چاہیئے) ورنہ یہاں کے تاجر پیشہ لوگ تو بے چارے بے حد امن پسند لوگ ہیں وہ اپنی طرف سے کبھی قیمتیں نہیں بڑھاتے۔ ایمرجنسی کے زمانے میں چیزوں کی قیمتیں اگر کم ہوئی تھیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چیزوں کے اصلی دام ہی کم تھے وہ تو مجبوری کی بات تھی کیونکہ اس وقت اصلی دام طلب ہی نہیں کئے جا سکتے تھے۔ یہ توجیہہ ہماری سمجھ میں آگئی۔ یہاں دام کچھ ہوتے ہی زیادہ ہیں۔ غریب ملک ہونے کا فائدہ یہی ہے۔

یہاں ایک خاص بات اور دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ زبان　　　　کے معاملے میں لوگ بے حد خوش رہتے ہیں اصل میں یہاں طے یہ ہوتا ہے　　　　کہ بدگوئی کی سب سے زیادہ سہولت کس زبان میں ہے۔ ہماری رائے کسی نے پوچھی تو نہیں لیکن ہم اپنی طرف سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کے معاملے میں کوئی پابندی ہونی ہی نہیں چاہیئے۔ کوئی سننے والا ہو تو زبان کی اہمیت ہے ورنہ جو جس زبان میں چاہے بولے کیا فرق پڑتا ہے۔

ہم یہاں اکثر ریڈیو پر خبریں سن لیا کرتے ہیں۔ سبھی زبانوں میں خبریں نشر ہوتی ہیں معلوم ہوا یہ ملکی زبانیں ہیں لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو سے آخر لاطینی زبان میں خبریں کیوں نشر کی جاتی ہیں۔ یہ ہماری غلط فہمی تھی ہمیں بعد میں کسی نے بتایا کہ یہ لاطینی نہیں آل انڈیا ریڈیو کی ہندی زبان ہے۔

ہماری رائے یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اب بھی صحیح آزادی اور مکمل آزادی کا رواج نہیں ہوا ہے۔ ۳۰ سال

کی مدت کافی لمبی ہوتی ہے اب تو عوام کو استقبال کے موقعوں پر رقص و سرود کی اسمبلیوں میں کود جانے کی اجناس کی قیمتوں کو آسمان پر لے جانے کی اور جبرانی اور ترکی اور اس قسم کی زبانوں میں خبریں نشر کرنے کی مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ بھی کئی آزادیاں ہیں جن کی اس ملک میں اشد ضرورت ہے لیکن فی الحال اتنی کافی ہوں گی۔
دلی چونکہ ہندوستان کی راجدھانی ہے اس لیے نئے نئے ڈھنگ کے بیانات یہیں تولد ہوتے ہیں۔ اور یہیں پروان چڑھ کر اخباروں میں نمودار ہوتے ہیں۔

ان بیانات سے یہاں کے باشندوں کے ادبی اور ثقافتی معیار میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہورہی ہے۔ (کوئی بھی سائنس داں اب تک یہ نہیں معلوم کر سکا کہ ہندوستان میں عین رات کے وقت وقوع پذیر ہونے والی ترقی کی رفتار دن کے اوقات میں سرزد ہونے والی ترقی کی رفتار سے کیونکر اور کس طرح دگنی ہوتی ہے) ادبی اور ثقافتی معیار کی بات پر ہمیں یاد آیا کہ ہندوستان میں یہ سرگرمیاں سرد پڑ گئی ہیں۔ اس معاملے میں ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد حکومت نے جب یہ اعلان کیا کہ آئندہ سے کسی قسم کے کوئی اعزازات نہیں دیئے جائیں گے تو لوگ بجھ سے گئے۔ ان کی ساری خوش دلی، خوش مزاجی، خوش خلقی اور اس قبیل کی دوسری خصوصیات بماد میں پڑ گئی ہیں پہلے ۳۰ سال سے یہ ہوتا آرہا تھا کہ ہر ۲۶ جنوری اور ہر ۱۵ اگست کو اخباروں میں ڈیڑھ دو میٹر کی طویل طویل فہرستیں چھپتی تھیں جن میں ان باشندوں کے نام ہوتے تھے جن کی زندگی میں یکایک سماجی اور ثقافتی انقلاب برپا ہو جاتا تھا صبح سویرے عوام الناس کو پتہ چلتا تھا کہ فلاں صاحب جو کل تک اچھے خاصے تھے، آج صبح اچانک خطاب یافتہ ہوگئے ہیں اور اب انہیں ان کے نام سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ اس طرح ہر سال لوگ عوام الناس کے زمرے سے نکل کر خواص الناس ہوتے جارہے تھے۔ جنتا پارٹی نے شاید یہ محسوس کیا کہ اگر یہ صورت حال برقرار رہی تو کچھ عرصے بعد یہاں عوام الناس ڈھونڈے سے بھی نہیں ملیں گے۔ لیکن حکومت کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر ملک سے اعزازات یکسر غائب ہوگئے تو حالات کتنے نازک بلکہ ناگفتہ بہ ہو جائیں گے۔ کوئی بھی ملک ہو اپنے اعزازات ہی سے پہچانا جاتا ہے (انگلستان میں اگر ڈیوک اور لارڈ نہ ہوں تو پھر انگلستان میں رہ کیا جاتا ہے) ہندوستان میں جنتا حکومت کے اس حوصلہ شکن بلکہ مستقبل شکن اعلان کے بعد چند ادیبوں اور شاعروں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ یہ تو ظلم ہے۔ جب ہماری باری آئی تو اعزازات ہی بند ہوگئے' (ہندوستان میں تو ایک عرصے تک یہ بھی بحث ہوتی رہی کہ پدم بھوشن اور پدم شری وغیرہ قومی ایوارڈ ہیں یا سر، خان بہادر، راؤ بہادر وغیرہ قسم کے خطابات ہیں یا صرف اعزازات اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب حکومت خود کوئی فیصلہ نہ کر سکی یہ چیزیں ہیں کیا تو حکومت نے اعلان کیا کہ کوئی صاحب ان اشیاء کو روزمرہ کے کاموں میں استعمال نہ کریں۔ اس اعلان کے بعد کافی اسٹیشنری اور نیم پلیٹ وغیرہ ضائع کرنی پڑی اور متعلقہ لوگوں کو مالی اور روحانی نقصان برداشت کرنا پڑا)

ہندوستان میں، اب تو ایل ایل ڈی کی ڈگری بھی مشکل ہی سے کسی کو دی جاتی ہے۔ ورنہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جب بھی کسی یونیورسٹی کے ارباب اقتدار کو معلوم ہوتا کہ فلاں ریاست کے شہزادے یا راج کمار نے میٹرک تک تعلیم پائی ہے تو فوراً ایک خصوصی کانوکیشن کا انتظام کیا جاتا اور شہزادہ موصوف یا راجکمار مذکور کو ایل ایل ڈی کی ڈگری تحفے میں پیش کر دی جاتی۔ یہ ڈگری ان لوگوں کی خدمت میں بھی پیش کی جا سکتی تھی جن کے بارے میں یونیورسٹی کو یہ اطلاع ملی تھی کہ فلاں صاحب اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم نہیں پا سکے۔ (وہ تو اچھا ہوا کہ ان ڈگریوں کے دیئے

جانے پر ان لوگوں سے کوئی رسید نہیں طلب کی جاتی تھی ورنہ نہیں اپنا نشان ابہام لگانا پڑتا ۔ ریونیو اسٹامپ کے ۲۰ پیسے الگ دینے پڑتے)

ہندوستان کے شہروں کی تعریف سن سن کر ہمارا دل تو بہت چاہا کہ پورے ملک کی سیاحت پر نکل جائیں لیکن دلی کی سیاسی سرگرمیوں میں ہمارا دل بہت لگنے لگا ہے ۔ حالات چاہے کیسے ہی ہوں بیانات کافی اچھے چھپتے رہتے ہیں ۔ آج کل یہاں چیزوں کی قیمتیں کم کرنے کی تدابیر پر بہت غور ہو رہا ہے (غور ہو رہا ہے یا نہیں ہمیں ٹھیک سے معلوم نہیں ۔ لیکن شور ضرور ہو رہا ہے) وزیروں کے بیانات اور ایم پیوں کے اعلانات وقفے وقفے سے جاری ہوتے رہتے ہیں ۔ ایک صاحب نے کہا کہ چیزوں کے دام آئندہ تین مہینوں میں کم ہو جائیں گے ۔ دوسرے صاحب کی رائے ہے یہ چھ ماہ میں کم ہوں گے ، کسی ایم پی نے شاید یہ خوش خبری کہلا بھیجی ہے کہ دام ایک مہینہ میں کم ہو جائیں گے ، اس کے برخلاف عوام نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ چیزوں کے دام کم ہوں گے ہی نہیں ۔ جو کچھ بھی دام ہیں بس انہیں میں خوش رہو ——— ہندوستان میں گرانی کے خلاف مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں زیادہ جوش و خروش دکھائی پڑتا ہے ۔ ہم نے اخباروں میں عورتوں کے ایک جلوس کی تصویریں دیکھی ہیں ۔ یہاں کے مردوں کا خیال ہے کہ جو کچھ بھی گرانی یہاں دستیاب ہے وہ عورتوں ہی کی وجہ سے ہے (سر گرانی بھی) خود جلوس بھی اب کافی مہنگے پڑنے لگے ہیں ۔ ان پر کافی رقم خرچ ہو جاتی ہے ۔ ورنہ کہتے ہیں پہلے اتنے ہی خرچ میں اس سے زیادہ بڑے اور شاندار جلوس آسانی سے مہیا ہو جاتے تھے ۔

دلی کی سیاسی گرمیوں میں وہی لطف ہے جو گلابی جاڑوں میں ہوا کرتا ہے (یہ گلابی جاڑے سوائے ہندوستان کے اور کسی ملک یا برّ اعظم میں نہیں ہوا کرتے) گلابی جاڑوں کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ جاڑے ہوتے ہیں جن میں آدمی ٹھنڈے پانی سے نہاتا نہیں لیکن آئسکریم یا قلفی کھا سکتا ہے ۔ ان جاڑوں کو رومان وغیرہ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے (یہاں ہر چیز موسمی ہوتی ہے ۔ گلابی جاڑوں کے دنوں میں مردوں اور عورتوں کے تعلقات خواہ وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہوں ، خوشگوار ہو جاتے ہیں) قلفی بھی ہندوستان کی اسپیشل ڈش ہے ۔ (اسپیشل کو یہاں بیشل بولا جاتا ہے) ہوٹلوں میں تو خیر یہ قلفی ملتی ہی ہے لیکن وہ ٹھکانے کی نہیں ہوتی ۔ اصلی قلفی وہ قلفی ہوتی ہے جو مٹی کے گھڑوں میں سے برآمد ہوتی ہے ۔ قلفی بیچنے والے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہیں اور پھر مٹی کے گھڑے میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالتے ہیں یہی چیز قلفی ہوتی ہے کہتے ہیں ان قلفیوں میں بادام پستہ ہوتا ہے (یہاں اس قسم کی خبروں پر سبھی لوگ یقین کر لیتے ہیں) ممکن ہے ہوتا بھی ہو کیونکہ دونوں خشک میوے بہت سستے ہیں ۔ بادام سوا سو روپے کلو ہے اور پستہ ڈیڑھ سو روپے کلو ہے (بادام کا یہ دام تو ہونا چاہیے ۔ وہ زمانہ اور تھا جب یہ بے دام ہوا کرتا تھا ۔ پستہ بھی اسی حساب سے بکنا چاہیے آدمی اسی طرح پستا ہے) مٹکے سے برآمد ہونے والی یہ قلفی ٹھنڈی تو ہوتی ہے لیکن اتفاق سے میٹھی بھی ہوتی ہے ۔ دو قلفیاں کھانے سے حلق اتنا ہی خراب ہو جاتا ہے جتنا کہ ایک قلفی کھانے سے اس لئے لوگ ہمیشہ کم سے کم دو قلفیاں کھاتے ہیں ۔

دلی کی سیاست میں آج کل زبان کا مسئلہ بھی بہت زیادہ جگہ پا گیا ہے بلکہ جگہ جگہ یہی مسئلہ ہے ہندوستان میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں (اور لوگ مختلف زبانوں میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں) لیکن بد قسمتی سے اردو زیادہ بولی جاتی ہے اور مسئلہ بھی اسی زبان کا ہے ۔ اس زبان کی ترویج یہاں اس طریقے سے کی جا رہی ہے کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم

کے لیے اعلیٰ درجے کی قیمتی کتابیں چھاپی جا رہی ہیں (اردو میں بنیادی اور ابتدائی تعلیم کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے) ترویج ہمیشہ اعلیٰ سطح پر ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد آگئی۔ دلی میں ایک مقتدر شخصیت نے حال ہی میں یہ بیان جاری فرمایا کہ وہ اردو کے بالکل مخالف نہیں بلکہ وہ تو اردو کے بہت قریبی دوست ہیں اور اردو کے لئے سات مرتبہ جیل جا چکے ہیں۔ (کہتے ہیں اس بیان کو پڑھ کر یہاں لوگ بہت دیر تک بلکہ کئی دن تک ہنستے رہے۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے یہاں کا کچھ طریقہ ہی ایسا ہو گیا ہے۔ جب بھی ان صاحب کا کوئی بیان شائع ہوتا ہے لوگ ضرور ہنستے ہیں) اردو کے بارے میں ایک اور اونچے مقام سے یہ بیان جاری کیا گیا کہ اردو کو کسی بھی ریاست میں دوسری زبان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اب اس بیان پہ بھی لوگ برہم ہو جائیں تو اس کا کیا علاج! ممکن ہے اس اونچے مقام پر یہ سوچا جا رہا ہو کہ کہیں نہ اسے پہلی زبان کا درجہ دیا جائے (ہر بیان میں کچھ مضمرات ہوا کرتے ہیں ان پر بھی تو غور کرنا چاہیئے!)

ہندوستان میں ایک علاقہ ہے جسے یہاں لوگ ساؤتھ کہتے ہیں۔ ساؤتھ کو زبان کے معاملے میں یہ شکایت ہے کہ ہندی اس پر مسلط کی جا رہی ہے (یہاں ہر کسی کو کوئی نہ کوئی شکایت ضرور ہے) ہندی دو طرح کی ہوتی ہے آل انڈیا ریڈیو سے جو ہندی نشر کی جاتی ہے وہ صرف سننے کے لئے ہوتی ہے سمجھنے کے لیے نہیں ہوتی) ناردتھ میں یعنی ہم جس علاقے میں آج کل رہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ایک ذمہ دار رکن کونسل کو انگریزی میں لکھا ہوا ایک چیک دیا گیا تو انھوں نے فرمایا یہ کسی انگریز کی اولاد کا دیا ہوا چیک ہے۔

(یہاں بات بات پر والدین کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے)

کچھ دانشوروں کو اس معاملے میں یہ شکایت ہے کہ انگریزی کا ستیاناس مارا جا رہا ہے۔ دانشوروں کی اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب اقتدار نے حال ہی میں یہ طے کیا کہ ڈاکٹروں کو انگریزی پڑھتے رہنا چاہیئے۔ ورنہ اب تک ان کی رائے یہ تھی اگر ڈاکٹر انگریزی زبان پڑھتے رہے تو ڈاکٹری کب پڑھیں گے

ہندوستان میں بہرحال اب یہ طے ہو گیا ہے کہ کسی شخص کو ایک زبان بھی صحیح بولنی آئے یا نہ آئے کم سے کم چار زبانیں غلط بولنی آنی چاہیئے۔

(باقی آئندہ)

رضا نقوی واہی

ایک چادر کو ترستی رہی تربت میری

ایک دن سیر پہ مائل تھی طبیعت میری / جانبِ پٹنہ سٹی[۱] لے چلی وحشت میری

بے ارادہ قدم اُٹھتے تھے، ٹھہر جاتے تھے / محوِ نظارۂ ادبار تھی حیرت میری

قلبِ آبادی سے جب ایک گلی میں پہنچا / بڑھ گئی اور، اُداسی سے رفاقت میری

چند ٹوٹے ہوئے گھر، اُن سے پرے، ایک کھنڈر / دیکھتے ہی ہوئی بے کیف طبیعت میری

ایسی ویرانی کا منظر تھا عیاذاً باللہ / کہ تکدر کی ہوئی نذر، سیاحت میری

وہ گھٹن تھی کہ قدم مُڑ گئے گھر کی جانب / متحمل نہ ہوئی سیر کی حسرت میری

گوشِ تخیل سے ٹکرائی، یکایک یہ صدا / جانے والے، اِدھر آ، دیکھ تو حالت میری

شادؔ کی روح مخاطب ہے مسافر تجھ سے / اِس کھنڈر میں ہے پڑی دیکھ وہ تربت میری

شادؔ منزل تھی اِسی خطۂ ویراں میں کبھی / تادمِ مرگ رہی جس میں سکونت میری

اسی خطہ میں ہوئی پرورشِ علم و ادب / اِسی مٹی میں ہے پیوست ریاضت میری

اِسی چوکھٹ پہ جھکے مہر و مہ و کاہکشاں / نور افشاں اسی در سے تھی بصیرت میری

اِسی ڈیوڑھی پہ کبھی "معتقدِ شادؔ"[۲] آیا / پھیلی کشمیر سے تا ڈھاکہ جو شہرت میری

جانور خانے میں تبدیل ہوا اب وہی گھر / شہر نے تیرے ادا کی یہی قیمت میری

"کیوں میں عالم میں لئے دیدۂ بینا آیا"[۳] / اب تو خود آپ سے اپنی ہے شکایت میری

حق بجانب تھی، یہ آواز، جھکا شرم سے سر / دفعتاً آئی مگر کام ظرافت میری

میں نے کی عرض کہ غافل نہیں پٹنہ والے / آپ کی یاد میں ہے آج ہی دعوت میری

شاہ مشتاق[۴] کے تکیہ پہ ہجومِ شعراء / گا کے کورس میں غزل دیگا شہادت میری

آئی آواز، کہ ہاں کھاؤ پیو جشن مناؤ / اور کس طرح سے تم کرتے بھی خدمت میری

حیف اُس شہر پہ جب نصف صدی سے اب تک
"ایک چادر کو ترستی رہی تربت میری"

---

۱ شہر پٹنہ کا قدیم حصہ جہاں شادؔ عظیم آبادی کا مکان شادؔ منزل واقع تھا ۲ سائلؔ دہلوی، داماد داغؔ، شادؔ عظیم آبادی سے جب ملنے آئے تو ایک غزل پڑھی جس کا ایک مصرع تھا ع سائلؔ آیا نہ کہو معتقدِ شادؔ آیا ۳ شادؔ کی ایک مشہور غزل کا مصرع۔

۴۔ شاہ مشتاق احمد، سکریٹری بہار اردو اکیڈمی

فکشنری

(جو فکشن اور ڈکشنری کا مرکب ہے)

بھارت چند کھنہ

ڈیڈی۔ والدین میں مرد (بشمول اُردو بولنے والے مردوں کے) "ڈیڈی" کہلاتے ہیں، مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر ایسا مرد والد ہو۔

نقصان کی تلافی۔ جو لوگ نقصان کی تلافی کے لیے قانونی چارہ جوئی کرتے ہیں ان کی تلافی نقصان سے ہوتی ہے۔

ڈانس۔ موسیقی کی تال پر ٹھمکے لگا لینا اور لگاتے رکھنا۔ ــــ موسیقی کی تال پر ــــ تال سے بے نیاز ہو کر اُچھلنا کودنا۔ ایسی ورزش جو تکلیف دہ اور صبر آزما ہو۔

ڈارون۔ ایک محقق، جس کو انسان کے ارتقا کے ابتدائی نقطۂ خیال انسانوں کے خاندان کے افراد اور ان کے آباء اجداد کی تصاویر دیکھنے سے پیدا ہوا۔

بیٹی، جس کے والد کو یہ خوف ہوتا ہے کہ سب نوجوان اس کو بیاہنا چاہتے ہیں اور ماں کو اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کوئی بھی نوجوان اس کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ ــ اگر ماں اپنی بیٹی سے دس سال کم عمر کی نظر آئے تو وہ مطمئن رہتی ہے۔

دن کا آغاز۔ بعض گھروں میں سورج کے طلوع ہونے سے ہوتا ہے اور بعض میں بچوں کے طلوع ہونے سے۔

چھٹی کا دن۔ چھٹی کا دن اکثر و بیشتر اس دن کے بعد واقع ہوتا ہے جس دن آپ نے چھٹی لی ہو۔

ماں کا دن۔ امریکہ میں سال میں ایک دن "ماں کا دن" کہہ کر منایا جاتا ہے، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ لوگ اب بھی اپنی ماؤں سے محبت کرتے ہیں ــ سال میں ایک دن کے لیے!

دن کی روشنی۔ غالباً یہی ایک چیز ہے جس کو فی زمانہ بچایا جا سکتا ہے ــــ اور اس کو بچانے کا بہترین طریقہ اسکا استعمال ہے۔

قدر و قیمت۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی بیویوں کی قدر و قیمت ان کے شوہروں کی نظر میں بڑھ جاتی ہے ــ وقت اور کپڑوں کے بلوں کی وجہ سے۔

موت۔ اس دنیا میں دو چیزیں یقینی ہیں ــ موت اور ٹیکس! مگر موت ہر مالیہ سال کے طلوع کے ساتھ بد سے بدتر نہیں ہوتی۔

حکومت کے قرضے۔ جب ہم حکومت کے قرضوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی ادائیگی آنے والی نسل ہی کرپائے گی ــــ اور یہی وجہ ہے کہ بچے پیدا ہوتے ہی رونا شروع کر دیتے ہیں!

ڈگری۔ ایسا شخص جس نے کوئی ڈگری حاصل کر رکھی ہو اور اگر اس کی جیب میں آٹھ آنے ہوں تو وہ یقیناً ایک پیالے کی پیالی خرید سکتا ہے۔ ــــ کسی شخص کے پاس کتنی ہی ڈگریاں کیوں نہ ہوں، وہ تھرما میٹر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

دانتوں کا معالج۔ جو صرف دانت، پورا دانت اور دانت کے سوائے اور کچھ نہیں اکھاڑتا۔

—— جو ہاتھ اور منہ کی کمائی کھاتا ہے۔

وہ واحد انسان جو کسی عورت کو منہ بند رکھنے کا حکم دیتا ہے اور اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔

گہرائی۔ بلندی کو الٹا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے۔

جلد کی بیماری۔ اعلیٰ ترین شعبہ ڈاکٹری جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ تو مریض مرتا ہے اور نہ بیماری جاتی ہے گو علاج جاری رہتا ہے۔

فرار۔ غریب آدمی کا طلاق۔

خواہش۔ اس کا قتل عام ہر نئے بجٹ کے اعلان کے ساتھ ہوتا ہے۔

نفرت۔ عورت تعریفوں کے پُلوں کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ بشرطیکہ ایسے پُل کسی اور عورت کی توصیف میں باندھے جا رہے ہوں۔

فروغ۔ کوئی بھی عورت صحیح معنوں میں کسی مرد کو بے وقوف نہیں بناتی بلکہ اس کو اس بات کا موقع دیتی ہے کہ اس کی بنیادی اور ازلی خصلتوں کو فروغ حاصل ہو۔

ہیرا۔ کوئلے کا ٹکڑا، جو صبر سے اپنی جگہ پڑا رہا۔

—— عورت کی کامیابی کا ایک زینہ

—— ایک ایسی شے جس کی دمک سے عورت کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور اسکو تحفہ دینے والے شخص کی خامیاں اور برائیاں نظر نہیں آتیں۔

—— ہیرا یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہر چمک دار چیز سونا نہیں ہوتی۔

—— ہیرے کی سختی سے بھی زیادہ سخت وہ مشکل ہوتی ہے جو اس کی ادائیگی میں حائل ہوتی ہے۔

ڈائمنڈ جوبلی۔ اس دن کے منانے کا نام ہے جس دن شادی میں دی گئی ہیرے کی انگوٹھی کی آخری قسط ادا کر دی جاتی ہے۔

پوتڑیاں (DIAPERS) بدلے جانے والے (SEAT COVERS) سیٹ کورز جن کو بار بار اور بار بار بدلا جاتا ہے۔

آمر۔ وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہر ایک کی کوئی بھی چیز حاصل کر سکتا ہے۔

—— جس کو دوسرے ملکوں کے ساتھ غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

ڈکشنری۔ بیوی کی طرح لفظ اول اور لفظ آخر اسی کا ہوتا ہے۔

پرہیزی غذا۔ کھاؤ، پیو اور موج اڑاؤ، کیونکہ نہ معلوم کب تم کو پرہیزی غذا کھانی پڑ جائے۔

—— وزن کم کرنے کے لیے پرہیزی غذا کا استعمال آپ کی قوت ارادی اور کمر کے ناپ کیلئے صبر آزما ثابت ہوتا ہے۔ اور اکثر ہوتا یہ ہے قوت ارادی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے مگر کمر کا ناپ کم نہیں ہوتا۔

—— سب سے بہتر اور موثر پرہیزی غذا وہ ہے جس میں غذا ترک کر کے صرف امید پر جینے کی کوشش کی جائے۔

مختلف۔ سب خاوند یکساں ہوتے ہیں مگر ان کی صورتیں جدا ہوتی ہیں۔

مشکلیں۔ کسی بھی مشکل سے نکلنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُسے حل کرو۔

—— زندگی اور فلموں کی زندگی میں صرف اتنا فرق ہے کہ زندگی کی مشکلیں شادی ہونے پر شروع ہوتی ہیں۔

وقار۔ ایک چیز جس کی حفاظت الکوحل سے نہیں کی جا سکتی۔

چاہ زنخداں۔ بہت سے مرد جو چاہ زنخداں کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں۔

حدود۔ لمبائی۔ چوڑائی۔ موٹائی اور اخراجات

حکمت عملی۔ ملک کے لیے جھوٹ بولنا

—— ایسا فن جس کے عمل سے آپ کی خواہش مد مقابل کی مرضی سے پوری کرائی جاتی ہے۔

—— اپنے دوستوں [illegible] لازمی [illegible]

عاتق شاہ

گھر کی مرغی

گھر کی مرغی ہمیشہ بدمزہ ہوتی ہے!

چاہے کتنے ہی اہتمام سے کیوں نہ پکوائی جائے۔ اور کتنے ہی بڑے باورچی کی خدمات کیوں نہ حاصل کی جائیں صرف ایک آنچ کی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ کبھی تو سالن سیٹا سیٹا محسوس ہوگا۔ اور کبھی یوں محسوس ہوگا جیسے نمک بہت ڈال دیا گیا ہے۔ اور جہاں یہ دونوں چیزیں برابر ہوں وہاں کسی اور شئے کی کمی یا زیادتی کا احساس ہوگا۔ اور کھاتے ہوئے کوفت ہوگی۔ لیکن یہی مرغی اگر پڑوس میں پکی ہے اور سالن واقعی کھارا یا سیٹا ہوگیا ہے تو بھی بڑے مزہ دار معلوم ہوگی۔ کیونکہ ہانڈی کے بدل جانے سے ذائقہ ہی نہیں بدلتا بلکہ مقام کی تبدیلی سے بھی مزہ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس لیے گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ اور پرایا پیر کی مرغی ——

ذہین اور سمجھ دار لوگ کبھی گھر کی مرغی کو ذبح نہیں کرتے۔ ہمیشہ دوسروں کی مرغیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اور جب بھی مرغی کھانے کو جی چاہے تو اپنے کسی دوست کے یہاں یا کسی رشتہ دار کے گھر چلے جاتے ہیں۔ اور دل کھول کر مرغی کی تعریف کرتے ہیں۔ اس پر میزبان بھی خوش ہوتا ہے اور مہمان بھی۔ مفت میں کسی بے چاری مرغی کے گلے پر چھری پھر جاتی ہے!

مرغی کھانا بعض کی ہابی ہوتا ہے۔ اور بعض کو صرف مرغی پالنے کا شوق رہتا ہے۔ اور یہ دونوں شوق اپنے اپنے انتہا پسندانہ رویّے کی وجہ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے کھانے والا کبھی مرغی پالتا نہیں اور پالنے والا کبھی مرغی کھاتا نہیں۔ بلکہ اس تصور سے مرغی کو چھونا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ لہٰذا مرغی رکھتے ہوئے بھی مرغی اس کی محرومی بن جاتی ہے!

مرغی کھانے اور مرغی پالنے پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ دونوں فعل اپنے محدود دائرۂ عمل میں ہابی کی تعریف میں آتے ہیں لیکن مرغیاں پالنا تیسری ترقی یافتہ دنیا کی طرف اٹھتا ہوا ایک مثبت قدم ہے۔ اس نفع بخش کاروبار کو شروع کرنے سے پہلے لوگ اپنا یا اپنی بیویوں کا ہاتھ جوتشی کو دکھاتے ہیں۔ اور کسی مبارک دن اور تاریخ اس قومی کام کو شروع کرتے ہیں جسے سائنس کی زبان میں "پولٹری فارم" کہا جاتا ہے۔

لیکن اس کاروبار میں ہر کوئی سرخرو نہیں ہوتا۔ جن کے ستارے اونچے ہوتے ہیں انہیں یہ کاروبار راس آتا ہے

ورنہ اکثر حضرات تھک ہار کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور دنیا کو کبھی اپنی صورت نہیں دکھاتے!

عقلمند آدمی سرکار سے قرض لے کر پولٹری فارم کھولتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ جلد سے جلد اس کا دیوالیہ نکال دے۔ بے وقوف اپنی رفیقۂ حیات کے زیور بیچ کر اپنا منہ کالا کرتا ہے اور ان دونوں کے بیچ میں ایک شخص اور ہوتا ہے جسے اردو میں حصہ دار اور انگریزی میں پارٹنر کہتے ہیں۔ یہ تھوڑا سا سرمایہ اصل میں شامل کر کے مالک کے ساتھ برابر مقابل کی کرسی پر شان سے بیٹھ جاتا ہے۔ اور سگریٹ کا دھواں پھونکتے ہوئے یا پان چباتے ہوئے مالکانہ حق حاصل کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں مُلّاؤں میں مُرغی مُردار ہو جاتی ہے۔!

اور بچے ہوئے انڈے محلے والے اپنا حق سمجھ کر بانٹ لیتے ہیں!

مرغیاں قسم قسم کی ہوتی ہیں۔ اونچی پوری۔ دُبلی پتلی۔ موٹی تازی۔ بونی بونی۔ کالی سفید حسین اور بدصورت۔ لیکن سب سے اچھی مرغی وہ سمجھی جاتی ہے جو انڈا دیتی ہے۔ اس کی ذات اور صورت کو کوئی نہیں دیکھتا۔ اور نہ اس کے کردار پر کسی کی نظر ہوتی ہے!

شریف مرغیاں اس کرۂ ارض کے ہر خطہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی اور غیر شریف مرغیوں کی پہچان یہ ہے کہ شریف مرغیاں دن بھر اڑوس پڑوس اور محلے کے گھروں میں گھومتی پھرتی ہیں اور جب انڈا دینے کا وقت آتا ہے تو وہ بھاگی بھاگی اپنے گھر چلی آتی ہیں اور چلا چلا کر پورے گھر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں اور پھر بڑے اطمینان سے اپنے ڈربے میں انڈہ دیتی ہیں۔ اس کے برعکس غیر شریف مرغیاں دن بھر اپنے گھر میں رہتی ہیں، اپنے آقا کی فراہم کی ہوئی غذا کھاتی ہیں۔ اور بلی کی طرح دبے پاؤں چپکے سے جا کر پڑوس کو نوازتی ہیں۔ اور بے چارے صاحب خانہ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کی پیٹھ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔!

بے وفائی کی ایسی مثالیں زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ اس لئے اس پر کسی کو کوفت کھانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ البتہ اس سے سبق حاصل کر کے لوگوں کو چاہیئے کہ توبہ واستغفار پڑھیں۔ یہ عبرت کا مقام ہے اس کے بعد صدق دل کے ساتھ خود کو خدا سے رجوع کریں!

ہائے ہائے ——— قیامت کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ آثار شروع ہو چکے ہیں۔
دیکھئے مرغیاں بغیر مرغ کے انڈے دے رہی ہیں!
اور مرغ گلی کوچوں اور کوڑا کرکٹ کے آس پاس گھوم رہے ہیں!!
اور بچے بغیر ماں کی آغوش کے انڈوں میں سے برآمد ہو رہے ہیں!
اور اب کوئی مرغی کُڑک نہیں ہوتی!
اگر ہوتی ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ ہر ایک چہرے پہ تازگی نظر آتی ہے۔ تھکاوٹ کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ جسم اور چال سے کوئی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ بوڑھی بھی جوان نظر آتی ہے اور جوان بھی جوان۔ اس عالم میں ان دونوں میں فرق کرنا ممکن نہیں۔!

اور مرغوں میں اتنا سلیقہ نہیں ہوتا کہ حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکے!

نوٹ۔ ہوشیار اور معاملہ شناس مرغ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے انھیں بُرا نہیں ماننا چاہیئے [illegible]

اگر نہیں ہوتا۔ یہاں عام بات ہو رہی تھی

آج بھی مرغ پالنا شرافت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں چونکہ شرافتیں زیادہ تھیں اور شرفا ہر محلے اور گلی کوچے میں دستیاب ہوتے تھے۔ اس لیے وہ مرغ پالتے تھے یا مرغ لڑاتے تھے۔ لیکن ان دونوں کے کردار کا یہ عالم تھا کہ وہ کبھی کسی مرغی پر بری نظر نہیں ڈالتے تھے اور نہ اپنے مکان میں کسی مرغی کو گھسنے دیتے تھے۔ ان کی ساری توجہ مرغوں کے ساتھ تھیں۔ ان کا جینا مرنا، غرض زندگی کا ہر کاروبار اس سے عبارت تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی حکومتیں ان کی شرافتوں سے متاثر ہوکر ان کے نام وظائف جاری کرتی تھیں۔ اور یہ دنیا داری کے جھمیلوں سے بے نیاز ہوکر مرغوں کو لڑانے کی نئی نئی تکنک پر غور کیا کرتے اور باقاعدہ منصوبے اور پروگرام کے تحت لڑائی کا اعلان کرتے!

پانی پت کی لڑائی کس نے دیکھی ہے جس کا حوالہ دیا جائے۔ لیکن مرغوں کی لڑائی سب نے دیکھی ہے۔ یہ صرف مرغوں کی لڑائی نہیں ہوتی تھی بلکہ دو "انسانوں" دو خاندانوں اور دو قبیلوں کے درمیان ہوتی۔ اور اسے دیکھنے کے لیے سارا شہر امڈ پڑتا جیتنے والے کے وارے نیارے ہوتے اور ہارنے والا پھر اپنے مرغ کو کھلا پلا کر دوسری لڑائی کے لیے تیار کرتا تاکہ شکست کا بدلہ لیا جا سکے۔ اگر مفتوح اس بیچ میں اللہ کو پیارا ہو جاتا تو اس کے فرزند ارجمند پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ اپنے مرحوم باپ کی شکست کو فتح میں بدل دے۔ اس کی روح کو خوش کرے۔ ایصال ثواب کا یہی ایک طریقہ تھا!

جس گھر میں اچھا توانا اور بہادر مرغ ہوتا وہ صرف صاحب خانہ کی ناک نہیں بلکہ محلے کی ناک اور شرفا کی آبرو سمجھا جاتا تھا!

ہمارے ملک جنت نشان میں اب بھی مرغ لڑائے جاتے ہیں میدان جنگ میں لڑنے والے ان بہادر سپاہیوں کو اصیل مرغ کہا جاتا ہے۔ یہ اونچے پورے اور توانا ہوتے ہیں۔ لڑائی کے وقت ان کے پاؤں کے بڑھے ہوئے ناخنوں پر چاندی کی پتلی پتلی پٹیاں منڈھ دی جاتی ہیں تاکہ وہ دشمن کو لہو لہان کر سکیں نکیلی چونچ تیز اور زہر میں بجھے ہوئے تیر کا کام کرتی ہے۔ ان کے علاوہ جو باقی بچ جاتے ہیں وہ اصیل نہیں ہوتے۔ صرف مرغ ہوتے ہیں جن کا کام صرف بانگ دینا ہوتا ہے۔ اور ڈرائنگ روموں میں خوش گوار تعلقات پیدا کرنا۔ ان سے پکائی ہوئی نہاری بڑے مزہ کی چیز ہوتی ہے۔ اور یہ برصغیر کی ایک اہم ڈش ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج کل مرغ کے نام سے مرغیوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ لیکن کیا مجال جو کوئی یہ پہچان لے کہ یہ بھری بھری صحت مند ٹانگ مرغ کی ہے یا مرغی کی!

مرغ اپنے حلقہ اثر میں تاج والا بادشاہ ہوتا ہے۔ جہاں جائے اس کی قدر ہوتی ہے۔ پہلے کے زمانے میں کہا جاتا ہے کہ ایک مرغ کی آواز پر درجنوں مرغیاں لبیک کہتی ہوئی دوڑی دوڑی آتی تھیں۔ لیکن ——

لیکن آج ایک مرغی کی ہلکی سی آواز پر درجنوں مرغ دوڑ کر قریب آتے ہیں اور رقص کرنے لگتے ہیں!

کٹ —— کٹ!

ککڑ کوں —— کوں —— ککڑ کوں —— کوں!!

اب تو سنا ہے کہ مغربی ممالک میں مرغیاں بانگ دینے لگی ہیں۔ اور اپنے ملک میں بانگ دینا بھول گئے ہیں نتیجہ ظاہر ہے۔ توبہ واستغفار کیجئے اور صدق دل کے ساتھ خدا سے رجوع کیجئے!!

ویسے بغیر بانگ کے بھی صبح برابر ہو رہی ہے!!

مُرارجی بھائی

(دکنی زبان میں)

حمایت اللہ

مُرارجی بھئی تمیں لنگڑے سپئی

ہاتھ میں چُڑیاں پہنو ناچو تھئی تھئی
مُرارجی بھئی تمیں لنگڑے سپئی

ناک پو اُنگلی رکھ کو بولو جی دوئی
مُرارجی بھئی تمیں لنگڑے سپئی

چرن سنگھ چچّا لگا تیں پوپئی
مُرارجی بھئی تمیں لنگڑے سپئی

بڑا میز سمجھا تو نکلے تپئی
مُرارجی بھئی تمیں لنگڑے سپئی

ایک ناری پو حملہ تھُو تھُو تھُو
بڑائیں اِتّا سا مَسلہ تھُو تھُو تھُو
ایک عورت سے بُدلہ تھُو تھُو تھُو

کیا وہ پورس کا قِصّہ یاد نئیں ہے
وہ سکندر کا بدلا یاد نئیں ہے
کون تھی اپنی اِندرا یاد نئیں ہے

اپنی کرنی کے بُدلے پھینچ ملتے
تمیں پیر میں سو پھل بھی پھینچ ملتے
رَاوَنا کو ہنومان پھینچ ملتے

اپنے عہدے کا پاس تو ہونا تھا
تمیں تھک گئیں ذرا اب سونا تھا
بڑے ہیں تم بڑا دل ہونا تھا

مسیح انجم

دسترخوان کے شیر + شعر

آزادی کے بعد ملک میں ایک ایسی ہوا چلی کہ سماجی، ثقافتی اور تہذیبی قدریں بڑی تیزی سے بدل گئیں۔ روایات بدلے۔ لوگوں کے قول و فعل کا بھروسہ نہ رہا۔ نازنینوں کی زُلفیں چھوٹی ہو گئیں۔ نوجوانوں نے خط بڑھا لیے۔ کاکل بڑھے۔ زلفیں بڑھیں۔ گیسو بڑھے مگر دل بہت تنگ ہو گئے۔ معدوں میں بلا کی وسعت آ گئی۔ نتیجتاً دسترخوان کے آداب و قواعد بُری طرح متاثر ہوئے خاص طور پر نان ویجیٹیرین دسترخوان بڑا متاثر ہوا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو مرغِ مسلّم و دو گوشتہ بریانی اور مکمل لوازمات پر مشتمل "چوکیوں والی" ایک ضیافت کا اہتمام کر کے خود ہی دیکھ لیجئے کہ ہمارے نوجوان، شیروں کی طرح اپنی اپنی چوکیوں کے حدود میں کس طرح ادھم مچاتے ہیں؟ ابھی آپ ادھر ہاتھ دھو کر چوکی کے پاس بیٹھنے بھی نہ پاتے کہ اُدھر آپ کے حصّے کی بوٹی دسترخوان کے شیر کا لقمہ بن جاتی ہے۔ ادھر آپ تھوڑی سی روا داری برتنے میں مصروف ہو جاتے ہیں تو اُدھر آپ کے حصّہ کا مرغ آپ کو داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔ آپ دسترخوان کے شیر پر دانت پیستے رہ جاتے ہیں مگر وہ اپنی داڑھ چلانے میں مگن رہتا ہے۔ بھلا اب دسترخوان کے شیروں کو یہ کون سمجھائے کہ بھئی دسترخوان کے بھی کچھ آداب و قواعد ہوتے ہیں۔ آداب و قواعد کی بات تو دور کی رہی۔ وہ تو دسترخوان پر پہنچنے سے پہلے مطلع کے طور پر ہاتھ دھو لینے کو بھی ایک جھنجھٹ تصور کرتے ہیں بلکہ اکثر تو مقطع اور مطلع ایک ساتھ کہہ لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض تو دور اندیشی کے تقاضے کے طور پر گھر پر ہی مطلع کہہ لیتے ہیں اور پھر دعوت کھانے کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ انھیں اس بات کی قطعی پرواہ نہیں رہتی کہ راستہ میں ان کا "مطلع" کتنا گرد آلود ہو گیا تھا۔ آخر ماضی میں بھی تو دسترخوان کے شیر ہوا کرتے تھے لیکن ماضی، ماضی تھا اور حال ـــ ؟

ماضی میں دسترخوان "پہلے آپ" سے شروع ہوتا تھا۔ اب "پہلے میں" سے شروع ہوتا ہے۔ اور اکثر "تُو تُو میں میں" بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر میزبان ذرا اَرذل قسم کا ہو تو لوازمات میں

گھونسوں کو بھی شامل کر دیتا ہے مگر یہ یاد رکھئے کہ گھونٹ کھانے والا دستر خوان کا شیر گردن جھکا کر یہی کہے گا " بچپن میں میری ماں بھی مجھے اسی طرح مار کر کھانا کھلاتی تھی!"

لیکن ماضی میں اگر کوئی دستر خوان کا شیر ڈٹ کر کھانے اور ادھم مچانے پر تل جاتا تھا تو میزبان کی بھی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی تھی اور وہ بھی کھلانے پر تل جاتا تھا۔ اس طرح ہر دو فریق "ہار" کو کرکٹ ٹسٹ میاچ کی طرح اپنے لیے ایک وقار کا مسئلہ بنا لیتے تھے یہاں تک کہ وہ دعوت "کھائیں تمام رات، کھلائیں تمام رات" میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ بالآخر میزبان اسپورٹس مین اسپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دستر خوان کے شیر کی پیٹھ تھپک کر یہ ڈکلیر کرتا:

"YOU ARE THE MAN OF THE MATCH!"

تب وہ دستر خوان کا شیر "MAN OF THE SERIES" کا ٹائٹل حاصل کرنے کے لئے سلسلہ وار کئی دعوتوں میں دستر خوان پر معرکے سر کرتا اور بکرے اور مرغوں کی "باقیات و صالحات" کے ڈھیر دستر خوانوں پر لگا دیتا۔ اور کئی دن تک پیچش کے مرض میں مبتلا رہتا۔

لیکن اب جو دعوتیں دی جاتی ہیں وہ لمیٹڈ اوورس (LIMITED OVERS) کی بنیاد پر دی جاتی ہیں۔ محدود مہمان یا محدود بن بلائے مہمان۔ محدود لوازمات اور محدود بوٹیاں اور بعض وقت تو بریانی کی پلیٹ میں بوٹیوں کی مقدار اس مد تک کم کر دی جاتی ہے کہ وہ "تلاش گمشدہ" کا اشتہار بن جاتی ہیں۔ اور بوٹی کو کھوجنے کے لئے ایک مہمان کو باضابطہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ "جو شخص بھی بوٹی کو تلاش کر کے لائے اُسے پچاس روپے نقد انعام"۔ ایسے موقع پر میزبان سے گوشت کے بارے میں دریافت کرنا بالکل فضول ہے۔ وہ مہمان پر اپنی دھاک جمانے کے لئے یہی جواب دے گا کہ "ساری بوٹیاں گھل گئی ہیں کیونکہ گوشت جو منگایا گیا تھا وہ "بغیر ہڈی" کا تھا۔

اگر دعوت شیر مال اور قورمہ کی ہو تو دستر خوان پر کٹوروں میں شوربا ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے گا۔ اس وقت بوٹی کو تلاش کرنے کے لئے ایک مہمان کو باضابطہ لنگوٹ لگا کر، ناک پکڑ کر شوربے میں غوطہ لگانے کی نوبت آتی ہے۔ یوں بھی اب کس کے پاس اتنا فالتو پیسہ پڑا ہوا ہے کہ وہ "کھائیں تمام رات اور کھلائیں تمام رات" والی دعوت کا اہتمام کر کے اپنے لئے ایک وقار کا مسئلہ بنا لے۔ اب "وقار والی دعوت" کا اہتمام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو بلاک مارکیٹنگ یا اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہوں۔

ہم نے مروت میں دستر خوان پہ ڈٹ کر کھانے اور ادھم مچانے والے نوجوان کو شیر سے تشبیہ دی ہے اور یہ بات شیر کے لئے عین توہین کے مترادف ہے۔ اگر شیر کو اس بات کا پتہ چل جائے تو وہ ہمارے خلاف عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر بیٹھے کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو وہ کسی جانور کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ تصورِ جاناں اور "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" میں معروف رہتا ہے۔

لیکن جہاں تک دستر خوان کے شیروں کا تعلق ہے وہ بڑے بے حیا و بے شرم ہوتے ہیں۔ انھیں "ہوکا" نام کی ایک بیماری مستقل لگی رہتی ہے جو دعوتوں کے سیزن میں بسا اوقات بزوں کو دیکھنے اور سونگھنے سے عود کر آتی ہے۔ جس کا خمیازہ ضیافت کرنے والوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کا واحد علاج اُبلے ہوئے موٹے چاول اور کچا کھٹا ہے۔ (مگر یہ واضح رہے کہ "کچا کھٹا" کسی شاعر کا تخلص نہیں ہے) اس علاج سے اگر مرض میں افاقہ نہ ہوا تو ہلدا ذمہ۔ گاؤں کی ہوشیار ساس اپنے چٹورے داماد کو اسی علاج سے راہ راست پر لاتی ہے۔ طب کی اصطلاح میں اس علاج کو "گھر کا علاج" یا "علاج

بالغذا" کہا جاتا ہے۔

اور جو لوگ دسترخوان کے شیروں کا علاج نہیں کر سکتے وہ انھیں دسترخوان کے "بلاوڑ" کہہ کر اپنے دل اور پیٹ کا غبار اتار لیتے ہیں۔ لفظ "بلاوڑ" میں بڑی بلاغت اور امیجری پوشیدہ ہے۔ "بلاوڑ" کہنے کے بعد ایک آدمی کو یہ اطمینان ہوجاتا ہے کہ واقعی اس نے بہت بڑی بات کہی ہے۔ اس کا صحیح لطف وہی شرفاء و دانشور اٹھا سکتے ہیں جو دسترخوان کے آداب و روایات کے چکّر میں پڑ کر دسترخوان کے بلاوڑوں کے ہاتھوں بڑی طرح ہزیمت اٹھا کر دعوت سے خالی پیٹ گھر لوٹ چکے ہوں۔ اس وقت ان کو چھیڑنا گویا بارود کے گودام کو دیا سلائی بتانا ہے۔

دسترخوان کے شیروں کے تذکرے کے بعد یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اُن اشعار کا بھی ذکر کیا جائے جو دسترخوانوں پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے دسترخوان کو آپ "اُردو دسترخوان" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن آج کل یہ "اُردو دسترخوان" اُردو میڈیم کے مدارس کی طرح اِکّا دکّا ہی نظر آنے لگے ہیں۔ کل ہم نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے چند دسترخوان کے شعر حاصل کریں لیکن بُری طرح ناکام رہے۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ "تم پتھر گٹی جاؤ۔ وہاں بہت سی دکانیں ہیں کسی ایک دکان پر جاکر دسترخوانوں سے مختلف شعر نوٹ کر لینا اگر شعر والے دسترخوان نہ ملیں تو فکر کی ضرورت نہیں۔ وہاں کی ہوٹلوں میں بہت سے شاعر مل جائیں گے ان سے بلا معاوضہ شعر لکھوا لینا۔

بات بڑی پسند آئی۔ میں پتھر گٹی گیا اور ایک دکاندار سے پوچھا "جناب! کیا آپ کے پاس دسترخوان ہیں؟"

دکاندار نے دریافت کیا "گھر کے لئے یا جہیز میں دینے؟"

میں کوئی جواب دیئے بغیر مسکرا کر رہ گیا اور مختلف دسترخوانوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ بڑی مشکل سے ایک دسترخوان ہاتھ لگا لیکن اس پر جو اُردو کا شعر تھا، وہ بہت ہی دھندلا گیا تھا میں نے دکاندار سے پوچھا "کیا آپ کے پاس اُردو اشعار کے لیٹیسٹ (LATEST) دسترخوان نہیں ہیں؟"

وہ کاروباری انداز میں بولا "جب اُردو کی کتابیں نہیں خریدی جاتیں تو پھر اُردو کے دسترخوان کون چھپوائے گا! اب تو میں "انگلش میڈیم" کے دسترخوان چھپوا رہا ہوں"

یہ سنتے ہی میں دکان سے باہر نکل آیا۔

اتنے میں میری نظر ایک لیڈر پر پڑی۔ وہ اپنی کار میں کہیں جا رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا کہ ان کے پاس اُردو کا ایک دسترخوان ہے۔ جب بھی وہ یہ دسترخوان بچھاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ الیکشن کے دن آگئے ہیں۔ وہ اُردو والوں کے ووٹ اسی دسترخوان کی مدد سے حاصل کرتے ہیں۔ جب وہ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو لڑانا چاہتے ہیں تو وہ ان کو اسی دسترخوان پر جمع کرتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے لومڑی کی چال چلی اور اُردو کی ترقی کے مسائل پر بحث کرنے کے لئے ادیبوں اور شاعروں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ شعراء خوش ہوئے۔ ادیبوں نے بغلیں بجائیں۔ مقررہ وقت پر دسترخوان بچھایا گیا بڑا شاعر، چھوٹا شاعر، متشاعر، صرف شاعر، ادیب اور ادیب نما سب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ کھانا لگائے جانے میں ابھی دیر تھی تو شعرائے کرام کلامِ دسترخوان سے دل بہلانے لگے۔ کوئی دسترخوان کے کسی مصرعے پر گرہ لگانے لگا تو کوئی دسترخوان کی زمین میں شعر موزوں کرنے لگا۔ اتفاق سے اس دسترخوان پر فارسی کا یہ شعر چھپا ہوا تھا ؎

شکر بجا آر کہ مہمان تو
روزیِ خود میخورد از خوان تو

ایک متشاعر نے روانی میں "شکر بجا آر کہ" کو "شکر بجا آمد"

پھر اس طرح پڑھا جس طرح ہنسٹ پل کے پاس اُردو کے بعض ریسرچ اسکالر "کلمۂ طیبہ" کو "کلمہ طبیبہ" پڑھ کر ریسرچ کرنے لگتے ہیں کہ کلمہ کہاں لکھا ہوا ہے۔ لفظ "تشکر" سنتے ہی دسترخوان پر اُونگھتے بیٹھے ہوئے نقّاد کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے فوراً شاعر سے سوال کیا کہ "اس شعر میں "تو" ہونا چاہیئے یا "تُست"؟"

شاعر بولا "تُو!"

نقّاد نے ڈانٹا "خبردار! زبان سنبھال کر بات کرو!"

شاعر نے گھبرا کر کہا "مجھے فارسی نہیں آتی!"

اس اطلاع پر نقاد نے شکریہ ادا کیا اور پھر دسترخوان پر چھپے ہوئے ایک اُردو شعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"تو پھر یہ شعر پڑھو!"

شاعر کی اَنا فوراً جاگ پڑی۔ وہ بولا "میں نہیں پڑھتا آخر آپ کون ہوتے ہیں پڑھوانے والے؟"

نقاد نے کسی قدر گمبھیر آواز میں کہا "نہیں آپ کو پڑھنا ہی پڑے گا۔ میں نقاد ہوں۔"

یہ سنتے ہی شاعر کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے رُکتے رُکتے اور سنبھلتے سنبھلتے وہ شعر پڑھا ؎

عزیز اب ... فکر ... کیوں ہو مجھ کو ... مہمانوں کے کھانے کی
خدا نے ... رزق ... بھیجا ... ہے مجھے اور میرے ... مہمان کو

نقاد نے پوچھا "بتاؤ یہ شعر کس کا ہے؟"

شاعر بولا: "فکر تونسوی کا ہے۔"

نقاد نے کہا "فکر تونسوی کو شاعری چھوڑے کئی سال گزر گئے۔"

"تو پھر عزیز کا ہے!" شاعر نے کہا

نقّاد نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"تو پھر مہماں کا ہے!" شاعر زچ ہو کر بولا۔

نقاد نے کہا "یہ بھی غلط!"

بڑے غور و فکر کے بعد شاعر نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا "تو پھر خدا کا ہونا چاہیئے۔"

نقاد نے سمجھایا "تخلص کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ تخلص والے لفظ پر چمچے کی علامت (ـــ) ہوتی ہے!"

شاعر نے دسترخوان پر چھپی ہوئی چمچے کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "علامت یہاں ہے اور شعر وہاں ہے وہ روایتی شاعری ہے اور یہ علامتی شاعری ـــ چمچہ، پلیٹ، کٹورا"

یہ سنتے ہی نقّاد کو جلال آگیا، اس کے مُنہ سے کف بہنے لگا۔ تمام شاعر اور ادیب اُردو کی ترقی کے مسائل اور ڈنر کو بھول کر بحث میں اُلجھ گئے۔ ہاتھا پائی کی نوبت آنے کو تھی۔ اتنے میں ایک کہنہ مشق شاعر نے آگے بڑھ کر کہا:

"آپ لوگ خواہ مخواہ آپس میں اُلجھ گئے ہیں جس شعر کو آپ لوگوں نے وقار کا مسئلہ بنالیا ہے، وہ "بحر" اور "بحث" سے خارج ہے!"

اس ہڑبونگ کا فائدہ اُٹھا کر عین اسی وقت لیڈر کے سکریٹری نے سارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ کہتے ہوئے دسترخوان سے خارج کردیا کہ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نقّاد کوئی "ایجنٹ" تھا۔ کونسا ایجنٹ تھا، خدا ہی جانے!!!

■■

ظفر چکدیوی

غزل

بیوی سے بھی ہے کھٹ پٹ لاحول ولا قوۃ ہم بھی ہیں بڑے نٹ کھٹ لاحول ولا قوۃ
اغیار کو ملتی ہے جی بھر کے چینی تاڑی اور ہم کو فقط تلچھٹ لاحول ولا قوۃ
کچھ بھی نہ ملا مجھ کو سسرے کی تجوری سے کیوں شادی ہوئی گولٹ لاحول ولا قوۃ
ہم سامنے رہ کر بھی دیدار نہ کر پائے بس تکتے رہے گھونگھٹ لاحول ولا قوۃ
گرگٹ کی طرح ہر دم وہ رنگ بدلتے ہیں ہر لمحہ نئی کروٹ لاحول ولا قوۃ
جو پودے گلابوں کے جانِ چمنستان تھے سوکھے تو ہوئے کرکٹ لاحول ولا قوۃ
میرج میں بھی عجلت کی اس اُلّو کے پٹھے نے ڈائیورس بھی دی چٹ پٹ لاحول ولا قوۃ
جب شرم ہٹی ان کی مرغے نے اذاں دے دی پھر ہو گیا سب چوپٹ لاحول ولا قوۃ
انگڑائی انھوں نے لی اور ضبط کے سب تکمے یاں ٹوٹ گئے پھٹ پھٹ لاحول ولا قوۃ
اک طالب کو تم بھی آئے تھے ریہرسل کو مے پی کے گئے غٹ غٹ لاحول ولا قوۃ

وہ میرے دلِ دل پہ آئے تو ظفر لیکن
میں سن نہ سکا آہٹ لاحول ولا قوۃ

اسرار جامعی

بچے کی دُعا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے سیاست میری زندگی قاب کے چمچوں کی ہو صورت میری
چٹپٹی بات مری گرم مسالہ ہو جائے خواہ جنتا کا مرے دم سے دوالہ ہو جائے
زندگی ہو مری سودائی کی صورت یارب! ہو مجھے کرسی نشینوں سے محبت یارب!
رہوں آزاد نہ ہو قید مقامی یارب دل بدلنا ہو مرا شغل دوامی یارب!
چاپلوسی کے ہنر میں مجھے یکتا کر دے جو بھی ہو مدِ مقابل اُسے رسوا کر دے
اتنی تاثیر خوشامد میں عطا کر مولا کہ ہمیشہ رہے قبضے میں منسٹر مولا!
چڑھتے سورج کا ہو قسمت میں پجاری بننا مجھ کو منظور نہیں "شل تجاری" بننا
روغنِ قاز کی مالش کا سلیقہ آ جائے دام میں پھانستے رہنے کا طریقہ آ جائے
مرے فتنوں سے ہر اک گھر کو اکھاڑا کر دے غیر تو غیر ہیں اپنوں کا کباڑا کر دے

مگر اللہ پٹائی سے بچانا مجھ کو
جوتا چپل نہ مقدر میں ہو کھانا مجھ کو
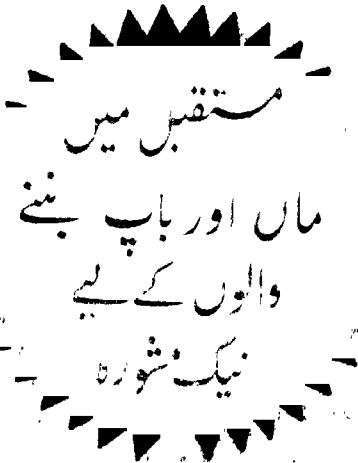
پہلا
جلدی نہیں
دوسرا
ابھی نہیں
تیسرا
کبھی نہیں
مستقبل میں
ماں اور باپ بننے
والوں کے لیے
نیک مشورہ
اپنے نزدیکی فیملی پلاننگ سینٹر، پرائمری ہیلتھ سینٹر
یا گرام سواستھ سہایک سے جو آپ کو ضروری
صلاح اور ساز و سامان فراہم کرسکتے ہیں
آج ہی رابطہ قائم کیجیے
جنوری 1979ء فیملی پلاننگ مہینہ ہے
davp/78/422

فضل جاوید

آج کل ہلمٹ ایک آسمانی آفت کی طرح ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ بعض جگہوں پر تو یہ سروں پر مسلط ہو چکا ہے۔
ہلمٹ دراصل اس فولادی خود کو کہتے ہیں جسے سر پر پہننے کے بعد اپنے آپ پر کسی اجنبی دنیا کی مخلوق ہونے کا گمان ہو جائے
ایسا معلوم ہو کہ ہم زمین پر نہیں بلکہ خلاؤں میں پرواز کر رہے ہوں۔ یا پھر چاند یا مریخ کی زمین پر دوڑ رہے ہوں۔
کاتب حضرات اپنی شوخیٔ طبع کو بروئے کار لا کر ایک ہلکی سی جنبشِ قلم سے ہلمٹ کا ناطہ شیکسپیر سے جوڑ دیتے ہیں۔
ایک کارٹونسٹ خدوخال کی کسی نمایاں چیز کو نشانہ بنا کر اس سے کارٹون کی تخلیق کرتا ہے۔ لیکن سر پر ہلمٹ سوار ہونے
کے بعد کسی اور نمایاں چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اچھا بھلا انسان خاصہ مضحکہ خیز لگنے لگتا ہے۔
اگر ہلمٹ پہننا خود اختیاری بات ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ کیونکہ اگر خود ہی مضحکہ خیز بن جانے کو دل چاہے تو کسی کو بھلا کیا
اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں تو زبردستی کا معاملہ ہے اسے قانون کے زور سے سروں پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ ہر ریاست میں آج
کل اس کے چرچے ہیں لیکن بعض ریاستوں میں اس پر سختی سے عمل ہو رہا ہے۔ یعنی موٹر سائیکلسٹ یا اسکوٹر چلانے والے کے
سر پر اس فولادی خود کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے اس کے پہننے کے بعد صرف زرہ بکتر کی کمی رہ جاتی ہے۔ اور آدمی خواہ مخواہ اپنے آپ کو
مغلِ اعظم سمجھنے لگتا ہے
کچھ عرصہ قبل ہمیں حیدرآباد آنا پڑا۔ دوست کی اسکوٹر پر جانا تھا اسٹارٹ لے ہی رہے تھے کہ دوست موصوف نے وارننگ دی کہ
ہلمٹ سر پر چڑھا لیں ورنہ پچاس روپے تک جرمانہ ہو سکتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس مجبوری کو اپنے سر پر چڑھایا۔ ایسا لگا کہ ہم
بوجھ سے دبے جا رہے ہیں چاہے وہ نفسیاتی بوجھ ہی کیوں نہ ہو۔
حیدرآباد یوں بھی ایک گرم شہر ہے۔ اگر کسی شمالی ہند کے باشندے سے حیدرآباد کے موسم کی تعریف کرنے کو کہا جائے تو
وہ اس طرح کرے گا۔ پہلے چھ مہینے گرمی اور بعد کے چھ مہینے سخت گرمی ——— ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ پہلے چھ مہینے والی گرمی کا موسم
... کا اتنا برا حال ہوا کہ ہم پسینے میں شرابور تھے اور اسکوٹر سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ہمارے

دوست جو پیچھے کی سیٹ پر براجمان تھے وہی پیچھے کا حال زور زور سے سنا رہے تھے کیونکہ پیچھے کی آواز ہمیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد احساس ہوا کہ ہماری کنپٹی کی رگیں تنتی جا رہی ہیں اور سر میں ایک نامعلوم سا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ شاید ہمارے دوست قیافہ شناس بھی تھے۔ شکایت سے پہلے ہی سمجھانا شروع کر دیا کہ جب تک اسکوٹر سڑک پر دوڑتی رہے ہلمٹ سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں کیونکہ پولیس ہر جگہ تعینات ہے۔

ہم بیچارگی کے عالم میں ان چند خوش نصیبوں کی قسمت پر رشک کرتے رہے جو پولیس کے سامنے سے بغیر ہلمٹ کے گزر رہے تھے۔ ہمارے اس جائزے کو بھانپ کر پھر دوست موصوف نے وضاحت کی کہ ہلمٹ پہنے بغیر جو لوگ گزرے ہیں وہ شہر کے نامی گرامی پہلوان ہیں۔ ان کا چالان کر کے پولیس خود مصیبت میں گرفتار ہونا پسند نہیں کرے گی۔ اب کیا تھا۔ ہم تھے' ہمارا سر تھا' اور سر پر ہلمٹ سوار ــــــ ہمیں زندگی میں پہلی بار اپنے نامی گرامی پہلوان نہ بننے پر بہت افسوس ہوا۔

واپسی میں اپنے دوست سے درخواست کی کہ اب وہ ڈرائیو کریں لیکن وہ بھی بلا کے شاطر تھے۔ اتنی آسانی سے اس مصیبت کو اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے۔ جب ہمارے سر کی رگیں منجمد سی ہوتی محسوس ہوئیں تو ہم نے چالان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہلمٹ اتار لیا۔ نتیجہ میں اگلے ہی چوراہے پر ٹرافک کانسٹیبل نے روک لیا۔ بڑے رعب سے پوچھا "ہلمٹ کہاں ہے؟" ڈرتے ڈرتے ہم نے اپنے دوست کی طرف اشارہ کیا جس کے ہاتھوں میں وہ موجود تھا۔ اس نے غصہ میں دانت پیستے ہوئے کہا "یہ کوئی ہاتھوں میں پہننے کی چیز ہے؟ اور آگے بڑھ کر ہلمٹ کو زور سے ہمارے سر پہ چڑھا دیا۔ ہمارا غصے کے مارے بُرا حال تھا۔ لیکن غریب الوطن تھے اور پھر اس خوانخواہ کانسٹیبل کا رعب بھی دل پر بیٹھ چکا تھا۔ خاموشی سے گردن پر بیلٹ کسا اور چل پڑے۔ گھر پہنچنے تک ہم نیم جاں ہو چکے تھے ہلمٹ جب سر سے اترا تو یقین کیجئے ایسا لگا کہ ناکردہ گناہوں کی ایک لمبی سزا یکلخت ختم ہو چکی ہے اور ہم دوزخ سے نکال کر جنت کے پر فضا اور نکہت دنور کے ماحول میں پہنچا دیئے گئے ہیں۔ اس دن ہلمٹ کے اس انگریزی لفظ کے تلفظ میں تھوڑا سا تصرف کرنے کو دل چاہا ــــــ Hell - mate یعنی جہنم کا ساتھی ــ

اب ہلمٹ سے ہمیں ایک قسم کی دل چسپی سی ہونے لگی تھی۔ کسی کو پہنے ہوئے دیکھتے تو اس کے دل کے اندر جھانک کر اس کے جذبات دیکھنے کو دل کرتا۔

ایک صاحب ہوٹل سے نکل کر ہلمٹ سر پر فٹ کیا ہی چاہتے تھے کہ ہم تیز قدمی سے ان کی طرف بڑھے۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ رک گئے۔ ہم نے سلام علیک کیا مزاج پرسی کی اور نہ ہی تعارف کے بکھیڑوں میں پڑے کہ مبادا ان رسمی تبادلات میں دل کی بات دل ہی میں رہ جائے اور فوراً ان سے دریافت کیا۔

"جناب! اس ہلمٹ کو پہن کر آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟"

اُن صاحب نے پہلے تو غور سے ہماری طرف دیکھا۔ ان کو اس طرح دیکھ کر ہمارے ذہن کے انجانے گوشے سے کسی مینڈھے کا تصوّر اُبھرا ــــــ انھوں نے ناک اور جبڑے پھلا کر اپنی گونج دار آواز میں کہا۔

"جی چاہتا ہے کہ جو سامنے آئے اس کے سر پر خوب ڈھیچے لگاؤں۔"

یہ کہتے ہوئے ہمیں اسی طرح غور سے دیکھتے ہوئے اسکوٹر اسٹارٹ کی اور چلے گئے ——— اور غیر ارادی طور پر ہمارے ہاتھ اپنے سر کی طرف اُٹھ گئے۔ اپنے آپ میں ہنستے ہوئے سوچنے لگے کہ ہلمٹ کا یہ نفسیاتی بوجھ ایک ہمارے ہی سر پر سوار نہیں۔ کچھ دیر بعد ہمت سے کام لے کر ایک اور صاحب کے قریب پہنچے۔ ان سے بھی وہی سوال کیا وہ شاید کچھ زیادہ ہی ستائے ہوئے لگ رہے تھے کہنے لگے "میاں اگر سر پر پہننے پر اکتفا ہو تو صبر سے کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم پیدل چلیں تو سر سے اتار کر ہاتھوں پہ لئے لئے چلنا ایسا ہی ہے جیسے بیگم کی تانا شاہی کا شکار ہو کر بحالتِ مجبوری اپنے شیر خوار کو گود میں جھلاتے ہلکاتے چلے جا رہے ہیں"۔

دیکھئے یہ ہلمٹ کس کس کی انا کو کس حد تک مجروح کئے جا رہا ہے۔ یہ ایک اچھی خاصی بلائے ناگہانی ہے جو سر پر سوار ہو گئی ہے۔

ایک صاحب کو ہلمٹ سے یہ شکایت ہے کہ جب سے وہ اسے زیبِ سر کئے ہوئے ہیں کئی اچھے دوستوں سے بدظن ہو چکے ہیں۔ جس دوست کی طرف ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے ہیں وہ بے اعتنائی سے دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے۔ ایک عبرتناک واقعہ بھی انھوں نے سنایا۔ وقت مقررہ پر وہ اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہے تھے۔ اس دن ان کی اسکوٹر خراب تھی تو دوست کی مانگ لائے تھے سر پر ہلمٹ سوار تھا۔ محبوبہ کے قریب پہنچ کر مسکرائے لیکن اُدھر سے قہر آلود نگاہیں جواب بن گئیں۔ لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن بات بنتی نظر نہیں آئی۔ وہ اس وقت تک پچھلی سیٹ پر بیٹھنے سے انکار کرتی رہیں جب تک کہ انھوں نے ہلمٹ اتار کر تصدیق نہیں کر دی کہ وہ وہی ہیں اور کوئی نہیں ———

عام طور پر کھیتوں میں چرند پرند کو ڈرانے اور بھگانے کے لئے بانس کا ایک کراس نما آدمی بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں جس کی گردن میں ایک بڑا گھڑا اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ ایک سنگل پسلی والے دھان پان قسم کے ایک صاحب لونا جیسی نازک گاڑی پر سوار ٹروں ٹروں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ان کی لمبی پتلی گردن میں ایک بھاری ہلمٹ اٹکا ہوا تھا۔ ان صاحب کو اس ہیئت میں دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کھیت والے scare crow کا تصور ذہن میں جاگا۔

بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے ہزار بار چالان ہو اب ہم ہلمٹ بغیر پہنے اسکوٹر پر اس خوب صورت شہر میں گھومیں گے۔ ایک شانِ بے نیازی سے صبح سے شام تک شہر کی شاہ راہوں پر گھومتے رہے۔ ٹرافک کانسٹیبل بھی شاید ہماری خطرناک قسم کی قوتِ ارادی کے آگے جھک گیا تھا کیونکہ ہمیں دیکھ کر وہ دوسری طرف گردن پھیر لیتا تھا۔ لیکن جوں ہی شام کے سائے گہرے ہو چلے اچانک معظم جاہی مارکٹ کے چوراہے پر ایک ٹرافک انسپکٹر نے ہمیں روک لیا۔ گاڑی کو سڑک کے کنارے لگوا کر اس نے بڑی نرمی سے پوچھا

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" اس کی اس خلافِ توقع حلیمی سے ہم بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ بھوپال سے حاضر ہوئے ہیں۔ اس نے لائیسنس کا پوچھا اب ہمارے ہکلانے کی باری تھی۔ بڑی مشکل سے جواب دیا کہ وہ تو ہماری اسکوٹر کی ڈکی میں بھول آئے ——— انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "خیر میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ بھوپال جا کر اپنی اسکوٹر کی ڈکی کھول کر اس میں سے لائیسنس نکال کر یہاں لائیے مگر یہ ضرور بتائیے کہ آپ اس طرح ننگے سر کیسے گھوم رہے ہیں؟" انسپکٹر کے اس نرم رویہ سے کچھ ہمت بندھی۔ ہم نے کہا "حضور! ہمارے بھوپال میں اسکوٹر پر اسی طرح ننگے سر گھومتے ہیں"۔ اس نے فوراً جواب دیا "لیکن ہمارے حیدرآباد میں یہ بے ادبی جرم ہے"۔ اور ہم یہیں کھاتے

ہوئے بولا۔ اب آپ پہلی فرصت میں ہلمٹ خرید لیجیے۔ اس کے بڑے فائدے ہیں۔ ابھی تک تو یہی کہا جاتا ہے کہ ایکسی ڈنٹ میں سر کے بل گرنے سے کھوپڑی محفوظ رہتی ہے۔ لیکن اگر کہیں پولس نے لاٹھی چارج کر دیا تو کم از کم آپ کا سر تو سلامت رہ سکتا ہے —— ایک بات اور ہے —— وہ مزید مسکراتے ہوئے بولا —— آپ کے سر کے بال اڑ چکے ہیں۔ تھوڑے بہت جو رہ گئے ہیں وہ بھی آمادہ بہ زوال ہیں۔ اگر آپ ہلمٹ پہننا شروع کر دیں تو آپ کا سر زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

انسپکٹر کے مزاح سے طبیعت اس قدر خوش ہوئی کہ ہم اس سے رخصت ہو کر سیدھے ایک قریبی ڈیلر کے پاس پہنچے اور اپنے لیے ہلمٹ خریدتے ہوئے سوچنے لگے کہ جس شہر کے ٹرافک انسپکٹر کی طبیعت میں اس قدر شستہ مزاح موجود ہو تو وہاں کے مزاح نگاروں کا عالم کیا ہوگا —— !!

نمکین غزل

بھوکے رہ کر بھی خدا دین غزل کہتے ہیں ۔۔۔ یعنی کوڑی کے ہیں جو تین غزل کہتے ہیں

جب بھی ہم پی کے او لیٹین غزل کہتے ہیں ۔۔۔ لہلہاتی ہوئی رنگین غزل کہتے ہیں

بانٹنی پڑتی ہے شاگردوں میں جب طرحی غزل ۔۔۔ کہہ کے اُستاد اناسین غزل کہتے ہیں

کام اردو کے اداروں کا نہ پوچھو یارو ۔۔۔ بیٹھ کر سارے اراکین غزل کہتے ہیں

جب سے ہڑتال پہ لٹکے ہیں سبھی کالج کے ۔۔۔ صدر شعبہ ہوں کہ ہوں ڈین غزل کہتے ہیں

طبع ناموزوں کے مارے ہوئے کچھ اہلِ سخن ۔۔۔ توڑ کر فن کے قوانین غزل کہتے ہیں

موسمِ گل میں مرے شہر کے اکثر شاعر ۔۔۔ سب سے سر جوڑ کے رنگین غزل کہتے ہیں

وہ فقط حسنِ ترنم سے چمک جاتے ہیں ۔۔۔ زندگی بھر میں جو دو تین غزل کہتے ہیں

چودھری رام لگن جی ہیں غضب کے شاعر ۔۔۔ بھینس کے آگے لیے بین غزل کہتے ہیں

غم کے ماروں کا یہی حال ہے اٹھتے سوتے ۔۔۔ درد میں ڈوب کے غمگین غزل کہتے ہیں

ہم تو بیوی سے پٹے جائیں کہ نکلیں گھر سے ۔۔۔ چاہے جتنی بھی ہو توہین غزل کہتے ہیں

جب سے کچھ آنے لگا ہے انھیں شعر گو جوہر
گھر میں بیٹھے ہوئے نمکین غزل کہتے ہیں

جوہر سیوانی

ڈاکٹر سید حامد حسین
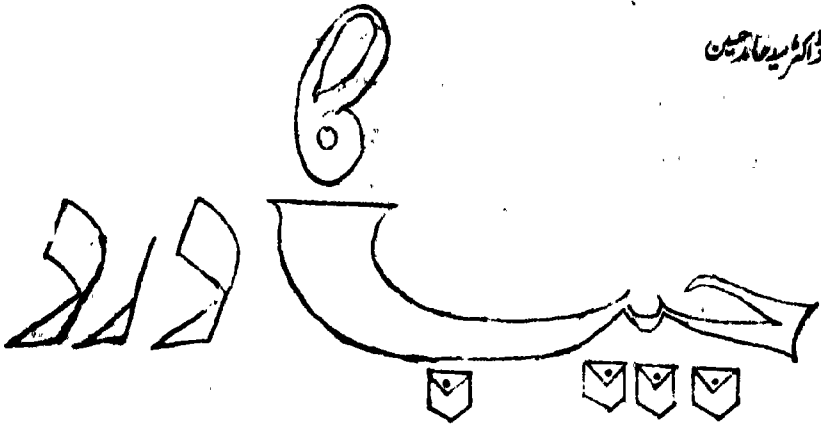
مجھے جیب کا درد ہے۔ جی چاہے تو اسے میری حماقت سمجھتے ہوئے ہنسئے بلکہ ضرور ہنسئے اور کہئے کہ پیٹ کا درد سنا ہے، دانت کا درد سنا ہے، ہاتھ پیر کا درد سنا ہے، سر کا درد سنا ہے۔ یہ جیب کا درد کیا بیہودگی ہے۔ بہرحال آپ بھی سن لیجئے وہ کہانی جسے دہراتے دہراتے میں تھک گیا ہوں۔ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے کہ جب میں راشن کی دوکان سے واپس آیا تو میری جوتی اور آخری قمیص کا دامن تار تار تھا۔ دفتر پہنچنے میں پہلے ہی ایک گھنٹے کی دیر ہو چکی تھی۔ جیسے تیسے بیوی نے کچھ ٹانکے لگا دیئے۔ دفتر پہنچا تو حسب معمول دروازے کے پاس کی میز پر دادا پیدا کاری کی منڈی لگائے بیٹھے تھے اور مہنگائی کے زمانے میں آمدنی بڑھانے والے سارے ہتھکنڈے بتا رہے تھے جو دو دن پہلے وہ مجھے سمجھا چکے تھے۔ یعنی کس طرح لوٹا مل گھاٹا والا دس دس پیسے گلو کے حساب سے کھیوں میں سے نکلی ہوئی مٹی واپس لے لیتا ہے۔ کیسے نیا شاد سوپ فیکٹری پانچ پیسے کے حساب سے سن لائٹ کے ریپر خرید لیتا ہے صاف لیبل والی دوا کی شیشیاں کیسے آنیٹ کیمسٹ والوں کے یہاں اچھے داموں بک جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کینٹین میں داخل ہوتے ہی دادا کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی ایسے چیخے جیسے دو دن پہلے میں ہی ان کی چھتری اٹھا کر بھاگا تھا۔ میں قریب کی ہی کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ دادا جھپٹ کر آئے اور بولے "بڑے بابو یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے، کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں نا"۔ میں نے انھیں بہترا سمجھایا کہ اب میری عمر کسی قسم کی ایسی ویسی بات کے قابل نہیں۔ لیکن وہ بار بار میرے حلیے، میرے بالوں، میرے کپڑوں پر اپنی ہمدردی کے غلاف چڑھائے جا رہے تھے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میری بتی قمیصیں دھوبی کے یہاں ایک ماہ سے پڑی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ صابن ملتا ہے اور نہ سوڈا تو پھر وہ کپڑے کیسے دھوئے۔ اور بلا دھلے کپڑے لوٹا دینا اس کی عزت کا سوال ہے۔

آخری قمیص پہ بھی تو اس کی یہ درگت ہوئی۔ دادا اس زور سے اُچھلے جیسے کینٹین والا بل لے کر آگیا ہو۔ بولے: "آپ بھلا اتنی سی بات پر پریشان ہو گئے۔ اس میں کونسی اُلجھن کی بات ہے۔ نئی قمیص لے لی ہوتی۔ دس روپے میں تو نئی سلی سلائی قمیص مِل جاتی ہے۔" اب چونکنے کی میری باری تھی میں نے دادا سے کہا آپ ایسے بے موقع مذاق نہ کیا کیجئے۔ دادا بولے: "بڑے بابو! آپ کو نہ اپنی خبر ہے، نہ دنیا کی۔ آپ کے ہی پڑوس میں جن سیوا بھنڈار کا نیا اسٹور کھلا ہے۔ میں تو وہاں سے کل ہی شام چار قمیص لایا ہوں، چالیس روپے میں۔ نہایت نفیس، بڑی ٹکاؤ"! مجھے یقین ہو گیا۔ دادا اس دور کے مسیحا ہیں۔ وہ نہ ہوں تو ایسے کتنے دکھ جان لیوا ہو سکتے ہیں۔

شام کو جب میں گھر پہنچا تو میری بغل میں دس روپے والی قمیص تھی۔ اور دوسرے دن جب اُٹھا تو طبیعت میں ایک عجیب بے نیازی تھی۔ آرام سے نہایا، کھانا کھایا۔ دفتر کی تیاری شروع کی، جوتے پہنے، سر میں تیل لگایا۔ بائیں طرف کے بالوں کی پٹی ہوشیاری سے بیچ سر میں جمائی تاکہ نکلتی ہوئی چاند کچھ چھپی رہے۔ اب روانگی باقی رہ گئی۔ کھیں سے فاؤنٹن پن برآمد کیا۔ دفتر کی کنجی میز پہ سے اٹھائی۔ تھیلا سے بس کے لئے پیسے لئے۔ دستی سنبھالی اور سگریٹ اور ماچس کی ڈبیاں بھی تو جائیں گی۔ لیکن ان سب چیزوں کو سمیٹ کر جب جیب میں رکھنا چاہا تو دل دھک سے رہ گیا۔ قمیص میں جیب نہ تھی۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ساری دنیا اچھل کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور جیب میں بیٹھنے کے لئے میرا منہ چڑھا رہی ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ساری کائنات میرے ساتھ کس طرح جائے گی اور ان کے بغیر دن بھر میرا گذارا کیوں کر ہوگا۔ وقت کم تھا۔ دماغ پہ زور ڈالا۔ قلم کو گریبان میں اٹکایا۔ کنجیاں ایک آستین میں رکھ کر آستین اوپر چڑھائی۔ دوسری آستین میں اسی طرح ماچس رکھ کر آستین اوپر چڑھائی۔ ناگاہ آئینے میں نظر پڑ گئی۔ آستینوں سے باہر نکلے ہوئے اپنے بازوؤں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کچھ صحت بن رہی ہے۔ خیال ہوا کہ گزشتہ رات سڑک کے نکڑ پہ میونسپل کی سینما گاڑی الاچھلے سے بھرے گوداموں منڈیوں اور غلے سے لدے ٹرکوں کی آمد و رفت کا سرکاری فلم دکھا رہا تھا۔ شاید اسی کی وجہ سے صحت پہ کچھ اثر پڑا ہو۔ لیکن ابھی بھی کئی چیزیں باقی تھیں۔ دستی ہم نے اپنے کالر میں الجھائی۔ پیسے مٹھی میں دبائے۔ لیکن سگریٹ کی ڈبیہ؟۔ ایک ہاتھ بس میں جھولنے کے لئے بھی تو خالی ہونا چاہئے۔ ایک ترکیب سوجھی۔ بائیں آستین اتاری ماچس اور سگریٹ کی ڈبیاں آستین کے اندر کلائی کے اوپر سرکائیں اور کلائی پہ کف کے اوپر کس کر گھڑی باندھ لی۔ چلئے یہ مہم تو سر ہوئی۔

بس میں حسبِ معمول ڈنڈا پکڑ کر لٹک جانا پڑا۔ کنڈکٹر نے ٹکٹ بڑھاتے ہوئے پیسے طلب کئے۔ ہم نے بے خیالی میں سیدھا ہاتھ چھوڑا الٹے ہاتھ سے سر کے اوپر بس کا ڈنڈا تھاما اور کنڈکٹر کے آگے پیسوں والی مٹھی کھول دی۔ اسی وقت بس کو دھکا لگا اور ہمارے بائیں ہاتھ کی آستین میں کچھ سرسراہٹ ہوئی اور سگریٹ اور ماچس کی ڈبیاں ایک کے پیچھے ایک روانہ ہو گئیں اور جس وقت وہ بغل کے قریب سے گذریں تو انہوں نے وہ گدگدی کی کہ میں بے قابو ہو کر سامنے والی خاتون سے جا ٹکرایا۔ یہ خاتون بھی میری طرح ڈنڈے سے لٹکی چھٹپٹا رہی تھیں۔ یہ اچانک ٹکر ان کی سمجھ میں نہ آئی اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے سینڈل کی ڈیڑھ انچ موٹی اور آدھا کلو وزنی ایڑی میرے پنجے پر جما دی۔ میں نے درد سے تلملا کر جو پیر کھینچا تو وہ سگریٹ اور ماچس کی ان ڈبیوں پر آپڑا۔ جو اس وقت تک بس کے فرش پر پہنچ چکی تھیں خاتون کی مرعوبی نے میری زبان کو دوسری معزز خواتین کی شان میں گستاخی سے روک دیا۔ لیکن آس پاس کھڑے مسافرین میں کھلبلی پیدا ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ خاتون کے قریب کے لئے بڑھے آرہے تھے۔ اسی کشمکش میں اگلے اسٹاپ پر اتر کر جب پیشانی کا پسینہ پونچھنا چاہا تو رومال ندارد تھا۔ بہرحال یہ خوشی تھی کہ ہماری قمیص سلامت ہے۔ اور ہمیں دادا پربیاری کی ہمدردیوں کا شکار نہ ہونا پڑے گا۔

شام کو جب ہم گھر لوٹے تو معلوم ہوا کہ ہم کسی رہزنی کا شکار ہو چکے ہیں۔ رومال، سگریٹ اور ماچس تو جاتے وقت ہی ہم سے رخصت ہو چکے تھے۔ دفتر سے روانہ ہوتے وقت ہم نے اپنے گمان کے مطابق کنجیاں اپنی جیب میں رکھ لی تھیں۔ لیکن اب وہ کنجیاں، گریبان

میں اب قلم کا صرف کیپ لگا ہوا تھا۔ باقی قلم کہاں جدائی کے لمحے کاٹ رہا ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ دس روپے کا نوٹ ہم بس کنڈکٹر کے حوالے کر چکے تھے۔ اور اس نے باقی پیسوں کی واپسی ٹکٹ پر درج کر دی تھی۔ مناسب جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ہم نے یہ ٹکٹ اپنے کان کے سوراخ میں پھنسا لیا تھا۔ جو پتہ نہیں بس کے کس جھٹکے میں کہاں گیا۔

گھر پہنچتے ہی ہماری بس ایک دھن تھی کہ کس طرح جلد سے جلد اسٹور پہنچیں اور قمیص بدل کر لائیں۔ ہمیں یاد آیا کہ ہماری شادی کا سوٹ کسی صندوق میں پڑا ہے۔ اگر وہ کہنیوں اور بیٹھک پر سے پھٹ گیا ہے تو کیا۔ اس میں جیبیں تو ہیں۔ جب ہم گھر سے نکلے تو ہم کو یہ اطمینان تھا کہ ہماری پرانی قمیص، کوٹ اور پتلون میں اب صرف ایک دو جیبیں نہیں بلکہ ہم پوری آٹھ جیبوں کے مالک تھے۔

اسٹور میں پچھلے دن کی طرح چہل پہل تھی۔ دروازے کے قریب ایک خاتون سفید ساڑی پر ایک نارنجی رنگ کا پلاسٹک کا پھول لگائے کھڑی تھیں "میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں ؟" انہوں نے بڑے پیشہ ورانہ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "میں نے کل ایک قمیص خریدی تھی ۔۔۔۔" میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے انہوں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : "شکایت کاؤنٹر پر جائیے"۔

شکایت کاؤنٹر پر ایک اور خاتون سفید ساڑی پر ہرا پھول لگائے بیٹھی تھیں۔ میں ان کے قریب پہنچا ہی تھا کہ وہ بولیں "کہو میں آئیے"۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا : "لیکن یہاں تو کوئی نہیں ہے"۔ انہوں نے کہا "آپ سے پہلے جو صاحب آئے تھے وہ اندر بیہوش ہیں"۔ میں نے ان کی جانب کچھ حیرت اور کچھ خوف سے دیکھا۔ انہوں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا : "آپ گھبرائیے نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ جب تک برابر والے کمرے میں ریکارڈ سنیئے"۔ میں گاہکوں کے ساتھ اس مثالی برتاؤ سے بہت متاثر ہوا۔ آنکھوں کو شکریے کے آنسوؤں سے تیار کئے۔ میں "پیش" لکھے دروازے کو ڈھکیلتا ہوا اندر جا پہنچا۔ سامنے کرسی پر چار فیٹ بائی چار فیٹ کی ایک ٹھوس خاتون رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے سفید ساڑی پر آسانی پھول لگا رکھا تھا۔ انہوں نے میری جانب ترس بھری بھویں اٹھا دیں۔ میں پتہ نہیں کیا سمجھ کر بول اٹھا ، "کیش کے علاوہ کوئی بھی لگا دیجئے" لیکن میری بات پوری ہونے سے قبل ہی وہ مشین پر پہلے سے لگے ریکارڈ کو شروع کر چکی تھیں۔ ریکارڈ کسی خاتون مقررہ کی آواز میں تھا :

"شکایات، شکایات، آج کل ہر طرف شکایات کا بازار گرم ہے۔ ہمیں شکایت کرنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ شکایت بیماری ہے۔ شکایت دبا ہے۔ شکایت بیرونی سرمایہ ہے۔ شکایت بیرونی مداخلت ہے۔ اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہمیں مخالفوں کے شکایتی ہتھکنڈوں سے دور رہنا چاہیئے۔ ہمیں ہمارے بیرونی دشمنوں کے بہکاوے میں نہ آکر شکایتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اگر ہم شکایت کی بجائے عمل کریں تو ہمارا ترقی کرتا ملک اور ترقی کر سکتا ہے۔ عمل شرط ہے۔ میدان عمل میں کمر کس کے آئیے۔ اگر ہر شخص پابندی سے روز ایک مچھر مارے تو ملک سے ملیریا فنا ہو سکتا ہے۔ اگر ہر شخص روز ایک چوہا مارے تو غذائی قلت دور ہو سکتی ہے۔ اگر ہر سپاہی نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لئے ہر ماہ ایک لڑکے کو مارے تو غنڈہ گردی دور ہو سکتی ہے۔ اگر ہر آدمی ایک ماہ تک خریداری بند کر دے تو قیمتیں بڑھنے سے رک سکتی ہیں۔ ملک میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سب امن ہے، سب چین ہے ۔۔۔۔" گراموفون کی سوئی اٹک چکی تھی۔ جوکر خاتون نے گراموفون بند کر دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔

میں دروازے سے باہر نکل آیا۔ ساتھ والے دروازے سے ایک اسٹریچر باہر لایا جا رہا تھا۔ وہ آدمی اب بھی بیہوش تھا۔ "آپ اندر جا سکتے ہیں"۔ سرخ پھول والی خاتون نے مجھ سے کہا۔ اندر ایک بڑی میز کے سامنے ایک کرسی پر ایک چھوٹی سفید ساڑی میں لپیٹ کر رکھ دی گئی تھی جس پر سرخ پھول لگا ہوا تھا۔ ساڑی کی تہوں میں کہیں سرسراہٹ ہوئی اور آواز آئی۔ "آپ کو کیا شکایت ہے ؟" میں نے کہا "شکایت نہیں درخواست ہے"۔ ساڑی کی تہوں میں سے تیز آواز آئی، "دونوں کا ایک مطلب ہے۔ الفاظ کے کھیل میں وقت مت ضائع کیجئے"!

"میری قمیص میں جیب نہیں لگائی گئی"

"ضرورت نہیں تھی"

"لیکن کیوں؟"

"اوپر کا حکم ہے"

"کتنے اوپر کا؟"

"بہت اوپر کا"

"کس وجہ سے؟"

"تاکہ جمع خوری کی روک تھام ہو سکے"

"کیسے؟"

"جتنی جیبیں ہوں گی اتنی ذخیرہ اندوزی ہوگی"

"لیکن میں تو اپنی جیبوں میں ضروری چیزیں رکھتا ہوں"

"یہ آپ کا وہم ہے"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"یہ اس وقت اس مسئلے پر بیٹھے ہوئے تھے اوپر سات کمیشنوں کی رائے ہے"

"کیا سرکار نے ہماری جیب کاٹنے کا کام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ یہ نہایت ٹھوس معاشی مسئلہ ہے" ساڑی تیز لہجے میں بولی۔

"لیکن ایک دس سنٹی میٹر مربع کی جیب لگانے میں کیا مشکل ہے؟" پھر ڈی کے ساتھ ساتھ ساڑی لرزتے ہوئے بولی: "ملک میں تیس کروڑ لوگ قمیصوں میں جیب لگاتے ہیں۔ ان کے پاس اوسطاً چار قمیصیں ہوتی ہیں۔ اس طرح ۱۲۰ کروڑ جیب درکار ہیں۔ ہر جیب میں دس سنٹی میٹر کپڑا لگتا ہے۔ یعنی ۱۲ سو کروڑ مربع سنٹی میٹر کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جیب کی سلائی کے لئے آدھے میٹر دھاگے کی ضرورت پڑتی ہے اس کا مطلب ہے کہ ......"

اسی وقت دروازہ کھلا اور خالی اسٹریچر اندر لا کر رکھ دیا گیا۔ میرے کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ ساڑی میں سے اتنے سو کروڑ روپے، اتنے لاکھ کروڑ، اتنے ہزار گھنٹے، اتنے کروڑ لٹر کی برابر آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے کرتے کی جیب نمبر ۲ سے رومال نکال کر پیشانی پر سے پسینہ پونچھا۔ عینک اتاری۔ اس کے شیشے صاف کئے۔ سر کو دو چار بار جھٹکا تاکہ کانوں کی جھنجھناہٹ ختم ہو۔ ایک لمحے کے لئے معلوم ہوا جیسے طوفان تھم گیا ہو۔ ہوا میں ہلتی ہوئی ساڑی کی جانب دیکھا۔ پھر آواز آئی۔

"دیکھئے اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ یہ بالکل ناممکن ہے۔"

پھر تھوڑا توقف ہوا۔ "مگر آپ بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ آپ کی کچھ مدد کرنا ہوگی؟" ساڑی میں سے ایک نحیف ہاتھ برآمد ہوا۔ ایک پرچے پر ڈاکٹر کے نسخے کی طرح کچھ لکھا اور میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ گرین کا آرڈر لے جائیے"

"ڈی کا آرڈر" غالباً وہی صاحب پر سفید ساڑی والی خاتون ہرا پھول لگائے بیٹھی تھیں۔ میں نے اپنی بچی کھچی ہمت کو سمیٹا

دان خاتون کے سامنے آکھڑا ہوا۔ انہوں نے ایک لمبا رجسٹر کھولا۔ پرچی پر کوئی نمبر لکھا "چالیس پیسے دیجئے"۔ ان کا ارشاد ہوا۔ میں نے جیب نمبر دو سے نکال کر ایک روپے کا ایک نوٹ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ نوٹ دیکھتے ہی "گرین کاونٹر" کی تھوڑی لٹک گئی اور بایاں ہاتھ ایک سمت میں اُٹھ گیا۔ میں نے سفید کھادی دیکھی کلائی پہ ودیسی گھڑی دیکھی اور چھوٹی انگلی پر سونے کی انگوٹھی دیکھی اور اس کے آگے ایک تختی پر آئی جس پر ریزگاری کے سلسلے میں بعض سنگین ہدایات درج تھیں۔

میں نے بیک وقت اپنے دونوں ہاتھ جیب نمبر ۴ اور جیب نمبر ۵ میں ڈال دیئے۔ ایک ہاتھ میں چونی آئی اور دوسرے میں ۱۵ پیسے میں نے ان کی میز پر رکھ دیئے۔ "قمیص لائیے" حکم ہوا۔ قمیص لے کر انہوں نے میز پر بچھا دی۔ کاونٹر کے نیچے ایک دراز کھولی۔ پہلے مہر لگانے کا پیڈ برآمد ہوا۔ پھر ایک بڑی سی مہر۔ مہر پر ترتیب کے ساتھ ٹھونک ٹھونک کر سیاہی لگائی اور پھر قمیص کے بائیں سینے پر مہر کر دبا دیا۔ مہر جب اٹھائی گئی تو میں نے دیکھا کہ قمیص پر بیگنی رنگ سے جیب کا ایک خاکہ بن چکا تھا۔

"یہ کیا ہے !؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی جیب"

"میری جیب !!" میں نے لڑکھڑاتی زبان سے دریافت کیا۔

"ہاں جیب کی آپ کے جسم کو ضرورت نہیں بلکہ صرف آپ کے دماغ کو اور اس لئے ...."

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ جب ہوش میں آیا تو اپنے گھر میں تھا۔ بیوی نے بتایا کہ لوگوں کو میرے کوٹ کی جیب کے کاغذات میں گھر کا پتہ مل گیا اور وہ لڑکے رکشا میں لاد کر مجھے گھر چھوڑ گئے تھے۔

اس دن سے میں چھٹی پر ہوں۔ ڈاکٹر میرا علاج کرنے سے اور ہسپتال مجھے داخل کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ مجھے گھر سے نکلنے میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اگر میری جیب میں میرا پتہ نہ ہوتا تو میرا کیا حشر ہوتا اور اگر جیب ہی نہ ہوتی تو.... ———— ♥

غزل

کوئی جھگڑا نہیں فساد نہیں — گھر کے رستے میں جائداد نہیں

سر پہ گنجوں کے بال آگ آئیں — ایسی کوئی بھی یاد کھاد نہیں

ناشر ہیں شعر پر بھی یہاں — واہ وا اور کوئی داد نہیں !

چھپ سکے پھر میں یہ غزل آئے — ہوگی پوری کبھی مراد نہیں !

کیا سفاہرت راج ہے یارو !

اک غزل بھی زبانی یاد نہیں

سراج نیلو +

قطعات

ابابیل لکھیم پوری

بولنے کی مشین ہے عورت
لیکن اس میں بریک نہیں ہوتا
چیز ہوتی یہ اور لاثانی
سائیلنسر جو فٹ کہیں ہوتا

مُسلماں تھی مگر ہندی پڑھی تھی
ہوا تحریر سے اس کی یہ ثابت
لکھا شوہر کو یہ القاب خط میں
رہو سر کے مُکٹ میرے سورکشِت

چپڑا افسر مویشی خانے کا
کون ہو تم میں آن ڈیوٹی ہوں
بوکھلاہٹ میں کہہ گیا مُنشی
مُنشی خانے کا میں مویشی ہوں

آپریشن کے بعد جب جاگا
پوچھا کیا ڈاکٹر میں اچھا ہوں
آئی آواز ڈاکٹر کیسا
میں تو اس قبر کا فرشتہ ہوں

غزل

غرارے میں نظر آئے گی اونٹ سی بیگم
کھلے گی قامتِ موزوں اگر ہو بل باٹم
مریضِ عشق کے بلغم میں خون آتا تھا
سُنا ہے آنے لگا اب تو خون میں بلغم
سر اپنا پیٹ کے تیشہ سے مرگیا فرہاد
تو دیکھیں آج بھی ہیں عاشقوں میں وہ دم خم
گریباں پھاڑ کے لیلیٰ یہ کہہ کے روتی تھی
اکیلی چھوڑ کے مجھ کو کہاں گیا بالم
کتاب ہاتھ میں بیٹے کی دیکھ کر خوش باپ
مگر وہ فلم کی پریوں کا تھا حسیں البم
خوشی مناؤ گرانی کا خاتمہ ہے قریب
قریب یعنی کوئی دس برس تو کم سے کم

جنھیں تھا ناز لیاقت پہ کیا کہوں ماہر
وہ دال کھا گئے جس وقت بھی لکھا بودم

عبدالکریم ماہر

متفرقات

شبیہہ عورتوں جیسی لباس مردانہ
سوال یہ ہے کہ مسٹر ہیں وہ کہ میڈم ہیں
سخنوروں سے کہو شعر خوانی بند کریں
پروگرام کے کچھ اور بھی تو ایٹم ہیں۔

اک روز کو روٹی نہ ملے مجھ کو گوارا
ناغہ نہ ہو راشن مرے کتّے کا خدارا

یوں دل شکستہ لوٹے راشن کی شاپ سے ہم
جیسے کہ گر پڑے ہوں بام بلند سے ہم

بیٹھے بٹھائے بس کا کرایہ بڑھا دیا!!
جنتا کو جان بوجھ کے بے بس بنا دیا!

دیکھے تو ذرا کوئی مری ہمت اعلا
دو بچوں کے ہوتے ہوئے دس کتّوں کو پالا

میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ یہ ناچیز ہیں کون
ہنس کے کہنے لگے ناچیز چھپے رستم ہیں

ناچیز حیدرآبادی
(اختر حسن)

حبیب ضیاء (ڈاکٹر)

آئی بلا کو ٹال تو ....

گذشتہ زمانے میں بارش کو خدا کی رحمت اور مہمان کو گھر کی برکت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب اس افلاسی دور میں اس کلیہ کو الٹ دینا پڑتا ہے۔ بارش بے وقت ہو کر تباہی لانے لگی ہے اور مہمان بے وقت آکر عذاب جان ثابت ہونے لگے ہیں۔ جب کوئی پہلی بار آنے کی ہمت کرے تو اسے الٹ پلٹ پتہ بتا کر آنے سے باز رکھا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو ہمارا گھر معلوم نہیں اور پہلی بار آنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں تو ہم انھیں اپنے گھر کا پتہ اس ڈراونے انداز میں سمجھاتے ہیں کہ وہ دوبارہ آنے کا نام نہیں لیتے۔
ابتدا میں ہم انتہائی سادگی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا گھر شہر سے زیادہ نہیں صرف سولہ میل دور ہے۔ بالآخر آنے کے بعد دو سڑکیں دو طرف جاتی ہیں۔ یہاں ذرا سی چوک ہو جائے اور دائیں کے بدلے بائیں طرف والی سڑک پہ چلے جائیں تو سیدھے بمبئی پہنچ جائینگے۔ دائیں طرف والی سڑک پہ بہت بڑی کالونی ہے۔ غفلت میں کالونی سے آگے نکل جائیں تو نہایت سنسان سڑک ملے گی۔ میلوں دور تک آبادی کا نام نہیں۔ اس سڑک پر آئے دن لوٹ مار اور ڈکیتی کے واقعات سننے میں آتے ہیں۔ اس تمہید کے سنتے سنتے پتہ پوچھنے والے کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور اپنی ہیبت چھپانے کے لیے دوسرے موضوع پہ بات کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جو لوگ کسی ضرورت پتہ لگا کر آ ہی جاتے ہیں انہیں مختلف طریقوں سے پریشان کر کے بھگایا جا سکتا ہے۔ صرف تھوڑی سی جرأت اور ہوشیاری درکار ہے۔
مہمان میکے کے ہوں تو دور کے سسرالی رشتہ داروں کی تصاویر کا البم بتانا شروع کر دیجیے اور اگر سسرال کی طرف سے کوئی نازل ہو جائے تو میکے کے البم کو بچنے کا حربہ بنائیے۔ غیر متعلق اور انجانی تصاویر کو مسلسل دو گھنٹے تک دیکھتے رہنے کی وجہ سے آنے والا بیزار ہو جائے گا۔ دوبارہ جب وہ آنے کا ارادہ کرے گا تو البم کی تصاویر اس کی نظروں کے سامنے آکر اسے روکیں گی اور آپ کے لیے گویا نیکی بن کر آڑے آئیں گی۔
معمولی غریب سے آتے، روتے ہوئے بچوں کے ٹیپ سنا دیجیے یہ نسخہ آزمودہ ہے۔ ایک بار ہمارے پاس کچھ مہمان آٹھ دن رہنے کا پروگرام بنا کر آئے تھے۔ موقع محل دیکھ کر ہم نے ان کے آتے ہی ٹیپ لگا دیا۔ اس ٹیپ کی وحشت زدہ

آوازوں سے ہمارے مہمان آٹھ دن کی بجائے آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہ رہ سکے۔ اس واقعہ کو ہوئے آٹھ سال گزر گئے۔ اب تک تو اللہ کا فضل ہے۔

بیرونی ممالک سے جو ٹیپ آتے ہیں ان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ان میں صرف بچوں کا رونا نہیں ہوتا بلکہ بڑے جو کمانے نکلتے ہیں وہ بھی سسکتی ہوئی بلکہ رلا دینے والی آواز میں اپنے تاثرات ٹیپ کر کے بھیجتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ٹیپ ہمارے پڑوس میں ہے۔ ہمیں جب بھی ضرورت ہوتی ہے یہ ٹیپ فراہم کر لیتے ہیں۔ اس ٹیپ میں ایک ایسے لڑکے کی آواز ہے جو حیدرآباد میں انتہائی غیر ذمہ دار، لاپرواہ اور باغی قسم کا تھا۔ سر پر ذمہ داریوں کا بوجھ جب بڑھ گیا تو اسے بھی کمانے کی فکر لاحق ہوئی۔ یہ لڑکا اب حیدرآباد کا نواب نہیں رہا بلکہ سعودی عرب میں سکہ ڈھالنے کی مشین بن گیا ہے۔ اپنے خون پسینے کی کمائی وہ ماہانہ بھیجتا ہے اور آٹھ دس ماہ میں ایک مرتبہ اپنے تاثرات بھی ٹیپ کر کے بھیجتا ہے تاکہ بے چین ماں اس کی آواز سن کر بقیہ دن جوں توں کر کے کاٹ دے۔ اس ٹیپ میں وہ بات کرتے کرتے جذبات سے بے قابو ہو کر رو دیتا ہے اور ٹیپ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ ٹیپ جب ہم نے مہمانوں کو سنایا تو وہ بھی بے اختیار رونے لگے۔ ان کا بھی اپنا ایک لڑکا تھا جو ایسے ہی حالات میں گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ جاتے ہی پہلے دس ہزار کی وہ رقم بھجوائے گا جو اس کے جانے کے سلسلہ میں قرض لی گئی تھی۔ اس کے بعد بہتوی خریدے گا اور پھر فریج اور ٹی وی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ موت وہاں شدت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ناگہانی بیماریوں نے اسے سنبھلنے نہ دیا۔ اس کے ماں باپ نے اسے لکھ بھیجا کہ کم از کم قرض ادا کرنے کے بعد مر جانا لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ ایسے گیا کہ ماں باپ نہ اس کا دیدار کر سکے نہ اس کی قبر پر پھول چڑھا سکے۔ کچھ دیر کے لئے ہم سخت پشیمان ہوئے کہ بلاوجہ آنے والوں کا دل دکھایا۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ ان لوگوں کے دل کے زخم اب بھی ہرے ہیں۔ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دیتے ہیں اور دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

بے وقت آنے والوں کا خاص خیال رکھئے۔ خصوصاً بغیر اطلاع کھانے کے وقت کوئی آجائے اور دوبارہ چولہے کے پاس جانے کا آپ کا موڈ نہ ہو تو اس صورت میں مہمان کے آتے ہی آدھی پیالی چائے اور کچھ بچا لیا میز پر لا کر رکھ دیجئے۔ اس وقت چائے کو دیکھ کر وہ اپنی آمد پر شرمندہ ہوتے ہوئے اپنی گھڑی پر نظر ڈالے گا۔ اور چائے پی کر اخبار پڑھنے لگے گا۔ ایسے وقت گھر کے افراد باری باری اندر جائیں اور کھانا کھا کر واپس آتے جائیں۔ اس عرصہ میں جو مہمان کے ساتھ بیٹھے ان کا کام یہ ہے کہ انتہائی میٹھی باتیں کر کے مہمان کی توجہ کھانے کی خوشبو کی طرف سے ہٹا دیں۔ آپ کے اس عمل سے وہ بہت متاثر ہوگا اور خاندان بھر میں آپ کی خوش اخلاقی کے گن گاتا پھرے گا۔

زیادہ تعداد میں اچانک دھاوا بولنے والے مہمان انتہائی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ چھٹی کا دن تھا ہم نے دوپہر کا کھانا بھی جلد تیار کر لیا۔ پکچر جانے کا پروگرام تھا۔ باورچی خانے سے نکل کر ہم منہ دھو کر انسان بننے والے ہی تھے کہ دفعتاً ہارن کی خون خشک کر دینے والی آواز سنائی دی۔ دیکھا کہ ایک گاڑی سے مختلف سائز کی مخلوق اتر رہی ہے۔ گھڑی کے کانٹے بارہ پر دیکھ کر ہمارے بھی بارہ بجنے لگے۔ کیونکہ اس قدر کم وقت میں بارہ آدمی کا کھانا تیار کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہم نے عجلت اور غصہ میں صرف ایک دو افراد کو سلام کر کے چولہے کا رخ کیا۔ ہمیں ادھر جاتا دیکھ کر صدر خاندان نے کہا "دیکھئے! آپ خواہ مخواہ چولہے کے پاس مت جائیے، ہم لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں"۔ ان کا یہ جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ ہم نے اسی کرے

میں جہاں وہ لوگ بیٹھے تھے، مختصر سا دستر خوان بچھا دیا اور یہ کہہ کر کھانا شروع کر دیا کہ آپ لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے ہمیں کھا لیتے ہیں۔ مہمان اُدھر ان کے بچوں کے بچے نظریں گاڑ گڑ گڑا نے لگے۔ ہمارے منہ سے بیں بھی کم زد دیتا جب سے ان لوگوں کی نظر لگی ہے ہمارا کھانا ہی چھوٹ گیا ہے۔ مالوں نے آ آ دسے کر کر کے ہم پھر اپنی جیبوں میں اتارے۔ لیکن نظر جو بیٹھ لگی بس بیٹھ ہی گئی۔

بدمزہ مشروبات سے تواضع کرنا بھی کسی کو دوبارہ آنے سے روکنے کا موثر ذریعہ ہے۔ ہم بہت کم کسی کے گھر جاتے ہیں۔ یہاں تک مہر کھانے کی وہ دعوتیں بھی چھوڑ دیتے ہیں جن کے لئے لوگ صبح سے بھوکے رہتے ہیں۔ البتہ پرسہ دینے کی رسم کو ہم ایک اہم فریضہ سمجھتے ہیں۔ وہ پرسہ کبھی نہیں بھول سکیں گے جس کے دینے کے بعد ہمیں انتہائی تلخ، بدبو بلکہ جلاب کے تیل کے مزے والا شربت پلایا گیا تھا۔ رشتہ کچھ ایسا تھا کہ اگر نہ پیتے تو خاندان بھر میں بداخلاق مشہور ہوتے۔ پینے کے بعد ہماری یہ حالت ہوئی کہ جینے کا شوق جاتا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم نے اپنے منہ کے مزے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا "یہ کاہے کا شربت تھا؟" اس پر میزبان صاحبہ خوشی سے جھول گئیں۔ ایک مجھولے کر وہ قریب میں رکھی گرد میں اٹی ہوئی بوتل تک پہنچ گئیں۔ ایک گلاس اور انھوں نے نیم گرم پانی میں تیار کیا۔ ایک ہاتھ سے ہماری گردن دبا اور دوسرے ہاتھ سے زبردستی گلاس ہمارے منہ سے لگاتی ہوئی بولیں۔ "یہ شربت ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر پینے والا اس کی ترکیب پوچھتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے دادا کے سسر صاحب کی ساری کتابیں ضائع ہو گئیں۔ اس شربت کی چار بوتلیں ہمارے حصے میں آئی تھیں۔ آدھی بوتل بچ گئی ہے آپ اسے اپنے ساتھ لیتی جائیے۔" اب یہ بوتل ہمارے پاس ہے۔ ہم نے اسے اپنی جان کے برابر رکھا ہے۔ ایک گلاس پانی میں صرف ایک قطرہ ٹپکا کر ہم لوگوں کو پلاتے ہیں۔ جن لوگوں نے زندگی میں صرف ایک بار یہ شربت چکھا ہے ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہیں۔

بعض لوگ مہمان کی آمد سے خوش تو نہیں ہوتے لیکن اخلاقاً کھانا کھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک جگہ ہم ایسے وقت گئے جب کہ کھانا ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ زبردستی ہمیں بھی کھانے کی میز پر گھسیٹا گیا۔ کٹورے میں دال اتنی تھی کہ اس پر جوشے بتن کا شبہ ہو رہا تھا۔ میزبان صاحبہ برابر اصرار کر رہی تھیں "لیجئے نا! آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہی ہیں۔" ہم نے دال لینے کی خاطر ہاتھ آگے بڑھایا تو کٹورے نے ہاتھ کو ڈراتے ہوئے کہا "خبردار! آگے نہ بڑھنا۔ ابھی شام کو بھی میز پر آنا ہے۔" یہ سن کر ہمارا ہاتھ سہم گیا اور اپنی جگہ واپس آ گیا۔ مجبوراً ہم نے کٹورے کو نوالہ بتا بتا کر کھانا پورا کیا۔

مہمان کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا بھی میزبان کا اخلاقی فریضہ ہے۔ مثلاً گوبھی ناپسند کرنے والے کو گوبھی ہی کھلانا چاہیے۔ جو کافی کی خوشبو سے دور بھاگتا ہے اُسے بار بار کافی پلائی جانی چاہیے۔ مسلسل اس نسخے کو آزمانے سے فائدہ یقینی ہے۔

اس کے علاوہ مہمان سے قرض مانگنا، مہمان کے بچوں سے پانی بھروانا، شریک زندگی سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لینا بھی مہمان کو بھگانے کے طریقوں میں سے چند موثر طریقے ہیں —

●●

نا قابل اشاعت مضامین
کسی صورت واپس نہیں کیے جائیں گے۔
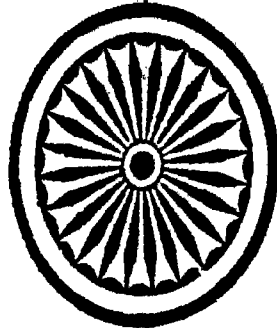
26 جنوری

مقدس سالگرہ ـــــ جس کی اہمیت میں تین گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

49 سال پہلے آج کے دن ہم نے مکمل سوراج حاصل کرنے کا عزم کیا۔

1950ء میں آج ہی کے دن ہم نے بھارت کو ایک جمہوریہ بنانے کا اعلان کیا اور اپنے لئے ایسا آئین بنایا جس میں انصاف، آزادی، مساوات اور بھائی چارے کے اعلیٰ نصب العین کو شامل کیا گیا تھا۔

دو سال پہلے لگ بھگ اسی دن ہم نے آئین میں دیئے گئے جمہوری نظام کی طرف دوبارہ سفر شروع کیا۔

اس سالگرہ کے مقدس موقعہ پر ـــــ

آیئے! ہم سب اپنی آزادی کی بحالی کے لیئے بھارت کے عوام کا شکریہ ادا کریں۔

آیئے! ہم ان لوگوں کے خوابوں کی تکمیل کے لئے کوشش کریں، جنہوں نے آزادی اور مساوات کے لئے اپنی جانیں قربان کیں۔

آیئے! ہم سب عہد لیں کہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف کے حصول کے لئے تیزی سے کوشش کریں گے۔

davp 78/408

دعوت میں ڈکار لیکر ایک بزرگ نے یہ شعر پڑھا۔

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

انہوں نے یہ شعر غلط جگہ پڑھ دیا تھا کیونکہ وہ دعوت فاتحہ کی نہیں بلکہ عقیقہ کی تھی۔ میزبان نے پریشان ہو کر کہا "آپ یہ کیا الفاظ نکال رہے ہیں" بزرگ بولے "پھر تم نے یہ فاتحہ میں پلاؤ کیوں بنایا۔ چہلم کی فاتحہ میں تو نان قورمہ ہی اچھا لگتا ہے۔ بشرطیکہ کہیں کا" پھر یہ راز کھلا کہ بزرگ غلط دعوت میں چلے آئے تھے۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ حلق تک کھا چکے تھے مگر تھے بڑے ڈھیٹ جیسے ہی انہیں غلطی بتائی گئی وہ بڑبڑانے لگے "توبہ بڑی غلطی ہو گئی۔ اسی لئے میں حیران تھا کہ چہلم کی فاتحہ میں پلاؤ کا مطلب؟ اب اصلی چہلم میں جاؤں بھی تو کیا کروں۔ ان کم بختوں نے تو حلق تک پلاؤ بھر دیا ہے توبہ توبہ ....!"

چہلم کا نان قورمہ بھی خوب چیز ہوتی ہے۔ نوجوان طبقہ تو مزے

لے لے کر کھاتا ہے لیکن بوڑھے بچے سہمے سے رہتے ہیں کہ بہت جلد لوگ خود اُن کی فاتحہ کا نان قورمہ ایسے ہی مزے لے لے کر کھائیں گے۔ بعض لوگ تو اس قدر غیر محتاط ہوتے ہیں کہ اچھے خاصے قریب المرگ بزرگوں سے کچھ اس قسم کی بات کہہ دیتے ہیں۔ فاتحہ میں تو قورمہ ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ کے پاس تو قورمہ خوب بنتا ہے صاحب! مزہ آجائے گا!

خیر یہ سب کچھ تو اُن کے بارے میں جو زندہ ہیں لیکن مرنے والے پر کیا گذرتی ہے ...... یہ معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بارے میں سوچنے سے موجودہ زندگی پر اثر پڑسکتا ہے۔

جوش نے کہا۔

کیا شیخ کی خشک زندگانی گذری — بے چارہ کی ایک شب نہ سہانی گذری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا گذرا — جنت کی دعاؤں میں جوانی گذری!

مگر بعض لوگ اس زندگی سے اچھی امید بھی رکھتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب نے ایک مرنے والے سے کہا: "میاں! مرنے کے بعد فلاں سوروں اور جہنم کے مل کر ان ملائکہ کو ان کا چہرہ سیاہ کر دے گا" تو جواب کرنے نے کہا "اچھا تو ہم کو ادھر کیا یہی کام ملے گا .... یہ پبلک کو سنانے کا جی!"

لیکن غلط امیدیں لگانے سے وہاں مایوسی بھی ہوسکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست بڑے کم ہمت واقع ہوئے تھے ساری جوانی شمیم نامی لڑکی پر عاشق رہے لیکن اس سے ملنے کی ہمت نہ کرسکے۔ آخر اس کی شادی ہوگئی۔ اطلاع ملتے ہی انہوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ کام کرنے سے پہلے کام خود ہی ختم ہوگیا چنانچہ آہ سرد کر بولے "اب تو شمیم رانی سے اس دنیا ہی میں ملن ہوگا۔ جب وہ خود ہی اٹھلاتی ہوئی آئے گی اور کھلکھلاتی ہوئی میرے گلے میں اپنی باہوں کا ہار ڈال دے گی۔

لو پیاری ہو گئی جیت بلم ہم تیسرے ہو گئے

یہ سن کر ایک دوسرے دوست نے منحوس زبان نکالی "ہوسکتا ہے وہ وہاں بھی یہ شعر پڑھ دے"

"پرائی ہوں پرائی میری آہ زو نہ کر"

بعض لوگ تو صاحب کمال کر جاتے ہیں کہ مرنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل موجودہ زندگی کے دکھوں سے بیزار ہوجاتے ہیں۔ اس دنیا کے دکھ توبہ توبہ۔ جیسے ریس کے گھوڑوں کی دھوکہ بازی قرض دینے والوں کی کرخنگی۔ سسرال کی پابندی چھوٹی سالی کا عشق اور بڑی سالی کا جہیز بڑے بھائی کے سسرال کی غلامی۔ رقیبوں جو کر نہ اٹھنا .... وغیرہ قسم کے دکھ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ لوگ یہ کیسے سمجھ لیتے ہیں کہ مرنے کے بعد یہ حالات وہاں نہیں ہوں گے۔ کیا مرنے کے بعد وہاں سب کے لئے لڈو، جلیبی برفی اور مٹھائی تیار رکھا گیا ہے کہ صاحبزادہ آئے۔ ذوق نے ایسے ہی نادانوں کو خبردار کیا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اسی شعر پر جو غالب کو چڑ کا دینے کا باعث ہوا تھا۔ غالب نے اپنے تھیں اشعار کا سارا دیوان دینے کا پیشکش کیا تھا اور سنتے ہیں ذوق نے اسی خطرہ کے پیش نظر مکہ جانے سے انکار کر دیا اور بہانہ بنا دیا کہ دلی کی گلیاں اُن سے نہیں چھوٹتیں۔

خیر جب غالب کو یقین ہوگیا کہ وہاں کوئی خاص اچھے حالات نہیں ہوسکتے تو انہوں نے کہا۔

جہاں لاکھوں برس کی حوریں ہوں　　ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

حالانکہ اس بات کو وہ یوں کہہ سکتے تھے کہ انگور کھٹے ہیں:

اس بارے میں ایک اور نوجوان کا واقعہ باعث عبرت ہے۔ یہ صاحب اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے ایک عامل صاحب سے تعویذ طلب کرنے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عامل صاحب خود اس لڑکی پر عاشق تھے۔ اور انہوں نے خود ایک چوزہ کھینچ کر کھیر پہ دم کیا تھا اور لڑکی کے گھر تحفتاً کھیر بھجوادی تھی۔ لیکن بُرا ہو لڑکی کی بوڑھی دائی کا اس نے کہا "کھیر موئے عامل صاحب کے پاس سے آئی ہے اسے کتے کو کھلا دو" چنانچہ وہ کتا اب بھی عامل صاحب کے دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ عامل صاحب نے ان صاحب سے کہا "میاں اگر تعویذ باندھنے پر بھی لڑکی تم کو نہ ملے تو کیا کرو گے۔

اُن صاحب نے سینے پہ ہتھڑ مار کر کہا" چاہے میری جان چلی جائے میں اُسے حاصل کر کے رہوں گا۔

عامل صاحب نے کہا یہ ہوئی نہ کام کی بات تو لو... یہ تعویذ باندھو اور خوب عبادت و ریاضت کرو اس تعویذ سے تم اس دنیا سے جاؤ گے اور عبادت کے طفیل جنت تو ملے گی ہی وہاں خدا سے محبوبہ کو مانگ لینا وہ صاحب خوش خوش گئے اور مایوس لوٹے۔ عامل صاحب نے منہ پھاڑ کر پوچھا کیا ہوا!"

وہ صاحب بولے "اے صاحب! اللہ نے تو ایک ٹیکنیکل پوائنٹ نکال لیا کہ۔

ہم جو کہتے ہیں کہ جنت میں تمہیں مانگیں گے
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

غالب نے بجا شکایت کی تھی کہ صاحب ہماری جنت و دوزخ کا دارومدار محض فرشتوں کی صحیح یا غلط رپورٹنگ پر ہے۔ اور آج کل رپورٹنگ میں کس قدر غفلت اور کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے۔ فرماتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اور پھر ان فرشتوں کے پاس دل نام کی کوئی چیز تو ہوتی نہیں اور نوٹ کرنے بیٹھے ہیں ہمارے اعمال جن کا زیادہ تعلق دل ہی سے ہوتا ہے کیا فرشتے اس احساس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو ہمارے دل میں کسی کی شاندار خوبصورت بیوی اور اونچے بنگلہ کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔

مرنے کے بعد حقیقت میں جو ایسی تصویر نظر پڑا یہ طلعت ہوگا کہ آپ کے شہر کے سب سے زیادہ عبادت گزار بزرگ جو نہایت بور شاعر بھی تھے اور جن کو لوگ اشعار سنانے نہیں دیتے تھے۔ اور وہ ہر مشاعرہ میں ہوٹنگ کا شکار ہو جاتے تھے۔ وہاں ایک مرصع تخت پر بیٹھے ہیں جو تخت یہاں آرٹ آف فیشن ہیں۔ لاکھوں برس کی حسین جوان لڑکیاں میک اپ کئے ان کو باری باری پنکھا جھل رہی ہیں تو کیا ہوسے بڈھے میاں کے لئے اتنا کیا کر سکتی ہیں۔ شاعر صاحب دلہے کی کرایہ کی شیروانی جیسی پوشاک زیب تن کئے بیٹھے ہیں پاس ہی ان کی نئی نئی [illegible] کی چھوٹی پرانی بیاض رکھی ہے۔

اتنے میں چار چار فرشتے ایک ایک آدمی کو پکڑ پکڑ لا رہے ہیں یہ سب ہم لوگ ہی تھے جو ان کو یہاں ہوٹ کیا کرتے تھے۔ جب ایسے کئی آدمی جمع ہو گئے تو مشاعرہ شروع ہوا۔ فرشتوں نے سب سے کہا کہ اب یہ بزرگ اپنی ساری بیاض جو شاید دو ہزار غزلیں، ایک ہزار نظموں اور پانچ ہزار رباعیوں پر مشتمل ہے۔ سنائیں گے تم سب کو واہ واہ، سبحان اللہ اور مکرر ارشاد کہنا ہوگا۔ خبردار جو کچھ اور کہا تو مار مار کر بھرکس نکال دیا جائے گا۔ ادھر دوزخ میں بھی عجیب منظر تھا۔ ایک پریشان حال بڈھے کے پیچھے آدمی کو فرشتے دھکیل کر لوہے کی کرسی پر بٹھا رہے تھے۔ پھر ایک انگیٹھی کرسی کے نیچے رکھ دی گئی۔ ایک فرشتہ اس انگیٹھی میں مسلسل کاغذات جلا رہا تھا۔ اس کی تپش سے اس آدمی [illegible]

جل کر عجیب حپانڈ پیدا کر رہی تھی ۔ معلوم ہوا وہ آدمی ایک اخبار یا رسالہ کا ایڈیٹر تھا ۔ جو صرف اپنے اور اپنے بھائی بہن کے مضامین شائع کرتا تھا اور دوسرے معصوم ادیبوں کے مضامین جلا دیا کرتا تھا ۔ بس اسی کی سزا وہ بھگت رہا تھا کہ ان معصوم ادیبوں کے مضامین جلا جلا کر اس کی چربی اتاری جا رہی تھی ۔ اور وہ ایک کتاب " دنیا کے سب سے بڑے مزاح نگار " لکھ رہا تھا ۔ جیسے ہم سب کے نام تھا دیہ اور والات زندگی تھے ہم نے عبرت پکڑی اور فرشتوں کو دوربین واپس دیکر جنت کی وہ کھڑکی بند کر لی جہاں سے ہم دوزخ کا یہ منظر دیکھ رہے تھے اتنے میں فرشتوں نے ایک بہترین گیٹ اپ اور شاندار طباعت والی کتاب ہمارے حوالے کی ۔ یہ ہمارے مضامین کا مجموعہ تھا جس کو جنت کی اردو اکاڈمی نے شائع کیا تھا ۔ پھر رسم اجرا کی بات ہوئی ہم نے اپنے چند احباب کے نام دیدیئے جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں ——— ■■

قطعات

اشرف مالوی
(مال ملیح آباد لکھنو)

○

آزادیٔ وطن کا ہر ایک نے فیض پایا
ہے آج بھی بلا چھت کچا مکاں ہمارا
ہم پھر بھی گا رہے ہیں ہر صبح یہ ترانہ
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

○

وصل گر روٹی کا ہو جائے تو سالن کا فراق
اس گرانی کے سبب جانِ حزیں مشکل میں ہے
گھر میں تھا جو کچھ اثاثہ بیچ کر سب کھا چکے
سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

○

عزت بھی مل گئی انھیں شہرت بھی مل گئی
کوئی بھی گوشہ چھوٹا نہ بندے کے واسطے
احسان کم نہیں یہ شہیدانِ قوم کا !!
ذی شان راہیں کر گئے چندے کے واسطے

کسی بھی بات کا جواب صرف "ہاں" یا صرف "نہیں" میں دینا ممکن تو ہے جیسا کہ عدالتی کارروائیوں میں سوالات کے ذریعہ اور گواہوں کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ جرح کے دوران کیے گئے سوالات کے جواب صرف "ہاں" یا "نہیں" میں دیں۔ لیکن یہاں عدالتی کارروائی میں لکھنا مقصود نہیں۔ ہم تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کئی سوالات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے جواب صرف "ہاں" یا "نہیں" میں دینا خطرناک کا معاملہ بن جاتا ہے اور بہت ساری غلط فہمیوں کے پیدا ہو جانے کا باعث بنتا ہے۔ مثلاً آپ سے اگر پوچھا جائے کہ "کیا آپ نے شراب پینا ترک کر دیا ہے؟" یا "کیا آپ اب بھی اپنی بیوی کو پیٹتے ہیں؟" تو جواب میں آپ وضاحت کیے بغیر صرف "ہاں" یا "نہیں" کہتے رہیں، دونوں صورتوں میں خفت اٹھانی لازمی ہے۔ ہر بات پر صرف "ہاں" کہنا ناممکن کی حدوں کو چھونے لگتا ہے اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو اس سے ایسے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں کہ انسان دوبارہ "ہاں" کی جرأت ہی نہ کر سکے گا۔

جب ہم نے ایک مشہور ادیب کے تعلق سے کسی مضمون میں یہ پڑھا کہ "مرحوم نے زندگی میں ہر بات کا جواب "ہاں" میں دیا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے سب کچھ قربان کر دیتے تھے۔ یہ بھی کردار کی عظمت ہے" ـــــــ یہ انکشاف ہمارے لیے باعث حیرت ہوا کہ ہر بات کا جواب "ہاں" میں دینا قربانی اور کردار کی عظمت کی تعریف میں آتا ہے۔ یہ پڑھ کر ہم چپ رہ سکے کیونکہ ایک مرحوم ادیب کی خصوصیت نے ہماری غیرت کو للکارا تھا۔ اس لیے جب ہم نے اپنی خصوصیات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ہماری بھی ساری زندگی "ہاں" کہنے میں بسر ہوئی ہے۔ پھر اچانک ہی ہم خود کی نظروں میں بلند اور عظیم ہو گئے۔ اس بلندی سے ہم نے پچھلی زندگی کے تشنج میں جھانکنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہماری پیدائش خود "ہاں" کہنے کا زندہ ثبوت ہے کیونکہ ہم اپنے والدین کی خواہش پر لبیک کہتے ہوئے اس دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ پیدائش کے بعد والے چند سال شعور اور یادداشت کے دھندلکوں میں اوجھل ہو گئے۔ پھر ذہن پر زور ڈال کر تانے بانے ملانے کی کوشش کی تو پرائمری اسکول میں "ہاں" کہنے کی شروعات ہوئی جبکہ ہم نے اپنی جماعت کے ننھے ساتھی (ظاہر ہے کہ ہم بھی اس وقت ننھے ہی تھے) کی فرمائش پر "ہاں" کہتے ہوئے اپنی کتابوں کی قربانی دی تھی۔ اس قربانی کا چسکہ پڑا تو قربانی اسکول تک پہنچ تا بی گیا اور پھر ہم نے صرف اپنی ساری کتابیں بلکہ والد صاحب کی ساری اہم اور

"ہاں"

بشیر انور

قیمتی کتابیں چوک میں منتقل ہوگئیں۔ کتابوں کی اس "عظیم قربانی" کی کئی ذیلی شاخیں نکلتی گئیں جو ہر موقع پر بیتا لیا چارکوں وغیرہ سے جا ملتی تھیں۔ جب ہمارا اسکول کے "ہونہار" ساتھی کلاس سے غائب ہو کر سینما یا ہوٹل جانے کی تجویز رکھتے ہم ہمیشہ "ہاں" کہہ کر ان کا ساتھ دیتے۔ "ہاں" کہنے کا یہ مضمون ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے اختیاری سے "لازمی" ہوگیا۔ خصوصاً ہائی اسکول کے پیریڈ میں ہمارا کلاس روم میں بیٹھے رہنا ہماری فطرت کے عین خلاف تھا کیونکہ اس سے ایک طرف تو اپنے ساتھیوں کو "ناں" کہنا پڑتا دوسرے کلاس روم میں ٹیچر کے ہر سوال کا جواب "ناں" میں دینا پڑتا اور کسی بات پر "ناں" کہنے سے ہم چڑتے تھے۔ اس کے باوجود بھی ہم نہ جانے کس طرح ہر سال برابر پاس ہوتے رہے۔

کالج پہنچے تو ہمارے "ہاں" کہنے کا معیار بھی خود بخود اونچا ہوگیا اور ہم نے اپنے بالغ ساتھیوں کی بالغ تجاویز پر "بالغ نظری" کے ساتھ "ہاں" کہنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کالج کا "روم" اور "روی" کے روپ میں تبدیل ہوگیا۔

"کرم اور رحمٰی گزیدہ" ہو کر کالج سے نکلے تو ہندوستانی روایات کے مطابق ملازمت اور شادی" کے دور میں داخل ہوئے۔ ملازمت میں سب سے پہلے" انکم ٹیکس آفیسر" کے اشتہار پر نظر پڑی (کالج سے نکل کر ہر تعلیم یافتہ بے روزگار اپنے آپ کو آفیسری کا مستحق سمجھتا ہے) اور اس جائیداد کے لئے ہم نے درخواست بھجوا دی۔ اتفاق سے انٹرویو کے لیے بھی بلا لیا گیا۔ مقررہ دن ہم پوری تیاریوں کے ساتھ انٹرویو کے لیے نکل پڑے ابھی بس اسٹانڈ تک پہنچے بھی نہ تھے کہ "رمی ماسٹروں" سے سامنا ہوگیا چونکہ ایک دن پہلے ہی زبردست ہار ہو چکی تھی۔ اس لیے "بازیافت" کی امید پر ہم نے فوراً "ہاں" کہہ ڈالی اور اس وقت تک رمی کھیلتے رہے کہ انٹرویو ختم ہوگیا۔ رمی میں بازیافت ہوئی یا نہیں لیکن "انکم ٹیکس آفیسر" کے عہدہ کی بازیافت ابھی تک نہ ہو سکی۔ یہ قربانی ہماری عظیم ترین قربانیوں میں سے ایک تھی۔ کیونکہ انکم ٹیکس والے ہمیشہ دوسروں کی قربانیاں مانگتے ہیں اور ہم نے "ہاں" کہہ کر ان کی خواہش کی تکمیل کر دی تھی۔ اس کے بعد بھی ہم کئی بار انٹرویو کے لیے بلائے جاتے رہے۔ انٹرویو میں ہر سوال کا جواب "ہاں" میں دیتے رہے اور قربانیوں سے دوچار ہوتے رہے۔ جب انٹرویوز کی برسوں پر محیط ہونے لگے تو ہم نے "کلرک کی جائیداد" کے لیے "ہاں" کہہ ڈالی اور آج تک اسی "ہاں" کی روٹی کھا رہے ہیں۔ ہم نے ہزاروں بار "ہاں" کہی ہے لیکن "پچھتاوا" صرف اس ایک "ہاں" پر ہے جو شادی کے موقع پر کہی گئی تھی۔ نہ صرف ہم بلکہ ہمارے [illegible] نصف درجن بچے اور دنیا بھر کے مسائل اس ایک "ہاں" پر ماتم کناں ہیں۔ بچوں کا ذکر نکلا [illegible] ایک "ہاں" کا واقعہ بھی یاد آگیا۔ بچے کی سالگرہ کے دن ہم نے قریبی رشتہ داروں [illegible] اس دن ہم دفتر سے ایک گھنٹہ پہلے ہی نکل گئے تاکہ وقت پر گھر پہنچ سکیں۔ جونہی آفس سے [illegible] سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ہم دونوں گلے لپٹ گئے اور چلتے آفر کی ہمارے دوست نے جواب میں ایک لمبا چوڑا پروگرام [illegible] دوستی بار یہ ہوش کیسا ہو گی پھر اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے اس کے بعد پکچر دیکھی جائے گی۔ چونکہ برسوں کے بعد ملے تھے اور پروگرام مستقل تھا اس لیے ہم نے فوراً "ہاں" کہہ دی۔ سیکنڈ شو کے بعد آدھی رات گئے ہم جب گھر [illegible] بچے تک بیوی کا پھنکارتے چہرے سے ناراضی اور مہمانوں سے شرمندگی دور کرنے میں ہفتوں لگ گئے۔

بعض مرتبہ ہم یہ سوچ کر سہم جاتے ہیں اور پھر خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ ساری عمر بھلے مانس اور بے ضرر لوگوں سے واسطہ رہا ہم بے دھڑک طریقے سے "ہاں" کہتے رہے۔ اگر چہ غلط' ڈاکوؤں یا قاتلوں سے واسطہ پڑتا اور ہم اپنی فطرت کے مطابق "ہاں" کہہ جاتے تو ہماری قربانیاں "بے معنی" قربانیاں ثابت ہوتیں اور ہم یا تو پھانسی پر جھول جاتے یا ساری عمر [illegible]

...ے اس کے بجے بھی ہماری ساری زندگی "قربانی" ... ہم خوش اور مطمئن ہیں کہ زندگی کا اتنا بڑا حصہ جو قیمتی تھا گزر گیا اب باقی عمر بھی کسی طرح گزار ہی لیں گے۔ یہ کہتے ہوئے ہمیں اس شخص کی یاد آرہی ہے جو ایک بلند عمارت کی (۵۰) ویں منزل سے گر پڑا تھا۔ تیزی سے نیچے گرتے ہوئے جب اس نے ۴۰ منزلیں طے کیں تو یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا کہ پلک جھپکتے ۴۰ منزلیں طے ہو گئیں اور کچھ نقصان نہیں پہنچا اب تو صرف ۱۰ منزلیں باقی رہ گئی ہیں۔

شگوفے

محمد علی گیلانی (پٹنہ)

○

جارج برنارڈ شا دبلے پتلے جسم کے تھے۔ ایک دفعہ ایک ہم عصر ادیب جی۔ کے چسٹرٹن نے جو کہ کافی بھاری بھر کم تھے برنارڈ شا کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر شا! آپ کو دیکھ کر کوئی بھی یہی سوچے گا کہ انگلستان میں غذا کی بہت قلت ہو گئی ہے۔"

اس پر برنارڈ شا نے برجستہ جواب دیا۔

اور آپ کو دیکھ کر وہ یہی سوچے گا کہ اس کی وجہ آپ ہی ہیں۔

◉ فرانسیسی ادیب بالزاک کا ایک کنجوس اور دولت مند چچا جب اس کے نام ایک بڑی جائیداد چھوڑ کر مرا تو بالزاک نے اس کی خبر اپنے دوستوں کو ان الفاظ میں دی۔

—"کل پانچ بجے صبح سے میری اور میرے چچا کی ایک نئی اور اچھی زندگی کی شروعات ہوئی ہے۔"

◉ فرانسیسی دانشور مونٹسکیو کو ایک مرتبہ ایک باتونی عورت نے سوالات کر کے پریشان کر رکھا تھا۔ مونٹسکیو اس باتونی عورت کی بکواس سے عاجز آچکے تھے جب اس عورت نے مونٹسکیو سے سوال کیا کہ—

"ان کے خیال میں خوش قسمتی کیا ہے؟" تو مونٹسکیو نے چڑ کر کہا——

"محترمہ! ایک ملکہ کی خوش قسمتی اس میں ہے کہ وہ بانجھ نہ ہو، ایک کنواری لڑکی کی خوش قسمتی اس میں ہے کہ اس کی عصمت محفوظ رہے اور وہ جو آپ کے قریب بیٹھا ہوا اس کی خوش قسمتی اس میں ہے کہ وہ بہرا ہو۔

◉ ریڈیو کے موجد مارکونی کے آگے ایک خاندانی رئیس اپنے خاندان کے بارے میں بہت ڈینگیں مار رہا تھا۔ اور خاص کر اپنے خاندان کے قدیم ہونے کا بار بار تذکرہ کر رہا تھا۔ پاس ہی ایک کسان بھی بیٹھا تھا۔ رئیس کی بکواس سن کر رہا نہ گیا اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جناب! اگر آپ کا تعلق ایک قدیم خاندان سے ہے تو اس پر اتنا زیادہ فخر نہیں محسوس کرنا چاہئے ہم [illegible] تو یہی جانتے ہیں کہ بیج جتنا زیادہ پرانا ہو گا فصل اتنی ہی زیادہ خراب ہو گی۔"

المیہ اور مداوا

ایک ہلاکت خیز طوفان نے ۱۹/ نومبر ۱۹۷۷ کو سیاہ بخت سنیچر کے روز آندھرا پردیش کے ساحلی اضلاع کو نشانہ بنایا اور اپنے پیچھے موت۔ تباہی اور بربادی کے ہولناک مناظر چھوڑ گیا۔ جس کے فوری بعد ایک کثیر مقصدی بازآبادکاری پروگرام شروع کیا گیا جو قلیل مدتی اور طویل مدتی امدادی اقدامات پر مشتمل تھا۔ اس پروگرام کے تحت انجام دیئے جانیوالے کاموں کا خاکہ درج ذیل ہے۔

تقسیم کردہ مفت امداد	۱۷ کروڑ روپے
محصول مالگزاری کی معافی	۷،۳۴ کروڑ روپے
۴۱۸۰۰ بنکروں کو امداد	۲،۲۵ کروڑ روپے
۱۴۰۰۰ ماہی گیروں کو امداد	۱،۶۱ کروڑ روپے
۷۵۰۰ صناعوں کو امداد	۶۸،۰۵ لاکھ روپے
سڑکوں۔ پلوں اور عمارتوں کی درستگی	۱۹،۲۸ کروڑ روپے
آبپاشی کاموں اور برقی تنصیبات کی بحالی	۱۸،۶۸ کروڑ روپے
تعلیمی اداروں کی بحالی	۱،۳۸ کروڑ روپے
بلدی جائدادوں کی درستگی و مرمت	۱،۵۰ کروڑ روپے
کیمیائی کھادوں اور بیجوں کی فراہمی اور اراضیات کو لائق کاشت بنانے کے کام	۱،۸۴ کروڑ روپے
تاحال تعمیر شدہ مستقل نوعیت کے مکانات کی تعداد	۱۱۱۰

ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد

33/78-79.

نرگس سہوانی

قہقہے

اگر کر کے وعدہ وہ "ابسینٹ" ہوگا
تو کِس "بیس" پر اُس کو "پیمنٹ" ہوگا

علاجِ غمِ دل جو "پیشنٹ" ہوگا
تو "بل" آپ کا سارا "پیمنٹ" ہوگا

سنبھل کر چلو چال اے حُسن والو
وگر نہ کہیں "ایکسیڈنٹ" ہوگا

جو جیتے گا کُشتی وہ پائے گا اُن کو
درِ یار پر "ٹورنامنٹ" ہوگا

رقیبوں کی قبریں تو کچی بنیں گی
مگر میری تربت پہ "سِمنٹ" ہوگا

یہ کیا کہہ رہے ہو محبت نہیں ہے؟
چلو آج ہی "ایگریمنٹ" ہوگا

سمجھ سوچ کر میں نے کی ہے محبت
کہ نقصان "تو سینٹ پرسینٹ" ہوگا

وفورِ محبت میں لپٹا لیا ہے
خدا جانے کیا اس کا "ججمنٹ" ہوگا

اُسے سارے عشاق سمجھیں گے عالم
تمہارے مکاں کا جو "سرونٹ" ہوگا

یہی جانتے تو اُنھیں پر نہ مرتے
"اسسٹنٹ" اُن سے بھی "ڈیسنٹ" ہوگا

مجھے عرصۂ حشر میں ڈھونڈ لینا
وہاں عاشقوں کا بھی اک "ٹینٹ" ہوگا

نہ ہوگا اگر چارۂ دردِ پنہاں
تو نرگس بھی ٹی بی کا "پیشنٹ" ہوگا

محبوب راہی

پیار کا گودام

جھگڑوں میں ہے مہارت، ہیں طاق گالیوں میں
شہرت ہمیں ہے حاصل غنڈوں موالیوں میں

یہ مہوشوں کے بھدے بے ڈیل ڈول شوہر
لٹکے ہوں جیسے کدّو پھولوں کی ڈالیوں میں

رنگت وفا کی ہم نے پائی نہیں کسی میں
ڈھونڈا ہے گوریوں میں، کھوجا ہے کالیوں میں

شامل ہے دل کی فطرت میں ایسی کچھ غلامی
چھوٹا جو گیسوؤں سے جا اٹکا بالیوں میں

گودام پیار کا اب بند کھول بھی دے
لائے ہیں خواہشیں ہم دل کی ٹرالیوں میں

کچھ اس طرح ادا کی ہم نے نمازِ بادہ
سجدے کئے ہیں اکثر سڑکوں پہ نالیوں میں

کرتب مشاعروں میں دیکھے ہیں ہم نے وہ، وہ
دیکھے نہ ہونگے تم نے جو جنز قوالیوں میں

انگلش کے ہم تھے عادی رس آسکا نہ ہم کو
ٹھرّا جو تھا تمہاری آنکھوں کی پیالیوں میں

یوں ہم پہ لے رہے ہیں جیسے برسا رہے ہوں پتھر
ثانی نہیں ہے جن کا نازک خیالیوں میں

جوتے، بستر سے ٹماٹر کھا کے گئی راہی اٹیچی
ڈائس پہ ہم چڑھے تھے پُرشور تالیوں میں

خود روزگار مواقع

بیروزگاری ایک ہمالیائی مسئلہ ہے۔ اس عظیم چیلنج سے نمٹنے کے لئے ہماری جانب سے انتھک جد وجہد اور لگاتار کوشش کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آندھرا پردیش میں ۱۵ / اگسٹ ۱۹۷۸ء سے ۵ کروڑ روپے مالیت کی ایک خصوصی روزگار اسکیم آغاز کی گئی ہے جس کے تحت پڑھے لکھے بیروزگاروں کو عملی تربیت دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس اسکیم سے زیادہ تر ہمارے کمزور طبقات کو فائدہ پہونچے گا۔

سال ۷۷ - ۱۹۷۶ء کے دوران ریاست میں مجموعی طور پر روزگار کی صورتحال میں قابل لحاظ بہتری پیدا ہوئی۔ دفاتر فراہمی روزگار کی جانب سے تقریباً ۵۲۸۷۶ ملازمتیں دلائی گئیں۔ اور اس طرح پچھلے سال کے مقابلے میں روزگار کے ۲۴ فیصد اضافہ مواقع فراہم کئے گئے۔

اسمال فارمرس ڈیولپمنٹ ایجنسی (ایس ایف ڈی اے) ۔ مارجینل فارمرس اینڈ اگریکلچرل لیبررس اسکیم (ایم ایف اے ایل) ۔ ڈراوٹ پرون ایریا ز پروگرام (ڈی پی اے پی) اور لائیو اسٹاک پروڈکشن پروگرام (ایل پی پی) بھی روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

مذکورہ بالا ایجنسیوں کے دائرۂ عمل کے علاقوں میں موجود تقریباً ۱۵ لاکھ چھوٹے اور مارجینل کسانوں میں سے اب تک ۵۸ ر ۶ لاکھ سے زائد کی شناخت عمل میں لائی جا چکی ہے اور مختلف مالیاتی اداروں سے ان کو امداد فراہم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ ایسے چھوٹے کسان جن کی اراضیات ڈھائی ایکڑ تری اور (۵) ایکڑ خشکی سے زیادہ نہیں ہیں محصول مالگزاری سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد

3/178-79.

سلیمان اطہر جاوید (ڈاکٹر)

اقبال کے کلام میں طنز و مزاح

اقبال اُردو کے وہ عظیم شاعر ہیں جنھوں نے اپنے پیش نظر اپنی قوم و ملت کی فلاح و بہبود کا ایک واضح اور متعین مقصد رکھتے ہوئے شاعری کی۔ ابتدائی دور کی تھوڑی بہت شاعری کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کا سارا کلام بامقصد ہی ہے۔ شاعرِ مشرق نے وہ جو کہا ہے کہ فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا ' حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکے روبرو ' صرف فلسفہ و شعر ہی کی حد تک نہیں' طنز و مزاح میں بھی روبرو کہنے سے کام نہیں چلتا، بامقصد شاعری ایسی ہی ہوتی ہے۔

طنز و مزاح کی خصوصیت یہی ہے کہ اگر یہاں وضاحت سے کام لیا جائے تو طنز واعظِ خشک کی نصیحتوں اور مزاح سرکس کے مسخروں کے پھکڑپن میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور طنز و مزاح نگار کو اپنا سا منہ لیکر رہ جانا پڑتا ہے اسی لئے تو کسی نے طنز و مزاح کو سفلی عمل سے مشابہ قرار دیا ہے کہ عمل کامیاب نہ ہو تو خود عامل اس کا نشانہ بن جاتا ہے۔ طنز و مزاح میں حسن اس کے ابہام سے در آتا ہے، اسی ابہام کی وجہ سے، کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے، والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ابہام کے باعث وہ بات بھی پیدا ہوتی ہے کہ جس فرد یا معاشرے کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا جائے وہ اس کو محسوس کرنے کے باوجود مسکرائے اور محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس زاویئے سے جائزہ لیا جائے تو لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے کامیاب طنز و مزاح نگار ہونے کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔

اقبال کے ہاں سماجی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی موضوعات پر چند ایک منظومات اور اس کے علاوہ طنز و مزاح کے حامل اشعار خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں تاہم واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے ہاں طنز و مزاح کسی مستقل رجحان کی صورت میں نہیں ملتا ——— اقبال نے جس دور میں شاعری کی ابتدا کی، اکبر الٰہ آبادی دنیائے شعر و ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ اقبال، اکبر کے شاعرانہ اثر سے بچ نہ سکے، وہ بچ بھی نہیں سکتے تھے۔ "بانگ درا" کے آخر میں طنز و مزاح، کے زیر عنوان جو کلام ہے اس کا بیشتر حصہ اکبری رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

تعلیم، خاص طور پر تعلیم نسواں، پردہ، مغربی تہذیب اور مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید، یہ اور ایسے کئی موضوعات

اکبر کی شاعری کے عناصر ترکیبی رہے ہیں۔ اقبال نے اکبر کے ان موضوعات کو اکبر ہی کے اسلوب میں استعمال کیا ہے وغیرہ، انگریزی الفاظ کا استعمال، یہ بھی تو اکبر کر چکے تھے۔ لیکن اکبر اور اقبال کے ہاں ان مماثلتوں اور یکسانیت کے باوجود اکبر اور اقبال کے نقاط نظر اور اسلوب و آہنگ میں غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ اسی باعث ان کی تاثیر اور دائرہ تاثیر میں فرق آجاتا ہے۔ اکبر کے خلوص سے کس کو انکار ہے لیکن اکبر کا مغربی تہذیب کا مطالعہ نہ تو گہرائی کا حامل تھا اور نہ ہمہ جہت! علاوہ ازیں مشرق کی خامیوں اور کوتاہیوں بیان کی ایسی نظر نہیں تھی یہی وجہ ہے ان کے کلام پر یہ اعتراض کیا گیا کہ مغرب کے تعلق سے وہ متعصب رہے۔ اس کے برعکس اقبال نے مغرب کو ہر زاویہ سے دیکھا تھا، مغرب کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی تحریکات کا اُن جیسا مطالعہ کرنے والے بہت کم ہندوستانی ہوں گے۔ انہوں نے مغرب کی خامیوں کی مذمت کی تو اس کی خوبیوں کو سراہا بھی۔ اور مشرق کی خوبیوں کو سراہا تو اس کی خامیوں کی مذمت بھی کی۔ اقبال کے ہاں اس خصوصی میں ایک توازن اور اعتدال ملتا ہے اور پھر اپنی فلسفیانہ آگہی کے باعث انھوں نے ان موضوعات اور مسائل کا مطالعہ خاصی گہرائی سے کیا تھا۔ مشرق اور مغرب کے تاریخی، تہذیبی اور معاشی پس منظر پر نہ صرف ان کی نظر تھی بلکہ مشرق اور مغرب کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے۔ ہے اور کیا ہونا چاہیئے وہ یہ بھی جانتے اور اس بارے میں اپنا ایک نقطہ نظر رکھتے تھے۔ انہی وجوہ سے اقبال کے کلام کی تاثیر افزوں ہے لیکن اقبال کی مزاحیہ رنگ کی شاعری ان خصوصیات کی حامل "بانگ درا" کے بعد ہوتی ہے۔ بانگ درا کا یہ وہ دور تھا جب کہ علی گڑھ تحریک کے باعث تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ ہماری تعلیم مغرب سے متاثر ہوتی جارہی تھی اور ایک زاویے سے مشرق کی روایتی قدروں سے محروم۔ اونچے معیارات قائم ہورہے تھے اور بات ہے، لیکن اخلاقی قدروں کا سودا کرکے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ؟ دفع مرض کے واسطے پِل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ اُستاد کے عوض دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بِل" پیش کیجیے

یہی حال تعلیم نسواں کا بھی رہا۔ تعلیم نسواں پر اکبر نے بہت کچھ کہا ہے اور طرح طرح سے۔ تھوڑا بہت اقبال نے بھی یہ دیکھیے تعلیم نسواں کے ساتھ پردے پر بھی طنز ہے۔ ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اور یہاں کہنے کو تو پردے پر طنز ہے لیکن شیخ صاحب بھی نشانہ بنتے ہیں اور مرد بھی ؎

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہوگئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہوگئے

اس دور میں اکبر، چکبست اور اقبال جیسے شاعروں کے ہاں وطنیت کا جاندار تصور ملتا ہے۔ مصنوعات ملکی کو حقیر سمجھ کر

بیرونی ممالک کی اشیاء کا استعمال ہمیشہ کی طرح اس دور کا بھی فیشن سہی لیکن کسی دور میں بھی اس فیشن کو مبارک اور مسعود قرار نہیں دیا گیا۔ ہر ہمدردِ قوم نے اس کو معترض نظروں سے دیکھا اور اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اقبال اپنے ردِ عمل کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک چھتریاں رومال مفلر پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

اقبال کے طنز و مزاح کا نشانہ لگ بھگ ہر موضوع بنا ہے۔ "بانگ درا" میں ایسی کئی منظومات مل جاتی ہیں۔ یہاں نشانہ ہے، تہذیبِ نو، جس کو اقبال نے کارگہِ شیشہ گراں قرار دیا ہے اور اسی کے ساتھ فرنگی مدنیت، فرنگی سیاست اور اس کے ثمرات پر یوں چوٹ کرجاتے ہیں ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجاری بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

ان اشعار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ "بانگ درا" میں اقبال کا طنز و مزاح کچھ ایسے اونچے معیار کا حامل نہیں اور نہ ان اشعار میں کوئی انفرادیت پائی جاتی ہے لیکن "بانگ درا" کے بعد "بالِ جبریل" "ضربِ کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" میں اقبال کی شاعری کا معیار جس قدر بلند اور برگزیدگی کا حامل ہوتا جاتا ہے، طنز و مزاح بھی کمیت کے اعتبار سے نہ سہی کیفیت کے اعتبار سے نکھرتا، نئی جہتوں اور بلاغت کا حامل ہوتا جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا ایک اہم مقصد مسلمانوں کو مذہب کی حقیقی روح سے آشنا کرانا ہے، ان کو ایک اچھا اور سچا انسان بنانا اور اس دنیا میں ایک باوقار فرد کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے رموز و آداب سکھانا۔ اقبال نے زندگی بھر اسی کی تلقین کی۔ اگر یہ مقصد اقبال کے ملحوظِ نظر نہ ہوتا تو پتہ نہیں اقبال کا کلام کس رنگ روپ کا حامل ہوتا ——

علوم مشرقی و مغربی کے سیر حاصل مطالعہ کے باعث اقبال نے مذہب کی روح کو صحیح طور پر سمجھا تھا۔ مذہب کیا ہے؟ مذہبی آدمی کا فرض اور کردار کیا ہونا چاہیے —— اقبال نے ان نکات پر غور و فکر سے کام لیا اور دوسروں پر بھی ان نکات کو روشن کیا۔ اقبال کے نزدیک مذہب سے مراد صرف ظاہر نہیں اور نہ صرف مذہبی رسم و رواج اور رنگ ڈھنگ کا نام مذہب ہے۔ ان کے نزدیک "مذہب" صرف "دین" نہیں بلکہ دین و دنیا دونوں مل کر تکمیل پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک، نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی، اسی لئے ترکِ دنیا اور فقط اللہ ہو کو اقبال نے نہ صرف ناپسند کیا بلکہ اپنے طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے۔

یہ صحیح ہے، اردو شاعروں نے عام طور پر زاہد و ملّا، واعظ، مولوی، عابد اور شیخ وغیرہ پر طنز کئے ہیں۔ اقبال کے یہاں بھی یہ سب ہے لیکن اقبال کے طنز کا زاویہ بدلا ہوا ہے، کچھ اور ہے۔ یہیں اقبال کی انفرادیت ابھر آتی ہے۔ عصرِ حاضر کے بیشتر شاعروں کی طرح اقبال نے مذہب کے ظاہر یا مذہبی رہنماؤں کی ہیئت پر طنز نہیں کیا ہے بلکہ ریان کر واعظ پر طنز ہے

یوں جو مذہب کی روح سے روگردانی کرتے ہیں مذہب کا استحصال کرتے ہیں اور مذہب کی ظاہری پیروی اور رسمی تقلید کو روح مذہب قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے اس سلسلے میں کسی رورعایت سے کام نہیں لیا ہے، کہیں کہیں تو بے حد کاری طنز کئے ہیں کسی نقاب کے بغیر شیخ حرم تلملا بھی اٹھے تو کم ہے ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے   گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادر زہراؓ

اور کہیں یہ چلتا چلاتا طنز ہے ؎

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے   کردار بے سوز، گفتار واہی

اقبال نے موقع پرستی اور زمانہ سازی کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا ہے۔ کس نے ان کو اچھا کہا ہے۔ مذہب کی تعلیم بھی ایسی نہیں ہے لیکن جب اقبال نے دیکھا کہ مذہب کا نام لینے والے اپنے موقتی مفادات اور دنیاوی مقاصد کی تکمیل کے لیئے وقتاً فوقتاً خود کو بدلتے حالات سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں تو اقبال برداشت نہیں کر پاتے اور وہ لوگ کہہ اٹھتے ہیں ؎

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے   عشق بے چارہ نہ ملّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

آج بلشتر مذہبی لوگ اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کے اجداد ولی تھے، صوفی تھے اور صاحب کرامات! ان کے پاس کیا ہے، بس یہی سند کہ یہ ان کی اولاد ہیں، ان کے وارث ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں سوائے اس کے کہ ان کے اجداد کے فسانے اور ان کی کرامات کے قصے ہیں۔ اقبال نے ایسے صوفیوں پر طنز کیا ہے اور صورتحال کی کیسی خوب صورت اور واقعی تصویر پیش کی ہے ؎

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی   فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز   کتابِ صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی

اسی طرح ایک اور غزل کے دو شعر ہیں، شیخ و ملا نشانہ بنتے ہیں ؎

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب   خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

مرے لیے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت   ہزار شکر کہ ملا ہیں صاحب تصدیق

اور یہاں انداز بڑا بلیغ ہے، فکر انگیز! فکر انگیزی، اقبال کے کلام کا وصف خاص ہے، فقیہہ شہر کی خبر لیتے ہیں

فقیہہ شہر کی تحقیر، کیا مجال مری   مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ ان کے مذہبی رہنما بیشتر دینوی مسائل پر متفق ہیں اور نہ دنیاوی مسائل پر۔ دور نہ جایئے عصر حاضر میں نماز میں آلۂ مکبر الصوت کے استعمال، رویت ہلال اور عیدین کے مواقع پر جو بوالعجبیاں دیکھنے میں آتی ہیں وہ کیا کم ہیں۔ اقبال کی نظر تو ظاہر ہے ان سے پیچیدہ اور اہم مسائل پر رہی ہوگی اقبال نے فقیہان شہر کے اس رویے پر کڑی تنقید کی ہے۔ ہماشما، ہر فقیہہ نے اس کو محسوس کیا اور اقبال کی تنقید کو برداشت نہیں کر پایا۔ اور سارے فقیہہ اقبال کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔ بالاتفاق اقبال کے نزدیک یہی پہلو قابل اعتراض

ہے کہ وہ لوگ جو کبھی باہمی طور پر متفق نہیں ہوئے تھے، اقبال کی مخالفت ہی میں سہی متفق تو ہیں ۔

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

"ملا اور بہشت" اقبال کی وہ نظم ہے جس میں انھوں نے حضرت ملا کے کردار کو بڑا فگندہ نقاب کرتے ہوئے دلاویز طنز کئے ہیں۔ نظم مختصر ہے لیکن ملا کا کردار بہ تمام و کمال اجاگر ہو جاتا ہے۔ ساری نظم پیش کی جاتی ہے ۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اسی طرح "ساقی نامہ" میں ایک جگہ خطیب کے اندازِ تقریر کی توضیح کرتے ہیں، جس کی تقریر میں کچھ نہیں سوائے انداز کے۔ آج کل کے بیشتر خطیب شرمائیں نہیں ۔

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

اور پھر ادھر سیاست کی طرف آیئے، زیادہ کیا عرض کروں، ابلیس خداوندِ جہاں کی خدمت میں عرضداشت پیش کرتا ہے اور جمہوری نظامِ حکومت میں اربابِ سیاست کے رویہ کو اجاگر کرتے ہوئے گویا ہے ۔

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

عصرِ حاضر میں آزادیٔ فکر بھی جمہور کی دین ہے۔ یہ اور ایسی آزادیٔ فکر اقبال کی نظر میں ۔

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

"ملا اور بہشت" کے علاوہ اقبال کی جن منظومات میں طنز بھاری اور کاری ہے۔ ان میں ایک ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال نے یہ نظم ۱۹۳۶ء میں لکھی یعنی اپنے انتقال سے لگ بھگ دو سال قبل۔ اس میں زبان و بیان ہی نہیں فکر و فن اور فلسفہ کی بھی پختگی ہے، لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، ایسا ہونا ضروری تھا۔ اس سے قطع نظر طنز بھی غیر معمولی پختہ اور بھرپور ہے۔ اس نظم میں ابلیس کا پہلا مشیر "علمِ کلام" پر طنز کرتا ہے ۔

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام

اسی نظم میں پانچواں مشیر ابلیس سے خطاب کرتے ہوئے ذاتِ الٰہی پر طنز کرتا ہے ۔

مجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

یہاں ابلیس اپنے مشیروں سے مخاطب ہے، طنز کا نشانہ بنتے ہیں اشتراکی ۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

ابلیس اسلام کی تعلیمات کو سراہتے ہوئے کہ اسلام تو حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں ہے۔ یہاں "نے کلاہ فغفور و خاقاں ہے" "نے فقیرِ رہ نشیں"۔ اور اسلام ہی ہے جو یہ تعلیم دیتا ہے کہ "بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں"

آگے چل کر مسلمانوں کی حالتِ موجودہ اور مذہبی قائدین کی حالتِ زار پر طنز کرتا ہے ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے ۔

اسی سلسلہ میں اقبال، ابلیس کی زبان سے ان مسائل کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے آج کا مسلمان دوچار ہے ۔ یہاں طنز گہرا ہے ، ان دو ، تین اشعار کو بھی پڑھ لیں ؎

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے ؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق ، حق سے جدا یا عینِ ذات

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے ؟
یا مجدّد ، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات ؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم ؟
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات ؟

"گدائی" اقبال کی مکمل طنزیہ نظم ہے اور طنز کا نشانہ ہے "والیِ شہر" ــــــ اقبال نے کس کس پہلو سے طنز نہیں کیا ہے ، حتیٰ کہ تان ٹوٹتی ہے ؎

مانگنے والا گدا ہے ، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

میر و سلطان پر "ساقی نامہ" میں بھی طنز ہے اور ساتھ ہی سرمایہ داری پر بھی ؎

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

مذکورہ بالا منظومات کی اہمیت ان کے مواد ہی کی وجہ نہیں ان کے اسلوب ، ان کے طنزیہ اسلوب کی وجہ سے بھی ہے ۔ "جبریل اور ابلیس" بھی ایسی ہی ایک نظم ہے جس کی وجہِ امتیاز اس کا طنزیہ اسلوب ہے بلکہ اس زاویے سے اقبال کی یہ نظم اور جادو جگا جاتی ہے ۔ اس نظم میں اقبال نے جبریل کی زبان سے جو کہا ہے اس میں لب و لہجہ کی وہی ٹھنڈک ، نرمی ، شیرینی ، رچاؤ اور دھیما پن ہے جو فرشتوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن ابلیس کا لہجہ بڑا غضب دار ہے ، گونجتا ہوا کھردرا ، بے ہنگم ، ناہموار ، بے مروتی کا حامل ، بے رحم ، کسی تکلف سے عاری ، غرض وہ ساری خصوصیات جو ابلیس سے وابستہ کی جا سکتی ہیں ۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ابلیس کے کردار کو اقبال نے کس عمدگی کے ساتھ سمجھا اور صفحۂ قرطاس پر پیش کیا ہے ۔ ان اشعار میں ابلیس ، جبریل سے مخاطب ہے ۔ اور طنز جبریل پر بھی ہے اور ذاتِ الٰہی پر بھی ، ابلیس کے اپنے مخصوص اور منفرد لہجے میں ، تیز ، تند ، ترش اور تلخ ؎

گر کبھی فرصت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو ، اللہ ہو ، اللہ ہو !

"جبریل و ابلیس" میں جبریل کے تعلق سے اقبال کا رویہ ہمدردانہ ضرور ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ فرشتے اقبال کے نزدیک قابلِ تقلید مخلوق نہیں ہیں ۔ کوئی عجب نہیں اقبال نے یہ خیال حالی سے لیا ہو ، حالی نے وہ جو کہا ہے ؎

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

اقبال نے بھی فرشتوں پر کئی طرح سے طنز کیا ہے ۔ کہیں تو انہیں تن آسان کہا ہے اور کہیں کم حوصلہ ۔ ان دو اشعار سے اندازہ ہوگا ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں — انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

دہ تو اور چاند تاروں کو بھی معاف نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ مقصود تقدیر پرستی کا مذاق اڑانا ہے ؎

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا — وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

قبال نے ذاتِ خداوندی کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے لیکن ربِ لم یزل پر اقبال کا طنز، جوش یا کسی ایسے ہی شاعر ے طنز کی طرح نہیں بلکہ اقبال نے خدائے پاک کی معبودیت اور اپنی عبدیت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے محض وخی سے کام لیا ہے ——— سب سے پہلے میں اس طرف توجہ دلاتا چلوں کہ اقبال نے صفاتِ ذاتِ الٰہی میں بنی طرف سے ایک اور صفت شامل کر دی ہے۔ کتنی سادگی کے ساتھ یہ صفت ہے بخیلی!

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

یک اور جگہ خالقِ دوجہاں کے کرمِ بے پناہ کو تسلیم کرنے کے ساتھ اقبال یہ کہنے سے بھی نہیں جھجکتے کہ ؎

غضب ہے عین کرم میں بخیل ہے فطرت — کہ لعلِ ناب میں آتش تو ہے شرارہ نہیں

سی کے ساتھ "بالِ جبریل" کی دوسری غزل جس کا مطلع ہے، "اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا، مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا" مطلع سے مقطع تک خدائے پاک پر طنز ہی طنز ہے۔ اقبال کے طنز کا یہ انداز ے حد اپنائیت لئے ہوتے ہے۔ وہ اس طنز میں اپنی ذات کو بھی شامل کر لیتے ہیں، اور کچھ اس دلربائی سے کہ رح نورؔدم نے کہا ہے 'خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے'۔ اقبال کے طنز پر بھی ذاتِ الٰہی مسکرا دیتی ہوگی بندگی اور خدائی کا تقابل کرتے ہوئے اقبال نے دیکھئے کیا کہا ہے اور کس طرح ؎

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے — خداوندا خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی استغفر اللہ — یہ دردِ سر نہیں، دردِ جگر ہے

انسان بے ثبات ہے، فانی ہے، لیکن اس میں انسان کا کیا قصور؟ وہ تو اپنی بے ثباتی اور اپنی فنا کا ذمہ دار نہیں۔ وہ تو ایک تخلیق ہے۔ خالق نے اس کو جس طرح بنایا وہ اسی طرح بنا۔ یہ تو خالق کے لئے سوالیہ نشان ور وجہِ فکر ہے کہ اس کی تخلیق ایسی ناپائیدار۔ ایسی بے ثبات ایسی باطل اور ایسی آنی فانی ہے۔ اقبال خدا سے مخاطب ہیں۔ طنز کتنا بلیغ ہے ؎

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل — کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

ور پھر یہ آدم، جو اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ کہا جاتا ہے، جس کا بڑا شہرہ ہے، جو ساری کائنات میں اللہ کی نیابت کر رہا ہے جو جانِ دو عالم کائنات ہے، جس کے لیے یہ دنیا تخلیق کی گئی ہے، جو خدا کے ہنر کا شاہکار ہے ——— لیکن یہ کیسا آدم ہے؟ کیسا شاہکار ہے؟ اندھا، بہرا، گونگا ——— اقبال سوالیہ نشان ہے؟

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا — کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

نہ خودی ہیں، نے خدا ہیں، نے جہاں ہیں یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

ایک اور جگہ اقبال نے ذات الٰہی پر یوں طنز کیا ہے ؎

تو برگِ گیاہے ندہی اہلِ خرد را او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بخرے چند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

"لینن خدا کے حضور میں" شاعرِ مشرق کی معرکہ آرا منظومات میں شمار ہوتی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں لینن کے موقف کو جیسے بھی واضح کیا ہو، لینن کی زبان کے واسطے سہی ذات الٰہی پر طنز کی گنجائش فراہم کرلی ہے۔ دنیا کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ؎

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

اسی نظم میں آگے چل کر مغربی تہذیب پر یوں طنز ہے ؎

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

عام مسلمانوں پر اقبال کے طنز زیادہ نہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی بے راہ روی اور بے عملی کا باعث صحیح اور مخلصانہ قیادت کا فقدان ہے۔ لیکن اقبال نے جہاں تہاں اپنے طنز کے وار سے عام مسلمانوں کو بیدار بھی کرنا چاہا ہے۔ ایک ایسا ہی شعر ہے۔ اصطلاحات مذہبی ہیں اور موضوع مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی زندگی ؎

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

احساس کے ساتھ آج کا انسان جو آج کی تہذیب کا مظہر ہے اقبال کی نظر میں ؎

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا دماغ روشن و دل تیرہ و نگاہ بے باک

اوروں پر تو سب ہی طنز کرتے ہیں اور لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ لیکن فنکار کی برگزیدگی اور عظمت اس میں بھی پوشیدہ ہوتی ہے کہ اس کا اپنے آپ سے کیا رویہ ہے؟ اس نے اپنے آپ پر کس قدر طنز کئے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں۔ ہر بڑے فنکار نے آپ اپنی شخصیت کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اقبال کی بڑائی کا ثبوت یوں بھی ملتا ہے کہ انھوں نے اپنی شخصیت، اپنی ذات کو بھی نشانہ بنانے سے نہیں چوکا۔ وہ طنز کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں، کبھی تو اس کا مقصد صرف اپنی ذات پر طنز ہے۔ اور کبھی اپنی ذات کے وسیلے سے اپنے ہم وطنوں کو عبرت دلانا۔ ان کا یہ مشہور شعر ہے

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

ظاہر ہے اس سے مراد اپنی ذات پر نہیں، قوم میں موجود گفتار کے غازیوں پر چوٹ کرنا ہے۔ ایک اور جگہ خود کو تن آسان

پکتے ہوئے قوم کی تن آسانی پہ یوں وار کرجاتے ہیں ؎

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سودا اپنا یہ اک مرد تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

جیسا کہ میں نے ابتداً عرض کیا ہے طنز و مزاح اقبال کے کلام میں کسی مستقل رجحان کی حیثیت سے نہیں ملتے لیکن اپنے عہد کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی موضوعات پر انھوں نے نہ صرف سنجیدگی اور فلسفیانہ زاویے ہی سے توجہ دلائی ہے بلکہ طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے اور جہاں بھی انھوں نے طنز و مزاح سے کام لیا ہے وہ کامیاب رہے ہیں۔ اسی طنز و مزاح کے باعث اقبال نے اہل خانقاہ پر طنز کرتے ہوئے اپنے بارے میں یہ جو دعویٰ کیا ہے اس کو تسلیم کرلینا پڑتا ہے ؎

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

نظر برنی

شیطانی ہے

اب تیسری شادی کریں، ارمان یہی ہے
"جینے کا مزا ہے تو مری جان یہی ہے"
تعلیم کو چھوڑا ہے تو نیتا جی بنیں گے
پیشہ یہی بہتر ہے کہ آسان یہی ہے
ہم نے جو کہا "کھاتے ہو کیوں قوم سے رشوت"
وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے
بھرتا ہوں چپلم پاس کی امید کرم پہ
دنیائے ترقی کا تو سامان یہی ہے
اک دل میں اگر آج ہیں کل دوسرے دل میں
ہارے ہوئے نیتاؤں کی پہچان یہی ہے
مکاری و غیبت سے ملے گی مجھے کرسی
ہاں میرے گورودیو کا فرمان یہی ہے
دسویں میں وہ پڑھتے ہیں فقط سات برس سے
نیتا وہی بن جائیں گے امکان یہی ہے
احتیاط سے تم رکھیو کے رہنا ہمیں نظر بند
بنگلہ کی بدولت یہی فرماتا ہے

مرتبہ: ایس پی ٹی صبو بنگیوی

زندہ دلانِ حیدرآباد کا گیارھواں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

ارضِ دکن اور زندہ دلانِ حیدرآباد اب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوگئے ہیں ہر سال کی طرح سالِ حال بھی عظیم الشان کل ہند پیمانے پر طنزیہ و مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ۳۰ر نومبر ۸۷ء کی شب اپنے دامن میں مسکراہٹوں (اور قیمتی) قہقہوں کے خزانے سامعین کی دلچسپی و دلبستگی کا سامان کرتے ہوئے جلوہ گر ہوئی۔ جس میں شرکت کرنے والے ہزاروں سامعین کی موجودگی اس کی شاندار کامیابی کی ضامن ہے مشاعرہ کا آغاز ٹھیک (۸) بجے ہوا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ریاستی وزیر آبکاری جناب پی گنگا ریڈی صاحب نے شرکت کی۔ دکنی زبان کے ممتاز و مقبول شاعر جناب سلیمان خطیب کے سانحہ ارتحال پر بطور خراجِ عقیدت اس مرتبہ مشاعرہ کی صدارتی نشست خالی رکھی گئی تھی۔ ان کا ایک رنگین و خوبصورت پورٹریٹ شہ نشین پر رکھا گیا تھا جس کو حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ جناب سعادت علی خاں صاحب کے فرزند جناب سجاد علی خاں نے تیار کیا۔ اس کل ہند مشاعرہ میں نامور شعرا کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق شعرا اکرام حصہ لیتے ہیں ابھرتے ہوئے شاعر منور علی مختصر سے ابتدا ہوئی پھر چکر نظام آبادی نے پہلے ایک قطعہ سنا کر غزل پیش کی۔

○

چکر نظام آبادی

تم میرے ہاتھ دھلاؤ تو مزا آجائے
مرغ بریانی کھلاؤ تو مزا آجائے

دوبئی جاکے وہاں سے مجھے تحفہ دینے
ٹیپ ریکارڈ بھجواؤ تو مزا آجائے

گالیاں دیتا ہے رستہ میں مجھے میرا رقیب
اس کو غنڈوں سے پٹاؤ تو مزا آجائے

رٹ کے دے سکتا ہوں بھاشن بڑے انداز سے میں
مجھ کو لیڈر جو بناؤ تو مزا آجائے

دوڑتا آتا ہے پولیس کا جوان میری طرف
تم اڑنگا اس کو لگاؤ تو مزا آجائے

تم منسٹر کے ہو چیچے مجھے معلوم ہے یہ
کام میرا بھی بناؤ تو مزا آجائے

چار غزلیں ہیں میرے پاس اگر ایسے میں
نائٹ میری جو سناؤ تو مزا آ جائے
سن کے جگر کی غزل اپنا گلا پھاڑ کے تم
آسماں سر پہ اٹھاؤ تو مزا آ جاوے

کنوینر نے محمود نشتر کے نام کا اعلان کیا۔

○

نئے رنگ کا اس نے پایا شباب
کہ چہرہ ہے میک اپ تو گیسو خضاب
وہ نکلے ہیں نشتر سنور کر مگر
نئی جلد میں ہے پرانی کتاب

○

ہر شئے تجھے قرضے کی درکار نہیں ہے کیا
قرضہ ہی ترقی کا معیار نہیں ہے کیا
لائسنس کو پوچھا ہے کیا کوئی حسینوں سے
اک ایک نظر ان کی ہتھیار نہیں ہے کیا
جھک جاتا ہے سر تیرا دل ہے کہ نہیں جھکتا
زاہد ترا ہر سجدہ بے کار نہیں ہے کیا
لوگوں کو ستاروں نے مریخ بھی پہنچایا
اک میرا ستارہ ہی دمدار نہیں ہے کیا
لڑکا ہو کہ لڑکی ہو سب ایک ہیں فیشن میں
پہچان بھی اب ان کی دشوار نہیں ہے کیا
ہندو ہوں کہ مسلم ہوں سب اس کے پجاری ہیں
اس دور میں لاٹھی ہی اوتار نہیں ہے کیا
ہوٹل میں گزارا دن محفل میں کٹی ہے شب
بتلا ترا اے شاعر گھر بار نہیں ہے کیا
ہر تازہ خبر نشتر مل جاتی ہے جنتا کی
چہرہ ہی غریبوں کا اخبار نہیں ہے کیا

اب گلیم سید کی اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کر رہے ہیں۔

○

سرقہ جو مرے جیب میں کل رات ہوا ہے
بچوں سے زیادہ مجھے بیوی پہ شبہ ہے
محنت کا تصدق ہے نہ خدمت کا صلہ ہے
جو کچھ بھی ملا بیوی کی قسمت سے ملا ہے
عادت تری پہلے کی طرح اب بھی وہی ہے
داڑھی تو دکھاوے کے لیے چھوڑ دیا ہے

○

گئے دعوت میں وہ کھانے کو بریانی
لگا کر میرے ذمہ گھر کی نگرانی
حفاظت گھر کی میں کر دوں مدد فرما
اکیلا میں ہوں اور ہے ماما رمضانی

●

پھر بڑی بی بول رکھی میں عاشقی کرنا کیسے
مرتے مرتے بھی آنکھوں پہ جان سے مرنا کیسے
ایک بالشت کے برابر بھی نہیں ہیں بول یکّی
ان کے زلفوں کو سمجھ کو سانپ میں ڈرنا کیسے
کھیل کھیلے تھے سو پہلے آج پھر وہ کھیل کو
کھاتے جیسا کر کو ٹھوکر گود میں گرنا کیسے
پھر منانے کو بھی معاف جا کو اگر تیرے دل کتنا
چاندنی میں لے کو تنہا ان کو میں پھرنا کیسے
ان کی اماں کا عجب ہے ان سے بڑھ کر پو کرنا
بن کے لوٹ میں بھی سسرے کی طرح پھرنا کیسے
ان کے ادوار ٹائم کر کو رات میں آنے تلک
بیٹھ کو چولہے کے میں روٹیاں گھڑنا کیسے
ڈالکوان کا غرارہ چھوڑ کو پھیکے بال
اونچی ایڑی کا میں سینڈل پہلی کو پھرنا کیسے
چھوڑ کو ماں باپ کو میں بنکوان کا رٹ مرے
جی کو ٹکڑوں پو خسر کے بیٹے پھرنا کیسے

سن کلیم اب دوستاں سب ہنستے ہنستے بول دیں
بے سمجھ تو بت جیا ہے، یا سمجھ مرنا کتے

حیدرآباد کے بزرگ شاعر سرپٹ حیدرآبادی نے سلیمان خطیب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد دو قطعات اور ایک غزل پیش کی۔

ن

بھاگتے ہیں نہ لڑ کے مرتے ہیں
آؤ ہم کیا ہیں ہم بتاتے ہیں
ناز ہے اپنے ظرف پہ ہم کو
جوتیاں کھا کے مسکراتے ہیں

ہم ایسے عالی ظرف جہاں میں کہاں رہے
دن رات کھا کے جوتیاں جو شادماں رہے
پھرتے رہے حسینوں کے رکشوں کے ساتھ ساتھ
ستر برس کی عمر میں بھی ہم جواں رہے

ہ

شاہیں بچوں کو زاغ و زغن کہہ دیا گیا
کچھ الوؤں کو جانِ چمن کہہ دیا گیا
وعدہ کیا گیا تو وچن کہہ دیا گیا
شادی اگر ہوئی تو لگن کہہ دیا گیا
اہلِ زبان بھول گئے اپنی بول چال
موباف کہتے کہتے ربن کہہ دیا گیا
کر کے سنگھار بیٹھی ہے گھونگھٹ نکال کے
بڑھیا کو ایک دن جو دلہن کہہ دیا گیا
انگڑائی لے کے چلنے لگے سینہ تان کر
سوکھا جوان کو سرو چمن کہہ دیا گیا
گھر کو ہمارے اور ہمارے لباس کو
آئینہ دارِ گور و کفن کہہ دیا گیا
کرفیو سے بھی ہو نہ سکا۔ امن برقرار
پولیس کو لاٹھی چارج بھجن کہہ دیا گیا
سرتیت بنا نہ کام کسی طرح سے تو پھر
جورو کو ماں، بھی مصلحتاً کہہ دیا گیا

عظمت بھلاواں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

مُنہ پہ توے کا نور اترا ہے
کیا سہانا یہ رنگ ہے باشا
میں زمانے کے ساتھ کیا بھاگوں
میرے پاؤں میں لنگ ہے باشا
وہ تو بیوی ہے جھٹکا مارے گی
میوزیم کی تفنگ ہے باشا
جس کو لگتا ہے کھا کے چھوڑتا ہے
کیا خطرناک زنگ ہے باشا
حق یتیموں کا کھا گیا لیڈر
یہ بھی جینے کا ڈھنگ ہے باشا
نہ کرو اس سے ناروا حرکت
بزرگوں کا پلنگ ہے باشا
جا کے بھیکا پڑا ہے بھٹی میں
کیا بھلا دیں کا رنگ ہے باشا

اس کے بعد نوجوان شاعران پوٹھ بھونگیری کو دعوت سخن دی گئی۔

لاش کو میری کفن چھینٹ کا لاؤ یارو
کوکا کولہ سے ایسے غسل دلاؤ یارو
ہجر میں ہیما مالنی کے میں مرجاؤں اگر
ضیاٹا کیز میں میری قبر بناؤ یارو
جتنا بھی بن سنور کے وہ آتے ہیں سامنے
تعریف پھر بھی ہوتی نہیں ہم سے آج کل
جب سے لڑی ہے آنکھ پڑوسن سے دوستو
لگتا نہیں ہے جی مرا بیگم سے آج کل

اب ڈھکن رائچوری مائک پر آتے ہیں۔

دکنی بولی کا پیش امام گیا
دکنی کا شاعر عوام گیا
خوب جی بھر کو زد لیو اٹھا لیو
شاعری کا بلند مقام گیا

ایک ہی بیوی تو میرے پاس ہے
شادی کرنے کی نئی پھر آس ہے
سن کے میرے دوست نے فوراً کہا
ذکر کیوں کرتے ہو گھر میں ساس ہے

تغیرات زمانہ

کیا تو بھی یار و عجب الٹا زمانہ مر گیا
جو بعد دال کالات دال پلاؤں دبانا ہو گیا
ایک چھوکری کی ہوئی شادی تو پہلی رات میں
بو مٹیاں اٹھے کہ لو دولا زنانا ہو گیا
جاکے وہاں چھوریاں بچاری دیکھنے وال کا غم
عاشقاں کو دید کا اچھا ٹھکانا ہو گیا

آئے گا اک وہ زمانہ جو بعد دال بولینگی یوں
دیکھو یہ گبرو جواں بڈھا پرانا ہو گیا
دیکھنا ڈھکن کے اب چھوڑو نکو نظراں کے تیر
ایک دل اب تھا سو خیراں کا نشانہ ہو گیا

اب سامعین کہنہ مشق شاعر اسماعیل ظریف کے قطعات سے محظوظ ہو رہے ہیں۔

محفل شعر کو گرما کے کچھ رات کٹے
اور شعرا کو پکڑ لاؤ کہ کچھ رات کٹے
شب فرقت میں تڑپنے سے تو بہتر ہے یہی
آنکھ کیچے میں اٹھ کے جاؤ کہ کچھ رات کٹے

کالی جاڑوں میں جو لنگ جیا کرتے ہیں
رضائی اوڑھ کے وہ انتظار کرتے ہیں

یہ ساٹھ سال کے پٹھوں کی دیکھئے ہمت
پرانے پل کو جو ہر روز پار کرتے ہیں

پریشاں ہو کے بھی اقدام خودکشی نہ کرو
جہاں بھی سینگ سمائے وہیں پہ جاکے مرو
اکیلے مر کے بھی شاید سکوں مل نہ سکے
مرو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے مرو

●

شاعری سے کم سے کم یہ تو ہوا اک فائدہ
واہ واہ کے شور میں دادِ سخن پانے لگے
جا گنے سے بڑھ گئی شاعر کی بینائی ظریف
اب تو دن میں بھی اسے تارے نظر آنے لگے

مہمان شاعر مستان لکھنوی نے سلیمان خطیب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے کلام کا آغاز کیا۔

شاعر تھا لاجواب تو انسان تھا عجیب
اس کی نظر میں ایک تھے زردار اور غریب
اس کو بھی لے گئے ملک الموت اپنے ساتھ
طنز و مزاح کا تھا زمانے میں جو خطیب

○

کتاب شوق کا بگڑا ہوا حروف ہوں میں
خنگوں کھایا ہوا عشق کا سفوف ہوں میں
جو ہوشیار میں ہوتا تو مر گیا ہوتا
خدا کا شکر ہے مستر کہ بے وقوف ہوں میں

○

موٹا بنا دیا کبھی دبلا بنا دیا
انسان کو جس مزاج کا چاہا بنا دیا
تھوڑا سا بچ رہا جو بشر کا میٹریل
اور کچھ نہ بن سکا اسے نیتا بنا دیا

○

خط اردو میں بھی اب کچھ نئی بدعتیاں ہوں گی
کہیں پہ ماترائیں اور کہیں پہ پائیاں ہوں گی
رہا کچھ دن جو فیشن کی ترقی کا یہی عالم
لنگوٹا ہوگا گردن میں کمر میں ٹائیاں ہوں گی

رشید میر جیلانی آمریکہ پہنچیں۔ ان کا کلام ملاحظہ فرمائیے :

چار شعر

بیگم کی حکومت ہے انجام نمی دانم
کیا حکم بجا لاؤں جب کام نمی دانم
دن رات فقط نخرے آرام نمی دانم
کب گھر میں سحر آئی کب شام نمی دانم
شادی کا دہی اک دن پھر آج کا یہ دن ہے
فالودہ نمی نوشم' بادام نمی دانم
پہنا تو دیئے کنگن آں چہرہ نمی بینم
ہر روز دھلے برتن حمام نمی دانم

آخری لمحے کا شاعر

آغازِ شب سے بند ہے کمرے میں نئے نواز
فکرِ سخن میں غرق ہے بستر پہ ہے دراز
تکیہ پہ ہے ردیف تو چھت پہ ہے قافیہ
مصرعہ کھٹک رہا ہے زمیں ہے مزاحیہ
سنجیدہ حرکتوں میں بھی پنج ہے مزاحیہ
کھایا نہیں ہے اس نے ابھی تک عشائیہ
مطلع کے انتظار میں ڈھلنے لگی ہے رات
"مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات"
آنکھیں دھواں دھواں ہیں دھندلکا دماغ میں
کھلتا نہیں ہے پھول دلِ داغ داغ میں
دو چار دن سے تیل نہیں ہے چراغ میں
گذری تھی پچھلی رات بھی اک پائیں باغ میں
تخلیق کا یہ کرب ہے جزو پیمبری
ہوتی ہے مفلسی میں یہاں حب شاعری

نازل ہوا جو شعر تو جیسے کہ چل پڑے
ارشاد کہہ کے چپ ہے بلبلے نکل پڑے
لطفِ زباں کے واسطے کھشتی اُبل پڑے
محفل کا رنگ دیکھ کے مچھر بھی چل پڑے
شاعر نے پائی داد بقدر مشاعرہ
غائب اگرچہ ہے یہاں صدرِ مشاعرہ
چوٹی کے شاعروں میں اب اس کا شمار ہے
باتوں میں ہے سرور' بدن میں خمار ہے
پچھلے کئی دنوں سے مسلسل بخار ہے
بیوی کا مہر اور کرانہ ادھار ہے
اک چل بیلا و تازہ غزل میں دکھائی دے
پڑھنے لگے وہ شعر تو ہچکی سنائی دے

●

دکنی زبان کے شاعر حفیظ خاں سپاٹ اپنے مخصوص انداز میں نظم سنا رہے ہیں۔

محبت میں جب تل گئی ناف
تو ہوگئے بالاں سر کے صاف
تو ہم دورسے پو نکل گئے
تو ہم ....
کیا اک لڑکی سے اظہار
میں کرتا ہوں تجھ سے پیار
ہوئی جب نظریں دو سے چار
پڑا جوتوں کا ایسا ہار
کہ سر کے مینکے ڈھل گئے
.... نکل گئے
بڑھانے قد کو سب مر رئیں
سیڑھیاں پاؤں کو بن رئیں
مٹک کو تن کو یوں چل رئیں
لوٹے ہی بینے سے پھر رئیں

اُلّوں فیشن میں ڈھل گئے

تو ہم دورے . . . .

محبت نے کیا یہ حال
چھیڑا برقع دیکھ کے لال
تو نکلا اندر سے دجال
کیا اسنے وہ لالم لال

تو ہڈیاں سارے گل گئے

تو ہم دورے . . . .

منجے پہلے تو وہ تولے
بلّو با واسے پھر بولے
میں بولا نکلیں گے ڈولے
کدھر میں سانپ اُلّو نیولے

تو منہ پو تھوک اگل گئے

تو ہم دورے . . . .

ہماری اماں کو گھالے
دوا پھر پیٹ میں ڈالے
پڑے قسمت پہ یوں تالے
بھلادیں کو گلے ڈالے

تو ہم کا نوٹس پو پھسل گئے

تو ہم دورے . . . .

بدلنے عورت کو دھجال
بنائیں جنتا کو فٹبال
کے الٹی ہوگئی ایسی چال
پلٹ کو منہ پو لگ گیا مال

تو داتاں سارے ہل گئے

تو ہم دورے . . . .

عرق پی پی کے خود کا ایک صاحب
پھر اس پو لکھ رہے نایاب
پلاؤ اور بیو احباب
شرابوں کی جگہ پیشاب

الّوں دورے پہ نکل گئے
. . . . نکل گئے

زمانے بھر کی عیّاری
مرے لیڈر پو ہے بھاری
عرق کی لت میں بے چاری
ہوا جنتا کا پاؤں بھاری

تو کالک منہ پو مل گئے
تو ہم دورے پو نکل گئے

تو ہم . . . . . .

پھر فیض الرحمٰن فیض نے اپنا کلام پیش کیا۔ فیض صاحب کے بعد پاگل عادل آبادی نے پہلے چوٹے پھر غزل سنائی۔

کیا خوب آج کل ترقی دکھائی دے
انڈا بھی اب تو دورسے مرغی دکھائی دے
مردوں کی کھوپڑی ہی نہیں صاف ان دنوں
لیڈیز کی بھی کھوپڑی گنجی دکھائی دے

○

قبر پہ روتا تھا اک روز اکیلا شوہر
لگ رہا تھا کہ کسی کا ہے یہ تازہ شوہر
ہمنے رونے کا سبب اس سے جو پوچھا تو کہا
دفن ہے اس میں میری بیوی کا پہلا شوہر

○

آئے گا وہ بھی دن یہ لکھا ہے کتاب میں
خوشبو غلاظتوں میں تو بدبو گلاب میں
پاگل مرارجی کا انوکھا خیال ہے
آبِ حیات ہے کہتے اپنے پیشاب میں

○

باپ سمجھا تھا جسے ماں کا وہ شوہر نکلا
بعد تحقیق کے گویا وہ کبوتر نکلا
ترس کھا کر جسے لایا تھا سڑک سے گھر کو
وہ تو کم بخت مرا ہی کیلنڈر نکلا

غزل

فلموں کی موسیقی کے چرچے بھی کم نہیں ہیں
بجنے میں اپنے دیسی دھپڑے بھی کم نہیں ہیں

مانگے ہے ریل گاڑی سسرال سے جہیز میں
یوں بن ٹکٹ بھٹیچر دولہے بھی کم نہیں ہیں

پکچر کی کیو میں ایسے نقشے بھی کم نہیں ہیں
بہرے تو پھر ہیں بہرے اندھے بھی کم نہیں ہیں

دن میں بغیر قندیل سیکل پکڑنے والے
لپنے سٹی میں ایسے کندے بھی کم نہیں ہیں

کھجلی بھی زندگی کا معمول بن گئی ہے
ناخن بھی ہیں ہزاروں گنجے بھی کم نہیں ہیں

بچوں کا کھیل تھرٹی بڈھوں کا کھیل ففٹی
پینچ تو پھر ہیں پینچ چھکے بھی کم نہیں ہیں

جڑواں ہوئے ہیں بچے ناکام ہے پلاننگ
قدرت علی کو ایسے تحفے بھی کم نہیں ہیں

مجنوں میاں کے ابا گر ہیں پرانے پاپی
لیلیٰ کی والدہ کے نخرے بھی کم نہیں ہیں

گذرے جو غیر ادھر سے تازہ غزل سنا دے
پاگل تری گلی کے کتے بھی کم نہیں ہیں

مالیگاؤں سے ظہیر ابن قدسی کو اس بار مدعو کیا گیا تھا۔ ان کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔

بیمار شاعری ہوں دوا دیجئے مجھے
معجون واہ وا کھلا دیجئے مجھے
میں بھی مدد کروں گا غریبی ہٹانے میں
پہلے کہیں وزیر بنا دیجئے مجھے

زن مریدی کی وجہ سے یا محبت کے طفیل
کام جو بیوی کا تھا سب کچھ میاں کرنے لگے
انتہا یہ ہے کہ جب بیوی ہوئی امید سے
مارے ہمدردی کے خود ہی الٹیاں کرنے لگے

کرتا ہوں دعا تجھ سے اک بندۂ عاجز ہوں
علما کی لڑائی کو اس طرح سے نپٹا دے
ہر راہ کی بک بک سے اچھا ہے خدا یا مالک
تو جانور کی گردن میں تاریخ بھی لٹکا دے

ٹسٹ ٹیوب بے بی

مرحبا سائنس کی جادوگری
نلکی زادی دہر میں پیدا ہوئی
غم زدوں کے دل کا غنچہ کھل گیا
باپ بن جانے کا رستہ مل گیا
ہوں گی اب بنجر زمینیں بار آور
خشک پیڑوں پر بھی آئیں گے ثمر
یوں سجائے جائیں گے دیوار و در
پھول لے آئیں گے دے کر آرڈر
سوچتا ہوں میں کہ کل یہ تجربہ
کر نہ دے دنیا میں پیدا مسئلہ

اس مشینی دور کا ہو کیا بیاں
رنگ بدلے جس میں ہر پیر و جواں
نوجواں شادی کی جھنجھٹ چھوڑ کر
مذہب و ملت سے ناطہ توڑ کر
ایک کاروبار یوں جاری کریں
بنک ذاتی اپنا اپنا کھول لیں
اشتہار اس طرح جس کے آئیں گے
ہر طرح کے ہم سے لیجے مادے

ہوں گے بچوں کے بھی شاپنگ سینٹر
درج ہوں گی قیمتیں یوں بورڈ پہ
گورے لڑکے کی ہے قیمت ایک ہزار
مجھ سے کالے پانچ سو میں لیجے چار
لڑکیوں کا ریٹ ہو گا سب سے کم
کون ان کو لے کے پالے ایک غم
یہ عبارت بھی وہاں ہو گی لکھی
ایک درجن پر ہیں دو بچے فری
تجربہ یہ ہو گیا گر کامیاب
دو دو زہ ہو جائے گا پھر ایک خواب

گو ابھی ہے بات یہ خود ساختہ
دکھ سہے گی کل نہ کوئی فاختہ
ہوں گے ناکارہ سبھی اس کا ہے غم
فیملی پلاننگ کے سارے آئیٹم
کیسے ان بچوں کی ہو گی روک تھام
ہوں گے اس الجھن میں لیڈر اور عوام
ان مشینوں کی وجہ سے فی منٹ
آئیں گے دنیا میں لاکھوں بے ٹکٹ

جدا مجدا ہوں گے انسانوں سے کم تین
ایک آدم ایک بندہ ایک مشین
کم نہ تھے دنیا میں پہلے ہی فساد
اب لڑیں گے نلکی والے انسان نژاد

وقت گر یونہی کرم فرمائے گا
تب سوا نیزے پہ سورج آئے گا

○

ظہیر قدسی کے بعد قادر حیدرآبادی نے مائیک سنبھالا۔

ممکن نہیں ہو جائے یہ ہر فرد بشر سے
جو کام لیا کرتا ہوں میں دست ہنر سے
ہر بار نئے شوز ملے ہیں مجھے قادر
خالی نہیں لوٹا کبھی اللہ کے گھر سے

نسلوں میں تو کیا جواب نہیں ہے ہزار میں
یکساں نئے روزگار ہے ہر کاروبار میں
کل تک جو پھر کے لیتے تھے برتن پھٹے ہوئے
آج ان کی بھی دوکان ہے بیگم بزار میں

تھا تکبر سے سبز باغ اپنا
زر سے جلتا تھا جب چراغ اپنا
پیسے کم ہو گئے جمعدی میں
نارمل ہو گیا دماغ اپنا

نگاہوں کا سہارا بھی سہارا ہو نہیں سکتا
اشارہ کرنا بھی چاہیں اشارہ ہو نہیں سکتا
کہاں آ کر ہوا پورا ہماری دید کا ارماں
کہ اب عینک بغیر ان کا نظارہ ہو نہیں سکتا

یہ جو سر کو جھکائے بیٹھے ہیں
اپنے لک لٹائے بیٹھے ہیں
دھوکے دے دے کے جو کماتے تھے
دیس میں سب گنوا بیٹھے ہیں

مذاقِ شعر سے ہٹ کر مذاق کی باتیں
یہ کیا مذاق ہے مت کر مذاق کی باتیں
مذاق عام سے ہٹ کر جو بات کرتے ہیں
انہی کا کام ہے قادر مذاق کی باتیں

بک جائے جو ہر بھاؤ میں وہ مال نہیں ہوں
سہہ جائے جو ذلت کو بھی وہ ڈھال نہیں ہوں
نادار ہوں مفلس ہوں مگر پھر بھی اے قادر
زردار جسے اوڑھ لے وہ شال نہیں ہوں

نادان سمجھتا ہے، سمجھ دار نہیں ہوں
دانا کو شکایت ہے طرفدار نہیں ہوں
یہ بات اسی واسطے پیدا ہوئی قادر
ہر ایک کا میں حاشیہ بردار نہیں ہوں

پیسوں کی راستے میں مکمل تڑی ہوئی
سوئے پلیٹ فارم پہ کمبل تڑی ہوئی
شامت نے میری ساتھ نہ چھوڑا کسی جگہ
آیا مشاعرے میں تو چپل تڑی ہوئی

غزل

تھی مسلسل انھیں اور مجھے دست جاری
یوں ہی کٹ گئی وصل کی رات ساری
تمہارا بھی کوچہ ہے، مکڑی کا جالا
یہاں آئے وہ جس کی شامت پکاری
کہاں تم نے ہم سے تنہا کبھی دن
کہاں تم نے دیکھی شرافت ہماری
وہ ہیں ساتھ غیروں کے پھر بھی میں خوش ہوں
نئے دور کی ہے محبت ہماری

○

کرم یاد ہے ان کی ساقی گری کا
حوالات میں رات ہم نے گزاری
یہاں لوٹ لیتے ہیں اغیار محفل
کہاں مر گئے ہیں ہمارے حواری
یہ سب مے کشوں کی دعا کا اثر ہے
ترقی پہ ہے دفتر آب کاری
عجب انقلاب زمانہ ہے قادر
میاں بنتی جاتی ہے بیوی ہماری

دکنی زبان کے شاعر اشرف خوندمیری نے جہیز کے تعلق سے ایک نظم "پھکٹ کا مال دی دے لال" سنائی :-

دولہا سڑکوں کی جھاڑو، دولہے کے بھایاں ہیں کنگال
اور اس کے میدر باوا ہیں سانپے کو پیسے کے دلال
چچا اٹے پوجا کو کرتے تیں ادلی بدلی مال'
سرکاری سسرال کو جا کو پھوپا کاٹیں بارہ سال
پھر بھی چاندی کے چھوٹے ٹکڑوں پو ٹپکا رئیں رال
مال پھکٹ کا سمجھ کو بھونی کرلے رئیں دیدہ دل کو لال
آنکھیاں گھگے ہے پنکی آنکھیوں میں تھوڑا جالا ہے
ذرا اوچا سنتیں بیٹھا ہوا کان کا تالا ہے

دولہے پاشا کی صورت تو جاند کا ٹکڑا ہے پکی !
پیاری پیاری صورت پو بہتا ہوا مُرکی نالا ہے
پھوٹا ٹا لونا دے کو لے رئیں پٹیل کی توتی گنگال
مال چھگنڈا کا سمجھ کو بھونئیں کرے رئیں دیدوں کو لال

دولہے والے کچھ بھی منگتیں نئیں کرنا فریاد کتے
دولہن والے جہیز میں ان کو دینا حیدرآباد کتے
باوا بگڑ جاتے سو ان کو کیا بولتیں کی نئیں معلوم
پوتے بگڑ جاتے سو اُنوں دس نمبر کی اولاد کتے
اُنوں بھی چالو اُنوں بھی چالو، دونوں ہیں بخشی ہوئی کھال
مال چھگنڈ کا سمجھ کو بھونئیں کرلے رئیں دیدوں کو لال،

جب بھی اپنی لائن پو آتیں سسرے کو دے تیں چکنی
گھس گھس کو گھسا دے تیں آنکھوں میں مرچی کی بکنی
شکر دانے کے پیچھے لُم کئی سو چھٹی بن کو
جب بھی جکو بھو نکتے سمجھیں ان کی نیت کی پھکنی
کانوں میں ہلو بھو کئے 'جا' جا کو تو سسرے کو گھال
مال چھگنڈا کا سمجھ کو بھونئیں کرلے رئیں دیدوں کو لال

کتا بخت آور بن کو دولہے کا پاؤں گھر میں آیا
اچھے بھلے گھر کو لپیٹیا کمان کے کی موڈگس کا سایا
کمر سے پتھر بن کو اوں میں ڈوبانا اچھا تھا
ایسے جو ئیں کو دے کے بیٹی سسرا بچارا پچھتایا
گھر کو چپکلے لگ گئے، گھر جا کو دیکھو ماے کڑیا کا تال
مال چھگنڈ کا سمجھ کو بھونئیں کرلے رئیں دیدوں کو لال

جب سے بیٹی کو کرکو دیئیں باوا کو لو چھڑنا ہے
ان کے آنگن میں کا سارا ہی آن کے آنگن میں پڑتا ہے
جب تک گن سے گھستے رہتیں دولہے بجلی کے کھمبوں میں
دولہن مسری کی ڈلی اور سسرا مٹھا لگتا ہے
اوپر سے کو نیچے تک چھیل دے رئیں سسرے کی چھال
مال چھگنڈ کا سمجھ کو بھونئیں کرلے رئیں دیدوں کو لال

جنیں کسی کے ہنستے بستے گھر میں زہر غم کا گھولیا
اُنیں جھگونے میں اپنے کبکی با سی کسنکیاں ڈھولیا
نیت میں خطرہ ہوئیں گا تو پڑیں گا جھولی میں پتھرہ
بڑے بڑے لوگاں بولیں میں دل سے لگا کو نئیں بولیا
جنیں بھی توڑی دل کی ہائے لگیں گی اس کو ماں کی چھال
مال چھگنڈ کا سمجھ کو بھونئیں کرلے رئیں دیدوں کو لال

چار جنوں کی نیند اُڑا کو دیکھتیں خود میٹھے خواباں
نفع کا سودا سمجھ کو کرتیں شادی بیاہ کا کاروبار
ہاتھ میں لے کو ترازو لالچ کے یہ سوکاریاں،
دولہن والوں کے گھر کو جائیں بن کو گانا دجّال
مال چھگنڈ کا سمجھ کو بھونئیں کرلے رئیں دیدوں کو لال

کنو ہنر شاعرہ صبغتہ اللہ بیماآسے کا کلام ملاحظہ فرمائیے:

"جنتی شوہر"

خواب میں آیا اپنی بیوی کے
ایک شب اس کا شوہر مرحوم
زندگی بھر رہا تھا جو مظلوم
اتنا خوش تھا کہ گنگناتا تھا
دیکھ کر اس کو مسکراتا تھا

پوچھا بیوی نے یہ تعجب سے
زندہ جب تک تھے تم ہمارے پاس
آخری سانس تک تھے کتنے اداس
گنگنانا نہ جانتے تھے تم
مسکرانا نہ جانتے تھے تم
اور آج اتنے خوش ہو سوچتی ہوں
تم یقیناً ہو آج جنت میں

حور و غلمان کی رفاقت میں
بولا شوہر کہ جی نہیں بی بی
ہے کوئی بات میں اگر خوش ہوں
گو میں دوزخ میں ہوں مگر خوش ہوں ۔

بمباش کے بعد اینگلو انڈین شاعر مصطفےٰ علی بیگ نے غزل کے کچھ شعر پیش کئے :

مائی ڈیر ڈونٹ وری
پیسہ نئیں تو سوکھی سوکھی ہے تو ہری ہری
یہ تو تیری نیچر ہے جہاں ہری وہاں چری
چھتری جیسے بال ان کے بیارل جیسے میکسی
چلتی پھرتی لگتی ہے وہ جیسے گھاس کی گری
فادر اِن لا کو سسٹنوں سے جاب دیدیئے
یعنی دال بھی ملی چاول کے ساتھ فری
مائی ڈیر ڈونٹ وری

غزل

ہاتھ میں مسیا ریج کی ریکھا چاہئے
جی میں ہے جنجال جی کا چاہئے
ان کے گھر کے سارے دروازے کھلے
چابیوں کا ایسا گچھا چاہئے
دیکھ لیتا ہوں خوشی کے کچھ ڈریم
زندگی میں کچھ تو دھوکا چاہئے
چودھویں منزل پہ ہے ان کا فلیٹ
ہم کو رسی اور چھیکا چاہئے
والف اپنی ہے حسین مانا ، مگر
ہم کو ایزا سے چینج ریکھا چاہئے

آدھی غزل کے شاعر بوگس حیدرآبادی نے چند شعر اور غزل پیش کی :

میت کو کاندھا دیوے ہے لنگڑا رقیب بھی
"چلتے ہیں خود بہ خود میرے اندر کفن کے پاؤں"

پکڑ کر لے گئے تھانے تلک ہم کو پولیس والے
"کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو"

ہوئی پچیس ویں اولاد پھر بھی ڈیڈی کہتے ہیں
"بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

ان کے شوہر نے انھیں دیکھ لیا میرے ساتھ
"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

غزل

بوگس مجھے اپنی غزلوں کا یوں عیب چھپانا پڑتا ہے
مشہور گویوں کی دھن میں اشعار کو گانا پڑتا ہے
تعریف پہ جو تعریف کریں ایک اور غزل پڑھنے کو کہیں
ہر ونگ میں پاس دے دے کر یاروں کو بٹھانا پڑتا ہے
پھر چاہے پڑھوں میں یا نہ پڑھوں طلباؤں کو قابو میں نہ رکھو
لیکن مجھے گرمانے کے لئے جی بھر کے پلانا پڑتا ہے
کیسا ہی سہی کیا اس سے غرض یاروں کو ہے بزنس سے غرض
غلطی نہ سہی غلطی ہی سہی باہر سے بلانا پڑتا ہے
گاکر نہ سناؤں میں جو غزل کوڑی کو نہ پوچھے کوئی مجھے
گانے کا مزہ لینے کے لئے بوگس کو بلانا پڑتا ہے

طالب خوندمیری نے پہلے "تیس تاریخ" سنا کر سلیمان خطیب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد نظم "ٹائم کیپسول" سنائی :

ٹائم کیپسول

میرے پیارے وطن مجھ کو نئی تاریخ لکھنی ہے
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں
اجازت ہو تو پورس کو سکندر کا چچا لکھوں
کوئی کہہ دے تو غالب کو بھی دادا میر کا لکھوں
کسی کا حکم ہو تو تاج کو بھی جھونپڑا لکھوں
قلم ہے بے دھڑک تو ہی بتا میں اور کیا لکھوں
صحیح تاریخ بھی کر دوں نظر انداز، یا لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

تری عظمت کو خطرہ ہے سیاسی شاہزادوں سے
تری خدمت بھی کرتے ہیں یہ زہریلے ارادوں سے
کبھی جنتا کو شرماکر حسین رنگین وعدوں سے
حکومت کی جڑیں مضبوط کرتے ہیں فسادوں سے
انھیں رہزن لکھوں، قاتل لکھوں یا رہنما لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

یہاں سرحد، زباں، پانی، ریاست کے بھی جھگڑے ہیں
الیکشن، ممبری، کرسی، قیادت کے بھی جھگڑے ہیں
فراق و وصل کے جھگڑے محبت کے بھی جھگڑے ہیں
میاں بیوی کے جھگڑے ہیں، ولادت کے بھی جھگڑے ہیں
ترے بارے میں یہ سب کون سے دل سے بتا لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

سہارے ڈھونڈنے والوں کو مانوں رہنما کیسے
جو پیتے ہیں لہو ان کو میں لکھوں پارسا کیسے
میں اُلٹی کھوپڑی کو بھی کہوں ذہنِ رسا کیسے
کسی مٹی کے مادھو کو لکھوں میں دیوتا کیسے
چمک جائے ذرا پتھر تو کیسے آئینہ لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

کوئی تو اتفاقاً بھی الیکشن جیت جاتا ہے
کبھی کوئی انگوٹھا دستخط پہ فتح پاتا ہے
اگر مجبور ہو تو شیرِ نر بھی گھاس کھاتا ہے
کبھی خالص گدھا بھی دھونس دھوبی پر جماتا ہے
مناسب تو یہی ہے میں گدھے کو ہی گدھا لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

قیادت ہر گھڑی کوئی نیا چکر چلاتی ہے
وزارت کرسیوں پہ نت نئے کرتب دکھاتی ہے
صحافت بھی ردائے مصلحت میں منہ چھپاتی ہے
مگر جنتا بچاری بے بسی میں سر کھپاتی ہے
بھلا کیونکر میں ایسی کیفیت کو ارتقا لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

کبھی مدراس فلمی بازوؤں میں کسمساتا ہے
کبھی پنجاب سارے دیس کو بھنگڑا نچاتا ہے
کبھی کرناٹکا گجرات کو ٹھینگا دکھاتا ہے
کبھی بنگال کا سیلاب دلی میں بھی آتا ہے
بتا کس زاویئے سے میں ترا جغرافیہ لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

ترے ہر شہر میں تھا سکّہ اُردو زباں جاری
یہی بدبخت کل تک تھی سبھی کو جان سے پیاری
نہ جانے کون سی لٹیا ہوئی ہے اس کو بیماری
کہ اب تو سانس بھی مشکل سے لے سکتی ہے بیچاری

اجازت ہو تو میں اُردو زباں کا مرثیہ لکھوں
مجھے اتنا بتا دے میں ترے بارے میں کیا لکھوں

ناگپور سے آئے ہوئے مہمان شاعر ناظم انصاری نے اپنا کلام سنایا :

وقت بے وقت بلاتے ہو یہ کیا کرتے ہو
اس بڑھاپے میں ستاتے ہو یہ کیا کرتے ہو
میں تو ملنے کے لئے آیا تھا تم سے اور تم
اپنے ڈیڈی سے ملاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

بے جھجک تھا جب تو وہ کہتے تھے دیوانہ مجھے
اب جھجکتا ہوں تو فرماتے ہیں مولانا مجھے

دیوانہ اس نے کر دیا اک بار دیکھ کر
ہم کر سکے نہ کچھ بھی لگاتار دیکھ کر
کشتی کے بادباں مجھے یاد آ گئے
بیگم تمہاری نوگزی شلوار دیکھ کر

ہے جیب خالی تو کیا پھر بھی مان باقی ہے
ضیافتوں کے لئے چائے پان باقی ہے
میں چٹکیوں میں ترے باپ کو نپٹ لوں گا
میرے دماغ میں ایسا پلان باقی ہے
تمہیں تو یاد نہ ہو گا کہ مارا تھا پتھر
ہمارے ماتھے پہ اب تک نشان باقی ہے
اسے بھی بیچ کر کھا لیں گے ایک دن بیگم
تمہارے میکے کا جو پاندان باقی ہے
ابھی سے چھوڑتے ہو بیچ کس لئے ناظم
ابھی تو آپ کا آدھا مکان باقی ہے

○

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں
کھائی تھی میں نے جینے کی جن کے لئے قسم
وہ کر گئے وفات ارے باپ کیا کروں
سیدھی کمر ہوئی بھی نہیں تھی ابھی سے پھر
ماری ہے اس نے لات ارے باپ کیا کروں
ہر روز روزِ عید ہے بیگم کے واسطے
ہر شب شبِ برات ارے باپ کیا کروں
بالغ ہوا ہوں تو جنتی علما کی کیفگ میں
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی رات ارے باپ کیا کروں
اس نے یہ کہہ کے ملنے سے انکار کر دیا
ناظم ہے واہیات ارے باپ کیا کروں

گلی نلگنڈوی نے سب سے پہلے مرحوم سلیمان خطیب کو خراجِ عقیدت پیش کیا :

نظروں سے دور رہ کے دلوں کے قریب تھا
شاعر خطیب تھا جو عجیب و غریب تھا
دکن کا جو خزانہ جو لٹا یا ہے مرے بھائی
بے تخت سلیمان تھا فن کا خطیب تھا

زخم دل پودے کے پودے سی کو ہے
میرے ہی رنگ میں افلاں بھی جی کو ہے
وہ جو فرمادیں کہ پینا ہے غلط
کیا بتاؤں وہ بھی صاحب پی کو ہے

ڈپلیکیٹ شاعر

تیر کا ہے کی داغ کا ہے کی اُٹھتا سوڈا کس کا ہے کی
کاندھا لگانے کو میں لگا دوں ڈھیر میں [illegible]

نیچے کا مصرعہ میرا ہوگا، اوپر کا مصرعہ کس کا ہے کی
کھٹا کریلا میرا ہے پھیکی لال ٹماٹر کس کا ہے کی
مری غزل کو سُن کو بولیا، شاعر ہوں ڈوپلیکٹ کتے میں
ہوٹنگ کر کو کون کی چھوٹا چمچہ کس کا ہے کی
کس کے کی چپلاں مل گئے ہیں بھینا کو پھر دوئں سڑکوں پو میں
سیدھے پاؤں میں ہے کانچ کی ڈاؤنیں پاؤں میں کس کا ہے کی
ہوٹنگ کرتیں کیوں بے مرغے مرے باوا بھی شاعر تھے
ہارمونیم ان کی بھاؤں سائیڈ میں طبلہ کس کا ہے کی
کام سے میرا کھاتے جاتا کون کھلائے کیوں پوچھوں میں
روٹی کا آڈر میں دیا تھا ٹیبل پو پایہ کس کا ہے کی
غالب کے سگوں کی قسم ہے پکا شاعر ہوں میں بھائی
میرے ہر ایک شعر پو لیکن لمبا سایہ کس کا ہے کی
میری غزل کو نکو سنو بھی میرے ترنم کو تو سنو بھی
بیٹری مری ذاتی ہے لیکن ساونڈ کا پونگا کس کا ہے کی
میری مرغی انڈے دے رئی بچے پال رہی ہے یارو
اس کے سنگت پھرتا ہے کالا مرغا کس کا ہے کی
لال کے اوپر لال بنا رئیں گیم کے اوپر گیم بنا رئیں
گلی کو جو گلی بنا رئیں ڈنڈوں پو ڈنڈا کس کا ہے کی

نوٹ: مزاحیہ مشاعرہ میں سنایا گیا یہ کلام ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے قلم بند کیا گیا ہے جس کی وجہ سے غلطیاں رہ جانے کا احتمال ہے۔ بعض شعراء کا کلام ٹیپ نہ ہو سکا۔ اور بعض کا کلام نامکمل طور پر سشریک رپورٹ کیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

ڈوپلیکیٹ مرشد

پورے جعلی مرشد ہو گئیں کس کی صحبت پکڑیں جی!
کون کی اچھا پڑھ کو بھوکیا کس کے جلے میں سپٹریں جی
اچھا ان شیشے میں اُتارئے کس کے ہاتھ کو اپڑیں جی؟
جو آچھوٹے، پینا چھوڑے، جوؤ کو چھوٹے ڈبا چھوڑے
سب چھوٹے تو چھوٹے پن کی داڑھی کیکو چھوڑیں جی

جھانپڑ ناگپوری

اپنی مصیبتوں کا دکھڑا کیسے سنانا
بہرا ہے ہائے اپنے محبوب کا گھرانا

دل رو رہا ہے لیکن ہے حکم یہ گاؤ
دادا رے دا رے دا دا رے تا نا رے نا

کہتے تو ہم پڑا نا ہاتھ اس کو پھر دکھا دیا
جھانپڑ دکھا رہا ہے جھانپڑ ہمیں زمانہ

قطعہ

منگنی کے بعد ہو گیا سسرال کا غلام
شادی کے بعد قبضۂ بیگم میں دل گیا
اک دن میں ایک ماہ کی تنخواہ ہوئی ٹپ
مندے کے بل کے ساتھ ہر بار کا بل گیا

ممتا

بڑی گائے نے اپنے شریر بچھڑے سے کہا کہ تم اپنے خاندان کی لٹیا ڈبو کر رہو گے۔ تمہیں سخت سے سخت سزا دوں گی، سمجھے؟

کچھ نہ سمجھے، نستے! شریر بچھڑا ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا سانپ کی طرح پھنکارتا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اودھم مچاتا سینگیں مارنے لگا۔

غریب زخمی گائیں، بچھڑے، بیل اور سانڈ نے تنگ دہائی دی اور بڑی گائے سے شکایت کی تو انصاف پسند گائے نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"تم سب جھوٹے ہو۔ میرا بچھڑا لاکھوں میں ایک ہے۔

راز اور امید

"آپ شاعر ہیں ؟"

"جی نہیں۔"

"آپ کے نام کے ساتھ راز کیا ہے بھلا ؟"

"یہ راز ہے"

"راز ؟"

"آپ سے کیا پردہ، میرے والد مرحوم شاعر تھے۔"

"آپ کے والد مرحوم شاعر تھے ؟"

"جی ہاں! میں ان کا بیٹا اور مستقبل قریب میں شاعر بننے کی امید ہے۔"

"یوں کہیے" راز نے راز سے کہا۔

"آپ امید سے ہیں ؟"

سزا

ایک جیب کترے نے ایک بس مسافر کے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کلائی پر کسی کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ جیب کترا گھبرا کر جیب والے مسافر سے معافی مانگنے لگا۔ غلطی ہو گئی میں
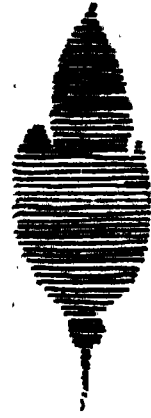
سلیم تمنائی

...ی کی مسکان کانٹے کی چبھن

شریف آدمی ہوں۔ اپنا جیب سمجھ کر ہاتھ ڈالا تھا،" اناڑی کہیں کے! بس مسافر مسکرایا۔

"استاد! جیب کترہ اپنی بھری جیب خالی اور بالکل صاف دیکھ کر چیخ اٹھا۔

"مسافر بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ اپنے فن کی بے حرمتی ہم برداشت نہ کرسکے، تمہیں سزا ملی ہے۔

اب آپ سو جائیے

شوہر جو کہ اردو کے ایک وفد کی نمائندگی کرچکا تھا بیوی سے بولا۔

"ہاں تو وزیر تعلیم نے اردو داں طبقے کی جائز شکایات بھی توجہ سے سنیں۔"

بیوی شوہر سے بولی۔ "مجھے صاحب موصوف سے بال برابر امید نہیں۔"

"نہیں بیگم!" شوہر نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے سر سے پیر تک چادر تان کر کہا۔

"وزیر تعلیم نے ہمیں چائے پلائی۔ فصیح و بلیغ اردو میں بات چیت بھی کی۔ برمحل غالب اور اقبال کے شعر بھی ترنم سے سنائے ہماری جائز شکایات پر ہمدردانہ غور و فکر اور وعدۂ فردا بھی کیا۔"

"جی!" بیوی نے لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اب آپ سو جائیے۔"

بدنامی

حاجی اللہ دتا کمرے میں تیر کی طرح گھستے ہوئے پینٹر سے بولے
"دیکھو میرے نام کے آگے اردو میں "سود خوار" نہ لکھنا بلکہ انگریزی میں بیانکر (Banker) لکھ دینا۔"

اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پینٹر نے تعجب سے پوچھا۔

"بھائی میرے۔" اللہ دتا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اللہ سے کم، دنیا جہان سے زیادہ ڈرنا پڑتا ہے میری برادری والے سود خور کہہ کر بدنام کریں گے، بیانکر کہہ لیں تو پرواہ نہیں۔"

آپ کا نام اور میری نظم

ایک مشہور شاعر نے ایک مشہور و معروف رسالے میں اپنا نام دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ تعجب سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سنبھل کر اپنے فرزند ارجمند کو آواز دی۔

"بیٹے ذرا کاغذ قلم دینا۔ میں مدیر محترم کو خط لکھوں گا۔ نہ جانے کس الو کے پٹھے کی نظم ہے جو میرے نام سے چھاپ دی۔

اوہ! بیٹے نے عرض کیا "آپ کے صاحب زادے کی ہے ابا!"

"تمہاری؟ باپ نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!" صاحب زادے نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے آپ کی نظم میرے اور میری نظم آپ کے مشہور و معروف نام کے ساتھ بھیج دی تھی۔ لیکن صرف آپ کا نام اور میری نظم چھپی ہے۔

حاضر جواب

لیڈر نے ملا کا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھا،
"مولوی صاحب! شیطان اور ابلیس میں کیا فرق ہے آخر!
حاضر جواب ملا نے فرمایا
"وہی جو آپ میں اور ہم میں ہے۔"

شرم

جب ایک انگریزی اخبار کے فوٹو گرافر نے خوفناک منظر کی تصویر لینی چاہی تو اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

زندگی اور غالب

"تقریر میں زندگی تم ہو ... زندگی"
"غالب تمہارا ... رہا تھا۔

زکات کو نکات بو گئے جناب

انٹرویو اور نمبر

ل : محترمہ آپ خوب صورت ہیں۔ لہٰذا ایک نمبر کی آپ حقدار ہوگئیں۔

ب : شکریہ جناب ،

ل : آپ کی شادی ہو گئی !

ب : خدا کے فضل سے نہیں۔

ل : اللہ کے فضل سے آپ کے کتنے بچے ہیں

ب : شادی کے بغیر بچے؟

ل : سوال کے بدلے آپ کا سوال نہیں جواب عرض کرنا چاہیے تھا۔ لہٰذا ایک نمبر کٹ گیا۔

تقاضہ

الیکشن کے ہنگامہ خیز اجلاسوں میں شیطان کو دیکھ کر منتظمین جلسہ نے بڑے ادب سے پوچھا " زہے نصیب لیکن آپ کیسے چلے آئے ! آپ کی سی با اصول شخصیت بغیر مقصد کے کہیں نہیں جاتی۔

" نہیں یہ بات نہیں ، شیطان نے فرمایا" مروت کا یہ تقاضہ ہے کہ اپنوں سے دور نہ رہا جائے۔ !"

آندھرا پردیش میں ڈیری انڈسٹری کی ترقی

(خبرنامہ)

شری ٹی راگھوا داس صدرنشین آندھرا پردیش ڈیری ڈیولپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ اور دوسرے عہدہ داروں نے آنند کا دورہ کیا۔ صدرنشین ڈاکٹر کورین اور صدر شعبہ جات نیشنل ڈیری ڈیولپمنٹ بورڈ اور ملک یونین لمیٹڈ کے ارباب سے ۲۴ اور ۲۵ جنوری کو ریاست میں ڈیری ڈیولپمنٹ کے مسائل پر گفتگو کی نیز دودھ جمع کرنے کے مراکز، بل مدر فارم، کیٹل فیڈ فیکٹری، آئل فیکٹری وغیرہ کا بھی معائنہ کیا۔ گفتگو میں یہ بھی غور ہوا کہ آندھرا پردیش میں ۳۸ لاکھ سے ۴۹ لاکھ لیٹر دودھ کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ اس تعلق سے نیشنل ڈیری ڈیولپمنٹ بورڈ اور انڈین ڈیری ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے حصے پر بھی غور ہوا۔ آپریشن فلڈ II پروگرام کے تحت یوروپین اکنامک کمیونٹی اور ورلڈ بنک کی مدد حاصل کرنے پر بھی گفت و شنید ہوئی۔ اس امداد سے ہر روز ۵ء۱۹ لاکھ لیٹر دودھ کا ۱۵ منتخبہ اضلاع میں (مائع دودھ اور اس سے پیدا شدہ اشیاء کے لئے جس پر ۳۰ تا ۴۰ کروڑ روپے کا خرچہ آئے گا) انتظام کرنے کی سہولت ہوگی۔

ڈاکٹر کورین نے ریاست آندھرا پردیش کی ہر طرح سے امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس ریاست کے تعلق سے ان کا خیال ہے کہ دودھ کے سلسلہ میں اس سے بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے تجویز رکھی کہ حیات نگر اور منہ کی بیماریوں کا ویکسین پروڈیوسنگ سنٹر ۱۵ کروڑ کے صرفہ سے قائم کیا جاسکتا ہے۔

جاری کردہ : آندھرا پردیش ڈیری ڈیولپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ لالہ پیٹ حیدرآباد

گھر بنوا رہا ہے ۔ اور اسے CIVILISATION تک پہنچنے کے لئے پاپڑ نہیں بیلنے پڑیں گے ۔ بلکہ CIVILISATION خود مجبوراً اس کے پاس پہنچے گی اور جس راستہ سے پہنچے گی ۔ اسے ہم بھی استعمال کریں گے ۔

میری بیوی نے بھی اطمینان کی سانس لی ۔۔ کیونکہ شام میں جیسے جیسے میری واپسی کا وقت قریب آتا جاتا ہے ۔ وہ آیتہ الکرسی پڑھنا شروع کر دیتی ہے ۔۔ کیونکہ ۔۔ جب ہر روز شام میں پل صراط سے گذر کر اپنی چھکڑا اسکوٹر پر اس مقام تک پہنچتا ہوں ، جہاں سے پتھروں ۔۔ اور چند ٹوٹے پھوٹے پائپوں پر ڈالی ہوئی مٹی پر سے گذرتا ہوا راستہ (یا راستہ کا کارٹون ۔ !) میرے گھر تک پہنچتا ہے ۔۔ تو پہلے اسکوٹر کو خطرناک آثار پر سیدھا لگاتا ہوں ۔۔ تصور ہی تصور میں ۔ راستہ کے عین مرکز کا تعین کرتا ہوں ۔۔۔ زور زور سے باتیں کرتی ہوئی عورتیں سانس روک لیتی ہیں ۔۔ بچے رونا چھوڑ دیتے ہیں ۔۔ اور پھر میں آنکھیں بند کر کے ۔۔ بریک پیر ہٹا لیتا ہوں ۔۔۔ اور میری قدیم اسکوٹر ایک جھٹکے کے ساتھ تقریباً اڑ کر دوسرے کنارے سے جا لگتی ہے ۔۔۔ ویسے ابھی تک تو نالے میں گرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں ۔۔ لیکن ۔۔۔ ! ! ؟

ہاں ۔۔ تو میں ۔۔ ایک سوال کا ذکر کر رہا تھا ۔۔ جو میرے ذہن میں ایک طرح سے کلبلا رہا ہے ۔

ہم سب CIVILISATION کے ۔ ہمارے سامنے سے گذر کر بڑے لوگوں تک پہنچنے کا انتظار ہی کرتے رہے ۔ لیکن ایک دن صبح ۔ جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ CIVILISATION جو شاید ۔ سڑک نمبر ۱۲ کی طرف زیادہ طاقتور تھی ۔ ساری چٹانوں ۔۔ اور ۔۔ رکاوٹوں کو پھاندتی ہوئی ایک نہایت خوبصورت ۔۔۔ اور پائیدار سڑک کی صورت میں ۔۔ مریخ تک پہنچ گئی ہے ۔۔ جہاں بڑے لوگ گھر بنا رہے ہیں ۔ ! !

اور سنا ہے ۔۔

کہ یہ سڑک ۔ بلدیہ نے بنوائی ہے ۔ ! !

سوال یہ ہے کہ یہ CIVILISATION ۔ بڑے صاحبوں کا کب تک عشق کرتی رہے گی ۔

ہم کب تک ۔ اسکے لئے ناقابل عبور رہ رہیں گے ۔۔۔ ؟

پرویز یداللہ مہدی

(قسط وار ناول)

چھوٹے بنگلے کی چھت پر خان فولادی عرف طوطا پری کے بٹوے کی موجودگی اس بات کا کھلا ثبوت تھی کہ پچھلی رات ڈالا سارا آسیبی چکر اُسی فتنہ پرداز کا چلایا ہوا تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس نے یہ آسیبی چکر چلایا کیوں ؟ اُس میں اُس ناہنجار کا کون سا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مرحومہ مسز چہ خوب کے روپ میں اُس نے کیسے پیش کیا ہوگا۔ شاید خود بال وگ وغیرہ لگا کر۔ یہ سوانگ بھرا ہو۔ ہم اپنے آپ میں اس طرح الجھے ہوئے تھے۔ اُدھر قبلہ چہ خوب بُری طرح بھنّائے ہوئے تھے وہ اس معاملہ کی اطلاع پولیس کو دینے کی بھرپور تائید میں تھے جبکہ ہم اور شبو اس معاملہ کو اس وقت تک طشت از بام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جب تک کہ اس سارے ڈرامے کی اصلی غرض و غایت کا پتہ نہ چل جاتے۔ لیکن قبلہ چہ خوب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ہم نے بھی اپنے دل و دماغ میں طوطا پری کے خلاف اب تک اُبھرنے والے تمام شکوک و شبہات کا اظہار کر دیا تھا۔ جشن میں ڈرامے کے دوران نقل کی جگہ اصلی تلوار لانے کا ذمہ دار ہماری نظر میں وہی تھا۔ کچھ دن پہلے ایک رات ہمارے کمرے میں ایک عدد زندہ سانپ پایا گیا تھا۔ اس کی موجودگی کا ذمہ دار بھی یقیناً وہی تھا۔ انتہا یہ ہے کہ پھوپھی اماں کی معصوم بلّی کی موت بھی اسی بے رحم کے ہاتھوں ہوئی تھی ـــــ اس آخری انکشاف نے پھوپھی اماں کے اعصاب پر بڑا اثر ڈالا۔ وہ طوطا پری کو کوسنے سناتی ہوئی بے تحاشہ رونے لگیں۔ شبو نے بمشکل انہیں سنبھالا۔ جب پھوپھی اماں کسی قدر نارمل ہوئیں تو قبلہ چہ خوب خونخوار ہو گئے۔ طوطا پری کو اپنے ہاتھوں سے کیفرِ کردار کو پہنچانے پر مچل گئے۔ انہیں اس خطرناک ارادے سے باز رکھنے کے لئے ہم نے ان سے آج شام تک کی مہلت مانگی اور ان سے حلفیہ وعدہ کیا کہ آج سورج ڈھلنے سے پہلے تک

ولد الحرام کے خلاف اتنا ثبوت ضرور اکٹھا کرلیں گے جو اُسے مجرم کے کٹہرے میں بہرحال کھڑا کر دے گا۔

"کیسا ڈرامہ ــــــــ آسیبی والا رات ــــــــ ؟"

بے دھڑک نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ اور ہم بھونچکے سے اس کی شکل دیکھتے رہ گئے۔ ہماری زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا ــــ ڈرامہ ــــ "جی ہاں ڈرامہ" بے دھڑک نے اُسی اطمینان سے دہرایا ــــ پھر مزید معلومات بہم پہنچائیں ــــ بڑی محنت کرنی پڑی۔ نقصان بھی اُٹھانا پڑا۔ سرچ لائٹ کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ نواب صاحب کا نشانہ بھی غضب کا ہے۔ ہماری طرف سے اگر ذرا سی غفلت ہو جاتی تو وہ لڑکی بے چاری ماری گئی ہوتی ــــ"

"لڑکی ــــ ہماری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا ــــ کونسی لڑکی ــــ ؟"

"وہی جس نے اس ڈرامے میں نادرہ کا رول کیا تھا ــــ" بے دھڑک کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آگئی تھی۔ ہماری متحیر آنکھوں کے آگے، رات والا سارا منظر گھوم گیا۔ ہم نے جھلاّ کر کہا ــــ لیکن جناب نے یہ آسیبی چکر والا کھڑاگ کیوں پھیلایا ــــ ؟

آجائے گا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ پہلے ذرا اپنی سانسیں درست کر لیجئے" کمبخت نے ہمیں مشورہ دیا پھر کہنا شروع کیا ــــ اس سارے کھڑاگ کے پیچھے صرف ایک ہی مطلب ہے۔ کسی طرح خان فولادی کو اقبالِ جرم پر مجبور کرنا "

"وہ کس طرح ــــ ؟" بات پھر بھی ہماری سمجھ سے باہر تھی۔

"وہ اس طرح کہ اب تک صرف میں ہی اکیلا اُسی ولد الحرام کو قاتل سمجھتا ہوں" بے دھڑک نے ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ــــ اگرچہ کہ آپ کا دل بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں آپ کھل کر اس کے خلاف نہیں بولنا چاہتے۔ ــــ" بے دھڑک کی اس چوٹ پر ہم نے اس سے نظریں چرالیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست تھی۔ اس نے آگے کہا۔ ــــ "اور مجھ اکیلے کی آواز، نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوگی۔ چنانچہ میں نے یہ آسیبی ڈرامہ کھیلا۔ تاکہ قبلہ نواب صاحب، شبو بیگم بھی اماں بھی کھل کر خان فولادی کے خلاف میدان میں آجائیں ــــ"

"مگر اس سے کیا ہوگا ــــ ؟" ہم نے سوال جھاڑ دیا۔

"اس سے ہوگا یہ کہ جب چاروں طرف سے یلغار ہوگئی تو وہ کم ظرف بوکھلا کر اپنے گناہ کا اعتراف کرلے گا ــــ"

"چال ویسے اچھی چلی ہے آپ نے ــــ" ہم نے بے دھڑک کی ذہانت کا اعتراف کیا اور ساتھ ہی شکایت بھی کی ــــ لیکن مجھے اس سلسلہ میں اندھیرے میں کیوں رکھا ــــ ؟

"آپ کو اندھیرے میں رکھنے سے ہی تو بات اس قدر روشنی میں آسکی ــــ بے دھڑک نے مسکرا کر کہا۔ "اگر آپ کو پہلے سے اس بات کا علم ہوتا تو ڈرامے کے دوران کہیں نہ کہیں آپ سے کوئی نہ کوئی لغزش ہوجاتی۔ اور میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔" بے دھڑک نے بڑی ٹھوس دلیل پیش کی تھی۔ ہماری شکایت

فوراً رفع ہو گئی۔ ہم نے کچھ توقف کے بعد اس سے پوچھا ———— "اب ہمیں کیا اُس وقت کا انتظار کرنا ہے جب خان فولادی خود بوکھلا کر اپنے جرم کا اقبال کرے گا ——؟"

"اُسے اپنے جرم کا اقبال تو بہر صورت کرنا ہے ——" بے دھڑک نے بظاہر خالی خالی نظروں سے خلاء میں تکتے ہوئے کہا۔ لیکن ہم اچھی طرح جانتے تھے اس لمحے وہ ضرور کوئی نیا پلان مرتب کر رہا تھا۔ سچ پوچھئے تو اب ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ طوطا پری اس قدر بے بس ہو جائے کہ سوائے اقبالِ جرم کے اس کے پاس کوئی اور راستہ نہ رہے۔ اور جلد از جلد یہ کھیل اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔ ادھر بے دھڑک نے چونکتے ہوئے انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ جیسے اچانک اُسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ پھر بولا ———— "پچھلے دو دن کے عرصے میں آپ خان فولادی سے ملے ہیں؟"

بے دھڑک کے اس سوال پر ہمیں بھی اچانک یاد آیا کہ اس وقت ہم جس مقصد کے تحت بے دھڑک سے ملنے آئے تھے اس میں پچھلی رات والے بھونڈے ڈرامے کے علاوہ طوطا پری سے کلب کے تہہ خانے میں ہونے والی ملاقات کا حال گوش گزار کرنا تھا۔ لیکن بھونڈے چکر میں ایسے اُلجھے کہ اگر بے دھڑک نے اس ضمن میں خود نہ چھیڑا ہوتا تو شاید اتنی اہم بات ہمیں یاد بھی نہ آتی ———— ہم نے طوطا پری سے اپنی آخری ملاقات کا مسلسل حال بیان کیا۔ جسے بے دھڑک نے بڑے غور سے سُنا۔ اور پھر ہماری بات ختم ہوتے ہی چٹکی بجا کر بولا: جیسا کہ آپ نے بتایا وہ کمینہ خود مجرم ہو کر ایسے ثبوت کی تلاش میں ہے جس سے اپنا الزام وہ دوسروں کے سر منڈھنے میں کامیاب ہو جائے۔ اب ہم اُسی چال سے اُس کو مات دیں گے ————" بے دھڑک اتنا کہہ کر رُک گیا۔ اور ہم صرف سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے رہنے پر کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ کوشش کیا خاک کرتے اس گورکھ دھندے میں اُلجھ کر خود سوالیہ نشان بن چکے تھے۔ بے دھڑک نے آگے کہا: "کامیابی آج رات ہی ہمارے قدم چوم سکتی ہے۔ اگر کسی طرح خان فولادی تک یہ پیغام پہنچایا جائے کہ اگر اُسے اصل قاتل کا پتہ چاہیئے تو آج رات کے پہلے پہر اُس ویران بھوت بنگلے میں پہنچ جائے!"

اُدھر بے دھڑک نے بات ختم کی اِدھر ہم سارا معاملہ بھانپ گئے۔ "پیغام رسانی" کا یہ فرض ہمیں ہی نبھانا تھا۔ ہم نے حسرت سے سوچا کاش ہم کسی دور دراز دیہات کے ٹپہ رساں ہوتے۔ اس طرح کم از کم اس ذہنی اُلجھاوے سے تو نجات مل جاتی ————"

ہم نے اس خطرناک فرض کو حتی المکنہ بجا لانے کا وعدہ کیا۔ اور پھر رخصت ہونے کے ارادے سے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بے دھڑک کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اس نے اپنے بریف کیس میں سے رول کیا ہوا ایک دبیز کاغذ نکالا پھر اُسے ہماری نظروں کے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ کاغذ پر خطوط کھینچے ہوتے تھے۔ جسے غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ کسی عمارت کا نقشہ ہے۔ نقشہ کے ماتھے پر جلی حرفوں میں لکھا تھا ———— "نادرہ کی یاد میں" ———— !

اس سے پہلے کہ ہم کچھ استفسار کرتے بے دھڑک خود بول اُٹھا ———— یہ اُس عمارت کا نقشہ ہے جسے میں نادرہ کی یاد میں تعمیر کرانا چاہتا ہوں ————" ہم نے نقشہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

"نقشہ سے تو معلوم ہوتا ہے۔ عمارت بہت شاندار ہوگی۔ لیکن اس کا مقصد ———— ؟"

"مقصد بہت نیک ہے شہزاد صاحب!" —— بے دھڑک نے ٹھنڈی سانس بھری پھر بولا: ———— "یہ عمارت دراصل ان بھٹکی ہوئی۔ ٹھکرائی ہوئی لاچار عورتوں کی جائے پناہ ہوگی جنہیں ہمارا سماج، ہماری نام نہاد سوسائٹی اپنی ہوس

کاش نہ بنانے کے چند گندے کپڑے کی طرح فٹ پاتھ پر پھینک دیتا ہے ——" بے دھڑک حضرات کے دھارے میں یہ نکلا۔ آج پہلی بار یہ گول مٹول ہیئت بے ڈھب شخص ہمیں بہت ہی بلند و بالا نظر آیا۔ —— ہم نے نقشہ دیکھتے ہوئے پوچھا —— "نقشہ کے حساب سے اسکیم تو بہت بڑی معلوم ہوتی ہے ——"

"ہاں —— اس پر کوئی بیس پچیس لاکھ روپے صرف ہوں گے۔ لیکن میرے پاس ایک ایسا پلان ہے کہ اگر پانچ لاکھ کی رقم اپنی تحویل میں ہو تو بقیہ رقم سرمایہ دار سے معمولی طور پر حاصل کی جا سکتی ہے —— بے دھڑک" نے مختصراً اپنے پلان سے آگاہ کیا۔ جواب میں ہم نے پوچھا —— "لیکن ابتدائی پانچ لاکھ کہاں سے آئیں گے؟" ابتدائی پانچ لاکھ۔ یوں سمجھئے کہ میرے پاس موجود ہیں۔

بے دھڑک کی اس اطلاع پر ہم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکرا کر کہا —— "آپ غالباً اسے گپ سمجھ رہے ہیں۔ نہیں شہزاد صاحب۔ گپ نہیں بلکہ سچ ہے۔ البتہ یہ کثیر رقم اسی وقت ہمیں حاصل ہو سکتی ہے جب خان فولادی اپنے جرم کا اقرار کرے۔ اور پولیس کی فائیل میں نادرہ کی موت کو خودکشی نہیں بلکہ قتل کا کیس قرار دیا جائے۔ بے دھڑک کی ان گول مول باتوں سے ہمیں ہول سا آنے لگا۔ ہم نے گڑبڑا کر پوچھا "آپ کی بات میرے پلے نہیں پڑی —— صاف صاف کہئے ——!

یعنی نادرہ کا پانچ لاکھ کا بیمہ تھا۔ جس کی رقم اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس ناگہانی حادثہ کو قتل کی واردات ثابت کیا جائے۔ جو کہ قتل کی واردات ہی ہے —— لیکن پولیس نے چونکہ اسے خودکشی کا کیس قرار دیا ہے۔ اسی صورت میں بیمہ پالیسی کے قوانین کی رو سے رقم کا ڈوب جانا یقینی ہے ——"

اب بے دھڑک کی بات پوری طرح ہماری سمجھ میں آگئی۔ ہم نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا —— آپ کے اس نیک مقصد میں میں ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہوں۔ اور اس وقت تک چین کا سانس نہیں لوں گا جب تک کہ مرحومہ کے قاتل کو پھانسی کے تختے پر نہ پہنچا دوں ——!!!

* * * * * *

خان فولادی کی لیبوریٹری Laboratory ، بستی کی حدود سے کافی دور تھی۔ یوں تو ساری بستی ہی پُرفضا مقام پر واقع تھی۔ لیکن لیبوریٹری کا محل وقوع کچھ زیادہ ہی پُرفضا تھا۔ پہاڑی سلسلے کے دامن میں ایک طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹرس تھے اور دوسری طرف لیبوریٹری کی عمارت تھی جو وضع قطع سے خاصی جدید معلوم ہوتی تھی۔ دور سے یہ خطہ زمین جس قدر پُرفضا اور دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ نزدیک پہنچنے پر اس کی دلکشی کچھ کم ہوگئی۔ اور اس کی جگہ ایک ہیبت ناک احساس پھنکارتا ہوا ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہوگیا۔ کیونکہ لیبوریٹری کے اندر الواع و اقسام کے سانپ ہمارا استقبال کرنے والے تھے۔ اگر جان پر نہ آپڑی ہوتی تو ہم زہریلے سانپوں کے اس "وائٹ ہاؤز" (White house) کا بھول کر بھی رُخ نہ کرتے۔ ہر ممکن جگہ طوطا پری کو تلاش کرنے میں ناکام ہونے کے بعد ہم نے اس طرف کا قصد کیا تھا۔

ہم نے موٹر سائیکل پارک کر کے گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ باوردی دربان نے ہمیں دیکھتے ہی ایستادہ ہوگیا۔ ہم نے ذہنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ جواب میں کمبخت نے بجائے اس کے کہ طوطا پری کی موجودگی یا غیر موجودگی

کے بارے میں کچھ بتاتا، بٹن والے کیبن میں گھس گیا۔ ہم نے اس طرف ہی سے دیکھا کہ وہ ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ شاید ہماری آمد کے متعلق ہی بتا رہا تھا۔ پھر اپنے اس فرض کی ادائیگی کے بعد باہر نکلا اور "آپ سیدھے وہاں چلے جائیے لان کے اس پار داہنے ہاتھ کو ملاقاتیوں کا کمرہ ہے۔ وہاں مسٹر باری آپ کے منتظر ہیں ـــــ!"

لان میں تھوڑے تھوڑے سے فاصلہ سے چھ فٹ لمبائی والے کھمبے نصب تھے۔ جن کے سروں پر چوکور ڈبے نٹ تھے۔ راہداری سے گزرتے وقت جب ان ڈبوں پر ہم نے سرسری نظریں دوڑائیں تو اندازہ ہوا کہ یہ ڈبے کبوتروں کے نہیں بلکہ سانپوں کے مسکن ہیں۔ ہر ڈبے پر جلی حروف میں انگریزی میں کچھ تحریر بھی تھا۔ شاید سانپوں کے نام ان کی اقسام اور دیگر معلومات درج تھیں۔ ہم نے تیز قدموں کے ساتھ ان کا فاصلہ طے کیا اور ملاقاتیوں کے کمرے میں قدم رکھنے تک اس خوف سے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا ـــــ گویا پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی پاداش میں طلسمی قصّوں کے کسی شہزادے کی طرح پتھر ہو جائیں گے ـــــ!

ملاقاتیوں کے کمرے میں واقعی مسٹر باری ہمارے منتظر تھے۔ جو اپنے جُثّے کے باعث مسٹر باری کی بجائے مسٹر بھاری معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی مسٹر بھاری کے بھاری بھرکم جبڑوں میں جُنبش ہوئی۔ پھر انکے ہونٹوں کے بیچ ایک دراڑ نمودار ہوئی۔ جیسے زلزلے کے جھٹکے سے زمین کا سینہ شق ہوگیا ہو ـــــ یہ غالباً مسٹر بھاری کی استقبالیہ مسکراہٹ تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ موصوف کی مسکراہٹ میں "مسکرا" کم تھی اور "ہٹ" زیادہ پھر بھی ہم نے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ موصوف نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ملاقاتیوں کے کمرے سے نکلنے کے بعد ہم لیبوریٹری کے اس حصہ میں پہنچے جہاں دو رویہ کیبن نما کانچ کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ مسٹر بھاری ایک کیبن میں داخل ہوگئے۔ ہم نے بھی ان کی تقلید کی۔ اس کیبن میں جو سب سے زیادہ چونکانے والی چیز ثابت ہوئی وہ تھی مخصوص وضع کی وردیاں جو ہینگروں پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ ان وردیوں کو دیکھ کر ہمیں خلائی مسافروں کی سائنٹفک وردیاں یاد آگئیں۔ مسٹر بھاری نے ایک وردی ہماری طرف بڑھائی اور دوسری اپنے لئے منتخب کی۔ ان کی دیکھا دیکھی ہم بھی اس مخصوص وردی میں داخل ہو گئے۔ کیونکہ یہ وردی خانہ بدوشوں کے خیمے کی طرح تھی۔ اس وردی کی پشت پر آکسیجن کا ایک چھوٹا سا سلنڈر بھی تھا۔ جس کی نلکیاں سر کے ماسک سے جڑی ہوئی تھیں۔ مسٹر بھاری نے سر کے ماسک کو گردن کے پچھلی طرف جھولتا ہوا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس معاملہ میں بھی ہم نے ان کی تقلید کی۔ ہم ان سارے مراحل سے یوں چپ چاپ اور اطمینان کے ساتھ گزر رہے تھے جیسے اس تمام اہتمام کے عادی رہے ہوں۔ پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ یہ سارا اہتمام آخر کس خوشی میں کروایا جا رہا ہے۔ کیا یہاں سے سیدھے لے جا کر لیبوریٹری میں موجود ہر چھوٹے بڑے سانپ سے مصافحہ بلکہ معانقہ بھی کروانے کا پروگرام ہے ـــــ؟

مسٹر بھاری نے کیبن کی دوسری طرف والے دروازے کی طرف اپنے بھاری قدم اُٹھاتے ہوئے ہمیں حسب دستور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کیبن کے باہر مختصر سی راہداری تھی۔ جس کے اس پار لفٹ موجود تھا۔ اُس لفٹ کے ذریعہ ہم لوگ چند ثانیوں میں دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک خودکار دروازے نے ہمارا استقبال کیا جس کے

تھے پر سرخ بتی روشن تھی۔ اس مقام پر پہنچتے ہی مسٹر بھاری نے ماسک سر پر چڑھا لیا۔ ہمارا ماسک بھی جوابًا رخ
لا پہنچ گیا۔ ماسک کیا سر پر پہنچایوں لگا جیسے کوئی غیر مرئی قوت ہمارا گلا گھونٹنے لگی۔ ہم نے جو کھلا کر مسٹر
بھاری کو جھنجوڑا۔ مسٹر [illegible] نے جیسے ہی ہماری کیفیت بھانپی ہماری وردی پر سینے کی جگہ لگے بٹن کو دبا دیا۔ بٹن
ادبنا تھا کہ ماسک کے اندر [illegible] ہوا کا جھونکا در آیا۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ یہ چھوٹا سا حقیر بٹن کس قدر
زندگی بخش [illegible] ۔ اس بٹن کا تعلق [illegible] دراصل آکسیجن کے سلنڈر سے تھا۔ گویا اب ہماری کائنات سکڑ کر اس
وردی میں سمٹ آئی تھی۔ ہمارے سر اور چہرے کا احاطہ کئے ہوئے جو ماسک تھا وہ صرف ماسک نہیں بلکہ ہمارے
لئے کرۂ ارض تھا۔ مسٹر بھاری نے دروازے سے [illegible] ہوئے چوکور پائیدان پر جیسے ہی قدم رکھے
دو کار دروازہ کھل گیا۔ پہلے مسٹر بھاری نے اندر قدم رنجا فرمایا۔ پھر ہم نے حسبِ دستور ان کی کورانہ
تقلید کی۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی خودکار دروازہ بند ہو گیا۔ اب ایک راز کھل جا سم سم ہمارے سامنے تھا
فوراً کھل گیا۔ اور اس کے کھلتے ہی جو عقدہ کھلا۔ اس کے نتیجے میں ہمیں کامل یقین ہو گیا کہ عقد سے
پہلے ہی ہماری رخصتی عمل میں آ جائے گی۔ ـــــ لیکن لیبوریٹری کا یہ حصہ غالبًا سانپوں کی تفریح گاہ تھا کیونکہ،
بیشمار سانپ آزادانہ اس حال میں رینگتے ہوئے نظر آتے۔ جب کہ ہم انسان ہوتے ہوئے بھی وردی کے حصار
میں قید تھے۔ سانپوں کے اس تفریحی گڑھ میں ہماری ہی طرح ایک وردی پوش شخص گھٹنوں کے بل بیٹھا ایک
خطرناک قسم کے ناگ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اگرچہ کہ ہماری جانب شخص مذکور کی پیٹھ تھی۔ لیکن ہم اُسے پہچان
چکے تھے۔ وہ لوطا پری تھا ـــــ!

★★

(باقی، باقی)

(جناب خواجہ عبدالغفور کی کتاب "سمن زار" سے شکریہ کے ساتھ)

خرافات

(مراسلے)

● 'شگوفہ' نہایت کامیاب رسالہ ہے۔ خدا اور کامیاب کرے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد' زندہ باد

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر' نئی دہلی

● سب سے پہلے تو آپ کی مہمان نوازی، خلوص اور تعاون کے لئے شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ واقعی حیدرآباد میں جس جوش و خروش سے ادبی اجلاس اور مشاعرے میں حصّہ لیا گیا یہ صرف حیدرآباد ہی کا حصّہ ہے۔ مشاعرے میں لطف ضرور آیا لیکن ادبی اجلاس میں جو رنگ تھا وہ کچھ نرالا تھا۔ عموماً ادبی اجلاس اس طرح کامیاب نہیں ہوا کرتے حالانکہ میرا مضمون قہقہے بپا نہ کر سکا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ حیدرآباد کے سب مزاح نگار نہایت کامیاب رہے۔ خاص طور پر مسیح انجم برہان صاحب اور نصرت صاحب۔ اور ان سب پر بھاری وزیر آبکاری جناب گنگا ریڈی تھے۔ میری طرف سے شکریہ کے ساتھ دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ رشید قریشی صاحب کی نظامت کا قائل ہو گیا۔

فضل جاوید' بھوپال

● 'کبڈی کبڈی' اور "کاتب کاتب" کی پسندیدگی کا شکریہ۔ کاتب صاحب کا دلچسپ نوٹ و ترمیم واقعی نہلے پہ دہلا ہے — ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ شگوفہ کی طرحی مزاحیہ غزلیں پسند آئیں۔ زندہ دلانِ مالیگاؤں کے ایک رکن کی حیثیت سے میری مبارکباد تمام شعراء کی بارگاہ میں! شگوفہ ڈرامہ نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔

مختار نویس ، مالیگاؤں

● حیدرآباد سے شگوفہ جیسا اچھوتا رسالہ نکال کر آپ نے ہندوستان گیر پیمانہ پر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے کیونکہ اتنے عظیم الشان ملک میں ایک بھی ایسا رسالہ نہ تھا جو پژمردہ دلوں میں مسکراہٹوں کے فوارے جاری کرنے اس کے لئے آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

غنی اعجاز
مومن پورہ - اکولہ

● اس بار شگوفہ کا سوونیر سلیمان خطیب کی غیر موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ قہقہے بجھے بجھے سے تھے۔ کم از کم مرحوم کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام شاملِ اشاعت ہوتا تو سوونیر کی روایتی رنگینی کو ایک حد تک برقرار رکھا جا سکتا تھا۔

اسمٰعیل آذر ، کٹک

● ایک عرصہ سے شگوفہ کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ طنز و مزاح کے میدان میں جو کام کر رہے ہیں قابلِ ستائش ہے۔

وسیمہ بیگم' کٹک

● شگوفہ کا خطیب نمبر اور سوونیر ملے۔ بہت ہی اچھے اور معیاری تخلیقات سے مزین اور دلنواز ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

ڈھکن رائچوری

● زندہ دلانِ حیدرآباد کے حالیہ ادبی اجلاس نے پچھلے برسوں کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ اس میں شریک سبھی ادیبوں نے اچھے مضامین کا انتخاب کیا بجز ایک صاحب کے۔ اس اجلاس کی کامیابی کا سہرا جناب مسیح انجم کے سر جاتا ہے۔ اس اجلاس کے معزز مہمان خصوصی جناب پی۔ گنگا ریڈی صاحب نے بھی زندہ دلی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

خطیب کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے بغیر صدارت کے مشاعرہ کا انعقاد' زندہ دلانِ حیدرآباد کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مجھے ایسی مثال کبھی بھی نہیں ملی۔

ادبی اجلاس و مشاعرے میں ' نئے ادیبوں اور شعراء کی شرکت بھی باعث مسرت ہے۔ ان کے کلام اور مضامین کی سماعت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ زندہ دلان کی یہ تحریک جو کبھی چنگاری تھی اب شعلہ بن گئی جسے پھونکوں سے بجھایا نہیں جا سکتا۔

فیض الرحمٰن ، رائچور

● سلیمان خطیب کی رحلت کی خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا۔ شگوفہ مل جاتا تھا، میں اُسے پرچہ کے علاوہ آپکی خیریت کا خط تصور کرلیتا تھا۔ عرصہ سے وہ بھی نہیں ملا۔ سلیمان خطیب ایک دیرینہ ساتھی تھے۔ ساؤتھ (SOUTH) پھر ایک بار ایک اچھے فنکار سے محروم ہوگیا۔

ہلال سیوہاروی

● آپ کا جریدہ شگوفہ چرخِ ادب پر چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہے کبھی کبھار دوستوں کے ہاتھ میں دیکھتا ہوں تو مچل جاتا ہوں۔ بہت عاجزی و انکساری کا سہارا لینے پر یہ پرچہ کوئی عنایت کردیتا ہے تو واپس کرنے کی نیت نہیں ہوتی ہے بہرکیف تازہ شمارہ ماہ اکتوبر کا کسی طرح پڑھنے کو مل گیا۔ جناب جوہر سیوانی کی نظم "بے تکلف مہمان" بے حد پسند آئی واقعی یہ نظم بے تکلف مہمان کی حرکات کی مکمل تفسیر ہے۔

انجم سحر
واراناسی

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سالنامہ حاضر ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ اس بار یہ خصوصی نمبر اپنی روایتوں کو پورے طور پر برقرار نہ رکھ سکا — 'ڈرامہ نمبر' کا کام جنوری کے اختتام تک بھی جاری رہا جس کے نتیجے میں دو خصوصی نمبر ایک ساتھ تکمیل کو پہونچے۔ اور توجہ بٹ گئی — تاہم یہ یقین ہے کہ شائقین شگوفہ زیر نظر خصوصی شمارہ کو پسند کریں گے۔

اس نمبر میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے گیارھویں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کی مکمل رپورٹ بھی شریک ہے جس کو پڑھنے کے بعد یہ احساس اُجاگر ہوتا ہے کہ ہمارے اکثر مزاحیہ شعرا مشاعروں کی "ہا، ہو" اور پسند ناپسند کو زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مشاعرہ میں سُنانے کے لئے شعراء کو "الگ باندھ کے رکھا" ہوا مال لے آنا پڑتا ہے لیکن اس مال کا "اچھا" ہونا بھی ضروری ہے۔ نیز داد و تحسین کے حصول کو مطمح نظر بنانے میں شاعری کی بنیادی اقدار کو مجروح نہیں کرنا چاہیئے۔

ہمارے سینئر مزاحیہ شعراء تھکے تھکے سے نظر آتے ہیں اور نئے اور نو آموز شاعر جو کچھ وہ ایک بار لکھ لیتے ہیں، اس پر ضرورت سے زیادہ مطمئن ہوجاتے ہیں۔ آج کے شاعروں میں اپنے ہی کلام کے انتخاب کا رجحان بہت کم پایا جانے لگا ہے۔ جو بھی شعر عالم وجود میں آگیا اس کا مشاعروں میں سُنایا جانا اور پکّی روشنائی میں چھپ جانا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ طنز و مزاح کے لئے پچھلے ڈیڑھ ایک دہے میں جو ماحول بنا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے اور اس صنف کے معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے — ہمیں امید ہے کہ طنز و مزاح نگار ادیب و شاعر اپنے اس فرض کو نئے سال میں بخوبی نبھائیں گے۔ ■■

FEBRUARY 1979

تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی یقین کی صورت کبھی گماں کی طرح
(ساحر)
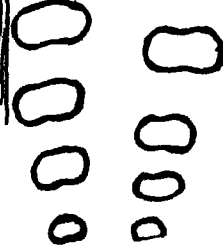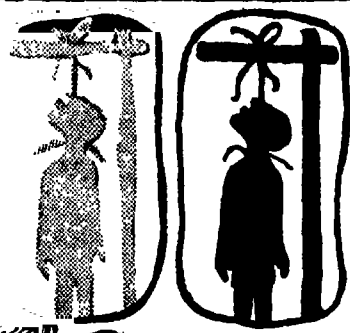
زندہ دلانِ حیدرآباد کی ترجمان

ماہنامہ شگوفہ

جلد (۱۲) ★ فبروری ۱۹۷۹ء ★ شمارہ (۲)

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد ۲ ۵۰۰۰۰

بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس روبرو دربار حسینی پرانی حویلی۔ حیدرآباد ۲ ۵۰۰۰۰

سالانہ ــــ (۲۰) ــــ روپے

بیرون ہند سے ــ (۳۵) ــ شلنگ

فی پرچہ :- RS. 1 = 50

کتابت: حکیم ⁘ سلیم ⁘ سلام

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ ۲۱ رفیق منزل ملے پلی حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

PHONE: 57716.

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مُلّا کی دوڑ (سیاحت نامے)

مال مَسرُوقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مُفت (انشائیے)

چوُرن (نظمیں)

پہلا
جلدی
نہیں
دوسرا
ابھی
نہیں
تیسرا
کبھی
نہیں
مستقبل میں
ماں اور باپ بننے
والوں کے لیے
نیک مشورہ
اپنے نزدیکی فیملی پلاننگ سینٹر، پرائمری ہیلتھ سینٹر
یا گرام سواستھ سہائک سے جو آپ کو ضروری
صلاح اور ساز و سامان فراہم کرسکتے ہیں
آج ہی رابطہ قائم کیجیے
davp

یوسف ناظم

ایک پردیسی کا سفرنامہ ہندوستان

(دوسرا ایڈیشن)

(دوسری قسط)

بمبئی شہر کی جیسی تعریف سُنی تھی اُسے ویسا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ جب ہم یہاں پہونچے تو سارا شہر پسینے میں تر تھا۔ یہاں مئی اور جون میں اتنی گرمی نہیں ہوتی ہے جتنی اکتوبر میں ہوتی ہے لیکن سُنا ہے خود مئی اور جون میں یہاں اتنی گرمی تو ہو ہی جاتی ہے کہ آٹا گوندھ کر چھاؤں میں بھی رکھ دو تو خود بخود بریڈ بن جائے۔ (بریڈ کو بمبئی میں پاؤ بولتے ہیں، بمبئی میں ہر شخص صبح اُٹھتے ہی پاؤ ضرور کھاتا ہے۔ کہتے ہیں جو شخص یہاں پاؤ نہیں کھاتا لاغر ہوجاتا ہے) اکتوبر کی دھوپ میں چلتا پھرتا زندہ مرغ، تندوری مرغ میں تبدیل ہوجاتا ہے اور اُسے فوراً ہوٹلوں میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ (تندوری مرغ کے تفصیلی حالات ہم آئندہ کبھی بیان کریں گے، یہ یہاں کا بہت مشہور پرندہ ہے)۔ بمبئی میں دو ہی موسم ہوتے ہیں۔ گرمی اور بارش۔ بارش کے دنوں میں یہاں کا سمندر چاروں طرف سے بارش کے پانی سے گھر جاتا ہے پورے ہندوستان میں بمبئی ہی ایسا شہر ہے جہاں ہر شخص تیرنا جانتا ہے۔ تیرنا نہ جانے تو گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر نہ پہنچ پائے۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ تیرتی رہی ہیں (ڈوبتے تو صرف مرد ہیں) یہاں عورتوں کی آبادی —— آبادی نہ سہی ان کی چہل پہل ہمیں زیادہ نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں عورتیں ہر میدان میں مردوں سے آگے ہیں۔ یہاں کی ٹرینوں اور بسوں میں اگر معذانہ دو چار جیبیں نہ کٹیں تو شہر سونا سونا نظر آتا ہے اور چلتی ٹرین سے ہاتھوں کی گھڑیاں، گلے کی زنجیریں اور کانوں کے بُندے کھینچ لئے جانے کی سو سوا سو وارداتیں نہ ہوں تو پولیس پریشان ہوجاتی ہے۔ ان سب معاملات میں بھی عورتیں، مردوں کے شانہ بشانہ رہتی ہیں بلکہ یہ سب کام تنہا اپنی ذمہ داری پر انجام دیتی ہیں۔ بمبئی میں پہلے مُسافر ٹیکسی چلانے والوں سے سہمے رہتے تھے اب مسافر انھیں لُوٹ لینے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ سمندر کے کنارے یا پارکوں میں اور میدانوں میں تفریح کرنے والے جوڑوں کا پہلے بیٹھ جانا اور اس کے فوراً بعد لُٹ جانا ایسا ہی ہے جیسے پرندوں کا ہوا میں اُڑنا۔ ایسی باتوں پر اگر کوئی شخص یہاں تعجب کرتا ہے تو اُسے ڈانٹ سُننی پڑتی ہے —— شہر

ہمیں پسند آیا۔

بمبئی اور دلّی میں ایک نمایاں فرق یہ دکھائی دیا کہ دلّی میں سڑکیں خالی پڑی رہتی ہیں۔ بمبئی میں کوئی سڑک، کوئی گلی، کوئی کوچہ، ایسا نظر نہیں آیا جہاں آدمی رُک کر اپنی سانس ٹھیک کر سکے۔ آدمی نہ چلتے ہوں تو کم سے کم جانور سڑکوں پر ضرور چلیں گے۔ شاہراہوں کے دونوں طرف "ضرورتمند" عوام الناس معروف گل کاری نظر آئیں گے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صبح کے اوقات میں اس قسم کا مجمع ذرا زیادہ ہوگا۔ کام سب ایک ہی کریں گے لیکن اسطرح کہ ؏ کسے را از کسے کارے نباشد

زندگی یوں ہمیں دلّی میں بھی نظر آئی لیکن زندگی وہاں لیٹی رہتی ہے۔ یہاں ملکھا سنگھ کی رفتار سے بھاگتی ہے (سُنا ہے ملکھا سنگھ ہندوستان کا سب سے تیز رفتار شخص تھا، جب بھاگتا تھا تو بھاگتا ہی رہتا تھا)

زندگی کی تیز رفتاری کی وجہ سے یہاں آدمی کو آتش زیر پا رہنا پڑتا ہے۔ صبح اُٹھ کر اگر آدمی تین منٹ میں نہالے دو منٹ میں شیو کر لے اور چار منٹ میں تیار ہو کر گھر سے باہر نکل جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ بڑے آرام کی زندگی گذار رہا ہے جو لوگ اس سے کم آرام میں ہیں وہ یہ سارے کام رات ہی میں کر لیتے ہیں۔ بمبئی میں یوں بھی دن رات کے ڈیڑھ بجے ختم ہوتا ہے اور پونے دو بجے صبح شروع ہو جاتی ہے۔ جو بچے اور والدین ایک ہی گھر میں رہتے ہیں ہفتے میں ایک دن ضرور ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ اس طرح رشتہ برقرار رہتا ہے

بمبئی میں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ ہر شخص مخالف سمت میں بھاگتا ہے یعنی شہر سے ۴۰ میل دور رہتا ہے تو نوکری یا کاروبار کے لئے شہر آتا ہے اور جو شخص شہر میں رہتا ہے اپنے گھر سے ۳۵ میل دور مضافات میں جاکر کام کرتا ہے کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جن کے گھر اور دفتر یا مکان یا دوکان نزدیک نزدیک ہیں لیکن ایسے لوگوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بمبئی میں رہ کر اگر آدمی روزانہ ساٹھ ستر میل کا سفر نہ کرے تو وہ شہری کب ہوا۔

دلی میں الکٹرک ٹرینیں بھی نظر نہ آئیں۔ بمبئی میں ہمیں پورا شہر اور پورے مضافات اِن ٹرینوں سے گھرے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان ٹرینوں کی چھتیں بھی کافی آرام دہ بنائی گئی ہیں۔ اور کتنے ہی مسافر اِن چھتوں پر چڑھ کر سفر کرتے ہیں۔ اس میں ریلوے کا فائدہ یہ ہے کہ چھتوں پہ پنکھے نہیں لگانے پڑتے۔ ٹرینوں میں سفر کرنے والے لوگ جیب میں اور کچھ رکھیں یا نہ رکھیں ایک کنگھا ضرور رکھتے ہیں اور پلیٹ فارم پہ اُتر کر سب سے پہلے بالوں میں کنگھا کرتے ہیں۔ کنگھا کرنے کے بعد انگلیوں کی مدد سے صاف کر کے، بال ہوا میں اُڑا دیتے ہیں (پھونک مارنی پڑتی ہے) آزو بازو چلنے والے لوگ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں

بمبئی کا ہر آدمی زیادہ ذہین ہوتا ہے اور ہر چیز کا مصرف جانتا ہے مثلاً یہ کہ دلی میں بھی لوگ بنیان پہنتے ہیں لیکن اس سے کوئی کام نہیں لیتے۔ بمبئی کا آدمی اس میں اپنا فاونٹن پن لگاتا ہے بلکہ وہ بنیان پہنتا ہی اس لئے ہے کہ اگر نہ پہنے تو فاونٹن پن کہاں رکھے۔ ہم نے بہتوں کو تو کتابیں اور فائیلیں تک بنیان میں رکھے دیکھا۔ بمبئی میں جگہ کی بڑی قلت ہے

دلی میں سارے لوگ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں، ان میں کوئی رشتہ نہیں جبکہ بمبئی میں ہر شخص ایک دوسرے کا سالا نظر آیا۔ ہمیں اتنی قرابت داری کہیں اور نظر نہ آئی لیکن بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ قرابت داری کا معاملہ نہیں، طرزِ گفتگو

کا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اس شہر میں ہمارا دل بہت لگے گا۔

شہر بمبئی میں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ہر آدمی کا دن ایک عدد "پاؤ" کھانے سے شروع ہوتا ہے۔ پاؤ کئی قسم کے ہوتے ہیں گول، استوانہ نما، مخروطی، مستطیل، مربع، سخت، میڈیم سخت، نرم، بے حد نرم۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی پسند کے نمونے کے بریڈ کھائے۔ بچے عام طور پر ڈبہ نما بریڈ استعمال کرتے ہیں اور اس کے ایک طرف کا دروازہ کھول کے اس کے اندر سے گودا نکال کر کھا لیتے ہیں۔ گودا کھا لینے کے بعد جو چیز بچ جاتی ہے۔ اس سے تین دیواروں والے کمرے کا کام لیا جا سکتا ہے بچے اس میں اپنی اسٹیشنری رکھتے ہیں۔ دو دن کے بعد اس کمرے کی بریڈ پڈنگ بن سکتی ہے جو اتوار کے دن آنے والے مہمانوں کی خدمت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس میں شکر کم سے کم ڈالنی چاہیئے تاکہ یہ زیادہ بدمزہ رہے۔ اس پاؤ اور بریڈ کے علاوہ یہاں کی اور بھی کئی ڈشیں ایسی ہیں جو عوام الناس ہی میں نہیں، محل آشیاں اور امپالا نشیں لوگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ گرم مونگ پھلی، چنے، نمک کے پانی میں اُبالے ہوئے سینگدانے، پانی پوری، رگڑا اور بھیل پوری یہ چیزیں اگر حلق سے ٹھیک طور سے نہ اُتریں تو لیموں پانی یا گنے کے رس کی مدد لی جا سکتی ہے۔ لیموں پانی میں کبھی کبھی لیموں کا عرق بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گنے کے رس میں کبھی کبھی ایک آدھ چھپکلی بھی پس کر آ جاتی ہے (اس میں رعایت یہ ہے کہ چھپکلی کی قیمت الگ سے ادا نہیں کرنی پڑتی) جن گلاسوں میں رس پیش کیا جاتا ہے انھیں دھویا بھی جاتا ہے۔ گلاسوں کو کس پانی سے دھویا جاتا ہے اس پر غور نہیں کرنا چاہیئے۔ بڑے شہروں میں اگر ایسی باتوں پر وقت برباد کیا جائے تو پھر آدمی کام کب کرے گا؟ ہمیں ان ساری ڈشوں میں بھیل پوری بہت پسند آئی۔ بھیل پوری میں طرح طرح کی چیزیں ملائی جاتی ہیں۔ بھیّا جب ان تمام چیزوں کو یکجا کر کے اپنے دستِ نازک سے ان کا مرکب تیار کرتا ہے تو اس کے ہاتھ کی صفائی پر رشک آنے لگتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ جو کچھ کماتا ہے وہ اس کے پسینے کی کمائی ہے۔ بمبئی میں ہر شخص دن میں ایک بھیل پوری ضرور کھاتا ہے۔ نہ کھائے تو اس سے بزنس میں ہزاروں غلطیاں ہو جائیں۔ ٹرین اور بس چھوٹ جائے اور وہ منیم سے سیٹھ کے درجے پر کبھی نہ پہنچ سکے۔ بمبئی میں ان لوگوں کو پسند نہیں کیا جاتا جو سڑک پر چلتے وقت کوئی چیز نہ کھاتے ہوں۔ یہاں سڑک پہ چلتے وقت ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا چاہیئے۔ آدمی معزز دکھائی دیتا ہے ورنہ لوگ سمجھتے ہیں یہ شخص فاقہ کشی میں مبتلا ہے بچے بھی سبق حاصل کرتے ہیں۔ ان فواکہات کے علاوہ یہاں قدم قدم پہ کھانے کے لئے قدرتی اشیاء بھی ملتی ہیں یعنی کیلے، امرود، سیوتے اور کھیرے۔ امرود کے ساتھ سُرخ مرچ میں ملا ہوا نمک مفت ملتا ہے۔ یہی کیفیت کھیروں کی ہے نمک بونس کی شکل میں تقسیم ہوتا ہے۔ کیلے اور چیکو کھانے والوں کو یہ نعمتیں نہیں ملتیں لیکن چیکو بیچنے والے البتہ اتنی سوشیل سروس ضرور کرتے ہیں کہ زائد رقم لئے بغیر چیکو کو ہر طرف سے چھیل کر آپ کے حوالے کر سکتے ہیں۔ ان میں کئی وٹامنوں کا اضافہ ہو جاتا ہے لیکن نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک تہائی چیکو چھلکے کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ اس لئے اکثر لوگ چیکو بھی چھلکے کے ساتھ ہی کھاتے ہیں اور یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ایک وٹامن بھی ضائع نہیں ہونے پایا۔ (یہاں ابھی ناریل کو چھلکے کے ساتھ کھانے کا سسٹم شروع نہیں ہوا ہے) ہاں یہاں ناریل کا پانی بکثرت پیا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہی ایک پانی ہوتا ہے جس میں جیونسیل

کارپوریشن کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہر ناریل میں سے ایک گھونٹ پانی ضرور برآمد ہوتا ہے۔ ناریل کی منہ مانگی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے (ہر ناریل فروش کے پاس ایک چاقو ہوتا ہے) استعمال شدہ ناریل کے خول سے آپ کچھ دیر فٹ بال کھیل سکتے ہیں۔ اس کا کوئی معاوضہ ادا کرنا نہیں پڑتا۔ پینے کی چیزوں میں یہاں نیرا بھی مقبول عام مشروب ہے لیکن یہ صرف صبح کے اوقات میں ملتا ہے۔ بہت عجلت میں پینا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کے نقائص ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ ہر ریلوے پلیٹ فارم پر نیرے کا ایک اسٹال ضرور ہوتا ہے جس پر بعد میں وہ لوگ سو سکتے ہیں جنھیں بنچوں پر سونے کے لئے جگہ نہ ملی ہو۔ ریلوے پلیٹ فارم پر جتنے بھی بنچ ہوتے ہیں۔ برسوں سے چند خاص لوگوں کی رہائش کے لئے ریزرو ہو چکے ہیں۔ خود پلیٹ فارم اور بالائی پلوں پر بھی قیام و طعام کی اجازت ہے۔ جو لوگ یہاں مستقل طور پر رہنا نہ چاہیں وہ چار چھ گھنٹوں کے لئے اپنی دکان لگا سکتے ہیں۔ بظاہر اس کا کوئی کرایہ نہیں ہے۔ ریلوے پلیٹ فارم پر نیرے کے علاوہ چائے بھی ملتی ہے اور اس چائے کے تعلق سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی چائے کہیں اور مل ہی نہیں سکتی۔ (یہ بات شاید ہم آپ سے کہہ چکے ہیں۔)

بمبئی میں پانی کم پیا جاتا ہے بلکہ صرف چائے پی جاتی ہے اور اس میں تعاون عمل وغیرہ سبھی قسم کی تحریکوں کا دخل ہوتا ہے ایک پیالی چائے جس میں چائے کے کئی قطرے ہوتے ہیں۔ کم سے کم دو آدمی چائے پیتے ہیں۔ طشتری میں جس میں پہلے ہی سے تھوڑا سا گدلا پانی موجود رہتا ہے، مہمان کو چائے پیش کی جاتی ہے، اس طرح چائے کی مقدار اور مہمان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔

شہر بمبئی میں ٹریفک کا بہت انتظام ہے (یوں ام مارل ٹریفک کا بھی بہت اچھا انتظام ہے۔ ام مارل ٹریفک کو نفس امارہ کے ذریعہ قابو میں لایا جاتا ہے) جگہ جگہ ٹریفک آئی لینڈ بنے ہوئے ہیں۔ فٹ پاتھ پر سمنٹ کی ریلنگ لگی ہوئی ہے۔ ٹریفک سگنل قدم قدم پر ہیں۔ یہ ٹریفک سگنل خود کار ہیں، جب ان کی خودی ختم ہو جاتی ہے یا جواب دے دیتی ہے تو بے خود کانسٹبل یہ کام سنبھال لیتے ہیں۔ ٹریفک سگنل پر امبر، ہری اور لال روشنی بتاتی ہے کہ اب آپ کو کیا کرنا ہے۔ لال بتی نظر آئے تو گاڑی اس طرح روک دینی چاہیئے کہ بریک لگانے کی آواز دور دور تک سنائی دے۔ امبر روشنی نظر آئے تو گاڑی چلانے کی تیاری کرنی چاہیئے اور سبز روشنی نظر آتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دینی چاہیئے۔ یہ جھٹکہ زلزلے سے ملتا جلتا ہونا چاہیئے۔ پیدل چلنے والوں کے لئے سگنل کے اندر ہی آدمی کی تصویر بنا دی گئی ہے۔ یہ آدمی مرد ہے لیکن جب یہ نظر آئے تو عورتیں بھی چل سکتی ہیں۔ پورے شہر میں ٹریفک سگنل کی تصویر والا مرد ہی وہ تنہا مرد ہے جس کے اشارے پر عورتیں چلتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر لگی ہوئی ریلنگ میں جگہ جگہ سے ایک ستون توڑ دیا گیا ہے تاکہ لوگ اس میں آسانی سے گذر سکیں۔ یہ راستے بہت ضروری ہیں کیوں کہ ہر شخص تو ریلنگ پر سے پھلانگ نہیں سکتا۔ پھر بھی ہر شخص کو تھوڑی بہت ہائی جمپ آنی ہی چاہیئے۔ راستہ چلنے والوں کے لئے سڑکوں پر سطریں بھی بنا دی گئی ہیں۔ ان سطروں میں بین السطور صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی ٹھیلے سے کوئی راہ گیر ٹکرا کر گر پڑے۔ ٹھیلہ یہاں اس سواری کو کہتے ہیں جس پر اتنا بوجھ لاد دیا جائے کہ اسے ڈھکیلنے والا خود کھنچتا چلا جائے۔ بمبئی میں پورے شہر کا آدھا بزنس، انہیں ٹھیلوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک شاعر نے ہمیں بتایا کہ بمبئی میں ہاتھ گاڑی چلانے والے ایک دن میں جتنا پیدل چل لیتے ہیں اتنا ملٹری والے دو مہینوں میں نہیں چل سکتے بس فرق یہ ہے کہ ان کے پاس بندوق نہیں ہوتی صرف زبان ہوتی ہے لیکن یہ زبان کام بندوق ہی کا کرتی ہے۔

بمبئی میں ٹریفک کے سلسلے میں ایک لفظ بہت عام ہے جگہ جگہ سننے میں آتا ہے "ٹریفک جام ہوگئی" ۔ بہت دن تک تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹریفک جام میں کیسے منتقل ہوسکتی ہے ۔ جب کبھی یہاں ٹریفک جام ہوتی ہے تو ہر موٹر یہ بتاتی ہے کہ میں بھی ایک ہارن رکھتی ہوں ۔ ہارن کا ایسا کورس ہم نے کہیں اور نہیں سنا ۔ جب پانچ سات سو ہارن ایک ساتھ بجتے ہیں تو کئی کانسٹبل اِدھر اُدھر سے جمع ہو کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں ۔ جی بھر کر سیٹیاں بجاتے ہیں اور چند گھنٹوں میں حالات پر قابو پالیتے ہیں ۔ حالات پر قابو پانے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اگر آپ شمال کی طرف جارہے ہوں تو آپ کو مشرق میں روانہ کر دیا جائے ۔ اور جو گاڑی مغرب میں جا رہی ہے تو اُسے جنوب کی طرف بھیج دیا جائے ۔

بمبئی میں سیکلیں اتنی تو نہیں جتنی دلّی میں نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی کافی ہیں ۔ سیکلیں عام طور پر ٹریفک کے قاعدہ قانون سے مستثنیٰ ہیں ۔ دوسری سواریوں کو جگہ جگہ رُکنا چاہیئے ۔ سیکلوں پر صرف اتنی پابندی ہے کہ یہ کہیں نہ رُکیں ۔ موٹروں کے ٹھہرنے کے معاملے میں بھی لوگ دو دو دن پریشان رہتے ہیں اور اس دن ان کی دوکان بند رہتی ہے ۔ کہتے ہیں موٹر نشین لوگ بعض وقت صرف پارکنگ کرنے کے لئے میلوں موٹریں دوڑاتے رہتے ہیں ۔ جن محلوں میں دوکانیں ہیں اگر دوکاندار سورج نکلنے سے پہلے وہاں نہ پہنچیں تو وہ گاڑی سے اُتر ہی نہیں سکتے ۔ کھڑے کھڑے گاڑی بیچ دینی پڑتی ہے بعض لوگ دکان ہی بیچ دیتے ہیں ۔ پارکنگ ایک فن ہے اور موٹر چلانے کا لائسنس بھی یہاں صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو دو فٹ کی جگہ میں موٹر پارک کر کے دکھا دیں ۔

یہاں پر کسی کے ہاں گیاریج نہیں ہوتا ۔ اس لئے رات کے وقت موٹریں اپنے اپنے مکان سے دو چار میل دور سڑکوں پر کھڑی کر دی جاسکتی ہیں ۔ ان میں سے ہر موٹر ، ہر مہینے میں ایک مرتبہ چرائی جاتی ہے ۔ بعد میں ۲۰، ۲۵ میل کے فاصلے پر یہ موٹر دستیاب ہوجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نوجوان کو اپنے تجربہ کے لئے یہ کار درکار تھی ۔ ایسی کار کو یہاں کار چیز کہا جاتا ہے ۔

بمبئی چونکہ بڑا شہر ہے اس لئے یہاں کی ہر چیز بڑی ہوتی ہے ، بڑے بڑے پرندے بھی یہیں نظر آتے ہیں یا ممکن ہے ان پر نظر کا موسم ہی صرف کرسمس کا موسم ہو ، کرسمس کے موقع پر یہاں ہر شخص ٹرکی کھانے کی کوشش کرتا ہے ۔ ٹرکی کھانے کا ہمیں موقع نہیں ملا لیکن سنا ہے ٹرکی کھانے میں فائدہ یہ ہے کہ کھانے کے ساتھ ساتھ ورزش بھی ہو جاتی ہے زندہ ٹرکی ہمیں کئی جگہ نظر آئے ۔ کہتے ہیں یہ مرغ کی ایک قسم ہوتی ہے ، وہ مرغ نہیں جو اُردو شاعری میں پایا جاتا ہے) اس مرغ کے آباو اجداد ترکی میں پیدا ہوئے تھے اور پھر ان کی نسل شمالی امریکہ لے جائی گئی کیونکہ یہ پرندہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ان کی پرورش کا انتظام اہلِ ترکی کے لئے ممکن نہ تھا ۔ شمالی امریکہ میں یہ نسل خوب پھلی پھولی (جمہوریت کا یہی فائدہ ہے ۔ مرغوں کو بھی ترقی کرنے کی اجازت ہوتی ہے) اصل مرغ تو ہم نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے لیکن ٹرکی کے دیدار سے آنکھیں روشن ہوگئیں ۔ مرغ اسے کہتے ہیں اور مرغ کو اتنا ہی ضخیم اور شاندار ہونا چاہیئے ۔ ٹرکی کو عام مرغوں اور مرغیوں کی طرح ڈربے میں نہیں پیدا کیا جاسکتا ۔ مرغ کا بچہ ایک کمرہ چاہتا ہے تاکہ اسے مکمل پرائیویسی حاصل ہو ، ٹرکی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا اپنا رنگ ہوتا ہے اور یہ ان حرکتوں سے احتراز کرتا ہے جو کم سے کم پبلک میں مرغ و مرغ کے مرغوں کو بہت بھاتی ہیں ، اس کی صحت کا راز بھی یہی ہے ۔ بظاہر یہ تجرد کی زندگی گزارتا ہے ۔ ٹرکی کے سر پر

کلغی تو ہوتی ہے۔ لیکن پَر نہیں ہوتے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی دُم پروں سے لبریز ہوتی ہے۔ جب دُم پر اتنے
خرچ ہو جائیں گے تو سر کے لئے کہاں سے آئیں گے۔ کرسمس کے موقع پر ٹرکی کے گوشت کا کھایا جانا، وقار کی علامت ہے کچھ
نہیں تو ایک تولہ گوشت کھانا ہی چاہیئے۔ یہ صرف ۲۵ روپے کلو بکتا ہے
بمبئی میں انڈے بھی سائز میں اوول میدان کے مانند ہوتے ہیں۔ ان کا نام ہی جمبو بیضہ ہے۔ جمبو انڈے میں ایک
نہیں دو زردیاں ہوتی ہیں۔ یہ انڈا وہ لوگ کھاتے ہیں جنھیں ڈاکٹر، دن میں صرف ایک بار کھانا کھانے کی ہدایت کرتے ہیں
یہ جڑواں زردیاں، سائز، رنگ، ساخت اور خواص میں ایک ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں ان کا ذائقہ بھی ایک سا ہوتا ہے۔ جمبو
انڈوں کے بارے میں بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ یہ انڈے مرغیاں نہیں پیدا کرتیں۔ ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔ مرغیاں
کیا نہیں کر سکتیں۔ بطخوں کو اپنے دیئے ہوئے انڈوں کی جسامت پر بڑا ناز تھا۔ اب ان کا سر پُر غرور جھک گیا ہے۔
(ہر غرور کا یہی انجام ہوتا ہے)

ہم نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا لیکن سُنا ہے یہاں چند خاص دنوں میں بکرے بھی اتنے بڑے بڑے آتے ہیں
کہ دو آنکھوں میں سما سکتے۔ ہمیں کسی نے بتایا کہ ایک مرتبہ تو ایک بکرے کی تصویر بھی اخبار میں چھپی تھی۔ اور جس اخبار
میں یہ تصویر چھپی تھی وہ خود بلیک میں بکا تھا۔ (بلیک بکنا خاص محاورہ ہے) ان بکروں کو خشک میوہ کھلا کر پالا جاتا
ہے۔ ایسے بکروں کا گوشت، پیر کے دن کھایا جائے تو بدھ یا جمعرات تک ضرور ہضم ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ دیر نہیں لگتی
ٹرکی کے گوشت کے ہضم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہاں کے کولڈ اسٹوریج میں مینڈکوں کے دست بازو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دست بازو بھی کافی تندرست
و توانا تھے۔ معلوم ہوا یہ باہر کے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں مینڈک کا گوشت جو بھی کھا لیتا ہے اُسے عمر بھر زکام
نہیں ہوتا۔ کیوں کہ خود مینڈک کو زکام نہیں ہوا کرتا یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی۔ مینڈک کی دوسری اور اہم خصوصیت یہ ہے
کہ یہ تنہا جانور ہے جو پانی میں بھی زندہ رہتا ہے اور خشکی پر بھی، اس کی پیدائش البتہ پانی میں ہوتی ہے اور اسی لئے بڑا ہو کر
جب یہ خشکی پر آجاتا ہے تو صرف مخصوص ضروریات کے لئے پانی میں واپس جاتا ہے۔ اس کے پَیر اس لئے برآمد کئے جاتے
ہیں کہ مینڈک میں صرف ہوتے ہی پَیر ہیں۔ باقی جو کچھ بھی ہوتا ہے بھرتی کے شعر کی طرح ہوتا ہے۔

ترکاریوں میں یہاں بینگن کی پرورش پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اُسے بہت کھلا پلا کر پالا پوسا جاتا ہے
جمبو کا لقب، چونکہ انڈوں کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اس لئے انھیں جمبو بینگن نہیں کہا جا سکتا لیکن ہوتے یہ جمبو بینگن
ہی ہیں۔ صرف ایک عدد بینگن کا سالن تیار کر لیا جائے تو پورے محلے کے افراد کے لئے کافی ہو جاتا ہے اسے پکانے کے
لئے البتہ الگ سے چولہا تعمیر کرنا پڑتا ہے۔ خاص دیگ بھی بنوانی پڑتی ہے لیکن بینگن کھانے میں تو یہ سب کتنا ہی پھیکا
ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اگر اچھے بینگن کھانے ہیں تو حیدرآباد جانا چاہیئے۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہاں لوگ تیکھی نہیں بگھارتے
صرف بینگن بگھارتے ہیں۔

پھلوں میں کافی بڑے سائز کے کیلے بھی نظر آئے پہلے تو ہم سمجھے یہ کیلے ناپ کر بیچے جاتے ہوں گے لیکن یہ

بھی عدد کے حساب سے بکتے ہیں۔ یہ کیلے یہاں نہیں پیدا ہوتے۔ ہندوستان میں ایک مقام ہے کیرالا۔ یہ کیلے وہیں سے آتے ہیں۔ کیرالا کا ایک کیلا عام سائز کے چند کیلوں سے کچھ بڑا ہی ہوتا ہے۔ اور وہاں سے بمبئی پہنچنے تک موم کی طرح نرم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لوگ اسے چھ روپے درجن خرید کر خوش ہوتے ہیں کہ سستے مل گئے۔

بمبئی میں بڑی چیزوں میں سب سے اہم چیز یہاں کی بڑی بڑی باتیں ہیں۔

ہندوستان پہنچنے دلّی میں نیا سال جمی کارٹر کے آنے سے شروع ہوا۔ پہلے تو ہمیں افسوس ہوا کہ اس موقع پر ہم دلّی میں نہیں بمبئی میں تھے لیکن جب بمبئی میں ٹیلی ویژن پر ہم نے جمی کارٹر کے استقبالیہ کی کارروائی دیکھی تو خوشی ہوئی کہ ہم دلّی سے ۱۲ یا ۱۳ سو کیلو میٹر دور تھے۔ انھیں وہاں میونسپل کارپوریشن کی طرف سے رام لیلا میدان میں ایک استقبالیہ دیا گیا تھا۔ استقبالیہ کی کارروائی ہندی میں تھی۔ باہر سے آنے والے سربراہان ملک پر یہ پابندی ہے کہ اپنے استقبالیے کی تقریب کے دوران مسلسل مسکراتے رہیں خواہ وہ کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں جمی کارٹر کو یوں بھی مسکرانے کی کچھ عادت سی ہے۔ (معلوم نہیں وہ کس کیفیت کی مونگ پھلی کھایا کرتے ہیں) اس لئے انھیں اس محفل میں بھی مسکراتے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن ان کی مسکراہٹ اس وقت غائب ہوگئی جب وہ خود تقریر کرنے کھڑے ہوتے۔ انہیں اپنی تقریر کے ہر جملے کے بعد مائک سے ہٹ جانا پڑتا تھا کیونکہ ایک مہاشے اُن کی تقریر کا ہندی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ کہتے ہیں ایسا ترجمہ ہندوستان میں اس سے پہلے نہ کبھی ہوا تھا نہ کبھی سنا گیا۔ اس ترجمے کی خوبی یہ تھی کہ اس کا جمی کارٹر کی تقریر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ اُن کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر کیا گیا تھا۔ اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ یہ انھیں کی تقریر کا ترجمہ تھا۔ اس پروگرام کو اور زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا تھا۔ انھیں مترجم صاحب سے کہا جاتا کہ ہندی تقریروں کا انگریزی ترجمہ بھی سناؤ تو ہماری فارن پالیسی پر کافی اچھا اثر پڑتا۔ انگریزی زبان میں بھی کچھ اضافے ہوتے۔

جمی کارٹر کے یہاں سے جانے کے فوراً بعد ہی برطانیہ کے وزیر اعظم کیلہن یہاں آگئے۔ کیلہن بھی اپنے دورے کے درمیان کافی مسکرائے۔ انہوں نے بھی بچوں کو گود میں اٹھایا اور ثابت کر دیا کہ بچوں کو گود میں اٹھانے کا قاعدہ صرف وائٹ ہاؤس ہی میں نہیں ڈاؤننگ اسٹریٹ نمبر دس میں بھی ہے۔ ہندوستان میں ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے۔ کہ یہاں مقابلہ بہت ہوتا ہے۔ ہر چیز میں مقابلہ چاہے وہ ادب ہو یا فیشن، تجارت ہو یا سیاست، کھیل ہو یا تقریب اب یہ دونوں حضرات یہاں آکر واپس ہوئے تو یہ مقابلہ ہو رہا ہے کہ کس کا دورہ زیادہ کامیاب رہا۔ کیا یہ بھی کوئی مشاعرہ تھا، جس میں یہ طے کیا جائے کہ کون شاعر زیادہ کامیاب رہا۔ اور کسے کم داد ملی (غنیمت ہے کہ سربراہان ملک کے دوروں کے موقع پہ ونس مور کے نعرے کا طریقہ رائج نہیں ہے) اب تو ہندوستان میں مرن برت کے بھی مقابلے ہونے لگے ہیں۔ ایک سوشیل ورکر کہتا ہے کہ میں نے ۱۹۷۶ء میں ۲۲ دن کا مرن برت رکھا تھا۔ تو دوسرا کہتا ہے کہ ۲۲ دن کا مرن برت بھی کوئی برت ہوا ہے.... تو ۱۹۷۵ء میں ۲۴ دن تک مرن برت رکھتا رہا۔ اور میرا کچھ نہیں بگڑا (مرن برت یہاں ہمیشہ ایسے برت کو کہا جاتا ہے کہ جس میں برت رکھنے والے کا کچھ نہ بگڑے۔)

بمبئی میں تو ہم نے قوالی کے مقابلے بھی دیکھے۔ قوالی ہماری زیادہ سمجھ میں نہیں آتی لیکن ہمیں وہ شور بہت پسند آتا ہے۔ جو قوالی میں ہوا کرتا ہے۔ شروع شروع میں تو ہم یہ سمجھتے رہے کہ یہ شوری قوالی ہے لیکن پھر ہمیں بتایا گیا

رقاصاؤں کے ناچ بیچ میں گانے کی طرح جو چیز ہوتی ہے وہ قوالی ہے۔ ہمیں اپنی کم فہمی پر کافی ندامت ہوئی قوالی کے مقابلوں میں ہمیں دوسری چیز جو بہت پسند آئی وہ سامعین کی طرف سے خراج عقیدت پیش کرنے کا طریقہ ہے۔ یہ خراج عقیدت رقم کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ دور سے یعنی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اسٹیج پر روپے پیسے پھینکے جا سکتے ہیں۔ لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جگہ سے اٹھے اور پورا راستہ طے کر کے نہایت ادب کے ساتھ روپے قوال کی خدمت میں پیش کرے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ وہ شخص قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ جو اپنی جگہ سے جھومتا ہوا اٹھے اور ناچتا ہوا اسٹیج کی طرف جائے۔ اسٹیج کے قریب پہنچ کر کم سے کم تین منٹ بھارت ناٹیم دکھلائے اور پھر نذر پیش کرے (حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ اس شخص کو اس کے ناچ کے سلسلے میں اسٹیج پر بیٹھنے والوں کی طرف سے نذرانہ پیش کیا جانا چاہیئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ گنگا الٹی بہا کرتی ہے

قوالی میں تیسری چیز جو ہمیں بہت پسند آئی وہ مردوں اور عورتوں کا مقابلہ ہے۔ یہی ایک میدان نظر آیا۔ جس میں مرد، عورتوں کا مقابلہ کرنے میں خوف محسوس نہیں کرتے۔ ان کی آوازیں کافی اونچی ہوتی ہے۔ اور باجے کے شور میں بھی سنائی دیتی ہے۔

بمبئی میں پچھلے دو ہفتوں سے سردی بھی شروع ہو گئی ہے۔ اور سڑکوں پر جوڑے اور زیادہ قریب ہو کر چلنے لگے ہیں ان کے بیچ میں پہلے اتنا فاصلہ رہتا تھا کہ ہوا گزر سکے۔ اب اس کی اجازت نہیں ہے۔ بمبئی کی سردیاں ہوتی ہی اتنی مختصر ہیں کہ ان کا ذرا سا بھی حصہ ضائع ہونے نہیں دیا جا سکتا۔

بمبئی میں ہماری اچھی خاصی گزر رہی تھی۔ بڑے بڑے سیاحوں سے ہم نے سُنا تھا کہ نیویارک کے بعد اگر کوئی معقول شہر ہے تو وہ بمبئی ہے۔ سیاحوں کی باتوں پر ہم نے کبھی یقین نہیں کیا۔ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے شاعروں اور سیاحوں میں یہ فرق ہے کہ سیاح بازی مار لیتے ہیں۔ لیکن ان کی اس بات پر ہم اس لئے ایمان لے آئے کہ اول تو ہم نے نیویارک دیکھا نہیں اور دوسرے اس لئے کہ اگر وہ بھی بمبئی جیسا ہی ہے تو پھر کیوں اتنے پیسے خرچ کئے جائیں سیاحت ہمیشہ غریب ملکوں کی کرنی چاہیئے۔ ہندوستان میں اسی لئے سیاحوں کی بہتات ہے۔ کابل میں بھی سُنا ہے باہر کے لوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ تھوڑے سے روپے میں زیادہ سے زیادہ عیش کی سہولت ایسی ہی جگہوں پر ہوتی ہے خیر ہمیں ' ان مصلحتوں سے کیا کرنا ہے۔

جی تو بہت چاہا کہ بمبئی میں کچھ دن اور گزارے جائیں لیکن ہمارے گھر یعنی پرشین گلف سے خبر آئی کہ اسمگلنگ کا کاروبار دوبارہ شروع ہونے والا ہے اور یہ کہ ہمیں فوراً واپس ہونا چاہیئے ہم نے سوچا کہ ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے کم سے کم تاج محل تو دیکھ لیا جائے۔

آگرہ شہر ہمارے جی کو نہیں لگا۔ اس شہر کو بھی خوبصورت بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو پیٹھے کی مٹھائی کھانے ہی سے فرصت نہیں ہے۔ پیٹھا اصل میں ایک پھل ہوتا ہے۔ جو تربوز کی طرح گول ہوتا ہے۔ ہر تربوز میں ایک کیلو گرام چھلکا اور ایک لیٹر پانی ضرور ہوتا ہے۔ پیٹھے میں صرف گودا ہوتا ہے۔ اس گودے کی مٹھائی بنتی ہے۔ اور اتنی کثیر مقدار میں بکتی ہے کہ کیا اناج بکے گا۔ ہماری رائے میں تو پیٹھے کو تو پھل کی بجائے ترکاری کہنا چاہیئے۔ لیکن جب انگریز ٹماٹر کو فروٹ کہتے ہیں تو اگر ہندوستان میں پیٹھے کو پھل کہا جاتا ہے تو اس میں ادب یا زبان کا کونسا ایسا

نقصان ہے جو سہا نہیں جا سکتا۔

آگرے کی آدھی آبادی کو ہم نے پیٹھے کی مٹھائی کی تجارت میں مشغول پایا۔ آگرہ کی دال موٹ بھی کھانے میں آئی یہ بھی کافی مشہور و مزے دار ہے اور جو شخص دال موٹ نہیں کھاتا لوگ اس کے بارے میں مشکوک ہو جاتے ہیں ہندوستان میں جتنے بھی شہر ہیں وہ سب کسی نہ کسی ڈش کی وجہ سے مشہور ہیں مثلاً دلی کے اطراف و اکناف میں ایک شہر ہے جس کا نام متھرا ہے متھرا کے پیڑے مشہور ہیں۔ متھرا جا کر اگر آپ وہاں کے پیڑے نہ خریدیں تو لوگ مارتے ہیں۔ کانپور کے جوتے مشہور ہیں (لیکن جوتے ڈش کی تعریف میں نہیں آتے) علیگڑھ کے تالے، میرٹھ کی قینچیاں اور جونپور کے چاقو مشہور ہیں۔ (لیکن یہ چیزیں بھی ڈش کی تعریف میں نہیں آتیں) ہندوستان میں جگہ جگہ کراچی کا حلوہ بھی ملتا ہے ہم سمجھتے تھے یہ کراچی سے بن کر آتا ہے۔ لیکن یہاں آ کر ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تو جاپان، امریکہ، جرمنی اور برطانیہ سب ہی جگہ کا سامان بنتا ہے۔

تاج محل کی عمارت دیکھ کر ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہمیں شبہ ہے کہ یہ عمارت روزانہ دودھ سے دھوئی جاتی ہے۔ اس عمارت کو تو زمین اور آسمان کے بیچ کہیں ہونا چاہیے تھا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ عمارت آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے۔ لیکن تاریخ میں بھی باتیں سچ تھوڑے ہی لکھی جاتی ہیں۔ ہمیں یہ سن کر تعجب ہوا کہ تاج محل میں خودکشی کی وارداتیں کم ہوتی ہیں۔ اتنے خوبصورت مقام پر تو آدمی بلا کسی وجہ کے بھی مر جاتے۔ تاج محل، آگرہ کی بجائے، جاپان وغیرہ میں ہوتا تو کم سے کم دس ایسی وارداتیں تو روزانہ ہوا کرتیں۔ دلی میں قطب مینار کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہاں اس قسم کی عمارتوں پر نگرانی بہت ہوتی ہے۔ قطب مینار پر تو کسی آدمی کو تنہا چڑھنے بھی نہیں دیا جاتا۔ ایک چشم دید گواہ ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ سنا ہے جب دو آدمی ایک ساتھ اوپر جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے ہیں کہ دوسرا کہیں مجھ سے پہلے نہ کود پڑے۔

آگرے سے رخصت ہوتے وقت ہمارے آنسو نکل پڑے۔ (غنیمت ہے دو ہی تھے) ہمیں اگر کبھی دوبارہ کہیں جانے کا موقع ملا تو ہم تاج محل ہی دیکھنے آئیں گے۔

ہمیں واپس ہونے کی جلدی تھی۔ ورنہ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم حیدرآباد اور لکھنؤ میں زیادہ ٹھہریں کیونکہ ایک دو ہفتے تو 'پہلے آپ' 'پہلے آپ' میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہم ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے۔ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کی بہت تعریف سنی تھی۔ کہتے ہیں اکیلے ایک شخص نے نوادرات کا اتنا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ جو بڑی بڑی حکومتوں ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں پہلے ہاتھیوں گھوڑوں، بیلوں اور بھینسوں کو بھی چاندی سونے کے زیورات پہنائے جاتے تھے۔ یہ زیور بھی اس میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن جب ہم یہ میوزیم دیکھ ہی نہیں سکے، تو سنی سنائی باتیں کیوں لکھیں۔ یہ دو جملے بھی جو ہم نے لکھ دیئے ہیں اپنی حسرت کے اظہار کے لئے لکھے ہیں۔

ہندوستان کے شہروں میں سے بنارس جانے کی بھی خواہش تھی۔ ہندوستان کا یہ تنہا شہر ہے جسے تین ناموں سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست " " جنھیں اردو کے شاعروں اور شاعری سے بڑی دلچسپی ہے اور جنھوں نے اپنا کافی وقت ہمیں اردو شاعری سمجھانے پر ضائع کیا۔ ہمیں بتا رہے تھے کہ اردو کے بڑے شاعر یا ادیب کو ہندوستان کے کسی نہ کسی شہر سے عشق تھا۔ اردو کے دو بڑے شاعر میر تقی میر اور ذوق کو دلی بہت پسند تھی۔ غالب کو کلکتہ بہت بھاتا تھا اور وہ اس کی یاد میں شعر کہا کرتے تھے۔ شبلی صاحب کو بمبئی سے عشق تھا۔ معلوم نہیں ہمارے ان ادیب دوست کو

یہ ساری باتیں کہاں سے معلوم ہو گئی تھیں۔ وہ تو اپنے بیان کے ثبوت میں ان سب شاعروں کے اشعار بھی سنایا کرتے تھے۔ جو کبھی ہمارے پلّے نہیں پڑے۔ اُنھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ اگر ہندوستان میں صبح دیکھنی ہے تو 'صبح بنارس' دیکھنی چاہیئے۔ لیکن ہمارے بہت پوچھنے پر بھی وہ یہ نہ بتا سکے کہ 'صبح بنارس' کس شاعر کی ایجاد تھی۔ انھوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہاں کے شاعروں نے دن، راتیں، شامیں اور صبحیں اسی طرح مختلف شہروں کے نام کر دی ہیں۔ شام کے بارے میں شاید انھوں نے بتایا تھا کہ یہ صرف اودھ میں ہوا کرتی ہے۔ (وہ اودھ کے کبابوں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے) رات کے لئے انھوں نے 'مالوے' کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ رات میں جاگنا ہو یا سونا' دونوں کاموں کے لئے شب مالوہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بات بھی ہم ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے۔

ہم اصل میں یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ بنارس تین ناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ آم' پان اور ساڑیوں کے لئے بنارس مشہور ہے۔ یہ تینوں چیزیں سارے ہندوستان میں کھائی اور پہنی جاتی ہیں۔ بنارسی ساڑی کے بغیر تو عورت کا دلہن ہی بننا ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص آموں کے موسم میں بنارسی لنگڑا ضرور کھاتا ہے۔ اور جسے بھی سڑک پر تھوکنا ہوتا ہے۔ وہ بنارسی پان کھا کر ہی تھوکتا ہے۔ مندروں کا ذکر آئے گا تو یہی شہر کاشی کہلائے گا۔ تیرتھ یاترا کو جانے والے لوگ بنارس کبھی نہیں جاتے کاشی ہی جایا کرتے ہیں۔ اور ریل جاتی ہے تو صرف وارانسی جاتی ہے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں نہ بنارس ہے نہ کاشی صرف وارانسی ہے بلکہ ٹرین کا لقب ہی وارانسی اکسپریس ہے۔ افسوس ہے کہ ہم ایسے دلچسپ شہر کی زیارت نہیں کر سکے۔ ہم ایک مرتبہ ہندوستان اور آئیں گے اور اب کی بار آئے تو واپس نہیں جائیں گے۔ ★★

کرنل محمد خان (پاکستان)
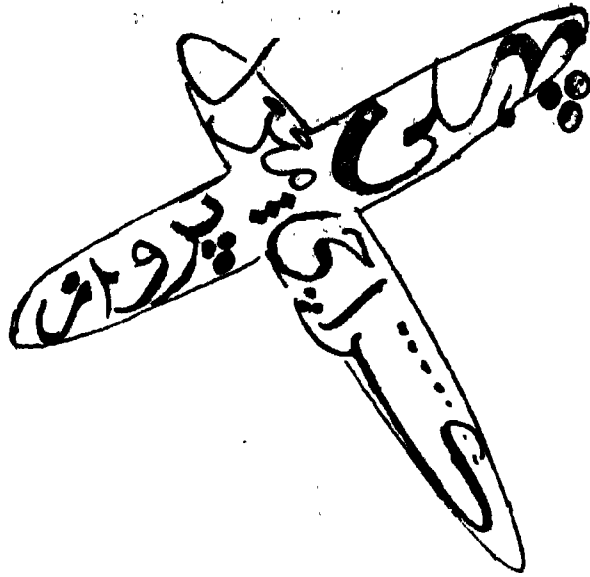
بن یاراں کس کاری

ساڑھے تین بجے سہ پہر ہمارا جہاز کراچی روانہ ہونا تھا۔ ہم پورے تین بجے چک لالہ ایرپورٹ پہ
پہنچ گئے۔ پنڈی سے ہمیں پیار ہے ایک تو اس لئے کہ اس کے نام میں نسائیت ہے ——— لاہور اور
پشاور بہت مذکر کاٹ کے شہر ہیں ——— لیکن پنڈی کی اداے دلبری محض تانیث تک ہی محدود نہیں
نام کے لحاظ سے کراچی بھی اتنی ہی مونث ہے بلکہ ایک شادی شدہ کنیت بھی رکھتی ہے یعنے عروس البلاد
کہلاتی ہے۔ لیکن جو شیوۂ ترکانہ دوشیزۂ پنڈی کا ہے وہ اس عروس ہزار داماد کا نہیں لیکن آج ولایت
روانہ ہوتے ہوتے ہمیں پنڈی سے بھی شکوہ ہونے لگا۔ وہ اس لئے کہ پنڈی کا پنڈا جو عام حالات
میں ہاتھ کے نیچے حریر و پرنیاں کی طرح ملائم و معتدل محسوس ہوتا تھا آج خلاف معمول ریگ اُموکی مانند
درشت اور گرم لگ رہا تھا۔ اور یہ پنڈی کے مزاج پہ ناقابلِ تلافی تہمت تھی۔ پنڈی کی دلربائی کا تو یہ تقاضا
تھا کہ آج ——— اور خصوصاً آج کہ ہم رخصت ہو رہے تھے۔ مری سے خاص طور پر بادل آتے، بوندا باندی
ہوتی، باغوں میں جھولے پڑتے فضاؤں میں رومان رچتا اور پنڈی چھوڑنے پہ ہمارے ارمانوں میں ہلچل
مچتی۔ کوئی دستِ ناتواں بھی دامن گیر ہوتا تو ہمیں دامن جھٹکنے کا یارا نہ ہوتا۔ اول تو ہم وہیں ہوائی ٹکٹ
پھاڑ کر پھینک دیتے ورنہ جہاز کی طرف قدم نہ اٹھتا۔ اور اٹھتا بھی تو اس انداز سے کہ پہلے ان کا دامن
تھام کر دل کو تھامتے اور پھر بہزار مشکل قدم بعد قدم جہاز کے زینے تک پہنچتے اور سیڑھیاں چڑھتے

کے لئے ایر ہوسٹسوں کا دو طرفہ سہارا درکار ہوتا ۔ ۔ ۔ معاف فرمائیے گا ۔ ر نکیلے پیا واجد علی شاہ سے زینے کا مضمون ، اتفاقیہ لڑ گیا ۔ یہ سرقہ نہیں توارد ہے ۔۔۔۔۔۔ لیکن آج پنڈی کے مزاج میں شوخی کم تھی اور گرمی زیادہ اس درجہ حرارت پر پہنچ کر ہمارے ارمان پروان چڑھنے سے پیشتر ہی پگھل گئے ۔ اور جب ہم بے ارمان دل لئے ایرپورٹ پر پہنچے تو جی چاہا کہ بیرونی ہال کے جلد رنگ و بو سے قطع نظر کرتے ہوئے انتظار گاہ کی خنکی میں جا پناہ لیں ۔ لیکن اچانک ہال کے ایک کونے میں ہمیں الوداع کہنے والوں کی ایک ٹکڑی نظر آئی ۔ یوں تو شاید ہم دور ہی سے اپنے الوداع کنندگان کو ایک رسمی مسکراہٹ ، ایک دستی لہراہٹ اور ایک زبانی ٹاٹاہٹ سے انگریزی جواب دے کر ہمسفروں کے ریلے میں اندر چلے جاتے ۔ لیکن ناگہاں احساس سا ہوا کہ ہم طوعاً کرہاً ٹکڑی کے مرکز کی طرف کھنچے کھنچے چلے جا رہے ہیں یوں جیسے اجرام فلکی کی کشش ثقل میں آ گئے ہوں ۔ اور دیکھا تو ٹکڑی کے درمیان ضمیر[1] کی بسیط تنومندی اور اس کے ساتھ سالک[2] کی بلیغ سر بلندی نظر آئی ۔ کشاں کشاں اور بے اختیار ان سے جا لپٹے ۔ پھر شاید دوستوں کو ہلتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے گرد کی لہر بھی تھم گئی ۔ اور دم معانقہ صرف ایک خیال دامنگیر رہا : کیا ان دوستوں کے بغیر سیر فرنگ میں کچھ مزا ہوگا ؟ سیف الملوک کا مصرع یاد آیا ۔ ع

باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری ؟

لیکن وہ گرم و گراں نصف ساعت جو جہاز کے انتظار میں پہاڑ نظر آ رہی تھی ، ضمیر اور سالک کے ساتھ اس قدر سبک ، سہل اور سویٹ گزری کہ ایک لمحہ گریزاں معلوم ہوئی ۔ اور پتہ اس وقت چلا جب ایک ایر ہوسٹس نے کسی قدر تلاش کے بعد ہمیں ڈھونڈ کر جھنجھوڑا ۔ " پی ۔ آئی ۔ اے کی پرواز لاہور اور کراچی کے لئے تیار ہے اور آپ ہی کا انتظار ہے ۔" پھر اس پر بھی اصرار کیا کہ : ابھی بلا توقف ' میرے ساتھ جہاز کی طرف چلو ۔ ہم چل پڑے اور وہ ایر ہوسٹس سے ہم کلامی اور ہم خرامی کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہو گئی ۔ لیکن محترمہ نے کوئی گمراہی کی بات نہ کی ' بلکہ آپ کے روئے انور پہ نگاہ پڑی تو محسوس ہوا جیسے ابھی مصلے سے اٹھ کر آئی ہوں ۔ جب پوچھا کہ آپ کا یہی کام ہے کہ بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہ راست پہ لا کر پہنچا دیں تو بولیں :

" جی ہاں میں گراؤنڈ ہوسٹس ہوں ۔"

کیا ایر ہوسٹس تولید خون کا باعث ہوتی ہے ؟

ہوسٹسیں دو قسم کی ہوتی ہیں ۔ ارضی و سماوی ۔ ارضی یعنے گراؤنڈ ہوسٹسیں نمازی شکل و صورت کی ہوتی ہیں یعنے نماز پڑھیں نہ پڑھیں پر ہمیشہ نماز کی لگتی ہیں ۔ ان سے بات کرتے ہوئے دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے ۔ دنیا فانی معلوم ہوتی

---

[1] : میجر سید ضمیر جعفری صاحب بانی الضمیر ملک کے مایۂ ناز مزاح نگار

[2] : میجر صدیق سالک " ہمہ یاراں دوزخ " کے مصنف اور صاحب طرز نثر نگار

ور اُن کی صحبت میں ہوائی جہاز کی پرواز نہ دیکھ... ترین مسجد کو بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سماوی پری نشین جہاز پر
پائی جاتی ہیں۔ اور ان کا تاثر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کی ہمسفری سے یا داہی میں تو نمایاں کمی آ جاتی ہے۔ البتہ
ان کے قرب سے تولید خون میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے۔ اور ان کی معطر سانسوں کے طفیل ہوائی جہاز کی ایرکنڈیشنگ
کے باوجود زندگی میں حرارت آتی ہے اور اگر یہ چلتی پھرتی رہیں تو دنیا رہنے کے قابل معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی ہما...
زادی اُودی کلونی میں گھٹ کر جہاز کی فضاء کو قطعی طور پہ ایمان رُبا بنا دیتی ہے جس سے مسافروں اور ساقرات
کے اپنے ارمان اور درمان تحت الشعور میں کروٹ سے کر اچانک جاگ اُٹھتے ہیں حتیٰ کہ بوڑھے اور بھاری
بھرکم سینیر افسر بھی جو ریٹائرمنٹ کے دہانے پر کھڑے ہو کر آخری سرکاری دورے پہ نکلے ہوتے ہیں بار بار گھنٹی
کا بٹن دباتے ہیں اور بار بار سنگتریاں طلب کرتے ہیں۔ اور اس بہانے اپنی ہلکی پھلکی میزبانوں سے خوش وقت ہو کر
اپنی ہم عمر اور ہم وزن بیگمات سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر وقتی نجات مناتے ہیں۔ الغرض ارضی و سماوی ہوسٹسوں
میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

آخر ہم نے دولتِ ایمان سے مالا مال ہو کر اس خدا رسیدہ ارضی ہوسٹس سے رخصت لی اور اس توقع پر
زینہ پہ قدم رکھا کہ رنگ و بو کی آسمانی دنیا میں داخل ہوتے ہی، شاید کوئی فتنہ ساماں، سماوی میزبانہ ہمارے
ایمان کے امتحان پہ آمادہ ہو جائے۔ لیکن دروازہ پہ کھڑی ایر ہوسٹس کو دیکھا تو خلاف توقع موصوفہ میں کوئی فتنوں والی
بات نظر نہ آئی۔ ہر چند کہ آپ کے رُخ و گیسو پر پی' آئی' اے کی مفت کریموں اور اوڈی کلونوں کا ضیا فانہ چھڑکاؤ کیا
گیا تھا۔ تاہم وہ بات پیدا نہ ہو سکی تھی جو سماوی مہ سیماؤں کا خاصہ ہوتی ہے۔ بلکہ شکل و صورت سے آپ اپنی اس
ارضی بہن سے بھی زیادہ تہجد گزار نظر آئیں گی۔ جس کی تحلیل سے ہم ابھی ابھی آزاد ہوتے تھے۔ بہر حال آپ
نے حسب معمول خوش آمدید کہنے کے لئے منہ کھولا۔ اور معاً آپ کی آواز کی خنک لہر سے جہاز کے تھرمامیٹر میں
پارہ گرنے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے اپنے ایمان کو ٹٹولا تو بالکل سالم اور صحت مند پایا۔ کیا مجال جو ذرا سی آنچ بھی آئی ہو۔
اور آتی بھی کیسے؟ برفخانے سے آنچ نہیں اُٹھا کرتی بلکہ قرائن سے نظر آتا تھا کہ ضرورت کے وقت آپ آگ بجھانے کے
آلے کا کام بھی دے سکتی ہیں۔ باقی رہا اُن کے قرب سے تولیدِ خون کا امکان تو فی الحال انجماد خون کا خطرہ زیادہ قریب
تھا۔ دراصل پی' آئی' اے نے محترمہ کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ یعنے مشیت یزدی نے انہیں ایر ہوسٹس پیدا نہیں کیا تھا۔
لیکن پی آئی اے نے بزور کر دیا تھا۔ یہ نہیں کہ خدانخواستہ آپ کسی کام کے قابل نہیں تھیں۔ یہ بات نہیں۔ آپ ٹیلیویژن پر
بیکار اگ گا سکتی تھیں۔ جہاں آپ کو مزید منہ بگاڑنے کی حاجت نہ ہوتی یا آپ ایکسپینڈ ایڈیشن کر عشق بار رفوں کنندوں
کو غائبانہ طیش دلا سکتی تھیں۔ اور اگر کوئی ایسا ہنر نہیں جانتی تھیں تو فقط شادی کر کے خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام
تہ و بالا کر سکتی تھیں۔ الغرض زمین پہ اُن کی جولانگاہ بڑی وسیع تھی۔ لیکن آسمانی میزبانوں کی دنیا میں آپ بہت بیجا
لگتی تھیں۔ بجھا بجھا سا ناہموار چہرہ یتیم گال سقیم آنکھیں اور منقبض ہونٹ جن تک مسکراہٹ کی رسائی ماؤنٹ ایورسٹ
کی برفیلی چوٹی سر کرنے سے کم نہیں تھی۔ اور جن کی دسترس میں لپ اسٹک نے تھک ہار کر دم توڑ دیا تھا۔ کسی
غیر جانبدار شخص کے نزدیک بھی یہ ہوائی میزبانی کے لچھن نہ تھے۔

بہرحال ہم نے موسوف کی خوش آمدید کے جواب میں اپنے جذبات پر قابو رکھا اور خوشی سے اُن سینیئر افسروں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ جو سراپا تصویر درد بنے سنگتریوں کا مقاطعہ کئے بیٹھے تھے اور کئی ایک تو اپنی بیویوں کو جانِ من سے خطاب کر کے خط لکھ رہے تھے۔ اور از راہ پشیمانی اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے۔

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ہم نے بھی پی آئی اے کے سیلکشن بورڈ کے خلاف احتجاج کے طور پر کھانے پینے کی ہڑتال کر دی اور اپنی سیٹ کی پُشت کو پیچھے گرا کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ ہم آنکھیں کھول کر بھی لیٹ سکتے تھے۔ لیکن کچھ دیکھنے کو بھی ہوتا۔ ذوقِ دید کو گوارا نہ ہوا کہ یوں بلا ضرورت چشمِ بینا داغی جائے۔ ویسے آنکھیں بند رکھنے کی ایک مزید وجہ یہ تھی کہ ہماری جڑواں سیٹ پر یعنی بالکل ہمارے پہلو میں ایک تنگ جامس بیم صاحبہ اپنے بیشتر خفیہ ہتھیار (Secret weapons) بے نیام کئے نیم دراز تھیں۔ مگر اس اسلحہ کی نمائش کے باوجود بے ضرر تھیں کیونکہ غالباً انہیں اپنے آخری ہم نشین کو شکار کئے ہوئے کم و بیش تیس برس بیت چکے تھے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ اُن کی بے نیش عریانی محض ویرانی کا اشتہار تھا۔ اور صاف ظاہر تھا کہ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا ہے سو اس بے استعمال ماحول میں آنکھیں موند لینے کے سوا کسی دیگر مفید شغل کی گنجائش نہ تھی۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

ایئر ہوسٹس کو ڈائن کس نے کہا ہے؟

کچھ دیر بعد اچانک ایئر ہوسٹس نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا:

"خواتین و حضرات تھوڑی دیر کے بعد ہم لاہور کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں براہ مہربانی اپنے سگریٹ بجھا دیں اور حفاظتی بند باندھ لیں"

یہاں تک تو اعلان مناسب اور ضروری تھا۔ لیکن خاتمۂ کلام سے پہلے محترمہ نے یہ بھی کہہ دیا:

"ہمیں اُمید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا"

جو نہایت نامناسب اور غیر ضروری تھا۔ کچھ مسافروں نے تو اس امید بے جا کے اظہار پر سختی سے اعتراض کیا۔ ایک سینیئر افسر سے یہ کہتے سُنا گیا:

"ایسا بانجھ سفر اور خوشگوار؟ کیا اس لئے کہ کریش (crash) ہونے سے بچ گئے ہیں؟"

ایک اور صاحب بولے: "یہ جراحت کے بعد نمک پاشی ہے"

پچھلی نشستوں سے ایک غضبناک احتجاج بلند ہوا۔ اور کسی دل جلے نے غصے میں آ کر ایئر ہوسٹس کو براہ راست ڈائن کہہ دیا۔ جو بہت غلط تو نہ تھا۔ لیکن بہت پارلیمانی بھی نہ تھا۔ اس پر ایک ستعلیق سے پولیس مزاج افسر برداشت نہ کر سکے تو پھر کر پچھلی سیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے پُر رعب انداز میں بولے:

"ایئر ہوسٹس کو ڈائن کس نے کہا ہے؟"

اُدھر سے اُتنا ہی بارعب جوابی سوال آیا:

"ڈانٹ کو اٹیرہ پوسٹش کس نے کہا ہے ؟"

اس کے بعد جہاز میں خاموشی چھا گئی ۔ اور مسافروں نے اپنے حفاظتی بیلٹ باندھ لئے۔ پولیس مزاج افسر نے بھی وقع کی نزاکت دیکھ کر منہ میں سنگترے ڈال لیے۔

کیا تھانے کی آب وہوا عشق کو راس ہے ؟

لاہور کے رن وے پر جہاز رکا تو ارشاد ہوا کہ کراچی جانے والے مسافر آب و ہوا بدلنا چاہیں تو پینتالیس منٹ کے لیے نیچے جا سکتے ہیں۔ ہمیں یوں بھی جہاز میں بیٹھنے کا شوق نہ تھا۔ اُدھر نیچے ہال میں جاوید اور امین انتظار کر رہے تھے۔ ان دونوں سے ملنا لازم تھا۔ جاوید سے اس لئے کہ اُن دنوں ایک طرف عشق اور دوسری طرف شادی کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ گویا اس مقام پہ کھڑے تھے جہاں پیچھے کعبہ تھا۔ اور آگے کلیسا۔ اور اس ایمان و کفر کے معاملہ میں ہم سے ایک مشورہ چاہتے تھے۔ اور ہر چند کہ اس معرکے کے لیے بیٹ ریفری غالب ہی تھے۔ تاہم اس خیال سے کہ چچا کی خدمات حاصل کرنا ممکن نہیں ہیں ایک دوست کے کام آنے میں مخل نہ تھا۔ اور امین سے ملنا اس لئے لازم تھا کہ اگر انہیں جاتے اور اُن کے گرد پانچ میل کے نصف قطر میں کسی مقام پر اتفاقاً موجود ہو اور ان سے ترکا دو چار لطیفے سُنے بغیر اس دائرے سے نکل گیا تو سمجھو کلام نقل گیا یہ نہیں کہ ان کے لطیفے بہت اسلامی ہوتے تھے۔ فقط یہ کہ مسلمانوں کو بہت موافق آتے تھے۔ البتہ سبزی خوروں پر یہ کلام نرم و نازک قطعاً بے اثر تھا۔ جو شخص بھی محمد امین کے لطیفوں پر پھڑک نہ اُٹھا۔ تحقیق پر گویا اور شخص کا شیدا تھا۔ یعنی ذوق سے محروم اور وجدان سے عاری کہ سبزی خوروں میں ذوق اور وجدان کی جگہ بیج لے لیتی ہے۔ چنانچہ ان سالم گوشت خور دوستوں کی کشش سے بلا تاخیر جہاز سے باہر نکلے۔ آگے جاوید اور امین کھلے بازو اور خالی آغوش لئے منتظر کھڑے تھے۔ پہلے جاوید بولے اور قصۂ درد سنانے لگے۔ یہ قصہ درد نہ تھا فریاد تھی، آہ تھی:

"کلیسا والی کی تیغِ ابرو کا کشتہ ہوں اور اُس کے حُسنِ جہاں سوز کا سوختہ ہوں۔ وہ راضی بھی ہے مگر صاحب کلیسا یعنی اس کا باپ راضی نہیں۔ بے چاری دن رات اسے منانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یعنے وہ راتیں چھوڑ کر جن میں مجھ سے چوری چھپے ملتی ہے۔ لیکن وہ ظالم ایک نہیں سنتا۔ کل بتا رہی تھی کہ جب بھی آتا ہے تیرا نام میرے نام کے ساتھ تو پھر جاتا ہے۔ اور کہتا ہے: تھانے میں رپٹ لکھوا دوں گا۔ یہ ہیں ارادے اُس ہونے والے خسر کے۔ ادھر گھر والے ایک اپنی پسند کی حور شمائل انتخاب کئے بیٹھے ہیں۔ انتخاب یہ بھی لاجواب ہے۔ اور اصرار بھی بے حساب ہے مگر ہاں کرنے میں کلیسا والی حائل ہے۔ کیا کروں ؟ کیا کروں ؟

ہم نے کہا "دیکھو صاحبزادے جس لڑکی کی شادی باپ کی رضامندی کی محتاج ہے وہ شادی کے بعد بھی بلا اجازت عشق نہ کر سکے گی۔ اور یہ آپ کی ازدواجی صحت کے لئے مفید نہ ہوگا۔ لہٰذا جی کڑا کر کے کلیسا والی سے ایک الوداعی ملاقات کرو اور اُس سے کہو کہ جان من قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اب ابا کو منانے کی کوشش بند کر دو۔ ورنہ ممکن ہے کہ تمہاری ممانعت جیل بھیجے یا ہم دونوں کو تھانے یا جیل تک پہنچا دیں اور ان دونوں مقامات کی آب و ہوا عشق کو راس نہیں۔ پھر دس منٹ

بعد جب کیسا والی سے چھٹی مل جاتے تو اولین فرصت میں کیسہ والی سے شادی کر لو کہ اس کے راستے میں کوئی ناراضمند باپ یا تھانہ نہیں آتا۔ قصہ کوتاہ جاوید مان گئے۔ اور آج حسب معمول ایک گڑیا سی بیٹی کے باپ ہیں۔

باقی تیس منٹ میں ہم نے امین صاحب سے لطیفے پر لطیفہ سنا۔ اور اس طرح آئندہ تین ماہ کے لئے زادِ سفر جمع کر لیا۔ تذکرۃً امین صاحب نے ہم سے پوچھا کہ پنڈی سے لاہور تک سفر کیسا رہا؟ ہم نے کہا ایر ہوسٹس کے سوا سب خیریت تھی۔ اس پر آپ نے ایر ہوسٹسوں کے متعلق ایک نہایت ہی متبرک اور اعلیٰ لطیفہ سنایا۔ اگر کبھی آپ سے ملاقات ہوئی تو یہ لطیفہ زبانی تو سنا سکیں گے لیکن افسوس ہماری تحریر اس کی طہارت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

ضرورت ہے ایک معتدل ایر ہوسٹس کی

لاہور سے روانہ ہوئے تو وہی جہاز تھا۔ اور وہی جہاز کا عملہ (مع ایر ہوسٹس)! ظاہر ہے کہ قیام لاہور کے وقفے میں پی آئی اے والے اتنی عبرت حاصل نہ کر سکے تھے کہ لاہور سے آگے کوئی متبادل اور معتدل سی ایر ہوسٹس شریک سفر کر دیتے۔ یہ نہیں کہ ان کے پاس اچھا مال نہ تھا۔ ہم نے لاہور ایر پورٹ کی غلام گردشوں میں کئی دلآویز اور شہنازیں چلتی پھرتی دیکھی تھیں۔ لیکن وہی بات کہ اصلی مال کی ذخیرہ اندوزی کا چسکہ بُرا ہے۔ اصلی کوالٹی کی جنس کو خواہ وہ چینی ہو، چائے ہو یا ایر ہوسٹس کوئی صاحبِ اختیار باہر کی ہوا نہیں لگنے دیتا۔ لیکن ہوائی سفر کوئی روز روز تو کرتا نہیں۔ چنانچہ آج کی پرواز میں اعلیٰ قسم کی ہوسٹس کی پس اندازی مسافروں کو بالکل موافق نہ آئی۔

کراچی اُترے تو خلافِ توقع ٹھنڈی ہوا کے نیکیلے اور نشیلے جھونکے خیر مقدم کو آئے۔ کہاں وہ لاہور کی پھریری تو اور کہاں یہ کراچی کی کافر ہوا کہ ہمارے گرد و پیش جملہ عقدہ ہائے حسن و جمال کھلنے لگے۔ وہ زلفوں کی پریشانیاں، وہ آنچلوں کی شادمانیاں اور وہ ساڑیوں کی حشر سامانیاں، ہمارے محرومِ دورہ بازافسروں کے وہ ارمان جو دم پرواز پورے نہ ہوئے تھے، دم رفتار نکلنے شروع ہوئے۔ اور آخر کار کسی قدر آسودگی کے عالم میں طبی سٹاف کاروں میں بیٹھ کر قصرِ ناز کو چل دیئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہماری ٹیکسی نے بھی شہر کا رُخ کیا۔

وہ جس کا ظاہر افسرانہ اور باطن چپراسیانہ ہے

کراچی پہنچ کر سروسز کلب میں ڈیرے ڈالے۔ سروسز کلب کی ساخت عجیب ہے۔ اس کا صحن گل و گلزار اس کا ڈرائنگ روم سدا بہار، مگر اس کے رہائشی کمرے خارزار اور اس کا کھانا زبوں و خوار۔ ایک زمانہ تھا۔ اور وہ انگریز کا زمانہ تھا۔ کہ ہم فوجی افسروں کو ہدایت تھی کہ شہری زندگی میں کوئی ایسی حرکت مت کیجو جو دوسرے درجے کے آدمی کرتے ہوں۔ قیام کرو تو فسٹ کلاس ہوٹل میں۔ سفر کرو تو فسٹ کلاس ڈبے میں، سینما دیکھو تو فسٹ کلاس نشستوں میں۔ ذرا کوئی افسر ردی ریستوراں، سستی سواری، یا گھٹیا گھاٹ پر دیکھا گیا اور کورٹ مارشل نے آ دستک دی۔ لیکن ایسا حادثہ ہوتا شاذ تھا کیونکہ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب قیمتوں کے قدم سطح زمین پر تھے۔ اور تنخواہوں میں افسرانہ وقار کو آفتاب آثار رکھنے کی طاقت تھی۔ اُن دنوں کچھ جان تھی تو فقط فوجی افسروں کی تنخواہوں ہی میں تھی۔ چنانچہ درجہ اول کے مقامات و مشاغل

رہی کا اجارہ تھا۔ یہ لوگ مری جا کر سیسل ہوٹل سے باہر قدم رکھنا ہتک قدم سمجھتے تھے اور لاہور میں فلیٹی سے باہر
دیکھنا تو اپنی نگاہ گردانتے تھے۔ لیکن پھر زمانہ بدلا۔ قیمتوں اور گرانیوں نے پر پرواز تولے اور افسروں کو سوتا چھوڑ کر
بلند کے رستے مریخ کو بڑھنے لگے، افسروں کی تنخواہوں اور الاؤنسوں نے لبِ بام تک تو ان کا پیچھا کیا۔ لیکن پھر منہ کے بل
پڑے اور بند ہو گئے افسرانہ جاہ و جلال کا رنگ روپ بگڑنے لگا۔ اور ان کے سفر و حضر کے لوازم سکڑنے لگے۔ یہی وجہ
ہے کہ اب کسی انٹرکانٹینینٹل یا پنج لگژری ہوٹل میں کوئی فوجی افسر نظر نہیں آتا۔ اب یا تو وہاں درآمد و برآمد کے دھندے والے
سیٹھوں کا قبضہ ہے یا صابن ساز اور پارچہ باف کروڑ پتیوں کا۔ چھٹے اول درجے کے ہوٹل اور ہنگامے یا تو اول درجے
کے بنیوں کے ہو کر رہ گئے ہیں یا پہلے درجے کے اسمگلروں کے۔ لیکن فوجی افسروں کو اپنے وقار کی حفاظت تو ہر طور پر
کرنا ہے۔ لہٰذا انہیں ایک ہی جائے پناہ نظر آتی ہے اور وہ ہے سروسز کلب جس کا ظاہر افسرانہ ہے اور باطن چپراسیانہ
لیکن یہی ایک مقام ہے جہاں غریبی میں خودی کی نگہبانی ممکن ہے۔

چنانچہ سروسز کلب میں ڈیرہ ڈال کر ہم نے خودی کی بیرونی حفاظت تو مستحکم کر لی لیکن جب اندرونی حفاظت
کے لئے کھانے کی میز پر جا بیٹھے تو معلوم ہوا کہ سوائے کافی کی پیالی کے باقی تمام بارود بیکار ہے۔ رہی سہی
کسر رات کو آہنی پلنگ سنگین بستر اور چوبی تکیے نے پوری کر دی۔ مگر علی الصبح جب بیرا چائے لایا تو ہمارے اندر
کی افسری نے پھر کروٹ لی۔ الغرض ساڑھے سات بجے کے قریب ہم پھر کرتلی لگا کر خلق کے مقابلے میں آ گئے ——
لیکن ڈائننگ روم میں ناشتہ کرنے بیٹھے تو آگے سوکھے توس کی معصوم سی پلیٹ رکھی تھی اور بس۔ ہیں پھر وہ لفٹینی کے دن
یاد آئے جب ہمارے میس کی میز شیر، شکر، شہد اور شمپین سے لدی ہوتی تھی۔ لیکن چھوڑیئے ان بھولی ہوئی کہانیوں
کو دلِ حزیں کو، بادۂ شبانہ کی سرمستیاں یاد کر کے اور ملال ہو گا۔

معاف کیجئے تاج محل آج دورے پر ہے!

ناشتے کی میز پر سے اٹھے تو دوستوں کو فون کرنے چل پڑے کہ ہم کراچی میں ہیں۔ فارغ ہیں اگر ہمارے
ساتھ کوئی ایسا سلوک کرنا چاہو جو شاہوں کی شان کے شایاں ہو تو ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔ آغا غلام حسین[1] بولے "کار
بھیج رہا ہوں جتنی سیر اکیلے کر سکتے ہو کر لو، باقی میں شام کو کرا دوں گا۔"

ابن انشاء بولے، "ہم بھی فارغ بیٹھے ہیں، آؤ جو سلوک جی چاہے کرا لو۔"

ہم نے کہا: "شکریہ جہاں گردِ اعظم، ذرا ہمارے لئے ایک مفصل ہدایت نامہ سیر و تماشہ تیار رکھیئے گا۔ ہم بھی
گھر سے سفرِ یورپ کے ارادے سے نکلے ہیں۔"

مشتاق احمد یوسفی کو حسبِ معمول بنک اور بارگاہ سے غیر حاضر پایا۔ کراچی جا کر یوسفی کی ملاقات سے محروم رہنا
ایسا ہی ہے جیسے آگرہ جا کر تاج محل نہ دیکھنا۔ یوسفی دیدار سے زیادہ گفتار کے تاج محل ہیں۔ ان کی زبان سے ——

---

[1] دوستوں کے آغا اور ماتحتوں کے آغا صاحب۔

ان کے تکلم کی طرح ـــــ ہر لفظ گلبدن بیگم بن کر نکلتا ہے۔ اور ہمیں ان ہی گلبدن بیگموں کی دید کا شوق تھا۔ مگر واے قسمت کہ فون کیا تو پتہ چلا کہ تاج محل تو دورے پر ہے۔ ناچار از راہ تلافی ہم نے "خاکم بدہن" کا ایک نسخہ اپنے ساتھ رکھ لیا۔ کہ یہ بھی تاج محل کا جیبی نمونہ ہے۔

حکیم محمد سعید کے درجن بھر ٹیلیفون نمبروں سے ایک پر تجربتاً قسمت آزمائی کی تو جواب میں کسی نے ایک درجن مزید ٹیلیفونوں کی فہرست لکھوا دی۔ گویا حکیم صاحب کو ڈھونڈنے سے ایک نیا امریکہ دریافت کرنا آسان تھا۔ ناچار ٹیلیفون رکھ دیا۔ ہمیں حکیم صاحب کی ملاقات کا شوق تھا۔ کہ وہ پاکستان بھر میں سب سے شیریں ادا حکیم ہیں۔ ان کی شیریں بیانی ان کا شربت روح افزا کی تخلیق ہے۔ جسے مشروب مشرق بھی کہتے ہیں۔ قاعدے کی رو سے اب تک ... ہم ایک بوتل روح افزا کی ساتھ رکھ لیتے۔ لیکن ہم نے ایک بہتر بدل یعنی حکیم صاحب کا فوٹو جیب میں ڈال لیا۔ کہ مشروب کی مشرقیت سے حکیم صاحب کی اپنی مشرقیت کہیں زیادہ مفرح ہے۔ آپ کے وجود پر کالے چشمے کے سوا کوئی مغربی آثار نہیں۔

نقشہ راہ سلوک کے مقامات کا!

رستے میں ... اور ہم سید سے بندر روڈ پر تخیبہ صافیکل بال پہنچے۔ جہاں ابن انشاء اپنی تصوف[1] سانی کے زور سے ہمارے لیے بیروت، جینوا، پیرس وغیرہ کے نقشے مع جملہ کاروان سراؤں، غلام گردشوں اور چور دروازوں کے تیار کئے بیٹھے تھے۔ آپ نے چند لفظوں میں ہم سے بیعت لی اور پھر نقشوں کی مدد سے بڑی تیز رفتاری سے راہ سلوک کی مختلف منازل طے کرانے لگے۔ آپ نے وہم و تشکیک کے پردے ایک ایک کرکے چاک کر ڈالے اور جملہ اسرار نہانی بے حجاب کرکے رکھ دیئے پھر آپ نے ان مقامات کی نشاندھی کی جہاں آپ نے گزشتہ سفر میں حسب ضرورت قدم، کلیجہ یا سر رکھا تھا۔ اور ہمیں ... بتائی کہ خدا توفیق دے تو انہی مقامات پہ اپنا قدم، اپنا کلیجہ، اور اپنا سر بھی رکھنا۔ اور پھر آپ نے ان مقامات پر سرخ پنسل سے لال دائرے کا نشان لگا دیا۔ کہ مرید نومشق صراط مستقیم سے بھٹک نہ جائے۔ پھر زیادہ اہم مقامات پر آپ نے نیلے دائرہ کا نشان ثبت کیا۔

آخر میں آپ نے ہاتھ اٹھائے اور ان راہوں پہ چلنے کے لئے ـــــ جو بہت زیادہ مستقیم نہیں ـــــ ہماری استقامت کی دعا مانگی معاً ہمارا دھیان، اپنی بشرٹ کے گریبان کی طرف گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سینہ کسی پر اسرار روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ اور ظاہر کی آنکھ بند کرتے ہیں تو باطن کی وا ہو جاتی ہے۔ دم رخصت آپ نے مزید پند ہائے سودمند، اور خصوصاً بیروت کے کیسنو کے متعلق مواعظ حسنہ ہم پر دم کئے اور ہم نے نہال ہوکر پیر کامل کو الوداع کہا۔

ایک پلیٹ تازہ ناول کی!

---

[1] یہ عقیدہ کہ ہر شخص بلا واسطہ خدا کی معرفت اور روحانی وجدان حاصل کر سکتا ہے۔

حسبِ وعدہ پچھلے پہر آغا آیا۔ اور ہمیں سیر کو لے چلا۔ پہلی منزل ڈیفنس سوسائٹی میں ایک جگمگاتا ڈرائنگ روم ایک جھلاتا کافی سیٹ اور ایک چہچہاتی میزبانہ تھی وہیں محترم میزبان بھی تھے۔ لیکن ان کی حیثیت ڈرائنگ روم کے متفرق فرنیچر کی سی تھی بلکہ ان کے مقابلے میں صوفہ کسی قدر زیادہ معزز نظر آتا تھا۔ بہرحال میاں بیوی دونوں سے تعارف ہوا۔ اور تعارف کے دوران یہ راز کھلا کہ محترمہ ایک معروف قسم کی میزبانہ ہی نہیں بلکہ ایک نامعلوم قسم کی مصنفہ بھی ہیں۔ چنانچہ کافی کی پیالی، پالک کے پکوڑوں اور مسالن کے سموسوں کے ساتھ ایک پلیٹ تازہ ناول کی بھی آگئی۔ اور ہمیں بتایا گیا کہ ناول پکوڑوں سے کسی طرح کم تازہ یا خستہ نہیں۔ اور یہ کہ مصنفہ کی تمنا ہے کہ ہم کافی کے ساتھ ناول بھی نوش کرتے جائیں اور جانے سے پہلے اپنی قیمتی رائے کا اظہار کر کے ممنون کریں۔

ہم نے ناول خوانی اور رائے زنی کے لئے آتی رات کی مہلت مانگی جو مل گئی لیکن محترمہ کو یہ یقین دلانے میں کافی وقت لگا کہ ناول کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے لازم نہیں کہ رات مصنفہ کے ڈرائنگ روم ہی میں گزاری جائے۔ دراصل مصنفہ کو ہماری گزارش سے تو ایسا اختلاف نہ تھا۔ خرابی یہ ہوگئی کہ آپ کے شوہر محترم بھی ہماری تائید کر بیٹھے اور ہر چند کہ ان کی تائید محض مسکین آنکھوں کی خفیف سی جنبش تھی۔ تاہم بیگم صاحبہ کے مشتعل ہو جانے کا اپنا پیمانہ تھا یعنی جہاں ہم آپ اشتعال میں آکر ایک دو انچ اچھلتے ہیں۔ وہاں بیگم صاحبہ ایک دو فٹ اچھل پڑیں اور دو فٹ ایک غضبناک بیگم کے لئے بھی خاصی بلندی ہے۔ بہرحال اس چھوٹے سے پیالی کے طوفان کے سوا یہ ساری سوشیل نشست بڑی پرسکون رہی۔ بلکہ شوہر محترم تو اس بھاڑ جھنک کے بعد بھی بڑے تمیز سے کافی پیتے اور وقتاً فوقتاً مسکراتے رہے۔ لیکن زبان کے رستے کوئی آواز نہ نکالی۔ میاں کی زبان بندی شرائط نکاح کی دفعات میں سے ایک تھی یا آپ مادر زاد بے زبان واقع ہوتے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اور ہم نے خدائی راز کو کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

کیا سالم لڑکی سے شادی کرنا عقلمندی ہے؟

کچھ ایسا ہی ماحول ایک دوسرے گھر کا تھا۔ جہاں ہم جھیل پارک کے رستے کسی قدر تازہ دم ہو کر پہنچے۔ گویا یہ ہماری سیر کی دوسری منزل تھی۔ ظاہر تھا کہ آغا کی ان لوگوں سے بے تکلفی ہے دروازہ پر پہنچتے ہی آپ نے ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں صدا دی۔

"شیمی"

اور جواب میں ایک جسیم مگر وجیہہ خاتون مع تبسم برآمد ہوئی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ آغا کے ساتھ کوئی اجنبی بھی ہے۔ اپنے تبسم کا ذخیرہ آغا ہی پر ختم کر کے ہمیں ایک غیر مرغوب اور خشک نگاہ سے دیکھا۔ آغا نے ہمارا تعارف کرایا تو ان کی خشکی میں نرمی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ حالانکہ آپ کی مٹی خاصی نم خیز دکھائی دیتی تھی۔ اجنبی یا تو پہلی نگاہ ہی پر دل میں کھب جاتا ہے یا دل سے ٹکرا کر گیند کی طرح پیچھے کی دیوار سے جا لگتا ہے۔ ہمیں بھی دل اور پھر دیوار سے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ آغا کہ پرانا دن شناس تھا اور بظاہر شیمی کے مزاج کا اسپیشلسٹ۔ بولا:

"شیمی یہ میرے دوست ہیں کوئی چیز منگوانا ہو تو بتاؤ۔ یہ ولایت جا رہے ہیں۔"

ہمارے کا یہ کہنا تھا کہ شیمی نے گویا بلا تاخیر گیند اُٹھائی اور دو چھکے کے پیچھے سینہ سے لگائی۔ ہمیں واضح طور پر کھینچنے کا احساس ہوا۔ محترمہ آصف کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے فی الفور ہمیں صوفے تک لے گئیں اور بٹھا کر پوچھا:

"تو آپ ولایت جا رہے ہیں؟ کب؟"

اگر آپ آج تک تعویذِ سلیمانی استعمال کرتے رہے ہیں تو ناحق وقت ضائع کرتے رہے ہیں؟ آئندہ اسمِ اعظم استعمال کریں۔ یعنے سیرِ ولایت کا جھوٹ یا سچ بولیں مراد پائیں گے۔

دستِ غیب پردے کے پیچھے سے بظاہر ایک مردانہ چہرہ نمودار ہوا۔ اگر یہ شیمی کے شوہر تھے تو ان سے زیادہ سہما ہوا شوہر دنیائے اسلام میں کہیں نہیں تھا۔ شیمی نے اُنہیں فقط ایک سرسری نگاہ سے دیکھا لیکن اس ایک نگاہ میں کہ بظاہر نگاہ سے کم تھی مفصل ہدایات پوشیدہ تھیں کیونکہ موصوف وہیں سے پلٹ گئے اور پانچ منٹ کے بعد مشروبات سے لدی ہوئی سینی اُٹھا لائے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ فی الواقع آپ ہی اس گھر میں خاوندیت کے تہمت بردار ہیں۔ غور سے دیکھا تو آپ ذرا جانے پہچانے نظر آئے۔ اور پھر دفعتاً ہم پر انکشاف ہوا کہ آپ تو کوئی دس سال پیشتر پنڈی میں ہمارے ہمسائے تھے۔ اور کنوارے تھے۔ جب اس الھڑ کنوارے کا تصور ایک لحظہ ایک پالتو خاوند کی صورت اختیار کر گیا تو ہم پر رقت طاری ہو گئی۔ اور ہم نے اپنے آنسوؤں کو گرتے گرتے سنبھالا۔ لیکن وہ اپنے آنسو نہ سنبھال سکے۔ گویا کہہ رہے ہوں ؎

کیسے چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں؟

ہمیں پہچان کر اُن کا ہم سے بھی بُرا حال ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے غریب ابھی ایک آہِ جہاں سوز کے ساتھ نالہ کھینچتا ہے۔ اور بھاگ میں کلامِ اقبال چھیڑتا ہے۔ ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

لیکن کہیں سے اشارہ پا کر آپ نے پھرتی سے آنسو پونچھے اور ایک ہچکی لے کر پوری آہ ضبط کر گئے۔ معاً ہمیں یاد آیا کہ یہ ایک بڑی چلبلی اور چنچل لڑکی پر مرا کرتے تھے جو اپنے دیگر قابلِ دید مقامات کے علاوہ چاہِ ذقن کی وجہ سے مشہور تھی۔ پھر ہم نے شیمی کی تھوڑی کا سرسری معائنہ کیا۔ اور اس چاہِ ذقن کے آثار دیکھے جو امتدادِ زمانہ اور چربی کے ہاتھوں اب کسی قدر اَٹ چکا تھا۔ لیکن ہموار نہیں ہوا تھا۔ یعنے قتلِ عاشقاں کی شہادت موجود تھی۔ بے شک یہ شیمی وہی لڑکی تھی اور پھر ہمیں چپا گلزار کی وہ پیغمبرانہ بات یاد آئی جو انہوں نے ان کی شادی پر کہی تھی۔ چچا نے کہا تھا:

"اس لڑکے کو جنرل نالج میں تیز نہیں، یہ مرتا اس کے چاہِ ذقن پر ہے۔ اور شادی سالم لڑکی[1] سے کر رہا ہے — پچھتائے گا۔"

اور آج دس برس کے بعد ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ پچھتانے سے گزر کر چند اگلی منزلیں بھی طے کر چکا تھا یعنے شکنجے کسوا چکا تھا۔ بھرتہ پھڑوا چکا تھا۔ اور اب سوموشن میں دم توڑ رہا تھا۔

مشروبات کے خاتمہ کے ساتھ ملاقات بھی ختم ہوئی۔ باہر نکلے تو ہم نے آصف سے پوچھا:

---

[1] شفیق الرحمٰن سے معذرت کے ساتھ۔

"آغا صاحب! کوئی تمہارا ایسا دوست بھی ہے جس کے ساتھ گھر میں کم از کم مساوات ہی برتی جاتی ہو؟"

کہنے لگے "کئی ہیں، لیکن میں انہیں سیر کرانے خفا الاں نہ کہ اخلاقِ حسنہ کا درس پڑھانے۔ مساوات والے گھروں میں باہمی ادب و آداب سے ماحول اس قدر پرجلال ہو جاتا ہے کہ گھر دکھنے لگتی ہے۔ کبھی تم نے مساوی طور پر موزب میاں بیوی کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا ہے؟ اگر تم نے نہیں دیکھا تو شیکسپیئر نے دیکھا ہے اور معلوم ہے وہ اس باہمی خوشامد کے متعلق کیا کہتا ہے؟"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے جیسے دو بوزنے بندر ایک دوسرے پر ازراہِ شفقت دانت نکال رہے ہوں۔"

"یہ تو بڑی ہولناک سی تشبیہ ہے!" ہم نے چونک کر کہا۔

بولا: "جبھی تو میں ایسے گھروں سے پرہیز کرتا ہوں۔ جب تک گھر میں ـــ یعنی کسی دوسرے کے گھر میں تھوڑی سی عدم مساوات نہ ہو زندگی میں شگفتگی نہیں آتی۔ یعنی اتنی برخورداری نہ فضا میں نہ زبان سے جہیز چل سکتی ہے تو پاسبانِ عقل کو دھکا دیا جا سکتا ہے۔ اور ہاں نوٹ کر لو، یہ گانا نہیں بول رہا، غالب اور اقبال بول رہے ہیں۔ ادھر ہوں۔"

آغا کی طبیعت میں سیڈازم[1] کا جاندار شائبہ تھا۔ بلکہ وہ زیادتی اپنے آپ سے بھی روا رکھتے تھے۔ گولڈن مین[2] کا ترجمہ سنہری کینچلی کر لیتے تھے کیونکہ آپ کوئی کام کرتے تو حد سے گزر کر ہی دم لیتے۔ کہتے تھے: زندگی قلندرانہ تجاوزات کے بغیر مرگِ بے سروسامان ہے اور اعتدال پسندی کا نامردی سے قریبی رشتہ ہے۔ ایک دن انہیں بلا نوشی پر ٹوکا تو کڑک کر بولے:

"آغا، تم شراب میں غافل ہوتے ہو؟"

کہا: "تم اب تک پہنچتے پہنچتے صحت کا ستیاناس کر دو گے۔"

آغا نے اپنے توانا کندھوں کو پھیلاتے ہوئے کہا:

"آؤ کشتی لڑ کر صحت کا فیصلہ کر لیں۔ ہو جائے مقابلہ سکاچ اور لیمن سکواش کا!"

"لیکن اسکاچ کا اثر تو لانگ رن[3] میں ہوگا!" ہم نے عقل کے زور سے ڈرایا۔

"برخوردار میں پچیس سال سے پی رہا ہوں، میں تو کب کا لانگ رن میں ہوں!" آغا نے تجربے کے زور سے جواب دیا۔

(کرنل محمد خان کی کتاب "بسلامت روی" کا ایک باب)

---

[1] سیڈازم (Sadism) ایذا رسانی میں لطف لینا۔

[2] گولڈن مین (Golden mean) اعتدال کا سنہری اصول یا نقطہ۔ مین (Mean) کے معنی اعتدال بھی ہوتا ہے اور کمینہ بھی۔

[3] لانگ رن (Long run) یعنی بہت عرصے کے بعد

★ احمد جمال پاشا

ہم نے آبِ حیات پلایا

جب ہم نے دیکھا کہ لوگ اب عطر کے بدلے تُرت ملنے لگے، کل تک جو عطر کی صنعت کے لئے ترقیاتی قرضے لیتے تھے۔ اب انہیں "آبِ حیات" کی صنعت کو فروغ دینے کی اسکیموں کے دھڑا دھڑ ٹھیکے، کوٹے اور پرمٹ ملنے لگے۔ تو ہم نے سوچا: ؂

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

ایسا سوچنے کی ایک معقول وجہ یہ تھی کہ کل تک جو مراعات پسماندہ طبقوں کو دی جاتی تھیں یا ہم پیلی گردن والوں کو ملنی چاہئیے تھیں، اب وہ "آبِ حیات حامی" طبقے والے چرکین کے بھائیوں کو ملنے لگیں۔ جو کل تک ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے تھے وہ اب ایک چٹکی میں ایسے اُلّو ہوئے کہ ہمارے سلام کا سیدھے منہ جواب تک نہ دیتے اس دورِ چرکینیت سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانے کے لئے ہم نے بہت سوچ سمجھ کر تمام اخباروں میں اپنا ایک بیان چھپوا دیا کہ:

"ہم آبِ حیات نوش فرمائیں گے"

اخبار پڑھنے والوں میں ہمارے گھر اور خاندان کے علاوہ دوست اور پڑوسی بھی شامل تھے جن کا مجمع سے ایک تانتا سا بندھ گیا ۔۔۔ لوگ خیال کی رفتار سے آرہے تھے ۔۔۔ کچھ انقلابی تھے، جنھوں نے ہمیں دلی مبارکباد دی کہ "ہم جیسے روشن خیالوں ہی کے قومی دھارے میں شریک ہونے سے قوم کا وقار بہت بلند ہو جائے گا ۔۔۔" وہ "دھارے" پر زور دے رہے تھے مگر ہمارا دماغ صرف ایک "دھار" کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ جس سے ہمارا "آدھار" یقینی تھا۔

گھر والوں نے سخت مخالفت کی ۔۔۔ "توبہ! توبہ! آخ تھو!" جیسے دلآزار فقرے کسے، ہمارے خیالات پر بیگم نے قدغن کر دی، چڑھتے سورج کی پرستش اور مستقبل کی تابناک کرنوں پر رجعت پرستی کی تاریکی بالکل اثر انداز نہ ہو سکی، ہم اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح جمے رہے۔

اخباری نمائندوں کے غول ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ ہم سے انٹرویو پر انٹرویو لے رہے تھے، تصویریں کھینچ رہے تھے۔ ہمارا پیغام ریڈیو والے ٹیپ اور ٹیلی وژن والے ٹیلی واز کر رہے تھے ہم سے ہر قسم کے سوال کئے جا رہے تھے۔ ہماری

سات پشتوں کے کارنامے ہماری پچھلی زندگی' ہمارا سابقہ کردار دلوں کے لئے ہمارے عزائم ۔ ہم سے جب ہماری مخالفت کے بارے میں پوچھا گیا تو ہم نے کہا: "مخالفت نہیں: جنگ کہیئے جنگ! Haves اور Have nots کے درمیان جاری ہے"

ہم سے پنچسالہ منصوبوں کے بارے میں پوچھا گیا ہم نے کہا: "ہمیں اگر واقعی ترقی کرنا ہے تو پنچسالہ منصوبوں کے بجائے آب حیاتی منصوبے بنائے جائیں"

کچھ مقامی سیاسی لیڈر ہماری مقبولیت سے خائف، اس طرح بھیگی بلی بنے ہمارے سامنے بیٹھے تھے جیسے وہ کسی وزیر کے سامنے بیٹھے ہوں۔ محلے کے ہوٹل والے نے ہمارے یہاں ہر آنے والے کی چائے، ناشتے اور کھانے سے بالکل مفت تواضع شروع کر دی۔ شہر بھر کے بدمعاشوں اور جرائم پیشہ نے ہمیں گھیر لیا۔ اور اس طرح ہماری خدمت شروع کر دی جیسے قاتل اور ڈاکو لیڈروں کی سیوا کرتے ہیں۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ معلوم ہوا، ایک بہت بڑے نیتا جنہوں نے ہمیں کبھی کھڑے کھڑے اپنے بنگلے سے نکلوا دیا تھا ایک لمبی موٹر پر کچھ سابق وزیروں کے ساتھ آ گئے۔ اور ہمارے پاؤں چھونے بلکہ پکڑنے کے بعد ہم سے درخواست کی: "نیتاجی مہاراج! ہم آپ سے تنہائی میں کچھ انتہائی اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں" ہم فوراً انھیں "استنجہ خانے" جیسی پرائیوٹ جگہ لے گئے۔ جہاں انہوں نے ہم سے درخواست کی۔ جب آپ اتنی مہان دیش سیوا کرنے جا رہے ہیں تو پھر کیوں نہ آپ کے آبحیات نوش فرمانے کا باقاعدہ اُدگھاٹن کرایا جائے، جس میں کم از کم پچاس ہزار پرجوش کرانتی کے عوام کا مجمع ہو!"

اس پہلو پر تو ہم نے ابھی تک غور نہ کیا تھا۔ اب تک آب حیات کے پرچ ترکیب استعمال کے طور پر ہمارے ذہن میں عطر کی شیشی سے لیکر پیمانہ و صراحی تک گھوم رہے تھے۔ سچ پوچھیے تو ہم ابھی تک آب حیات کی خوراک کا فیصلہ ہی نہ کر پائے تھے۔ ہماری خدمت میں یہ درخواست بھی پیش کی گئی کہ، بسلسلۂ آب حیات ایک مجلس عمل بھی بنا دی جائے۔ مگر کچھ کلبی باز حضرات نے اعتراض کیا کہ "ایکشن کمیٹی" سے پہلے "مجلس استقبالیہ" بنائی جائے۔ کچھ چندہ خوروں نے "مالیاتی کمیٹی کی تشکیل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا۔ اور اس سے زیادہ اپنی شمولیت پر۔ غرض بہت غور و خوض کے بعد ساری کمیٹیاں اس احتیاط سے بنائی گئیں کہ الکشن کے نتیجے میں جتنے وزیر اور ممبران قانون ساز بے کار ہو گئے تھے۔ وہ سب ان میں کھپ گئے۔

یہ طے پایا کہ ہمارے گھر سے گیٹو گھاٹ تک سارے راستوں کو دلہن کی طرح سجا دیا جائے اور ایک عظیم الشان جلوس ہمیں اس راستے سے ہماری کھاٹ سمیت گھاٹ تک لے جائے۔ ہم گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہوئے وہاں چوک تک پہنچیں۔ جہاں ہماری گل پوشی اور عطر پاشی ہو۔ اس کے بعد ایک سونے کی کشتی پر ایک پلاٹینم کی کٹوری میں آب حیات کوئی بہت ممتاز قومی شخصیت ہمیں پیش کرے۔ اس موقع پر نام نہاد سیکولر روایات کے مطابق ناریل پھوڑا جائے۔ ہماری آرتی اتاری جائے اور ہمارے ماتھے پر تلک لگایا جائے۔ آب حیات نوش فرمانے کے بعد ہم قوم کو ایک بصیرت افروز پیغام دیں جس کے لئے آب حیات ہو۔ اس نکتہ پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ "جلوس آخر گیٹو گھاٹ سے کیوں لے جایا جائے۔ وکرم ان کو گیٹو ناتا کا پتہ گنگا مورتی پسینا نہیں ہے بلکہ خود اپنی جسمانی ڈسٹلری کی کشید بھی اور چھلانی ہے۔ آخر ہم سب بندر کی اولاد ہیں۔ اس لئے۔ اس شبہ اور ہر پہ اپنے غریب آباد [illegible]

کرنا انتہائی احسان فراموشی ہوگی۔ اس لئے ہم کو بجائے گنگا گھاٹ کے بند یا گھاٹ سے جایا جائے۔ یہ تجویز ووٹروں کے نظریہ اتفاق کی طرح اس قدر معقول تھی کہ کثرت رائے سے پی۔ یو۔ ڈی نے فوراً منظور کر لی۔ پھولوں کی بارش کے ساتھ عطر کے چھڑکاؤ پر سخت اعتراض کیا گیا۔ کثرت رائے سے طے پایا کہ "چھڑکاؤ تو ہو مگر" آبِ حیات کا "کٹوری اور کٹورے پر بھی بحث ہوئی مناسب یہی سمجھا گیا کہ "کٹوری ہی رکھی جائے"۔

سوال کھڑا ہو گیا۔ "وہ بڑی شخصیت کون ہو؟ جو ہمارے آبِ حیات پینے کا اُدگھاٹن کرے۔۔۔؟" بڑے بڑے سائنسدانوں، عالموں، مفکروں، دانشوروں، پروفیسروں اور قوم کے بے لوث خادموں، ممتاز صحافیوں کے نام آئے، مگر پتنگ کی طرح کٹ گئے۔ پشو پالن و بھاگ کے منتری کا شبھ نام بھی زیر بحث آیا۔ مگر ایک منزل پر وہ بھی کٹ گیا۔ دو تین وزیروں نے وزیرِ اعلیٰ کا نام بھی پیش کیا۔ سوال اُٹھا: کونسے وزیرِ اعلیٰ؟ اس پر بھی اتفاق نہ ہو سکا۔ بہت بحث و تمحیص کے بعد قدرتی ذرائع کے وزیر کا نام منظور ہوا کہ آبِ حیات کا تعلق قدرتی ذرائع سے ہے۔ زور دیا گیا کہ وزیر ہو تو کم از کم وزیر تجارت سے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس بات کو سب نے پسند کیا۔ دو ایک دوسرے ملکوں کے سربراہوں کے نام بحیثیت مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آئے مگر قوم پرستی کے جذبے سے سرشار نیتاؤں نے اس خالص سودیشی پوجا میں کسی غیر ملکی کو شریک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سب کی للچائی ہوئی نظریں ہر پھر کر وزیرِ اعظم کی جانب جاتیں کہ وہ اس نسخۂ کیمیا کے خالق جو ٹھہرے۔

اُدگھاٹن کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ مالیاتی کمیٹی میں شامل سرمایہ داروں نے شہر کو سجانے رزاد آراستہ کرانے کے عوام کا عظیم الشان جلوس نکالنے کی تیاریوں میں روپیہ پانی کی طرح بہانا شروع کر دیا۔ کیونکہ سرمایہ داروں کو یقین تھا کہ نئی حکومت میں پانچوں گھی میں ہوں گی۔ اور انھیں گراں فروشی، چور بازاری اور اسمگلنگ کی زیادہ بہتر سہولتیں دستیاب ہوں گی۔ آبِ حیات کے چھڑکاؤ پر مجھے بھڑکتا دیکھ کر ملک کے ایک چوٹی کے دیش بھگت سرمایہ دار نے مجھے اطمینان دلایا کہ:

"سرکار! آپ بالکل مت گھبرائیے۔ ہم دو نمبر کا آبِ حیات استعمال کریں گے۔ یعنی سادے پانی میں چونا اور زرد رنگ ملا ہوگا!" یہ سنکر ہم ششدر ہو گئے۔ ہم نے سوچا "اگر ملاوٹ کا اس دور میں یہ ممکن ہے تو ہماری کٹوری بھی اس سے لبریز ہو سکتی ہے بلکہ چھلک سکتی ہے!"

اُدگھاٹن کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اچانک مسئلہ پیدا ہو گیا کہ "آبِ حیات آخر کس کا ہو؟" کیونکہ اخبار سوز رسند لیش نے اپنے ایک غیر معمولی اداریے میں یہ سوال اُٹھا دیا تھا کہ "آخر کس کا موتر ہو؟" مرد کا؟ کسی عورت کا؟ کسی پچھڑی جاتی کا؟ یا خود ہمارا ہو؟ کیونکہ پردھان منتری تو اپنے موتر پر زور دیتے اور اپنے جسم و رنگ کو چمکاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے چہرے کی رونق تازگی کے ساتھ عمر بھی بڑھتی ہے۔ اور سابق منتری جی کے اس سے اُن کا سوا استعمال رہتا ہے اور منہ کا ذائقہ بھی۔ اگر ہم نے اس سلسلہ میں اُن سے روشنی حاصل کی ہے تو اُن کی تقلید ہمارے لئے دیش کی مہان سیوا ہوگی۔ لیکن اگر کسی دوسرے کا ہو تو تجربہ کرنے میں کوئی برائی نہیں کیونکہ ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں۔ آخر پرانے زمانے میں لوگوں کے پیشاب سے چراغ جلتے ہی تھے۔ لیکن پھر یہی سوال ہے کہ وہ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ اخبار نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ "جس کا بھی ہو اُس کا اطمینان سائنسدانوں سے جانچ کرا کے کر لیا جائے اور پینے کے بجائے پلانے کا اُدگھاٹن ہو!"

"آبِ حیات جانچنے" کے مطالبے سے ایک خوف پیدا ہوا کہ چھڑکاؤ والے کو کہیں اگر جانچ لیا گیا تو کیا ہوگا؟ لیکن اس کے ساتھ پینے کے بجائے پلانے کے مطالبے سے بڑی تقویت پہنچی۔

خطرات، اندیشوں اور بحثوں میں سارا وقت گزر گیا۔ آخر وہ شبھ دن آگیا جب ہمیں آبِ حیات پی یا پلاکر جاودانی ہو جانا تھا۔ اُس دن "روزنامہ موتر ایکسپریس" اور "موتر اسٹنڈرڈ" وغیرہ نے اپنے "اسپیشل موتر نمبر" نکالے۔ اُن کو دیکھنے کے بعد ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ کیونکہ ایک ہزار سے زائد بے روزگار سابق وزیروں اور ممبران قانون ساز نے اعلان کیا تھا کہ "ہم بھی آبِ حیات پئیں گے!"

اس اعلان میں وہ سب لوگ شامل تھے جو اُدگھاٹن تیاری کمیٹی کے ممبر تھے۔ اچانک ایک سرخی دیکھ کر ہماری جان میں جان آگئی۔ ان لیڈروں نے ایک مشترکہ اعلانیہ میں مطالبہ کیا تھا کہ "ہم سب کو آبِ حیات پلاکر اُدگھاٹن کریں گے"۔ اُدگھاٹن پروگرام میں بھی صرف پلانا شامل تھا۔ پینے کا ذکر سرے سے نہ تھا۔ مشترکہ اعلانیہ پر کچھ ایسے رشتہ داروں، اور پڑوسیوں کے نام بھی شامل تھے۔ جو کل تک ہم سے جلتے تھے۔ ہمارے مخالف تھے لیکن اب خوشامد کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ کہ سیاسی فائدہ ذات پات، رشتہ داری اور دوستی ہی کے ذریعہ اُٹھا لے۔ ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا کہ ہمارے گھر کے سامنے ایک بھیڑ لگنا شروع ہو گئی۔ بھیڑ برابر بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ پہلے گھر بھرا، پھر لان بھرا، پھر راستہ بھرا۔ پھر سڑکیں بھریں۔ پولیس نے عوام کے بڑھتے ہوئے ہجوم کو بار بار لاٹھی چارج کر کے روکنے کی ناکام کوشش کی مگر بے اختیار "آبِ حیات زندہ باد" "ہمارا عظیم رہنما پائندہ باد!" کے فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا۔ قابو کے باہر ہجوم آبِ حیات کی پچکاریاں مارتا، پھول برساتا برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ہمارے درشن کے لئے بے تاب تھا۔ فائر بریگیڈ والے صورتحال کو قابو میں لانے کے لئے برابر زمین کو کیوڑے سے دھار رہا تھا۔ آبِ حیات کی خوشبو اب ناکوں پر دماغوں کے وجود فضا کو معطر بناتے چلی جا رہی تھی۔ فضائی آلودگی محکمے نے مجبوراً مدد کے لئے فوج کو طلب کر لیا۔ ایک فوجی ہیلی کاپٹر نے ہمیں مکان کی چھت سے بدقت تمام نکالا۔ بار بار اعلان کے بعد ہمارے ہیلی کاپٹر نے جھنڈیا گھاٹ کے لئے پرواز شروع کی۔ مجمع سیلاب کی طرح سڑک کی طرف بڑھا۔ لیڈروں نے بڑی کوشش کی کہ کراتے کے پرجوش عوام کا جلوس باقاعدہ ترتیب دیا جا سکے۔ جس میں ہاتھی، گھوڑے، گدھے، اونٹ اور بینڈ باجے تھے۔ سب سے آگے ہم ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ سب سے پیچھے عوام تھے۔ دونوں کے درمیان جانور تھے۔ پرجوش نعروں سے زمین و آسمان گونج رہے تھے۔

[illegible] بجے ہم [illegible] میں ہمیں اکیس توپوں کی سلامی پیش کی گئی۔ مشترکہ افواج نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اُس کے بعد شاہانہ تزک و احتشام سے اُس بلند ڈائس پر لے جایا گیا جو جھنڈیا گھاٹ سے زیادہ آسمان سے نزدیک تھا۔ [illegible] چھوڑا گیا۔ آرتی اتاری گئی۔ تلک لگایا گیا۔ فلک شگاف نعروں کی گونج میں سونے کی کشتی ہمارے سامنے لائی گئی۔ ابھی ہم اپنا ہاتھ آبِ حیات کی کٹوری کی جانب بڑھانے ہی والے تھے کہ ڈائس پر بیٹھے سیکڑوں اشخاص ہماری جانب لپکے اور لاؤڈ اسپیکروں سے اعلان ہونے لگا:

"ہم سب کو آبِ حیات پلائیں گے!"

اس کے ساتھ ایک صراحی اور متعدد جام ہمیں پیش کئے گئے۔ ابھی ہم اپنی ساقی گری کا آغاز بھی نہ کر پائے تھے

تھے کر پانچ یہ سا فرپر پورا ڈانس ٹوٹ پڑا۔ فیرفانی منظرہ یکھنے کے لئے ہجوم نے ڈانس پر یلغار کر دی۔ جس کے بوجھ کی تاب نہ لا کر بلند ڈانس ٹوٹ کر ایک خوفناک چرچراہٹ کے ساتھ سیکڑوں فٹ نیچے زمین پر گرا۔ میں زوروں سے بوجھ سے دب کر جو بے طرح چلایا تو گھر والے دوڑ پڑے۔ میں بستر کے نیچے زمین پر پڑا ....

بچاؤ، بچاؤ! چلا رہا تھا!

(غالب کی روح سے معذرت کیساتھ)

پیروڈی

امام رائچوری

کیا ہوا! میں پڑھا لکھا نہ ہوا   اُن کی طرح تو بے ہودہ نہ ہوا
لاکھ کوشش کیجئے بنانے کی   ماڈرن اب تلک گدھا نہ ہوا
سود میں گھر بکا دُکان بکی   پھر بھی قرضہ مرا ادا نہ ہوا
کس قدر ڈھیٹ ہے یہ شرمندہ   جوتیاں کھا کے بھی ذرا نہ ہوا
لینے دینے کے بارد جھگڑے میں   میری شادی کا فیصلہ نہ ہوا

چار سو منتقل کیا کے امام
اک عدد گھر میں بوریا نہ ہوا

ہزل

ساحر اندوری

اس دل نے گنگنایا شب بھر یہی ترانہ
اے یار اب تو آجا سردی کا ہے زمانہ
پہلے تو تیل ان میں جلتا تھا یا الٰہی
جلتے ہیں خود دیئے اب اُف گردشِ زمانہ
پہلے جہاں پہ ہم تھے اب غیر ہے وہاں پر
پھولوں کی شاخ پر ہے اُلّو کا آشیانہ
پہلے تھا شاخِ گل پر، بندر نے نوچ ڈالا
اب آسمان پر ہے ساحر کا آشیانہ

غزل

اعجاز غالبی

گا رہیں اتوں قوالی بہت بھیڑ جما کو
ہے کس کی غزل ہم بھی سنیں گھس کو گھسا کو
ہم حیدرآبادی ہیں بڑے زندہ دلاں جی
دیکھیں تو ہمیں ہیم ستاں آنکھ لڑا کو
یہ لالہ رُخاں، سنگدلاں دشمنِ جاں ہیں
دل دیا مرے دوست ذرا دیکھ دکھا کو
گر محفلِ جاناں میں گئی دال نہ دیئی
لوٹ آئیں گے اعجاز کوئی بات بنا کو

قطعہ

...ب صاحب جن کے گھر بچوں کی تھی اک پوری ٹیم
...جو نکلے شام کو بازار سے مسٹر فہیم
...استے میں ایک بچی رو رہی تھی زار زار
...ہ یہ سمجھے ہے بچاری کوئی لاوارث یتیم
...رد میں اس کو اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑے
...ن میں بیٹھی ہوئی تھیں ان کی بیگم 'بی نسیم'
...دیں بیگم کی، بچی کو انھوں نے ڈال کر
...کہا' لو گھر میں لے آیا ہوں اک [illegible] یتیم
...یکھ کر بچی کو بیگم نے مسرت سے کہا
...ج' یہ تو اپنی بیٹی ہے خدا رکھے شمیم
...ثرتِ اولاد نے کیا تم کو اندھا کر دیا
...بنی نازو کو یتیم اور مجھ کو بیوہ کر دیا

جوہر سیوانی

نظمِ جدید

لہرا کے اپنے دوش پہ زلفِ سیاہ فام
اک شاعرِ جدید سنانے لگے کلام
"دو پینٹ، دو قمیض"
مجمع نے واہ واہ کا نعرہ کیا بلند
"دو ساڑی، ایک جانگیا، تکیے کے دو غلاف"
مجمع سے پھر یہ شور اٹھا "خوب، واہ واہ"
شاعر [illegible] ہو کر یہ بول اٹھا
اے حاضرینِ بزم
واللہ، ہو گئی غلطی مجھ سے چلتے وقت
دھوبی کی کاپی جیب میں رکھ لی بجائے نظم
مجمع سے ایک شخص نے نقرہ کیا یہ چست
جو کچھ کہا ہے آپ نے، بالکل بجا درست
ہو آپ کا کلام کہ دھوبی کا ہو حساب
دونوں میں کوئی فرق نہیں مطلقاً جناب

مصیبت در مصیبت

[حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم "مصیبت" کی پیروڈی
جوش صاحب سے معذرت کے ساتھ]

حیدر بیابانی

میں کھانسا تو پڑوسن کا ہماری چڑھ گیا پارہ
معاً اس نے مرے سر پہ اٹھا کے اینٹ دے مارا

مجھے چکر سا اک آیا طبیعت میری گھبرائی
بہا جو خونِ ناحق تو رپٹ میں نے بھی لکھوائی

کہا میں نے کہ اے صاحب مجھے ہے بلغمی کھانسی
اگر یہ جرم ہے تو پھر مجھے دلوایئے پھانسی

یہ سننا تھا کہ تھانیدار صاحب نے مجھے ڈانٹا
یہاں کھانسا اگر کم بخت تو پڑ جائے گا چانٹا

المیہ اور مداوا

آج آندھرا پردیش کے طوفان زدہ ساحلی اضلاع کے بیشتر علاقوں میں صبح کے اُبھرتے سورج کی کرنوں سے اٹکھیلیاں کرتی، ہری بھری اور سرسبز و شاداب فصلیں لہلہا رہی ہیں متاثرہ ساحلی اضلاع گنٹور اور کرشنا کے علاقوں میں رہائشی مکانات کی تعمیر خشت بہ خشت، منزل بہ منزل تیزی کے ساتھ جاری ہے۔

ہلاکت خیز طوفان باد و باراں کی تباہ کاریوں کے بعد شروع کئے جانے والے ہمہ رخی بازآبادکاری پروگرام کی بدولت قدرت کے غضب کے شکار مایوس عوام میں امید کی کرن نمودار ہوئی۔

"بے گھروں کے لئے گھر" اب محض دلوں کو گرمانے والا نعرہ نہیں ہے۔ طوفان سے متاثرہ علاقوں میں یہ ایک زندہ حقیقت بن گئی ہے۔ چیف منسٹر ریلیف فنڈ اور رضاکارانہ تنظیموں کی امداد سے تعمیر شدنی مکانوں کی مقصود تعداد ۲۰۰۰۰ میں سے اب تک ۱۳ ہزار مکانات کی تعمیر کا کام شروع کیا جا چکا ہے۔ ساحلی اضلاع میں جابجا طوفان سے بچاؤ کے لئے سلسلہ وار سائبانوں کی تعمیر کو فوقیت دی جا رہی ہے۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

36/78-79

★ عبدالقوی دسنوی

یارب نہ وہ سمجھے ہیں ؟

مجھ سے میرے طلبہ کی فرمائش ہے کہ میں کچھ کہوں اور وہ سنیں، میں سوچتا ہوں کہ میں کیا کہوں جو وہ سنیں۔ اب تک کیا نہیں کہہ سکا ہوں جو وہ نہ سن سکے ہیں۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ نہ میری سنانے کی عادت ہے اور نہ ان کو سننے کی۔ سنتا وہ ہے جو جانتا نہیں ہے۔ اور جانتا وہ نہیں ہے جو سنتا ہے تو سن کر نہ جاننے والوں کی صف میں کھڑا ہونا نہ دانشمندی ہے نہ ہوشمندی۔ اس لئے مجھے اکثر کلاس میں پڑھاتے پڑھاتے ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ جیسے طلبہ — ہمہ تن "دیدم، دم درکشیدم" کی تصویر بنے بیٹھے ہیں، پورا کمرہ خاموش ہے۔ جیسے میز، کرسیاں خاموش رہتی ہیں، عرش و فرش خاموش رہتے ہیں، در و دیوار خاموش رہتے ہیں۔ لیکن "دیوار گوش دارد" بھی سنا ہے۔ پتہ نہیں دیوار سنتے ہیں یا نہیں طلبہ تو کسی کی بھی سنتے نہیں ہیں۔ البتہ ایک بار کسی استاد نے پڑھاتے پڑھاتے سوال کر دیا تھا "کلیات اقبال" کس کی لکھی ہوئی ہے؟" تو ایک طالب علم نے سن لیا۔ اور اسے استاد کی بات سمجھ میں آئی۔ ہو یا نہیں آئی ہو، اشارہ سمجھ میں آگیا فوراً بول اٹھا، "جناب آپ کا خیال قطعی غلط ہے۔ میں نے ہرگز یہ کتاب نہیں لکھی ہے۔ اور نہایت لال پیلا چہرہ کرکے بیٹھ گیا، اس طالب علم کے بعض ساتھیوں کا کہنا تھا کہ اس جواب سے حضرت استاد ایسے لاجواب ہوئے کہ پھر کسی جواب کے طالب نہیں رہے۔

اس طرح کے واقعات اگر میں سناؤں جس سے آپ کوئی نہ کوئی سبق حاصل کریں تو آپ ہی سے کوئی نہ کوئی بول اٹھے گا آج کے اس موقع پر بھی استاد محترم نے استادی شروع کر دی اور وہی پرانی اور فرسودہ باتیں جن کا آج سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے بیان کرنے لگے۔ ایک مرتبہ ایک منچلے نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ سر! آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں سب درست لیکن کامیابی تو اسی کو حاصل ہوتی ہے جو آج کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ پرانے تجربے — نئی زندگی کو سنوارنے کی کوشش، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ میں ٹھٹھک گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ میں نے تو کوئی ایسی بات ان سے کبھی نہیں جس میں پرانا پن ہو البتہ ایک واقعہ سنایا تھا۔

ہے یہ واقعہ معلوم نہیں کیوں پسند ہے جب بھی میں سنتا ہوں، غصہ نہیں کرتا، ہنس دیتا ہوں۔ آپ بھی سنئے:

قصہ یہ ہے کہ ایک امتحان میں ایک اردو کے طالب علم نے اپنے جان نثار دوست سے یہ طے کر رکھا تھا کہ امتحان کے پرچے تقسیم ہونے کے بعد وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکے گا۔ اس وقت وہ اشارے سے بتا دے گا کہ اسے کس پر مضمون چاہیئے، وہ اسے پہچانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق جیسے ہی اس نے کھڑکی سے سر نکالا کہ امتحان کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کے پریشان حال دوست نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسید کی داڑھی کا اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ سرسید سے متعلق کوئی مضمون چاہیئے۔ اشارہ پاتے ہی وہ لڑکا یہ جا، وہ جا اور اب وہ مظلوم طالب علم امتحان کا مارا ہوا اپنے مشفق کرم فرما کا منتظر:

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

کی مجسم تصویر بنا ہوا۔ انجم شماری کے بجائے کاپی کی ورق گردانی میں مصروف لیکن اُس کے شیدائی اور فدائی دوست آنے کا نام نہیں لیتے اور یہ بے چارہ:

تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کا ورد کرنے لگا کہ آخر امید کی جھلک نظر آئی اور غرفہ سے وہ جھانکے معاف فرمایئے گا جلوہ افروز ہوئے گرامی انداز کہ

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

یہ صاحب بھی ٹکٹکی باندھے ہوئے ادھر ہی دیکھ رہے تھے کہ ذرا آنکھیں چار ہوں تو اشاروں اشاروں ہی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے سرسید مرحوم کے لئے کچھ تقاضا کر دیں کہ:

اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

چنانچہ آنکھیں لڑیں تو بے اختیار سرسید کے لئے اشارہ کر دیا اور وہ حضرت پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور پھر انتظار کی سخت گھڑیاں کاٹنی دشوار ہو گئیں اور غالب کے اس شعر کے معنی پہلے تو سمجھ میں نہیں آئے تھے لیکن اب آنے لگے:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

لیکن وہ نہ آئے۔ اور صبح ہو گئی یعنی گھنٹہ بج گیا۔ مجبوراً نامۂ اعمال اس قدر بے داغ چھوڑا کہ ممتحن کو بھی قلم چلانے کی ہمت نہیں پڑی ہو گی۔

وہ حضرت جب امتحان کے کمرے سے باہر آئے تو رفیقِ مشفق وہیں پریشان حال، وبالِ غم اُٹھاتے منتظر ملے۔ بہت گھبراتے ہوئے پوچھا کیا حال ہے، امتحان کیسا ہوا؟

غصہ میں جواب ملا، "امتحان کیا خاک دیتا، تم نے تو سرسید پر مضمون ہی نہیں بھیجا۔"

اور وہ ندامت سے سر جھکائے کہہ رہے تھے:

"تم نے سرسید کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے تو سمجھا سنگھ صاحب امتحان کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تشریف فرما ہیں۔"

اور اس سمجھنے سمجھانے میں ایک کی زندگی تباہ ہوگئی۔

یہ واقعہ میں اکثر اپنے طلبا کو سناتا ہوں کہ عبرت حاصل کریں لیکن یہ نسخہ اکثر بے اثر رہتا ہے وجہ ظاہر ہے۔ اس
کے دور میں جب کہ مہذب لوگ تمام کامیابیاں، کامرانیاں بغیر محنت کے حاصل کر لیتے ہیں کون بے وقوفوں کی طرح محنت
کرے۔ "بے وقوف!" میں نے دانستہ کہا ہے۔ آج نئے لغت میں بے وقوف وہ ہے جو سچ بولتا ہے
اری کرتا ہے۔ محنت اور مشقت پہ ایمان رکھتا ہے۔ پہلے لوگ سچ بول کر عزت حاصل کرتے تھے۔ آج جھوٹ بول
س سے بہت زیادہ باعزت بن جاتے ہیں۔ پہلے ایمانداری کی قدر تھی اب ایمان فروشی کا بازار گرم ہے۔ پہلے عیاری
کاری کو بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اب عیار اور مکار ڈپلومیٹ کا بہت بن کر جہاں تہاں فاتحانہ انداز
نے نظر آتا ہے اور بے چارے کچھ لوگ تھوکنے کے بجائے تھوک گھونٹتے نظر آتے ہیں۔ پہلے محنت کر کے اپنی ذہانت
ذکاوت کی مدد سے فرسٹ کلاس حاصل کرتے تھے آج نہ محنت کی ضرورت ہے نہ ذکاوت، ذہانت کی ——
کلاس کی ڈگری آپ کو ایسے ملے گی جیسے کوئی چیز نہیں ملی۔ میں اپنے طالب علموں کو اکثر کہتا ہوں کہ بہت سی
یں وہ نہیں جو وہ دیکھتے ہیں۔ اور بہت سے نتائج وہ نہیں جو وہ نکالتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی جنگل میں نیولے اور سانپ کی جنگ چھڑ گئی، دوران جنگ نیولے نے سانپ کی دم اپنے منہ میں لے لی۔
انپ نے نیولے کی دم دونوں نے ایک دوسرے کو نگلنا شروع کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ سانپ نیولے کو نگل گیا اور
سانپ کو اور دونوں غائب ہو گئے۔ ایک طالب علم نے اس واقعہ کو سن کر کہا: لیکن!" دوسرے نے اور زیادہ زور
یا: "لیکن!" میں نے کہا: "لیکن ویکن کچھ نہیں" بظاہر تو یہ سچ معلوم ہوتا ہے مگر یہ سچ نہیں ہے۔ اسی طرح جیسے ہمارے
ن بہت سے لوگ بہت سی باتیں نہایت ہوشیاری سے دوسروں کو اس طرح بتلاتے ہیں جیسے وہ سچ ہوں۔ لیکن وہ
یں ہوتے۔ صرف ان کا کرتب ہوتا ہے۔ نہ نیولا سانپ کو نگلتا ہے نہ سانپ نیولا کو — ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

★★

بہتر رسل و رسائل کی سہولتیں

ہماری دیہی معیشت کو بڑھاوا دینے کی غرض سے ریاست آندھرا پردیش کے تمام اندرونی علاقوں میں واقع دیہاتوں کو بہتر رسل و رسائل کی سہولتیں فراہم کرنے پر زور دیا گیا۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن (اے۔پی۔ایس۔آر۔ٹی۔سی) نے سال رواں کے دوران میں مزید ۱۱۳۷ دیہات کو بس کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔

۲/ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو دیہاتوں کو جوڑنے والی ٹرانسپورٹ اسکیم کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کے تحت ۳۲۱۱ مزید مواضعات کو جملہ ۷۷ بس روٹس سے جوڑ دیا گیا۔

مستقبل قریب میں زیادہ سے زیادہ دیہاتوں کو اس اسکیم کے تحت لایا جائے گا۔ آج ہمارے دیہاتوں کو رسل و رسائل کی بہتر سہولتیں دستیاب ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

37/78-79

غزلیں

صمد الزماں زماں (کٹیہار، بہار)

جوتیاں کھائی کہیں اور کھا گیا پتھر کہیں — سرخرو دیوانے کا تب ہو سکا ہے سر کہیں
پیٹ کر سمدھی کلیجہ رہ گئے کہ ہائے ہائے — اب کوئی دیتا نہیں سائیکل کہیں موٹر کہیں
ہائے رے فیشن پرستی بن گئے مادہ سبھی — دیکھنے کو اب نہیں ملتا جہاں میں نر کہیں
رات دیوالی تو دن ہوتے ہیں میرے عید کے — ٹور پہ صاحب مرا جاتا ہے جب باہر کہیں
وہ کھڑا باہر بجاتا جا رہا تھا کال بیل — اور بجتی جا رہی تھیں گھنٹیاں اندر کہیں
رنگِ رفتارِ زمانہ دیکھئے سر پیٹئے — دل کو بہلانے چلی ہیں مادر و دختر کہیں

کل زماں نوکر نے میرے راز داری سے کہا
رات کے پچھلے پہر جاتی ہے وہ اکثر کہیں

کوثر معید (نظام آباد)

مالِ حرام کھا کر بچے جو پل رہے ہیں — عہدِ شباب میں وہ بے جان نکل رہے ہیں
تعلیمِ نو کا یارو اب تو خدا ہی حافظ — لکھ پڑھ کے سارے لڑکے بھگّو نکل رہے ہیں
ہوٹل کو جا رہے ہیں دشمن کے ساتھ میرے — سینے پہ مونگ میرے دیکھو وہ دَل رہے ہیں
جب بھی پرانا جوتا پیروں کو کاٹتا ہے — مسجد میں جا کے فوراً جوتا بدل رہے ہیں

شاید ملاوٹوں کا یہ بھی اثر ہو کوثر
گوروں کے بچے سارے کالے نکل رہے ہیں

بے دھڑک (مدراس)

وقت کرتا جو وفا یوں نہ کنوارے ہوتے — باپ بچوں کے بنے ہم بھی تمہارے ہوتے
ہم اگر آج الیکشن میں نہ ہارے ہوتے — ہم بھی چمچوں کی سدا آنکھوں کے تارے ہوتے
کاش ہم جو کسی لیڈر کے دُلارے ہوتے — چار چھ اپنے بھی گیرج میں کھٹارے ہوتے
تم پہ یہ ظلم بھلا دیکھ سکیں گے کیسے — تم کنواری رہو دنیا میں ہمارے ہوتے
جھگڑا بیگم سے سدا ہوتا نہ مہنگائی کا غم — کاش بے فکری سے جیلوں میں گزارے ہوتے

بے دھڑک کاش نہ ہوتا یہ پھٹیچر فیشن
زیبِ تن جسم پہ بیگم کے غرارے ہوتے

خارش ہی سہی مل کے کھجانے کے لئے آ		آ شوق سے اک تارا بجانے کے لئے آ
ٹی وی پہ کبھی جلوہ بتانے کے لئے آ		شہراہ پہ اک بھیڑ جمانے کے لئے آ
جتنے تجھے آتے ہیں سیاست کے کرشمے		اُن سب کو الکشن میں دکھانے کے لئے آ
غیرت ہے اگر تجھ میں تو اے راندۂ درگاہ		دہلیز پہ سر اپنا جھکانے کے لئے آ
آتے ہیں تجھے خوب نہانے کے بہانے		چپکے سے کسی روز نہانے کے لئے آ
سوئے ہیں یہاں بیچ کے گھوڑوں کو سپاہی		ہے شہر میں ہر چیز چرانے کے لئے آ
بے زار ہوں ہوٹل کی غذاؤں سے بہت میں		ہفتہ میں دو اک دن تو پکانے کے لئے آ
بچوں پہ تجھے رحم نہیں آتا ۔ نہ آ کٹے		بھولے سے کبھی اپنے زنانے کے لئے آ
شستہ ہو زباں تیز ہوں دندانِ ظرافت		لوہے کے چنے ہیں یہ چبانے کے لئے آ

خورشید خضر کیوں ہے ہر اک بات میں نشتر
دانستہ کبھی ہنسنے ہنسانے کے لئے آ

یہ حسن ، یہ شباب ارے باپ کیا کروں		ایماں ہوا خراب ، ارے باپ کیا کروں
آتے ہیں ان کے والد ماجد مری طرف		سونٹا بغل میں داب ، ارے باپ کیا کروں
اب وہ بھی بات بات پہ دینے لگے مجھے		دنداں شکن جواب ، ارے باپ کیا کروں
کرتا تھا عیش جن کے روپوں سے میں رات دن		مانگے ہے وہ حساب ، ارے باپ کیا کروں
گھر کا تو مجھ پہ بند ہی تھا ، میکدے کا بھی		بند ہو گیا ہے باب ، ارے باپ کیا کروں

محبوب کہہ رہی ہیں یہ چہرے کی جھرّیاں
رخصت ہوا شباب ، ارے باپ کیا کروں

بارھویں عورت بھی دیکھا چاہیئے		کچھ مگر دولت بھی دیکھا چاہیئے
وہ مرے بن جائیں گے شاید خسر		دے کے کچھ رشوت بھی دیکھا چاہیئے
اپنی ہی بیوی سے اتنا پیار کیوں		غیر کی عورت بھی دیکھا چاہیئے
صرف تنقیدوں کے ڈنڈے کس لئے		شعر کی ندرت بھی دیکھا چاہیئے
اٹھ گیا آخر جنازہ عشق کا		حسن کی آفت بھی دیکھا چاہیئے
مونچھ داڑھی صاف کروانے کے بعد		آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیئے

غیر سے لکھوا کے پڑھتا ہے غزل
راز کی ہمت بھی دیکھا چاہیئے

★ جعفر عباس

کریز CRAZE

اور اُس دن ہمارے پڑوسی حکیم دلی خان نے جب اس بات کا انکشاف کیا کہ وہ فاران جا رہے ہیں۔
تو سچ جانئے ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی اور ہم دل ہی دل میں اتنی دیر تک خوش ہوتے رہے کہ اُن سے بیٹھنے کو بھی
نہ کہا۔ آخر جب ہم خود تھک گئے تو اُن سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اُن کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ خوشی و مسرت
کی وجہ سے اُن کی آواز بیٹھی جا رہی تھی۔ جب حالات کچھ قابو میں آئے تو ہم نے پوچھا: "لیکن آپ کیوں جا رہے ہیں؟"
بولے: "پچھلے مہینے یہاں ایک عرب شیخ آئے تو انھیں بخار ہوگیا۔ سارے بڑے ڈاکٹروں کو رجوع کر ڈالا مگر
افاقہ نہ ہوا پھر وہ بھولے بھٹکے ہمارے پاس آگئے ہم نے انھیں ایک ہی خوراک میں اچھا کر دیا۔ وہ بے حد متاثر
ہوئے اور اب انہوں نے اپنا "طبیب خاص" کے طور پر وہاں بلایا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تو خاموش ہوگئے مگر ہماری بیگم
جنہیں ہماری باتیں چھپ چھپ کر سننے کا بے انتہا شوق ہے وہ ایک دم بھڑک گئیں اور ہماری وہ درگت بنائی
کہ اللہ کی پناہ! اگر حکیم دلی خاں صاحب اُس وقت درمیان میں "پیس میکر" کا کردار نہ ادا کرتے تو انجام خدا جانے
کیا ہوتا۔

بہرحال حکیم صاحب وقتی صلح کرا کے خود تو تیاریوں میں مصروف ہونے کے لئے چلے گئے لیکن ہمارے سر
جو مصیبت ڈال گئے وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔ ہوا یوں کہ حکیم صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد بیگم صاحبہ
نے کچھ شرائط سامنے رکھیں۔ ہم نے تو پہلے ان شرائط کو نظر انداز کیا۔ مگر حالات بے قابو ہوتے جا رہے تھے۔
بیگم نے صبح و شام ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی، "دیکھو تمہیں پورا کا پورا وہاں جانا ہے۔ جس حلوائی کا سالا دوبئی میں
ہے۔ پڑوسن کا بیٹا اپنی بہن کو بھیجتا ہے۔ تم صرف پانچ روپے میں خوش ہو، تیس مار خاں بنے بیٹھے ہو۔ اور اگر دس دن
کے اندر اندر تم کسی عرب ملک نہیں گئے تو میں میکے چلی جاؤں گی۔ تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ چنانچہ دل ہی دل میں

ہم بہت خوش ہوئے کہ چلو بیگم کو میکے کی یاد تو آئی ورنہ ہم تو اب تک سمجھ رہے تھے کہ ان کا "میکہ" ہی نہیں ہے۔ خیر ہم نے بنا کسی حیل و حجت دو ٹوک الفاظ میں بیان دے دیا: "دیکھو بیگم شیخوں کا کچھ بھروسہ نہیں، غیر ملک ہوگا۔ عربی زبان میں بولنا پڑے گا۔ جو ہمیں آتی نہیں۔ ہم تو اردو بھی ٹھیک سے نہیں بول پاتے اور پھر تم وہاں نہیں ہوں گی" لیکن ہماری اس تقریر کا بیگم صاحبہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا: "نہیں! تمہیں میری قسم! تمہیں میڈل ایسٹ جانا ہی ہوگا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ محلہ میں ہماری کیسی بے عزتی ہوتی ہے کیونکہ خالہ کے تمام لڑکے مسقط میں ہیں۔ پڑوسی چچا جان کے تمام لڑکے ابوظہبی میں ہیں۔ جسے دیکھو سب عرب میں ہیں۔ اور ٹھاٹ سے روپیہ کما رہے ہیں۔" ہم نے کہا وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم وہاں جاکر کریں گے کیا؟" بولیں: "جو سب کر رہے ہیں!" ہم نے کہا: "مگر وہ سب کرنے کے لئے ہمارے پاس کوالیفکیشن نہیں ہے۔"

"یہ میں نہیں جانتی۔ اگر نہیں جاتے تو اچھا نہ ہوگا۔ پیسہ نہ ہو تو میرے زیور حاضر ہیں، مگر تمہیں عرب ملک جانا ہی ہوگا۔ تاکہ ہم بھی محلہ اور برادری میں اونچی ناک لے کر چل سکیں۔"

ہم نے بہت منت کی کہ یہ مشکل کام ہے۔ بولیں "تم مرد ہو کر مشکلات سے گھبراتے ہو۔" ہم نے اپنی مردانگی کا بغور جائزہ لیا تو ہم بھی پریشان ہو گئے۔ حلیہ ملاحظہ فرمایئے: دبلے اتنے کہ تیز ہوا چلتی ہے تو کسی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ موسم بدلے تو فوراً بیمار ہو جاتے ہیں۔ ڈرپوک اتنے کہ رات کو اگر بیگم صاحبہ چھینک دیں تو ڈر جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے نام پر ہول آنے لگتا ہے۔ گاڑی میں سفر نہیں کیا۔ سڑک پر چلتے ہیں تو اس قدر سنبھل سنبھل کر چلتے ہیں کہ دفتر کبھی وقت پر نہیں پہنچ پاتے اور "باس" کی ڈانٹ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ جس دن وہ برا بھلا نہیں کہتا ہمارا دل دفتر کے کام میں نہیں لگتا۔"

غرض کہ بیگم کے اس ہنگامے کے بعد جب ہم دفتر پہنچے اور دوستوں سے مشورہ کیا تو ان لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ لیکن جب چائے اور سگریٹ کی دعوت کا اہتمام کیا تو وہ لوگ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ طرح طرح کے مشورے ہونے لگے۔ کوئی کہتا یہ کرو، کوئی کہتا اخبارات میں اشتہارات دیکھو۔ کسی نے کہا کسی ٹریولنگ ایجنٹ سے ملو۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔ جب دسواں دن بھی ختم ہو گیا اور ہم اس وطن عزیز کو چھوڑ نہیں پاتے تو بیگم صاحبہ روٹھ کر میکے چلی گئیں۔

محلہ میں تو یہ حال تھا کہ ہر شخص پوچھتا: "کیوں میاں! کب جا رہے ہو؟" "سنو وہاں سے کیمرہ لیتے آنا" پڑوسی چچا فرماتے: "سنو! وہاں گھڑیاں اچھی اور سستی ہوتی ہیں، ضرور لیتے آنا" حلوائی نے کہا: "میاں جی! ذرا ننھے سے کہنا کہ خط جلدی جلدی لکھا کرے۔" ہم سب کی سنتے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے مگر منھ سے کچھ نہ بولتے۔ بہت دن ہو گئے اور محلے والوں کو یقین ہو گیا کہ ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں تو انہوں نے حیرت سے پوچھا: "کیوں بھئی! گئے نہیں!" ہم نے بہانہ کیا: "جی! ذرا طبیعت ٹھیک ہو جائے تو چلا جاؤں گا۔" کوئی کہتا: ذرا ویزا تو دکھاؤ!" ہم نے آخر تنگ آکر کہہ دیا کہ: "ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں"

بیگم صاحبہ کے میکہ جانے کے بعد سے تو میرا جینا بڑا آسان ہو گیا ہے۔ بڑے مزے میں گزر رہی ہے۔ دن بھر چائے کا دور چلتا ہے۔ سگریٹ بے حساب، دفتر سے لمبی چھٹی پر ہوں اس لئے گھر پر رہتا ہوں۔ میگزین پڑھتا ہوں، سامنے ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوں۔ شام کو یار دوست آجاتے ہیں۔ ان کے ساتھ سیر و تفریح کرتا ہوں، نائٹ شو بھی اب دیکھ رہا ہوں۔

بیگم صاحبہ کی موجودگی میں ناشتہ شو کا تصور گناہ عظیم تھا) غرض کہ خوب گزر رہی ہے خدا کرے بیگم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جلدی ہی چلی آئیں اور ہماری یہ سیر و تفریح، یہ عیش و آرام جو اُن کی غیر موجودگی میں میسر ہے وہ ملتا ہے۔ ہم بیگم کو روزانہ ایک خط لکھ دیتے ہیں کہ ہمیں ویزا آنے والا ہے۔ اور وہ بہت خوشی و محبت کے ساتھ ہمیں خط لکھتی ہیں۔

لیکن کبھی کبھی ڈرنے لگتا ہوں کہ اگر بیگم کو ہمارے جھوٹ کا علم ہوگیا تو کیا ہوگا، پھر سوچتا ہوں کیا ہوگا، بیگم میکے پڑی رہیں گی نا!

ابھی ابھی ایک صاحب آئے ہیں انہیں سعودی میں کچھ بندوں کی ضرورت ہے اور وہ مجھ سے ضد کر رہے ہیں کہ میں بھی چلوں، اس قدر لالچ دے رہے ہیں کہ ہمارا ضمیر ڈگمگا رہا ہے۔ لیکن وہ بدستور ضد پر قائم ہیں۔ چنانچہ ہم دو بجے جا رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ کا روتے روتے بُرا حال ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں بول رہی ہیں۔ اب ہمارا ہوائی جہاز اُڑ رہا ہے ـــ بستر کا نرم گوشہ کھسکتا ہے۔ اور بیگم جھٹ سے رضائی کھینچ لیتی ہیں ـــ اٹھو ـــ دفتر نہیں جانا ہے کیا؟ ـــ اور ہم احمقوں کی طرح کبھی اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

ماہنامہ شگوفہ کا تاریخی و
دستاویزی اہمیت
کا حامل

ڈرامہ نمبر

شائع ہو چکا ہے

مہمان مدیر: ساگر سرحدی

مضامین

فن کار اور سماج : ایڈورڈ باؤنڈ (انگریزی)
ترجمہ : ابراہیم رنگلا
ایک شخص : ابراہیم رنگلا
اُردو ڈرامہ ۔ سرسری جائزہ : سعادت علی خاں
اُردو ڈرامہ میں مزاح : ابراہیم یوسف
کہ عشق آساں نمود اوّل ... ساگر سرحدی
حیدرآباد میں اُردو ڈرامے : سعادت علی خاں

ڈرامائی شگوفے

سلمہ ۔ کے ۔ ہنگل
قادر خاں
ساگر سرحدی
جاوید خان
من موہن کرشن
پربودھ جوشی
رمیش تلوار
بھدرا کانت زویری

تراجم

خدائی فوجدار : برتلت بریخت (جرمن)
ترجمہ : لاجپت رائے
ورثہ : وسنت آباجی ڈھاکے (مراٹھی)
ترجمہ : اوشا جوگ ۔ ابراہیم رنگلا
پورٹریٹ : رتناکر متکری (مراٹھی)
ترجمہ : اوشا جوگ ۔ ابراہیم رنگلا
ناکہ بندی : چھایا داتار (مراٹھی)
ترجمہ : اوشا جوگ ۔ ابراہیم رنگلا
کالا آئینہ : زاہد حیدر (بنگلہ)
ترجمہ : شفیع الحسن
منافع : بی ۔ وی ۔ ایس ۔ جی ۔ پترو (تلگو)
ترجمہ : آر ۔ ایم ۔ سنگھ
افسرِ اعلیٰ : نکولائی گوگول (روسی)
ترجمہ : ایم ۔ سی ۔ چھیبا
یوگی اور ویشیا : راجہ مہندر وکرم (سنسکرت)
ترجمہ : شفیق عباس

تراجم

دو پریمی ؛ دادا بدیجی (سنسکرت)
ترجمہ : چمن لال مہتا۔ ابراہیم رنگلا
ڈاکٹر نرس ؛ بلونت گارگی (پنجابی)
ترجمہ : سہدیو
ہم نہ سوٹے تھے ؛ پربودھ جوشی
سائیں مہاراج ؛ بلراج ساہنی
پیٹنٹ میڈیسن ؛ ویاس کوی فقیر موہن (اڑیا)
ترجمہ : اسمٰعیل آذر
صبح نے کیا دیکھا ؛ بھدرا کانت زویری (گجراتی)
ترجمہ : حیدر خاں پٹھان

اردو ڈرامے

بکرم ؛ نتن سیٹھی
ایک بنگلہ بنے نیارا ؛ ساگر سرحدی
آج کا سچ ؛ فکر تونسوی
بس اسٹینڈ پر ؛ اظہر افسر
نوکر کا چکر ؛ احمد جمال پاشا
خواب ؛ غلام جیلانی
منشی جی اور شہر کی سیر ؛ وجاہت علی سندیلوی
چھتری ؛ غلام یزدانی
ستاروں سے آگے ؛ بھارت چند کھنہ
امیدوار ؛ خواجہ عبدالغفور
نوک جھونک ؛ مقصود علی خاں
خسرو۔ فرہاد ؛ ڈاکٹر سمیع الحق
ڈاکٹر بے دل کا دل ؛ پرویز یداللہ مہدی
کر چلا ہیں ؛ شفیقہ فرحت
غالب فلم انڈسٹری میں ؛ خالد عابدی
خاتمہ بالشر ؛ برق آشیانوی

فیض الرحمٰن فیض

تھُت تری

بال سر کے کیوں کٹایا تھُت تری
چکنی ہنڈی کیوں بنایا تھُت تری

عشق کو رُسوا کیا بازار میں
مار کیوں سڑکوں پہ کھایا تھُت تری

ڈُوری دینے کا وعدہ تھا مگر
ہانڈیاں مٹی کی لایا تھُت تری

عیش میں گذری کلب میں رات بھر
گھر میں بیگم کو گھمایا تھُت تری

شوق شادی کا بڑھاپے میں ہوا
سر میں کیا سودا سمایا تھُت تری

امن کا گہوارہ تھا یہ شہر "بھاگ"
کون چنگاری لگایا تھُت تری

ووٹ لینے در بدر پھرتا رہا
ووٹ لے کر مُنہ چھپایا تھُت تری

ورغلایا گھر کے ہر اک فرد کو
ناچ ٹھگلی کا نچایا تھُت تری

نشہ بندی کی چلی تحریک جب
دھندہ چوری سے چلایا تھُت تری

حلوے مانڈے سے غرض مُلّا کو ہے
قوم کی کشتی ڈبایا تھُت تری

نام روشن باپ دادا نے کیا
نام اُن کا تو مٹایا تھُت تری

لفٹ دے کر اس کو آخر پھنس گیا
عزت و دولت لُٹایا تھُت تری

تجھ کو رسوا کر دیا جوّا شراب
مال و دولت سب لُٹایا تھُت تری

تو نے سمجھا یہ ہوائی بات ہے
فون پر شادی رچایا تھُت تری

تفرقہ ڈالا میاں بیوی میں تو
ان کا گھر دوزخ بنایا تھُت تری

پہلے ہی تیری پتنگ اک کٹ کی تھی
غوطہ دے کر کیوں کھپایا تھُت تری

بن کے چمچہ اور دکھا کر سبز باغ
دے کے جھانسا کیوں پھنسایا تھُت تری

فیض یہ ہے سینہ زوری چور کی
شعر میرے ہی سنایا تھُت تری

محمد صبغۃ اللہ بمباٹ

کبھی ہم تھے سوار سائیکل پر

انگریزوں نے بیوی کو چاقو سے تشبیہ دی۔ ان کی زبان کا محاورہ ہے کہ "WIFE IS A KNIFE TO CUT LIFE" یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی سائیکل کو بھی بیوی کا ہم رتبہ بنا دیا اور نصیحت کرنے لگے "KEEP YOUR BYCE AS YOUR WIFE" یہ محاورہ تو اب قصۂ ماضی بن چکا ہے اس لئے کہ انگلستان میں سیکلوں سے زیادہ تعداد میں موٹریں ہیں اور کئی اصحاب ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا حیدرآباد فرخندہ بنیاد (خدا اُسے نظر بد سے بچائے) سائیکلوں کا شہر ہے۔ یہاں آپ کو گومتی کا پانی پیا ہوا آدمی بھی سیکل پہ نظر آئے گا۔ اور کنبا کاری کی زیارت کیا ہوا آدمی بھی سائیکل پر دکھائی دے گا سائیکل پہ پھرنے والے پتلون اور بشرٹ میں بھی ہوں گے، پائجامہ شیروانی میں بھی، کوئی نیکر پہنے ہوگا تو کوئی پتلون۔ کاسہ، ما ہے کوئی لنگوٹ بندھا سیکل سوار بھی نظر آئے گا۔ جب سیکل کی مقبولیت کا یہ عالم ہو کر بڑے بڑے موٹر نشین ایک عدد سیکل کا رکھنا فخر سمجھیں تو ہمارے لئے بھی عزم سفر کا یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا۔ اس لئے ہم نے اپنی آدھی زندگی اسی پہ گھومتے گزار دی۔ البتہ کبھی یہ بھی ہوا کہ اپنی سیکل کو کندھوں پہ لئے پھرنے کی نوبت بھی آئی۔ انگریزوں کے قول کے مطابق جس وقت میں بیوی نہیں رکھتا تھا اُس وقت بیوی سے زیادہ سائیکل کا خیال رکھتا تھا۔ صبح اُٹھتے ہی غسل کرنے یا منہ ہاتھ دھونے سے پہلے اُسکو صاف کرتا تھا۔ اور آئیلنگ کر کے تیار کر لیتا تاکہ راستہ چلتے ہوئے وہ کسی کی سمع خراشی کا سبب نہ بن سکے۔

جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شوہر خواہ کتنا ہی وفادار ہو، بیوی کا کوئی نہ کوئی گلہ باقی رہتا ہے۔ چنانچہ میری سائیکل کو بھی مجھ سے ایک شکایت تھی کہ میں نے اُس کو کبھی بلدیہ میں رجسٹر نہیں کرایا اور اُس کا جھگڑا تا ہوا نمبر میری سائیکل کے گلے کا لاکٹ نہ بن سکا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کبھی اُس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ خدانخواستہ اگر ضرورت پڑی (دوا نخواستہ۔ یہ کہ بری ضرورت تنقیح کے دوران ہی پیش آتی ہے) تو میں اپنے دوست سے سائیکل کا نمبر بھی اُسی طرح مانگ لیتا جیسے میرے بعض دوست اخبار مانگ لیتے ہیں۔ یا میرے ہم جماعت میری کتابیں) نہ اُن لوگوں کو کبھی توفیق ہوئی کہ اخبار یا کتابیں خرید کر پڑھیں جیسے کہ اُن کا فائدہ ہے۔ اور نہ مجھے کبھی توفیق ہوئی کہ نمبر خریدوں جبکہ فائدہ تو کیا ہوتا۔ اُلٹا جیب سے دو دام ہے جو دے کے [illegible]

اب دیکھئے کہ میری سائیکل کا نمبر واجبی کیوں تھا۔ ایک دن میں ٹھیک ساڑھے نو بجے ایک ڈرامہ کے ریہرسل کے لئے ریڈیو اسٹیشن جارہا تھا۔ گھر سے نکل کر چادر گھاٹ پل پر پہنچا کہ ایک آواز سنائی دی " دوست آگے سائیکلیں پکڑ رہے ہیں" میرے کان کھڑے ہوگئے۔ اور میں نے فوراً ہی بریک لگایا اور سائیکل سے اُتر کر About turn ہوگیا۔ لیکن ساتھ ہی دوسری آواز آئی۔ "شیخ مدار! وہ سائیکل والا پلٹ گیا ہے، جاؤ پکڑو اُسے" اب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو خاکی وردی پہنے ایک شخص جو غالباً شیخ مدار ہی ہوگا میرے تعاقب میں آرہا ہے۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ ہی رہے تھے کہ میں نے بڑی مشکل سے پکڑ کر پنجرے میں بند کیا۔ اور اللہ کا نام لے کر اپنی سائیکل کو دہائی دی " چل میری سائیکل چرخوں " کن انکھیوں سے میں نے شیخ مدار کو بھی دیکھا۔ ہم دونوں میں اچھی خاصی ریس شروع ہوگئی۔ میرے جسم کی تمام قوت میرے پیروں میں آگئی تھی۔ اور شیخ مدار کی طاقت غالباً ایڑیوں میں اور پسینہ تلوں کے نیچے۔ صرف چالیس منٹ کی دوڑ میں ہم ابراہیم پٹن پہنچ گئے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ گھر سے نکلتے وقت میں نے اپنے دوست سے نمبر مانگ کر کنجی میں لگا لیا ہے۔ جیسے ہی یہ خیال ذہن میں آیا۔ میں نے سائیکل روک دی اور ساتھ ہی شیخ مدار کا ہاتھ میری گردن پر تھا۔ اُس نے ہانپتے ہوئے پوچھا: "آپ کا نمبر کہاں ہے؟" میں نے نہایت معصومانہ انداز میں جواب دیا" جی وہ سائیکل کی کنجی کے ساتھ تالے میں لگا ہے"۔ اُس نے جھک کر نہایت غصیلی نظروں سے نمبر کو دیکھا اور پھر مجھ سے کہنے لگا" آپ نمبر رکھ کر آخر کیوں بھاگ رہے تھے؟" میں نے بھولے پن سے جواب دیا: " بھئی معاف کرنا میں نے یہ سمجھا کہ شاید آپ بیز قندیل کی سائیکلیں پکڑ رہے ہیں" شیخ مدار کے غصہ کی انتہا نہ تھی۔ زمین پیروں سے نکل چکی تھی اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی دوڑ دھوپ کے باوجود ایک چائے کے پیسے بھی وصول نہ کرسکے۔

ایک اور عجیب واقعہ ہوا کہ میں اپنے دوست کے ساتھ (جس کا نمبر میرے کام آجایا کرتا تھا) عابد روڈ سے گزر رہا تھا۔ اُن دنوں میں جب کبھی کسی چوراہے پر پہنچتا تو ہمیشہ اپنی نظر نصف فرلانگ آگے رکھتا تاکہ باوردی جوانوں کو پہلے سے دیکھ لوں۔ لیکن اُس دن میں باتیں کرنے میں کچھ اتنا محو تھا کہ آگے دیکھنے کا خیال نہ رہا۔ اب گڑھے میں گرنا ضروری تھا۔ سائیکلیں پکڑی جارہی تھیں۔ میرے لئے "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کا معاملہ تھا۔ نہ سائیکل آگے بڑھا سکتا تھا۔ اور نہ پلٹ سکتا تھا۔ میں نے کہا بُرے پھنسے لیکن میرے دل نے آواز دی " تم آج تک نہیں پھنسے ہو اب کیا پھنسو گے"۔

ایک ترکیب ذہن میں آگئی۔ میں نے بڑے جوش سے اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ مار کر بلند آواز سے کہا "ارے بھئی! اچھا ہوا کہ میں نے پرسوں ہی اپنی سائیکل کا نمبر لے لیا۔ ورنہ آج دھر لیا جاتا" میرا یہ جملہ باوردی جوان نے سن لیا اور اُس نے میرا تعاقب ترک کر دیا۔

تنقیح کا زمانہ تھا اور مجھے شہر جانا تھا۔ میں اپنے دوست کے گھر پہنچا کہ نمبر لے لوں۔ لیکن وہ مجھ سے پہلے کہیں جاچکے تھے۔ میں بھی بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کا ورد کرتے ہوئے نکلا۔ راستہ میں نمبر والے دوست سے بھی ملاقات ہوگئی۔ جب ہم سلطان بازار کے چوراہے پر پہنچے تو چند وردی پہنے ہوئے جوان اس طرح جھک جھک کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ سائیکلوں کے نمبر نہ تلاش کر رہے ہوں بلکہ کسی کان سے سونا نکالنے کی دھن میں ہوں۔ ہم دونوں چلتے اور ایک موڑ پر دونوں نے الگ الگ راستہ اختیار کیا۔ وردی پوش جوان نے مجھے لیم شحیم دیکھ کر میرا پیچھا تو چھوڑ دیا اور میرے دوست کا تعاقب شروع کیا۔

اب میں اس مذاق کا لطف اُٹھانے کے لئے سائیکل سے اُتر کر کھڑا ہو گیا تاکہ تماشہ دیکھوں۔ جوان نے فوراً دوست کو پکڑا اور نمبر پوچھا انہوں نے کہا کہ بریک کے ساتھ لگا ہوا ہے ــــ "پھر آپ بھاگے کیوں؟" اُس نے برجستہ سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا: "بھئی! نمبر تو میرے پاس تھا، لیکن میرے دوست کے پاس نہیں تھا۔" اور اتنی دیر میں وہ اپنے گھر بھی پہنچ چکے ہوں گے۔ جوان صاحب اپنا سا منہ لئے لوٹ گئے۔

ایک دن ہوا یہ کہ بلدیہ کے لوگ تنقیح کر رہے تھے اور میں بھی اطمینان سے سیکل چلا رہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ صاحب سائیکل ہاتھ میں لئے پیدل چل رہے تھے۔ تنقیح کرنے والوں میں سے ایک نے اُن سے نمبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب میں فرمایا: "ارے بابا! میں تو وہاں سے پیدل آرہا ہوں!"

بلدیہ کے جوان نے کہا: "میں قندیل نہیں نمبر پوچھ رہا ہوں!"

"مارچ ختم ہو رہا ہے، نمبر پرانا ہو گیا ہے یہ نمبر لے کر کیا کرو گے۔ اب کل سے اپریل شروع ہوگا نیا نمبر لے لوں گا۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔

روز روز کی ان پریشانیوں سے تنگ آکر میں نے مناسب سمجھا کہ نمبر خرید لوں۔ اس سے دو فائدے ہونگے ایک تو پریشانیوں سے بچ جاؤں گا۔ دوسرے قوم کی نظر میں چور بھی نہ رہوں گا۔ نہ مجھے نصف فرلانگ آگے نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ سائیکل پلٹانے کی، غرض دو روپے چودہ آنے میں نے بلدیہ کی نذر کئے۔ اور نمبر خرید لیا۔

جوں ہی میں نے نمبر خریدا اُس کے فوراً بعد بلدیہ نے سب کے لئے سائیکل کا نمبر معاف کر دیا۔ شاید وہ صرف میرے نمبر خریدنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور اس طرح بلدیہ والوں نے مجھ سے اپنا تعلق ترک کیا۔

پھر میں نے اس ترکِ تعلق کو مزید مستحکم کرنے کے لئے ایک عدد ویسپا خرید لی۔ بلدیہ والوں سے تعلق ختم کر کے R.T.O والوں سے تعلق پیدا کر لیا۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

سید ابوالفیض (سید آبادی)

ہاں!

"ہاں" اور "نہیں" دو ایسے لفظ ہیں جو نہ جانے کتنے مظالم دنیا پر ڈھائے ہیں۔ تعمیر و تخریب، ترقی و تنزلی، عروج و زوال کی بے شمار داستانیں ان دو الفاظ سے وابستہ ہیں۔ اسی 'ہاں' اور 'نہیں' پر کائنات اور اس کی رنگینیوں کا انحصار ہے۔ "نہیں" نے ابلیس کی ذات کو گمنامی سے نکالا اور حضرت آدم کی ایک 'ہاں' نے ان کو زمین پر پہنچایا۔ آج تک جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں اس میں 'نہیں' کے ساتھ 'ہاں' کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ تاریخ کے طلبا کو شاید یاد ہو گا کہ مہابھارت کی جنگ اسی 'نہیں' اور 'ہاں' کا نتیجہ تھی۔ آج بھی دنیا کو تباہ کرنے کیلئے روس اور امریکہ کی الکٹرانک ہتھیاروں سے لیس فوج اسی 'ہاں' کے انتظار میں کھڑی ہے۔

لفظ 'ہاں' بڑا ہی آفت کا پرکالہ ہے۔ ساری دنیا اس کی متمنی اور متلاشی رہی ہے۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ ہر ایک اس کی 'ہاں' میں ہاں ملائے۔ ہر نوجوان دل اس 'ہاں' کی آواز سننے کے لئے مچلتا رہتا ہے۔ اسی ایک 'ہاں' کے لئے دنیا میں یہ سارے داؤ پیچ کھیلے جا رہے ہیں۔ "باب العشق" میں اس ہاں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایک عاشق اپنے معشوق کی ایک 'ہاں' کے لئے بے شمار اذیتیں جھیلتا ہے۔ گھر بار، تخت و تاج چھوڑتا، محلے والوں کے طعن و تشنہ سہتا ہے، راتوں کو اپنی نیند خراب کر لیتا ہے۔ اپنا سکھ چین، تیاگ دیتا ہے اور عشق کے آخری مرحلے میں تو چپل جوتے تک، معشوق کی ایک ہاں کے لئے کھاتا ہے۔ گویا معشوق کی ایک 'ہاں' پر دونوں جہاں نثار ہے۔ شیریں کی اسی 'ہاں' کے لئے فرہاد نے اس کے محل تک دودھ کی نہر لانے کا ذمہ لیا تھا۔ لیلیٰ کی اسی 'ہاں' پر مجنوں نے در، در کی ٹھوکریں کھائیں۔ اور اسی 'ہاں' کی خاطر ہیر نے رانجھا کے لئے کتنے مصائب جھیلے۔ انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ ششم نے تخت و تاج چھوڑ کر ایک عام انسان کی زندگی بسر کی۔

آج ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی اسی 'ہاں' پر زندگی تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اپنی پڑھائی لکھائی

اس پر تبصرہ اور کر کے ساماں سے بحث وقت کر رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، چھٹیوں کے زمانہ میں کالج کے سامنے لڑکوں کی بھیڑ اسی "ہاں" کی امید میں ہوتی ہے۔ کہ شاید کوئی لڑکی ہاں کہہ دے اور ان کے گلشن امید میں بہار آجائے۔ راہ چلتے لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ بھی اسی "ہاں" کا باعث ہے۔

"ہاں" "نہیں" کیلئے آگ پر پانی کا کام کرتا ہے۔ جہاں 'نہیں' بہت ساری تباہیاں لاتی ہے۔ "ہاں" اسی تباہی سے دنیا کو بچاتی ہے۔ اگر دنیا کا ہر فرد، ہر قوم اور ہر ملک 'ہاں' کہنا سیکھ لے تو پھر سارے جھنجھٹ ہی مٹ جائیں گے۔ نہ کوئی جنگ ہوگی اور نہ تباہی۔

"ہاں" نے جہاں ایک طرف تخلیق عالم کیا، دوسری طرف ارتقائے عالم اور افزائش نسل آدم بھی اسی ہاں کی مرہون منت ہے۔ یہ وہی "ہاں" ہے جو، جوڑوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے خوشی و مسرت کے پھول کھلاتا اور پھر افزائش نسل کا سلسلہ چلتا ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کا سارا کاروبار اسی 'ہاں' کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ دو ٹوٹے ہوئے دلوں کا ملنا۔ دو بچھڑوں کا ملن۔ اور دو ممالک کی دوستی اسی ایک "ہاں" پر منحصر ہے۔ تلواریں جو کام نہ کر سکیں اسے 'ہاں' نے انجام دیا۔ تواریخ میں 'انگلی مال' نام کے ایک ڈاکو کا ذکر آیا ہے۔ جس سے سارا زمانہ لرزہ بر اندام تھا۔ لیکن اس نے جب مہاتما بدھ کے سامنے اپنے گناہوں سے توبہ کی حامی بھری تو پھر اس کی زندگی میں جو انقلاب آیا۔ اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ چمبل کے ڈاکوؤں کو بزور طاقت نہ تو انگریز زیر کر سکے اور نہ حکومت۔ بالآخر جے پرکاش نارائن نے توبہ کی حامی بھروائی۔

اسی 'ہاں' کی بدولت ملک کا بٹوارہ ہوا۔ آزادی نصیب ہوئی۔ ایشیاء اور افریقہ کے بیشتر ممالک اسی کی بدولت آزاد ہو رہے ہیں۔ خدا بھلا کرے اس 'ہاں' کا جس نے انسان کو انسان بننے اور انسانیت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔

یوں تو تواریخ 'سوشیالوجی' علم الاخلاقیات اور علم نفسیات میں 'ہاں' کی اہمیت مسلم ہے لیکن دراصل یہ علم سیاسیات کی کلید ہے۔ ہاں جمہوریت کی بنیاد ہے۔ جمہوری حکومت بالغ حق رائے دہندگی پر قائم ہوتی ہے۔ قوانین ووٹوں کی بنیاد پر وضع کئے جاتے ہیں۔ عام انتخاب سے قبل ہر پارٹی کا امیدوار ووٹروں سے 'ہاں' کہلوانے کی غرض سے در در کی ٹھوکریں کھاتا اور سارے آلام و مصائب برداشت کرتا ہے۔ اگر پانچ ووٹروں نے ایفائے عہد کیا تو ضمانت بچ گئی۔ ورنہ بچارے کی ساری محنت اکارت گئی۔ اور لاکھوں روپے برباد ہوئے۔ اس ووٹ کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ لیجئے وہ بھی سنا دیتا ہوں۔ ہمارے علاقہ میں ایک دھنا سیٹھ مگر انتہائی کنجوس آدمی بستے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہوش سنبھالنے سے آج تک گاؤں کے فلاحی یا مذہبی کام میں کبھی بھی ایک پیسہ نہیں دیا۔ بلکہ جب بھی موقع ملا کھسک گئے۔ اتفاق سے اس دفعہ الکشن میں لوگوں نے تال دے کر ان کو کھڑا کر دیا۔ ان کی حمایت میں خوب جلسے، جلوس ہوئے۔ اور نعرے لگائے گئے۔ جس کو سنئے یہی کہتا نظر آتا تھا کہ "ہاں" بس آپ ہی کو ووٹ دیں گے۔ سیٹھ صاحب نے اپنی یہ پوزیشن دیکھی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اپنے حلقہ انتخاب میں دو چاول کو میں کھد والے، لائبریریوں کو کتابوں سے بھر دیا۔ ورکروں کو بھی خوب نوازا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارے کے پاس جو کچھ تھا اس الکشن کی نذر ہو گیا اور دو چار

بچہ بچہ یا کیسٹ بھی گردی دکھائی۔ الکشن کے بعد جب نتیجہ نکلا تو وہ دونوں کی کثیر تعداد سے ہار گئے۔ سُنا ہے کہ اب عالم مایوسی میں انھوں نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے اور کسی شہر میں "کچھ" کر رہے ہیں۔

اب آیئے اس "ہاں" کے اقسام کا جائزہ لیں۔ "ہاں" کی تین قسمیں ہیں (۱) تعمیری ہاں (۲) تخریبی ہاں (۳) ہاں اسکوائر یا مصالحتی ہاں۔

تعمیری "ہاں" وہ ہے جو تعمیری کام انجام دے۔ تخریبی "ہاں" وہ ہے جس سے تخریبی کام ہو۔ اور جو بغیر غور وفکر کے جلدی میں بول دی جائے۔ مثلاً آپ کو آفس جانے کی جلدی ہو۔ کوئی آفیسر آنے والا ہو اور گھر سے نکلتے وقت عین موقع پر آپ کی بیوی یہ کہہ دے، "اجی! ایک کپ چائے تو پیتے جائیے، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کونسی گاڑی چھوٹ رہی ہے" آپ بھی "ہاں" کہہ کر بیٹھ گئے۔ اور چائے پی لی۔ اُدھر آفیسر نے وقت مقررہ پر حاضر نہ پا کر سسپنڈ کر دیا۔ اب تیسری قسم کی "ہاں" اسکوائر وہ ہے جو بیچ بچاؤ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً دو لڑنے والوں کے بیچ ایک تیسرا آدمی ہاں ہاں کہتا ہوا آتا ہے۔ اور معاملہ رفع دفع کرا دیتا ہے۔

صوتی اعتبار سے "ہاں" کی چار قسمیں ہیں (۱) ہاں جو حلق سے بولی جائے اقرار کے لئے۔ (۲) "ہاں" جو کھینچ اور دکھا کر بولی جائے۔ (بدلہ لینے کے لئے اس میں آواز کے ساتھ سر بھی ہلتا ہے۔ (۳) "ہاں" تکراری یا مصالحتی ہاں (جو مصالحت کے لئے آئے) (۴) یاسی ہاں، جو ایک سرد آہ کے ساتھ زبان سے اظہار افسوس کے لئے نکلے۔

"ہاں" کی ایک دوسری شکل "ہوں" ہے۔ جو ناک سے بولی جاتی ہے۔ صوتی اعتبار سے اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) "ہوں" ناک اور حلق سے برابر حصے کے ساتھ برائے اقرار (۲) "ہوں" جھٹکے کے ساتھ، روکنے یا منع کرنے کیلئے (۳) دیر تک اٹھائی "ہوں" بدلہ کیلئے۔

"ہاں" تو مضمون کی طوالت سے کہیں قارئین چاشنی کے بجائے بوریت نہ محسوس کریں اس لئے اس دعا کے ساتھ خدا حافظ کہ اس "ہاں" کا نیک سایہ ہمیشہ ہم لوگوں پر قائم رکھے۔ آمین ★★

ہمارے بازآبادکاری پروگرام

آندھرا پردیش میں طوفان سے متاثرہ علاقوں کیلئے کئے گئے طویل مدتی بازآبادکاری اقدامات کئی پہلوؤں پر مرکوز ہیں۔ جیسے مالگزاری کی ادائی سے چھوٹ۔ بنکروں۔ دستکاروں اور ماہی گیروں کو مالی امداد وغیرہ۔ کسان برادری کو خصوصیت کے ساتھ امداد بہم پہونچانے کی غرض سے حکومت نے ۳۴ء۷ کروڑ روپیوں کے مساوی محصول مالگزاری معاف کرنے کی منظوری دی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق متاثرہ بنکروں کی تعداد تقریباً ۴۱۸۰۰ اور ماہی گیروں کی تعداد تقریباً ۱۴ ہزار ہے اور صرف ماہی گیروں کی بازآبادکاری پر ۲۳ء۱۶۱ لاکھ روپیے خرچ کئے گئے بنکروں کی بازآبادکاری پر ۲۲۵ لاکھ روپیوں کی رقم خرچ کی گئی ہے۔ ۷۵۰۰ مختلف زمروں سے تعلق رکھنے والے دستکاروں جیسے موچیوں۔ چمڑے کی دباغت کرنے والوں۔ سیندھی کے درخت تراشنے والوں۔ بڑھائیوں اور لوہاروں وغیرہ کو ۶۵ ۶۸ لاکھ روپیوں کی امداد دی گئی۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

36/78-79
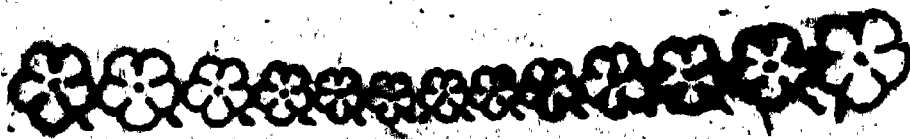
نوید مسیح الدین

ہوئے پڑھ کے ہم جو رسوا!

اُس رات ہم سکنڈ شو دیکھنے کے باوجود صبح جلدی ہی بستر سے جاگے تھے۔ کیونکہ ٹھیک گیارہ بجے سے ہمارا امتحان تھا۔ اس لئے جھٹ پٹ ناشتہ کیا پھر پورے ساز و سامان سے لیس ہو کر کالج روانہ ہوئے۔ چوراستہ کی پان کی دکان سے دو چار عدد پان بھی اُدھار لئے۔ اور بڑی بے فکری سے نقل مارنے کے گُروں پر غور و خوض کرتے ہوئے کالج پہنچے۔ وہاں کا سماں بڑا نرالا تھا۔ کالج کی آہنی گیٹ پر پرنسپل صاحب کی قیادت میں دونوں جانب تمام لکچرر صف بستہ کھڑے تھے ہم یہ سوچ کر بہت خوش ہوئے کہ شاید ہمیں خوش آمدید کہا جائے گا۔ اور یہ لوگ مستقبل کے ہونہار گریجویٹس کے اعزاز میں استقبالیہ گیت گا ئیں گے اور پھر پھول برسائے جائیں گے۔ لیکن کچھ ہی دیر میں ہماری اس خوش فہمی پہ اوس پڑ گئی۔ اور ہم انگشت بدنداں رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے امتحان دینے والوں کی جامہ تلاشی شروع ہو گئی یکایک غیر ارادی طور پر ہمارا ہاتھ اُس جگہ پہنچا جہاں ہم نے معاشیات کی گائیڈ چھپا رکھی تھی۔ جامہ تلاشی کے دوران جب ہماری باری آئی تو چھان بین کے باوجود تلاشی لینے والوں کی رسائی گائیڈ تک نہ ہو سکی۔ اب آگے ایک اور مرحلہ سے گزرنا تھا۔ منتظمین کو شک ہوا کہ موزوں میں بھی نقل کی چٹھیاں چھپائی جا سکتی ہیں اس لئے چپراسی جوتے جھٹک کر پاؤں دبا دبا کر چٹھیاں ڈھونڈنے لگے تھے۔ کیونکہ کھڑے کھڑے ہمارے پیروں میں درد ہونے لگا۔ چپراسیوں کے پیر دبانے سے ہماری تکلیف کچھ حد تک دور ہوئی ہم نے وقت کی پرواہ کئے بغیر قصداً کچھ دیر اسی طرح ٹھہرنا چاہا۔ ناگہاں کسی لڑکے نے زور کا دھکا دیا۔ چونکہ ہمارا پیر چپراسی کی گرفت میں تھا۔ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ گر پڑے جس سے ہمارا سفید پتلون داغدار ہو گیا۔

جب ہم امتحان ہال میں پہنچے تو ممتحن نے گرجدار آواز میں کہا: "جو کوئی بھی کتابیں یا گائیڈس چھپا کر ساتھ لائے ہوں، چپ چاپ ہمارے حوالے کر دیں۔" ہم نے روہانسی آواز میں گڑگڑا کر کہا، "سر! ہمارا تمام اسلحہ گولہ بارود سرحد پر ہی چھین لیا گیا ہے۔" کچھ جھینپ کر وہ ہمیں قہر آلود نگاہوں سے گھورنے لگے۔ ہمیں اس حیرتناک تبدیلی پہ کافی تعجب ہوا۔ کیونکہ ہم اس سے قبل بھی کئی امتحانات دے چکے تھے۔ اور یہی ممتحن حضرات "بُرا مت سنو" "بُرا مت دیکھو" "بُرا مت کہو" کے اصول پر کاربند کھسیانی بلیوں کی طرح ٹیبل نوچتے بیٹھے رہتے تھے۔ خیر ہم پہلی دفعہ اپنے زنگ آلود ذہن پر بار ڈال کر سوچنے لگے کہ کیا آج سورج مشرق سے نکلا ہے یا مغرب سے؟ ابھی پوری طرح سنجیدگی سے سوچ بھی نہ پائے تھے کہ یکایک فلائنگ اسکواڈ نے دھاوا بول دیا۔ ہم بہت بوکھلائے اور بغلیں جھانکنے لگے ہماری بغلیں پسینے سے تر بہ تر ہو چکی تھیں اب ہر لڑکے کی از سرِ نو جامہ تلاشی شروع ہوئی۔ اور مواد دستیاب ہونے پر چند لڑکے دو تین سال کے لئے debar کر دیئے گئے۔ ہمارا دل بڑی زور سے پھڑکنے لگا۔ جی ہاں! دھڑکا نہیں اگر دھڑکتا تو یہ احساس نہ ہوتا کہ دل سینہ چیر کے نکلنے کے لئے بے قرار رہا ہے۔ اور اسی دل کی پھڑپھڑاہٹ کے دوران ہم نے بھی غیر استعمال شدہ عقل پہلی دفعہ استعمال کی اور تلاشی سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو بے حد معروف دکھانا ہی مناسب سمجھا اور الم غلم لکھ کر صفحے کالے کرنے لگے۔ صحیح جواب تو

لکھنے سے رہے۔ کیونکہ کتاب تو کتاب کا ٹیسٹ تک امتحان سے ایک روز قبل خریدی گئی تھی۔ غرض ہمیں نیک نیتی سے، جوابات لکھنے میں منہمک دیکھ کر ہماری جان بخشی کر دی گئی۔ اتنے میں کسی کونے سے ہچکیوں کی دبی دبی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ہم نے حیرت سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک صاحب بڑے مضطرب پسینہ میں شرابور ہوتے جا رہے تھے۔ اور آنکھیں مینڈکوں کی طرح اُبل پڑ رہی تھیں۔ ممتحن نے اُن کی حالت پر ترس کھا کر ایک گلاس پانی پیش کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ موصوف نے فلائنگ اسکواڈ سے گھبرا کر نقل کی چٹھیوں کا گولہ نگلنے کی کوشش کی تھی جو حلق میں پھنس گیا تھا۔
غرض جیسے تیسے تین گھنٹوں بعد اس زنداں سے چھوٹے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ نئے وائس چانسلر نے یہ دھوم مچا رکھی ہے۔ بے ساختہ ہمارے منہ سے اُس سابقہ وائس چانسلر کے حق میں "دعائیہ کلمے" نکلنے لگے۔ جس کا نام جاننے کی کسی نے آج تک زحمت گوارا نہ کی تھی۔ اب ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ روز تھکے ماندے کالج جائیں گے۔ تاکہ چیکنگ کے دوران لکچرر ہمارے جسم دبا کر انتقام کی آگ کو سرد کر سکیں۔ خیر جناب ہم بڑے بے آبرو ہو کر کالج سے نکلے، نکلے کیا دھکے دے کر نکالے گئے۔

یہاں ہم یہ بات آپ پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں میٹرک کرنے کے فوری بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر بھیج دیا گیا تھا۔ جس سے ہمارے ہم وطنوں کو شہر کا پروگرام بناتے وقت قیام و طعام کی بڑی سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے ہم علی الصبح یعنی دس بجے اٹھ کر ورانڈے میں کھڑے دانت مانجھ رہے تھے کہ ہمارے ایک قدیم ٹیچر اپنے چند شاگردوں اور اولاد کا قافلہ لئے چلے آ رہے ہیں۔ ہم خاموشی سے اندر کھسک گئے۔ لیکن وہ ہمارے دروازہ پر ہی آ دھمکے۔ اور ہمارے ہی ہاں پڑاؤ ڈالا۔ یہ ہمارے پرائمری اسکول کے "مڈل پاس" اُستاد تھے۔ پورا نام تو ہمیں یاد نہ رہا۔ لیکن شریر لڑکے انہیں جڑی بوٹی کہتے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُن کے کانوں پر لانبے لانبے بال اُگے ہوتے تھے۔ اُستاد محترم اپنی املا کی کمزوری کے باعث ذہین طلباء سے بڑے خائف رہتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے انہوں نے 'س' سے صدر مدرس لکھ دیا اس فاش غلطی پر ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا "سر! صدر مدرس 'ص' سے لکھا جاتا ہے" وہ بلا تامل کہنے لگے "وہ صدر مدرس ہائی اسکول کا ہوتا ہے۔" اب شہر میں اِن کی تشریف آوری میٹرک کے امتحان کے سلسلے میں تھی۔

ہاں! تو جناب ہم اپنے امتحان کی باتیں بیان کر رہے تھے۔ لیکن اچانک ہمیں وہ مڈل پاس ٹیچر یاد آ گئے جو ہم جماعت میں ہمیں پڑھایا کرتے تھے۔ اب ہم آپ سے کیا عرض کریں، ہمیں ہائی اسکول کی سطح تک بھی ایسے ہی ٹیچروں سے سابقہ پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم علم حاصل کرنے سے کہیں زیادہ نقل مارنے کے نت نئے طریقوں سے واقف ہوتے گئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ نقل بغیر عقل کے ساتھ نہیں دیتی۔ اگر ہم عقل کو استعمال کر کے علم حاصل کرتے تو کسی اصلی عہدہ پر پہنچتے اور کام کے آدمی کہلاتے!

★★

پُرانی اصطلاح ــــ نئی تشریح

اصغر امام آروی

فاشسٹ: یہ ایک جمہوری گالی ہے۔ جمہوری ممالک میں بہت ہی جمہوری لیڈر اس گالی کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ سننے والے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا صرف مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ حکمراں جماعت کے لئے اپوزیشن فاشسٹ ہوتی ہے اور اپوزیشن والوں کے لئے حکمراں جماعت اور عوام دو فاشسٹوں کے بیچ سینڈوچ ہوتی ہے۔

انتخاب: یہ جمہوریت کا سب سے اہم فریضہ ہے کہ اپوزیشن والوں اور شکست خوردہ لیڈروں کو اس کا انتظار شدت سے رہتا ہے۔ مگر ارباب حکومت کبھی اس کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ اور کبھی خیال آ بھی جاتا ہے تو اس کو جھٹک دیتے ہیں۔ انتخاب سے اپوزیشن اور حکمراں دونوں جماعت میں تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ ووٹ کے فیصلے حکمراں جماعت کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتے ہیں ع "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا" اپوزیشن والے یہ مصرعہ گنگناتے ہیں۔ ؎ "آج وہ ملا جس کا صدیوں سے تھا انتظار مجھے"

بیلیٹ پیپر: بیلیٹ پیپر محض ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوتا ہے جو کسی کی سیاسی زندگی کے لئے پیام اجل لاتا ہے تو کسی کو تکمیل خواب دیرینہ کے مژدے سناتا ہے۔ پہلے صرف بیلیٹ پیپر کا استعمال ہوتا تھا مگر اب بیلیٹ پیپر سے پہلے بولٹ کا استعمال بھی ہوتا ہے کیونکہ بولٹ کے استعمال سے بیلیٹ کا استعمال آسان ہو جاتا ہے۔

ووٹرس: یہ دو پیر والے وہ سدھائے ہوئے جانور ہوتے ہیں جو اپنے چارہ دہندہ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ یوں تو بانیان جمہوریت نے ووٹر ہونے کے لئے عمر کی قید لگا رکھی ہے مگر ماڈرن جمہوریت میں عمر قید کے کلیہ کو فرسودہ قرار دے دیا گیا ہے۔ اب نئے قاعدہ کی رو سے ہر کوئی جو پولنگ بوتھ تک چلنے کی سکت رکھتا ہے ووٹر کہلاتا ہے۔

یوں تو ایک ووٹر ایک ہی ووٹ دے سکتا ہے مگر یہ کلیہ اب قائم نہ رہا یہ ووٹر کی جسارت و ہمت پر منحصر ہے کہ جتنے چاہے ووٹ دے۔ ایک ووٹر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ بہروپ ہوتا ہے۔ ایک ووٹر اپنے آقا کے لئے جنس کی تینوں شکلوں میں حاضر ہو سکتا ہے ایک ووٹر دوسرے کے ووٹ کی زیادہ فکر کرتا ہے اور ایک کامیاب ووٹر کی یہ کوشش رہتی ہے کہ دوسروں کو ووٹ کی زحمت سے نجات دلا دے۔

جلسے: انتخابی جلسوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہاں لوگ آتے نہیں بلکہ لائے جاتے ہیں۔ جلسے کی کارروائی ختم تک پُرامن طور پر بیٹھنے کے لئے مناسب معاوضے بھی دیئے جاتے ہیں۔

ایک جلسے میں سنگ و خشت، پھول، سڑے انڈے، ٹماٹر، باٹا کے سن فلاور اور چپلیاں سب کچھ برسائے جا سکتے ہیں اور یہ بارش اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ووٹ کی فصل اُس کے حق میں کیسی ہوگی۔

بوگس ووٹنگ: آج کا لیڈر بوگس ووٹنگ پر کافی بھروسہ کرتا ہے۔ مرے ہوئے اور شہر سے غائب ووٹروں کو بوگس ووٹنگ کے ذریعہ زندہ یا حاضر ثابت کیا جاتا ہے بوگس ووٹ ڈالنے والوں کو بار بار اپنا نام، اپنی ولدیت، اپنا پیشہ اور اپنی جنس تبدیل کرنا ہوتا ہے لیکن چونکہ نام، پتہ، ولدیت اور جنس بدلنے پر کوئی سرکاری پابندی نہیں ہے۔

★★

ایسے صحت مند سالنامے کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

جوہر سیوانی
سیوان (بہار)

★ سالنامہ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

جہانگیر ناگپوری

★ مدیر شگوفہ، سلام مسنون

شگوفہ کا سالنامہ نظر سے گذرا۔ مجموعی طور پر آپ کی سعی واقعی قابل ستائش ہے۔ مشاعرے کی رپورٹ پڑھی۔ بقول فکر تونسوی "ہندوستان میں کسی زمانے اور کسی زبان میں طنز و مزاح کی ایسی باقاعدہ محفلوں کا وجود نہیں ملتا اردو میں پہلی مرتبہ زندہ دلان حیدرآباد نے طنز و مزاح کو ایک زندہ تحریک بنادیا۔ واقعی رشیوں منیوں اور صوفیوں کے اس دیش میں اپدیشوں اور فلسفوں سے بوجھل فضاؤں میں طنز و مزاح کے غبارے چھوڑنے والے لائق صد تحسین ہیں

اس شمارے میں "میرا پہلا اور آخری صدارتی خطبہ" ایک پردیسی کا سفرنامہ، گھر کی مرغی، ہلمٹ، جیب کا درد اور کمشنر کے نام انشائیے پسند آئے۔ اسرار جامعی، اشرف مالوی، محبوب راہی کے قطعات و نظمیں پسند آئیں۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا مضمون بھی اچھا ہے اور "چہ خوب" واقعی "چہ خوب" ہے۔

ارشد اقبال حیدرآباد

★ مصطفےٰ بھائی صد سلام رحمت

سالنامہ ملا۔ غنچۂ دل کھلا
آپکی محنتیں خوب ہیں مصطفےٰ

پر آداریہ میں جو ذمہ داری آپ نے فنکاروں پر ڈالی ہے کیا خود کو بھی ــــــ۔ ایک مدیر کی حیثیت سے دعوت دیتے ہیں۔

★ صابر بہاری
رانچی

★ حیدرآباد سے یہاں پہنچنے کے بعد کچھ اس قدر شدید مصروفیت طاری رہی کہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ ویسے آپ کے خلوص اور نوازشوں کی سوغات اور زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ اجلاس کی خوشگوار یادوں کا اتنا سارا ذخیرہ میں اپنے ساتھ لیا ہوں کہ جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ادبی اجلاس کا سارا پروگرام جو میں نے ٹیپ کرلیا تھا کوئی ستر بار سن چکا ہوں اور (سوائے اپنے مضمون کے) ہر مضمون پر سر دھنتا ہوں۔ یہاں کویت میں مقیم چند پاکستانی ادب نواز حضرات نے بھی ٹیپ سنے ہیں اور بہتوں نے اسے ریکارڈ بھی کرلیا ہے۔ سب کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ عمدہ قسم کا مزاح سوائے حیدرآباد کے کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ اکثر دوست احباب کو میں نے شگوفہ سے بھی متعارف کروایا۔ کاش کہ دوسرے اور پرچوں اور رسالوں کی طرح شگوفہ بھی یہاں دستیاب ہوسکتا۔

سید نصرت
کویت

★ پچھلے دنوں میں نے زندہ دلان حیدرآباد، شگوفہ اور آپ کی خدمات کا ایک ریڈیو پروگرام میں احاطہ کیا تھا۔ جو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے تھا۔

ابوالفیض سحر
دہلی

91479

OURS ~~IS~~ WAS A BEAUTIFUL CITY

PRICE

اِس ہتھیلی کے پیچھے

(فہرست)

دختر جو تھک کے قصیدہ ہو کر ہم نے طول دیا ہے۔ کچھ تو یہ حکایت لذیذ ہے اور ذرا دراز ترکھنے جانے کے قابل ہے۔ اور کچھ ہم اپنی تلخ نوائی کی تلافی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ جو پنڈی کراچی کے سفر میں ہم سے سرزد ہوئی تھی۔ ہمیں توقع ہے کہ منتظرین قاری اس بات کی داد دے گا کہ جہاں ہم ٹکا روؤں کے ساتھ اظہار بیزاری میں بخل نہیں برتتے وہاں ہیرو پجیجیوں کی دلداری میں اسراف بھی روا رکھتے ہیں۔ بلکہ خاص حالات میں تو گھر بشمول دل بھی لٹا دیتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ شخص جو تعریف تو کرے مگر تبغض کے ساتھ، بخیل ہی نہیں، رذیل بھی ہے۔

اڑنے سے پیشتر ایک رس بھری آواز نے براہ میکروفون ہمیں خوشامد کی حد تک خوشامدید کہا اور خوشامد کا مزہ ابھی منہ ہی میں تھا کہ پوتنگ فضا میں بلند ہوا۔ جب ۲۷ درجے کی بہار آفریں بلندی پر پہنچا تو تواضع کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے سگار آئے، پھر ناشتہ آیا۔ پھر سگار آئے اور آخر سوال آئے۔ "کچھ دیکھئے گا؟ کچھ پڑھیئے گا؟ سر کے نیچے تکیہ رکھ دوں پاؤں کے نیچے دل رکھ دوں! اپنی جان نذر کروں، اپنی وفا پیش کروں؟" ____ خدا جانے اس توبہ شکن تواضع نے کتنے شہروں کے مزاج بگاڑے اور گھر اجاڑے ہوں گے لیکن معاف کیجئے یہ سوال ہمیں بعد از وقت سوجھ رہا ہے۔ اس وقت پوتنگ کے مسافروں کو ایسے فاسد سوالوں کا مزاج نہ تھا۔ اگر کوئی پوچھتا تو جواب صاف تھا۔ مزاج بگڑتا ہے، تو بگڑنے دیجئے۔ گھر اجڑتا ہے تو اجڑنے دیجئے۔ نامحرم اس لحظہ یہ سب فکر فضول ہے، جب حشر کا دن آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا۔

جب تواضع کا طوفان تھا تو آہستہ آہستہ پوشسوں نے بھی پر سمیٹے اور ایپرن اتار کر اپنے آستانے میں سستانے لگیں۔ اگرچہ پھر بھی گھنٹی کی آواز پر کبھی روتے بچوں کے منہ میں مصنوعی نپل اور کبھی بسورتے بوڑھوں کے ذہن میں اصلی اسپر ڈالتی نظر آتیں۔ بہرحال ایک مختصر سے بے ہوشش وقفے میں ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جہاز میں ہمارے علاوہ اور مسافر بھی ہیں۔ سب سے پہلے ہم نے ہم نشین پر توجہ دی۔ آپ کے چہرہ پر میر پور، اور قمیص پر سالن کے آثار تھے۔ خوش قسمتی سے آپ سو رہے تھے۔ زیادہ گہرے تعارف کی نوبت نہ آئی۔

یہ صحرا یہیں رہتا ہے

کھڑکی سے باہر جھانکا تو معلوم ہوا کہ دیار وطن سے کوسوں نکل آئے ہیں، وہ خطۂ خاک جس پہ ہم اڑ رہے تھے خطۂ پاک نہ تھا۔ بلکہ پانچ میل کی بلندی سے بھی اجنبی نظر آتا تھا۔ یہ صحرا تھا اور کوئی صحرا سا صحرا! چپٹا، چٹیل اور چوپٹ، ہم نے اپنے حافظے کے جغرافیہ داں حصے سے اس صحرا کا نام پوچھا تو حافظے نے اپنی معصومیت کا اظہار کیا۔ ہمیں الجھن یہ تھی کہ ہمارے علم نقشہ کے مطابق وہاں سمندر ہونا چاہیے تھا یا ساحل سمندر جہاں نقرئی بادبانوں والی خواجوں کی کشتیاں رواں ہوں اور حسب معمول ساحل روپہلی ریت پر غسل آفتاب میں رو بہ فلک بیٹھے ہوں تاکہ اوپر سے ہمارے طیارے گزریں تو ان مہک پرشوں کو کچھ چھپائے نہ بنے ____ ہمیں پورا علم ہے کہ جہاں سیکھنے والوں اور دیکھنے والوں کے درمیان پانچ میل کا عمودی فاصلہ حائل ہو، وہاں کوئی قابل فہم اعضاء اجسام نظر نہیں آتے تاہم التماس ہے کہ ایسا سوچنے میں کیا حرج ہے۔ رعنائی پہ بے شک ہمارا تصرف نہیں۔ لیکن رعنائی خیال تو کسی

کی جاگیر نہیں اور یہ ہمارا نہیں' غالب دیدہ وہ کا نسخہ ہے۔ ؎ ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال

لیکن اس لق و دق صحرا کے نظارے سے ہمارے خیال کا حسن بری طرح ریگ آلود ہو گیا۔ ہاں ایک فائدہ ہوا کہ یہ اُلجھن ایک تقریب ملاقات کا بہانہ بن گئی اور ہم نے پاس سے گزرتی ہوسٹس کو ٹھہرا کر پوچھا: "یہ صحرا کہاں سے آگیا؟" ——— بولی: "جہاں تک میرا علم ہے یہ صحرا یہیں رہتا ہے۔ بہرحال یہ ایران ہے" ——— "ایران!" ——— ہمارے منہ سے احتجاجاً نکلا: "وہ سعدی! وہ حافظ والا ایران! وہ آب رکنا باد، وہ گل گشت مصلےٰ والا ایران! وہ آہو والا اور غزالوں والا ایران! وہ بلبلوں اور قمریوں والا ایران! وہ..." "معاف کیجئے گا" ایر ہوسٹس ایک دلآویز بے صبری سے بولی: "ایران کے چرند و پرند کی فہرست تو بہت طویل ہے اور مجھے دوسرے مہمان بھی بلا رہے ہیں۔ کیا میں کوئی فوری خدمت بجا لا سکتی ہوں؟ مثلاً اسپرو ..." ——— ہم اتنے بوڑھے تو نہ تھے کہ صدمۂ صحرا سے جانبر ہونے کے لئے ہمیں اسپرو ٹیبلٹ کی حاجت ہو لیکن اتنے بچے بھی نہ تھے کہ ہمارے منہ میں نپل دے دیا جاتا۔ بہرحال اسپرو کی پیشکش ہم نے شکریہ کے ساتھ مگر نہایت درشتی سے ٹھکرا دی۔ ہمیں ناخوش دیکھ کر ہوسٹس بولی: "اب چند گھنٹے صبر کریں۔ بیروت میں آپ کو اتنی بلبلیں اور قمریاں ملیں گی کہ چک واسے میں اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوتیں۔"

اور پھر ایک ادا سے وہ مسکراتی گنگناتی ہرنی کی طرح آگے بڑھ گئی اور ساتھ ہی ہمارے جملہ شکوے اور شکایتیں بہا لے گئی۔ نیز کچھ روشنی بھی چرا لے گئی۔ روشنی ماند پڑی تو ہم نے بھی آنکھیں موند لیں کہ پچھلی رات بہت تھکے ہارے لیٹ گئے آرام کیا ——— بیروت تک پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ کہیں بغداد کی نواحی فضا میں لنچ کے لئے جگائے گئے۔ لنچ تو خیر لذیذ تھا ہی لیکن ہم پر دیرپا اثر نان و گوشت کے ذائقے کا نہ تھا بلکہ تواضع کے مزے کا جس نے ہمیں اور ہمارے ہم نشیں کو عارضی مہاراجا بنا دیا: ہمیں ریاست چک والا کا اور انہیں ریاست میرپور حال بریڈفورڈ کا!

پھر دفعتاً بیروت آگیا اور ہماری بین الاقوامی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اس کی پہلی علامت یہ تھی کہ جونہی ہم جہاز سے اترے، ہم سے زیادہ توجہ ہمارے پاسپورٹ کو دی جانے لگی۔ گویا پاکستان سے ہم پاسپورٹ لے کر نہیں اُٹھے تھے بلکہ پاسپورٹ ہمیں لے کر آیا تھا۔ اور یہ جاننے کے لئے کہ ہمارا وجود لبنان کے لئے مفید ہے یا مضر، ہماری نبض سے زیادہ ہمارے پاسپورٹ کی نبض ٹٹولی گئی۔ جب ہمارے پاسپورٹ کی صحت ٹھیک نکلی تو ہماری تندرستی بھی تسلیم کر لی گئی۔ گویا ہماری حالت ان داستانی شہزادوں سے مختلف نہ تھی جن کی جان طوطے میں ہوتی تھی۔ ہماری جان پاسپورٹ میں تھی چنانچہ ہم نے اُسے چوما، سینے سے لگایا اور جس چیز کو دراز کی تہ میں پھینک دیتے تھے اب دل کی تہ میں جگہ دی۔ یہ ہو چکا تو بسم اللہ کر کے حفاظتی ہاتھوں سے حلال تھیلا اور چل پڑے ——— ہم ہوا میں تو بوئنگ سے اترتے ہی منزل ہو گئے تھے ——— اللہ کسٹم کے راستے کچھ عربی، کچھ انگریزی، کچھ سچ، کچھ جھوٹ بولتے ایئر پورٹ سے باہر نکلے۔

بیروت میں بھی آپ کی سسرال ہے

بیروت میں ہمارا کوئی واقف آشنا نہ تھا۔ پاکستان سے روانگی سے پہلے ہمارے ایک مہربان نے اپنے ایک مہربان کو جو بیروت میں مقیم تھا تار بھیج کر ہمارے استقبال کی تاکید کی تھی۔ ہم نے ایئر پورٹ سے نکل کر ہر چہرے کو دیکھا

وطن دور سے پاکستانی نظر آتا ہے یا نہیں اور آتا ہے تو اُسکا حسن استقبال ہے یا نہیں، لیکن ناکامی ہوئی۔ تاچار ہم نے ابن انشا کی ہدایت نامہ [illegible] تھا:

"بیروت ایئرپورٹ سے ٹیکسی لے کر سیدھے الحمرا ہوٹل جائیے۔ ساتھ ہی الحمرا پرستوراں دائرے کا نشان تھا۔ ہم نے تیزی سے الحمرا کے لئے ٹیکسی لی۔ منزلِ مقصود پر پہنچے تو منزل سامنے تھی مگر مقصود غائب یعنی ہوٹل موجود تھا۔ مگر رہنے کو جگہ نہ تھی۔ الحمرا کیا ہر ہوٹل مسافروں سے بھرا پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ بیروت کے اکثر سیاحوں کے پیرانِ طریقت نے اپنے لال دائرے الحمرا ہی پر ثبت کئے ہیں۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ ایک بار پھر ابن انشا کے نقشے کی طرف رجوع کیا اور ایک نیلے دائرے والا مقام نظر آیا جو راہِ طریقت سے تو ذرا ہٹ کر واقع ہوا تھا لیکن تھا خاصا کارآمد۔ یہ پی آئی اے کا دفتر تھا۔ اور الحمرا سے بہت دور نہ تھا۔ دو چار قدم ہی چلے تو، سامنے ایک عمارت کی پیشانی پر سبز پاکستانی رنگ کے تین مانوس انگریزی حروف نظر آئے۔ PIA دفعتہً ساری اجنبیت، ساری کوفت دور ہوگئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ وطن میں ہم پی آئی اے کے دفتر کے سامنے سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے غیروں کا گھر ہو۔ لیکن کسی غیر ملک کی گلیوں سے گزرتے ہوئے یہ تین سبز حروف نظر آجائیں تو یوں لگتا ہے، جیسے سسرال ہو۔ اندر داخل ہوتے تو مانوس پاکستانی چہرے دکھائی دیتے اُردو میں علیک سلیک ہوئی اور پھر ہم نے اپنے تار فراموش میزبان [1] کو فون کیا۔ ہمارے ابتدائی سلام کے جواب میں بڑی دوستانہ سی آواز آئی: "ارشاد!"

"کیا میں فیاض صاحب سے بول رہا ہوں؟" ——— "بیشک یہ آپ کا خادم فیاض ہے، اور آپ کی تعریف؟"

"میری تعریف تو اُس تار میں درج ہے جو رحمٰن صاحب [2] نے آپ کو ایبٹ آباد سے بھیجا تھا" ——— "کب بھیجا تھا؟"

"یہی کوئی تین روز ہوئے۔" ——— "صرف تین!" ——— "خدا نے چاہا" ——— "اور خدا کا چاہنا بڑا ضروری ہے" ——— "تو ہفتے عشرے میں پہنچ جائے گا!" ——— "تو تار یہاں اس رفتار سے پہنچتے ہیں؟" ——— "جی ہاں! بشرطیکہ تائیدِ ایزدی بھی شامل حال ہو۔ اور اگر شامل نہ ہو تو ایک ہفتہ اور جمع کر لیں، بہرحال حکم!" ——— "اگر آپ کو تار مل جاتا تو اس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا کہ اس خاکسار مسمی محمد خاں کا ایئرپورٹ پر استقبال کیا جائے اور پھر کسی موزوں سے ہوٹل میں قیام کا بندوبست کر دیا جائے۔"

"آپ ایئرپورٹ سے بول رہے ہیں!" ——— "نہیں جناب! وہ منزل طے کر چکا ہوں۔ اس وقت پی آئی اے کے دفتر میں بول رہا ہوں"

"آپ ہمارا قصور دس منٹ تک اور معاف فرمائیں اور وہیں تشریف رکھیں۔"

بیروت میں بیوی ضائع ہونے کا خطرہ ہے

پورے دس منٹ کے بعد ایک خوبرو لبنانی نوجوان ہمارا نام پوچھتے پوچھتے پی آئی اے کے دفتر میں داخل ہوا ہمارے سامنے آکر کمر سے جھکا اور تقریباً نیم رکوع کی حالت میں پہنچ کر کہنے لگا: "خاکسار کو ولید کہتے ہیں" ——— ہم نے دل میں سوچا کہ اگر کہتے ہیں تو کیا حرج ہے۔ ولید نام کے لئے ۲۳ سالہ تعارف کی ضرورت تو نہیں کہ اعتراف گناہ معلوم ہو۔

---

[1] : حبیب بنک بیروت کے منیجر

[2] : پبلک اسکول ایبٹ آباد کے پرنسپل ایم اے رحمٰن

لیکن جلد ہی پتہ چل گیا کہ خدمت اس کا پیشہ ہے۔ اپنا تعارف جاری رکھتے ہوئے بولا: "میں فیاض صاحب کا اسسٹنٹ ہوں۔ انہیں ڈاکٹروں نے گھیر رکھا ہے اور کئی روز تک گھیرے رکھیں گے، مگر میں اُن کی زد سے محفوظ ہوں اور آپ کی خدمت کے لئے وقف کیا گیا ہوں" ــــــ پھر پورے پانچ منٹ فیاض کی طرف سے اور ایک مدت تک اپنی طرف سے نہایت ہی رقت خیز معذرت پیش کرتا رہا۔ جو ایک لبنانی کی معرّب انگریزی میں اور بھی درد انگیز محسوس ہوئی اور بیشتر اس لئے کہ اس کی انگریزی اچانک ایک عربی آہ کی شکل اختیار کر لیتی ہم نے اس کا ہاتھ تھپ تھپایا، مضمون تبدیل کرنے کی کوشش کی اور موضوع کو ہوٹل کے انتخاب پر لے آئے۔

ولید ساتھ کار لائے تھے۔ اس میں بیٹھ کر ہوٹل تلاش کرنا شروع کی۔ تلاش شروع کرنے سے پہلے ہمیں بتایا گیا کہ ہر چند کہ مرکزی بیروت میں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی کمی نہیں اور ہوٹلوں میں کمروں کا توڑا بھی نہیں، تاہم کمروں میں صاف بستروں کی شدید کمی ہے۔ ہم نے حیرت کا اظہار کیا۔ تو ولید نے ہمیں یاد دلایا کہ بیروت عالمی سیّاحوں، سراغرسانوں اور سمگلروں کی جنت ہے۔ اور موسم گرما میں جنت کا کوئی بستر خالی نہیں رہتا بلکہ اکثر اوقات ایک ایک بستر میں دو دو سوتے ہیں۔

ہمارے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا: "یہ بندوبست البتہ مناسب ہی معلوم ہوتا ہے" ــــــ ولید نے ایک لمحے کے لئے ہمیں غور سے دیکھا۔ پھر ادب میں تھوڑی سی شرارت ملا کر بولا: "سر! یہ بندوبست ہر مسافر کے لئے نہیں۔ یہ صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جو اپنی بیویاں ساتھ لاتے ہیں" ــــــ اور یہ کہتے ہوئے ظالم نے "بیویوں" کے لفظ پر اتنا زور نہ دیا جتنا "اپنی" پر۔ پھر ہماری دلجوئی کے طور پر کہنے لگا: "اگر آپ کا ہوٹل جنت کے مرکز کے بجائے جنت کے حاشیے پر واقع ہو تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟ وہاں بستر ملنا یقینی ہے۔"

کہا "اگر مرکزی بستروں میں گنجائش نہیں تو پھر کہیں سہی ؎

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

چنانچہ ولید ہمیں ایک حاشیائی ہوٹل بنام سیارا میز میں لے گئے جس پر کسی خانقاہ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے در و دالان کی بے کسی سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے محکمہ اوقاف اور محکمہ آثار قدیمہ کی مشترکہ تحویل میں ہو۔ منیجر سے، معاف فرمائیے مجاور سے بات ہوئی تو بولا: "کئی کمرے خالی ہیں، جو پسند آئے لے لیں" ــــــ ولید جھٹ بولے: "دیکھا، میں نہ کہتا تھا، یہاں فقط بستر ہی نہیں سالم کمرے خالی مل گئے۔ اس جگہ وہ مرکزی ہوٹلوں والی تنگیاں اور مجبوریاں نہیں۔ یہاں تو میاں بیوی کو باہم لڑنا بھی پڑیں تو علیحدہ علیحدہ کمروں میں سو سکتے ہیں۔"

یہ بات ہمیں بہت موافق نہ آئی۔ آخر ایسی سہولت کی کیا خوشی جس سے بیوی خفا ہونے کا امکان ہو۔ مسافرت میں ایک جگہ بیوی کو دیا بھی بڑا دیان ہے کہ یہی ہے وقت سفر خیر کا روان کے لئے: سو ایک سے زیادہ خالی کمرے سراسر مانع حقوق ازدواج ہیں۔ بہرحال ہم کہ تنہا سفر کر رہے تھے۔ خالی کمروں سے ایسے خائف نہ تھے چنانچہ ان میں سے ایک کمرہ چن لیا۔ اور داخل ہوئے تو ہر چند کہ بیشتر سامانِ ضرورت موجود تھا، تاہم ہر شئے سے غربت اور بے ثباتی ٹپکتی تھی۔ ہمیں ذرا آزردہ دیکھ کر ولید اپنے انتخاب کی صفائی میں بولے:

"مسٹر خان! چوبیس گھنٹوں میں سے رات کے چند گھنٹے گزارنے کے لئے یہ جگہ بُری نہیں۔ بہرحال آپ بیروت میں سونے کے لئے نہیں، سیر کرنے کو آئے ہیں۔ اور سیمارا میز کی رات کے باوجود آپ کے دن کا سویرا کا ذائقہ بالکل وہی ہوگا جیسا سینٹ جارجز ہوٹل کے مکینوں کا ـــــ"

اب ہمارا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جس شخص کی راتیں ویران ہوں اس کے دن شاداب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہم نے سیمارا میز کے باوجود اپنی رات میں ستارے ٹانکنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ جس سے ولید ابھی بے خبر تھے۔ لہٰذا ہم نے سامان رکھا اور ولید کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "ولید صاحب! اب آپ جا سکتے ہیں صرف یہ بتاتے جائیے کہ کیسینو لبنان کا ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے۔ ہم رات وہاں گزاریں گے" ـــــ ولید بولے: "ہمیں آپ کے کیسینو کے شوق یا پروگرام کا علم نہ تھا۔ نیازی تو آج شام آپ کی دعوت کرنا چاہتے ہیں" ـــــ ہم نے کہا: "ہماری اطلاع کے مطابق بیروت میں دیکھنے والی روٹی نہیں کیسینو ہے۔ نیازی کو شکریہ کے ساتھ یہ پیغام پہنچائیں کہ اگر کھانا ضروری ہو تو کل شب سہی۔ مگر دل آرا آج کی رات سازِ دل نہ چھیڑ کہ ہم سیرِ گل کا ارادہ رکھتے ہیں" ـــــ ولید نے ہمارے بہانے کی شوخی اور عزم کے تیور دیکھے تو سر جھکا کر تسلیم بجا لایا۔ اور ٹیلیفون اٹھا کر ہوٹل کے مجاور سے پکّی عربی میں بات کرنے لگا۔ پھر ہمیں بتایا کہ آپ کی کیسینو کی نشست بک ہو گئی ہے۔ کیسینو کی بس آپ کو ہوٹل سے لے جائے گی اور واپس بھی لے آئے گی۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور رخصتی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو بولے: "مجھے رخصت کرنے سے پہلے ایک سوال کا جواب دیں، کہ اب سے آٹھ بجے شام تک یعنی پورے پانچ گھنٹے تنہا کیا کریں گے۔ اور اگر ان پانچ گھنٹوں میں آپ کو تھوڑا سا بیروت دکھا دیا جائے تو کیا حرج ہے؟"

جٹّی نہا کے چھپڑ وچوں نکلی

ہم نے دل سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ولید کے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔ سیمارا میز سے نکل کر تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ سینٹ جارجز ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کا عکس نظر آیا اور جوں ہی ہماری نگاہ بارھویں منزل سے اترتی اترتی سطحِ زمین کے قریب پہنچی ہمیں ہوٹل کا نیلگوں "سوئمنگ پول"[1] رنگا رنگ چھتریاں اور سرخ و سپید جسم دکھائی دئیے۔
ولید بولے: "آئیے آپ کو ذرا اس مرکزی ہوٹل کا ذائقہ بھی چکھاتے جائیں" اور پھر سیدھے اس خالی میز کی طرف بڑھے جو نہانے والوں، نہانے والیوں اور تماشائیوں کے جمگھٹ میں سوئمنگ پول کے کنارے رکھی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور پھر گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف جسم ہی جسم دکھائی دیتے، برہنہ بے پردا جسم، سنسناتے تھرتھراتے جسم، بے تاب بے حساب جسم، جوانی سے چور اور زندگی سے بھرپور جسم!

اتنے میں ایک بیرا آیا، جس نے ولید کو پہچان کر سلام کیا۔ معلوم ہوا کہ ولید صاحب بھی اس حوض کے پرانے شناور ہیں۔ بیرا کوکا کولا لے آیا۔ ہم ہاتھوں سے آب اور آنکھوں سے شراب پینے لگے۔ ناگاہ ایک برقِ رقص نے ٹک کر۔۔ سوئمنگ پول کے نیلگوں پانی سے اپنا برّاق سینہ بلند کیا۔ اسے دیکھنا تھا کہ ہمیں دور سے آواز سنائی دی:

---

[1] (Swimming pool) نہانے کا تالاب

جنت ہمارے پیچھے چھوٹ گئی، خلف دی لات و رگی

اگلے لمحے میں اس شعلہ رو کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اسی لمحے ہم نے اپنے چہرے پر مار پیٹ کی سی شدت
محسوس کی کیا اس کی مسکراہٹ کا رُخ پیچ پیچ ہماری طرف تھا؟ اجنبیت کے باوجود ہم جواب میں دعا دینے ہی والے تھے
کہ ولید نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر نہ صرف جنبش بازو سے جواب دیا بلکہ چلا کر کہا: "لیلیٰ!" ـــــ اور ساتھ ہی ہمیں اطلاع
دی کہ "لیلیٰ میری دوست ہے" ہمارا وجد یک لخت تھم گیا کہ لیلیٰ کی مسکراہٹ کے مخاطب ہم (تھے) ہمارا ہم نشین تھا
گو یہ بھی کم دُکھ نہ تھا کہ ولید کی معرفت ایک دوسرے کی نسبت ہمیں بھی تھی۔ لیلیٰ کو غور سے دیکھا تو ظالم جس حد تک پانی سے باہر تھی
اگر بلا نہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ ہم ولید کی خوبیِ قسمت پر رشک کی ابتدا ہی کر رہے تھے کہ لیلیٰ آبی زینے سے چڑھ کر ایک نوخیز غزال
کی طرح رقصاں رقصاں ہمارے سامنے اور قریب آ کھڑی ہوئی اتنی قریب کہ نداب بے باکی سے آنکھ جھپکتے تو اس کے بھیگے
بدن کو پلکوں سے چھو لیتے۔ لیکن یہ آنکھ جھپکنے کا نہیں آنکھ کھولنے کا مقام تھا۔ اور دیکھا تو جو کچھ پانی کے اندر بھی تھی۔ اگر
قیامت نہ تھی تو کچھ نہ تھی اور قیامت بھی وہ جو عین سر پر آ کھڑی ہو۔ لیلیٰ نے ولید کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"آؤ نہائیں!" ولید بولے: "پہلے ان سے ملو، مسٹر خان، میرے مہربان" ـــــ بولی: "میرے بھی ہیں!" ـــــ
اور پھر ہماری طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ بھی آئیں مسٹر خان!" کہا: "شکریہ! میرے پاس تو نہانے
کے کپڑے نہیں!" ـــــ بولی: "یہاں بیدنگ سوٹوں کی کمی نہیں اور مرد کا بیدنگ سوٹ ہوتا بھی کیا ہے! ایک بالشت کپڑا!" ـــــ
اور مسکرا دی ـــــ ہم نے کہا: "جی ہاں! ظلم تو عورتوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ پونے دو بالشت کا سوٹ پہننا پڑتا ہے!"
بولی: "پہننا نہیں کسنا پڑتا ہے!" ـــــ اور پھر بیرے سے بولی: "بیرا! دو مردانہ کاسٹیوم لے آؤ" ـــــ ہم نے کہا:
"مس لیلیٰ دعوت کا شکریہ۔ مگر میں یہاں نہ نہا سکوں گا۔ ہمارے یہاں غسل پردے کا معاملہ ہے!" ـــــ بولی: "مگر ہم کوئی برہنہ
تو نہیں نہا رہے!" کہا: "محترمہ یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کی برہنگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے!"
بولی: "آپ کے ہاں کہاں سے شروع ہوتی ہے؟" ـــــ عرض کیا: "بھئی سچی بات ہے، اچھے ہاں تو ٹخنے سے شروع ہوتی
ہے اور اکثر اوقات سر سے پار ہو جاتی ہے۔ مگر آج کل آنکھوں پر بھی رُکنے لگی ہے!" ـــــ کہنے لگی: "تو انشا آپ ہم
کرے، آپ تشریف رکھیں۔ مجھے آپ کی پردہ داری منظور نہیں۔ مگر ولید تم؟" ـــــ ولید بولے: "آتا ہوں جان پردہ نشین ہیں۔
خدا حافظ!" لیلیٰ نے الوداع میں اپنے لمبے بازو کی تمام تر لمبائی کو ایک دل گداز سی جنبش دی۔ ساتھ ہی ہم دونوں پر ایک
متبسم نگاہ ڈالی جو ولید کے دل سے ہوتی ہوئی ہمارے جگر کے پار بھی ہو گئی۔ پھر رقصاں رقصاں لبِ آب تک پہنچ گئی۔
اور ایک کھلنڈری مچھلی کی طرح پانی میں اُتر گئی اور ہم مرکزی ہوٹل کا مزا چکھ کر ـــــ زبان سے کم، آنکھوں سے زیادہ ـــــ اُٹھ
کھڑے ہوئے اور ولید کی کار میں بیروت کی سڑکوں پر چل نکلے۔

جہنم میں سکائی سکریپر تعمیر کیے جائیں گے

ایک جگہ کار سے نکل کر بازار میں چند قدم چلے تو یک لخت احساس ہوا کہ ہمارا قد سکڑ کر بقدر [illegible]
رہ گیا ہے۔ ولید سے شکایت کی تو بولے:

• اللہ آپ کی سادگی قامت کا نگہبان ہو' آپ کا قد نہیں سکڑا' صرف دو نوں طرف کی عمارات بلند ہو گئی ہیں۔ یہ دائیں ہاتھ والی دس منزلہ ہے' بائیں ہاتھ والی پندرہ منزلہ' سامنے بائیس منزلہ اور ذرا آگے چالیس منزلہ۔ یہ بالشتئے' جو آپ کو فٹ پاتھ پر رینگتے نظر آرہے ہیں۔ بالغ مرد و زن ہیں اور وہ رینگ نہیں رہے' ہماری طرح پاؤں کے بل چل رہے ہیں۔"

ہم نے چاروں طرف دیکھا تو اس خشت و سنگ کے جنگل میں فقط ایک چیز بے وقعت نظر آئی ——— انسان! یعنی ان عمارات کا خالق مگر اپنی تخلیق اپنے فرینکنسٹائن (Frankenstein) کا صید زبوں ——— ہم نے ولید سے پوچھا "یہاں کہیں یک منزلہ مکان بھی پایا جاتا ہے؟" بولا" آج سے بیس برس پہلے کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ اب نہیں۔ یک منزلہ مکان رب العالمین کی رحمت ہے۔ اور بیروت اس رحمت سے محروم ہے۔

اس صورتِ حال کا آسان لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ بیروت کی ایک تہائی آبادی کے قدم تو زمین پر ہیں۔ مگر دوسری تہائی ہوا میں معلق ہے اور تیسری زینوں اور سیڑھیوں پر سے اتر چڑھ رہی ہے۔ اور ہر تہائی کا نصف بچے' بوڑھے اور بیمار ہیں۔ ان چہل منزلہ مکانوں کے مکینوں سے کوئی دل کی پوچھتا تو یقیناً فریاد کر اٹھتے کہ خدارا نکالو ہمیں ان خوبصورت قید خانوں سے۔ ہماری خواہش فقط اتنی ہے کہ دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔ ہم نے ولید کی رائے پوچھی تو بولا :" میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جہنم میں رہنے کو سکائی سکریپر ملیں گے ورنہ عذاب کا منشاء پورا نہ ہو سکے گا۔

ہم نے یہ سنا تو پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے اور پھر وہیں سے یعنی بیروت کے بازار ہی سے کھڑے کھڑے اہلِ وطن کو پکارا۔ "کہ اے خاک نشینانِ پاکستان' مژدہ ہو کہ آپ یا آپ میں سے اکثر ابھی اس حد منزلیت سے محفوظ ہیں۔ جو اہلِ بیروت کا مقدر بن چکی ہے اور اے کوچہ گردانِ وطن مبارک باشد کہ خواجۂ بلند بام نا فرجام ہے۔ اور اس بے توفیق مسخرے پر رحم کھاؤ کہ فراخئ زمین سے محروم اور تنگئ بام میں محبوس ہے "!

وقت گزر رہا تھا ولید نے کار تیز کی اور بیروت کے بام و در فلمی تصاویر کی طرح جھلک دکھا کر غائب ہونے لگے۔ لیکن ایک گلی سے دوسری گلی میں مڑنا یوں لگتا تھا' جیسے ایک سرنگ سے نکل کر دوسری سرنگ میں داخل ہو رہے ہوں ——— یا اللہ ——— دفعتاً منہ سے دعا نکلی :" تیری ہموار زمین پر یہ ناہموار عمارات کبھی ختم یا ذرا پست بھی ہوں گی ؟" ——— دعا ابھی لب پہ ہی تھی کہ جواب آیا :" مایوس نہ ہو' کھول آنکھ' زمین دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ" اور کیا دیکھتے ہیں کہ دفعتاً کار ساحل سمندر پہ آ نکلی ہے۔ کار سے نکل کر شکر کا ایک لمبا سانس لیا۔ اور خشت و سنگ کے ظالم بوس ہمالوں کی طرف پشت کر کے اپنی نگاہوں کا دامن سطحِ آب پہ پھیلا دیا۔ اس سیالِ زمرد کی دید سے اعصاب کو وہ سکون محسوس ہوا گویا پراگندہ بدن پہ الزبتھ آرڈن اپنے ہاتھ سے کولڈ کریم مل رہی ہے۔

کسینو کی دنیا ستاروں سے ذرا آگے ہے۔

لیکن وقت بدستور گزر رہا تھا۔ لوٹ کر سیمارامیز میں آئے' ولید رخصت ہوئے ہم نے غسل کیا کپڑے

آتشیں تن ہی نہیں، آتشیں بدن بھی ہے کہ صرف ستر ہی نہیں، کل بدن کھلا ہے!" بہرحال ہم پر منکشف ہوا کہ کسینو کی دنیا صرف ستاروں ہی تک محدود نہیں، یہاں ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں اور یہ جہاں تھے بے حجاب لالہ رخوں، اور بے لباس سمن بروں کے جو بستیاں، بکینی یا بودُس سے یکسر پاک تھیں۔ یہاں جلوہ کا دربار بے جامہ ہی انجام پاتے تھے بلکہ ہر عمل کے پیچھے یہ مبارک مگر مشکل جذبہ کارفرما تھا کہ زاویوں اور وتروں کو واضح تر کرنے کا کوئی راز سینۂ کائنات میں باقی ہو تو اسے کس طرح آشکارا کیا جائے اور بے شک خداوندانِ کسینو اس عقدہ کشائی میں ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر اُترے اور اس اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہرے جو ہم سے پیشگی وصول کر لیا تھا۔

لیکن جدت فقط نمائشِ حسن ہی میں نہ تھی، جلوہ گاہِ حسن میں بھی تھی۔ اگر پیشِ منظر حسنِ نسوانی کا نگارخانہ تھا تو پس منظر رنگ و مسرت کا حیرت کدہ۔ وہ پردہ اُٹھتے ہی دیو دار بھرے کہساروں کا اُبھرنا، وہ فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی آبشاروں کا گرنا، وہ دشت و صحرا سے لدے ہوئے گنڈولوں کا نہروں سے گزرنا، وہ زہرہ جبینوں سے بھرے ہوئے آڑن کھٹولوں کا آسمان سے اُترنا، وہ چنگ و رباب اور نغمہ و نشاط کے پھیلتے ہوئے ریلے، وہ رنگا رنگ روشنیوں کے بدلتے ہوئے جیلے، وہ بے حجاب تماشائیوں کی خود فراموشی، وہ بے تاب جوڑوں کی ہم آغوشی، وہ .... خیر جانے دیں کہ اس سے آگے کی کیفیت بیان کرنے کے لئے کسی جوش یا عدم کی ضرورت ہے۔ ہم تو فقط تماثر جوس پی کر گئے تھے ــــــ ارے، محویت میں ہمیں وقت کا ہوش نہ رہا۔ رات کے دو بج چکے ہیں۔ تماشا ختم ہونے کو ہے۔ وہ حسینانِ کسینو رخصتی سلام کر رہی ہیں۔ اور دیکھیں کہ ہماری ہم نشین بھی چونک کر آنکھیں مل رہی ہیں لیکن ہماری ہم نشین کا دورانِ تماشا سو جانا غلبۂ خواب کا نتیجہ نہیں۔ غرورِ حسن کا تقاضا ہے۔ کیونکہ موصوفہ نے اپنے من میں ایک پرائیویٹ کسینو بسا رکھا ہے۔ بہرحال ہم جاگے ہیں، آپ بھی جاگیں اور اُٹھئے کہ اب تو لذتِ خواب سحر گئی۔

واپسی پر بھی کسینو سے لے کر سیاوا میز تک پھر وہی رشکِ حور شریکِ نشست تھی یہ دو طرفہ شبینہ نعمت بے شک غیر مترقبہ تھی۔ لیکن اس نعمت میں نیند کا سکون شامل نہ تھا۔

یاد کر میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا :: رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا۔

ڈرائیور موٹر اور مافیہا سے بے خبر تھا

اس طویل شب بیداری کے بعد سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو ساتھ ہی مادام سیاوا میز بھی ناشتہ لے کر نمودار ہوئیں۔ ہم نے کہا "مادام اس قدر سویرے ــــــ" بولی: "یہ سپیدۂ سحر نہیں، سپیدۂ دوپہر ہے۔ اور ناشتہ ہی نہیں، عبدالرحمن بھی ایک مدت سے آپ کی بیداری کا منتظر ہے" ــــــ اور ساتھ ہی ایک خوش رو نوجوان نے دروازہ سے جھانکا شکل و صورت سے یکسر زادہ لگتا تھا۔ ہم نے انگریزی میں پوچھا: "آپ کی تعریف؟" نوجوان اُردو میں بولا: "میں فیاض صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ آپ کے لئے کار لایا ہوں۔ شاید آپ بیروت یا نواحِ بیروت کی سیر کرنا چاہیں" ہم نے کہا: "اچھا تو آپ پاکستانی ہیں؟" بولا: "جناب معاف رکھنا میں لبنانی ہوں" ــــــ "لیکن آپ اُردو بڑی روانی سے بولتے ہیں" ــــــ "جی ہاں: فیاض صاحب سے بول بول کر روانی ہو گئی ہے"

دیکھا تو اس کے چشم و رخسار میں بھی ایک رنگ و روشنی کا سلسلہ نظر آیا کہ قریب زبیدہ کی ذات نہاں تھی۔ پھر ایک وہ لی کے پاس سے گزرتے ہوئے رحمٰن کار ٹھہرا کر دروازے کی سمت میں چلا گیا "زبیدہ"؟

اور دروازے کے دروازے پر ایک حور شمائل آ کھڑی ہوئی۔ ہم سے اجازت لئے بغیر رحمٰن اُڑ کر دروازے تک گیا اور زبیدہ کا ہاتھ تھام کر ایک عالم بے خودی میں موٹر کار و مافیہا سے بے خبر زبیدہ کو دیکھنے لگا۔ ہم نے بھی زبیدہ کو دیکھا اور پھر رحمٰن کی تمام تر بے تابیاں، بے صبریاں اور بے ادبیاں سراسر جائز نظر آنے لگیں۔ ہماری منزل چند سو گز رہ گئی تھی۔ رحمٰن زبیدہ سے عربی میں کچھ کہہ کر پھر کار میں آ بیٹھا اور کھنڈروں کے قریب ہمیں ایک گائیڈ کے حوالے کرنے کے بعد دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حریم ناز کو پرواز کر گیا۔

پروہتوں میں محبت کے میچ ہوتے تھے

گائیڈ بعلبک کی تاریخ بیان کرنے لگا۔ لیکن جب سیاح اپنی آنکھوں سے تاریخ دیکھ رہا ہو، اُسے تاریخ سننے کی حاجت نہیں رہتی۔ اور جس فصاحت سے جوپیٹر مندر کے چوالیس میں سے چھ پس ماندہ گردش کش ستون اپنی دو ہزار سالہ داستان بیان کر رہے تھے۔ اس کے سامنے گائیڈ کی زبان قلیل کمال کرتی محسوس ہوتی تھی۔ تاریخ ان معبودوں کو پگین Pagan یعنی بے کتاب عہد کی یادگار کہتی ہے۔ لیکن اس سے ان کی عظمت، ان کی شوکت اور شان دل آویزی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گفتۂ غالب ایک ازلی سچائی معلوم ہوتی ہے۔ کہ وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے۔ خواہ یہ وفا خدائے واحد سے ہو۔ جو اہلِ کتاب کا عقیدہ ہے۔ یا خدایانِ متفرق سے، جو پگین انسانوں کا عقیدہ تھا۔ انسان کا جذبۂ عبودیت ایک ہی ہے۔ فقط اُس کا رُخ بدلتا رہتا ہے۔ اسی ذوقِ عبادت کی تسکین کے لئے انسان نے کبھی اہرامِ مصر تعمیر کئے کبھی معابد، موہنجو داڑو، کبھی منادرِ بعلبک اور کبھی کلیسائے روم اور بالآخر خدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھی ——— معاف کیجئے گا بعلبک کے کھنڈروں کی دلآویزی میں کھو کر ہم اپنی توفیق سے بڑھ کر عالمانہ باتیں کرنے لگے۔ اور پیشتر اس کے کہ یہ موضوع ہمیں اور آپ کو دوبارہ گاڑھی فلسفیانہ دلدل میں دھکیل دے، آئیے، صاف ہوا میں نکل کر گائیڈ کی باتیں سنیں۔ جو زیادہ عام فہم ہیں۔ گائیڈ کی آواز آئی۔

"خواتین و حضرات! ——— یہ جوپیٹر کے مندر کے ساتھ باخوس کا مندر ہے اسے شراب کا مندر بھی کہتے ہیں۔ کہ یہاں شراب نوشی کی رتھیوں میں، مے نوشی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ہی وینس یعنی محبت کی دیوی کا مندر ہے۔ کہ یہاں اول پروہتوں میں محبت کے میچ ہوتے تھے۔"

"محبت کے میچ"! ایک ہپی نما سیاح نے چونک کر پوچھا لیکن اندازِ سوال میں استفسار کم تھا اور تائید زیادہ ——— "جی ہاں!" گائیڈ نے جواب دیا۔ شہر کی تمام دوشیزاؤں پر پہلا حق پروہتوں کا ہوتا تھا۔ اور اس حق کا استعمال اس مقدس مندر کے منڈپ پر سرِعام ظہور میں آتا تھا۔ جو دوشیزہ قوم اس اعزاز یا اس عبادت سے محروم رہتی ہمیشہ کے لئے ننگِ ملت تصور ہوتی۔

صرف ایک اور فلسفہ کی مختصر سی بات ..... یہ [illegible] یہ اولاد نہیں مرے ان کے فرزند آج بھی موجود ہیں۔ جو اپنے آبائی فرائض کو معمولی ترمیم کے ساتھ بدستور انجام دے رہے ہیں۔ یعنی جو کچھ وہ مندروں میں برملا کرتے تھے، معبود ول

میں چھپ کر رہ گیا ہے ـــــ "چوں وقت ملاقات ما بماند اسیر وصل گشتند"

بہر حال آئیے ، آثارِ بعلبک سے رخصت ہوں کیونکہ بڑے فلسفہ آدم ملاقات ہو رہے ہیں اور اگر ہمارے کچھ فلسفہ کا رد و انسی بچے پر دست کے ماتھے پر جا لگا تو فساد کا اندیشہ ہے لہٰذا بہر حال ہمارا مسلک فتنہ نہیں محبت ہے۔ وہ دیکھیں بچی سیاح نے اپنے ساتھی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور وہ دونوں دنیش ورلڈ کے حضور محبت کے منظر میں مبہوت کھڑے ہیں۔ صرف ایک لمحہ ٹھہریں اور ہمیں سنیپ شاٹ لینے دیں۔ کلک !

ہم نے تصویر کے کیمرہ شانے سے ہٹایا اور ذہن سے فلسفہ کی کدورت نکال کر سیدھے سادے خلف کا رستہ ہمارا انسان بن گئے۔ کیونکہ فلسفہ بگھارنے وقت عمر خیام نے کئی مرتبہ ہمارے کان میں سرگوشی کی تھی کہ : آں کس کہ گناہ ذکر چوں زلیست بگو ۔ اور ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ ساتھیوں کے ساتھ ہنستے ، گنگناتے ، کھنڈرات سے باہر نکلے ـــــ آگے مسٹر اور ہونے والی مسز عبدالرحمٰن کار سے ٹیک لگائے ہمارے انتظار میں مگر ہماری موجودگی سے غافل محو اختلاط و انبساط تھے۔ ہم نے بھی کرشاکر کے ایک مصنوعی چھینک ماری ، اگرچہ دل نے اس حرکت پر ہمیں ہزار ملامت کی۔ محب اور محبوب کی ملاقات کائنات کا حسین ترین منظر ہے ۔ اور اس ملاقات میں مخل ہونا گویا۔ تاج محل ڈھا دینا ہے ۔ ہر چند کہ ہمارا احساسِ ندامت شدید تھا۔ تاہم یہ بدحواسی ہو چکی تھی۔ جواب میں ایک دم چونک اُٹھنے کے بعد رحمٰن نے مسکرا کر اور زبیدہ نے شرما کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ اور ہم اُنھیں آشیرباد دے کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ اور ذرا قریب قریب اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ ہر چند کہ ہم اس وقت پڑھنے کے موڈ میں نہ تھے تاہم ہم نے جیب سے سفید کاغذ نکال کر بیخودی سے پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد کار ہیسہ زبیدہ کے گھر کے سامنے رُکی اور زبیدہ نے رحمٰن کے ایما سے ہمیں دعوت چائے دی۔ رحمٰن لمحاتِ ملاقات کو تا بحد امکان طویل کرنا چاہتا تھا۔ ساتھی رحمٰن نے ایک بار پھر سبکتگین کی ہرنی کی طرح دیکھنا شروع کیا۔ گویا زبیدہ کی دعوت میں اپنی خاموش تائید بھی شامل کر دی۔ ہم نے آسمان کی طرف دیکھا تو قدرت کا اشارہ بھی یہی تھا کہ زنہار جو دو چاہنے والوں کی تدبیرِ وصل میں حارج ہوئے۔ ناچار دعوتِ چائے قبول کی۔ اور بعد میں ہر چند کہ بے دستہ پیالیوں میں قہوہ پینے سے انگلیاں جل اُٹھیں تاہم جگر میں ٹھنڈک محسوس ہونے لگی کہ تاج محل دوبارہ تعمیر ہو رہا تھا۔

بعلبک کی سیر سے فارغ ہوئے تو سیدھے ہوٹل پہنچے۔ عبدالرحمٰن کو چھٹی دی اور لبنان کا پہلا خاموش لنچ کھایا۔ صبح کے ہنگاموں کے بعد یہ خاموشی ہمیں بڑی موافق آئی۔ لیکن کھانے کے بعد ستانے کی سوچ رہے تھے کہ لیڈر ڈاکٹر وہ تشریف لائے ۔ وجہ نزول پوچھی تو بولے "آپ کو یاد دلانے آیا ہوں" ـــــ "جی ہاں ! ڈنر ! دیکھیے بھول سکتا ہوں ؟" ـــــ "ہوں ! جناب ! ڈنر تو رات کی بات ہے ۔ فیاض صاحب کا ارشاد ہے ، چار بجے بنک میں تشریف لائیں ، ہمارا بنک بھی دیکھیں لہٰذا چائے بھی پئیں ۔" زبانی تواضع کی بجائے چائے پلانا بھی بےشک بہتر خدمت ہے ، لیکن اس کا دیر کے لئے چار بجے طلب کرنا بہتر خدمت کی بہترین مثال نہیں۔ خصوصاً اس تھکے ماندے مہمان کو جو بے محابا اور بے طاقت آنے سے رہا ہو۔ مگر عذر کرنا گناہ تھا۔ ناچار ایک منہ توڑ جماہی سے جسم سیدھا کر کے کہا "حاضر جناب" ۔

ڈاکٹر بولے "ٹھیک ساڑھے تین بجے پندرہ منٹ پر رحمٰن گاڑی لے کر آئے گا ۔ تیار رہیئے گا " اور ہم سو رہے

کم سے کم ضروریات کی تکمیل کا پروگرام

کم سے کم ضروریات کی تکمیل کے پروگرام کے تحت ترقی اور منصوبہ بندی کے فوائد کو اندھرا پردیش کے غریب عوام تک پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے لئے معینہ مدت کے اندر تکمیل پا جانیوالی اسکیمات تیار کی جارہی ہیں۔

یہ پروگرام دیہاتوں کو بجلی کی سربراہی، ابتدائی تعلیم کی سہولتیں پرائمری ہلتھ سنٹروں کا قیام، دیہات میں پانی کی سربراہی، گندی بستیوں کی ترقی اور دیہات میں سڑکوں کی تعمیر وغیرہ پر مشتمل ہے۔

مذکورہ پروگرام کے تحت پانچویں منصوبے میں ۵۶۰۵. کروڑ روپے مختص کئے گئے تھے جس میں سے ۹۴۶۳۴ کروڑ روپے خرچ کئے جاچکے ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ

40/78-79

خواجہ عبدالغفور

ظالم شراب

نشہ دولت کا ہوتا ہے، حُسن کا ہوتا ہے۔ علم و دانش زہد و تقویٰ اور سب سے بڑھ کر شراب کا نشہ ہوتا ہے۔ ویسے تو شراب دیگر مشروبات کی طرح بے ضرر سیدھی سادی شئے ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ زیادہ تر انگور کے رس کو گلا سڑا کر بنائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو بنتِ عنب کہتے ہیں۔ اس کا نام دخت رز بھی ہے۔ لیکن یہی ام الخبائث بھی کہلاتی ہے۔ جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ مسکن مفرح اور مہنگی ہوتی ہے جب زیادہ پی لی جاتی ہے تو حالت سکر میں انسان کا رویہ بدل جاتا ہے۔ کوئی بہت ہنس مکھ حاضر جواب خوش مذاق ہوجاتا ہے۔ کوئی دکھی ملول اور رونہار بن جاتا ہے۔ کوئی بزدل کوئی عالی ظرف کوئی بدکار فحش جھگڑالو اور سنکی بن جاتا ہے۔ کوئی فلسفی کوئی شاعر، غرض کہ ہر بادہ خوار اپنی انفرادیت ظاہر کرتا ہے۔

جاپانی کہاوت ہے، آدمی پہلے شراب پیتا ہے۔
پھر شراب شراب کو پیتی ہے۔
اس کے بعد شراب آدمی کو پیتی ہے۔

جب کوئی شراب پیتا ہے تو اس کو لگتا ہے کہ وہ اپنے اختیار اپنی مرضی اپنی پسند سے پی رہا ہے۔ کچھ دیر عالم سرور میں اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ حالانکہ ذائقہ تلخ اور ناگوار ہوتا ہے۔ اور جب جام و سبو کا دَور چل پڑتا ہے تو آدمی کے ہوش و حواس قابو سے باہر ہوجاتے ہیں اور پیٹ کی شراب مزید شراب کا تقاضا کرتی ہے۔ پینے والا مجبور محض محسوس کرتا ہے اور اس تقاضا کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بالآخر یہ نوبت آتی ہے کہ شراب کا پلہ بھاری ہوجاتا ہے۔ اور انسان اتنا کمزور پڑجاتا ہے کہ شراب اس پر غالب آجاتی ہے۔ اور لگتا ہے ایسے وقت اس کی بات چیت میں سلیقہ نہیں رہتا۔ زبان لڑکھڑاتی ہے۔ بولنا کچھ ہوتا ہے بات کچھ نکلتی ہے۔ کبھی گالی گلوچ کبھی مار پیٹ کی نوبت آجاتی ہے۔ بے حساب پینے والے غالب کے اس شعر میں اپنی تسلی کا سامان پاتے ہیں ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

جگر مراد آبادی فرماتے ہیں ؎

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پئے جارہا ہوں میں!

کبھی شراب انسان کو بہادر اور نڈر بنا دیتی ہے۔ پینے کے بعد بہت سارے لوگ اپنے آپ کو سورما اور اولوالعزم سمجھنے لگتے ہیں۔ فوج کا ایک نوجوان کپتان شراب نوشی کی علت میں مبتلا تھا۔ ویسے اپنے کام میں ہوشیار تھا اور فرائضِ منصبی میں کبھی کوتاہی نہ کرتا لیکن اس بری عادت کی وجہ سے اس کے چال چلن پر دھبہ لگ چکا تھا اور ہدایت و تنبیہ کے باوجود اپنی عادت کو نہ بدلنے کی وجہ سے اس کو ترقی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ بوقتِ معائنہ اس کی کارگزاری سے خوش ہو کر کمانڈر ان چیف نے کہا ــــ "تم شراب نوشی سے توبہ کر لو تو ہم تمہیں آج ہی ترقی دے کر کرنل بنا دیں گے"۔ نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا ــــ "جناب والا مجھے بادہ خواری چھوڑ کر کرنل بننے کا کچھ شوق و ارمان نہیں اس لئے کہ جب میں پی لیتا ہوں تو فیلڈ مارشل بن جاتا ہوں"۔

اسی فلسفہ کو خمار صاحب دوزخ اور فردوس کی باتیں کرنے والوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

کون سی جنت کا واعظ کر رہا ہے ذکر تو
ایسی اک جنت تو ہم رندوں کے مے خانہ میں ہے

ہر انسان کی فطری طور پر اور کچھ جسمانی اعتبار سے مے نوشی کی حدیں خود بخود مقرر ہو جاتی ہیں اور اس حد تک وہ لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ فوج میں سرِ شام شراب کے دو چار دور ہی چلنے کے بعد ایک معمر اور خرانٹ قسم کے اعلیٰ عہدہ دار اپنے ماتحت افسروں کو سمجھا رہے تھے کہ معقول طریق پر شراب نوشی کچھ بری نہیں بشرطیکہ ہر شخص اپنی حد کو دھیان میں رکھے اور اس بات پر سختی سے عمل پیرا ہو کہ جس قدر وہ پی کر اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکتا ہے اسی قدر پئے اور اس کے بعد جام کو ہاتھ نہ لگائے۔ اس بات پر شدومد کے ساتھ عمل کر سکنے کے لئے انھوں نے آسان طریق کار یہ بتایا کہ جیسے ہی چھت پر لگے چار بلب کے آٹھ دکھنے لگیں آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اپنی حد کو پہنچ چکے ہیں۔ افسروں نے چھت کی طرف نگاہ ڈالی تو وہاں پر صرف دو بلب لگے تھے ؎

ساقیا عکس پڑا ہے جو تیری آنکھوں کا
اور دو جام نظر آتے ہیں پیمانے میں

شراب کی دکان اور بار کا مالک رات کو اپنے بستر پر آرام سے سو رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور کسی نے پوچھا، "کیا عمر خیام بار کے مالک بول رہے ہیں؟" انھوں نے جب ہاں کہا تو دوسری طرف سے کسی نے پوچھا "آپ بار کب کھولتے ہیں؟" انھوں نے بتایا ــ "بار صبح گیارہ بجے کھلے گا"۔ اور فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد پھر گھنٹی بجی اور فون پر وہی سوال دہرائے گئے۔ مالک نے بیزارگی کے عالم میں پھر سے وہی جواب دیئے اور کھٹ سے فون رکھ دیا۔ آدھے پون گھنٹے کے بعد فون کی گھنٹی پھر سے بجی اور نیم مدہوشی کے سرور میں اس آواز نے سوال کیا :

"ارے بتاؤ تو تمہارا بار کب کھلے گا؟"

بے چارے مالک نے جھنجھلا کر کہا :

"تمہیں یہ کیا فکر لگی ہے۔ بتاؤ تو کیا کام ہے۔ کیوں مجھے تنگ کرتے ہو۔ اگر تمہیں شراب چاہئے تو میرے گھر چلے آؤ میں تمہیں ایک آدھ بوتل دے سکتا ہوں!"

دوسری طرف سے جواب ملا :

"کس کم بخت کو شراب کی کمی ہے۔ یہاں پر تو ہر قسم کی شراب بے حساب رکھی ہے اور میں نے بھی جی بھر کے پی رکھی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں تمہارے بار کے اندر بند ہوں۔ بار کا دروازہ جب تک باہر سے کھلے گا نہیں میں یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اس لئے بار بار تم سے

پوچھ رہا ہوں کہ آخر تم یہ فلاں کمرے میں کب آ گئے : غالب نشہ میں یہ صاحب اندر ہی اندر بند ہو گئے تھے ۔ اور اب انھیں باہر جانے کا کھلا راستہ چاہیے تھا ۔ انتہائی نشہ کے عالم میں بھی لوگ اپنے مطلب کی بات کو نہیں سمجھتے ۔ اس قدر ان کے ہوش و حواس برقرار رہتے ہیں ۔

بادہ نوش ضروری نہیں کہ بلانوش ہوں ۔ رندوں کا سلیقہ اور ضبط و تنظیم قابلِ تعریف ہوتے ہیں ۔ دیکھا گیا کہ ایک صاحب روزانہ مقررہ وقت پر کلب آتے ۔ تنہا ایک میز پر بیٹھتے ' اور شراب کے دو گلاس کا آرڈر دیتے ۔ باری باری سے ہر گلاس میں سے ایک دو گھونٹ لیتے اور پھر اس کو رکھ کر دوسرے گلاس کو منہ لگاتے ۔ اس طرح جب دونوں گلاس خالی ہو جاتے تو نئے سرے سے دو گلاس کا آرڈر دیتے ۔ اور یوں اپنا دل بہلاتے ۔ ان کو کئی دن اس طرح پیتے دیکھ کر ایک صاحب پوچھ بیٹھے : لوقتِ واحد میں دو گلاس آرڈر کرنے کا کیا مطلب ہے ؟ انھوں نے بڑے دکھ اور دلی غم کے اظہار کے ساتھ بتایا کہ ان کے ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا اور وہ دونوں مدتوں ہم نوالہ و ہم پیالہ اور ہم مشرب رہے ۔ اپنے دوست کی موت کے بعد بھی انھوں نے اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے یہ عادت بنائی ہے کہ اس کا اور اپنا جام ایک ساتھ میز پر رکھ کر اس کے حصے اور اپنے حصے کی شراب پی لیا کرتے ۔ جواب معقول تھا ۔ لوگوں نے ان کے دوستی کے حق ادا کرنے پر ان کی تعریف کی اور ان کی طرف سے توجہ ان ہٹا دیا ۔ کچھ دنوں بعد اتفاقاً کسی کی نظر پڑی تو دیکھا کہ یہ اسی میز پر ہمیشہ کی طرح تنہا بیٹھے ایک ہی گلاس سے پی رہے ہیں ۔ تعجب سے پوچھا ایسا کیوں ؟ شراب پینے والے صاحب نے کہا بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کے منع کرنے پر میں نے شراب پینا ترک کر دیا ہے ۔ البتہ [illegible] دوست کا حق تو ابھی ادا کر رہا ہوں ۔ اس لئے صرف اس کے حصہ کی شراب آرڈر کرتا ہوں اور اس کا حصہ پی لیتا ہوں ۔

ایک صاحب بار میں آئے ' میز پر بیٹھے اور بیئر کا گلاس آرڈر کیا ۔ جب بیرا نے بھرا ہوا گلاس ان کی میز پر رکھا تو بڑی دیر تک اس کو بغور دیکھتے رہے اور نظروں سے لطف اندوز ہوتے رہے ۔ لیکن گلاس کو منہ نہیں لگایا ۔ کچھ دیر بعد گلاس ہاتھ میں لئے ' وہ ٹوائلٹ روم گئے اور خالی گلاس لئے ہوئے واپس آئے ' اپنی میز پر براجمان ہوئے اور بیرا کو پکار کر ایک گلاس اور آرڈر کیا ۔ جب آرڈر کے مطابق گلاس آیا تو اس کو بھی اسی طرح دیکھتے رہے اور جب دیکھنے سے جی بھر گیا تو اسی طرح گلاس ہاتھ میں لئے ٹوائلٹ روم گئے اور خالی گلاس کے ساتھ واپس آ گئے ۔ جب انھوں نے دو چار بار یہی حرکت کی تو برابر کی میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے پوچھا :

" یہ کیا ماجرا ہے کہ آپ بھرا گلاس لے جاتے ہیں اور خالی گلاس لے کر واپس آتے ہیں ؟ "

انھوں نے بڑے فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں بتایا :

" دیکھئے آپ سب حضرات بھی تو وہی کرتے ہیں جو میں کر رہا ہوں ۔ فرق یہ ہے کہ آپ اپنی شراب کو پی کر پیٹ میں ڈالتے ہیں اور پھر ٹائلٹ روم جا کر اس کو خارج کر دیتے ہیں ۔ ایک طرح سے آپ محض ایک درمیانی واسطہ کا کام کرتے ہیں ۔ میں نے سوچا کہ یہ واسطہ کیوں رکھا جائے ' کیوں نہ راست اس شراب کو وہیں پر پہنچا دیا جائے جہاں آپ اس قدر جھمیلے کے ساتھ پہنچاتے ہیں ۔ آپ اپنے بدن کے [illegible] صرف [illegible] یہ بار کرتے ہیں [illegible]

کرتا ہوں ، حقیقت قائم رکھتا ہوں "

شراب میں وہ طاقت وہ اعجاز ہے کہ زمان و مکان کے فاصلے لمحوں میں طے ہو جاتے ہیں ۔ جو اوجھل ہے وہ آشکارا ، جو دور ہے وہ قریب ، جو دل میں ہے وہ زبان پر یہ ایک حقیقت ہے ۔ آدھی رات گئے پولیس کے حوالدار نے ایک صاحب کو بیچ سڑک پر کھڑے دیکھا ۔ سوچا کہ یہ سڑک پار کر کے آگے چلا جائے گا ۔ لیکن بہت دیر تک اس کو اپنی جگہ سے ہلتے نہ دیکھ کر یہ قریب گیا اور پوچھا :

" کیا بات ہے جناب یہ آپ اس قدر رات گئے سڑک پر کھڑے کیا کر رہے ہیں ۔ گھر جائیے ' یا مجھے پتہ بتائیے تو گھر پہنچا دوں "

نشہ کے عالم میں لڑکھڑاتے قدموں کو ٹھیک کر کے انھوں نے جواب دیا :

" حوالدار صاحب بات یہ ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں ساری عمارتیں گھوم رہی ہیں اور میرے اطراف چکر کاٹ رہی ہیں ۔ اس انتظار میں ہوں کہ اس گھما گھمی میں میرا گھر بھی سامنے آجائے تو بس میں جھٹ سے اندر ہی جاؤں ' چل کر جانے کی زحمت سے بچ جاؤں گا "

من چلوں ' بادہ مستوں کی ایک محفل میں جب کافی جام پئے جا چکے تو کسی نے چیلنج کیا کہ جو کوئی چھ بوتل بیر ایک ساتھ پئے گا اس کو ۱۰۰ روپیہ انعام دیا جائے گا ۔ چونکہ سب کچھ زیادہ ہی بدمست ہو چکے تھے اس چیلنج کو قبول کرنے میں ہچکچانے لگے ۔ ایک باہمت باظرف شخص نے جو اوروں سے کچھ زیادہ ہی پیا تھا اس چیلنج کو قبول کیا ۔ سب طرف سے واہ واہ ہوئی ۔ اس شخص نے کچھ مہلت مانگی اور کلب سے اٹھ کر باہر چلا گیا ۔ کچھ دیر تو اس کا انتظار ہوتا رہا ' پھر لوگوں نے سوچا کہ وہ ہمت ہار کر چلا گیا اور اب واپس نہیں آئے گا ۔

تھوڑی دیر میں اس کو لڑکھڑاتے قدموں سے آتے دیکھ کر سبھوں نے خوب تالیاں بجائیں اور وہ بھی ڈٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا ۔ اور کہا

" لائیے آپ کی چھ بوتلیں ۔ میں ابھی پی کر بتاتا ہوں "

چیلنج دینے والے نے پوچھا — یہ تو بتائیے کہ آپ اتنی دیر کہاں غائب رہے ؟ — اس شخص نے بتایا :

" تم کیا سمجھے کہ میں منہ چھپا کر بھاگ گیا تھا ' ہرگز نہیں میں تو دوسرے بار میں جاکر امتحاناً چھ بوتلیں پی کر آیا ہوں "

بادہ خوروں کی محفل میں بحث ہو رہی تھی کہ کون سی شراب اچھی ہوتی ہے ۔ اور کس کی پسند کیا ہے ۔ کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ ۔ ایک صاحب نے کہا :

" بھئی شراب تو وہی سب سے عمدہ ہوتی ہے جو کسی اور کے پیسوں سے خریدی گئی ہو چاہے وہ کسی برانڈ کی ہو "

کلب میں داخل ہوتے ہی ایک صاحب نے اعلان کیا کہ جب میں پیتا ہوں تو سب ہی میرے ساتھ پیتے ہیں اور سب کی طرف بتا کر کہا کہ پلاؤ ان کو یہ سب پئیں گے "

اور جب سب پی چکے تو اس شخص نے اپنے جیب سے روپے نکالے اور پھر اعلان کیا :

" جب میں اپنی شراب کے دام چکاتا ہوں تو سب ہی اپنا اپنا بل ادا کرتے ہیں "

ایک شخص اپنے آپ کو خراب شاعر سمجھتا تھا ۔ اس کا

دعویٰ تھا کہ وہ کسی بھی شراب کو صرف چکھ کر یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کس چیز کی بنی ہے۔ کتنی پرانی ہے اور اس کا برانڈ کیا ہے — اس بات پر شرط بند گئی۔ اس سے چھپا کر گلاس میں ڈال کر مختلف قسم کی شرابیں یکے بعد دیگرے اس کو پلائی گئیں۔ ہر وقت اس نے صحیح صحیح بتایا کہ وہ کون سی کس نام کی اور کہاں کی بنی ہوئی شراب ہے۔

کئی تجربوں کے بعد بھی جب یہ لگا کہ شرط ہاری جارہی ہے تو ایک گلاس میں صرف پانی ڈال کر اس کو پلایا گیا۔ اس نے اس کے کئی گھونٹ پیے، کچھ منہ بنایا کچھ حیرانی و پریشانی کا اظہار کیا پھر اس نے صاف صاف بتایا کہ وہ شرط ہار گیا۔ اس لئے کہ اس ذائقہ کا مشروب اس نے کبھی نہیں پیا تھا۔ اور نہ اس شراب کا نام بتا سکتا ہے۔ ہاں اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ یہ جو بھی شراب ہے جہاں کہیں کی بھی بنی ہے یہ اس قدر بد ذائقہ اور بے کار ہے کہ کبھی بھی وہ بازار میں فروخت نہیں ہو پائے گی۔

اس کے برخلاف ریاض خیرآبادی کا تجربہ ملاحظہ ہو:

ے توبہ جو کرلی پیرِ مغاں نے میرے ہاتھ پر
پانی میں بھی شراب کا ہم کو مزا ملا

شرابی نے خوب پی رکھی تھی اور ڈاکٹر سے رجوع ہوکر اپنی بیماریاں سنانے لگا تو ڈاکٹر نے کہا:

"حالت نشہ میں تشخیص کرنا ممکن نہیں۔ آپ کسی اور وقت تشریف لائیے"

مریض نے کہا:

"معاف کرنا ڈاکٹر صاحب آپ اپنے مطلب پر بھی پابندی کرتے ہیں اور تشخیص نہیں کرپاتے۔ میں پھر کسی وقت آؤں گا جب آپ نشے میں نہ ہوں —!"

اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ حالتِ سکر میں لوگ زیادہ ہی بااخلاق اور تمیزدار ہوجاتے ہیں۔

حسبِ معمول جب ایک صاحب بس پر سوار ہوئے تو بس کنڈیکٹر نے پوچھا:

"صاحب رات آپ گھر صحیح سلامت پہنچے؟"

اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں بہت اچھی طرح۔ مگر آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

بس کنڈیکٹر نے کہا — "جی، بس یوں ہی۔ بات یہ تھی کہ جب آپ رات کو بس میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک خاتون بس میں سوار ہوئی اور آپ نے بڑے اخلاق سے اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کو دے دی"

"تو اس میں تعجب کی کیا بات ہوئی؟"

کنڈیکٹر نے کہا — "بات صرف اتنی ہے کہ پوری بس خالی تھی اور وہ خاتون کسی بھی سیٹ پر بیٹھ سکتی تھی"

کال + کال

مونس بریلوی

ہر چیز کا ہے کال یہ کالوں کا ملک ہے
دنیا میں بے مثال، یہ کالوں کا ملک ہے

بیٹھے ہیں لوگ صرف یہاں کل کی آس پر
حاصل ہے یہ کمال، یہ کالوں کا ملک ہے

کیا ذکر دودھ کا یہاں پانی نہیں نصیب
کر جاؤ انتقال، یہ کالوں کا ملک ہے

گیہوں کی بات کیا یہاں ملتا نہیں چنا
کھاتے ہیں لوگ چھال، یہ کالوں کا ملک ہے

اے دوست مرغ و ماہی کا کیا تذکرہ کروں
چاول ہے اور نہ دال، یہ کالوں کا ملک ہے

لازم نہیں کسی بھی طرح شکوۂ شکر
صد شکر کا ہے سال، یہ کالوں کا ملک ہے

مٹی کا تیل بھی یہاں آبِ حیات ہے
بجلی کا کیا سوال، یہ کالوں کا ملک ہے

بھرپور طنز ہے یہ ترا مختصر لباس
اے غیرتِ جمال، یہ کالوں کا ملک ہے

دیکھا تھا ہم نے خواب میں اک سبز انقلاب
تعبیر آئی لال، یہ کالوں کا ملک ہے

سرمایہ دار کو یہاں ہر عیش ہے نصیب
مفلس ہے خستہ حال، یہ کالوں کا ملک ہے

فاقہ کشی نے روح بدن سے نچوڑ لی
باقی ہے صرف کھال، یہ کالوں کا ملک ہے

سوکھا کہیں ہے اور کہیں سیلاب جلوہ گر
فریاد ذوالجلال، یہ کالوں کا ملک ہے

مونس ادب کا والی و وارث نہیں کوئی
ہے فکر و فن نڈھال یہ کالوں کا ملک ہے

غزل

رؤف رحیم

جب بہو ہے چرچری تو سر پھرا داماد ہے
جیسی فطرت کے ہیں ہم تم ویسی ہی اولاد ہے

زندہ درگور دفا ہے جو بھی گھر داماد ہے
صید کا وہ صید ہے صیاد کا صیاد ہے

'چھوکری معہ نوکری' یہ اشتہار آنے لگے
رقم بھی دی جائے گی جو قابلِ امداد ہے

اب ہو کیا تعلیم کا معیار اپنے ملک میں؟
اونگھتے شاگرد ہیں تو نیند میں استاد ہے

ظلم کے چکر نے ڈالا سب کو یارو عشق میں
ایک ہے مجنوں تو گویا دوسرا فرہاد ہے

چار بیگم، آٹھ لڑکے اور ہیں چھ لڑکیاں
مختصر سا خاندان ہے مختصر تعداد ہے

کیا تعجب ہے اگر ہم تم ہیں جورو کے غلام
زن مریدی ابتدا سے شیوۂ فرہاد ہے

کر کے شادی پھنس گئے ہم جال میں افلاس کے
چیختے پھرتے ہیں اب "فریاد ہے فریاد ہے"

ہر کسی سے سوچ کر ملنا زمانے میں رحیم
آدمی اس دور کا مجموعۂ اضداد ہے

لیم مقصود

ایک گھنٹہ کا سفر

آدمی زندگی کے پہلے سفر یعنی پیدائش سے آخری سفر یعنی موت تک کئی طرح کے سفر کرتا ہے۔ ایک نامعلوم دنیا سے کوچ کر کے
س دنیا میں آتا ہے۔ اور پھر اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا کا سفر کرتا ہے۔ ہر سفر کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتا ہے۔ چاہے
پیدل ہو، بس میں ہو یا کسی اور سواری میں۔ ہمیں کئی سفروں کا تجربہ ہے جن میں سب سے مختصر اور سب سے دلچسپ سفر بس کا ہے۔
ب اتفاق ہے کہ یہ بس کا سفر ہمارا آخری سفر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک بار بارش کے موسم میں ہمیں ایک ضروری کام کے
یں اپنے ایک نہایت ہی بے تکلف دوست سے ملنے جانا تھا۔ ہمارے گھر سے ان کے گھر کا فاصلہ بمشکل (۸) کلومیٹر تھا۔
ت شدید ہو رہی تھی۔ اس Route (روٹ) کی کئی بسیں فیل ہو چکی تھیں۔ مسافروں کا ہجوم بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا بے چینی سے
انتظار کر رہا تھا۔ بس اسٹاپ کافی چھوٹا تھا اور مسافر زیادہ۔ اس لیے بنا امتیاز جنس و نسل و رنگ لوگ نہایت ہی قریب قریب بلکہ
ی آغوشی کی حالت میں کھڑے ہوئے تھے۔ بڑا رومانی منظر تھا۔ بعض تو بس اسٹاپ کی چھت سے چمگادڑ کی طرح لٹک رہے تھے
ے تو دوسروں کے کندھوں پر سوار تھے اور ہمیں اس درخت کی یاد آ رہی تھی جس پر حالیہ سیلاب اور طوفان میں ہزاروں لوگوں نے پناہ
ک عجیب عجیب زاویوں سے کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لٹکے ہوئے اور لیٹے ہوئے تھے۔ جو جس حالت میں تھا بس تصویر کی مورت بنا
۔ اگر ذرا سی جنبش کرتا تو اندیشہ ہوتا کہ کہیں اس کے سر پر بیٹھا ہوا آدمی نہ گر جائے یا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کے سر پر سے گر جائے
دوسرا دال برا جاں ہو جائے۔ لیکن جہاں پیر رکھنے کی جگہ نہ ہو وہاں حرکت کرنے کے لیے جگہ کہاں سے آ سکتی تھی! ہم نے گھر سے نکل
اپنی کشتیاں جلا دی تھیں۔ اب واپسی کا سوال ہی نہ تھا۔ لوگ یہاں سے سڑک سے گزرنے والی سواریوں کو بڑی حسرت بھری
سے دیکھ رہے تھے گویا کہہ رہے ہوں :

" دیکھیے ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو "

لکے بس آئی لوگوں نے یوں سیٹیاں بجائیں اور یوں حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جیسے بس نہ ہو کولمبس کا جہاز ساحل پر آ لگا ہے

ہر شخص اپنے آپ کو بس میں ٹھونسنے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ اس جدوجہد میں کسی کا پرس داغِ مفارقت دے گیا۔ کسی کی کوئی قیمتی چیز وہیں بس اسٹاپ پر رہ گئی۔ نتیجتاً وہ صرف سرد آہ کھینچ کر رہ گیا۔ جو بس میں چڑھ گیا وہ اتر نہیں سکتا تھا اور جو چڑھ نہ سکا اس کے لیے بس رک نہیں سکتی تھی۔ اس کشمکش میں ہماری نئی چپل بھی سڑک پر ہی کہیں گر گئی۔ جس کا پتہ ہمیں بس سے اترنے کے بعد چلا۔ ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ جہاں اچھے اچھے تجربہ کار اور طاقتور اشخاص بس میں سوار نہ ہو سکے وہاں ہم اپنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ صحیح و سالم بس میں سوار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ تو خدا کا فضل ہوا کہ چپل کی طرح ہمارا ایک پیر یا ایک بازو وہیں کہیں بھیڑ میں ٹوٹ جاتا تو ہمارا کیا حال ہوتا۔ بس میں داخل ہونے کے بعد بھی اور کئی معرکے سر کرنے تھے۔ لوگوں کا ہجوم اور ان کی انواع و اقسام کی بو بڑی ہوش ربا ثابت ہو رہی تھی۔ پیر رکھنے کی جگہ نہ تھی اس لیے ہم پنجوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ ہم ابھی اپنے ہوش و حواس کو یکجا کر بھی نہ پائے تھے کہ لوگوں کو چیرتا ہوا کاندھے تک ننگا ایک ہاتھ ہماری طرف بڑھا اور مطالبہ کرنے لگا بس کے ٹکٹ کے پیسے چپ چاپ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ ہم اس ہاتھ کو پہچان نہ سکے کیونکہ یہ ہاتھ کاندھوں تک ننگا تھا۔ ہم نے پوچھا "تم کون ہو"؟ آواز آئی "جناب! میں اس بس کے کنڈکٹر کا ہاتھ ہوں"۔ ہم نے دریافت کیا۔ کیا آپ مسافروں تک پہنچنے کی جدوجہد میں کپڑوں سے بے نیاز ہو چکے ہیں؟ جواب آیا "میں نے آپ تک پہنچنے کے لیے جگہ پیدا کرنے کی غرض سے اپنی آستینیں اوپر چڑھا لیے ہیں"۔ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ کنڈکٹر ہی کا ہاتھ ہے۔ ہم نے پیسوں کے لیے اپنی ہپ پاکٹ (hip pocket) میں ہاتھ ڈالا اور اپنا پرس نکالا۔ مگر یہ پرس ہمارا نہیں تھا۔ ہمارے پرس پر تو للی کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس پرس پر بروس لی کی تصویر تھی ہم نے غلطی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی بجائے خدا جانے کس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ "بروس لی" کی فوٹو دیکھتے ہی ہمارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ "بروس لی" کی فوٹو رکھنے والا شخص بروس لی کے فن سے واقف نہ سہی لیکن بروس لی جیسا مزاج رکھنے والا تو ہو سکتا ہے۔ ہم نے اپنی گردن کو خطرے میں ڈال کر پیچھے پلٹ کر دیکھا ہمارے پیچھے دھاری دار بنیان پہنا ہوا ایک تگڑا آدمی کھڑا تھا۔ یہ پرس یقیناً اسی آدمی کا تھا۔ بس کو ایک جھٹکا لگا اور وہ آدمی لڑکھڑا کر ہمارے قریب آ گیا۔ ہم نے موقعہ غنیمت جان کر یہ پرس اس کی جیب میں ڈال دیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ ہم ایسی غلطی دوبارہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے بازو والے صاحب سے کہا "بھیا! ہماری پتلون سے ایک روپیہ نکال کر ہمارا ٹکٹ لے لیجیے"۔ یک دم آواز آئی "پکڑو! پکڑو۔ یہ ہمارا پرس چرا رہا ہے۔ چور چور" پھر دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ہمارے بازو والے صاحب کی کمزور سی آواز آئی "کسے چور کہتے ہو؟ تم ہی نے تو جیب سے پرس نکالنے کے لیے کہا تھا"۔ پہلے شخص کی آواز آئی۔ "پاگل ہو! میں نے کب کہا تھا! میرے پاس تو بس پاس ہے۔ مارو! چور کہیں کا۔" دوسری آواز "تو چور تیرا باپ چور" پھر تو گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ بس رک گئی۔ مسافرین نے دونوں کو بس سے اتار دیا۔ جن صاحب کو ہم نے ٹکٹ لینے کو کہا تھا وہ بے چارے بس سے نکال دیے گئے۔ اللہ انھیں یقیناً صبرِ جمیل عطا فرمایا ہو گا اور انھیں بقیہ سفر پیدل طے کرنے کی ہمت و توفیق بھی دی ہو گی۔ غرض بس ابھی ایک کلومیٹر بھی چل نہ پائی تھی کہ اس سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ ڈرائیور نے بس روک دی اور کہنے لگے۔ "بس میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے اس لیے بس کا آگے بڑھنا خطرناک ہے"۔ سب کے چہروں پر حیرت و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ سب ایک دوسرے کا منہ تو کیا دیکھتے (جو بہت حد تک بگڑ چکا تھا) ڈرائیور اور کنڈکٹر کا منہ تکنے لگے۔ اتفاق سے اس بس میں موٹر میکانک بھی تھا۔ اس نے بس کے پہیوں کو چیک کیا تو پتہ چلا کہ ایک پہیے کے پیچ ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ پہیہ نکلنے ہی والا تھا کہ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ میکانک نے پتھر سے ٹھونک ٹھونک کر اسے ٹھیک کر دیا۔ بس چل پڑی پھر تھوڑی دیر بعد وہی آوازیں آنے لگیں۔ پھر بس روک دی گئی پھر میکانک نے وہی عمل کیا۔ میکانک کو فٹ بورڈ پر کھڑا کر دیا گیا تاکہ وہ پہیے کی نگرانی کرتا رہے۔ موسم بھی کچھ خوشگوار ہو گیا۔ بس اتنی احتیاط سے آہستہ آہستہ چلائی جا

تی کر چلتی بس سے لوگ اتر جاتے ہوٹل جا کر چائے، کافی وغیرہ پی کر آتے اور پھر بس میں چڑھ جاتے۔ میکانک بھی اپنی منزل مقصود پا کر چلا گیا۔ پھر ایک بار لوگوں کو اپنے غیر مختتم سفر کے اختتام کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ لیکن ہم نے یہ ذمہ داری اپنے تھکے ہوئے کندھوں پر لے لی۔ جن پر بس اسٹاپ پر ایک قوی ہیکل آدمی سوار تھا۔ ہمیں میکانک کا جانشین بنایا گیا اور وہ پتھر ہمارے حوالے کیا گیا جس کی شکل تیشے سے ملتی جلتی تھی مگر ہمیں اس پتھر سے دو دھکی نہر جاری کرنی نہیں تھی بلکہ بس کے پہیے کو حسب استعداد ٹھونکنا تھا۔ ہمارا عجیب حال تھا۔ سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ کپڑوں پر جگہ جگہ جوتوں، چپلوں اور گیلے پیروں کے نشانات اتنے واضح ہو چکے تھے کہ بآسانی ان کا نمبر اور سائز معلوم کیا جا سکتا تھا۔ چہرے کا حال دوسروں ہی سے معلوم ہو سکتا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد بس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہم تیشہ (پتھر) اٹھائے بس سے کود پڑے بارش بھی کچھ تیز ہو چلی تھی۔ ہم نے پہیے پر نظر ڈالی اس کا پیچ ڈھیلا نہیں تھا۔ البتہ ایسا لگتا تھا کہ بس میں کوئی اور خرابی ہو گئی ہے۔ ڈرائیور نے بس کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بس کسی لڑاکا بچے کی طرح صرف غرّا کر رہ گئی۔ مسافر ناامید ہو کر بس سے اترنے لگے۔ جو ذرا بہت ہی دیر سے مایوس ہونے والے یعنی (optimist) قسم کے مسافر تھے وہ بس میں بیٹھے ہی رہے ایسے لوگ بس کا پرزہ پرزہ الگ ہونے تک اس کے چالو ہونے کا انتظار کر سکتے تھے۔ انہیں بس سے اتارنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا کہ اسے کسی سمندر میں لے جا کر الٹ دیا جاتا پھر بس خود چیخ کر کہتی کہ "اب آپ باہر نکل آئیں میں چلنے پھرنے (کیونکہ بس چل رہی تھی دوڑ تھوڑا رہی تھی) کے قابل نہیں رہی ہوں"۔ ڈرائیور نے بیزار ہو کر اعلان کیا "بس فیل ہو چکی ہے اور اب یہ ایک انچ بھی یہاں سے آگے نہیں بڑھے گی۔ براہ کرم آپ سب لوگ بس سے اتر جائیے"۔ ایک مسافر نے غصے سے پوچھا "پٹرول تو ہے نا اس میں؟" ڈرائیور نے دریافت کیا "کیوں"؟ وہ مسافر بولا "اس لیے کہ میرے پاس ماچس ہے"۔ ڈرائیور مسافر کے خطرناک ارادوں کو بھانپ کر کہنے لگا۔ سیدھی طرف سے اتر جائیے ورنہ مجھے پولیس کو اطلاع دینی پڑے گی۔ ڈرائیور کی اس دھمکی کا اثر (optimist) اور (pessimist) دونوں قسم کے لوگوں پر برابر کا پڑا۔ سب لوگ دھڑا دھڑ بس سے اترنے لگے۔ ہم تو پہلے ہی بس سے اتر چکے تھے۔ ہم نے تیشہ (پتھر) کو اپنے یا کسی اور کے سر پر دے مارنے کے بجائے دور فضا میں اچھال دیا۔ بس نے ہمیں ایک ایسے مقام پر چھوڑ دیا تھا جو جزیرہ تو نہیں تھا البتہ جزیرہ نما ضرور تھا۔ ایک فلم کا منظر ہماری نظر میں گھوم گیا جس میں اسمگلر مسافروں سے بھرے ہوائی جہاز کو ایک جزیرے میں اتار دیتے ہیں اور پھر یہاں سے ایک ایسی پراسرار کہانی شروع ہوتی ہے جو پورے دو گھنٹے تک چلتی ہے۔ اب اس مقام سے بھی ایک ایسی ہی کہانی شروع ہونے والی تھی جو کم از کم ایک گھنٹہ تو ضرور چلتی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت ہم اس کہانی کا کردار نہیں تھے بلکہ صرف ایک تماشبین تھے۔ اب ہم خود اس کہانی کا مرکزی کردار تھے۔ اور ہمیں اس مقام سے منزل مقصود تک تقریباً ایک گھنٹہ بارش اور کیچڑ میں پیدل چل کر اس کہانی کو کلائمکس تک پہنچانا تھا۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے بڑی ہی بے تکلفی سے ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھا ہم نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ یہ ہمارے گہرے دوست اسلم تھے جن کے ہاں پہنچنے کی ہم صبح سے کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے حیرت سے پوچھا "آپ یہاں کیسے"؟ انھوں نے جواب دیا "بھائی! گھر پر میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ وقت مقررہ پر جب تم نہیں آئے تو میں خود تم سے ملنے کے لیے نکل پڑا۔ اور جب تمہارے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ تم میرے گھر روانہ ہو چکے ہو چنانچہ میں ایک اسکوٹر سے تمہارے تعاقب میں واپس گھر جا رہا تھا کہ راستے میں یہ بس ملی۔ میں اسکوٹر سے اتر کر اس میں سوار ہو گیا۔ بس میں اتنا ہجوم تھا کہ میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں"۔ ہم دونوں اس عجیب و غریب اتفاق پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

●●

آندھرا پردیش کی بدلتی ہوئی معیشت

قدرت نے ریاست آندھرا پردیش کو بے پناہ وسائل عطا کئے ہیں۔ محل وقوع کے اعتبار سے یہ ریاست ملک کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ اور اس کی جدید صنعتی بنیادیں ہندوستان کے کونے کونے سے صنعت کاروں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔

۷۸۴ کروڑ روپے کے متاثر کن سرمائے سے قائم کردہ ۲۶۰ سے برابر متوسط اور بڑی صنعتیں ریاست کے صنعتی حالات کو از سر نو بدل رہی ہے۔

۲۳۲ کروڑ روپے کی لاگت سے کاکی ناڈا میں قائم کردہ کیمیائی کھاد کا کارخانہ ۱۹۸۱ء سے پیداوار دینا شروع کردے گا۔ ۷/ جولائی ۱۹۷۸ء کو صدر جمہوریہ ہند نے اس کارخانے کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس کارخانے میں ۴ء۹۵ لاکھ ٹن یوریا پیدا کیا جا سکے گا۔ جس سے سالانہ ۹۰ کروڑ روپے حاصل ہوں گے۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

39/78-79

محاورہ
مابین
ابلیس و شیطان

ڈاکٹر [illegible]
([illegible])

ابلیس

فرزندوں میں میرے کوئی اب جان نہیں ہے
تم ایک شرارت پہ بڑی شان دکھاتے
وہ دیکھو بنی آدم صد فن کے تماشے
وہ جھوٹ میں تمدید میں فائق ہوئے ہم سے
ہم ان کی جفاکاری سے نادم ہیں جہاں میں
ہے اہلِ ہمم کوئی جو اک فتنہ جگا دے

شیطان

تسلیم کہ انساں سے شیطاں نہیں ہم
شیطانی میں انساں کے مقابل تو نہ ہونگے
اب سوچ کے کچھ ایسی ہی تدبیر کریں گے
وہ مملکتِ ہند کہ مشہور جہاں ہے
اک صوبہ بہار اس کا ہے تابندہ نگینہ

ابلیس

وہ خطہ ہے مخدوم جہاں اپنے عدو کا
گو تم پہ وہیں عقدۂ تخلیق کھلا تھا
ہیں لوگ وہاں سادہ پسندانِ زمانہ

شیطان

ہاں لوگ جفاکوش وطن دوست ہیں
پر آج وہاں آپ کے اقبال سے ہرجا
ہر پیں میں کتب خانوں میں جلنے کا سماں ہے
یا خشت زنی سے کہیں پتھر کی جھڑی ہے

انساں سے بڑھ کر کوئی شیطان نہیں ہے
خود ہم سے بھی سو طرح کے انعام کماتے
اک فتنہ سے فتنوں کے جو طوفان اٹھاتے
ہر جرم سیہ کار میں سابق ہوئے ہم سے
ہر دم کی شکستوں سے ہیں اسبابِ فغاں میں
انساں کی شیطانی کا سر تھوڑا جھکا دے

پر ویسے بھی آقا مرے، بے جان نہیں ہم
ہاں اپنے مقاصد سے بھی غافل تو نہ ہونگے
آدم کی تباہی میں نہ تقصیر کریںگے
کہتے ہیں کہ عظمت میں وہ فردوس نشاں ہے
پنہاں ہے جہاں معدنِ ہستی کا دفینہ

انوارِ حقیقت کی تمنا کے نمو کا
عرفانِ حقیقت کا جنھیں نور ملا تھا
آساں نہیں ان کو غلط کار بنانا

خوددار بھی مردانِ مجاہد بھی ہوئے ہیں
یا آگ ہے یا آتشِ خاموش کا ملبا
ریل اور دفاتر کے اجڑنے کا سماں ہے
یا نعرہ بپا چیخ سے محشر کی گھڑی ہے

ابلیس

پر اس میں کہاں آگ کے پرکالوں کی حشمت! ظاہر ہے یہاں بھی وہی انساں کی کرامت
کچھ ہند کی ہاری ہوئی پارٹی کا کرم ہے امریکہ کے پی ال کی بھی اک تھوڑی رقم ہے
کچھ تم بھی وہاں فتنہ اٹھاتے تو سمجھتے انساں کو پابند بنالیتے تو سمجھتے

شیطان

شیطان سے کیا ہوگا جو انسان سے نہ ہوگا ہاں چاہیئے ندمت فقط ارماں سے نہ ہوگا
اک راستہ سوجھا ہے کہ اب جس پہ چلے ہیں انسان کے جذبات مرے ہاتھ لگے ہیں
تحریف صحافت کی بنا ڈال چکا ہوں خود اپنی ادارت کی بنا ڈال چکا ہوں
بن میری مشیت کے قلم چل نہیں سکتا گر ہو نہ مشورہ میرا تو کچھ چل نہیں سکتا
تحریف صحافت سے ذرا رنگ ہوں بھرتا محمود کی ٹوپی سر حامد پہ ہوں دھرتا
اخبار اگر دیکھیں تو تصدیق کریں آپ کچھ ندمت اعمال کی توثیق کریں آپ
کہتے ہیں کہ یہ بات نہ یہ بات ہوئی ہے نیشن کا ورق دیکھئے ہر بات ہوئی ہے

مرزا غالب + مختار یونس

"رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو" ممتحن ABSENT (اب سینٹ) ہو اور امتحاں کوئی نہ ہو
یہ سراسر ظلم ہے اگزامینیشن ہال میں "ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو"
"بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے" گیلی لکڑی بھی جلائیں تو دھواں کوئی نہ ہو
مرغ تندوری کی دعوت میں، ہوں ٹانگیں اور ہم "کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو"
"پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار" ڈاکٹر کا حکم ہے نرس جواں کوئی نہ ہو
فلم میں ویلن بنو تو جیتے جی گالی سنو
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مختار یونس مالیگاؤں

شیخ رحمٰن
(اکولہ)

جہاں میں رہتا ہوں

شہر آکولہ مورنا ندی (یہ ہماری فراخدلی ہے کہ ہم اسے ندی کہہ رہے ہیں ورنہ عام طور پر لوگ اسے نالہ کہتے ہیں) کے کنارے ہے۔ اس شہر کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہے۔ تاریخی شہر بالاپور کا حوالہ دینے پر لوگ اسے پہچانتے ہیں۔ آکولہ کے حقیقی باشندے بالکل کم ہیں۔ دیہاتوں کے لوگ یہاں آکر آباد ہوگئے ہیں اور یہاں کی زمین نے انھیں اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا ہے جیسے کوئی نیک دل دوسروں کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح اپنا لے۔

یہاں کی آب و ہوا شدید ہے موسم گرما، موسم سرما اور موسم برسات تینوں ہی شدید ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں کے لوگ شہر کے باہر جانے سے کتراتے ہیں کہ آب و ہوا کی تبدیلی کے باعث طبیعت ناساز ہو جائے۔ چھتریوں کی یہاں بہت کھپت ہے۔ موسم برسات میں بارش سے، موسم گرما میں دھوپ اور دھول سے اور سرما میں سرد ہواؤں کے جھکڑوں سے یہ لوگوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ موسم گرما میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جب دھول اڑتی ہے تو اچھے اچھوں کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے یہ دھول راجستھان کی ریت کی طرح مشہور ہے۔

آکولہ کی خاص پیداوار یہاں کے شعراء ہیں۔ ایسے لوگ جنھیں کوئی اور کام نہیں وقت گزاری کے لئے شاعری کرتے ہیں۔ شاعروں کے تین مختلف گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو مشاعروں اور ادبی نشستوں میں اپنا کلام سناتا ہے اور سامعین کی واہ واہ کے سہارے جیتا ہے۔ تخلیقات کی اشاعت کو یہ لوگ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو مشاعروں اور ادبی نشستوں کو "جشنِ خود فریبی" کہتے ہیں اور اسے شہرت حاصل کرنے کا گھٹیا طریقہ تصور کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا کلام مختلف رسائل کو اشاعت کی غرض سے بھیجتے ہیں اور کلام کے شائع ہونے تک سر تا قدم شاعر بن جاتے ہیں۔ تیسرے گروہ میں وہ شعراء شامل ہیں جو اپنا کلام دوسروں کو سناتے ہیں اور نہ اشاعت کی غرض سے رسائل کو بھیجتے ہیں۔ یہ بیچارے تنہائی میں اپنا کلام خود ہی گنگناتے ہیں اور خود ہی داد بھی دے لیتے ہیں (آخر دیواروں سے باتیں کرنے سے تو یہ کام اچھا ہے نا!) آکولہ کے زیادہ تر شعراء اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جو شاعری نہیں کر سکتے مشاعرے منعقد کرکے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ یہاں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ ان مشاعروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شعراء کی تعداد سامعین سے زیادہ ہوتی ہے۔ لوگ فراغت مل جائے تو بھی...

چاہے گلے میں درد ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایسے لوگوں کی کثرت ہوتی ہے جو اشعار کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ سخن فہم حضرات مشاعرے کے آس پاس ہوٹلوں میں چائے پیتے نظر آتے ہیں۔ گھریلو نشستیں جہاں شعرا وقتاً فوقتاً اپنی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں۔

سیاست سے لوگوں کو خاص لگاؤ ہے۔ تقریباً تمام شہری مختلف وجوہات کی بنا پر کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہیں۔ الیکشن کے زمانے میں بڑی کشمکش کی فضا رہتی ہے۔ باپ ایک پارٹی سے منسلک رہتا ہے تو بیٹا دوسری پارٹی کی حمایت کرتا ہے۔ میاں ایک پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں تو بیوی کی تمام تر ہمدردیاں کسی دوسری پارٹی کیلئے وقف ہوتی ہیں۔ غرضیکہ آکولہ "چکلگور" بن جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں کچھ لوگ محتاط رویہ اپناتے ہوئے اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے بھی دور رہتے ہیں تاکہ سیاسی اختلافات ذاتی اختلافات کی شکل اختیار نہ کرلیں۔ کچھ لوگ جو اپنے آپ کو کٹر سیاست داں سمجھتے ہیں مختلف مقامات پر اپنی محفلیں جمائے رہتے ہیں۔ ان محفلوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جیسے جیسے الکشن کا دن قریب آتا ہے یہ محفلیں زیادہ پر شباب ہوتی جاتی ہیں اور الکشن کے دوسرے دن یہ محفلیں اس طرح ویران ہو جاتی ہیں جیسے پہلے کبھی ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ ان محفلوں میں ہر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں اساتذہ بھی ہیں اور رکشا چلانے والے بھی۔ اپنے امیدوار کی تعریف اور مخالفین کی تضحیک کرنا ہی ان محفلوں کا موضوع خاص ہوتا ہے۔ اس تعریف اور ہجو گوئی کے دوران چائے، پان اور سگریٹ کے دور چلتے ہیں اور ان چیزوں کا بل بیچارہ امیدوار ادا کرتا ہے۔ چاہے اسٹیٹس پارٹی ہو یا ادارے۔ لوگ موقع شناس ہیں اس لیے دل بدلی کی وبا عام ہے۔

چائے اور پان کا استعمال روزمرہ کی ضروریات میں شامل ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ چائے پلانے کے بعد پان نہ پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو کھانا کھلانے کے بعد پانی نہ پلانا۔ ایک کپ دو آدمی پیتے ہیں۔ یہ یہاں کا رواج ہے۔ مہمان نوازی میں چائے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آپ اپنے مہمان کی ہر طرح خاطر مدارات کیجئے۔ بس چائے پیش مت کیجئے۔ مہمان آپ کی مہمان نوازی پر شک کرنے لگے گا اور اپنے تئیں آپ بھی اس بداخلاقی پر شرمسار ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی چائے بڑے کام کی چیز ثابت ہوتی ہے۔ جب کبھی کسی سے کوئی کام کی بات اگلوانا ہو تو اسے چائے پینے کی پیشکش کی جاتی ہے اور پھر پیار بھری پر خلوص باتوں کے ساتھ چائے کا دور چلتا رہتا ہے۔ یہ باتیں گویا چائے پر ملائی کا کام کرتی ہیں۔ پھر چائے پیش کرنے والا اس قدر شاندار انداز میں اپنا مدعا بیان کرتا ہے کہ سننے والا بے دھڑک وہ تمام باتیں بتا دیتا ہے جنھیں جاننے کی غرض سے چائے پلائی گئی۔ راز اگلوانے کا یہ مخصوص طریقہ کار ہے۔

پان کھانے میں آکولہ والے کسی طرح لکھنؤ والوں سے کم نہیں ہیں۔ چھالیہ "چھپاری" یہاں کی مرغوب سپاری ہے۔ اس کے بغیر پان خلاف شان سمجھا جاتا ہے۔ ایک عدد سپاری کے ۴ یا ۶ ٹکڑے کئے جائیں تو لوگ دانتوں کی مضبوطی پر شک کرنے لگتے ہیں۔ دانتوں کو مضبوط بنانے والی دوائیاں بیچنے والوں کو یہاں ہمیشہ نقصان ہوا ہے۔

دو چیزیں یہاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک قدیم تاریخی قلعہ دوسرا تا ور۔ یہ قلعہ جسے اورنگ زیب عالمگیر نے بنایا تھا۔ سے تقریباً ۶۰ فٹ اونچا ہے۔ اگر کبھی آپ کو خدانخواستہ اس قلعہ کی سیر کا موقع ملے تو بڑی ہوشیاری سے اس کے زینے طے کیجیے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا پیر پھسل جائے اور نئی تاریخ بن جائے۔ یہ زینے اس کتب خانے کے زینوں سے مشابہ ہیں جن سے گر کر شہنشاہ ہمایوں عالم بالا میں پہنچ گئے تھے۔ ان زینوں کے بارے میں ہم نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ زینے دوسرا ٹاور کولہ نگر پریشد نے تعمیر کروائے تھے اور مزدوروں کو مناسب مزدوری نہیں دی گئی تھی اس لیے انھوں نے یہ اسپیشل زینے تیار کئے کہ کسی دن نگر پریشد کا کوئی افسر ان زینوں سے پھسلے اور ان کا انتقام پورا ہو جائے۔!

شہر کا چار منزلہ ٹاور کالے پتھر سے بنا ہوا ہے۔ اس کی اوپری منزل میں چار سمتوں میں چار گھڑیاں نصب ہیں۔ ان گھڑیوں کی جس خوبی نے اس ٹاور کو دنیا کے عجوبوں میں شامل کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ گھڑیاں ایک وقت میں مختلف اوقات ظاہر کرتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بجتے نو ہیں اور ٹاور بارہ ٹھونکے دیتا ہے۔

تلک روڈ آکولہ کا سب سے زیادہ بارونق روڈ ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر کپڑوں، برتنوں، دوائیوں، مٹھائیوں، جوتوں اور بجلی کے سامان کی دوکانیں ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سنیما گھر ہیں۔ اس روڈ پر ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے۔ یہاں آپ کو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سونی مہیوال اور رومیو جولیٹ کی نئی نسلیں پروان چڑھتی نظر آئیں گی۔

لوگ دور اندیش ہیں اس کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ مہاراشٹر ریاست میں نس بندی کے سب سے زیادہ آپریشن اسی علاقے میں ہوتے ہیں۔ یہ اعداد بات ہے کہ آپریشن کروانے والوں میں ستر اور اسی سالہ بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہے۔

ہو سکتا ہے میرے اس مضمون کو پڑھ کر بعض صاحبان آکولہ کی سیر کے بارے میں سوچیں۔ ان حضرات کو میں یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وہ آکولہ روانہ ہوتے وقت اپنے پاس نقدی کے علاوہ اتنا اسباب ضرور رکھیں کہ وقت ضرورت اسے بیچ کر واپسی کا ٹکٹ خریدا جا سکے کیونکہ اکثر مسافروں کو ریلوے اسٹیشن پر اپنی کٹی ہوئی جیبیں ٹٹولتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

نئے طرز کی منصوبہ بندی

۱۹۸۳ - ۱۹۷۸ کی مدت کے دوران ریاست آندھراپردیش کیلئے ۳۹۶۶ کروڑ روپے کا متوسط مدتی منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ منصوبہ بندی میں ایک نیا ڈھنگ اپنایا گیا ہے۔

اس منصوبہ کے تحت شعبہ جاتی موازنوں کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ، چھٹویں منصوبے کو ٹھوس طریقہ پر روبہ عمل لایا جاسکے۔

آبپاشی اور توانائی کے موازنوں میں کمی کرتے ہوئے متوسط مدت کے نئے پلان میں بڑی تبدیلی لائی گئی ہے۔ اس کے بالمقابل صنعتوں، مائننگ اور سوشیل سروسس کے شعبوں کی رقم میں اضافہ کیا گیا ہے۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ

41/78-79

رؤف خوشتر
گلبرگہ

یرقان
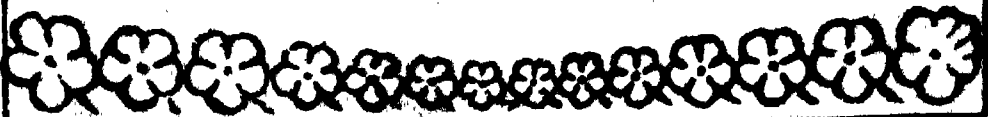
ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے ؎ بے سبب ہوا غالب دشمن یرقان اپنا!

اپنے ارد گرد ارے غیرے کو شاعر و ادیب کے روپ میں دیکھ کر ہمیں بھی یہ شوق چرایا کہ ہم بھی شاعر یا ادیب بنیں۔ ہم نے یہ پتہ لگایا کہ اس کے لئے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بیرونی طور پر خود کو شاعر و ادیب جتلانے کے لئے روپ بدلے۔ مومن کی سی زلفیں چھوڑیں۔ علامہ اقبال کی طرح مونچھیں رکھیں۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ اس کے لئے اندرونی طور پر کوئی خصوصیت کے مالک ہونا چاہیئے۔ جب کہیں جاکر کوئی شاعری کر سکتا ہے۔ یا افسانہ لکھ سکتا ہے۔ اب ہمیں اپنی اندرونی ادیبانہ خوبیاں اجاگر کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ یہاں تک ہم نے ملٹن بننے کے لئے اپنی آنکھوں کو قربان کرنا چاہا۔ لیکن "نیم ملٹن" ہی بن سکے یعنی کہ ہمیں پوری طرح نہیں چلی گئیں چشمہ لگ گیا۔

ہم نے دل ہی دل میں خدا سے "سائیکلونسٹر" لگا کر دعا مانگی کہ ہمیں بھی دوسرے بڑے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرح ان کی کوئی شاعرانہ، ادیبانہ خوبی و خصوصیت عطا کر۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہماری سائیکلونسٹر والی دعا خدا اس بسوں، موٹروں اور انسانوں کے شور میں سن لے گا۔ تو جناب ہمیں خدا نے ایسی چیز عطا کی جو کبھی ایشیاء کے عظیم افسانہ نگار صاحب طرز ناول نویس کرشن چندر کو عطا کی گئی تھی۔ یعنی ہمیں بھی یرقان ہو گیا۔ (افسانہ نویسی کے آغاز میں کرشن چندر بھی یرقان میں مبتلا تھے)۔

ہماری کالی آنکھوں میں جہاں اب تک نصف برز کا ڈیرا تھا۔ وہاں اب یرقان نے اپنا قبضہ جما لیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ہم ابتداء سے ہی پیلے رنگ سے الرجک واقع ہوتے ہیں۔ اس لئے اسی پیلے رنگ نے ہمارے جسم کے مختلف حصوں پر اپنا قبضہ جما کر ہمیں کوئی نہ کوئی آفت میں مبتلا کر دیا ہے۔ پہلے تو اس نے ہمارے ہاتھوں پر اپنا رنگ دکھایا۔ یعنی ہمارے ہاتھ پیلے کر دیئے گئے۔ جس کی پاداش میں ایک عدد بیوی تادم حیات ہمارے سر پر مسلط کی گئی۔ پھر مرچ مسالے دار کھانوں کا پاؤ درجن بچے ہو گئے۔ اس سے پہلے ہم کنوارے کتنے مزے میں تھے اب اس پیلے رنگ نے ہاتھ چھوڑ کر ہمارے دانتوں کی طرف کوچ کیا۔ جس کی سزا کے طور پر کئی دانت پیلے ہو کر شہید ہو گئے۔ مجبوراً مصنوعی دانت لگانے پڑے جس کا علم صرف ہماری بیگم صاحبہ کو ہی ہے۔ اب یہ کم بخت پیلا رنگ دانتوں سے نکل کر آنکھوں میں بس گیا ہے۔

یرقان زدہ ہوتے ہی ہم صاحب فراش ہو گئے۔ دوست احباب کشاں کشاں یوں دیکھنے آنے لگے کہ اچھا خاصا

ہلکا پیلا کیسے ہو گیا۔ ہندوستانی سیاست، جہالت، غربت نے ہر متوسط ہندوستانی کو زرد پیلا بنا دیا ہے۔ ہندوستان میں ہرا انقلاب (Green Revolution) آئے نہ آئے لیکن ہندوستانی چہروں پر زرد انقلاب ضرور آگیا ہے۔ اس لئے ہمیں یرقان ہوتے ہی ہم دو وجوہات کی بناء پر خوش ہوئے۔ اول تو ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اب ہم سو فیصدی سچے ہندوستانی ہیں۔ اور دوم اس لئے خوش ہیں کہ ہم فخر سے اپنے آپ کو کرشن چندر جی کے ہم مرض کہہ سکتے ہیں۔ ہم پایہ نہ ہم طرز نہ سہی "ہم مرض" ہی سہی۔

لیکن ہماری یہ خوشی صرف لمحاتی تھی۔ اس کے دوسرے پہلو جب سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ یرقان کتنی اذیت ناک بیماری ہے۔ اتنا سخت پرہیز کہ فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ حکیم اور ڈاکٹر ہمارے اس مرض سے بہت خوش تھے کہ چلو دو تین ہفتوں کا راشن مل گیا۔ اگلے وقتوں کے ڈاکٹر اپنے بنک بیلنس کے ساتھ ساتھ مریضوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ پس اب بات اُلٹی ہو گئی ہے۔ آج کل کے ڈاکٹر آبادی گھٹانے اور اپنے بنک بیلنس میں اضافہ کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک ڈاکٹر کو مندر میں زیرِ لب یہ گنگناتے سُنا ہے ؎

سب کو دے دے اے بھگوان
ٹی بی، ہیضہ اور یرقان

ہمارے پرہیز کے اعلان کے ساتھ ہی مکان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ بیگم صاحبہ نے بھی دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارے پرہیز کا خیر مقدم کیا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں ؎

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

بچے ہر خوانچے والے کو آواز دیتے۔ ہر قسم کی مٹھائیاں اور پھل خریدنے پر اصرار کرنے۔ اُن کی ضد کے آگے ہمارا بٹوہ کھل جاتا۔ اور بچوں کے منھ مٹھائیوں پھلوں سے بند ہو جاتے۔ اور ہم اپنی پیلی زبان ہلا کر اپنی پیلی پیلی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتے اور اپنے پیلے ہاتھ ملتے ہوئے چادر تان کر لیٹ جاتے۔ (آخر بچوں کے آگے پیلے آنسو کیسے بہاتے) بیگم صاحبہ ذرا ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے پہلے تو بچوں کو ڈانٹتی اور پھر باورچی خانہ میں گھس کر سارا حلوہ صاف کر جاتیں۔ شاید ہمیں ستانے کا انھیں پیلا موقع (سنہری نہیں) ہاتھ آگیا۔ اتنا ہی نہیں بیگم صاحبہ نے اپنے رشتہ داروں کو خطوط لکھ لکھ کر بلانا شروع کر دیا۔ (گویا ہمارا دمِ آخر آپہنچا) ہم نے یہ حال دیکھ کر عرض کیا ؎

کیوں جمع کرتے ہو تم عزیزوں کو !

عزیزوں کی آمد پر مُرغ کٹنے لگے۔ اور بریانی کی دیگچی چڑھنے لگی۔ اور ہمارے حصہ میں وہی پھیکی و بدمزہ دال اور روٹی۔ ہمیں وہ دن یاد آگئے جب ہم سالم مُرغ ہضم کر جاتے۔ اور بکرے کی مسلم ران پر ہمارے ہی جملہ داخلی و خارجی حقوق محفوظ رہتے۔ ہائے کیا دن تھے وہ ؎ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ؛ لیکن اب نقش و نگارِ پرہیز مرض یرقاں ہو گئیں

ہمارے دوست احباب اب ہمیں یرقانی پیلے صاحب، پیلا بابو جیسے خطابات سے نوازنے لگے ہیں خطوط میں ہمارا ذکر یوں آتا کہ لال دوست، کالے دوست، گورے دوست کی جانب سے پیلے دوست کو سلام۔ اب ہم خدا کے حضور میں صدقِ دل سے بہ آوازِ بلند دعا کرنے لگے ہیں کہ اے خدا، یرقان سے نجات دلا کیونکہ میں ادیب بننے سے باز آگیا ہوں !

رعنا مطلوب

لنگڑے شرائط

ضرورت ہے ایک شوہر کی جو :

(ا) رات میں بہت دیر سے گھر نہ لوٹے تاکہ کنڈی کھٹ کھٹانے سے محلہ والوں کی نیند خراب نہ ہو۔

(۲) کھانے میں اگر کبھی نمک تیز یا پھیکا رہ جائے تو کھانا اُٹھا کر نہ پھینکیں۔

(۳) جو بد نظر نہ ہو، چونکہ ایسا ہو کہ اگر خادمہ یا سالیاں یا پاس پڑوس کی لڑکیاں جوان ہوں تو ہر وقت گھورا کرے۔

(۴) جو نخرے باز نہ ہو، کہ ذرا سا بیماری میں سارے گھر کو سر پہ اُٹھائے۔

(۵) سر پر تیل مالش کرانے یا پیر دبوانے کا خبط نہ ہو۔

(۶) جو میکہ کے طعنے دینے سے پرہیز کرے۔ اور میکہ جانے سے نہ روکے۔

(۷) غصہ ور نہ ہو اور یہ بھی نہیں کہ ہر وقت بتیسی نظر آتی رہے۔

(۸) کوتاہ قد نہ ہو۔

امیدوار اپنی درخواستیں بھیجیں، مذکورہ بالا ساری خوبیاں نہ رکھنے والے اشخاص پر پوری توجہ دی جائے گی۔ اور ان کے ساتھ ممکن تعاون کیا جائے گا۔ المشتہر نجمہ صدیقی، شملہ روڈ، پٹنہ ۴

ڈاکٹر حسن امام جو ہر روز اخبار "صدائے عام" خریدتے تھے، اُن کی نظر جب ضرورتِ رشتہ کے کالم پر پڑی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ساری شرائط کو پڑھ لینے کے بعد جب اپنا جائزہ لیا تو خود کو ان ساری برائیوں سے پاک پایا۔ اور مطمئن ہو کر خط لکھنے بیٹھ گئے ——— محترمہ تسلیم! ——— آپ کی صاف گوئی نے مجھے متاثر کیا، مجھ میں وہ تمام عیوب نہیں جو آپ کے اشتہار میں تھے۔ بہرحال آپ سے بھی چند باتیں دریافت کرنی ہیں۔ اس کے بعد میں بھی سوچوں گا کہ آپ میری شریکِ حیات بن سکتی ہیں یا نہیں۔

(۱) آپ میں ڈینگیں مارنے کی بیماری تو نہیں یعنی اپنے میکہ کی بڑائی کر کے میری جان عذاب میں تو نہ ڈالیں گی۔

(۲) آپ خوشامد پسند تو نہیں ہیں؟ عورتیں اپنی خوشامد کرانے کے لئے مندرجہ ذیل فقرے دہرایا کرتی ہیں۔ (الف) اگر میں بدصورت نہ ہوتی تو کیا مجھے یہ دن دیکھنے پڑتے (تاکہ بر خوردار شوہر صاحب فوراً کہیں، واہ تم تو بنتِ مہتاب، جنت کی حور ہو، تمہارے صندلی رنگ کے سامنے تو چاندنی بھی پھیکی ہی معلوم پڑتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر ہیما مالنی اور ریکھا چندا اور کر اپنے ہاتھ کاٹ لیں گی (ب) کاش میں جاہل نہ ہوتی (تاکہ جواب ملے کہ تم ڈگریوں کا محتاج تھوڑے ہی ہو، اور پھر تم رحمٰن امام اللہ کا درس اپنی جماعت پاس، ارے قسم تمہاری عقل کے آگے ارسطو پانی بھرتا ہے۔ واہ ماشاءاللہ کیا دماغ پایا ہے (ج) آپ دوسری شادی کر لیجئے تاکہ آپ کو کچھ آرام ملے (اس لئے کہ شوہر بیچارہ فوراً گڑگڑانے لگے، بھلا تمہارے

مقابلے میں کوئی دوسری بھی ہوتی ہے۔ (اور جو آرام تم نے پہنچایا ہے وہ جنت میں بھی میسر نہ ہوگا۔) ۔ (ج) اللہ پاک مجھے آپ ہی کے سامنے دنیا سے اٹھائے۔ مگر زیادہ بچوں کا خیال رکھیئے گا (تاکہ اس فقرے پر شوہر بیوی پر سر رکھ کر زار و قطار روئے اور کہے "اے میری شریک حیات! اے میری شریک غم! جب تک گنگا جمنا میں پانی رہے تیرا سایہ خداوند کریم میرے سر پر قائم رکھے)۔

براہ کرم اگر آپ ان ساری برائیوں سے پاک ہوں تو فوراً جواب دیں تاکہ مزید خط و کتابت کے بعد معاملات طے کئے جاسکیں فقط

والسلام، ڈاکٹر حسن امام، مراد پور (دکنیا)

کئی روز کے انتظار کے بعد ڈاکٹر صاحب کو ایک لفافہ ملا۔ لفافہ چاک کرتے ہی ان کی نظریں لفظوں کی قطار پر پھیلنے لگیں،

محترم سلام و آداب! ـــــ آپ کے جواب سے مطمئن ہوں، آپ نے جتنی باتیں دریافت کی ہیں ان میں سے کوئی بھی میرے اندر نہیں ہے۔ میں اتوار دس بجے کی ٹرین سے گیا آرہی ہوں۔ آپ مہربانی فرماکر چھ بجے شام کو آزاد پارک میں میرا انتظار کریں۔ ہم لوگ کچھ آزاد خیال کے ہیں اس لئے یہ ضروری سمجھتی ہیں کہ شادی سے پہلے ہم لوگ آپس میں مل کر ایک دوسرے کو جان لینے کی کوشش کریں۔ اور ہاں، ہم لوگوں نے تو کبھی ایک دوسرے کو دیکھا نہیں ہے۔ اس لئے نشانی کے طور پر آپ لال ٹائی باندھ کر آئیں میں اپنے بالوں میں لال ربن باندھ لوں گی ـــــ خط پڑھتے ہی ڈاکٹر صاحب کے دل میں خوشی کا طوفان آمڈ پڑا۔ کانوں میں شہنائیاں سی بجنے لگی۔ لیکن آج تو سنیچر ہے۔ یہ خیال آتے ہی ان کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی خیر ایک رات انہوں نے جوں توں کر کے کاٹ ہی ڈالی اور صبح اٹھتے ہی فوراً شیو بنایا، سیلون میں جاکر بال کٹوائے۔ اور غسل خانے کی طرف دوڑ پڑے۔ نہاکر باہر نکلے تو ایک گھنٹہ تک بال سنوارتے رہے۔ اور ناشتہ کرنے ہوٹل چل پڑے۔ فراغت پاکر جب ڈسپنسری پہنچے تو گیارہ بج چکے تھے۔ کچھ دیر ڈسپنسری میں بیٹھے ایک دو مریض دیکھا، اور ایک بجے کے قریب پھر گھر کی راہ لی۔ گھر آکر پھر غسل کیا تاکہ جلد کی رنگت کچھ اور صاف لگے۔ ویسے تو ماشاءاللہ جلد کا رنگ تو صاف تھا ہی۔ بالوں کو خضاب لگا کر کالا کیا جو اب سفید ہو چلے تھے اور قریب پانچ بجے آزاد پارک کی طرف نکل پڑے ـــــ اس وقت پارک میں اچھا خاصہ ہنگامہ تھا۔ لوگ مختلف ٹولیاں بنائے ادھر ادھر چہل قدمی کر رہے تھے۔ بچے گھاس پر بے تحاشہ دوڑ رہے تھے۔ نئے شادی شدہ جوڑے کسی کنج کے نیچے تنہا بیٹھے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول تھے۔ کچھ بے فکر نوجوان دور بیٹھے ہوئے ان جوڑوں کو للچائی ہوئی نظروں سے گھور رہے تھے ـــــ ڈاکٹر حسن امام صاحب پارک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک طرف بڑھ گئے۔ اس وقت ان کے ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنے ذہن میں ملاقات کا ایک خاکہ تیار کرنے لگے۔ اور چاروں طرف نظر دوڑا کر ایک خالی بینچ پر بیٹھ گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد انہیں ایک لڑکی آتی نظر آئی۔ سفید ساری اور سفید بلاؤز پہنے ہوئے لمبی تڑنگی اور تندرست لڑکی تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ ناک نقشہ بھی کافی جاذب نظر تھا۔ سفید ساری میں اس کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب کی نظر لڑکی کے بالوں پر پڑی بے ساختہ اچھل پڑے، لڑکی کی طرف چل پڑے اور جیسے ہی قریب پہنچے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن تعجب تو اس بات پر ہے لڑکی نے جوابی کارروائی نہ کی بلکہ بونکوں کی طرح ڈاکٹر صاحب کا منہ تکنے لگی۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب گھبرا کر بولے: "اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ مجھ صدیقہ ہیں اور میں ڈاکٹر حسن امام ہوں" ـــــ اتنی دیر میں لڑکی بھی سنبھل چکی تھی۔ بولی: "میں مجھ صدیقہ نہیں ہوں آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" ابھی ڈاکٹر صاحب کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک لڑکی کو جو بیساکھی کے سہارے چل رہی تھی۔ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب کی نظر اس کانی سی بیساکھی کے سہارے چل رہی لڑکی کے بالوں پر پڑی جس میں لال ربن بندھا ہوا تھا، سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ اور لڑکی چلاتی ہی رہ گئی "ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے پوچھے ہوئے سارے خرابیوں سے پاک ہوں!"

غالب عرفان

شاعری اور رکشا

یکایک ٹریفک کی سرخ روشنی نظر آئی۔ اور مجھے اپنی سائیکل کو روک دینا پڑا۔ میری الجھن بڑھ گئی۔ کیونکہ مجھے گھر پہنچنے کی
تھی۔ پھر یہ ٹریفک کی سرخ روشنی اف فوہ! .....

آگے ایک رکشا کھڑی تھی۔ جس کی پشت پر لکھا تھا "گیت گاتا چل" آپ اندازہ کیجئے کہ گیت کا ٹکڑا کیا غضب
ڈھایا ہوگا۔ یوں لگا جیسے کوئی میرا منہ چڑا رہا ہے۔ جی میں آئی کہ "گیت گاتا چل" لکھنے والے سے جاکر پوچھوں کہ اس کا کب
ب ہے؟ لیکن ناممکن تھا۔ آخر کس سے پوچھتا؟ غالباً آپ کو ملے پلی چوراہا، لاڈ بازار، لال دروازہ، فتح دروازہ، دبیر پورہ
ں کے گیر تک کی اکثر رکشاؤں کی پشت پر فلمی ٹکڑے لکھے ہوتے نظر آتے ہوں گے۔ ان کے علاوہ 'بوبی'، 'بیراگ' اور 'جگنو'
آزاد، بمک کی فلموں کے نام بھی مع تفصیل و تصویر بہت سی رکشاؤں پر زیور طبع سے آراستہ پائے ہوں گے۔ لیکن میں جن تحریروں
کر کرنے جا رہا ہوں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے اکثر کی نظر ان تحریروں پر بھی گئی ہو لیکن ــــ میں نے جو تاثر
تحریروں سے لیا ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ پھر مزید یہ ہے کہ ملک کی کسی اور زبان میں آپ کو ایسی تحریریں نہیں ملیں گی۔ یہ شرف
اردو اور صرف اردو کو ہی حاصل ہے۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہو کہ اپنا شہر حیدرآباد دکن بھی اردو کا ایک ایسا چمن ہے
کے ہر گل و بوٹے کی لچک پر اردو ہی اردو کے ترانے موزوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ غریب رکشا مالک اس نعمت سے کیوں محروم
ہے۔ دیکھئے اس کی گل افشانیاں کیسے کیسے رنگوں کا امتزاج حسن پیش کرتی ہیں۔

اگر کسی نے اپنے رکشے کی پشت پر یوں ہی "دل" لکھوایا ہے تو دوسرا کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ فوراً آپ کو
رکشے پر نہ صرف "دو دل" لکھا ہوا ملے گا بلکہ وہ دل اپنی تصویری شکل میں یوں ملیں گے کہ ان کے بیچوں بیچ ایک تیر
پیوست رہے گا۔ اور دل کے سوراخ سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں گے۔ اتنا ہی نہیں ذرا آگے بڑھئے اور غور سے
دیکھئے تو "دل کے مارے" بھی ملیں گے۔ اور "ایک دل دو دیوانے" بھی۔ آپ رکشا کے اندر جھانک کر دیکھیں تو آپ
مایوس ہوں گے۔ وہاں آپ کو کسی دل والے کے درشن ہوں گے اور نہ ہی رکشا کے باہر دو دیوانے تعاقب میں ملیں گے

حسبِ ضرورت عکس نظر آئے گا اور رکشہ کے اندر کوئی ضعیفہ براجمان ہوں گی۔ یا پھر کوئی ضعیف ہاتھ میں لاٹھی لئے موجود ہوگا ـ پھر جانے بھی دیجئے! آگے چلئے۔ بات دل کی ہو رہی تھی۔ "ایک دل دو دیوانے" کے بعد "دل تیرا دیوانہ" "پھر دل کی آگ" "دل نے تجھے مان لیا" "دل ہی تو ہے" "دل ایک مندر" "دل دیا درد لیا" دلیپ کمار اور وحیدہ رحمٰن کی لا تصویروں کے ساتھ۔ رکشا کی پشت پر نظر آئیں گے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ غالباً رکشہ راں جو یقیناً نوجوان ا چاہ کرتا بھی ہے کسی ان دیکھی حسینہ کو مخاطب کر رہا ہے کہ پہلے دل دیکھئے۔ دیکھو پھر یہ دیکھو کہ اس کے بدلے میں تمہیں کیا دیتا ہوں۔ اگر کچھ نہ دے سکا تو وہ سارا دن حیدرآباد اور سکندرآباد کی سڑکوں اور گلیوں کی سیر تو مفت ہی کرا

اب ہم آپ کو شعر و شاعری کی دنیا میں لئے چلتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک شعر آپ کو رکشے کی پشت پر درج ملے گا۔ رکشا والوں کو اس سے غرض نہیں کہ شعر صحیح ہے یا غلط۔ پینٹر نے اسے غلط لکھا ہے۔ یا شعر کے الفاظ ادھر ادھر بکھر جانے سے شعر کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ آج تک ہمارا یہ ارمان کبھی پورا نہ ہوا۔ کہ کسی رکشا پر ایک مصرعہ یا ایک شعر ایسا دیکھ لیا جائے جو واقعی درست تحریر ہوا ہو یا پھر بھولے سے ہی سہی شاعر کا نام شعر نیچے درج ہو۔ مرزا غالب کا ایک شعر ایک رکشا کی پشت پر یوں لکھا ہوا ہے ؎

تم شہر میں ہو تو تمہیں کیا غم جب چلیں گے ÷ لائیں گے اُٹھا کے بازار سے جان اور دل اور

یقیناً غالب کی روح تڑپ اٹھی ہوگی اپنے کلام کا یہ حشر دیکھ کر غالب کی روح تڑپے یا مچلے مگر مجھے کیوں غلط شعر پڑھ کر غلط شعر لکھنے والے پر رحم آنے لگتا ہے۔ غصہ اس لئے نہیں آتا کہ آخر غصہ کروں تو کس پر؟ میں یہاں اسی لئے غلط لکھے گئے مصرعے صحیح شکل میں درج کر رہا ہوں۔ کہ تسلسل بگڑنے نہ پائے۔

اس شعری مقابلے کی تو انتہا ہی نہیں ہے۔ اگر کسی من موجی نے کسی مصرعے کے چند الفاظ یعنی "پھر ملیں گے" لکھ تو دوسری رکشا پر یہ مصرعہ یوں ملے گا۔ ع

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

چلئے آگے بڑھیئے اگلا رکشا اپنی عمر کا شکوہ کرتا ہوا ملتا ہے ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن ÷ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

اس شعر میں شاعر کی بے بسی ایک مسلمہ حقیقت ہونے کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ رکشہ راں بھی شعر کے مفہوم سے واقف ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ رکشاؤں پر لکھے گئے پینٹ سے لے کر شعر تک سب کچھ رکشہ مالک ہی پینٹ کرواتا ہے۔ اور ضروری نہیں کہ رکشہ راں اپنی رکشا کا مالک بھی ہو۔ لہٰذا اگر رکشا میں غلط جملے نظر آئیں تو آپ کو کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہیئے ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ÷ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ شعر پڑھ کر آپ سوچیں گے کہ رکشہ راں کوئی ضعیف شخص ہوگا! جی نہیں آگے بڑھئے تو آپ کو ر کی سیٹ پر ایک ایسے نوجوان کو بیٹھا دیکھیں گے جو باقاعدہ بیل باٹم پہنے رنگ دار شرٹ کے ساتھ منہ میں پان ٹھونسے بیٹھا کسی خاتون (جو رکشا سے اتر کر غالباً کرایہ ادا کر رہی ہوں گی) سے کرائے کی کمی کا شکوہ کرتے ہوئے

رہا ہوگا۔ بہرحال اشعار کی جو درگت رکشاؤں پر لکھنے کے بعد بنتی ہے اُس کا ادراک بہ نفسِ نفیس پڑھ کر ہی ہو سکتا
ہے۔ آپ کی دلچسپی کی خاطر بھیجئے کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر ÷ کہ دل ابھی بھرا نہیں ہے

ظاہر ہے کہ مخاطب کوئی لڑکی ہی ہوگی۔ پچھلی رکشا ران کی حالت دن بھر رکشا کھینچتے کھینچتے خون تھوکنے کے
قابل ہوگئی ہو سے

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کے ÷ اُٹھتے نہیں ہے ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

اس شعر کے پڑھنے کے بعد رکشا والے کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ وہ خودکشی ہوگا سراسر غلط ہے۔ وہ
دن بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد چند سکے حاصل کر کے ان سے گھر کا چراغ اور چولہا جلائے گا۔

اشعار کے بعد چلئے ایک اور دنیا کی سیر کراتے ہیں۔ "طوفان میل" ـــ "ہوا گاڑی" "گیتا نجلی" ـــ
"راجدھانی ایکسپریس" جیسے نام بھی آپ کو اکثر رکشاؤں پر لکھے ہوئے ملیں گے۔ لیکن اُن سب ناموں سے آپ کو رکشا کی رفتار
کے بارے میں جو خوش فہمی پیدا ہوگی وہ آپ کی بھول ہے۔ آپ کسی بھی ایسی رکشا پر سوار ہو کر دیکھئے تو نتائج آپکے سامنے خود
بخود ظاہر ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ مجھے نامپلی سے ملے پلی تک کسی کام کے سبب جانا تھا اور منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی لہذا ایک رکشا
جس پر "طوفان میل" درج تھا۔ میں نے یہ سمجھ کر جوائی کر یقیناً یہ مجھے طوفان میل کی سی رفتار سے لے اُڑے گی۔
جیسے ہی میں رکشا پر سوار ہوا اور رکشا راں نے پیڈل مارے فوراً رکشا کی چین اُتر گئی۔ بڑی مشکلوں سے ہاتھ منہ کالا کر
کے اُس نے چین چڑھائی۔ اور رکشا آگے بڑھی۔ کچھ ہی دور چلی ہوگی کہ رکشے کے اگلے پہیئے میں ہوا کم محسوس ہوئی۔
اور رکشا راں قریب کی دکان سے پمپ لے کر ہوا بھرنے لگا۔ ادھر اُس نے ابھی دو یا تین پمپ مارے تھے کہ اُدھر
سے میرے ایک ملیسے شناسا نمودار ہوئے۔ جن کے بارے میں ہمارے دوستوں میں مشہور ہے کہ وہ ایسی جونک ہیں جو
پھر آسانی سے نہیں چھوٹتی۔

بہرحال "قہر درویش بر جانِ درویش" صاحب سلامت کے بعد گفتگو کا جو سلسلہ چھڑا تو ختم ہونے کا نام ہی
نہ لیتا تھا ادھر طوفان میل کا ڈرائیور نہ صرف رکشا کا اگلا پہیہ بلکہ پچھلے دو پہیوں میں بھی ہوا بھر چکا تھا۔ اور اسکے بعد بھی جب کافی دیر
تک ہماری گفتگو ختم نہ ہوئی تو خود ہی جھنجھلا کر بولا صاحب جلدی کیجئے۔ مجھے آور سواریاں کرنی ہیں۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ میں نے
وقت غنیمت جانا اور اُن سے اجازت لی۔ اب جو طوفان میل کی دوڑ شروع ہوئی تو رکشا کے ہچکولے کبھی اِس
پہلو تو کبھی اُس پہلو۔ میں نے رکشا پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ لیکن رفتار کے ساتھ ساتھ سڑک کی ناہمواری کے سبب
رکشا بڑی طرح اچھل رہی تھی۔ اور میں کسی حادثہ کا تصور کر کے لمحہ بلمحہ اپنی موت کو قریب محسوس کر رہا تھا۔ آخر میں نے چیخ کر کہا:
"ارے او بھائی! مجھے جلدی نہیں ہے جانے کی (حالانکہ مجھے بے حد جلدی تھی) آخر کار وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

حبیب نگر کے نالے کے قریب ایک بچے کو بچانے کی کوشش میں رکشا بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرائی اور میں اچھل کر سیدھے
ایک دلدل میں جا گرا۔ خیر جھوڑیئے اپنی خیر منایئے بھلا شور و بیکہ دیکھائی اکثر ملا سفر کیجئے لیکن زحمت نہ کیجئے جس پر یہ عبارت نقش
لکھی ہو۔ "طوفان میل"

ادریس بانکے

[illegible] کی نہیں، مچھر کا بھی لشکر نہیں
اب مرے کمرے میں کوئی خوشنما منظر نہیں

[illegible] یہ میری تانکا جھانکی کے لئے
میں تو اَن میریڈ ہوں میڈم! آپ کا شوہر نہیں

[illegible] عشق کے میدان کا
حسن نے پتھر سے کھائے مات یہ وہ سر نہیں

کیا پتہ کیوں ہوں گھبراتے ہیں دیکھ کر کتنے مجھے
میں تو چپراسی ہوں افسر یا کوئی لیڈر نہیں

دل مرے ملکے میں خراب عشق و الفت ہے حضور
یہ بدیسی منٹے نہیں، سیرپ نہیں، واٹر نہیں

دیر میں کوئی پرندہ کب بھلا آتا نظر
وہ تو کہئے خیر سے بلی نے پایا پر نہیں

[illegible]! حوا کی بیٹی سے محبت ہے مجھے
شیخ صاحب یہ کوئی انگور کی ڈاٹر نہیں

آدمی کو جو کہے بندر وہ ہے بندر کی ذات
ہے مری تحقیق بانکے! آدمی بندر نہیں

شہزاد معصوم

ہم دل کا حال کہہ گئے سارا مذاق میں
لیکن ستم ظریف نے ٹالا مذاق میں

دیکھا ہے ہم نے یہ بھی تماشا مذاق میں
اپنا بھی بن گیا ہے پرایا مذاق میں

آتا ہے کھل کے جب انھیں غصہ مذاق میں
کرتے ہیں ہم کچھ اور اضافہ مذاق میں

رندوں نے شیخ جی کو پڑھایا مذاق میں
حضرت نے بھی زباں سے چکھا مذاق میں

چھیڑا تھا پہلے آپ نے میرا قصور کیا
کیا خوب منہ چھپا لیا اُلٹا مذاق میں

اس شوخ کے فریب تبسم میں آ گئے
شہزاد ہم بھی کھا گئے دھوکا مذاق میں

ایک ماڈرن لڑکی کی دعا

الٰہی مجھے سیدھا رستہ بتا دے
کہ ہفتہ میں اک دن سینما دکھا دے

مجھے ہیروئن کی سی خوبی عطا کر
جو دیکھے وہ خوش ہو کے مجھ کو دعا دے

بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے مطلب
زباں کو میری مثل قینچی بنا دے

سدا لکھنے پڑھنے سے بیزار ہوں میں
سر امتحاں نقل کرنا سکھا دے

پڑھانے جو آئیں مجھے ماسٹر جی
تو موڑ کوئی ان کو دھکے لگا دے

اسی کو سناؤں گی اپنی کہانی
کوئی مجھ کو پگلی سے چل کر ملا دے

وسیمہ پگلی کٹکی

اور وہ بھی اس طرح کہ ان شعراء نے قدیم حیدرآبادی زبان کو اپنے خیال کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور پرانی نئی زبان کے امتزاج سے ایک نئی زندگی کو جنم دیا جو دکنی نہ ہوتے ہوئے بھی دکنی کہلائی۔ اصل میں یہ زبان پرانے شہر کی گھریلو زبان ہے۔ جیسے نذیر احمد دہقانی، علی صاحب میاں، اعجاز حسین کھٹا اور بعد میں سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب نے استعمال کیا۔ اور یہی چند نام دکن میں اردو مزاحیہ شاعری کی ضمانت ہیں۔ دکنی یا مقامی زبان میں مزاحیہ شعر گوئی کے نتیجہ میں ایک تو مقامی زبان کو قابل استعمال بنایا گیا دوسرے شمالی ہند میں خالص اردو میں جو مزاحیہ شعر کہے جا رہے تھے اس سے الگ اپنی دنیا آپ بسائی۔ اس طرح زبان کے اعتبار سے اردو میں مزاحیہ شاعری دو علٰحدہ علٰحدہ خطوط پر پروان چڑھنے لگی ہے۔ خصوصاً دکن میں تو مقامی اردو ہی کو قبولیت عام کا درجہ حاصل ہے چنانچہ بعد کے جو شعراء ہیں انھوں نے بھی دلاور فگار کی نہیں دہقانی ہی کی زبان کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا ہے اور وہ خاصے مقبول اور ہر دل عزیز بھی ہیں۔ لیکن بعض نظمیں سلیمان خطیب نے ادبی زبان میں بھی لکھی ہیں اور یہ نظمیں لب ولہجہ، گہرے طنز اور مزاح کے اعتبار سے خوب ہیں۔ اس طرح خطیب ہی تنہا شاعر ہے جس نے ادبی اور مقامی دونوں زبانوں میں مزاحیہ شاعری کی روایت ڈالی ہے۔ اس سلسلہ کی سب سے اچھی مثالیں مخدوم کی نظم "ایک چنبیلی کے منڈوے تلے" کی پیروڈی ادبی نقطۂ نظر سے اور مقامی زبان کی اعتبار سے "یاد" جیسی کلاسیکی نظمیں ہیں۔

حیدرآبادی دکنی شاعری جو مزاحیہ شاعری کا دوسرا نام ہے کی ابتدا پچھلے پچاس سالوں میں ہوئی۔ اور اس شاعری کے بانی مبانیوں میں نذیر احمد دہقانی کا نام زیادہ روشن ہے۔ دہقانی نے اپنے مخصوص لب ولہجہ کے ذریعہ دکنی شاعری کو عوامی بنایا۔ اس نے ابتداء ہی سے عوامی احساسات اور جذبات کو دکنی شاعری میں پیش کیا۔ اس طرح دکنی شاعری اپنی پیدائش ہی سے عوامی، جمہوری، ذرسیکولر بنیادوں پر قائم ہے اور اس کے اسی مزاج نے سماج کے ہر طبقہ میں اسے مقبول بنایا۔

چنانچہ دہقانی کی نظم "کب تلک" ان کے سماجی شعور اور ذوقی آزادی پر دلالت کرتی ہے

جاتے رہینگا پیچھے پیچھے ہن کو ہاتاں کب تلک

سر پو پوٹلی کب تلک آپڑے لاتاں کب تلک

اس کی دوسری نظمیں موٹ کا گیت، لکو، اور شاعر اور برسات بہت مشہور ہوئیں۔

علی صاحب میاں اپنی نظم "لیو خطبہ" کی وجہ سے عوام میں بہت جلد مشہور ہوئے۔ علی صاحب میاں نے بھی دہقانی کے انداز کو اختیار کیا اور عام آدمی کے حساسات اور جذبات ہی کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی۔ چنانچہ جنگ چلتے اور قطعات میں ہمارے سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کی جھلکیاں نمایاں طور پہ ملتی ہیں۔ معاشی استحصال کی طرف اشارہ کیا ہے

باغ لگا رہوں محنت سے پھل دوسرے کھا رہیں لیو خطبہ

کانکو میں مٹی دالے سو دالے منہ میں بھی بھارئیں لیو خطبہ

"چوسے" کے زیر عنوان علی صاحب میاں نے جو قطعات لکھے ہیں وہ ادب میں منفرد چیز ہے۔ تو ذائقہ کے لئے دو چوسے پیش خدمت ہیں

گھی ترکی آلی کے بوٹیاں لگ گئے انجیر کو

اک گلیہری بند دیئے ہیں بھینس کی زنجیر کو

شاعراں اب بول رئیں نوئے قسم کی شاعری

ایک مصرعہ تیر کو تو ایک مصرعہ تکبیر کو

دیہاتی، علی صاحب میاں، گھنٹہ، ذوقی، ان ہی لوگوں کے خطیب کے بعد دکنی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اور یہ دور عبارت ہے زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ مزاحیہ شعراء کی تخلیقات سے۔ مزاح اور طنز کو جس ادارے نے تحریک کی صورت عطا کی یقیناً وہ زندہ دلان حیدرآباد ہے۔ چنانچہ اس کے طرز کا کئی ہندوستانی اداروں پر منتقل ہونے والے اثرات اجلاسوں اور مشاعروں میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ خود حیدرآباد میں جشن مزاح کا انعقاد ملک بھر میں اپنی نوعیت کی پہلی اور کامیاب کوشش تھی اس طرح حیدرآباد نے ملک و بیرون ملک کے اردو شعراء کو مزاح اور طنز کی طرف متوجہ کیا اور اس ادب کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر بلندی ثریا پر کردیا۔ یقیناً یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اثر جن شعراء نے طنز و مزاح کے میدان میں اپنی نیک نامی کے جھنڈے گاڑے ہیں ان میں حمایت اللہ اپنے منفرد خیال کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ حمایت اللہ کے لکھنے اور پڑھنے کا انداز بھی خوب ہے۔ وہ ایک عدد "اپ کا ڈبہ" کے ساتھ ادب میں داخل ہوئے لیکن ان کی غزلیں اور چٹکلے بھی پسند ہوتے ہیں ؎

ارے ایک اپ کے ڈبے تو میرے کھیلاں بگاڑاتا
پھر خوشیوں کی کھیتی کو میری آکو اجاڑاتا
میں تیرے بیٹ اور وہ کالے کلوٹے بیل اچھا تھا
یو منہ منہ سے پوچھے جاتی ہماری بیل اچھا تھا

منہ کا مزہ بدلنے کے لیے حمایت کا ایک شعر پیش ہے ؎

میں رویا تو آنسو سے ٹب بھر گیا تھا
اُنوں اس میں بھینس کو نہلا کو چلے گئے

برقؔ آشیانوی کا تعلق ہمارے شعراء کے بزرگ طبقہ سے ہے۔ نام میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ ان کی شاعری میں موجود نہیں ہے۔ طنز و مزاح کو انھوں نے اوڑھنا اور بچھونا اس طرح بنا لیا ہے کہ وہ نثر بھی لکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ ایک شعری اور مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ برق آشیانوی جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ معاشرہ کی اچھائیاں اور برائیاں ان کی نظروں سے چھپ نہ سکیں۔ قطعات بھی کہتے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے:

انتظار بس میں کیا بتلائیں کیا کیا ہو گیا
کیو میں ٹھیرے ٹھیرے سب کا حال پتلا ہو گیا
گھر سے تو آیا تھا سالم گھٹ کے پونا ہو گیا
اور جو پہلے سے آدھا تھا اور آدھا ہو گیا

حمایت کے علاوہ مصطفیٰ علی بیگ اور صبغتہ اللہ بیباک شعراء ہیں۔ مصطفیٰ علی بیگ کی نیم صوفی و نیم مجذوبانہ یعنی اردو انگریزی شاعری خوب ہے اور دونوں زبانوں کے لفظوں کے استعمال سے وہ طنز بھی کرتے ہیں اور مزاح بھی پیدا کرتے ہیں۔ یہ اپنے انداز کے منفرد شاعر ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی اچھا ہے اور شعر پڑھتے پڑھتے منہ ٹیڑھا کر لیتے۔ وہ کمر کو جھکا کر ہاتھ نچانے لگتے ہیں تو سراپا گویا ہو جاتے ہیں۔ صبغتہ اللہ بیباک اسم با مسمیٰ شاعر ہیں۔ فکر کی گہرائی جیسے اس نئی نسل کے شعراء کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دیہاتی سے لے کر خطیب تک جو سماجی شعور ہمیں دکنی شاعری میں ملتا ہے وہ ایک روایت کی صورت اختیار کر لیتا

پرویز ید اللہ مہدی

چہ خوب — ۳۰

ہم جتنی دیر سانپوں کے مسکن میں رہے صرف مسکین صورت بنائے تماشہ دیکھتے اور اپنے رونگٹے کھڑے کرواتے رہے۔ جب کھڑے کھڑے ہمارے رونگٹوں کے پاؤں شل ہو گئے، تب کہیں ہمیں اس خطرناک تماشے اور مخصوص وضع کے لباس سے نجات ملی۔ طوطا پری سے بات کرنے کا موقع ہمیں اس کے پرائیویٹ کیبن میں ملا۔ اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

" فرمائیے! آپ نے یہاں تک آنے کی تکلیف کیسے گوارا کی۔!"

" آپ کو شاید یاد ہوگا کہ پچھلی ملاقات میں، میں نے کہا تھا کہ اب آپ سے اُسی روز ملاقات ہوگی جب آپ کے خلاف کوئی ثبوت میرے ہاتھ لگے گا۔! اتنا کہہ کر ہم نے طوطا پری کا بٹوہ جو ویران بنگلے کی چھت پر ملا تھا۔ اس کی طرف اُچھالتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا —— یہ رہا آپ کے خلاف ایک جیتا جاگتا ثبوت —— بٹوہ اپنے ہاتھوں میں جھیلنے کے بعد طوطا پری نے اُسے غور سے دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بلکہ ہمیں ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر ایک سفاکانہ مسکراہٹ سے بولا —— " ثبوت تو میرے بھی ہاتھ لگ چکا ہے شہزادہ صاحب،" —— طوطا پری کے اس غیر متوقع انکشاف پر ہمارا گڑبڑانا لازمی تھا۔ پھر بھی ہم نے اپنے لہجے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے پوچھا —— " کس کے خلاف۔؟" " اصلی مجرم کے خلاف —— اُس کا جواب جس قدر مختصر تھا۔ اتنا ہی غیر واضح اور اُلجھا ہوا بھی تھا! —— چنانچہ ہم نے وضاحت طلب کی:

" اچھا اصلی مجرم کون ہے!" —— " معلوم ہوتا ہے آپ ہمیشہ پکا پکایا کھانے کے عادی ہیں" اُس نے طنز کا تیر چلایا۔ اتنی آسانی سے اُلجھی ہوئی گتھیاں نہیں سلجھتیں —! شہزادہ صاحب! بڑی محنت بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑی ہے۔ تب جا کر کہیں یہ ثبوت ہاتھ لگا ہے! لہذا ذرا اپنی ذہانت بھی استعمال کیجئے۔ آپ کی ذہانت نے تو چند ہی دنوں میں ساری بستی میں اپنا سکہ جما لیا ہے۔ ذرا ذہن پر زور دیجئے۔ اتنا کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور ہم نے جھلا کر اپنی ذہانت کو بے نقط صلواتیں سنا ڈالیں۔ جس کا سکہ خواہ مخواہ ہی بستی میں جم گیا تھا۔ ورنہ سچ پوچھئے تو ہمارا یہ سکہ ایک مدت

ان کے زائل کردہ جبڑے کے جھٹکے سے بھی گیا گزرا تھا۔ ہم نے اپنی ذہانت کے جبڑے کے جھٹکے کو یاد آتے طلاق
رجبڑے کی زبان ہلاتی ـــ "مسٹر فولادی آپ اپنے پر پھیلاتے ہوئے آسیبی جال میں پوری طرح پھنس چکے ہیں اب
سوانگ کوئی پینترا آپ کو اس جال سے نہیں نکال سکتا ـــ بہتری اسی میں ہے کہ آپ اپنے جرم کا اقرار کر لیں اور
کو قانون کے حوالے کر دیں ـــ"

جرم کا اقرار ـــ قانون کے حوالے ـــ" طوطا پری نے ہمارے لہجے کی ہو بہو نقل اتاری اور پھر
زوردار قہقہہ لگا کر ـــ مزید بولا ـــ "اگر میں اپنے اس جرم کا اقرار نہ کروں جو میں نے نہیں کیا۔ لیکن آپ
ہیں کہ میں نے کیا ہے تو کیا آپ کے سمجھنے سے قانون مجھے مجرم قرار دے گا ـــ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قانون واقعی اندھا
جو ثبوت کے طور پر آپ کے پیش کئے ہوئے میرے اپنے بٹوے کو دیکھتے ہی مجھے پھانسی کا حکم سنا دے گا۔ ویسے
کو یہ میرا بٹوہ ملا کہاں؟ ـــ" آسیب زدہ بنگلے کی چھت پر ـــ" ہم نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر
ـــ "اور یہ ثبوت جس وقت میرے ہاتھ لگا اُس وقت نواب صاحب قبلہ، شبو اور گھر کے دو عدد نوکر بھی موجود
ـــ!"

"یعنی کہ نواب صاحب اور ان کی ساری پلٹن اس کی چشم دید گواہ ہے ـــ" طوطا پری نے یہ جملہ بظاہر
بھولپن سے ادا کیا۔ لیکن طنز کی کاٹ ہمیں اچھی طرح محسوس ہوئی۔ گویا سارے مجرمین نے مل کر ایک بے گناہ شخص کو
پھنسنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ اپنی دانست میں ـــ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بٹوے کی موجودگی سے پولیس یہ باور کر لے گی
جائے واردات پر میں بھی موجود تھا ـــ تھوڑا بہت قانون میں بھی جانتا ہوں شہزادہ صاحب!" صرف تفہیم کرکے
جاننے کے لئے قانون کی ڈگری نہیں حاصل کی ہے میں نے ـــ" طوطا پری کے قانونی پینتروں نے ہمیں واقعی بوکھلا
تھا بلکہ ایسا لگتا تھا کہ اگر کچھ دیر اور ہم اس کے قانونی پینتروں کی زد میں آتے رہے تو بے گناہ ہونے کے باوجود
مادر ضبط ہم خود جرم کا اقرار کر لیں گے۔ ہمیں یوں بوکھلایا ہوا دیکھ کر اس نے انٹرکوم کے ذریعے اپنے نوکر کو
سرد، ٹھنڈے مشروب بھجوانے کہا۔ پھر ہم سے ملائم اور ٹھنڈے لہجے میں بولا: ـــ" دیکھا آپ نے
ثبوت پر تکیہ کئے ہوئے اتنی دور سے آپ یہاں تشریف لائے تھے وہ تکیہ تو دور تکیے کا غلاف بھی نہیں نکلا"
اپنی اس عدیم المثال تشبیہ پر خود ہی ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی پر ہم نے جھنجھلا کر کہا ـــ" اگر میرا لایا ہوا ثبوت
کی نظر میں تکیہ کا غلاف بھی نہیں ثابت ہوا تو آپ اپنا ثبوت پیش کیجئے۔ دیکھتا ہوں آپ جس ثبوت پہ
ٹکے ہوئے ہیں وہ واقعی کوئی تکیہ ہے یا گاؤ تکیہ ـــ"

"واہ! واہ! بہت خوب ـــ مگر راز شاد اتنی دیر سے میں ہی یہ سمجھے ہوئے تھا کہ آپ اپنی ذہانت کے
زور آتے ہیں لیکن معلوم ہوا کہ وہ ساتھ ہی ہے۔ شاید آپنے کچھ دیر کے لئے چھٹی مانگی تھی ـــ"

طوطا پری نے یوں داد دینا شروع کی ـــ جیسے اتنی دیر سے ہمارے بیچ کسی سنجیدہ ترین مسئلہ
بات چیت نہیں ہو رہی تھی بلکہ ہم آئے کوئی مزاحیہ غزل سنا رہے تھے۔" اتنے میں مشروب کی ٹرے لئے
[illegible] کے آتے ہی اس نے مشروب کا ایک گلاس ہماری جانب بڑھاتے ہوئے پھر وہی بات دہرائی [illegible]

"[illegible] نہیں تو ہم کوشش کریں گے [illegible] سے [illegible] سنا [illegible] —— [illegible] اس دوران میں کم ہو جاتی۔ جواباً ہم نے بھی مسکرا کر پوچھا —— اس سے [illegible] آپ کا کیا کام بن جائے مقصد کی طرف لوٹ آئیے"

"گویا آج آپ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اپنا گوہر مقصود حاصل کر کے ہی لوٹیں گے ——" اس نے ایک نظر [illegible] ہمارے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا —— پھر ہلکی سی ہنسی ہنس کر بولا —— "نیز آپ بھی کیا یاد کریں گے —— آپ پہلے نوجوان ہیں جن کی آنکھوں میں میں نے اپنی نادرہ کے لئے کبھی ہوس نہیں دیکھی —— [illegible] سے میری نظر میں آپ کا رتبہ بڑھ جاتا ہے —— آپ کی —— میں آپ کو مایوس نہیں لوٹا سکتا —— بس اتنی درخواست کروں گا کہ آج رات تک انتظار کیجئے۔ بلکہ میرا ساتھ دیجئے، جس آسیب زدہ بنگلے میں آپ کو میرا [illegible] بلایا ہے وہاں آج رات [illegible] پہنچ جائیے گا دیکھئے نہیں، نواب صاحب قبلہ اور شبو کے بغیر اس آسیبی ڈرامے کا ڈراپ سین نہیں ہو سکتا۔ اس [illegible] کی موجودگی بھی بے حد ضروری ہے۔ ہماری تو ہری شش تھی —— اندھا کیا چاہے ؟ دو آنکھیں اور یہیں تو آنکھوں کے ساتھ [illegible] کی [illegible] بھی مل گئی تھی —— جب ہم وہاں سے رخصت ہوتے تو یہی سوچ رہے تھے کہ اگر ہمارے تمام [illegible] کر بھی زور لگا دیتے تو لوطف پری کو آج رات اس آسیب زدہ بنگلہ میں آنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ [illegible] ناکامی کے ساتھ ذہن کے ایک گوشے میں یہ [illegible] سوال بھی کلبلا رہا کہ آخر ایسا کون سا ثبوت لوطف پری کے [illegible] ہے جو وہ اس قدر دھڑلے کے ساتھ اس جگہ پر آنے کو خود بخود تیار ہو گیا جو ہماری دانست میں اس کے [illegible] کے مترادف تھی —— !!!

"ہر مجرم اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے ایسی بوکھلاتی ہوئی چالیں چلتا ہے شہزاد صاحب !" بے دھڑک [illegible] کے بعد ہمارے تذبذب کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن لوطف پری نے کچھ اس طرح ہمارے [illegible] اور [illegible] کی تھی کہ ہم بے دھڑک کے اس مختصر سے جواب سے مطمئن نہیں ہو سکے —— لیکن وہ تو کسی ٹھوس ثبوت کی بات کر رہا تھا۔

"آپ بھی کیسی ناسمجھی کی بات کر رہے ہیں، اگر اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا تو وہ نواب صاحب، شبو اور آپ کو اس آسیب زدہ بنگلے میں کیوں بلاتا۔ سیدھے پولیس کے پاس جاتا کیونکہ اس کیس میں اس کا [illegible] سب سے زیادہ پھنسا ہوا ہے ——"

بے دھڑک کی اس دلیل نے وقتی طور پر مطمئن ضرور کر دیا لیکن دماغ میں کھلبلی مچی ہی رہی۔ علاوہ [illegible] بھی بار بار ہمارے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا کہ لوطف پری سے اصلیت اگلوانے یا اعتراف جرم کروانے کے لئے بے دھڑک نے بھی ٹھوس ثبوت اکٹھے کئے ہیں۔ یا وہ بھی صرف [illegible] پر ہی [illegible] بیٹھا ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ دال گلنی ناممکن ہے —— جب ہم نے اس طرف بے دھڑک کی توجہ مبذول کروائی تو وہ کچھ دیر تک خلاء میں یوں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا جیسے [illegible] میں ثبوت تلاش رہا ہو —— پھر [illegible] —— خود نادرہ [illegible] اپنے جسم

[illegible] کر دا سکے گی

نادرہ مرحومہ کی روح ....؟" ہم نے ہکلا کر کہا

"جی ہاں! دراصل جیسا کہ آپ نے بھی شاید سنا ہوگا کہ بعض لوگوں کی مدد سے ایسے آلات [illegible] ہیں جن کے ذریعہ سے کوئی بھی ماہر روحانیات روحوں سے رابطہ قائم کر سکتا ہے ـــــ" بے دھڑک کی یہ [illegible] اگرچہ ہمارے لئے ایک دم نئی نہیں تھی۔ تاہم اس قسم کے تجربے اب تک صرف مغرب ہی میں ہوتے آئے ہیں۔ اور پھر روحوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے کسی ماہر کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہے۔ کیا بے دھڑک نے ایسے کسی ماہر کو [illegible] ہے۔ جب اس سلسلہ میں ہم نے اس سے دریافت کیا تو وہ مسکرا کر بولا ـــــ "کیا ضروری ہے کہ کوئی [illegible] ماہر روحانیات بھی موجود ہو اور رابطہ کے آلات بھی۔ کیا اس قسم کا ماحول بنانے ویسی ہی فضا تیار کرنے سے کام نہیں بنے گا ـــــ!" اتنا کہہ کر رُک گیا۔ سوالیہ نظروں سے چند ثانیوں تک ہمارے حیرت زدہ چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا: "میں کہتا ہوں اگر اس قسم کا پُراسرار ماحول بنایا جائے تو مجرم کیا؟ مجرم کے فرشتے بھی اپنے جرم کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ـــــ اور پھر آپ تو جانتے ہی ہیں، کہ وہ آسیب زدہ [illegible] کس قدر دہشت ناک ہے ـــــ اور پھر یہ ہماری ڈرامہ بازی پوری طرح بناوٹی تھوڑے ہی ہوگی۔ اس میں پچاس فیصد اصلیت بھی ہوگی ـــــ ملاحظہ فرمائیے ـــــ" اپنی بات مکمل کرتے کرتے اس نے بیاگ میں سے ایک عدد پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈ نکالا اور سوئچ آن کر دیا جو کیسٹ اس وقت اس میں موجود تھا اس میں مرحومہ نادرہ کی آواز محفوظ تھی۔ یہ شاید کسی ٹیلیفونی گفتگو کے دوران ریکارڈ کیا گیا تھا۔ کچھ دیر تک یہ کیسٹ سنانے کے بعد اس نے دوسرا کیسٹ سنایا ـــــ اس میں بھی [illegible] ہی کی آواز تھی۔ لیکن اس میں مرحومہ نے اپنا نام پتہ وغیرہ دہرایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی چند عجیب عجیب سے [illegible] جملوں کے بیچ بیچ نہیں کہیں خاصا وقفہ تھا۔ بے دھڑک نے ریکارڈ کا سوئچ آف کر دیا۔ اور بولا: "پہلے کیسٹ میں نادرہ کی آواز تھی۔ دوسرے کیسٹ میں کسی اور کی آواز ہے۔ لیکن نادرہ کی آواز سے ملتی جلتی ـــــ اور بیچ بیچ میں جو وقفہ آپ نے محسوس کیا وہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں موقع محل کے اعتبار سے نادرہ کی آواز بھی بھری جائے تاکہ چالاک مجرم کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ اور ساتھ ہی ـــــ ساتھ ہی روحوں سے رابطہ قائم کرنے والے ماہر کو بھی اس وقفہ کے دوران اپنے سوال کرنے کا موقع مل جائے ـــــ" بے دھڑک کی ان پُراسرار تیاریوں نے نہ صرف ہماری زبان کو گم کر دیا تھا بلکہ دل و دماغ کو بھی مفلوج کر دیا تھا۔ ہمیں یوں گم سم دیکھ کر وہ بولا ـــــ "اب کیا مجرم اس پُراسرار شکنجے سے بچ سکتا ہے۔ بے دھڑک کے اس سوال پر ہمیں نے ذرا ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ پھر زبان ہلائی "چال اپنی جگہ بے حد مضبوط ہے۔ لیکن ماہر روحانیت کی جگہ کون پُر کرے گا؟"

"آپ ـــــ!!" بے دھڑک کے اس انکشاف پر ہمیں یوں لگا جیسے برسوں پہلے ہیروشیما پر گرائے جانے والے بم کی مادہ ہم پر آ گرا ہو ـــــ کہاں ایک بھرا پُرا شہر ہیروشیما اور کہاں ہماری ذات۔ برکات [illegible] شمار تو ہاشماؤں میں بھی نہیں ہوتا ـــــ"

بے دھڑک نے ہمیں یوں حیرتوں کا کرہ ہمالیہ بنا دیکھ کر پوچھا ـــــ کیا آپ مرحومہ کی روح کو

سکھوں پہچانے گئے تھے اتنا نہیں کر سکتے ـــــ بغداد کے چور کے رول میں تو آپ نے بھی کمال کر دیا تھا۔ تھوڑا سا چونک گئے ـــــ

"وہ بات اور تھی جناب ـــــ ہم نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا ـــــ وہ ہنسی کھیل والی بات تھی اور یہ آپ خود محسوس فرمائیے کیا میں شکل سے ماہر روحانیات لگتا ہوں ـــــ"

جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے میں آپ کا حلیہ ہی بدل دوں گا ـــــ ماہر روحانیات کی شکل میں اگر آپ خود کو ایک بار آئینے میں دیکھ لیں تو بیک اپ کے نیچے اپنی اصلیت کو مردہ سمجھ کر خود اپنی روح سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر ڈالیں" ـــــ بے دھڑک نے اپنے ماہرانہ ہاتھوں کو ہماری پھٹی پھٹی آنکھوں کے آگے نچاتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہماری تسلی پھر بھی نہیں ہوئی ہم نے ایک اور پنخ نکالی ـــــ اس کے باوجود اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو گئی اور آپ کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تو ـــــ!" ہماری اس بات پر بے دھڑک کسی گمبھیر سوچ میں ڈوب گیا ـــــ اور جب دوبارہ ابھرا تو ٹھوس لہجے میں بولا: ـــــ "ہمارا یہ وار خالی نہیں جانا چاہیئے" ـــــ ارے ہاں یاد آیا، خان فولادی نے تو شاید شبو اور نواب صاحب قبلہ کے ساتھ آپ کو بھی جائے واردات پر موجود رہنے کے لئے کہا ہے ـــــ"

"ہاں ـــــ میں تو یہ بھول ہی گیا تھا" ـــــ ہم نے فوراً لقمہ دیا ـــــ "یہ احساس ہمارے لئے وقتی طور پر بڑا فرحت بخش ثابت ہوا۔ چنانچہ ہم واپس اپنی ترنگ میں آ گئے۔ لہٰذا لگے ہاتھوں بے دھڑک کو مشورہ بھی دے ڈالا ـــــ میری مانئے تو بیک اپ کر کے آپ خود ماہر روحانیات بن جائیے ـــــ"

"میں ـــــ!!!" بے دھڑک نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ـــــ آپ ـــــ کیونکہ خان فولادی نے آپ کی وہاں موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ہو سکتا ہے آپ کو دیکھ کر ہاتھ آیا ہوا شکار دوبارہ نکل جائے ـــــ"

"کیا وقت پر بات آپ کے ذہن میں آئی ہے۔ میرا تو خیال ہی اس طرف نہیں گیا۔ بے دھڑک نے ہماری طرف ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ

ہم نے اس کی کہی ہوئی بات میں اپنی بات ملائی ـــــ اس طرح آپ بھی وہاں موجود ہوں گے۔ اور خان فولادی کو شک بھی نہیں ہو گا ـــــ"

اس وقت تین بجے ہیں میں ایک ہی کیسٹ میں دونوں آوازیں منتقل کر کے اپنے میک اپ کے سامان کے ساتھ اندھیرا ہوتے ہی آسیب زدہ بنگلے میں پہنچ جاتا ہوں ـــــ"

بے دھڑک نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر جیسے اسے کچھ اور یاد آ گیا ہو۔ بولا: "میں مغالطے دور سے اپنے کچھ معتبر دوستوں کے آدمی آسیب زدہ بنگلے کے اطراف پھیلا رکھے ہیں تاکہ خان فولادی یا اس کے گرگے چھپ کر اس بنگلے میں داخل ہو کر پہلے ہی سے کوئی چال یا کوئی گڑبڑ نہ کر سکیں ـــــ"

بے دھڑک کے اس دور اندیشانہ اقدام پر ہم نے اپنے مصافحے کو اور زور دار بنا کر گویا اس کے اس اقدام کی ستائش کی اور پھر طوطا پری کی نقل و حرکت کے متعلق سے مزید اطمینان کی خاطر پوچھا ـــــ"

"مجھے کی مدد تک تو خیر آپ کے آدمی نظر رکھے ہوئے ہیں لیکن خدانخواستہ اگر باہر سے کوئی گل کھلا کر آئے تو ——" "یہ وسوسہ آپ دل سے بالکل نکال دیجئے ——" بے دھڑک نے ہمارا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا —— "میں اس فتنہ پرداز کی طرف سے بھی غافل نہیں ہوں۔ جس وقت آپ اس کی بیوہ شری گئے تھے میرے آدمی آپ کے پیچھے پیچھے وہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر کلب اور جہاں جہاں بھی اس کا آنا جانا ہوتا ہے وہاں وہاں میرے آدمی اس کی ہر نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوتے ہیں —— بے دھڑک کے اس انکشاف پر ہم پوری طرح مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوتے ——

(باقی باقی)

آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کی تشکیل جدید

حکومت آندھرا پردیش نے آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کے لئے حسب ذیل اصحاب کو تین سال کے لئے نامزد کیا ہے۔ بورڈ آف گورنرس کے ابتدائی ۱۸ ارکان ایگزیکیٹو کونسل کے بھی رکن رہیں گے جس کے صدرنشین جناب حافظ ابویوسف ایم ایل سی ہیں:

ارکین ایگزیکیٹو کونسل :

جناب ایم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج — صدر
جناب محمد ابراہیم خان ایم ایل اے نائب صدر
جناب حافظ ابویوسف صدرنشین مجلس عاملہ
وزیر تعلیم حکومت آندھرا پردیش — رکن
جناب سید ہاشم علی اختر آئی اے ایس "
جناب عابد علی خان "
جناب سید نعمت علی "
جناب سلطان صلاح الدین اویسی ایم ایل اے "
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ "
جناب اکرام جاوید "
جناب شیو رکھو شیلا ایم ایل اے "
جناب سردار جیتان بار ایٹ لا "
جناب ایم اے عباسی "
جناب اعجاز قریشی "

ڈاکٹر زینت ساجدہ رکن
پروفیسر فقیر پاشا قادری (کرنول) "
جناب سید مصطفےٰ کمال "
معتمد محکمۂ تعلیمات "
معتمد محکمہ فینانس ڈپارٹمنٹ "
جناب چندر سری واستو (سکریٹری / ڈائرکٹر) "

بورڈ آف گورنرس مذکورہ بالا ارکین کے علاوہ

ناظم اسکول ایجوکیشن و ناظم اعلیٰ تعلیم "
ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی "
جناب [illegible] ایڈیٹر روزنامہ [illegible] "
جناب حسن الدین احمد آئی اے ایس "
جناب سید عظیم الدین ایڈوکیٹ "
ڈاکٹر حسینی شاہد "
ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید "

(باقی صفحہ [illegible] پر)

پھولیں گے اگر خدا لایا

اردو اکیڈیمی کی تشکیل نو پر آندھرا پردیش ہی نہیں بلکہ دوسری ریاستوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔ تین سال قبل اردو اکیڈیمی کی تشکیل پر ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کے حلقوں میں سخت ناراضگی و بے چینی کا اظہار کیا گیا تھا۔ کیونکہ سابقہ حکومت نے "اردو اکیڈیمی" میں اردو والوں ہی کو نظرانداز کر دیا تھا۔ نئی تشکیل شدہ اکیڈیمی یقیناً ریاست کی نمائندہ اکیڈیمی کہی جاسکتی ہے۔ جس میں اردو کے تمام اہم اداروں انجمن ترقی اردو، ادبی ٹرسٹ، تحفظ اردو، ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی، اقبال اکیڈیمی اور ادارۂ ادبیات اردو کے علاوہ اساتذہ اردو، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو خاطر خواہ نمائندگی دی گئی ہے۔ تلنگانہ کے تقریباً تمام اضلاع اور آندھرا کے بھی نمائندے اکیڈیمی کے لئے نامزد ہوسکے ہیں۔ اکیڈیمی کے ڈائرکٹر و سکریٹری کے عہدہ کے لئے ممتاز صحافی اور تقریباً بیس برس سے اردو تحریک سے وابستہ شخصیت چندر سری واستو کا انتخاب عمل میں آیا ہے اور اس ادارہ کے میر کارواں جناب ایم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج ہیں جن کی اردو مسائل سے دلچسپی سے اردو والے بخوبی واقف ہیں۔ ہم ڈاکٹر ایم چنا ریڈی وزیر اعلیٰ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اس ادارہ کو صحیح معنی میں جمہوری روپ عطا کیا۔ اور اردو کیلئے کام کرنے والوں کو یکجا کیا۔ ☆☆

ڈاکٹر [illegible] رشید	رکن
جناب [illegible]	"
جناب اوج یعقوبی	"
جناب سرینواس لاہوٹی	"
ڈاکٹر رشید موسوی	"
جناب شاذ تمکنت	"
محترمہ آمینہ انصاری کارپوریٹر	"
جناب عاتق شاہ	"
جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف	"
جناب داؤد اشرف	"
جناب نذیر احمد	"
جناب امان اللہ خاں ایم ایل اے	"
ڈاکٹر ایم آر دین	"
جناب انصر بیگ	"
جناب ظہیر الدین احمد	"
جناب محمد اسمٰعیل	"
جناب سید عبد الجبار خاں	"
جناب مرزا وحید احمد بیگ	"
جناب نصرت فاروقی	"
جناب جلیل پاشاہ	"
جناب باقر آغا ایم ایل اے	"
جناب حبیب اللہ [illegible]	"
جناب جمیل امرت	"
جناب چندر سری واستو (سکریٹری و ڈائرکٹر)	

میری والدہ محترمہ کے سانحۂ ارتحال (۲۴/فروری ۱۹۷۹ء) پر قارئین و معاونین "شگوفہ" اور دیگر احباب نے اپنے تعزیتی خطوط کے ذریعہ جس ہمدردی و خلوص کا اظہار کیا ہے اس کے لئے میں ان تمام سرپرستوں و چاہنے والوں کا شکر گزار اور ممنون ہوں کہ فرداً فرداً تعزیت ناموں کے جواب میں خط نہ لکھ سکا۔ جو میرے لئے ممکن بھی نہ تھا۔ (مصطفیٰ کمال)

STRIKE
STRIKE
DOWN
DOWN
NO ENTRY
ONE WAY
CLEAN

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

جلد (۱۲) شمارہ (۴)

اپریل ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت
حمایت اللہ
مسیح انجم

جنرل منیجر : سمیع جلیل

سرکیولیشن منیجر — ایم مظہر الزماں خاں

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بائنڈنگ : محبوبیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو دربار حسینی، پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

سالانہ — (۲۰) — روپے
بیرونِ ہند — (۳۵) — شلنگ
فی پرچہ — Rs 1-50

خط و کتابت کا پتہ :- شگوفہ ۲۲۔ بچلرس کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

(فون : 57716)

اسی تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

شائع ہو چکا ہے

ماہنامہ شگوفہ کا تاریخی و دستاویزی اہمیت کا حامل

ڈرامہ نمبر

مہمان مدیر : ساگر سرحدی

مضامین

- فن کار اور سماج : ایڈورڈ باؤنڈ (انگریزی) ترجمہ : ابراہیم رنگلا
- ایک شخص : ابراہیم رنگلا
- اُردو ڈرامہ : سرسری جائزہ ، سعادت علی خاں
- اُردو ڈرامہ میں مزاح : ابراہیم یوسف
- کہ عشق آساں نمود اوّل : ساگر سرحدی

ڈرامائی شگوفے

★ ملے۔کے۔ ہتل ★ قادر خاں ★ ساگر سرحدی ★ جاوید خاں ★ منموہن کرشنی

★ پربودھ جوشی ★ رمیش تلوار ★ بھدر اکانت زویری

تراجم

برتلت بریخت (جرمن) دسنت آباجی ڈھاکے (مراٹھی) رتناکر متکری (مراٹھی) چھایا داتار (مراٹھی)

زاہد حمید (بنگلور) بی۔ایس۔جی پترو (تلگو) نکولائی گوگول (روسی) راجہ مہندر بکرم (سنسکرت)

دارا سدھی (سنسکرت) بلونت گارگی (پنجابی) بلراج ساہنی (ہندی) ویاس کوتی گنیر مو (ملیالم)

بھدر اکانت زویری (گجراتی)

اُردو ڈرامے

زتی میتھی ساگر سرحدی فکر تونسوی اطہر افسر احمد جمال پاشا نعیم جیلانی غلام یزدانی

وجاہت علی سندیلوی بھارت چند کھنہ خواجہ عبدالغفور مقصود علی خاں ڈاکٹر سمیع الحق پدمنیہ عبداللہ مہدی

شفیقہ فرحت خالد عابدی برق آشیانوی پربودھ جوشی

ممتاز آرٹسٹ سعادت علی خاں کا بنایا ہوا خوبصورت سہ رنگی سرورق

ضخامت : ۴۵۴ صفحات

قیمت : سالانہ خریداروں سے 15/- روپے
عام خریداروں سے 20/- روپے
لائبریری ایڈیشن 25/- روپے

رقم بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر روانہ کریں۔ وصول ہوتے ہی روانہ کر دیا جائے گا۔

منیجر شگوفہ ۔ حیدرآباد

کرنل محمد خان (پاکستان)

سوئٹزرلینڈ: حُسنِ ازل کی نمُود

لبنان چھوڑنے کی سزا

بیروت ایئرپورٹ میں داخل ہونے کے بعد دیگرے دو تین مقامات پر ہماری پیشی ہوئی لیکن جس دربار میں بھی گئے ذکر ہمارا نہ تھا۔ ہمارے پاسپورٹ کا تھا۔ غیر ملکی سفر کا اصل ہیرو پاسپورٹ ہی ہے۔ مسافر تو مشکوک کردار کا سائیڈ ہیرو بلکہ ولن سمجھا جاتا ہے۔ جسے ہر کوئی مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ خود ہمیں بارہا کچھ ایسی ہی نظروں سے دیکھا گیا تا آنکہ ہمارے پاسپورٹ نے ہمارے چال چلن کی صفائی دی اور ہم پردیس میں پھرا کرنے کے قابل ہوئے۔ بے شک ہم شکل سے خاصے شریف النفس اور عجیب الطرفین نظر آتے تھے۔ لیکن اہل کسٹم کا دیانتدارانہ موقف یہ تھا کہ ہر شخص ہو سکتا ہے بظاہر عجیب و عجیب ہی نظر آتا ہے۔ بہرحال جب ہماری نیک چلنی پر سرکاری مہر لگ چکی تو ہمیں اُس مقام تک جانے کی اجازت مل گئی جسے ڈیپارچر یا مقامِ رخصت کہتے ہیں۔ لیکن ایک چھوٹی سی شرط کے ساتھ حکم ہوا:

"ذرا مبلغ نصف لیرا فی کس لبنان میں جمع کراتے جائیں!"

پوچھا یہ لبنان آنے کی سزا ہے؟

ارشاد ہوا: "لبنان چھوڑنے کی!"

ہم نے پاس ہی منہ بنایا تو حاکم بولا:

"ایسا منہ بنانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ پاکستان چھوڑنے پر بھی یہ جرمانہ ہوتا ہے اور بالکل اسی قدر!"

معاً ہمیں وہ کراچی ایئرپورٹ کا مونچھوں والا مہربان کسٹم افسر یاد آ گیا جو اُس وقت تک ٹکٹوں پر مہر لگانے کھڑا رہا تھا۔ جب تک ہم سے ساڑھے تین روپے وصول نہ لئے تھے اور جب ٹکٹ پر مہر اور صفحۂ پاسپورٹ کے

لب سے لب ملے تھے ـــــ ہم نے ایک اور ٹریولر چیک چور کر اکر نصف لیرا صاحب کی کف دست پر رکھ دیا۔

پی آئی اے نے جھاڑی لگائی

اگلے ہال میں داخل ہوئے تو چاروں طرف مختلف فضائی کمپنیوں کے کاونٹر یعنے دفاتر تھے۔ قدرتاً ہماری نگاہ پی آئی اے کا نام تلاش کرنے لگی۔ لیکن ناکام لوٹی۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا تو ایک کاونٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہلال عید دکھانے کے انداز میں بولا:

"وہ وہ"

"وہ" کی سیدھ میں دیکھا تو ایک غیر پاکستانی ایئر لائن کے دفتر کے کونے میں پی آئی اے کی پیشانی پر چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی یوں جیسے ایرانی والے اپنے ریستوران کے کونے میں کسی کو جھاڑو لگانے کی اجازت دیدیں بڑا صدمہ ہوا۔ جی چاہا کوئی پی آئی اے کا رکن ملے تو شکوہ و فریاد کر کے صدمہ ہلکا کریں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پی آئی اے کی تختی کے نیچے ایک پاکستانی ایئر ہوسٹس کھڑی ہے۔ تیزی سے اس کو یہ کہنے کو لپکے کہ محترمہ خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے! اور السلام علیکم سے ابتدائے کلام کی، لیکن جواب میں چند ادق عربی الفاظ کا تبرک مگر ناقابل فہم سا چھینٹا ہمارے کانوں میں آ پڑا۔ جس میں سے تلاش کے باوجود کوئی وعلیکم السلام قسم کی چیز برآمد نہ ہوئی۔ پھر انگریزی آزما کر دیکھی۔ لیکن اب کے جوابی بوچھاڑ ناقابل فہم ہی نہ تھی کچھ غیر متبرک بھی تھی۔ پتہ چلا کہ صرف یونیفارم پاکستانی ہے، اندر لڑکی لبنانی ہے۔ ایسی لڑکی پی آئی اے کے کس کام آتی تھی؟ یہ راز خدا وندا پی آئی اے کو معلوم تھا یا خود خداوند کو اور اس وقت دونوں سے رابطہ مشکل تھا۔ چنانچہ ہم شکم میں شکوہ دبائے آگے چل نکلے۔

بہر حال ہمیں ٹکٹ تو خریدنا نہیں تھا۔ ہم تو صرف رشتۂ وفا کے خیال سے پی آئی اے والوں کو دیکھ کر رک گئے تھے۔ لیکن جب دیکھا کہ رشتہ کا دوسرا سرا تھامنے والا کوئی نہیں اور ہم ٹھوس عربی دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں تو مزید جنس وفا ضائع کئے بغیر سیدھا ڈیپارچر ہال کا رُخ کیا اور ناگہاں ایک دنیائے رنگ و بو میں جانازل ہوئے۔

ایک بزرگانہ ہنہناہٹ

بیروت جیسی بین الاقوامی ایئرپورٹ کے ڈیپارچر ہال کی آبادی رنگ و نسل اور وضع اور اطوار کے اعتبار سے بڑی متفرق اور متلون ہوتی ہے، ہال بالکل عجائب خانہ لگتا ہے۔ کئی لوگوں کو بالمشافہ دیکھنے کے باوجود اُن کے ویسا ہونے پر اعتبار نہیں آتا۔ کہتے ہیں کسی نے پہلی مرتبہ زرافہ دیکھا یعنی پاؤں سے شروع کر کے ٹانگوں سے اوپر سے ہوتے ہوئے گردن کے ساتھ ساتھ اوپر ہی اوپر دیکھتا گیا اور جب ایک مدت کے بعد گردن کے سر ہونے کی نوبت آئی تو حیرت سے چلا اُٹھا: "میں نہیں مانتا"

اب سوال یہ ہے کہ اگر آپ ایک دراز ریش جبّہ پوش درویش صورت اور آبنوس رنگ بزرگ
ہیں جو اپنے دراز آستین بازوؤں کو دو بے آستین نیلے قبا شباب آگیں کافر ادا لالہ رخوں کی کمر میں
لیے دنیا و مافیہا سے بے پروا بیروت ایئرپورٹ کے زبالے ڈیپارچر ہال کے بیچ انہیں گدگدا اور خود ہنستا رہا ہو تو آپ مان لیں گے؟
انہیں دیکھا تو ہم ورطہ لیکن ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

بیروت ایئرپورٹ پر پاکستانی جزیرہ

اور اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ دو اصلی اور تر و تازہ پاکستانی ایئرہوسٹس ہال میں داخل ہو رہی ہیں لبنان
میں پاکستان کی موج نوبہار کا یوں در آنا شاید ہم نہ مانتے کہ اچانک ہر دو نے مسکرا کر سلام کیا۔ ہم نے
یوں کہا ——— "ارے یہ تو ہماری پرانی رفیقائیں ہیں جو برسوں کراچی سے ہمیں بوئنگ میں ساتھ لاتی تھیں۔
"السلام علیکم": ہم نے آگے بڑھ کر اور کھل کر کہا: "جب ہی تو ہیں کہوں یہ زمین آسمان کیوں تنگ رہی ہے۔"
دو میں سے ایک بولی: "اس لئے کہ پورے بارہ گھنٹے اس شہر کی زمین کو فخر قیام بخشا ہے۔"
کہا: "سر تسلیم خم ہے" اور سر خم کیا۔
"تو کہیے، بیروت میں کوئی بلبلیں اور قمریاں بھی ملیں؟" یہ سوال نیل تقسیم کرنے والی نے پوچھا۔
"ملی تو نہیں، دیکھی ضرور ہیں۔"
"دیکھنے ہی کو ملنا کہتے ہیں سوائے اس کے کہ آپ انہیں پاکستان میں درآمد کرنے کے ارادے سے آئے ہوں؟"
ہم نے کہا: "نہیں جناب! اس جنس میں ہم بالکل خود کفیل ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے ہمیں اس ہال سے
باہر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔"
ایئرہوسٹس ذرا شرمائیں لیکن زیادہ مسکرائیں۔ تعریف عورت کی بڑی خوشگوار کمزوری ہے۔ انہوں نے
ایک امریکی انداز میں ہمیں برملا تھینک یو تو نہ کہا لیکن ان کی مسکراتی خاموشی میں Many thanks پنہاں تھے۔
اتنے میں چند اور پاکستانی مسافر ادھر آ نکلے اور ڈیپارچر ہال کی وسیع دنیا میں ایک چھوٹا سا پاکستانی جزیرہ
بنانے لگا۔ ایسے عارضی جزیروں میں باتیں بلا تعارف ہی نہیں، بے مطلب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ یقین کئے بغیر کہ
کون کون ہے، چھوٹی چھوٹی بے معنی گفتگوئیں چل پڑیں لیکن باتوں باتوں میں ایک بامعنی بات سنائی دی اور پتہ چلا کہ
وہ خاتون جو جزیرے کے مرکز میں کسی سے باتیں کر رہی ہے مسز "شن" کہلاتی ہیں اور وہ لڑکی جو ذرا ہٹ کر مسز
"شن" کو دیکھ رہی ہے ان کی بیٹی ہے۔ مس شن اپنی ماں کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہے، سمجھ میں نہ آیا۔
مس شن بمشکل بارہ سال کی لگتی تھیں۔ یعنی ہرچند کہ ایک دو سال بعد شباب کے دروازے پر ایک قیامت
دستک دینے والی تھیں تاہم سردست ان کا قدم دہلیز سے بلا شک و شبہ باہر تھا۔ اس کے برعکس ان کی والدہ

بہت بہت شکریہ

مسز ش دہلیز سے گزر کر بہت سا فاصلہ طے کر چکی تھیں اور اب بڑی جانفشانی سے اپنے جلا جرے کو قابو میں ؛ بریدہ زلفیں، کولڈ کریمیں اور پاشٹ لپ سٹکیں استعمال میں لاتے ہوئے اس فاصلے کے نشانات مٹا رہی تھیں لیکن اس عمل میں جزوی کامیابی ہی حاصل کر سکی تھیں۔ وہ میک اپ سے مسلح ہو کر تقاضائے فطرت سے متصادم تو ہو گئی تھیں لیکن اس محاربے میں بمشکل اپنے چہرے کا بھرم رکھ سکی تھیں۔ آپ کے پیٹ کا بھرم تو کلا اور قمیض پھاڑ پھاڑ کر فریاد کر رہا تھا کہ کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟ اور جواب بظاہر نفی میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسز ش اگر ایک زاویے سے قابل برداشت نظر آتی تھیں تو دوسرے زاویے سے برداشت سے بھی باہر تھیں۔

اتنے میں یکایک کسی نے کہا: "وہ دیکھیں کراچی سے بوئنگ آ پہنچا!"

اور سب نگاہیں آہستہ آہستہ رکتے طیارے پر جم گئیں۔ غور سے دیکھا تو یہ وہی بوئنگ تھا، جو دو روز پہلے ہمیں کراچی سے لایا تھا۔ اور پھر جیسا کہ دستور ہے کچھ مسافر اترے، کچھ سوار ہوئے۔ جہاز کا عملہ تبدیل ہوا۔ پرواز سے پہلے کی رسوم ادا ہوئیں ـــــ خوش آمدید، ایمرجنسی حفاظتی بند سونف اور سگریٹ ـــــ اور طیارہ لبنان کی نیلگوں فضا میں بلند ہوا۔ ہمارا اگلا پڑاؤ استنبول تھا۔

فراغتے و کتابے ....

بوئنگ میں مسافروں کی تعداد نشستوں کے نصف سے بھی کم تھی۔ تقریباً ہر مسافر کے ساتھ کی سیٹ خالی تھی۔ سوائے اس سیٹ کے جہاں مسز ش اور مس ش ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔ ہم تنہا تھے لیکن اس تنہائی سے ایسے ناخوش نہ تھے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس سے پہلے کی پروازوں میں بھی ہم نے اپنے ہم نشینوں سے کچھ فیض نہیں پایا تھا۔ ہمارا تجربہ ہے کہ دس میں سے نو ہم نشینوں کے مقابلے میں ایک پسندیدہ کتاب بہتر ساتھی ہے۔ ہاں اگر خوش قسمتی سے وہ دسواں ہم نشیں، وہ جانِ آرزو، میسر آجائے تو کتاب کیا، جان بھی قربان کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان سے ہمسفروں میں ایسی جنس نظر نہ آئی کہ جاں نثاری کی نوبت آتی۔ پیچھے سے ہم نے بیگ سے "دستک" پر تھیم[1] نکالی اور اپنی پرواز بھول کر مصنف کی پروازوں میں کھو گئے۔ ساتھ ہی اپنی ایک دیرینہ مراد پا لی۔ یا یوں کہیں کہ اس کا وہ تہائی پا لیا: فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

استنبول تک سفر پُرسکون گزرا، سوائے اس کے کہ مسز ش کئی بار اپنی نشست سے اٹھ کر کسی دوسرے مسافر کے ساتھ والی خالی سیٹ پر جا بیٹھیں اور اس طرح انہوں نے اپنے کئی ہمسفروں کو باری باری قدرے دستخط طلب رفاقت بخشا۔ خدا جانے یہ مسز ش کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا یا حکمت ایزدی کہ ہم اس رفاقت سے محروم یا محفوظ رہے۔ اتنے میں استنبول آگیا۔ جہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے اترے۔ استنبول کی ایئرپورٹ دیکھی۔ اپنے ترک بھائی بہنوں کی زیارت کی۔ انہیں مل کر مسرت ہوئی کہ ہمیں پاکستانی پا کر کھل اٹھے ـــــ ترک جب بھی سنتے ہیں پاکستانی ہیں

---

[1] محترمہ اختر ریاض الدین کی تصنیف لطیف

بہت قریب ہیں۔ خوش دل و خوش اختلاط، سادہ و روشن جبین۔ نصف ساعت میں کوئی نصف درجن دوست بن گئے۔ اور رخصت ہوئے تو اُن کی دعاؤں نے ترکی کی سرحدوں تک ہمارا ساتھ دیا۔

اُتر آنا تعارف پر مسز شِن کا

استنبول سے جنیوا روانہ ہوئے تو ہم نے اپنی رفیقِ تنہائی —— دھنک —— کو پھر کھول لیا۔ اور بیکسیکو کی مہ وشوں میں محو ہو گئے۔ پھر اچانک ہماری بائیں آنکھ کے بائیں کونے سے ہمارے دماغ کے پردے پر ایک پہاڑ سا ہیولا نمودار ہوا۔ اور اسی لمحے ہمارے ساتھ کی خالی سیٹ کے منہ سے ایک کرب انگیز سی چیخ نکلی۔ دماغ پھیر کر سیٹ کو دیکھا تو بے چاری مسز شِن میں جتنا پانی مسز شِن پوری طرح بیٹھ بھی نہ چکی تھیں۔ کہ ہم سے مخاطب ہوئیں: "السلام علیکم —— آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

زور کہاں، پہ نہ تھا آپ پر تھا بیٹنے میں دوسروں کے کوائف تو اکٹھا کر چکی ہوں، اب آپ کی باری ہے۔ ہم سوال کی بے تکلفی سے ذرا چونکے مسز شِن کو قریب سے دیکھا تو چہرہ کبھی قابلِ دید تھا اور کبھی قابلِ رحم بہرحال وعلیکم السلام کہا اور عرض کیا:

"جانا تو لندن ہے، مگر آج جنیوا ہی میں ٹھہروں گا۔ اور دو دن بعد انگلستان جاؤں گا۔"

"سچ!" مسز شِن نے کسی قدر چہک کر کہا: "ہم بھی لندن جا رہے ہیں اور آپ کی طرح دو دن جنیوا ٹھہریں گے۔ سارے مسافروں میں سے صرف آپ کا پروگرام ہم سے ملتا ہے۔"

کہا: "عجیب اتفاق ہے۔"

مسز شِن فوراً باضابطہ تعارف پہ اُتر آئیں۔

"میں مسز شِن ہوں، میرے ساتھ میری بیٹی گلشن ہے۔ وہ بیٹی ہے۔"

اس نام اور رشتہ کا علم ہمیں پہلے سے تھا۔ لیکن دستور کے مطابق وہ سکہ بند تعارفی جملہ دہرایا۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔"

محترمہ بولیں، "اور آپ سے بھی، مگر آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

ہم نے نام عرض کیا، لیکن شاید محض نام سے آپ کی تشفی نہ ہو سکی۔ پوچھنے لگیں،

"آپ کام کیا کرتے ہیں؟ رہتے کہاں ہیں؟"

عرض کیا: "فوجی ہوں اور فوجی کا کوئی مقام نہیں۔"

"یہی تو فوجیوں کی خوبی ہے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔"

"محترمہ ہر گھاٹ کی آب و ہوا خوشگوار نہیں ہوتی۔"

"لیکن وہاں خوشگوار گھاٹ سے بھی تو آدمی اکتا جاتا ہے۔"

"پہلے یہ تو بتائیے،" فرمانے لگیں "آپ کے یہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"کرتے تھے۔ پانچ برس ہوئے، بے چارے اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

اور یہ مژدۂ جانفزا سناتے ہوئے مسز شی نے بڑی داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ گویا مرحوم نے یہ قربانی ہماری خاطر ہی دی ہو۔ حالانکہ مسز شی کو دیکھتے ہوئے زیادہ قرینِ قیاس یہ بات تھی کہ مرحوم اپنی خاطر ہی جان سے گزر گئے ہوں گے۔ بہرحال ظاہر تھا کہ اگر محترمہ مرحوم کے نعم البدل کی تلاش میں ہیں تو نعم البدل کو اپنے پیشرو کی ہسٹری سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ پہلے تو رسم دنیا کے طور پر ہم نے ایک حسرت بھرا سانس لیا۔ زیرِ لب إنا لله پڑھی اور بالائے لب کہا:

"بڑا افسوس ہے کوئی حادثہ پیش آیا تھا یا قدرتی موت تھی؟"

بڑے اطمینان سے بولیں: "بخار ہوا تھا، بیمار پڑے اور مر گئے ——— اور ہاں آپ بیگم کو ساتھ نہیں لائے؟"

بالفاظ دیگر مسز شی کہہ رہی تھیں کہ کیا بے کار، بے ربط، اور بیہودہ سوال کر رہے ہو؟ اگر مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر تمہارے جذبۂ تاسف ہی کو چوٹ لگی ہے تو بڑے غلط جذبہ کو چوٹ لگی ہے اور یہ کہ ہم نے اپنے پتّے میز پر رکھ دیئے ہیں۔ تم اپنے پتّے سیدھے کرو۔

ہم نے مسز شی کو بغور دیکھا تو اُن کی پیشانی پر ایک دھندلی سی تحریر نظر آئی، "مشتری ہوشیار باش" بہرحال ہم نے سچائی سے کام لیتے ہوئے اُن کے سوال کا جواب دیا۔

"جی بیگم تو نہیں آسکیں"

یہ سن کر کے بیگم ہے، مسز شی کو مایوسی ہوئی۔ لیکن واجبی سی ہی کیونکہ بیگم ساتھ نہ آکر تلافی بھی کر دی تھی۔ کہنے لگیں

"تو آپ سیر کے دوران رنلی Lonely (تنہا) محسوس کریں گے؟"

"اگر کریں گے تو برداشت کریں گے۔"

"فوجی بڑے سخت دل ہوتے ہیں؟"

جی چاہا کہ دل نکال کر محترمہ کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ کہیں کہ: "ذرا مٹھی میں دبا کر اس کی سختی کا اندازہ کر لیں۔ یہ غیر فوجی دلوں سے بہت مختلف نہیں؛ لیکن اتنے میں دوسری نشست سے مسز شی کی آواز آئی جس میں خفیف سی جھنجھلاہٹ بھی تھی ——— "امی! اب اِدھر بھی آؤ" ——— اور مسز شی جیسے اسکول سے بھاگتے ہوئے بچوں کی طرح پکڑی گئی ہوں۔ ناچار اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جاتے ہوئے کہنے لگیں؟ "اب جنیوا ملیں گے" ——— اور جنیوا اب کوئی پانچ منٹ ہی دور تھا۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟

لیکن مسز شی سے ملاقات تو بعد میں ہوتی رہے گی آیئے ذرا طیارے کی کھڑکی سے سوئزرلینڈ کا فضائی نظارہ کریں ——— سبحان اللہ یہ کسی خطۂ ارض کی جھلک ہے یا حسنِ ازل کی نمود! خدایا تو نے کن کہتے ہوئے کیا دو قسموں کی تخلیق کا حکم دیا تھا؟ سٹینڈرڈ اور ڈی لکس؟ عام اور خاص؟ میرے سامنے یہ وہ زمین تو نہیں جسے دیکھنے کا میں عادی ہوں ——— یہ کافر کہساروں کے سانولے سرمئی سلسلے، یہ سبز و کبود وادیوں کے ریشم میں لپٹے ہوئے نشیب و فراز، یہ دلربا بلندیاں، یہ

پرفسوں بستیاں' یہ پہلوسے کوہ کی سلوٹوں میں رنگ رنگیلی بستیاں' یہ سرخ چھتوں والے بے شمار کاٹیج' یہ بکھری ہوئی بیر بوٹیاں' یہ چھوٹی چھوٹی ندیاں' یہ رنگ روپ کے بدلتے ہوئے سین جیسے قدرت کسی باتصویر کیلنڈر کے صفحے الٹ رہی ہو۔ اللہ! یہ باغ و راغ تو نے کس کارخانے میں بنائے ہیں؟ یہ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — میں ان سوالوں کے جواب میں کسی ملکوتی آواز کا منتظر تھا کہ ایک انسانی آواز آئی — "خواتین و حضرات! ہم تھوڑی دیر میں جنیوا کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں براہ کرم اپنے حفاظتی بند....." ایر ہوسٹس نے ہمارا خواب پریشان کر دیا۔ حالانکہ اس لڑکی سے ہمیں صرف نیکی کی توقع تھی۔ ناچار ہم حسن و جمال کی دنیا چھوڑ کر حفاظتی بندوں کی دنیا میں لوٹ آئے۔

جنیوا ایئرپورٹ ۔ جائیں تو جائیں کہاں؟

جہاز سے اترے اور ایرپورٹ کے لونج میں پہنچے جہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی منزل کو جانا تھا۔ لیکن کونسی منزل؟ کونسا ہوٹل؟ کونسی سرائے؟ — "آپ پریشان نہ ہوں!" ایک آواز آئی۔ "آپ کے ہوٹل کی تلاش ہمارا فرض ہے۔" اور کیا دیکھتے ہیں کہ پی ڈی اے کی یونیفارم میں ایک سوئس حسینہ' ایک فتنہ گر قد و گیسو ہمارے کانوں میں جرمن لہجے میں انگریزی رس گھول رہی ہے۔ پھر ہمارا بازو تھامے ہمیں ایک کیبن کی طرف لے گئی جہاں تین چار لڑکیاں ٹیلیفونوں سے مسلح ہو کر جنیوا کے ہوٹلوں میں بیرونی مہمانوں کے لئے کمرے تلاش کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے ہماری خاطر ہمارے بیٹھے بیٹھے ٹیلیفون کی چھلنی سے سارا جنیوا چھان مارا۔ سیکڑوں کالیں (Calls) سیکڑوں ناکامیاں اور سیکڑوں مسکراہٹیں لیکن آخر ایک گہرا ٹھنڈا اور پیارا سانس لے کر بولی: "کائن پلتس" "Kein platz" (کوئی جگہ نہیں) — ہم مایوسی میں ایک اور آہ کھینچنے کو تھے کہ بولی: "ذرا آہ کو روکیں' میں کسی پانساں (Pension گھریلو مہمان خانہ) کو فون کرتی ہوں شاید جگہ مل جائے — پوری بیس پانساؤں کو فون کرنے کے بعد اکیسویں سے جواب ملا کہ دو کمرے خالی ہیں۔ ہم نے پوری بے صبری سے کہا: — "ایک ہمارا ہے' کرایہ خواہ کچھ ہی ہو۔"

شاید کبھی خوابوں میں ملیں

ساتھ ہی ہم نے لڑکی سے قلم چھین کر' ہاتھ کی ہتھیلی پر پانساں کا پتہ نوٹ کیا۔ ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی تیز رو سواری مثلاً بیلی کاپٹر یا راکٹ مل جائے مگر نہ ملی۔ ناچار ٹیکسی لی اور بیشتر اس کے کہ کوئی رقیب رو سیاہ وہاں برق رفتار پہنچ جاتا۔ ہم ٹیکسی سے اتر کر سیڑھیوں اور نقشوں سے ہوتے ہوئے پانچویں منزل پر مالکہ پانساں مادام پیکارڈ سے رو برو مل ذو نیاز ہو گئے۔ یعنی اپنا نام پتہ لکھایا' ان کا پوچھا اور کمرہ لے لیا۔ یہ مادائیں عام طور پر بھاری بھرکم اور بھبوسی مخلوق ہوتی ہیں۔ لیکن مادام پیکارڈ مستثنیات میں سے تھیں عمر تو ایسی پائی نہ تھی پہلے مسز شی کا ہم عمر ہوں گی لیکن مسز شی کی ہم وزن یا ہم جثہ یقیناً نہ تھی۔ مادام پیکارڈ کی پیمائش (Vital Statistics) بھاتی کمر اور کولہوں کا ناپ (انچوں میں) کولڈ فیصد کمی طور پر غارت گر صبر و شکیب تھی یعنی مسز شی کے ۴۰ ۔ ۳۰ ۔ ۴۰ کے مقابلے میں فقط ۳۵ ۔ ۲۰ ۔ ۳۵ تھی اور اگر مؤخر الذکر اعداد کی مالکہ میں کسی کو بھدا پن نظر آئے

پ بے بہرہ ہے۔ جو مستقر میسر نہیں ـــــ بہر حال ہم ابھی مادام پیکارڈ سے محو گفتگو تھے کہ ایک اور خاتون باغیچی کا بیچی، دروازے سے داخل ہوئی۔ جی ہاں! یہ مسز ش مع مس ش ہی تھیں جو بظاہر ہمارے نقش قدم بلکہ خط پرواز پر اڑ تی آ رہی تھیں۔ مسز ش نے ہمیں دیکھا تو بولیں، "کتنا عجیب اتفاق ہے آپ کو بھی اسی ہوٹل میں جگہ ملی جہاں ہمیں ملی ـــــ

اب اول تو ہمیں محترمہ کے ہوٹل میں نہیں بلکہ محترمہ کو ہمارے ہوٹل میں جگہ ملی تھی کہ بحیثیت مسافر ہم چند منٹ پیشتر تھے۔ دوسرے موصوفہ ہمارے پیچھے محض اتفاقاً نہیں ذرا ارادۃً تشریف لائی تھیں۔ لیکن ایک خاتون کو زچ کرنا ہمارا منصب نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے مسز ش کی تائید میں کہا ـــــ "جی ہاں! واقعی عجیب اتفاق ہے ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں "ـــــ بولیں، "کیا کہا؟ کہاں ملیں؟ کم ذاتوں میں؟"

ہمارا شعر ضائع ہو گیا تھا۔ دراصل مسز ش جملہ کاروبار بشمول عشق سلیس نثر ہی میں کر سکتی تھیں ـــــ ہم اپنے کوائف لکھوا چکے تھے۔ لیکن باوجود شدید خواہش کے اپنے کمرے کو نہ جا سکتے تھے کہ مسز ش کا سلسلۂ کلام راستہ روکے کھڑا تھا اُدھر سامنے کی کھڑکی سے جھیل جینوا کا جاں پرور نظارہ دامنِ دل کھینچ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کب کمرے میں جا کر سامان رکھیں، کپڑے بدلیں اور جھیل کے کنارے پہنچیں۔ اتفاقاً ہماری نگاہ کے تعاقب میں مسز ش نے بھی جھیلِ جینوا کی جھلملاتی جھلک دیکھ لی تو بلا تامل بولیں، "سامان رکھنے کے بعد کہاں جائیے گا؟" کہا، "جھیل کے بغیر کہاں جا سکتا ہوں؟" ـــــ بولیں: "ٹھیک ہے ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔" لیکن مس ش نے فوری ترمیم کی ـــــ "امّی! ہم بازار جائیں گے، ہمیں گھڑیاں خریدنی ہیں۔ جھیل بعد میں دیکھیں گے" ـــــ امّی بولیں، "نا بیٹی! ابھی چار ہی تو بجے ہیں۔ یہ جھیل دیکھنے کا وقت ہے۔ گھڑیاں تو شام کو بھی خریدی جا سکتی ہیں" ـــــ یہ سن کر مس ش زبان سے تو چپ رہی لیکن اپنا پیچ و تاب نہ چھپا سکی۔ بیچ بدن کا دور ـــــ دراصل مس ش کا منشا یہ نہ تھا کہ والدہ محترمہ کو جھیل کی سیر سے محروم رکھا جائے بلکہ یہ کہ ایک غیر محرم کی رفاقت سے پرہیز کر لیا جائے اور ہم دل و جان سے مس ش کے ہم خیال تھے۔ مس ش جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ بلحاظ عمر "لولیٹا" (روسی ناول نگار نابوکاف Nabokov کے مشہور انگریزی ناول Lolita کی نوخیز ہیروئن) سے بھی چھوٹی تھیں یعنی جوانی کے گرداب بلا سے خاصی دور ساحل پر یا شاید ساحل سے بھی ذرا ہٹ کر بھلی بھلی نرم خیز ہوا میں بیٹھی تھیں۔ اور مسز ش جیسے طوفان زدوں کے جذبات اور احساسات سے یکسر بے خبر۔ اگر ماں کی دنیا پر اس کے دل کی فرمانروائی تھی تو بیٹی کے دماغ پر اٹھویں جماعت کی کتاب الاخلاق چھائی تھی۔ چنانچہ اگر مسز ش اپنے دکھ کا مداوا کرنا چاہتیں تو بیٹی مادری کوششوں کو شبہ کی نگاہوں سے دیکھتی اور سوچتی کہ شاید ماں کی تربیت میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ چنانچہ اب ہر لحظہ اپنی والدہ ماجدہ کی اخلاقی پرورش کی فکر میں تھی۔ اور جہاں کہیں دیکھتی کہ بے چاری کے کردار میں جھول آ گیا ہے، فوراً اصلاح دیتی یا دینے کی کوشش کرتی۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہمیں بیٹی سے اتفاق تھا۔ اور ماں سے ہمدردی۔ بے شک ہمارے باب میں ماں مہربان تھی اور بیٹی نامہربان مگر ہمیں ماں کے کرم کی حاجت تھی نہ بیٹی کے ستم کی شکایت۔ چنانچہ ہم غیر جانبدار رہے اور ماں بیٹی کو بحث کرتے اور کوائف لکھاتے چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے کہ دیکھیں اس پاکستان کے پالن کا کیا رنگ ہے ـــــ

پھول کے بدلے دل حاضر ہے!

کمرے میں داخل ہونے لگے تو پہلا تاثر حسرت کا تھا۔ دوسرا حیرت کا اور تیسرا عشرت کا۔ حسرت اس بات کی کہ زندگی بھر دو راتیں سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کو ملیں اور وہ بھی کسی جگمگاتے ہوٹل کی بجائے بے ننگ و نام سی پانسیان کی نذر کر دیں۔ حیرت اس بات پر کہ کمرے میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ کمرے کے اندرونی تیور، تابناک ہوٹلوں سے بھی تیکھے ہیں ——— وہی امیرانہ لوازم اونی قالین، ریشمی صوفے اور فومی بستر ٹیلویژن — ٹیلیفون، اور بیسوں متفرق بٹن جن پر انگلی رکھتے ہی مختلف حاجتیں پوری ہونے لگیں ——— اور یہ سب کچھ ایک کشادہ کنگ سائز کمرے میں جس کا ظرف عام ہوٹلوں کی نسبت محلات سے مشابہ تھا اور عشرت اس وجہ سے کہ صوفے پر بیٹھے تو گویا میڈیم پیکارڈ نے اپنی چاندسی بانہوں میں لے لیا۔ اور بستر میں داخل ہوئے تو جیسے کسی گداز آغوش میں منتقل ہو گئے۔ نہانے کے لئے غسلخانے میں گئے تو چیزوں کو چھونے سے جھجکنے لگے کہ میلی نہ ہو جائیں یہ سوئٹسانی ناقابلِ برداشت حد تک صفائی پسند ہیں۔ نہا کر چائے پینے لگے تو محسوس ہوا جیسے زندگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا مادام پیکارڈ نے آبِ حیات اُبال کر چائے ڈالی تھی۔ اور ہائے وہ مادام کی نفاستِ ذوق کہ چائے کے ساتھ دو پلیٹوں میں کچھ اشیائے نقل لے آئیں تو تیسری میں ایک تازہ پھول رکھ لائیں اس ادائے خاص کا ایک ہی جواب تھا کہ پلیٹ واپس کرتے ہوئے اس میں دل رکھ دیتے۔ لیکن ایسی فضول خرچی بھی کیا! چھوٹا سا شکریہ ادا کر دیا ——— ہم سے بڑے ہوٹلوں میں رہنے والوں کی زبوں حالی پر ایک دو پرخلوص آہیں بھریں اور چھڑی ہاتھ میں لے کر جھیل جینوا کی سیر کو نکل پڑے۔

ایک اجنبی پیازی کانوں والا

باہر نکلے تو دروازے پر مسز شی کھڑی انتظار کر رہی تھیں ——— ارادۃً! قریب ہی مس شی اپنے نوخیز نتھنے پھلائے اور تیکھی تیوری چڑھائے کھڑی تھیں ——— احتجاجاً ——— اور جب روش پر چل نکلے تو مس شی پھسلتی سے ہم دونوں کے درمیان چلنے لگیں ——— احتیاطاً ——— بہر حال دورانِ رفتار ہمیں ماں بیٹی کے حل و توضیح کا دماغ نہ تھا کہ ہمارے سامنے جھیل جینوا کے پانی کی قلزم نما وسعت تھی جس کی سطح پر تہِ آب سے اُمنڈتا ہوا فلک برس فوارہ ایک کوہ پیکر رباب کی شکل میں بیک وقت سر بلند اور سرنگوں ہو رہا تھا۔ جھیل کے کنارے پہنچے تو کنارے سے لپٹ جانے کو جی چاہا۔ پھولوں کے ہجوم میں بیٹھنے کو سکون بخش خیابانی نشستیں، چلنے کو جنون بخش مستانی روشیں اور دیکھنے کو طراوت بخش سوستانی دوشیزائیں۔ نشستوں، روشوں اور دوشیزاؤں کے رنگ روپ کا بھرو ہی عالم کہ ہمارے دست دہا تو رنگ رہے اگر چاندنی بھی چھو جائے تو رنگ میلا ہو۔ سوئٹزرلینڈ میں فطرت ہر شئے کا اپنے ہاتھوں سے میک اپ کرتی ہے۔

ایک پہیلی روش اندرون آب کو جاتی تھی۔ اس پر ہو لیتے اور مرکز میں ایک کھلے چبوترے پر جا بیٹھے کہ دور دور تک جینوا اور جینوا کی جھیل کا نظارہ کر سکتے۔ نیچے پانی میں دیکھا تو گزوں تک نگاہ اترتی چلی گئی۔

گئی تھی جہاں سطحِ آب اور بطنِ آب کے درمیان کچھ غیر آب نظر آتے یعنی از قسم کا غذ یا برگ و گیاہ فقط جنگلے کے ساتھ راج ہنسوں کا جوڑا غسل کے بعد آرائش جمال میں محو تھا اس تال میں مادہ نے دو فالتو پر نذر آب کر دیئے تھے۔ جو ننھی ننھی بادبانی کشتیوں کی طرح تیرنے لگے تھے۔ اور بجائے خود حسن کے نقطے نظر آتے تھے ــــــ اور پھر ایک امریکن ٹورسٹ بی بی گلے میں لٹکائے ہوئے پانچ کیمروں میں سے ایک سے ہماری پارٹی کی نشست لینے لگی۔ لیکن بٹن دبانے سے پہلے مسکرا کر بولی: "آپ کی پوشاک کس قدر رنگ بھری ہے کیا میں آپ کی تصویر لے سکتی ہوں؟" یہ سوال مس ہتھ مسز ش سے کیا گیا تھا۔ سوال سُن کر ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو فخریہ نظروں سے دیکھا اور مسز ش بولی: "ضرور" ــــــ اس پر امریکن فوٹوگرافر نے مسز ش سے کہا: "شکریہ، اور اگر زحمت نہ ہو تو آپ اپنے خاوند کے دائیں ہاتھ کھڑے ہو جائیں اور آپ کی بیٹی اُن کے بائیں ہاتھ" ــــــ "خاوند!" ہم نے بالکل بلا ارادہ اپنے گلے کی گہرائی میں دھرایا یعنی اضطرار میں لفظ خاوند کا غرارہ کر لیا۔ لیکن کوئی بامعنی آواز باہر نکلنے نہ دی۔ ہر چند کے ہمارے چہرے پر بلش Blush آنے کی عمر نہ تھی۔ تاہم ہمارے گوش و رخسار تیز پیازی ہو گئے۔ اب فوٹوگرافر کی تردید ماں یا بیٹی کا کام تھا کہ ہم شریکِ گفتگو نہ تھے لیکن مسز ش نے اس غلط رشتے کے اعلان پر کوئی واضح احتجاج نہ کیا اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا بلش دونا پیازی ہو گیا۔ مس ش نے اس صورتِ حال پر اپنے دودھ کے دانت پیسنا شروع کیئے۔ جس پر مسماۃ فوٹوگرافر خوش ہو کر بولی: "Cold Hat smile" (ذرا ٹھنڈا ٹھنڈا سا مسکراہٹ کو)

اور بٹن دبا کر تصویر لے لی ــــــ اگر یہ تصویر رنگین فلم پر لی گئی تھی تو یقیناً اسے کسی امریکی نمائش میں انعام ملا ہو گا۔ کیا ایک ایسی تصویر شاہکار نہ ہو گی جس میں ایک ہنستی ماں اور دانت پیستی بیٹی کے درمیان ایک پیازی کانوں والا اجنبی لفظِ خاوند کے غرارے کر رہا ہو ــــــ جھیل کی سیر ہو چکی تو بازار کی سیر کی باری آئی جہاں تفریحاً مسز ش کے ساتھ شاپنگ میں اعتراض نہ تھا۔ اور مسز ش کو اشتیاقاً ہمارے ساتھ ملکر شاپنگ کرنے کا شوق تھا۔ لیکن ہمیں مس ش کو مزید اذیت دینا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے ماں بیٹی سے کھڑے کھڑے ایک فرضی دوست سے ملنے کا بہانہ کیا۔ مسز ش نے دوست کے وجود اور محل وقوع کے متعلق جرح کرنا چاہی لیکن ہم ہاتھ ہلاتے، خدا حافظ کی اڑ لیتے، تیز تیز قدم اٹھاتے چل نکلے۔ حتیٰ کہ ہم اپنے مجازی مجنے کی کشش ثقل سے باہر نکل گئے۔

چیلنج بنام جملہ خرگوشانِ عالم

بازار میں داخل ہوتے تو شام ہو رہی تھی اور دکانوں کا ظاہر و باطن رنگارنگ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ یہ روشنیاں بیروت اور کراچی کی طرح بصارت پر گراں نہ تھیں اور غور سے دیکھا تو وجہ معلوم ہو گئی۔ روشنیاں متحرک نہ تھیں۔ ساکن تھیں۔ متحرک اور ساکن روشنیوں میں وہی فرق ہے جو مارکٹائی سے بھرپور اور مہر و محبت سے لبریز فلمی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ بے شک یہ سوستانی خوش ذوق ہیں اور سکون

سے قدر دان ہی نہیں، نگہبان بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر دانی میں کچھ سرکاری اشارہ بھی ہوگا! ورنہ کوئی سرپھرا دکاندار اپنی دکان کے ماتھے پر دو چار وضعدار فقروں کی بجائے برق و رنگ کا ایک بالا رقص برپا کر سکتا تھا اور یہ سوس کاریگروں کے لئے کچھ مشکل بھی نہیں۔ جن لوگوں کی چابکدستی ذہن و سنگ میں جان ڈال کر انہیں دنیا کی حسین ترین گھڑیوں میں بدل سکتی ہے۔ وہ تانبے کے تار سے بجلی گزار کر ایک جنون خیز نیان سائن بھی تیار کر سکتے ہیں۔ کراچی میں یہی کام ہمارے شہر سے کر رہے ہیں۔ اور بے روک ٹوک کر رہے ہیں۔

لیکن آئیے سوس گھڑیوں کی بات کریں۔ سوئٹزرلینڈ کے بازاروں میں سب کچھ ہے لیکن خدا جانے یہ احساس کیوں غالب رہتا ہے کہ یہاں گھڑیوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ ہونا بھی چاہئے۔ عام لوگوں کو معلوم نہیں کہ سوئٹزرلینڈ میں گھڑیوں کی شرح پیدائش دنیا کی کسی ذی روح مخلوق سے کم نہیں اور یہ چیلنج اہل چین و ہند ہی کے لئے نہیں بلکہ خرگوشانِ عالم کے نام بھی ہے۔ جن کی کثیر العیالی کے بڑے بڑے درباروں میں چرچے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ کو خرگوشوں کے خاندانی منصوبوں سے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں۔ تاہم ذرا سوچ کر بتائیں کہ دنیا بھر میں ایک سال میں تخمیناً کتنے خرگوش تولد ہوتے ہوں گے؟ ایک کروڑ؟ دو کروڑ؟ چلو چار کروڑ؟ بس؟ تو خدا آپ کا بھلا کرے۔ سوئٹزرلینڈ والے ایک سال میں پوری ساٹھ کروڑ گھڑیوں کو جنم دیتے ہیں۔ یعنی اگر مغربی پاکستان سوئٹزرلینڈ کو گھڑیوں کا ٹھیکہ دے دے تو ہر پاکستانی شہری ہو یا دیہاتی اپنی ہر سالگرہ پر نئی گھڑی باندھ یا لٹکا سکتا ہے۔ لیکن افسوس جب تک ایران، سعودی عرب اور کویت کا جملہ تیل متفقہ طور پر اپنا رخ بدل کر کسی پاکستانی چشمے کے راستے نکلنا شروع نہیں کرتا۔ ہمیں سوئٹزرلینڈ کے ساتھ یہ تجارتی معاہدہ ملتوی رکھنا پڑے گا۔ البتہ اس تیل کے پیش نظر جو ہمارا اپنا گاؤں بل کسر (مصنف کا گاؤں بل کسر جو چکوال سے بارہ میل مغرب میں ہے اور جہاں تیل کے متعدد چشمے ہیں۔) پیدا کرتا ہے۔ ہم نے ایک پیاری سی سنہری ملمع والی گھڑی خرید لی۔ ملمع والی اس لئے کہ ہمارے تیل کے چشموں کی محدود پیداوار بھی ملک کو سونے سے نہیں بھر سکتی فقط ملمع ہی کر سکتی ہے۔

اہلِ جنیوا کی انگریزی کمزور ہے

گھڑی تو خیر ہم نے کامیابی سے خرید لی لیکن چند دوسری اشیاء خریدنے میں ہمیں خاص دقت پیش آئی یہ نہیں کہ جنیوا میں چیزیں نایاب تھیں۔ ذرا انگریزی کمیاب تھی۔ بلکہ اکثر لوگ خاصی معقول انگریزی بول بھی رہے تھے۔ صرف ان لوگوں دکانداروں کی انگریزی جن سے ہمیں کام تھا۔ خاص طور پر کمزور تھی۔ بنیان خریدنے کیلئے جب ہماری تمام انگریزی کا بے بدل سرمایہ ضائع ہو چکی تو ناچار اپنی قمیص کے بٹن کھول کر بنیان دکھانا پڑی اور خدا کا شکر ہے صرف بنیان ہی کی ضرورت تھی۔ اسی اصول کے ماتحت کھانے کے لئے ہمیں یوں تو ڈنڈا گھمانا پڑا بجائے بھگڑ میں جانا پڑتا۔ مگر بھلا ہو خدا کے اس برگزیدہ بندے کا جس نے یورپ میں سلف سروس ایجاد کی ہے۔ اب کھانے سے پہلے نام سے مخاطب نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ چلو تعارف اور براہ راست اپنے ہاتھ سے دیکھ کے پلیٹ میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہی ہم نے کیا اور اس کا پہلا فائدہ یہ نظر آیا کہ مچھلی

سمجھ کر اٹھا لیا تھا۔ مچھلی ہی تھی، بھینڈی نہ تھی۔ بیعف مردوں نے پہلے منہ سے آزدگی کرنے کا کئی بار نتیجہ یہ نکالا بحریہ کی آرٹ کی طرح" جس کو سمجھا تھا انناس وہ عورت نکلی " (یہ مصرعہ سید محمد جعفری کا ہے۔)

اِک رات پہلے نیند سے

رات دیر سے پانساں کو لوٹے تو مسز ش اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں اور محض اتفاقاً کیونکہ ہمیں دیکھتے ہی فرمانے لگیں: "کیا عجیب اتفاق ہے! اگر آپ ایک منٹ پہلے یا بعد میں گزرتے تو ہماری مڈبھیڑ نہ ہوتی "۔۔۔۔ پھر وہ ذرا سی رک گئیں جس کا مطلب یہ تھا کہ مڈبھیڑ تو ہو ہی چکی ہے' لہذا تھوڑی سی گفتگو بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ہم نے کچھ کہے بغیر سر تسلیم خم کیا۔ بولیں "تو اتنی دیر تک کیا ہوتا رہا؟"۔۔۔۔ عرض کیا: "کیا ہونا تھا؟ جدھر بازار لے چلا' چلتے گئے "۔۔۔۔ "کوئی رہنما نہ ملا؟"۔۔۔۔ "کوئی ہم زبان تک نہ ملا" ہمارا خیال تھا مسز ش نے تفصیل پوچھی تو جنسیات کی خرید کا قصہ سنائیں گے اور شب بخیر کہیں گے۔ لیکن مسز ش کے دل میں تو ایک سنگین سا شک کھول رہا تھا۔ ہمہ تن سوال بن کر کہنے لگیں: "آپ تو ایک دوست کو ملنے نہیں گئے تھے؟"۔۔۔۔ ہمیں اپنا بہانہ یاد نہیں رہا تھا اور ہم پہلے دروغ گو نہ تھے جس کے حافظے نے خطا کی ہو۔ بہرحال اب ایک اور دروغ کے بغیر چارہ نہ تھا۔ کہا: "اچھا وہ دوست! وہ جھوٹا نکلا۔ وعدہ کر کے نہ آیا"۔۔۔۔ "نہ آیا یا نہ آئی؟"۔۔۔۔ تو یہ بات تھی ہم تو ایک ایسے دوست کے متعلق جھوٹ بول کر پریشان ہو رہے تھے جس کا وجود ہی نہ تھا اور مسز ش کو اس کی تذکیر و تانیث کی پڑی تھی۔ بہرحال ہمیں پہلی مرتبہ سچ بولنے میں فائدہ نظر آیا تو بے تحاشا قسم کھالی: "خدا گواہ ہے عورت نہ تھی" اور دل میں کہا: "بلکہ انناس بھی نہ تھی "۔۔۔۔ عورت کے شکوک کا آخری علاج قسم ہے۔ اور مسز ش کے لئے بھی کارگر ثابت ہوئی کہ موصوفہ نے بلا تاخیر ہماری معصومیت کا پروانہ جاری کر دیا اور فرمایا: "مجھے ایک فوجی سے یہی توقع تھی" پتہ چلا کہ فوج میں نوکری کرنے کا کچھ تو فائدہ ہے۔ ہم نے کمر سے جھک کر بیک زبان شکریہ اور شب بخیر کہا اور اپنے کمرے کو چل پڑے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پیچھے دیکھا تو مسز ش بدستور دروازے پر آخری آشیرباد دینے کو کھڑی تھیں۔ آشیرباد لی اور مسز ش کو دعا دے کر سو گئے۔

اگلی صبح ایک نرم اور گرم بستر کی نشیلی نیند سے بیدار ہوئے تو چھوٹی چھوٹی متفرق عیاشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی عیاشی تو دیر خیزی تھی' شاید یہ عیاشی ہم سے پہلے کسی سست مزاج بادشاہ کو بھی نصیب ہوئی ہو لیکن یقیناً ظل سبحانی آپ ہماری طرح محظوظ نہ ہوتے ہوں گے کہ تخت نشینی سے پہلے نہ ہماری طرح فوج میں نوکری کی ہوگی اور نہ برسہا برس مرغے کی پہلی اذان کے ساتھ جاگ کر پریڈ کی ہوگی اور حقیقی عیاشی وہی ہے۔ جو پریڈ کے بعد نصیب ہو۔ دوسری عیاشی بستر میں نیم دراز ہو کر ناشتہ خوری تھی اور وہ بھی میڈم پیکارڈ کے ہاتھوں۔ اگر آپ اس کی فلمی مثال چاہیں تو راک ہڈسن اور جینا لولو برجیڈا کا تصور کر لیں لیکن ظاہر ہے کہ ہماری جوڑی ذرا پھیکی تھی۔ اور آخری عیاشی اس معطر و منقطر پانی سے غسل تھا۔ غسل خانے سے نکلے تو ہماری زندگی چنبیلی کی اس کلی کی مانند تھی جو ابھی ابھی شبنم سے منہ دھو کر فارغ ہوئی ہو۔

اس لاشریک کے علاوہ ہمارا کوئی مربی نہیں

ڈنر تیار ہو کر باہر نکلے تو دروازے پر مسز شن ــــ کا مس شن ــــ سے پر تلی کھڑی تھیں۔ مس شن صاحبہ موں ہمیں دیکھتے ہی کھلی عداوت کا مظاہرہ کیا۔ یعنی ہماری طرف پشت کر کے ماں کو حفاظتی اوٹ میں لے کر اُن کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ لیکن مسز شن صاحبہ تو اپنی بیٹی کے اس پار سے ازراہِ تکلف ہم سے مخاطب ہوئیں: "آج کہاں کی سیر کا ارادہ ہے؟" ــــ اب ہمارا ارادہ خواہ کہیں کا تھا۔ لیکن ماں بیٹی کے ساتھ جانے کا نہ تھا کہ ہم خلق خدا کے درمیان عموماً اور ماں بیٹی کے درمیان خصوصاً فساد کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ ہم نے پھرتی سے ایک ایسی سیر کا بہانہ گھڑا جس میں مسز شن سے جُثّہ کی خاتون کی شمولیت ممکن ہی نہ ہو اور فی البدیہہ کہا: "جی! آج کوہ ایلپس پر چڑھنے کا ارادہ ہے۔" ــــ مسز شن نے ایک لمبے وقفے کے لئے ہمیں دیکھا اور پھر وہی سوال کیا۔ جس کے لئے ہمیں تیار ہونا چاہیئے تھا ــــ "ساتھ کوئی دوست بھی ہوگا؟" ــــ اور اس کا جواب گزشتہ رات سے ہماری جیب میں تھا۔ ہم نے خضوع میں خشوع ملا کر کہا: "قسم ہے اُس کی جس نے پہاڑ اور دریا پیدا کئے ہیں کہ ہمارے جنیوا میں اُس لاشریک کے سوا کوئی دوست نہیں۔ اس مہم پر تو تنہا جا رہے ہیں ــــ ہماری قسم پھر نشانے پر بیٹھی اور مسز شن کے لبوں سے پھر وہی دعائیہ تبسم پھوٹا۔ الغرض ہم دوسری آشیرباد لے کر پانسیان سے باہر نکلے اور پیشتر اس کے کہ ماں بیٹی لفٹ سے اترتیں ہم جنیوا شہر کی سیر کرانے والی تفریح بس میں بیٹھ گئے اور یہی ہمارا اصلی پروگرام تھا۔

مزاج شریف مس سارہ نیسلر پی ایچ ڈی

یہ تفریحی بسیں ہم جیسے کم فرصت اور سبک کیسہ سیاحوں کے لئے نعمت ہوتی ہیں چند گھنٹوں میں گوناگوں مقامات کی سیر، رنگا رنگ ساتھیوں کی ہمنشینی اور ایک دلنشیں بیان گائیڈ کی زبانی رواں دواں تبصرہ ہم نشینوں اور مقامات کے رنگ و روغن سے تو ہم خاصے متاثر ہوتے لیکن رہنما کی دلنشیں بیانی نے ہمیں کچھ چکرا سا دیا۔ کیونکہ وہ فصل بھروپی فرانسیسی زبان سے انگریزی بولتے ہوئے ہر "ر" کو "غ" بنا دیتا تھا۔ لہٰذا اُسے سمجھنے کے لئے تمام تازہ الفاظ میں ہر "غ" کی جگہ "ر" رکھنا پڑتی تھی اور جتنی دیر میں ہم ایک غ کی جگہ "ر" فٹ کرتے وہ دس غ آگے نکل جاتا۔ اس دوڑ میں ہم ہی واحد پسماندہ نہ تھے، ساتھ کی نشست پر بیٹھی ہوئی ایک عینک پوش انگریز لڑکی بھی وہ چار سطر پچھڑی ہوئی تھی اور بعض سے شاید ہم نکتے ہوں ہم نہ تھے جتنی وہ غریب کہ اپنی مادری زبان کے قتل کی چشم دید گواہ تھی اور جب ہم نے ایک دو مرتبہ اس کی بیزاری کی تائید کی تو ہمارے درمیان مشترکہ مظلومیت کی بناء پر رشتۂ مودت استوار ہونے لگا۔ مزید تعارف پر معلوم ہوا کہ محترمہ لندن یونیورسٹی میں اقتصادیات کی بڑی فاضل قسم کی طالبہ ہیں۔ یعنی پی ایچ ڈی کے کنارے کھڑی ہیں ــــ خیر وہ تو طالبہ ہی تھا عینک جو لگی ہوئی تھی ــــ جواب میں ہم نے بتایا کہ ہم بھی پنجاب یونیورسٹی کے فاضل اقتصادیات ہیں اور اب نہ ہے سے علم کی پیاس بجھانے انگلستان جا رہے ہیں۔ تو ہماری ہم نشین نے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے دستِ ناز آگے بڑھایا۔ لیکن دستِ ناز بڑھتا بڑھتا ہمارے جوابی ہاتھ کو مس

کرتا، ہماری گردن سے جا لٹکا دیا۔ یہ نہیں کہ ہمیں اس ساعدِ سیمیں کو اپنی گردن میں حائل کرنے میں کوئی تامل تھا
فقط یہ کہ منشائے یار نہ تھا۔ یار کا شائد محض ضعفِ بصارت کی وجہ سے چوک کا قصد اور ہم کسی کی معذوری
کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے بصد ادب محترمہ کی کلائی کو اپنی گردن کے قریب جا تھاما۔
اور پھر معانقہ کا معروف عمل بجا لائے۔ اس اثنا میں محترمہ نے بھی دور کی عینک اتار کر نزدیک کی زیبِ چشم
کرلی اور ہمارے مختلف اعضا کو اپنی اصلی جگہوں پر اور باہم مربوط دیکھ کر خفیف سا تبسم کیا۔ جواب میں ازراہ
ممنونیت مترنم کیا۔ اور اپنا نام عرض کیا۔ پتہ چلا کہ آپ سارہ ٹیلر ہیں۔ لیکن ہمارے لئے سارہ ہیں۔ یعنی وہ منزل
جو برسوں میں طے ہوا کرتی ہے۔ ہمیں لطفِ خاص سے ایک لمحے میں طے کرا دی گئی۔ اس رعایت پر ہم نے تھوڑا
سا ناز کیا۔ اور پھر اس قدر ناز کا خمیازہ بھگتنا شروع کیا۔ یعنی جلد ہی ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم بتدریج مس
سارہ ٹیلر پی ایچ ڈی کی نحوست علمی صحبت کی دلدل میں پھنس رہے ہیں اور تا بہ زانو پھنس چکے ہیں اور سچ تو یہ ہے
کہ ہم اس وقت اتنے علم کے پیاسے نہ تھے جتنے کوکا کولا کے۔ چنانچہ مس ٹیلر کی بخشی ہوئی بے تکلفی کو استعمال
میں لاتے ہوئے اسے پہلے نام اور پیار سے مخاطب کیا اور کہا :

"سارہ ! قطع کلام معاف، مجھے پیاس لگ رہی ہے آؤ کچھ پئیں :"

"کچھ پینا" انگریز کی کمزوری ہے۔ انگریز کا عیش کا تصور فقط اس قدر ہے کہ اس کے ہاتھ میں گلاس ہو
جس میں وہسکی ہو تو بہتر ورنہ کوئی مائع ہو، کوئی بہنے والی شئے ہو۔ سارہ بولی :

"ونڈرفل آئیڈیا، مگر یہاں کچھ پینے کو ہے بھی ؟"

ہم نے دل میں کہا : "جانِ من ! تو ہاں کہہ تو سہی اور ذرا پلکیں بند کر، پھر دیکھ، ہم کیسے تمہاری خاطر آسمان سے
جگ مگ کوک توڑ کر لاتے ہیں" لیکن ہمیں ایسی افلاکی مہم پر جانے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ عین اسی وقت ہماری
بس لیگ آف نیشنز مرحوم کے عالیشان مزار کے پاس پہنچ کر تھمنے لگی۔ اور تھم چکی تو ہمارے مبصر نے بس سے اتر
کر جملہ مسافروں کو زیارت کی دعوت دی۔ بس سے اترے تو سب سے پہلے کیفے ٹیریا نظر آیا۔ دوسرے مسافر تو لیگ
کی داستانِ عروج و زوال سنتے ہوئے مبصر کے پیچھے چل پڑے۔ اور ہم سارہ کو ہاتھ سے تھامے بار پر گئے جہاں
اس کے دوسرے ہاتھ میں گلاس اور منہ میں تنکا دے کر مزید پیکر بازی کا سدِ باب کر دیا۔ بلکہ موقع پا کر اسے ایک
متبادل غمگسار یعنی بارمیڈ سے باتوں میں لگا کر چپکے سے باہر نکل آئے تا کہ ہم بھی لیگ آف نیشنز کے تاریخی ہالوں
میں ذرا جھانک لیں اور سند رہے کہ ہم اولاً کفن چوروں کا وہ عظیم الشان اڈا بچشم خود دیکھ کر آئے ہیں جہاں تقسیم
قبور کا بیوپار ہوا کرتا تھا ——— موجودہ زمانے میں یہ دھندا نیویارک میں ہوتا ہے ——— ہمارا خیال تھا کہ لیگ کے
مزار پہ نے چراغے نے گلے کی کیفیت ہوگی لیکن دیکھا تو اس کے مزار پر قمقمے فانوس جگمگا رہے تھے اور اس کے مزار
کی گل چمن بہار پہ تھے۔ بخدا یہ مزار نہ تھا، بازار تھا۔ اور اس بازار کے بیوپاری اپنے اسلاف سے کہیں زیادہ
چالاک و چست تھے۔ یعنی بیوپار تقسیم قبور ہی کا تھا۔ مگر انہیں دین کی کتابوں کو صحت و محنت، تخفیف اسلحہ اور
بہبود عامہ کے عنوان دے رکھے تھے۔ آخر اس مزار، بازار اور آثار کی زیارت سے فارغ ہوئے اور دوسرے

مسافروں کے ساتھ بس میں آ بیٹھے۔ چلنے سے پہلے ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا تو ایک نشست خالی پائی۔ جو اِلا یہ نشست ہماری ہمسائی مس ٹیلر ہی کی تھی۔ اور ہمیں معلوم تھا کہ موصوفہ کہاں ہیں؟ کیوں ہیں؟ اور یہاں کیوں نہیں لیکن چپ رہے۔ ڈرائیور نے ایک دو دفعہ خاصے صبر کے ساتھ اور پھر چار پانچ دفعہ نہایت بے صبری سے ہارن دیا۔ لیکن موصوفہ کی آن میں نتیجہ ٹیلر کے بجائے صفر ہی نکلا۔ آخر ہم نے تو مس کو کہ ذرا تکلف کر کے مس ٹیلر کا محل وقوع بتایا۔ بلکہ اتر کر اُس کے ساتھ کیفے ٹیریا تک گئے۔ آگے مس ٹیلر ایک خود ساختہ بلیک بورڈ کے ذریعے کیفے کے جملہ سٹاف کو اُن کے اپنے ملک کی مصنوعات کے اعداد و شمار سمجھا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو عجز کو یاد آیا کہ کبھی ہم بھی اُن میں بیٹھا تھا۔ آرام سے شاگردوں سے معافی مانگتے اور "باقی پھر" کہتے ہوئے کسی ندامت کسی معذرت کے بغیر ہمارے ساتھ چل پڑیں۔ ڈرائیور نے جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا اور کچھ زیر لب جھنجھلایا بھی، مگر مس ٹیلر پر یہ کلام نرم و نازک بے اثر نکلا۔ البتہ کسی قدر گرمجوشی سے اس خاکسار کا شکریہ ادا کرنے لگیں کہ کس شاندار کیفے سے تعارف کرایا۔ خدا جانے وہ بد دعائیں جو کیفے کے سٹاف کے منہ سے نکلی ہوں گی، ہمارے کھاتے میں لکھی گئیں یا مس ٹیلر کے حساب میں۔

بس چلی اور ساتھ ہی مس ٹیلر کی زبان بھی چلنے کو تھی کہ ہم نے ایک معروف دفاعی چال چل دی یعنی مس ٹیلر کو ایک طویل فوجی لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ حریف کو اپنی پسند کے میدان میں لڑنے پر مجبور کیا جائے۔ چال کامیاب رہی کہ جواب میں مس ٹیلر سوائے "اچھا؟" اور "پھر" کے کوئی جارحانہ آواز نہ نکال سکیں اگر خدانخواستہ Initiative (اقدام) مس ٹیلر کے ہاتھ آجاتا تو ظاہر ہے کہ ہمیں موصوفہ کے ریپڈ فائر کے مقابلے کا حوصلہ نہ تھا۔ ادھر ہمارا گولہ بارود یعنی فوجی لطیفہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ریڈ کراس کی خوبصورت عمارت آگئی۔

جنیوا ریڈ کراس کی جائے پیدائش ہے۔ ہمیں اس کے دیکھنے کا شوق تھا۔ اور بسر کو دکھانے کی بےتابی چنانچہ ایک بار پھر اترے۔ عمارت کے اندر گئے۔ اور وہ چھوٹے ڈیسک دیکھے جن میں ریڈ کراس نے پچھلی صدی میں آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر اُن کارناموں کی روداد سنی جو اس نے جوان ہو کر انجام دیتے تھے۔ ابتدا میں بے شک موصوف کے ہاتھوں جو ریوڑیاں اپنوں ہی میں تقسیم ہوتی رہیں۔ تاہم جنہوں نے بھی کھائیں سب بےچارے ریوڑیوں کے محتاج اور مستحق ضرور تھے اور محض اس لئے کہ چند ریوڑیاں غلط تقسیم ہو گئی تھیں، اسے شاباش سے محروم رکھنا گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ ہم نے ریڈ کراس کو شاباش دی۔ اس کے گول سہانے سر پہ ہاتھ پھیرا اور درازی عمر کی دعا دی۔

★★

نظر برنی

ملتے جلتے آتے جاتے

آپ اگر کوشش فرماتے ، ملتے جلتے آتے جاتے
خاموشی سے نوٹ دکھاتے ملتے جلتے آتے جاتے

گر خواہش ہے پرموشن کی چوری چوری باس سے ملتے
دفتر کا دستور نبھاتے ملتے جلتے آتے جاتے

راہ و رسم سے باس پگھلتا لنچ و ڈنر سے آپ کا ہوتا
خود جاتے یا اسے بلاتے ملتے جلتے آتے جاتے

سامنے اس کے بن کے رہتے ہیں بھیگی بلی اور چغد بھی
لیکن پیچھے رعب دکھاتے ملتے جلتے آتے جاتے

آپ سے گر مسٹیک ہوتی کبھی اس کی ڈانٹ کو شوق سے سنتے
اس کے آگے لب نہ ہلاتے ملتے جلتے آتے جاتے

آپ میں گر ہمت کی کمی تھی پھر تو سہارا غیر کا لیتے
اس کے چمچوں کو ہی پٹاتے ملتے جلتے آتے جاتے

افسر کو افسر ہی سمجھو اپنا نظرؔ وشواس یہی ہے
شان میں اس کی شعر سناتے ملتے جلتے آتے جاتے

غزل

سرپٹ حیدرآبادی

نہ ہو مجھ کو اسکی کوئی خبر، یہ خیال امر محال ہے
وہ وہاں ضرور علیل ہے، یہاں دل جو میرا نڈھال ہے

میں ہوں اس کے مرے سے شاد کیوں مرا کیوں مزاج بحال ہے
جو نہ حل کسی سے بھی ہو سکا، وہ معمہ میرا سوال ہے

نہ وہ جوشِ عہدِ شباب ہے، نہ تو وہ وال ہے نہ وہ کھال ہے
کبھی جس پہ ہم بھی اکڑتے تھے، وہ زمانہ خواب و خیال ہے

یہ بجا کہ چوری کے شعروں سے ہے بھری ہوئی مری شاعری
ہوا مجھ پہ شک بھی نہ سرقے کا، یہی خاص میرا کمال ہے

وہ شریک رس ہوا اگر تو رہے گا سہرا اسی کے سر
وہی یعنی سرپٹ تیز تر وہ نہ آئے ورنہ یہ محال ہے

قطعات

سرپٹ حیدرآبادی

تعاون باہمی پہ کرکے عمل چلایا ہے کام اپنا
وہ ہم کو سمجھے غلام اپنا ہم ان کو سمجھے غلام اپنا
ہوا نہ تھا عشق جب تک ان سے، نہ تھا ٹھکانا، نہ کھانا پینا
ہے مستقل اب انہیں کے گھر میں قیام اپنا طعام اپنا

جس چیز کو بھی دیکھئے الٹے اثر میں ہے
کل تک جو بات عیب تھی وہ اب ہنر میں ہے
دفتر میں رات دن رہے بیوی تو غم نہیں
بچے کھلانے کے لئے شوہر تو گھر میں ہے

شفیقہ فرحت

حضرتِ آلو

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ آلوئے خوش رنگ یاد آیا

اور کیوں نہ آئے — آلو تو سبزیوں اور ترکاریوں کا غالب اور اقبال ہے۔ کھیت سے لے کر کولڈ اسٹوریج تک اور ٹھیلے سے لے کر کھانے کی میز تک، یا آس تھری اِن ون جھلینگا چار پائی تک جو بیک وقت آپ کے ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم اور بیڈ روم کے خوش گوار اور ناخوش گوار فرائض انجام دیتی ہے۔ جدھر نظر ڈالئے بس وہ ہی وہ ہے —

نقش فریادی ہے اس کی شوخیٔ تحریر کا
آلوئی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

بس آلو ہی ایک حقیقت ہے۔ باقی سب مجاز۔ ایک اسی کو بقا ہے۔ باقی سب فانی۔ اور سب سبزیاں تو "بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے" کے مصداق اپنی ایک جھلک دکھا کے روپوش ہو جاتی ہیں مگر حضرتِ آلو ہیں کہ سالے بارہ مہینے اُسی جمال و جلال کے ساتھ جلوہ آرا ہوتے ہیں۔

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو
وہی ہم ہیں آلو ہے اور ماتم حالِ تر کا

اور صاحب بارہ کیا اگر سال میں پندرہ اور اٹھارہ مہینے بھی ہوتے تب بھی "ایں جہانی" اسی شان سے ٹھٹے رہتے کہ —

دل ہوا پھر آلوئے رخشندہ کا در کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

جانے کس ایماندار فرشتے نے دھاندلی کر کے ایسے فولادی عناصرِ خمسہ سے آلو کی تخلیق کی کہ برستا پانی، کڑکتا جاڑا اور جھلستی دھوپ بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ آلو نہ ہوا حضرت اقبال کا مردِ کامل ہو گیا۔ کیوں کے کا کس [illegible]

کاٹماروں اور ہندوستانی (سفارتی تعلقات کی خوشگواری کی بناء پاکستانی بھی ۔۔!) فلموں کا ہیرو ہو گیا ۔۔ !

اور سچ تو یہ ہے کہ یہ فلمی ہیرو کی طرح کارساز بھی ہے اور ۔ کارآفریں بھی ۔ اور مشکل کشا بھی ۔۔ ! اور بگڑی کو بنانے والا ۔ ڈوبتے کو بچانے والا ۔ بے کس کا سہارا ۔ بے بس کا کنارا ۔۔ !!

جب موسم کی بارش اور موسم کے اولوں کی طرح مہمان آپ کو ایصالِ ثواب کا موقع عطا کرتے ہوئے عذاب بن کر نازل ہو جائیں اور قرار کے سارے راستے مسدود اور بازار کی ساری دکانیں بند ہو جائیں اور آپ کے لئے اپنی پس ماندہ عزت اور مہمانوں کے لئے اپنی باقی ماندہ جان بچانی مشکل ہو جائے ۔ اس وقت یہی آلو اپنی بے رنگی سے آپ کے دسترخوان پہ رنگ اور مہمانوں کے دل میں ترنگ بھر دے گا ۔ تب آپ کو احساس ہو گا کہ آلو کے مقابلے میں آپ کی اپنی حیثیت کس درجہ حقیر ہے ۔۔ ! اور پھر آپ آلو سے اپنے سفارتی تعلقات خوشگوار بنانے کی خاطر اس پہ لگائے گئے تمام الزامات نہ صرف واپس لے لیں گے بلکہ ایک پریس نوٹ جاری کریں گے کہ

جز آلو اور کوئی نہ آیا بروئے کار

اور اس کے بعد ایک پریس کانفرنس بلا کے ۔ آلو چپس اور آلو چاٹ کھاتے اور کھلاتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کر دیں گے کہ آلو سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا اور یہ کہ

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو آلو تو جینے کا مزہ کیا

ویسے آف دی پریس حقیقت یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی کو سوائے آلو فروشوں کے آلو سے دلچسپی لیتے نہیں دیکھا ۔۔ ! مگر خیر ۔۔ یہ آپ کا عشق ہے اور اگر آپ کا یہ عشق اس فلمی اور قلمی رفتار سے بڑھتا رہا تو ممکن ہے کسی دن آپ ٹول والی مسجد کے ملّا جی کے پاس بغیر جوتے پہنے ننگے پیر یا بالقدم سلیپر سٹکلٹدوڑ سے چلے جائیں اور ان کی شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً پھیلی ہوئی براق داڑھی کی قسم دے کر پوچھیں کہ "ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا" تو کیا اس باغِ رضواں میں آلو کی بوریاں بھی ہیں کہ نہیں ورنہ ہم بیکار اتنے پاپڑ کیوں بیلیں ۔۔!

ویسے آلویات کے مرکز اور اصل مراکز ہوٹل اور ہوسٹل ہوا کرتے ہیں ۔ یہ چاہے کھلن مرگ اور سونا مرگ میں ہوں یا کنیا کماری میں ۔ اور میگھ آنے میں ہوں یا کچھ میں ' ماہرِ آلویات اپنی "آلو شناسی" کے ایسے ایسے نادر نمونے پیش کریں گے کہ ہر کھانے والا بہ رقت و دقت یہ شعر پڑھتا ہوا ڈائننگ ہال سے نکلے گا ۔

ہال میں پھر آلو نے اک شور اٹھایا ۔ یا لیلیٰ جو برتن اٹھایا سو اس میں آلو نکلا

ان مقامات آہ و فغاں میں بشرطِ استواری ہر دن اور ہر رات کا مینو آلو + ہی ہوتا ہے ۔ یعنی آلو گوبھی آلو مٹر ، آلو ٹماٹر ، آلو بینگن ، آلو سیم ، آلو بھنڈی ۔ آلو ترائی ، آلو لوکی ، آلو کدو ، آلو کریلا ، آلو ٹینڈا ، آلو پالک آلو میتھی ، آلو انڈا ، آلو گوشت ، آلو مرغی ، آلو مچھلی ، آلو پلاؤ وغیرہ وغیرہ ۔۔

یہ تو حضور وہ آلو ہیں جنہیں ہم آپ (اور آلو فروش بھی) میدانی اور پہاڑی کہتے ہیں جس طرح کسی زمانے میں

خربوزے کو دیکھ خربوزہ رنگ پکڑا کرتا تھا اسی طرح آج ان میدانی اور پہاڑی آلو کی ہمہ گیر اہمیت کو دیکھ کر کچھ شہری آلو بھی نہ صرف پیدا ہونے لگے ہیں بلکہ رنگ بھی پکڑتے جاتے ہیں اور ڈھنگ بھی ـــــ !!

شہری آلو چاہے پہاڑی اور میدانی آلوؤں کی طرح گول مٹول نہ ہوں مگر لڑھکتے انہیں کی طرح ہیں۔ اِدھر بھی اُدھر بھی ـــــ تھالی کے اندر بھی اور تھالی کے باہر بھی ـــــ ! اور زمانہ اِن کے فن کا بڑا قدردان ہے ـــــ !!

جس طرح طلسم ہوش رُبا کی پریوں اور دیوؤں کی جان کسی طوطے کسی مینا میں بند ہوتی تھی۔ اسی طرح آج کے بازی گروں کی جانیں بھی انھیں آلوؤں میں اٹکی رہتی ہے ـــــ ہر گروہ انھیں محبّت پاش اور محبت پاش نظروں سے دیکھتا ہے۔ پھر اشارے کنائے ہوتے ہیں۔ نذر نیاز ہوتی ہے اور یہ بظاہر بے نیازی کا ثبوت دیتے ہیں مگر دل ہی دل میں اپنے غیر اہم وجود کی اہمیت کے احساس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور بات بے بات گوندانی کے پرشن کی طرح اکڑتے رہتے ہیں۔ آخرکار مناسب حربے کے بعد کسی گوبھی کسی ٹماٹر کسی مٹر کے ساتھ مل کر ہنڈیا پکاتے ہیں اور دسترخوان سجاتے ہیں۔

ویسے یہ کچھ نہیں ہیں ـــــ مگر گوبھی ٹماٹر مٹر کے ساتھ سب کچھ ہیں اور گوبھی ٹماٹر مٹر بھی اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ آلو کے بغیر "بہت کچھ" بننا ممکن نہیں ہے اسی لئے تو "شمارہ آلو مرغوب بہت مشکل پسند آیا" ہے۔ لہٰذا دونوں طرف کا جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے ـــــ !!!

آلوؤں کی یہ قسم بڑی عقلمند۔ خودشناس اور جہاں دیدہ ہے۔ اسی لئے بھاؤ بڑھے ہیں اور بلدی ان کی قسمت میں جیں بحروف سنہری و روپہلی لکھتا ہے ـــــ ! نگاہ آلوشناس ان کے علاوہ بھی قسم قسم کے آلو دیکھ لیتی ہے۔

آلو کی طرح گول مٹول۔ آلو ہی کی طرح مرنجاں و مرنجان اور مسکین ـــــ ! یہ اوروں سے بے تعلق اپنے سے بے خبر نہ کسی کا حساب چکانا۔ نہ کسی کو حساب دینا۔ نہ دوستی نہ دشمنی نہ لاگ نہ لگاؤ۔ چہرے پہ ایسی ملکوتی حماقت (جسے مہذب زبان میں معصومیت بھی کہا جاتا ہے) جیسے ابھی ابھی کسی ملک کی بادشاہت کا تاج مرصع آپ کے سر مبارک پہ رکھا جانے والا ہو ـــــ !

زندگی کے بازار میں ان کی قیمت ایک سوت کی انٹی سے زیادہ نہیں لگتی کہ ان کے ہاتھ میں نفع نقصان کا ترازو نہیں! لہٰذا انہیں آلو کے بجائے ابلا آلو کہنا زیادہ مناسب ہوگا ـــــ !!

شہری آلوؤں میں "سماجی آلو" کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے بغیر اندرونِ شہر و بیرونِ شہر کی کوئی تقریب مکمل نہیں۔ وہ چاہے اِندو پاک مشاعرہ ہو یا مذاکرہ ـــــ آکو ملک کانفرنس ہو یا مرغی انڈا سمیلن قطب شمالی کے آرٹسٹ کی برف سے بنائی تصویروں کی نمائش ہو یا جنبی ادیبوں کی نشست یا۔ تاریخ المساجد سے بیری والی مسجد تک کسی کا بھی ماہیں عصر دمغرب" والا پروگرام ہو تو آپ آلو + کی طرح نہ صرف وہاں موجود ہونگے بلکہ داد۔ بے داد انتظام انتشار ہر ایک کا پورا پورا ساتھ دیں گے ـــــ !

اور معززین شہر میں سے چاہے جس کا انتقال پُرملال ہوا ہو وہاں بھی آپ اپنے چھلکے بھیلے آنسوؤں سمیت نظر آئیں گے

اور تجہیز و تکفین کے سارے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور یوں جذبۂ بے اختیار شوق کے ساتھ زندہ اور مردہ دونوں کی عاقبت و عافیت تباہ کریں گے گویا مرحوم کے اصل وارث آپ ہی ہیں ــــ!

یوں انہیں کسی بلاوے کی حاجت نہیں مگر پھر بھی دستِ غیب سے یہ ہر جگہ کے دعوت نامے حاصل کر لیتے ہیں ہر شہر میں ان کی بہتات ہے اور شاید ٹکے سیر بھی مہنگے ہوں بلکہ سرمۂ مفت نظر کی طرح چشم خریدار پہ ہی احسان ہوگا. مگر یہ ہیں بڑے کام کی چیز ـــ ہال کی خالی کرسیاں ان کے وجود سے بہ آسانی چھپ جاتی ہیں اور وہ آل انڈیا کانفرنسیں جن میں سامعین کی تعداد مقررین اور منتظمین کی تعداد سے ایک نفر بھی زیادہ نہ ہو اور وہ آل انڈیا کے بجائے آل محلہ بھی نہ معلوم ہوتی ہوں، وہاں انہیں کے دم سے (دستر خوانی آلو کی طرح ـــ!) رونق لائی جاتی ہے. اور کہیں کہیں تو فتح و شکست کے فیصلے بھی انہیں کی ذات بے برکات سے ہوتے ہیں۔

تو پھر کیوں نہ یاد آئے ـــــ آلوئے خوش رنگ ـــ

۲۲

فضلِ جاوید

عورتوں کی چوپال

خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ اس قول کی سچائی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں لیکن اس خالی ذہن کی جادوگری سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر زمانے میں بزرگوں اور حکیموں نے وقت کی اہمیت پر بار بار زور دیا ہے اور قیمتی سرمایہ کو فضول باتوں اور بے کار کاموں میں کھو دینے سے ہمیشہ منع کیا ہے۔ لیکن سنجیدگی سے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اگر سب لوگ اور بالخصوص عورتیں ان کی باتوں میں آ جائیں اور وقت کی اہمیت کو پہچان کر تعمیری کاموں میں جٹ جائیں تو یقیناً سب ہنگامے ختم ہو جائیں گے اور رنگینیاں مٹ جائیں گی اور یہ دنیا ویران ویران سی دکھائی دینے لگے گی۔ اسی لیے کسی شاعر نے حکما کے قول کو جھٹلا کر یہ اعلان کر دیا کہ "اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی "رونق" تم سے ہے۔ یعنی اگر تم چپ بیٹھی رہو گی تو یہ رونق یکسر ختم ہو جائے گی۔

شہر کا کوئی محلہ ہو یا کالونی یا گاؤں قصبہ، وہاں کچھ عورتیں ایسی ضرور مل جائیں گی جنھیں آس پاس کی ہر چیز کا علم ہوتا ہے۔ وہ اچھی خاصی محکمۂ اطلاعات و نشریات ہوتی ہیں۔ بس یہی کچھ عورتیں ہیں جو اپنے ساتھ سارے محلے کو ساری کالونی کو اور سارے گاؤں کو حرکت میں رکھتی ہیں۔ شہر کی بہ نسبت گاؤں میں ایسی رونق کم ہوتی ہے۔ لیکن کالونیوں میں رہنے والے اس سے کچھ زیادہ ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کالونیاں عموماً شہر سے دس بارہ کیلو میٹر دور بسائی جاتی ہیں۔ جہاں کی تہذیب و معاشرت شہر سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

ہم جس کالونی میں رہتے ہیں اس میں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آ کر بس گئے ہیں۔ شمال جنوب مشرق مغرب سب اطراف کے لوگ اپنی اپنی تہذیب لے کر یہاں آئے اور ایک نئی معاشرت کی بنیاد ڈالی۔ یہاں خاصی تعداد ایسی عورتوں

سے گی جاپنے شوہروں کے کارخانے اور بچوں کے اسکول جانے کے بعد اپنے اپنے گھروں سے نکل آتی ہیں اور پھر کسی کوارٹر کے سامنے پر عورتوں کی یہ محفل جمتی ہے۔ ہر گھر کے اندر کا حال انہیں معلوم ہوتا ہے۔ کون کون کس کوارٹر میں آتا جاتا ہے۔ کس کے پاس کونسی نئی چیز آئی ہے۔ کس کا میاں کارخانے سے تھکا ہارا آکر کھانا بناتا ہے کپڑے دھوتا ہے اور بیوی سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ کرتی ہے سینما جاتی ہے — کس کی تنخواہ کتنی ہے۔ کون کون فیملی پلاننگ کر رہا ہے اور کس کس کے گھر اولاد نہیں ہوتی — غرض وہ کون سا راز ہے جو ان پر آشکار نہیں —

عقلمند لوگ عورتوں کی اس چوپال کے فیصلوں اور جملوں سے اپنی کمزوریوں کو دور کر لیتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات یہ محفلیں فتنے برپا کرتی ہیں۔ محلے کے سارے جھگڑے فساد انہی خالی ذہنوں کے کھڑے کیے ہوتے ہیں۔

یہاں ایسی عورتیں بھی بیاہ کر لائی گئی ہیں جنہوں نے زندگی میں بجلی جلتی ہوئی نہیں دیکھی تھی۔ ٹرین۔ اسکوٹر۔ ریڈیو یہ سب ان کے لیے جادوئی چیزیں تھیں۔ ہوائی جہاز کوئی آسمانی آفت سمجھتی تھیں — لیکن یہاں آکر کچھ ہی دنوں میں وہ سب کو میں گھل مل کر ایسی بن گئی ہیں جیسے کہ وہ اسی ماحول میں پیدا ہوئی ہوں — اسی ماحول میں سلگنے والا کوئی اور نہیں یہی عورتوں کی چوپال ہے —

ایک دن عورتوں کے اس خطرناک پلیٹ فارم سے انکوس بی کے گھر کا سکون درہم برہم کرنے کا سامان ہو رہا تھا۔ چھ سات عورتوں کی یہ ٹولی انکوس بی کو ہر اس گھر میں لے گئی جہاں ڈرائنگ روم میں صوفہ سیٹ سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔
ایک گھر میں چائے پیتے ہوئے انکوس بی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا۔ "دیکھا انکوس بی — پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ سلیقے سے ہر چیز بھی سنوری رہے تو اس سے عزت بڑھتی ہے۔ اب ان مسز جاوداہی کو دیکھو۔ مسٹر جاوداہی کی آمدنی تمہارے اچھے میاں سے بھی کم ہے لیکن اس شاندار قسم کے صوفہ سیٹ نے گھر کی شان دوبالا کر دی ہے۔"

دوسرے گھر میں پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے ایک بولی۔ "انکوس بی یہ مسز حق بھی خوب چیز ہیں۔ ہر سال پردے بدلتی ہیں۔ حق صاحب کی بگھار تو اچھے میاں کے اوور ٹائم کے برابر ہوگی لیکن محلہ کی 'سلیقہ شعار عورت' کا ٹائٹل مسز حق کو ہی ملتا ہے۔"

ایک گھر میں چھالیہ پھانکتے ہوئے کہا گیا۔ دیکھو انکوس بی یہ مسز خان کی سجاوٹ ہے۔ اس خوبصورت صوفہ سیٹ پر قالین سے میچ کرتے ہوئے کشن کتنا زیب دے رہے ہیں۔

اسی طرح خوب راکھ کریدی گئی۔ انکوس بی کے ذہن کے کسی انجانے گوشے میں آٹھ دس سال سے دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔
شام کو تھکے ہارے اچھے میاں آئے۔ انکوس بی نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ ان کی ساری تھکن دور ہو گئی اور مسکراتے ہوئے بولے۔ کیا بات ہے آج بہت خوش ہو؟

"وہ تو میں سوتے وقت بتاؤں گی پہلے تم اپنی پسند کی کھٹی دال اور کباب کھاؤ۔" وہ بڑی ادا سے بولیں۔

اچھے میاں کا ماتھا ٹھنکا۔ "مجھے تو آج کھٹی دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔"

"تم کو تو میری باتوں میں ہمیشہ ہی کالا نظر آتا ہے۔ ذرا جاوداہی صاحب حق صاحب اور خان صاحب کے گھر جاکر دیکھو۔ تم سے کم تنخواہ میں وہ لوگ کتنے اچھے صوفے، پردے اور غالیچے سجا رکھے ہیں —"

اب بے چارے اچھے میاں اپنے پانچ بچوں کو پڑھائیں لکھائیں، اپنے خاندان کا پیٹ پالیں یا انکوس بی کے لیے صوفہ سیٹ

پردے اور قالین لے آئیں۔ ہر رات جب سوتے وقت فرمائش کی تجدید ہوتی ہے تو صبح اٹھتے ہی اچھے میاں کے دل میں "ہم کسی سے کم نہیں" قسم کا احساس جاگتا ہے اور پھر جب یہ احساس اچھی طرح دل میں گھر کر گیا تو فوراً اپنے پراوی ڈنٹ فنڈ سے ایک معقول رقم بطور قرض نکال کر وہ ایک صوفہ سیٹ خرید لائے۔ جو ان کے چھوٹے سے کمرے میں بالکل بے ضرورت تھا۔

اپنے اس مشن میں کامیاب ہوجانے کے بعد ان سب کی نظر رام کلی پر پڑی۔ آخر ایک دن اسے اس پلیٹ فارم پر لایا گیا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا دماغ اچھی طرح ڈھل گیا ـــ اب بھٹناگرنی کی تعریف اس کے سامنے شروع ہوئی۔ بھئی کیا کفایت شعار ہے یہ بھٹناگرنی بھی ـــ نہ صوفہ [illegible] نہ اوور ٹائم ـــ پھر بھی جوڑ جوڑ کر ایک بڑھیا ریفریجریٹر خرید ہی لیا ـــ پھر اس سے مخاطب ہوکر کہا گیا ـــ کیوں ری رام کلی تیرے آدمی کی تنخواہ تو بھٹناگر جی سے بہت زیادہ ہے۔ تیرے پاس ریفریجریٹر کیوں نہیں ہے؟ بے چاری رام کلی کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی اور نام بھی تو اس نے پہلی بار سنا تھا۔ پہلے دن کا سبق ختم ہوا ـــ رام کلی کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس عجیب شئے کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں مچلتی رہی۔

دوسرے دن ایک نے تجویز پیش کی کہ رام کلی کو فریج دکھایا جائے۔ رام کلی کا من خوشی سے ناچ اٹھا۔ سب اسے لے کر بھٹناگرنی کے کوارٹر پہنچے۔ ڈائننگ ہال میں قرینے سے ایک طرف فریج رکھا گیا۔ بھٹناگرنی نے سب کو فریج سے آئس کریم نکال کر کھلائی۔ رام کلی غور سے ریفریجریٹر کو دیکھنے لگی۔ مسز بھٹناگر سب کے سامنے اس کی خوبیاں گنانے لگیں۔ رام کلی کو جو چیز سب سے زیادہ اچھی لگی وہ برف کا خانہ تھا۔ وہ خوشی سے ناچتی ہوئی واپس لوٹی۔

شام کو دن بھر کا تھکا ہارا بدھو رام جب گھر آیا اور نہا دھو کر رسوئی میں پہنچا تو باجرے کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کی مہک سے اس کی بھوک دوگنی ہوگئی۔ خوب سیر ہوکر کھایا۔ جب پانی منہ سے لگایا تو چونک کر اس نے رام کلی کی طرف دیکھا ـــ اس نے جواب دیا۔ باجرے کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کے ساتھ اتنا ٹھنڈا پانی مزا دے گیا۔ کوئی نیا مٹکا خریدا ہے کیا؟

اس نے اٹھلا کر جواب دیا " بڑے میٹرک پاس بنتے ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ پانی برف کی مشین کا ہے ـــ"

"برف کی مشین؟ اس نے چونک کر دہرایا ـــ ہاں ہاں برف کی مشین ابھی پرسوں تو بھٹناگرنی کے گھر آئی ہے۔ اس میں آئس کریم بھی اپنے آپ بن جاتی ہے۔ بدھو رام سمجھ گیا کہ وہ کون سی مشین کی بات کر رہی ہے۔ سونے سے پہلے رام کلی نے بدھو رام سے وعدہ لے لیا کہ وہ بھٹناگرنی کی طرح ایک بڑھیا برف کی مشین خرید لائے گا ـــ بدھو رام کی نیند البتہ اڑ گئی کیونکہ بدھو رام اتنا بدھو بھی نہیں تھا کہ اسے ریفریجریٹر کے دام کا اندازہ نہ ہو۔

آخر بونس کے دن رام کلی کی فرمائش کے آگے اسے جھکنا ہی پڑا۔ جلد ہی وہ دن آگیا جب رام کلی کے گھر کے آگے محلے کی ساری عورتوں کا ہجوم تھا۔ ہاتھ ٹھیلے میں ریفریجریٹر لایا گیا تھا۔ دو کمروں کے کوارٹر میں اسے رکھنے کا مسئلہ بڑا شدید تھا۔ یہ لوگ اپنے آدھے درجن بچوں کے ساتھ انہی دو کمروں میں تقسیم ہوکر سوتے تھے۔ آخر اسے کچن میں رکھا گیا ـــ ہم بھی بڑی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ بدھو رام جب پرساد لے کر ہمارے پاس آیا تو ہم نے اس سے دریافت کیا۔ بھئی بدھو رام۔ شراب سے آپ کو شغف نہیں۔ گوشت مچھلی انڈے آپ کھاتے نہیں۔ پھر اس میں آپ آخر رکھیں گے کیا ـــ؟ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا "کیا آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ فریج میں ایک ہفتہ کا کھانا بنا کر رکھ لیں تو خراب نہیں ہوتا۔ سستی سبزی خرید کر رکھ لو۔ پیاز سال بھر کی خرید کر اس میں بھر دو۔ سال کے بارہ مہینے برف جماؤ۔ خوب آئس کریم کھاؤ۔ بڑے فائدے ہیں جناب اس کے ـــ

ہم واقعی سیلے وقوفوں کی طرح بدصورام کے آگے سر ہلاتے رہے۔

یہ وبا ہمارے محلے میں کچھ اس طرح پھیلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کئی کوارٹروں میں فریج آگئے۔ یہ قسن بٹ رہا تھا۔ اس موسم میں شہر پر بیماری کالونی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ ہفتوں بلکہ مہینوں تک الماریاں، صوفہ سیٹ، مسہری، ڈائننگ ٹیبل، ڈریسنگ ٹیبل، ریفریجریٹر وغیرہ آتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان قیمتی اشیاء کے خریدنے والوں میں سے اکثر کو ان چیزوں کے رکھنے اور استعمال کرنے کا تجربہ تک نہیں ہوتا۔ یہ سب دراصل عورتوں کی اس خطرناک چوپال کے مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن گھروں میں سات دنوں کا کھانا ایک ہی وقت میں پک جاتا ہو تب بے چاری عورتیں کریں بھی تو کیا — کوئی اور ملک شاید ہی ایسا ہو جہاں کی عورتوں کو فراغت کے اتنے بے شمار لمحے میسر ہوں — میرے خیال میں لندن کا ہائیڈ پارک، رشید احمد صدیقی کا ارہر کا کھیت اور عورتوں کی اس خطرناک چوپال میں کوئی نہ کوئی قدرِ مشترک ضرور ہے — اور یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موخر الذکر شئے ہمارے ملک کی ایک خاص چیز ہے۔

●●

غزلیں

حبیب الرحمٰن برنی
رانچی (بہار)

سعد خاں ہوں گے کبھی قوال بن جائیں گے ہم
رو پڑیں گے خلوت میں محفل میں غزل گائیں گے ہم
چشمِ ساقی کا اشارہ جس گھڑی پائیں گے ہم
محتسب کو ساتھ لے کر خم میں گھس جائیں گے ہم
اللہ اللہ یہ زمانہ آگیا ہے آج کل
آپ جوتا کھائیے گا اور شرمائیں گے ہم
جنگ بازوں کا یہ کہنا ہے کہ اک دن دیکھنا
آگ میں ایٹم کے بھٹے بھون کر کھائیں گے ہم

سراج نرملی

کروں کیا اور تو ہی بول بیٹے
بہت تنگ آچکا تیری مدد سے
تمہارے تو لیڈر کو دیکھتے ہی
انھوں نے پھاڑ ڈالا اس کو خنجر سے
اضافہ گھر کی آبادی میں ہوگا
ہوئی وحشت ہیں تو اس خبر سے
میاں ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں
جھگڑے پہ نہیں عزت کے ڈر سے
ترنم چھوڑ دے تو اے سراج اب
نہیں ہے تو ن اچھا تیرا نخرے

ارشد علی خان

ساری دنیا میں ہندوستان ہی غالباً وہ واحد "خوش نصیب" یا "بدنصیب" ملک ہے جہاں حشرات الارض کی مانند شاعر پائے جاتے ہیں۔ ان حشرات الارض میں کبھی کبھی دابۃ الارض جیسا قوی الجثہ شاعر نمودار ہو جائے تو مشہور ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کی مایہ ناز ترقی کی سینہ کوبی، شاعر حضرات کچھ اس بے دردی سے سالہا سال سے کرتے چلے آرہے ہیں کہ الاماں —— اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستانی قوم بھی بلا کی نبض شناس واقع ہوئی ہے۔ وہ ان حضرات کو کچھ اس طرح پہچان لیتی ہے جس طرح لوگ آسمان پر "جھاڑو تارے" کو بڑی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں۔ یہ جھاڑو صفات حضرات خود تو مطلق صاف نہیں رہتے (نہ جسمانی صفائی اور نہ روحانی) بلکہ جھاڑو کا مکمل پارٹ ادا کرتے ہوئے دنیا بھر کی غلاظت اکھٹا کر کے رکھ دیتے ہیں —— لطف کی بات تو یہ ہے کہ ان حضرات کو شاعری کے دورے کم، ہنسانے کے زیادہ پڑتے ہیں —— اور یہ خواہش دم واپسیں تک ہنوز تازہ ہی رہتی ہے۔ بعینہ پہاڑی نالے کی طرح جو مسلسل بہنا چاہتا ہے۔ بعض شعرا کو جب مشاعرے اور بیکار افراد دستیاب نہیں ہوتے تو وہ اپنے جی کا جنون، دیواروں کو اپنا دیوان سنا کر پورا کرتے ہیں ——

شاعر کو زندہ رکھنے کا واحد طریقہ بھی اس کے اشعار سننے اور سن کر داد دینے پر منحصر ہے —— جو کام آکسیجن اور گلوکوز نہیں کر سکتے وہ کام اس کا غیر مطبوعہ کلام کرتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک شاعر صاحب اس قدر علیل ہوئے کہ تمام لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ موصوف پل دو پل کے شاعر رہ گئے ہیں۔ رشتہ دار چاہتے تھے کہ وہ ایک آدھ دن اور جی لیں تو ان کے لڑکے کو بلوایا جائے تاکہ وہ کچھ وصیت کر سکیں۔ لہٰذا ڈاکٹروں کو طلب کیا گیا لیکن سب نے مایوسی ظاہر کر دی۔ مگر ایک شخص نے کہا آپ حضرات فکر مت کریں مجھے ان کے ساتھ تنہا کمرے میں چھوڑ دیں —— لوگوں نے یونہی عمل کیا۔ وہ شخص

شاعر کے کمرے میں داخل ہوا جہاں شاعر پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا ـــــ وہ آگے بڑھا اور بولا "اے عظیم المرتبت شاعر اٹھو اور اپنا کلام سنا"۔ اتنا سننا تھا کہ شاعر برق رفتاری سے اٹھا اور تکیے کے نیچے سے "غیر مطبوعہ دیوان" نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ صبح رشتہ داروں نے جب کمرے کا دروازہ کھولا تو حیرت سے ان کی چیخیں نکل پڑیں، کیونکہ شاعر تو بڑے مزے سے پلنگ پہ دراز تھا لیکن نوارد مر چکا تھا ـــــ

بہرحال یہ شعرائے کرام ہر فیلڈ میں پائے جاتے ہیں۔ رکشہ والے سے لیکر راکٹ والے تک۔ ان حضرات کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک گروہ "آہ" والوں کا ہے اور دوسرا "واہ" والوں کا ـــــ "آہ" والا گروہ وہ ہوتا ہے جو رات دن سینہ کوبی کرتا ہے اور اشعار لکھتا یا پڑھتا رہتا ہے جس کے سننے کے بعد لوگ آہ و فغاں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ـــ آہ والے شاعر کا نصب العین یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی ٹریجڈی کو احاطۂ شعر میں لا کر اس کی کچھ اس طرح بندش کرے کہ سوائے دکھ درد کے کچھ نہ نکلے ـــــ وہ عموماً گھر، در، بھوک افلاس، تنگ دھڑنگ بلکہ موت، قبر کفن وغیرہ جیسے کفن پھاڑ شاعری کرتا ہے ـــــ ایسا شاعر تنہا پسند، کم گو، بوسیدہ کپڑے پہنے بوسیدہ مکان میں گوشہ نشین ہوتا ہے ـــ چونکہ رونے رلانے سے اسے قطعی کوئی فرصت نہیں ملتی اس لیے وہ ہر فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ سے، بیوی بچوں سے اور بہر جان دار سے "متنفر" یا "گھبرایا" رہنے لگتا ہے ـــ لیکن عشق ضرور کرتا ہے۔ یہ عشق خیالی ہوتا ہے۔ خیالوں میں معشوق سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ البتہ گھر آنے کی محض اس لیے دعوت نہیں دیتا کہ اس کے گھر بوریا نہیں ہوتا ـــ اس کی معشوق غضب کی شوخ و چنچل واقع ہوتی ہے۔ نس نس میں رس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، آنکھیں عموماً ہرن جیسی بلکہ ٹانگیں بھی ہرن جیسی ہوتی ہیں ـــ ہونٹ لال و یاقوت نما" یا "گلاب کی پنکھڑیاں"، بال اماوس کی رات کے مانند کالے اور "ملائم"، چہرہ کبھی کنول، کبھی گلاب وغیرہ وغیرہ موسم کو دیکھ کر بدلتا رہتا ہے۔ غالباً معشوقہ فارن کی خاص لپ اسٹک سے یہ کمال حاصل کرتی ہے ـــ ان تمام چیزوں کے باوجود اس کی قیامت خیز کمر کا پتہ ہی نہیں چلتا، یعنی اکثر وہ بغیر کمر ہی کے ہوتی ہے۔

"آہ اور واہ" والے شاعروں میں تضاد ہونے کے باوجود دونوں کی معشوق ایک ہی قسم کی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ "آہ" والا اس کی جدائی پر قانع رہتا ہے جبکہ "واہ" والا اس سے واصل ہو جاتا ہے بلکہ حبالۂ نکاح میں لا کر افزائشِ شاعری میں مصروف ہو جاتا ہے۔

آہ والا شاعر، مشاعروں سے پناہ مانگتا ہے جبکہ واہ والا شاعر مشاعروں پر نہ صرف جان چھڑکتا ہے بلکہ وہیں جاں بحق ہو جانے کی حد تک سنجیدہ نظر آتا ہے۔ آہ والے شاعر کو مشاعرے تک لانے کے لیے اسے کندھوں پر لاد کر لانا پڑتا ہے کیونکہ وہ افلاس، تنگ دستی اور دیگر دوسرے مصائب کی تاب لا کر دیسی ٹھرے کا سہارا لے چکا ہے۔

اکثر اوقات ڈائس ہی سے گھر کی جانب فرار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا چند چوکنے قسم کے چوکیدار اسے ہوشیار کرنے کے لیے متعین کیے جاتے ہیں۔

ان شاعروں سے الگ ایک خطرناک قسم اور پائی جاتی ہے، اور وہ "نوسکھوں" کی ہوتی ہے ـــــ یہ قسم اس وقت نشوونما پاتی ہے۔ جب انھیں اوقات گزاری کی کوئی اور راہ سجھائی نہیں دیتی۔ ایک ایسے ہی وظیفہ یاب کرنل کو جب کچھ نہ سوجھا تو انھوں نے لوگوں کے ہوش و حواس اڑانے کی خاطر شاعری شروع کر دی۔ وہ جنگل کے بھوکے شیر کی طرح ہر جاندار پر جھپٹتے اور

اور اپنی بے جان شاعری سے اسے بے جان کرنے کی کوشش کرتے ۔۔۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ لوگ دھڑا دھڑ محلہ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اگر کسی کے ذاتی مکان تھے تو آناً فاناً کوڑیوں کے دام فروخت کر بیٹھے ۔۔۔ کرنل شاعر نے جب یہ دیکھا کہ لوگ محلہ خالی کرکے انھیں ریگستان کی کھجور کے درخت کی طرح یکا و تنہا چھوڑ گئے ہیں تو ان کا پارہ چڑھ گیا ۔۔۔ وہ بھی آخر کرنل تھے، لہٰذا فوجی طریقہ کار اپنا لیا ۔۔۔ جب کبھی کوئی غزل یا نظم جنم دے بیٹھتے تو فوراً فوجی وردی پہن کر ریوالور لوڈ کرکے گھر سے نکل کھڑے ہوتے، پھر کسی چھاپہ مار کی طرح لوگوں کی بو سونگھتے رہتے ۔۔۔ جوں ہی انھیں کوئی نظر آتا وہ بے دھڑک ایک ہوائی فائر کر ڈالتے۔ نووارد ڈر کر ڈھیر ہو جاتا تو کرنل نپے تلے قدم ڈالتے ہوئے اس کے قریب جاتے اور ایک ٹھوکر لگا کر للکارتے "اٹھو اور چپ چاپ میرے ساتھ چلے آؤ۔ خبردار بھاگنے کی کوشش کی ...... یاد رکھو میرے ہاتھ میں ریوالور لوڈ ہے .... چنانچہ وہ شخص بلا چوں و چرا ان کے ہمراہ چلنے لگتا ۔۔۔ وہ اسے اپنے گھر لاتے اور ریوالور کی زد میں رکھ کر اپنا کلام سنا کر چھوڑتے ۔۔۔ اسی طرح ایک وقت وہ ایک شخص کو اغوا کر لائے ۔ ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے میں تازہ غزل پکڑے اسے جب تمام غزل بالجبر سنا چکے تو اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ لیکن مغویہ شخص اطمینان سے جوں کا توں بیٹھا رہا۔ کرنل نے جھلا کر کہا کیوں بیٹھے ہو؟ اٹھو اور بھاگ جاؤ! ۔۔۔ اس پر اس شخص نے کہا "جناب دراصل میں خود بھی شاعر ہوں اور اپنا کلام سنانے کی خاطر گھر سے نکلا تھا، خوش قسمتی سے آپ سے ملاقات ہو گئی لہٰذا اپنا کلام طبع زاد سنائے بغیر رخصتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔۔۔ کرنل نے زندگی میں پہلی مرتبہ خوف زدہ ہو کر جھرجھری لی اور پھر ناخوش گوار انداز میں بولے "! خیر ۔۔۔ جلدی سنا ڈالو۔ مجھے دراصل اپنی دوسری غزل لکھنی ہے ۔۔۔ اس نووارد نے سنانا شروع کر دیا۔ سکنڈ منٹوں میں، منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہونے لگے لیکن اشعار تھے کہ مشین گن کی گولیوں کے مثل دھڑا دھڑ نکل رہے تھے۔ کرنل ریوالور لیے پہلو پہ پہلو بدلتے۔ لیکن شاعر ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی اسپیڈ تب ہی رکی جب اس نے ریوالور چلنے کی آواز سنی۔ اس نے گھبرا کر کرنل کی طرف دیکھا وہ فرش پر ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ دراصل کرنل نے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی ۔

۵۵

ظفر چکذیوی

جاہل کون ؟

ایک پی ایچ ڈی مرے بارے میں کل کہنے لگے ایم لے ہیں لیکن ہیں جاہل کچھ انہیں آتا نہیں
سُن کے یہ سوئے ادب ان کے مخاطب نے کہا حق میں اک ٹیچر کے یوں کہنا تمہیں بھاتا نہیں
ناز سے بولے کہ وہ اسکول تک استاد تھے اب میں پی ایچ ڈی ہوں میرا اُن سے کچھ ناتا نہیں
جب پتہ مجھ کو چلا میں نے کہا "سچ ہے مگر قابل انساں اپنے گن کا راگ خود گاتا نہیں
ایم لے ہو کر بھی کوئی رہ جاتا ہے جاہل اگر کر کے پی ایچ ڈی بھی قابل کوئی بن جاتا نہیں
ہوتی ہے تعمیرِ اوّل فرد کی اسکول میں کوئی جوہر بطنِ مادر میں جلا پاتا نہیں
اُردو شعبے کا جو وہ انچارج ہو بیٹھا تو کیا کتنے لفظوں کا تلفظ بھی اُسے آتا نہیں
اپنی کم آگاہی سے اس کو نہیں ہے آگہی جھوٹ کا کرتا ہے پرچار اور شرماتا نہیں
کچھ نہ کر سکنے پہ بھی تولید کا باعث تو ہے
باپ اگر جاہل ہے تو کیا باپ کہلاتا نہیں؟

غزل

مار کھاتے کھاتے درگت ہوگئی عشق کی مجھ کو بُری لت ہوگئی
اچھی خاصی جب مرمت ہوگئی صاف تب اپنی طبیعت ہوگئی
اپنا تو ہے مشغلہ دِل پھینکنا تم کو کیوں مجھ سے محبت ہوگئی
دشمنوں کو تو گلہ تھا ہی مگر دوستوں کو بھی شکایت ہوگئی
چاہنے والا نہ جب کوئی رہا ان کو تب میری ضرورت ہوگئی
گاڑھی ان کے ساتھ جب چھننے لگی اور پتلی اپنی حالت ہوگئی
کیوں کرے جنتا، حکومت سے گلہ اب تو جنتا کی حکومت ہوگئی
آدمی ہوتا نہیں اتنا حسین ان کو جب دیکھا تو حیرت ہوگئی
رہ گئے ہم بس کلیجہ تھام کے اور وہ دل لے کے چمپت ہوگئی
سب کے سب کہنے لگے جھوٹا مجھے میری حق گوئی بھی آفت ہوگئی
دس برس میں بارہ بچے ہوگئے ایک ہی بیوی مصیبت ہوگئی
کرلیا ہنسنا شعار اپنا ظفر
زیست جب غم سے عبارت ہوگئی

مناظر عاشق ہرگانوی

سائنسدانوں کی انتھک کوشش اور تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ چمچے اسی وقت پیدا ہوئے تھے جب انسانی تہذیب کی شروعات ہوئی ہوگی۔ اس وقت چمچے کس اصلیت کے تھے ابھی اس کی تحقیق نہیں ہوسکی ہے۔ لیکن میری ذاتی تحقیق کے مطابق انسانی تہذیب کی شروعات کے کچھ ہی برسوں بعد چمچے "منہ لگے" کے نام سے مشہور تھے۔ سبھی راج دربادوں میں ان کی موجودگی کے آثار ملتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ یا راجہ تو صرف تخت پر ہی بیٹھتے تھے۔ مگر کام کاج ان ہی چمچوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے منھ سے نکلی ہوئی بات لوہے کی لکیر ہوتی تھی۔ عوام جتنے خوفزدہ بادشاہ یا راجہ سے تھے اس سے کئی گنا زیادہ خوف انھیں ان چمچوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس وقت بادشاہ یا راجہ کا منھ وہ لاؤڈ اسپیکر ہوتا جس کا کنکشن اس مائیک سے ہوتا جس پر "منھ لگے" بولا کرتے تھے۔

آزادی سے پہلے یعنی برٹش حکومت میں چمچوں نے اپنا دائرہ کار کافی بڑھایا۔ اور ٹھوک کامیابی حاصل کی باہر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے اور اندر ہی اندر انگریز حاکموں کے اشارے پر ناچتے یہ ناچ بھاکڑا ناچ ہوتا یا "جاسوس ناچ" یہ تو صرف سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے —— ملک جب آزاد ہوا تو آزادی کا سہرا اپنے سروں پر باندھ کر یہ چمچے نیتاگری کا چانس ہتھیا کر بیٹھ گئے۔ جنہیں نیتاگری نہیں ملی وہ ادھر دوڑنے لگے جدھر شہد کی چاشنی نظر آئی۔

یہ حقیقت ہے کہ چمچوں کے بغیر کوئی بھی نیتا، کوئی بھی لیڈر یا پیسے والا، کوئی بھی گیدڑ، خود کو ادھورا ادھورا محسوس کرتا ہے۔ اور اس طرح سارے ملک میں چمچوں کی قوم منتشر ہوکر اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اگر آپ بہ نظر غائر دیکھیں تو یہ چمچے قدم قدم پر دکھائی دیتے جائیں گے۔ خاص طور سے منسٹر کی کوٹھی کے باہر، سرکاری دفتروں کے باہر، بلیدروز گاروں کی بھیڑ میں کسی کیفے میں یا ریل میں یا کسی گیدڑ کی دوکان سے لے کر کروڑی مل کے شاندار ہوٹل تک چمچوں کی لمبی قطار مل جائیگی۔ البتہ انہیں شناخت کرنے کے لئے ایک خاص نظر کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ نظر کون سی ہے؟ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے۔ اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب آپ کے سامنے کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے جیسے تبادلہ کروانا ہو، [illegible] بیٹے کے داخلہ کا [illegible] یا [illegible] کی ذات کا [illegible] آپ [illegible] حل کر لیں اور آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ایک بہت ہی قدیم کتاب میں میں نے پڑھا ہے کہ ایک ہاتھی کو مگر مچھ پانی کے اندر گھسیٹ لے جا [illegible]

تھا جب ہاتھی نے خود کو بے دست و پا پایا تو خدا کو یاد کرنے لگا۔ خدا نے اس کی دردناک آہ زاری سُنی تو رحم کھا کر اسے بچالیا۔ ٹھیک اسی طرح چمچوں کو یاد کرنے سے آپ کا سارا دکھ درد دور ہوسکتا ہے۔ لیکن اس میں ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ جب تک ان چمچوں کے آگے نوٹوں کی گڈی نہ رکھی جائے ان کی کسمساہٹ نہیں جاتی۔ اور جب تک ان کی کسمساہٹ باقی ہے سمجھئے یہ مگرمچھ بنے رہیں گے۔ اور آپ کو ہاتھی سمجھتے رہیں گے۔ چمچے عام طور پر بنے بنائے مل جاتے ہیں۔ پھر بھی ان کے بنانے کی ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے دیکھئے:

مکھن (لگائیے) + محلوں کے خواب (دکھائیے) + گرم کیجئے (نوٹوں سے) = چمچہ

نوٹ: چمچوں کو تیار کرنے سے پہلے شرم، حیا جیسی نقصان دہ چیزوں کو ان سے دور رکھیئے۔

چمچے دیکھنے میں بھلے لگتے ہیں اور خود کو عوام کا خدمتگار بتلاتے ہیں۔ کوئی چمچہ جلدی پگھلتا ہے تو کوئی دیر سے، نوٹوں کی گرمی پر یہ منحصر ہے۔ یہ جیسی ہوا ہو ویسی ہی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک چمچہ دوسرے چمچے کو دیکھ کر کبھی نہیں حسد کرتا۔ چمچے آپس میں موسیرے بھائی ہوتے ہیں —— چمچے اگر کسی کا گلا بھی کاٹتے ہیں تو ہنستے ہنستے، جس سے تکلیف نہیں ہوتی —— چمچوں کی ایک مختصر ڈکشنری سے آپ چمچے کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

چمچہ: چمڑے کو چاروں طرف سے گھیرے رکھنے والا شخص، چاپلوس اور منھ لگا۔

چمچو: جس کی آنکھیں نئے نئے چمچوں کی تلاش میں ہوں۔

چمچاگر: ریٹائرڈ چمچہ، جو اب سپلائی کا کام کرتا ہے۔

چمچہ گری: مکھن لگانے کا فن جاننے والا شخص۔

چمچہ تُر: چاپلوسوں کی تعداد بڑھانے والا شخص

چمچارتھی: چمچہ بننے کا امیدوار، جس کی درخواست زیر غور ہو۔

چمچہ رس: چمچے کے منہ سے ہر وقت ٹپکنے والی تعریفی رال۔

چمچہ لت: جسے چمچہ رکھنے کی لت پڑ جائے، یا جو چمچے دوسروں کے ساتھ لت پت ہو جاتے ہیں۔

چمچہ لیت: اپنی رائے پہ دوسروں کو چلانے والا شخص۔

چمچہ چار: کسی کا چمچہ بننے سے پہلے سیکھا جانے والا طور طریقہ۔

چمچلو: موقع بے موقع بغیر سوچے سمجھے الوؤں کی طرح آنکھیں بند کر کے تعریف کے پل باندھنے والا۔

چمچی: (الف) چاپلوس عورت (ب) چمچوں کی گھروالی (ج) گھر میں شوہر کے ذریعہ بیوی کو دیا جانے والا پیار بھرا خطاب۔

چمچیلی: چمچوں کا جال

چمچہ بچ: بے وقوف چمچہ

چمچہ پوش: ہر فائدے کی بات کو پوشیدہ رکھنے کا گُر جاننے والا شخص۔

چمچہ نوش: جو بلا نوش ہرگز نہ ہو۔

غرض چمچے کی تعریف کرنا چراغ کو بلکہ موم بتی کو جاپ دکھانے کے مترادف ہے۔ تعریف اس کی کی جاتی ہے جس کی کوئی تعریف نہ ہو۔

جوہرؔ میوانی

مری تلاش میں ہے

کسی وزیر کا چمچہ

نہ چارہ گر، نہ مسیحا مری تلاش میں ہے — اُدھار کھایا تھا، بنیا مری تلاش میں ہے
چڑھایا جائے گا سُولی پہ میرا دل شاید — کسی کی زُلف کا پھندا مری تلاش میں ہے
کھڑے کھڑے ذرا رادھا سے بات کیا کرلی — بصد جلال کنہیا، مری تلاش میں ہے
چناؤ پھر کوئی ہونے کو ہے یہاں شاید — میرے محلّے کا دادا مری تلاش میں ہے
مجھے بتائے وہ مطلب کا دیکھیے نہ کہیں — کسی وزیر کا چمچہ مری تلاش میں ہے
لیا تھا قرض مرے دوست نے، گواہ تھا میں — مگر وہ کابلی والا مری تلاش میں ہے
محلّے والے کی مرغی تو شیخ نے ماری — مگر وہ عقل کا اندھا مری تلاش میں ہے

تلاش کرتے تھے پہلے چچا بھتیجے کو
آج میرا بھتیجا مری تلاش میں ہے

صاف چوری کا مال ہے پیارے

نشہ بندی کا سال ہے پیارے — اب تو ٹھرّے کا کال ہے پیارے
کیا اتارا ہے میر کا چربہ — تو بڑا باکمال ہے پیارے
واہ کیا دھوبیا ترنّم ہے — کوئی سُر ہے نہ تال ہے پیارے
اس زمانے میں شاعری کے سوا — ساری چیزوں کا کال ہے پیارے
چال بازی تیری معاذ اللہ — جیسے مکڑی کا جال ہے پیارے
کھچڑی سرکار کا کرشمہ ہے — جوتیوں میں جو دال ہے پیارے
ہر مرض کی دوا ہے "آبِ حیات" — جسم خود ہسپتال ہے پیارے
لڑکے کیوں کر بنیں نہ اب ہپّی — نائیوں کا اکال ہے پیارے
دل پہ مارا ہے جس نے شب خوں وہ — ایک کافر جمال ہے پیارے

شیخ کھائیں گے، کیا غرض اُن کو
کیا حرام و حلال ہے پیارے

جیسے سرکس کا سکھایا ہوا بھالو نکلے

جب چلے بات تو ہر بات پہ جھاڑو نکلے — ایسے ماحول میں کیا، صلح کا پہلو نکلے
رات کے دھوکے میں لوگوں نے جلالیں شمعیں — جب وہ بکھرائے ہوئے دوش پہ گیسو نکلے
خوں کی پیاسی تو نہیں دوستو، تہذیبِ جدید — جابجا آج ہر اک بات پہ چاقو نکلے
جن کا بدھو تھا لقب، پہلے الیکشن کے وہی — جیت کر آئے تو اک نمبری چالو نکلے
ووٹ لینے کے لئے گربۂ مسکیں تھے مگر — بیٹھے گدی پہ تو چنگیز و ہلاکو نکلے
وص، سے شکل لکھی وش، سے صورت لکھ دی — جب سند دیکھی گئی ماہرِ اُردو نکلے
ہم نے مانا کہ ولیمہ کی یہ دعوت ہے مگر — کھائیں کیا، گوشت کے ڈونگے میں جو آلو نکلے

برقی قوت کی پیداوار میں اضافہ

آندھرا پردیش برقی قوت کی پیداوار کے ہمہ گیر اہمیت والے شعبے میں اپنی قابل رشک سبقت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے وزیر اعظم کے ہاتھوں نومبر ۱۹۷۸ء میں ۲۱۰۰ میگا واٹ کی تخمینی صلاحیت رکھنے والے راما گنڈم سوپر تھرمل پاور اسٹیشن کے سنگ بنیاد کی تنصیب ایک سنگ میل کے مماثل ہے۔

آندھرا پردیش میں برقی کی تنصیبی صلاحیت سال ۷۹-۱۹۷۸ کے آغاز کے وقت ۱۵۶۳ میگا واٹ سے زیادہ ہوگئی اور توقع ہے کہ ۱۹۷۹ء کے وسط تک مزید بڑھ کر ۱۸۸۸ میگا واٹ ہو جائیگی۔

"رورل الکٹریفکیشن کارپوریشن" دیہاتوں کو برقیانے کے معاملے میں اپنی امدادی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کارپوریشن نے اب تک آندھرا پردیش میں ۲۱۳ اسکیمات منظور کی ہیں جن کے لئے ۷۰،۸۳ کروڑ روپے قرضہ جاتی امداد فراہم کی گئی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش، حیدرآباد

D.G. I. & P.R 451
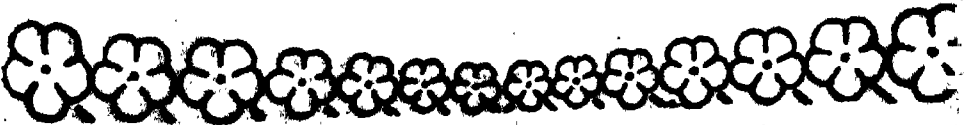
دنیش بھارتی

ترجمہ، کالیکا پرشاد

عاشقی کے فارمولے

سوشیالوجی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ہی ہمارا عالم بی۔ اے نظر آنے لگا تھا۔ نوکری کرنا خلافِ شان معلوم ہوا۔ بزنس کو پناہ گزینوں کی علامت سمجھا۔ افسانہ نگار یا صحافی بننا بھی کوئی پیدا ہونے کا مقصد ہے؟ غرض یہ کہ زندگی کی ہر چیز' سنڈگی کا سب سے "گھٹیا مال' نظر آنے لگی ـــــ گھر والے نوکری کروانے پر بہ ضد تھے۔ اور ہم تھے کہ اپنے اس جنم میں کوئی کارنامہ انجام دینا چاہتے تھے۔ بہت غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کیوں نہ زندگی کو 'افسوں' کارخانوں میں سڑانے کے بجائے اُسے ایک رومانٹک موڑ دیا جائے۔ اور کسی سے رومانس کیا جائے۔

فلمیں دیکھنے کا شوق عہدِ طفلی سے تھا۔ بچپن کا یہی شوق آج جوانی کا مقصد بن گیا تھا۔ دھڑا دھڑ شہر کے سارے کے سارے تھیٹروں کے پتے دیکھے۔ اور "ہنٹر والی" سے لے کر "شالیمار" تک ساری فلمیں دیکھ کر ان کے رومانی مناظر کا بغور مطالعہ کیا۔ عاشقی کے عملی حصہ کو مزید سائنٹفک بنانے کی غرض سے "قصہ توتا، مینا" آٹھ جلدوں سے لے کر الف لیلیٰ کی ساری وارداتوں کو پڑھ گیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ عاشقی کا نظری حصہ مکمل ہو چکا ہے ـــــ اب عاشقی کے پریکٹیکل کے لئے ایک عدد لڑکی کی ضرورت تھی۔ لڑکی چاہے جیسی ہو" تلاش جاری کی۔ تو ایک دوشیزہ نظر آگئی۔ جیا بھادری جیسی لگتی تھی۔ مگر تھی ذرا کالی۔ خیر ہمیں اُس کے رنگ یا قد سے کیا سروکار۔ بیالوجی کے طلباء پریکٹیکل میں چیر پھاڑ کرتے وقت مینڈک یا جھینگر کی خوب صورتی تھوڑے ہی دیکھتے ہیں۔

"چھوٹی سی بات" کا امول پالیکر' ودیا سنہا کو آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ ہم نے کالج آتے جاتے اُسے دیکھنا شروع کیا۔ لیکن ہماری تین چار دنوں کی محنت کام نہ آئی کیونکہ وہ لڑکی نظر آنا بند ہوگئی۔ ہم ذرا حیران ہوئے۔ پھر سوچا شاید بیمار ہو یا نانی کے گھر گئی ہو۔ لیکن بعد میں پتہ چلا اُس نے کالج آنے جانے کا اپنا راستہ ہی بدل دیا تھا۔

ہم نے سوچا فارمولا زوردار تو نہ تھا۔ اس مرتبہ "کرم" کے راجیش کھنہ کی طرح ودیا سنہا کی گری کتابیں اُٹھا کر دینے کا اور کریڈٹ حاصل کرنے کا فارمولا یاد آیا۔ ہم نے کسی طرح ماں باپ سے لڑ بھڑ کر کالج جوائن کرنے کے لئے پھر سے انہیں رضامند کر لیا۔ ہم نے پتہ لگایا کس مضمون میں سب سے زیادہ لڑکیاں ہیں۔ اردو کی کلاس میں سب سے زیادہ لڑکیاں نظر آئیں تو ہم ہو گئے ایم۔ اے اردو کے سال اول کے طالب علم۔

پھر تو کیا ـــــ ہم دوستوں کی باتیں بھی نہیں سنتے تھے ـــــ ہم تو بس اس چکر میں تھے کہ جب کوئی

لڑکی کتابیں لیتے چکرا کر گرے اور ہم لپک کر اُس کی کتابیں اُٹھانے میں اُس کی مدد کریں۔ •

لیکن تین ماہ تک کوئی لڑکی مع کتابوں کے نہیں گری البتہ چوتھے مہینے ہم ضرور لائبریری کی سیڑھیوں کی "نذر" ہوگئے۔ اور پورے دو ہفتے کالج آنے جانے سے مجبور ہوگئے۔

کہتے ہیں صبر بہت بڑی چیز ہے۔ چھٹے مہینے کی دوپہر ہم دل مسوس کر کالج کے باہر آ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے" دھڑاک " کی آواز آئی ـــــ ہم نے دیکھا تیز قدموں سے آ رہی ایک لڑکی اپنی ساری میں جا پھنسی ہے۔ کتابیں اِدھر اور لڑکی اُدھر۔ بس یہ دیکھتے ہی ہم مدد کے لئے کسی اور کے پہنچنے سے پہلے ہی جا پہنچے۔ موچ آگئی تھی۔ اُس کے منع کرنے کے باوجود بھی ہم نے اپنی سائیکل رکشہ کے پیچھے لگا دی۔ اُس وقت ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جب اُس نے دروازہ سے ہی ہیرے لوٹنے سے پہلے" چائے پی کر جانے" کا اصرار کیا۔ تو ہماری کیا مجال تھی جو نہیں " کہتے ـــــ لیکن اندر جانے کے بعد ہماری ساری خوشی' جوش ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا ـــــ سامنے کھڑے نوجوان سے اُس نے تعارف کروایا ـــــ "یہ میرے شوہر ہیں"ـــــ اُس کے بعد اُس نے کیا کہا ہم نے نہیں سنا۔ کچھ دیر کے لئے تو ہم کسی ایکسیڈنٹ سے اپنا حافظہ کھوئے ہوئے مریض کی" میں کہاں ہوں " والی پوزیشن میں آ گئے تھے۔

خیر وہاں سے گھر لوٹے تو پھر گھر سے کالج کبھی نہیں گئے۔ زخم گہرا تھا۔ لیکن اُسے یہ سوچ کر سہلایا کہ عشق کا یہ فارمولا ہی موزوں نہ تھا۔ لہذا برداشت کر گئے۔

زخم ذرا ٹھیک ہوا تو ٹھیک مثل والے کیس کی ایک " آہو چشم " کو پڑھانے کے بہانے فلم" پریم پتر" کے بے مدکایا فارمولے کے تحت اُسے اپنا نے بے حد جذباتی لولیٹر لکھ دیا۔ تو اُس کرم جلی نے اُسے اپنی انتی لوگرام کی ممی کو دے ڈالا۔ اور اس دن کے بعد سے ہمارے وہاں جانے پر تالا لگ گیا۔

لیکن ہم" مرض بڑھتا ہی گیا جوں جوں دوا کی" کے اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ سوال ہماری ناکامی کا نہیں زندگی کے مقصد کا تھا۔ ویسے ہماری کوششوں کو نامراد دسواں مہینہ لگ چکا تھا۔

کچھ دنوں کی باقاعدہ ماتم پرسی کے بعد ہماری نظر سامنے مجھے پر رہنے والی شلوار کرتے والی پر پڑی۔ اُس کی جھیل سی آنکھوں کو دیکھتے ہی اُن میں شرٹ اُتار کر چھلانگ لگانے کے لئے طبیعت مچلنے لگی۔

ہم نے خط لکھنے میں تحریری خطرہ سمجھا۔ پچھلا تجربہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے " اور دل" خطرہ کا رسک لے کر اُسے ایک آنکھ ماردی۔ پھر کیا تھا۔ پنجاب دی کڑی دہیں سے بڑی کڑک آواز میں چیخی ـــــ " ادمی وہ سامنے والا مُنڈا مینوں اکھاں مارداے" میرے تو ہوش کبوتر ہوگئے۔ اُس کا باپ بڑا ظالم تھا۔ محلے کے چار پانچ مجنوؤں کی قبریں اپنے دروازے پر ہی بنا چکا تھا۔ لہذا اپنے فارمولے کی ناکامی پر افسوس کرنے کا وقت نہ تھا۔ لہذا ہم گھر پر اطلاع دئے بغیر بھاگ گئے۔ اور تک بھگ دو ہفتے روپوش رہنے کے بعد اور مکمل طور پر مطمئن ہو کر اُس وقت گھر واپس آئے جب اخبار میں اپنی تصویر کے ساتھ چچا جی کا یہ خطروں والا اعلان پڑھا۔

" بیٹا دینش جہاں کہیں بھی ہو گھر چلے آؤ۔ ہم لوگ تمہارے اچانک چلے جانے سے بہت فکرمند ہیں "

غزل

اشرف۔ نوی لکھنؤ

(حضرت انور مرزا پوری سے معذرت کے ساتھ ———)

اے مرے ہمنشیں چل کہیں اور چل اس گرانی میں اپنا گذارا نہیں
عاشقی چھوڑ دی مے کشی چھوڑ دی دال روٹی کا بھی اب سہارا نہیں

آجکل دلبروں کی یہ ہے کیفیت گلبدن دل نشیں ماہ پارا نہیں
پھر بھی ان کے دماغ عرش اعلیٰ پہ ہیں وہ سمجھتی ہیں ثانی ہمارا نہیں

ڈھول اپنے گلے میں کوئی باندھ لوں میری فطرت کو ہرگز گوارا نہیں
چار دن کا سہارا بنو تو بنو عمر بھر کا سہارا سہارا نہیں

پہلے فیشن کو کہتا تھا میں بھی بُرا آج قائل مگر مجھ کو ہونا پڑا
روز بازار جا کر یہ مجھ پہ کھلا بیل باٹم سے سستا غرارا نہیں

ان سے پیچھا چھٹے کیسے اشرفؔ مرا یہ بتا دے کوئی آج مجھ کو جتن
اس طرف جان دینے کو تیار ہوں اس طرف سے ابھی تک اشارا نہیں

قہقہے

درد، غم، بیقراری ادھر — چین، آرام، تسکین اُدھر
ان کی چھت پر پڑی جب نظر — رہ گیا دل کوئی تھام کر
روری، جوتشی، ڈاکٹر — کہہ رہے ہیں سبھی صبر کر
خاک ہوتی دوا کارگر — چارہ سو بیس تھا ڈاکٹر
یوں تو کرتے ہیں وعدے بہت — آ تو جائیں کبھی بھول کر
شوخیاں، مستیاں، دھمکیاں — کیسے لائیں انھیں راہ پر
میکے وائف سدھاری ہے کیا — بھوت بنگلے میں بدلا ہے گھر
لب کھلے تھے کہ کہنے لگے — مختصر، مختصر، مختصر
نبض چلتی ہوئی رُک گئی — تیرے آتے ہی اے چارہ گر

باوفا، باہنر، باصفت
صرف نرگسؔ ہے ایسا بشر

نرگس سہسوانی

یوری کولا

حضرتِ ناصح کی، دُنیا میں غنیمت ذات ہے
مصلحت آمیز و دل کش اُن کی ہر اک بات ہے
کوکا کولا کا جو ذکر آیا تو فرمانے لگے
"یوری کولا" پیجئے! یہ اک نئی دریافت ہے
ہے جو غیرت تو بدیشی شئے نہ ہرگز لیجئے
اپنی مصنوعات پہ ہی اب بھروسا کیجئے
کوکا کولا کی درآمد بند ہے تو کیا ہوا
اس سے بہتر اور ارزاں "یوری کولا" پیجئے

'یوری کولا' نام ہے اس مال کا
اک نیا تحفہ ہے یہ اس سال کا
میکشو! تاڑی پر انڈی چھوڑ دو
یہ بدل ہے آتشِ سیّال کا

فرحت قادری (گیا، بہار)

بچوں کا بین الاقوامی سال

سال ۱۹۷۹ء "بچوں کا بین الاقوامی سال" کی حیثیت سے منایا جا رہا ہے۔ آندھرا پردیش میں اس سال کے دوران میں بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق جاریہ اسکیمات کی عمل آوری میں زیادہ شدت پیدا کی جائیگی اور ساتھ ہی ساتھ نئی اسکیمات بھی آغاز کی جائیں گی۔

بچوں کی ترقیاتی خدمات سے متعلق مشترکہ اسکیم اضلاع عادل آباد اور اننت پور کے دو بلاکوں میں زیر عمل آوری ہے۔ اس اسکیم کے تحت مشترکہ طور پر ایسی خدمات فراہم کی گئی ہیں جو غذا۔ صحت۔ تعلیم اور تفریحات سے متعلق سہولتوں پر مشتمل ہیں۔

سال ۷۸۔۷۹ کے دوران میں اضلاع مشرقی گوداوری۔ ورنگل۔ کرشنا اور کرنول کے چار مزید بلاکوں میں اس اسکیم کا آغاز کیا گیا ہے۔ بچوں کے بین الاقوامی سال میں اضلاع وساکھاپٹنم۔ چتور اور میدک کے مزید تین بلاکوں میں اسکیم کی عمل آوری شروع کی جائے گی۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش (حیدرآباد-۱)

D.G. I. & P.R. 43

تمنا مظفرپوری

نظیر صدیقی ... بحیثیت انشائیہ نگار

تقاضا ادبی ڈائجسٹ الہ آباد کے ۱۹۶۱ء کے کسی شمارہ سے میں نظیر صدیقی کا ایک انشائیہ "شہرت کی خاطر" پڑھا تھا اور بے اختیار میرے منھ سے بہت خوب " نکل گیا تھا۔ اس کے بعد ان کے کئی انشائیے پڑھنے کو ملے پھر ان کے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" کا چرچہ چلا لیکن تلاش کے باوجود وہ کتاب مجھے نہ مل سکی۔ بلکہ اس کی جگہ پر نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تاثرات و تعصبات" ۱۹۶۳ء میں مجھے ملا۔ تاثرات و تعصبات میں ان کا ایک مضمون "کچھ اپنی صفائی میں" ہے۔ یہ مضمون شہرت کی خاطر پر مختلف رسائل میں کئے گئے تبصرے کے جواب میں ہے۔ "کچھ اپنی صفائی میں" انشائیہ کی جامع تعریف بھی مل جاتی ہے۔ یوں تو انشائیہ پر بہت سے مضامین ہیں لیکن جس تفصیل سے نظیر صدیقی نے اس مضمون میں انشائیہ کے متعلق لکھا ہے۔ اس کی وجہ سے انشائیہ کیا ہے؟ سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔ انشائیہ کی تعریف میں نظیر صدیقی اپنا خیال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں۔ اور با معنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ ہوتا ہے۔ اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جاتی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کے نام بھی۔ یہ وہ صنف ادب ہے۔ جس میں لکھنے والا نہ صرف دوستوں کی کمزوریوں پر ہنستا ہے بلکہ اپنی کمزوریوں پر دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں تفریح و تنقید ایک دوسرے سے بغلگیر نظر آتی ہیں۔ اور بصیرت و ظرافت ایک دوسرے کی سگی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان اور نفس مضمون میں وہی نسبت ہوتی ہے جو کھونٹی اور لباس میں ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں اسلوب کا دلنشین ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خیالات کا دلچسپ ہونا۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں حماقت کی باتیں کرنے کی اجازت ہے لیکن حماقت کی باتوں پر اکتفا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں۔"

"شہرت کی خاطر" میں اٹھارہ مضامین ہیں۔ جن میں پہلا مضمون 'صنف انشائیہ' پر ہے۔ آٹھواں مضمون آپ سے ملئے، طنزیہ خاکہ کی شکل میں ہے۔ اور چودھواں مضمون شہر سخن ہائے گفتنی جاوید "ایک سفرنامہ ہے" یہ سفرنامہ بھی بڑا دلچسپ ہے کیونکہ اس میں صرف ادیبوں سے ملاقات کا ذکر اور ادبی گفتگو ہیں۔ بقیہ مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے متعلق نظیر کا مطالعہ بڑا عمیق ہے۔ ان کا مشاہدہ اور تجربہ پختہ ہے۔ اور وہ صرف جانتے ہی نہیں بہت سے بیچ ایسے ہیں ... [illegible] ... لکھتے وقت زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رہتی ہے۔

کہیں بھی وہ طنز کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اپنے تنقیدی مجموعہ تاثرات و تعصبات کے مضمون کچھ اپنی صفائی میں" ایک جگہ لکھتے ہیں: "میرے انشائیوں میں شاید یہ انکشاف ذات سے بھی زیادہ نمایاں عنصر تنقید کا ہے۔ جس نے کہیں طنز کی شکل اختیار کرلی ہے۔ کہیں مزاح کی۔ جو کہیں آپ پر کی گئی ہے۔ کہیں دوسروں پر۔

اس سلسلہ میں ان کا مضمون "نظیر صدیقی مرحوم" ایک بہترین مثال ہے۔ یہ ان کا ذاتی مضمون ہے۔ لیکن اسمیں کونسی بات ایسی نہیں جو سماج اور ماحول پر طنز نہیں اور قاری یہ نہیں محسوس کرتا کہ یہ تو میری باتیں ہیں۔

انسانی زندگی میں اخلاق کا سب سے بڑا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اخلاقیات پر زور دیتے ہیں۔ "نظیر صدیقی مرحوم" میں لکھتے ہیں: " مرحوم کو اس خبر سے کبھی خوشی نہیں ہوئی کہ شہر میں نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے وہ ہمیشہ اس خبر کے منتظر رہے کہ شہر میں چوروں اور رشوت خوروں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ نظیر مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلمان قوم پر ایسے اچھے ریمارکس دیتے ہیں کہ ہر ایماندار مسلمان اسے ماننے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ "بیٹھے بٹھائے" میں لکھتے ہیں: "مسلمان وہ قوم ہے جو داڑھی کو نماز پر یا دوسرے لفظوں میں سنت کو فرض پر ترجیح دیتی ہے۔ نظیر صدیقی اپنے اصول کے پکے اور اخلاق کے بڑے سے پابند ہیں۔ اخلاق کے سلسلہ میں زندگی کے تمام خام پہلوؤں پر ان کی نظر رہتی ہے۔ مضمون "کچھ اپنی صفائی میں" پڑھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ لوگوں نے نظیر کے انشائیے کو انشائیہ کیوں نہ سمجھا؟

"شہرت کی خاطر کے مطالعہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کے انشائیوں پر اعتراضات! اعتراضات برائے اعتراضات ہیں ورنہ صنف انشائیہ یا فن انشائیہ نگاری کی روشنی میں ان مضامین کا مطالعہ کیا جائے تو نظیر صدیقی ایک اچھے اور کامیاب انشائیہ نگار ہیں۔ اپنے انشائیے میں وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں صاف اور جرأت کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیان پیارا اور چلبلا اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ یہ اسلوب ان کا خاص ہے۔ بالکل منفرد! جملے پڑھئے اور پہچان لیجئے۔ مثلاً: "کہا جاتا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا المیہ موت ہے۔ لیکن مرحوم کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ خود ان کی زندگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی بھر زندگی کا رونا روتے رہے۔" (نظیر صدیقی مرحوم) "کسی سواری پر شہر کی شاہراہوں سے گزرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم شاہراہوں سے نہیں بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزر رہے ہیں۔" (جہاں میں رہتا ہوں) "بہت سی نعمتیں ایسی ہیں جن کے بغیر زندگی گزار لینا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن کچھ نعمتیں ایسی ہیں جن کے بغیر زندگی بسر کرنا یکسر محال ہے۔ دوستوں کا وجود ان ہی نعمتوں میں سے ہے۔" (دولت اور دوستی) —— کس قدر چست جملہ ہے۔ نظیر نے جو کچھ لکھا وہ آئینے کی طرح ہے سامنے رکھئے اور چہرہ دیکھ لیجئے:

انشائیہ کی تعریفات کی روشنی میں بھی دیکھنے پر نظیر نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آزاد اور خود مختار ہیں۔ وہ مضامین میں بہکتے ہیں۔ نہ موضوع اور عنوان کی مرکزیت برقرار رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اسے آزادانہ کہتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں کیف و اثر ہے۔ اور جو کچھ کہتے ہیں وہ دل کو چھوتا ہے۔ اور جملہ طنز سے بھرپور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس لیجئے: "میری زندگی کا مدار اب دو ہی چیزوں پر رہ گیا ہے۔ دنیوی زندگی کا مدار بخشش اور اُخروی زندگی کا مدار بخشش پر۔ تم مجھے شاہی بخش دو خدا میرے گناہ بخش دے گا۔" (نظیر صدیقی مرحوم)

ہر مضمون کے ہر صفحے میں ایک پتے کی بات ہوتی ہے ایک چست اور شگفتہ جملہ ہوتا ہے مگر میرا مقصد ان اقتباسات پیش کرنے کا یہ ہے کہ نظیر صدیقی انشائیہ نگار ہیں اور ان کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" انشائیوں کا مجموعہ ہے۔

نظیر صدیقی، پاکستان

شادی

شادی انسان کی ان شامتوں میں سے ہے جن سے بچنا محال اور نہ بچنا مہلک ہے۔ یہ بات شوہر کے نقطۂ نظر سے بھی اتنی ہی درست ہے جتنی بیوی کے نقطۂ نظر سے۔ یہ احساس صرف شوہروں کا حصہ نہیں کہ ایک ایک عدد بیوی ان کے گلے آپڑی ہے۔ بلکہ بیویاں بھی اسے اپنی شامت اعمال سمجھتی ہیں کہ ایک ایک عدد شوہر ان کے سر منڈھ دیا گیا ہے۔ جو اپنی نظر میں خلاصۂ کائنات ہی کیوں نہ ہو لیکن، بیوی کی نگاہ میں گھر کے سب سے ناقص اور نکمے فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہر بیوی کو دوسروں کے شوہر ذہین اور ہر شوہر کو دوسروں کی بیویاں حسین معلوم ہوتی ہیں۔

جب سے میں نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا ہے کہ میں شادی اس وقت کروں گا جب نہ صرف میری بلکہ ملک بھر کی عام اقتصادی حالت درست ہو جائے گی۔ میرے احباب اور اعزہ سخت تردد اور پریشانی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن و فکر کی تمام قوتیں اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ میں اپنے اس قومی مگر غیر انسانی ارادے سے باز آجاؤں وہ مجھے شادی کی ترغیب دینے کے لئے ہر قسم کی منطق سے کام لیتے رہے ہیں اور شادی کے ایسے ایسے فوائد بیان کرتے رہے ہیں جو اب تک خود ان کے تجربے میں نہیں آئے اور نہ آئندہ آئیں گے۔ جب سے انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں شادی کے فوائد سے متاثر نہیں ہوتا۔ انہوں نے مجھے ان نقصانات کا احساس دلانے کی کوشش شروع کر دی ہے جو شادی نہ کرنے کی وجہ سے مجھے پہنچ رہے ہیں۔ مثلاً میں اکثر تنہائی اور بے کیفی کا رونا روتا رہتا ہوں۔ اب جب کبھی میری زبان سے تنہائی اور بے کیفی کی شکایت نکلتی ہے، احباب اور اقربا کہنے لگتے ہیں دیکھو ہم اسی لئے کہتے ہیں کہ شادی کر لو۔ شادی کا کم از کم اتنا تو فائدہ ہے کہ آدمی تنہائی اور بے کیفی محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اس کا نتیجہ بچوں کی پیدائش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور میں شوہر بننے سے اتنا نہیں گھبراتا جتنا باپ بننے سے۔

جہاں تک اولاد کا تعلق ہے وہ بہر حال ایک مصیبت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اولاد کثرت سے پیدا ہو جب بھی اور اگر بالکل نہ پیدا ہو جب بھی۔ اولاد کثرت سے پیدا ہو تو آدمی کی اقتصادی حیثیت پر ضرب پڑتی ہے اور

اگر بالکل نہ پیدا ہو تو ہر دو فریق کی آبرو خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ناکام شوہر کہلائے جانے سے نامراد عاشق کہلوانا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

شادی کے معاملے میں نوجوانوں اور بوڑھوں کا نقطۂ نظر ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہا ہے۔ نوجوان ہمیشہ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ شادی اس سے کرنی چاہیئے جس سے محبت ہو چکی ہو اور بوڑھے ہمیشہ اس پر اصرار کرتے آئے ہیں کہ محبت اس سے کرنی چاہیئے جس سے شادی ہو چکی ہو۔ نوجوانوں کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ محبت محبوبہ سے ہونی چاہیئے۔ خواہ محبوبہ جیسی بھی ہو۔ بوڑھوں کا پیمانِ عمل یہ رہا ہے کہ محبت منکوحہ سے ہونی چاہیئے۔ خواہ منکوحہ جیسی بھی ہو۔ ان دونوں کے انداز نظر میں فرق صرف اتنا ہے کہ بوڑھے شادی کو فرض کا درجہ دیتے ہیں نوجوان اسے فرض تصور کرتے ہیں۔

شادی کو فن کی حیثیت سے برتنے کی صورت یہی ہے کہ پہلے محبت کی جائے اس کے بعد شادی یعنی محبت کے راستے سے شادی کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اس معاملے میں نوجوانوں سے جو عام غلطی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ نہ محبت کرتے وقت کچھ سوچتے ہیں اور نہ شادی کرتے وقت۔ لیکن بعد میں پچھتاتے دونوں ہیں۔ محبت پر اس لئے کہ غلط قسم کی لڑکی کو محبوبہ بنا لیا۔ اور شادی پر اس لئے کہ غلط قسم کی محبوبہ کو منکوحہ میں تبدیل کر لیا۔ نوجوانوں کا پہلا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ جو لڑکی بھی سامنے آئے اس سے محبت کر لو۔ اور دوسرا یہ کہ جو لڑکی بھی محبت کرنے پر آمادہ ہو اس سے شادی کر لو۔ اس جلد بازی میں نہ محبوبہ اچھی ملتی ہے نہ بیوی۔ شادی کو فن کی حیثیت سے برتنے میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خوب سے خوب تر محبوبہ یا بیوی کی تلاش میں آدمی نہ محبت کرسکے نہ شادی۔ بقول میر ؎

اب کچھ کر کے چوریاں کہ بہت یاد رہو۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس مصرع کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر زمانے کے لئے شادی نہ بن سکو تو عبرت ہی سہی۔

نوجوان شادی کو فن تصور کرتے ہیں حق بجانب ہوں یا نہیں لیکن بوڑھے لوگ شادی کو فرض تصور کرنے میں ہرگز حق بجانب نظر نہیں آتے خصوصاً اس لئے کہ وہ شادی کو نوجوانوں کا فرض کم اور اپنا فرض زیادہ سمجھتے ہیں۔ اسی بناء پر قدیم زمانے سے ہمارے یہاں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ شادی کے معاملے میں والدین نہ لڑکے سے کچھ مشورہ کرتے ہیں۔ نہ لڑکی سے اور جب جی چاہا، جہاں جی چاہا۔ جس سے جی چاہا، لڑکے یا لڑکی کی شادی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو لیتے ہیں۔ موجودہ صدی میں خصوصاً پچیس تیس سال سے نوجوان، بوڑھوں کے اس رویئے کے خلاف احتجاج بھی کرتے رہے ہیں اور بغاوت بھی۔ احتجاج کے لئے وہ اپنی محبوبہ یا منظورِ نظر کے نام اس قسم کے شعر کہتے رہے ہیں کہ ؎

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو   ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اگر اس قسم کے احتجاج سے کام نہیں چلتا تو بغاوت کے طور پر سیول میرج کر لیتے ہیں۔ اس احتجاج اور بغاوت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک طرف والدین کی نظر میں ترقی پسند شاعری اور مغربی تمدن دونوں رسوا ہوتے ہیں، دوسری طرف بوڑھوں اور نوجوانوں کے درمیان سیول میرج کی بدولت سیول وارشروع ہو گئی ہے۔

شادی کے ساتھ خانہ آبادی کے الفاظ روایتی طور پر استعمال ہوتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اس بات کی تحقیق آج تک نہ ہوئی

کہ شادی سے گھر واقعی آباد ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ اگر گھر کے افراد میں اضافہ کے معنی خانہ آبادی کے ہیں تو یقیناً شادی سے گھر آباد ہوتا ہے۔ لیکن مشاہدہ بتاتا ہے کہ گھر کے افراد کی تعداد جتنی بڑھتی جاتی ہے افراد کی سہولتیں اور مسرتیں اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ گھر کی بڑھتی ہوئی آبادی ہی گھر کی بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ اب تو ماہرین عمرانیات کا خیال ہے کہ دنیا کو جتنا خطرہ سائنس کی ترقی سے نہیں، اتنا آبادی کی ترقی سے ہے۔ اس پیشین گوئی نے شادی شدہ لوگوں کو عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ یعنی انسانیت کے بہی خواہوں کی طرف سے ان کے نام یہ اپیل اور حکومتوں کی طرف سے یہ آئین شائع ہونے لگا ہے کہ شادی کے باوجود بچے نہ پیدا کرو یا ایک دو بچوں پر اکتفا کرو۔

بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ محبت ہر ایک سے کی جاسکتی ہے سوائے بیوی کے یعنی بیوی سب کچھ ہو سکتی ہے بجز محبوبہ کے۔ مگر اس خیال میں ہر فلسفیانہ خیال کی طرح فلسفہ کا عنصر زیادہ اور تجربہ کا عنصر کم ہے۔ انسانی تجربات اور جرائم سے متعلق اخباروں کے صفحات شاہد ہیں کہ بیوی محبوبہ بھی بن سکتی ہے۔ اگر اپنے شوہر کی نہیں تو دوسروں کی سہی۔ جب کبھی کوئی بیوی کسی اور کی محبوبہ بن جاتی ہے تو اس کا شوہر اس واقعے یا حادثے کو خاندان کی ناک کٹ جانے سے تعبیر کرتا ہے۔ اور خاندان کی کٹی ہوئی ناک کی تلافی کے لئے اپنی بیوی کے عاشق کی گردن کاٹ ڈالتا ہے۔ جب تک خاندان کی ناک انسان کی گردن سے زیادہ اہم سمجھی جائے گی، اس قسم کے حادثے ہوتے رہیں گے۔ اس قسم کے حادثات کو روکنے کی واحد صورت یہ ہے کہ خاندانی عزو وقار کے تصور میں ترمیم کی جائے یعنی یہ بات سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ محبت ایک جذبۂ بے اختیار ہے۔ اس بناء پر اگر ایک شوہر کو کسی کی بیوی سے یا ایک بیوی کو کسی کے شوہر سے محبت ہو جائے تو اس جذباتی مجبوری کو خاندانی عزو وقار کے منافی تصور نہ کیا جائے۔ ایسی صورت میں دونوں (عاشق اور محبوبہ) کو مجبور سمجھ کر معاف کر دینا چاہیئے۔ بلکہ دونوں کو از سرِ نو شادی کر کے دونوں کی مسرت میں اضافہ کرنا چاہیئے۔

شادی کا ادارہ انسان اور انسانی معاشرے کے بہت سے مسائل کو حل کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا معلوم نہیں اس نے وہ مسائل حل کئے یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نے بہت سے مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ اس لئے بعض لوگ اس ادارے کو ناقص اور نقصان دہ قرار دے کر اس کو یک قلم ختم کر دینے کے حامی بن گئے ہیں۔ ذاتی طور پر مجرد رہنے کے باوجود میں ایسے لوگوں کا مخالف رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنے مسائل میں بُرے حل اور بدتر حل کے درمیان انتخاب کرنا پڑا ہے۔ شادی کے معاملے میں بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بد کو بدتر پر ترجیح دی جائے۔ یعنی یہ مان لیا جائے کہ شادی کی رسم یا شادی کا ادارہ ہزار بُرا سہی لیکن اس کا نہ ہونا اور بُرا ثابت ہوگا۔

کسی کا شعر ہے ؎ وہی کٹی ہوئی نیندیں وہی فسردہ دلی ؛ میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لُٹا کے کیا پایا

ممکن ہے محبت کرکے بھی یہی دو چیزیں ہاتھ آتی ہوں۔ شادی کرکے بھی دو ہی چیزیں ہاتھ آتی ہیں۔ لیکن وہ کٹی ہوئی نیندوں اور فسردہ دلی سے مختلف اور بہتر ہوتی ہیں۔ میری مراد جہیز اور بیوی سے ہے۔ جہیز اور بیوی میں جس کی جتنی اہمیت پہلے تھی اتنی اب بھی ہے یعنی شادی کے سلسلے میں بیوی کی حیثیت پہلے بھی ثانوی تھی اور اب بھی ثانوی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگلے زمانے کے لوگ شادی کے سلسلے میں غیر معمولی جہیز کے آرزو مند ہوا کرتے تھے اور اب لوگ دلہن کے لئے [illegible] آج کل شادی [illegible]

جس شدید لیکن غیر شائستہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اس نے شادی کو سوداگری بنا کر رکھ دیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، شادی جہیز کے لئے کی جاتی ہے نہ کہ بیوی کے لئے۔ اس صورت حال کو دیکھتے دیکھتے مجھے فرائڈ کے اس نظریئے کی صحت میں بھی شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ انسان کے افعال و اعمال کا سرچشمہ اس کے جنسی میلانات ہیں۔ بیوی کی بہ نسبت جہیز سے غیر معمولی دلچسپی اگر فرائڈ کا نظریہ سو فیصدی صحیح ہوتا تو جو چیزیں حاصل شادی ہیں ان میں بیوی سر فہرست ہوتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کسی شادی کرنے والے سے پوچھیں کہ شادی کے صلے میں کیا کچھ چاہتے ہو تو وہ جواب میں کچھ اس قسم کی فہرست پیش کرے گا۔

(۱) سلامی دو ہزار روپے (۲) جدید طرز کا آراستہ مکان ایک عدد (۳) فرنیچر ایک سٹ (۴) اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن یا امریکہ جانے کا خرچ (۵) کار ایک عدد (۶) ریڈیو ایک عدد (۷) ریڈیو گرام ایک عدد (۸) گرم سوٹ چار عدد (۹) ٹھنڈا سوٹ چار عدد (۱۰) گرم شیروانی دو عدد (۱۱) ٹھنڈی شیروانی دو عدد (۱۲) پارکر ۵۱ ایک عدد (۱۳) رسٹ واچ ایک عدد (۱۴) بیوی — ایک عدد۔

جیسا کہ اس فہرست سے ظاہر ہے کہ شادی سے ہاتھ آنے والی چیزوں میں بیوی آخری جزو کی حیثیت رکھتی ہے کیا عجب کہ ایک زمانہ ایسا بھی آ جائے جب اس قسم کی فہرست میں بیوی کہیں بھی نہ آنے پائے۔

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اعتراف سے اعتماد پیدا کرتے ہیں۔ اور خاصے کامیاب رہتے ہیں۔ وہ یوں کہ لوگ اپنی بیویوں سے اپنے سابقہ معاشقوں کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ بلکہ سابقہ معاشقوں کے خطوط تک اپنی بیوی کے حوالے کر دیتے ہیں کہ جی چاہے تو انہیں رکھو اور جی چاہے تو جلا دو۔ بیوی سے اس قسم کے اعتراف کا مطلب ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے میرا کردار عاشقانہ رہا ہے۔ اب شوہرانہ رہے گا۔ بالفاظ دیگر پہلے میرا سروکار مسلسل عاشقی سے تھا اب تدریجی خودکشی سے رہے گا۔ سنا ہے کہ اس قسم کے اعتراف و اقرار کے بعد بیوی کا دل ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جاتا ہے شوہر زن مرید ہو یا نہ ہو۔

بیویاں شوہروں کے کردار کا جتنا بھی احتساب کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ کردار کے احتساب کا تعلق ہر زمانے اور ہر سماج میں مردوں سے زیادہ عورتوں ہی سے رہا ہے۔ مرد اپنے کردار کے لئے زیادہ سے زیادہ بیوی کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے کردار کے لئے پورے سماج کے سامنے جواب دہ ہوتی ہیں۔ سوسائٹی مردوں کے گناہوں سے اغماض برتا کرتی ہے لیکن عورتوں کی لغزشوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ ایک مدت سے عورت مرد کے مساوی حقوق کے نعرے سنتے میں آ رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عورت اور مرد کے حقوق مساوی اس دن ہوں گے جس دن عورتوں کو بھی مردوں کے برابر گناہ میں حصہ لینے، گناہوں میں حصہ لینے کے باوجود سماج کی زد سے محفوظ رہنا نصیب ہوگا۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا۔ شادی کے معاملے میں لڑکی اور لڑکے کی اچھائی کا معیار صرف یہ ہوگا کہ لڑکی کا ماضی بے داغ ہو اور لڑکے کا مستقبل روشن۔ ✦

"تو تو میں میں" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایک مزاحیہ کتاب ہے اور ڈراموں کے مجموعہ کی مناسبت سے بہت ہی اچھا نام ہے۔ اگرچہ کہ "تو تو میں میں" والی ترکیب روزمرہ میں بحث و مباحثے اور لڑائی جھگڑے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ تاہم مزاحیہ کتاب کا یہ نام اپنی انفرادیت اور جدت کی وجہ سے قابلِ قبول ہے۔ ویسے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں کرداروں کی جھڑپیں آتی ہیں تو کتاب کا نام خودبخود ذہن میں آجاتا ہے۔

اپنے پیش لفظ کو پرویز نے "پیش نظرچہ" کا نام دیا ہے۔ جو "افسانچہ" کا بھائی لگتا ہے۔ اب چونکہ پیش نظرچہ میں افسانچہ جیسا صوتی آہنگ نہیں ہے۔ اس لئے شاید ہی اس کو مقبولیت ملے اس پیش نظرچہ میں پرویز نے جو تکنک استعمال کی ہے یعنی ڈرامائی پیرایہ میں اپنے آپ سے بات چیت کی ہے۔ وہ ان کی جدت طرازی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس تکنک کو اور بھی لکھنے والے اپنائیں۔ بہرحال مجھے پرویز کا یہ انداز اچھا لگا۔ اسی کو پڑھکر آپ مصنف کے خیالات، اندازِ بیان اور زبان کی لطافت سے واقف ہوجائیں گے اور آگے کے ڈراموں میں آپ کو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا۔ میرے خیال سے اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے پیش نظرچہ پڑھنا اس لئے ضروری ہے کہ آپ مصنف کے بات کہنے کے انداز سے واقف ہوجائیں۔ ویسے تو پرویز نے اس میں اپنے اور ڈرامے کے بارے میں بڑی خاص باتیں کی ہیں۔ جیسے ایک جگہ پرویز کا "وہ" "اپنے" "میں" سے کہتا ہے:

"آپ نے بھی اکثر پڑھے لکھے ناقد اور شعور رکھنے والے اردو داں حضرات کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ اردو ادب میں ڈرامہ اپنی کم مائیگی کے باعث دیگر ملکی و غیر ملکی زبانوں کے آگے "بھیگی بلی" کی طرح سکڑا، سہما نظر آتا ہے۔"

اب پرویز کا یہ جواب دیتا ہے :

"یہی تو وہ جملۂ معترضہ ہے جس کے جواب میں میں نے کمر اور قلم دونوں کو کس کر اردو ڈرامہ کو اس بھیگی بلی سو گرمانے کی کوشش کر دی ہے"

پرویز کے ان جملوں سے اندازہ لگائیے کہ انہیں اردو ڈرامے کی کمی اور کمزوری کا کتنا دکھ ہے انہیں یہ قطعاً برداشت نہیں کہ ان کی زبان کا ڈرامہ دیگر ملکی و غیر ملکی زبانوں کے آگے " بھیگی بلی " کی طرح سکڑا سہما رہے ۔ بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اردو ڈرامہ " شیر " بن کر سامنے آئے یعنی دنیا کی کسی بھی زبان میں لکھے جانے والے ڈراموں سے مقابل رکھا جا سکے ـــــ ان کی یہ خواہش حق بجانب اور کوشش قابلِ تحسین ہے ۔

آج اردو ڈرامہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن بھارتی کے طفیل زندہ ہے ۔ اگر اسے یہاں بھی پناہ نہ ملتی تو ختم ہو چکا ہوتا ۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہندوستان کے تقریباً ہر ریڈیو اسٹیشن سے اردو ڈرامے نشر ہوتے اور پسندیدگی سے سنے جاتے ہیں ۔ ریڈیو میں ان ڈراموں کی مقبولیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اردو کی ریڈیائی ڈراموں کو ابتدا میں قابل اور جانے مانے افسانہ نگاروں نے لکھا اور ریڈیو اسٹیشنوں پر کام کرنے والے اعلیٰ افسروں نے بھی بڑی محنت اور لگن سے اسے پروڈیوس کیا ۔

پرویز کو بھی ڈرامے لکھنے کا شوق ریڈیو سے ہی پیدا ہوا ۔ چنانچہ دوردرشن بھارتی (دہلی) کے پروڈیوسر جناب گنگا پرشاد ماتھر نے پرویز کے شوق کو جلا بخشائی ۔ پرویز کے ڈرامے دوردرشن بھارتی پر نشر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں ۔ پرویز نے ان ہوائی لہروں کو طباعت میں مقید کر کے بہت اچھا کیا کیونکہ ہزاروں ، لاکھوں ڈرامے جو کہ اپنی مثال آپ ہوتے ہیں ۔ وہ ایک بار نشر ہونے کے بعد ضائع ہو جاتے ہیں ۔ کچھ ڈرامے جو بار بار بھی نشر ہوتے ہیں ۔ اگر ہم ان ڈراموں کو پڑھنا چاہیں تو ہمیں وہ نصیب نہیں ہوتے ۔ بہت ہی کم رسالے ہیں جو کبھی کبھی کوئی ڈرامہ شائع کرتے ہیں اور ان کے مدیران کہتے ہیں کہ ڈرامہ پڑھنے کی چیز نہیں ، دیکھنے اور سننے کی چیز کا نام ہے ۔ ایک حد تک ان کی شکایت بجا لیکن شائع ہوتے رہیں تو کیا حرج ہے ۔ اردو کے مردہ اسٹیج کو حیدرآباد کے ببن خاں نے " ادرک کے پنجے " کے ذریعہ دوبارہ زندگی دی ہے ۔ اور اس کے بعد کئی ڈرامے اسٹیج کئے جا رہے ہیں ۔ ممکن ہے کہ اردو ڈرامے پھر سے اپنا ساکھ جمائے ایسے امکانات اس لئے بھی نظر آتے ہیں کہ ہماری ہندوستانی فلموں میں اردو کا چلن بہت زیادہ ہے ۔ اگر اردو کو نظر انداز کر کے خالص ہندی زبان میں مکالمے لکھے جائیں تو فلمیں پٹ جاتی ہیں ۔

پرویز کے ان ڈراموں میں سیٹج کی بھی جو بو نظر آتی ہے ۔ اندازہ ہوتا ہے کہ پرویز ہو دھن کی گھنڈی کھینچا جانے والے ڈرامے بحسن و خوبی لکھ سکتے ہیں ۔ یہ خوبی ان میں اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا ابتدا کہانی کار کی حیثیت سے کی تھی ۔ اور ڈرامے میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے جو کہ داروں کی زبانی ادا ہوتی ہے ۔ چنانچہ آپ کو اس مجموعے میں شامل ہر ڈرامے میں ایک کہانی نظر آئے گی ۔

یہ اہمیت بھی رکھتا ہے۔ ان ڈراموں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ڈرامہ پڑھنے کی بھی چیز ہوتا ہے۔ جو لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ بھی پرویز کے ڈراموں کو پڑھ کر قائل ہو جائیں گے۔

ان ڈراموں کی خوبی یہ ہے کہ اسے ہلکا پھلکا ادب پڑھنے والا بھی پسند کرے گا۔ رومانیت اور طنز و مزاح کو پسند کرنے والا بھی لطف اٹھائے گا۔ اور سنجیدہ ادب کو عزیز رکھنے والے کو بھی اس کتاب میں کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ "ڈاکٹر بیدل کا دل" میں پرویز کا تخلیق کردہ کردار ایک جگہ کہتا ہے "اب زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ بھلے ہی جیتے جی کسی کا دل کسی سے نہ ملتا ہو مگر مرنے کے بعد آپ چاہیں تو کسی اور دشمن کے سینے میں ڈال سکتے ہیں"

"کشش" میں پروفیسر اور اس کی بیوی میں "تو تو میں میں" ہوتی ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دہلی دھلائی زبان کا مزا دے جاتی ہے۔ بیگم کے مکالمے سے ڈرامے کی ابتداء ہوتی ہے۔ بیگم اپنے پروفیسر شوہر کو آواز دیتی ہیں:

بیگم: سنتے ہو جی! میں نے کہا! کیا کانوں میں کنکھیاں بھر رکھی ہیں یا سیسہ ڈال رکھا ہے کچھ سنا تم نے!

پروفیسر: سن رہا ہوں حضور! بالکل سن رہا ہوں۔ اچھی طرح سن رہا ہوں اور صرف آپ ہی کو سن رہا ہوں۔ بلکہ پچھلے پچیس سال سے سن رہا ہوں۔ اور "سننے" "سنانے" کے اس سلور جوبلی سال میں اور جو کچھ سنانا ہو سنا دیجئے۔

بیگم: سنانا کیا ہے خاک! گھنٹہ بھر سے برابر آوازیں دے رہی ہوں۔ کیا اپنے سارے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔

یہ سن کر پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

پروفیسر: ہماری ایسی تقدیر کہاں بیگم! ہمارے نکاح میں تو آپ کے ساتھ آپ کے جہیز کے گدھے گھوڑے بھی بہرے ہو آئے ہیں۔

اس قسم کے [illegible] میں [illegible] جگہ مل جائیں گے۔ اور آپ کے ذہن میں ہلکی سی خوشگوار فضا پیدا کریں گے۔ اور اس طرح آپ [illegible] تازہ دم ہو لیں گے۔

"نانیشنل [illegible]" میں بھی آپ کو ہر مکالمہ دلچسپ لگے گا۔ یہ ڈرامہ دیگر ڈراموں کے مقابل بہت ہی چھوٹا [illegible] ہے۔ اور یہ شروعات سے ہی اپنا جادو جگاتا نظر آتا ہے۔ بیوی کہتی ہے کہ میں نے [illegible] والا بل چھوڑ دیا ہے ــــ دیکھ لیجئے! تو شوہر صاحب جواب کہتے ہیں! "کیا کہا! [illegible] کیا ہے ــــ" بس اسی بات پر "تو تو میں میں" شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس کا انجام [illegible] سے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

ڈرامہ "کرکٹ بخار" کرکٹ کے شوقین لوگوں کو بے حد پسند آئے گا۔ اس میں کرکٹ کی اصطلاحات کا استعمال بہت ہی موثر ڈھنگ سے ہوا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی واحد چیز پڑھنے میں آئی۔ اصل [illegible] پرویز کے مشاق قلم نے اسے ڈرامے کی روپ [illegible] میں لا کر [illegible]

کوئی حد ہے۔ کھاتا پیتا روزہ، گدھے کے سینگ، صحت مند بیمار اور بینڈک، بینڈکی اور زکام اور سپرڈنڈ بھی چھلکے مگر معنی خیز ہیں۔ جو ریڈیو پر بہت ہی اچھے لگے ہوں گے۔ انہیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس کیجئے کہ آپ پڑھ نہیں رہے ہیں بلکہ سن رہے ہیں تو آپ لطف اندوز ہو سکیں گے اور ڈرامہ نگار کی چابکدستی اور شگفتہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

میری نظر میں اس کتاب کا آخری ڈرامہ "آج سے سوکل نہیں" حاصل کتاب ہے۔ اس ڈرامے زمانے کی موجودہ روش پر طنز کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں پر آپ کو لگے گا کہ ڈرامہ نگار واقعی اُن کے اردگرد کے ماحول کی عکاسی پیش کر رہا ہے۔ کہیں کہیں آپ کو اپنی گھناونی تہذیب پر ماتم کرنے کو جی چاہے گا۔ اور کہیں آپ مسکراتے ہوئے اپنے دل میں درد کی ایک لہر محسوس کریں گے۔ اس ڈرامے کو میرے خیال سے ہندوستان کی کسی بھی زبان کے ریڈیائی ڈرامے کے آگے رکھا جا سکتا ہے۔ میں اس کو ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ کرنے کی تائید کروں گا۔

بہرحال مجھے پرویز پر فخر ہے کہ ایک نیم مردہ صنف ادب میں پرویز نے اضافے کے لئے سوچا ہے اور اس صنف کو آگے بڑھانے کے لئے کمربستہ ہو گئے ہیں۔ کاش کچھ اور نوجوان اور کچھ ذمہ دار اصحاب اس صنف پر کام کریں۔ آخر میں تہِ دل سے پرویز کو اس کی کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ اُردو کے لئے مزید کام کریں گے۔

پرویز یداللہ مہدی

قسط وار ناول

چہ خوب — ۳۱

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

کئی بار سنے ہوئے اس مشہور مصرع نے آج پہلی بار نہ صرف ہمارے آستیں، گریباں اور دامن کو تار تار کر دیا بلکہ رگوں میں دوڑنے پھرنے والے لہو کو بھی منجمد کر دیا۔ اگرچہ ہم یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے محض ڈرامہ بازی ہے۔ لیکن ماحول کی پراسراریت میں اس مصرع کی گردان نے وہ دہشت شامل کر دی تھی کہ خطا وار نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ خطا ہونے کو جی چاہ رہا تھا ــــــ ویران بنگلے کے وسطی ہال میں گونجنے والی اس نالہ و فریاد کی لے میں وہ اثر تھا کہ ہم ڈر جاتے اگر ہم اصلیت سے واقف نہ ہوتے۔

اب اپنے قبلہ چہ خوب اور شبیر جو اس تماشے کا ڈراپ سین دیکھنے کے لیے ہمارے ساتھ ہی اس بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔ غالباً پہلے ہی سے واقف تھیں کہ خلائی یا بندرنے نہیں ہوتا۔ اس لیے گھر چھوڑنے سے قبل ہی دونوں نے اپنے تمام آہ و نالوں سے فراغت پالی تھی ــــــ!

ہال کے وسط میں پہنچ کر ہم نے بے دھڑک کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن چاروں طرف سوائے ویرانی کے کچھ نظر نہیں آیا حالانکہ ہال میں گونجنے والا طرحی مصرع اس بات کا ثبوت تھا کہ بے دھڑک صاحب یہیں کہیں ہیں۔ ہم یہاں پہنچ چکے تھے۔ ہم نے گھڑی دیکھی آٹھ بجے ہیں۔ کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ طوطا پری بھی حسب وعدہ کبھی بھی ہال میں پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے احتیاط کے پیش نظر بیٹھی ہوئی آواز میں بے دھڑک کو وقفہ وقفہ سے دو چار بار پکارا لیکن جواب میں

چھان مارے لیکن بے دھڑک کو گدھے کے سر سے سینگ اور خبر گجراتی حضرات کے اچارسے بھینگن کی طرح غائب پایا۔ اسی لمحہ بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ خان فولادی اور عرف طوطا پری ہال کے وسط چلا آ رہا تھا۔ اُدھر اچانک ہال میں گونجنے والا طرحی مصرعہ بھی بدل گیا اور اس بار جو ٹیپ کا بند سنائی دیا وہ یہ تھا ——

گناہ گار۔ پاپی، قاتل، گو آگیا —— تو آیا نہیں، بلکہ تیرا گناہ، تیرا جرم تجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔ طوطا پری

ہال کے وسط میں پہنچ کر رک گیا اس کے روبرو قبلہ چہ خوب اور شبو کھڑے تھے جن کے کان ہال میں گونجنے والی آواز پر لگے تھے اور آنکھیں طوطا پری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہمارے بھی کان اور آنکھیں اسی ڈیوٹی پر لگی تھیں۔ طوطا پری کے چہرے کا اطمینان اور بے نیازانہ انداز اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ یہ سارا تماشہ اس کی نظر میں کسی فٹ پاتھی شعبدہ باز کا لمحاتی کھیل ہے۔ اسی پل ہال میں ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز ابھری ——

"اے عالم ارواح سے عالم فانی کی طرف دوبارہ مراجعت کرنے والی بھٹکتی ہوئی روح تم کون ہو —؟ تمہارے جسدِ خاکی کا نام کیا تھا —— ؟ یہ آواز یقیناً بے دھڑک کی تھی لیکن اس قدر بدلی ہوئی تھی کہ اگر ہمیں پہلے سے علم نہ ہوتا کہ ماہر روحانیات کا پارٹ وہی ادا کر رہا ہے تو ہمارے فرشتے بھی اس کی آواز کو پہچان نہیں پاتے —— بے دھڑک کی آواز کی گونج تھمتے ہی ایک سسکی ابھری پھر روح کا جواب سنائی دیا ——

"میں وہی ہوں جسے اس سرائے فانی میں ایک لمحہ بھی سکون کا میسر نہیں ہوا، جس کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ بھی نہ تھا، جو سمندر میں رہ کر بھی پیاسی رہی جو جیتے جی بھی بے چین رہی اور مر کر بھی بے قرار ہے —— میرا جسم اب مردہ ہو چکا ہے، اور قیامت تک مردہ ہی رہے گا۔ اس مردہ جسم کا نام تھا نادرہ خانم ——" روح کا جواب پورا ہوتے ہی پھر کچھ سسکیاں سنائی دیں اور پھر عجیب پُر ہول سناٹا چھا گیا۔ طوطا پری کے چہرے پر ایک عجیب ٹھہراؤ تھا۔ البتہ قبلہ چہ خوب اور شبو دم بخود کھڑے تھے۔ ماحول کی پُراسراریت نے انہیں غالباً پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا —— ہم نے احتیاط کے پیش نظر انہیں اصلیت بتانے سے گریز کیا تھا کیونکہ قبلہ چہ خوب کی عجلت پسندی سے ڈر تھا کہ کہیں وقت سے پہلے ہی رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ البتہ شبو کے پیارے پیارے چہرے پر خوف کے گہرے رنگ دیکھ کر ہمارا جی بار بار بے قابو ہو رہا تھا کہ بیچ بیچ کر اصلیت بیان کر دیں۔ ہم نے بڑی مشکل سے اپنے اس جذبے قابو پایا لیکن خود کو روک نہ سکے اور شبو کے قریب پہنچ کر آہستہ سے شانے کو تھپتھپایا۔ شبو کو جیسے ہی ہمارے قریب کا احساس ہوا اپنی انگلیوں کو ہماری انگلیوں میں پھنسا کر مضبوطی سے ہمارا ہاتھ تھام لیا۔ اسی لمحہ پھر ایک بار ماہر روحانیات عرف بے دھڑک کی آواز گونجی ——

"اے بھٹکتی پیاسی روح، تجھے اپنی تمام تر بے چینیوں، بے قراریوں اور بے تابیوں کا واسطہ اپنی زبان سے بتا دے اس بے ضمیر قاتل کا نام جس نے تیری زندگی کے آفتاب کو موت کے گمنام غاروں میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ——"

"میرے بے ضمیر قاتل مجھے موت کی نیند سلانے کے بعد خود چین سے سونے والا جعفر یا اس وقت یہاں موجود ہے

[illegible]

کا یہ اثر ہوا کہ قبلہ چرب خوب کی نظر طوطا پری جو پہلے ہی معتوب تھا اب تو قابل مجرم ہوگیا ! —— لیکن ماحول کی سنگینی نے غالباً قبلہ چرب خوب کی قوتوں کو وقتی طور پر کم از کم اس حد تک سلب کرلیا تھا کہ انھوں نے طوطا پری پر راست جھپٹا مارنے کی کوشش نہیں کی۔

ادھر بے دھڑک نے طوطا پری کے جرم کے ثابت ہوتے ہی ایک اور کیل ٹھونکنی شروع کردی تھی ۔ "بھٹکتی روح تجھے اپنے مردہ جسم کے نیلے پن کا واسطہ، جس نے تیرے چہرے سے زندگی کی پیاری سرخی چوس لی۔ اب اپنی "زہر تلی" کے خون آشام ہاتھ پر پٹا پہنا شامے کہ اس کے پشت پر جو بلا چھپا ہے اس تک ہم بے بصیرت کم مایہ انسانوں کی نظر نہیں کی جا سکی اور نہ جا سکتی ہے —— !!!

اس راز کی عقدہ کشائی سے قبل چند ثانیوں تک وہی مخصوص سناٹا اپنا بے آواز جاشن دیتا رہا۔ اور اس وقفے کے دوران ہم نے پھر ایک بار طوطا پری کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا چہرہ حسب سابق سادہ کتاب کی طرح نظر آیا جس میں حرف تو ایک طرف، فل اسٹاپ یا کاما کا نشان تک نہ ہو۔ اب ایسی زیور کتابت و طباعت سے محروم کتاب پر ہم بھلا کیا تبصرہ کرتے، تھک ہار کر اپنی تمام تر سماعت کو روح کی طرف لگا دیا —— بے جسم روح کی آواز ایک بار پھر ابھری۔ "آہ! میرے مادی جسم کی وہ آخری شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اپنے خوب صورت جسم کی وہ تڑپ —— رگ رگ میں سرایت کرتا ہوا زہر، لمحہ بہ لمحہ زندگی کے نور کو اپنی لپلپاتی سیاہ زبان سے چاٹنے والی وہ موت کی ہولناک ناگن —— وہ زہریلی جھجن جو بظاہر ایک "ناگن" کی تھی، لیکن درحقیقت وہ ایک زہریلا ناگ تھا' زہر کا سوداگر —— خان فولادی جس کی گردن پہ میرا خون ہے —— زہریلے سانپوں کو اپنی انگلیوں کے اشارے پر نچانے والے موت کے ٹھیکیدار نے اپنے ہاتھوں کا کمال دکھایا —— زہر کے نقلی سانپ کو اصلی زہریلے سانپ میں بدل کر اس قاتل نے نہ جانے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا —— انتقام ——

انتقام —— —— بات ختم کرتے کرتے روح کی سسکیاں بے قابو ہوگئیں۔ پھر سسکیاں ہنسی میں بدل گئیں۔ روح کی کرب آمیز ہنسی میں وہی کاٹ تھی جو خسرو چرب خوب عرف نادرہ خانم کی ہنسی میں پائی جاتی تھی۔ —— یہ قہقہہ غالباً مرحوم کا اپنا قہقہہ تھا جو کسی پروگرام کے سلسلے میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ بے دھڑک نے جس ہوشیاری اور چالاکی سے سارا ڈرامہ تیار کیا تھا، اسے اتنی ہی چابک دستی سے پیش بھی کر رہا تھا لیکن خود اس کے روپوش ہونے کی وجہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھی —— ہو سکتا ہے ماحول کو اور بھی پراسرار بنانے کے لیے روپوش ہوگیا ہو —— اور اگر یہی وجہ تھی تو یہ حربہ بڑی حد تک کامیاب تھا کیونکہ ہال میں موجود ہر متنفس پتھر بنا بیٹھا تھا جیسے ماتمی [illegible] سے ہم کلام ہو۔ بظاہر روح کی آواز کی گونج ختم ہو چکی تھی لیکن خوف زدہ ہال میں اس کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس [illegible] وہ اچھا تھا کہ قبلہ چرب خوب جناب تک خاموش [illegible] کی کیفیت [illegible] سب کچھ سن رہے تھے ۔ اچانک [illegible] لیکن پھر اچانک عجیب [illegible] —— [illegible] کو تھوڑا [illegible] —— [illegible]

کسی اور کی۔ لیکن میرا یہ گمان یقین میں ضرور تبدیل ہوگیا ہے کہ مرحومہ کی موت میں خان فولادی یقیناً تمہارا ہاتھ ہے ـــــ"
قبلہ چہ غوب کے اس راست حملے پر ہمارا اندازہ تھا کہ طوطا پری بھڑک اُٹھے گا یا پھر بغلیں جھانکنے لگے گا، لیکن اس نے خلاف توقع ایک قہقہہ لگایا۔ پھر تالی بجا کر بولا ـــــ

"آپ کا غصہ سر آنکھوں پر نواب صاحب قبلہ! آپ کے اس الزام کے سلسلہ میں، میں بھی منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں، لیکن حالات کو جس طرح میرے خلاف بنایا گیا ہے اس کی روشنی میں آپ کی جگہ جو بھی ہوتا، اسی طرح مجھے مجرم سمجھتا ـــــ اس لیے آپ میری نظر میں قابل معافی ہیں، لیکن ابھی کچھ دیر میں جب اصلیت پر سے پردہ اٹھے گا تو آپ کا ہر گمان ہے گا اور نہ یقین ـــــ" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا اور اس طرح چاروں طرف خلاؤں میں دیکھنے لگا جیسے روح سے ہم کلام ہونے کے لیے کسی مخصوص گوشے کو تلاش رہا ہو جہاں سے راست روح سے ربط قائم کیا جا سکتا ہو۔ پھر اس کی اپنی دانست میں جیسے ہی اسے وہ مقام نظر آیا۔ بہ آواز بلند بولا ـــــ "اے بھٹکی ہوئی بے سکون روح! اگر تو واقعی دائمی سکون کی متلاشی ہے تو میری آواز کی لہروں سے اپنی سماعت کے تار جوڑ کر ـــــ غور سے سن ـــــ میں جسے کہ تو نے اپنے مادی جسم کا قاتل ٹھیرایا ہے۔ تجھ سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں ـــــ مجھے بتا دے کہ تیرے قتل سے مجھے کیا ملا ـــــ آخر کون سا فائدہ میرے پیش نظر تھا جو میں نے اپنی چاہت کا خود اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیا ـــــ!!"

اتنا کہتے کہتے طوطا پری کا گلا بھر آیا۔ وہ رک گیا مگر خلا میں اسی طرح تاکتا رہا۔ اچانک روح کی سسکی ابھری ـــــ روح کی سسکی نے ہمیں چونکا دیا۔ طوطا پری نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ ایسا لگتا تھا طوطا پری کو روح سے ربط قائم کرنے میں ماہر روحانیات کے وسیلے کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ اصلی روح کا چکر کہاں تھا جو اپنی مضبوط قوتِ ارادی کی مدد سے طوطا پری روح کو ہم کلام ہونے پر مجبور کر سکتا تھا۔ یہ ساری ڈرامہ بازی تھی جس کا علم یا تو بے دھڑک کو تھا یا پھر ہمیں تو پھر طوطا پری کے سوال پر نقلی روح نے اصلی سسکی کیسے بھری۔! ذہن کی تہوں میں ابھرنے والے اس سوال نے سچویشن کو اور بھی گنجلک بنا دیا ـــــ اس وقت تو ہم تحیر کے ایورسٹ پر پہنچ گئے۔ جب روح کا جواب سنائی دیا ـــــ

"میرے مادی جسم کے بہیمانہ قتل کے پیچھے دولت کی ہوس کارفرما تھی ـــــ میرے مادی جسم کا پانچ لاکھ کا بیمہ ـــــ!!" روح کے اس انکشاف پر طوطا پری نے قبلہ چہ غوب کی طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا ـــــ "پانچ لاکھ کی بیمہ پالیسی ہتھیانے کے لیے قتل کا جواز وہی بنا سکتا ہے جو بیمہ شدہ ہستی کے ورثا میں شامل ہو ـــــ" طوطا پری کے اس راست حملے پر قبلہ چہ غوب کا بھتھے سے اکھڑنا لازمی تھا۔ موصوف جھنجلا کر گرجے

"خان فولادی اپنی چرب زبانی کو لگام دو، میں برداشت کی تمام حدیں پہلا نگ چکا ہوں ـــــ اب تم مجھے بھاگنے بھڑکانے کی جگہ تمہارا ماہی چاہا یا ہے۔ ختم کر دو یہ ناٹک کا کہ غصہ سے ہے سے اقبال جرم کرلو ـــــ" ماحول کا یہ اسرار ناکت نے قبلہ چہ غوب کے حواس پہ اتنا اثر نہ کیا تھا کہ انہیں کی گرم مزاجی خلاف تھی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ موصوف کا گرم گرم سے میں دم بالکل نہیں تھا بس غم ہی غم تھا ـــــ (باقی)

خرافات

(مراسلے)

ڈیر مصطفےٰ کمال

سالنامہ پڑھ کر اندازہ ہوگیا کہ آپ لوگ دم لینے کے لئے کہیں رکتے نہیں۔ لیکن اس سفر میں پڑھنے والوں کو تھکا ضرور دیتے ہیں۔ اُس پر یہ حیدرآبادی عجز وانکسار بھی کہ سالنامہ اپنی روایتوں کو برقرار نہ رکھ سکا جبکہ یہ حقیقت ہے کہ سالنامہ توقعات کے عین مطابق ہے۔ آپ کے اداریہ میں نئے سال کا پیغام فکر انگیز ہے ۔ سالنامہ کے بعد ضخیم ترین ڈراما نمبر دیا گیا ابھی صفحات پلٹنے بھی نہیں پائے کہ فروری کا شمارہ ہاتھ لگا ۔ اب بھلا بتایئے اگر کوئی زندہ دلانِ حیدرآباد کی بار بار تعریف نہ کرے تو آخر کیا کرے۔ ذائقہ بدلنے کو ہی سہی ڈاکٹر حامد حسین اور پروفیسر آفاق احمد کے بعد پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے بھی اس شوخ صنف کو منہ تو لگایا۔

۱۰ر اور ۱۱ر مارچ کو مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی کی طرف سے بھوپال میں دو روزہ سمینار منعقد ہوا موضوع تھا "اردو کے پچھلے دس سال" ۔ آپ کے سالنامہ کا اداریہ یاد آگیا۔ آپ نے بھی پچھلے ڈیڑھ ایک دہے ۔۔۔ بات چھیڑی تھی۔ بڑا اچھا موقعہ ڈاکٹر شفیقہ فرحت کو میسر آیا کیونکہ آخری نشست میں انہیں طنز و مزاح پر پڑھنا تھا۔ انھوں نے ان دس برسوں میں طنز و مزاح کا انتہائی مختصر جائزہ لیتے ہوئے زندہ دلانِ حیدرآباد کی خدمات کا خاص طور پر اعتراف کیا اس سمینار میں حیدرآباد سے محترمہ زینت ساجدہ صاحبہ بھی شریک ہوئی تھیں۔

فضل جاوید بھوپال

● ڈرامہ نمبر جیسے شاندار اور بے مثال کام کے لئے مبارکباد

ایم۔ایم۔ سنگھو ایڈیٹر، بمبئی

● مبارکباد قبول فرمائیں۔ ڈرامہ نمبر پر۔ اتنی محنت اور اتنا خوبصورت نفیس پرچہ۔ واہ واہ

یوسف کھتری ، بمبئی

● محترم جناب مصطفیٰ کمال ، تسلیمات

اب آپ نمبر نکالنے میں ماہر ہوگئے ہیں۔ کیوں نہ آپ کو "نمبری" کہا جائے۔ ڈرامہ نمبر ملا۔ مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس کی ترتیب اور مواد جمع کرنے میں جس عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے یہ آپ ہی کا حق ہے مہمان مدیر جناب ساگر سرحدی بھی قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے آپ سے بھرپور قلمی تعاون کیا ہے۔

راقم السطور
فیض الرحمٰن رائچور

● شگوفہ کا سالنامہ اور ڈرامہ نمبر دونوں خصوصی اشاعتیں بہت شاندار ہیں۔

حمید الماس ، بنگلور

● ڈرامہ نمبر تاریخی دستاویز ہے آپ کو اور ساگر صاحب کو مبارکباد شدید انتظار ہوگا۔

مختار یوسفی ۔ مالیگاؤں

● شگوفہ برابر نظروں سے گزرتا رہا ہے۔ پٹنہ میں شعراء و ادبا بے حد پسند کرتے ہیں۔

عاشق نوادوی، پٹنہ

● شگوفہ کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں بس اتنا کہوں گا کہ مستقبل میں شگوفہ کے لئے ترقی کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔

محمد قمر ، حیدرآباد

● ہنسے ہنسانے والوں کو صحت مندانہ مزاح پڑھنے کے لئے شگوفہ نے ایک بہترین پلیٹ فارم مہیا کیا ہے مجھے امید ہے کہ آپ اپنی اس روایت پر قائم رہیں گے۔ شمیم حمید، بھٹکل

قابلِ کاشت اراضی میں اضافہ

آندھرا پردیش کے منصوبہ جاتی اخراجات میں کچھ عرصے سے آبپاشی پراجکٹوں کے لئے بھاری حصہ مختص کیا جا رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اراضیات کی سیرابی کے لئے گنجائش مہیا کی جائے۔

درج فہرست علاقوں میں ۲۱٫۶۸ کروڑ روپیوں کی تخمینی لاگت کے چھ اوسط پراجکٹ کی عمل آوری کا کام شروع کیا گیا ہے۔ چھوٹی آبپاشی کے تحت ۲٫۲۰ ملین ہیکٹر کی امکانی گنجائش میں سے ۱٫۷۶ ملین ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش اب تک پیدا کی جا چکی ہے۔

سال ۸۰-۱۹۷۹ کے دوران میں ۶۸۰٫۲۶ لاکھ روپیوں کے اخراجات سے مزید ۶۳۵۰ ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا کر لینے کی تجویز ہے۔

ڈائریکٹر جنرل محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش۔ DGIPR.A.

شگوفہ

جلد ۱۲
شمارہ ۵
مئی ۱۹۷۹ء

طباعت نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲ ؛ بائنڈنگ محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی حیدرآباد ۲

سالانہ ---- (۲۰) روپے
بیرونِ ہند ---- (۳۵) شلنگ
فی پرچہ ---- RS. 1.50

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ مجرد گاہ اعظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون نمبر 57716

PURANDAS RANCHHODDAS & SONS
INDIA
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

شگوفہ
کے عام شمارہ کی قیمت
جون ۷۹ء سے ڈیڑھ روپے ـــ اور ـــ
ـــ سالانہ خریداری ۲۴ روپے ہوگی۔

رضا نقوی واہی

سہاگن بیوہ

کہا شاعر کی زوجہ نے سہیلی سے یہ رو رو کر
لگا ہے جب سے تُک بندی کا چسکا میرے شوہر کو
ہمالہ جیسی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹتی ہیں
خدا غارت کرے بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو
بڑھاتی ہے یہ جس تیزی سے ناکاروں کی آبادی
اسی کے بطن سے جنتے ہیں حشرات سخن پیدا
نہ جانے شہر میں تعداد نا اہلوں کی کیا ہوگی
انہی آوارہ گردان غزل کے سرغنہ ہیں وہ
"ہوئی صبح اور رکھ کر کان پہ اپنے قلم نکلے"
یہ بے فکروں کی ٹولی بیٹھتی ہے جتنے عرصے تک
کچھ اس انداز سے اک دوسرے کو داد ملتی ہے
وہاں سے اٹھ کے سارا دن وہ کرتے ہیں مٹرگشتی
شب آتی ہے تو بزم شعر کی ہوتی ہے تیاری
ذرا سی دیر کو آتے ہیں گھر لیکن یہاں پر بھی
دم فکر سخن ہوتا ہے اُن کا حال کچھ ایسا
کبھی تو بھاگ جاتا ہے گرفت فکر سے مضموں
کبھی وحشت زدہ چہرے پہ مایوسی ٹپکتی ہے
بہن، میں اپنے گھر کی داستان غم سناؤں کیا
میں جب کہتی ہوں راشن ختم ہے اور گھر میں فاقہ ہے
اگر کچھ اور کہتی ہوں تو نظریں پھیر لیتے ہیں
کبھی جب موڈ میں آکر وکالت اپنی کرتے ہیں
وزیر خارجہ بھی اپنے شاعر ہیں خدا رکھے

بہن، میں تو سہاگن ہو کے بھی بیوہ سے ہوں بدتر
سر بزم سخن کرتے ہیں وہ خرمستیاں شب بھر
پڑی رہتی ہوں غصے کو دبائے سُونے بستر پر
کہ شاعر گر ہے یہ کم بخت اپنے ملک کے اندر
اسی رفتار سے صنعت غزل کی ہے ترقی پر
کہ جن کے دم سے ہے گھر والیوں کی زندگی دوبھر
ہمارے ہی محلے میں ہیں جب یہ لوگ درجن بھر
محلے میں سخن سازوں کے لیڈر ہیں مرے شوہر
مری دیوڑھی پہ آ دھمکے نحوست کے یہ سوداگر
مرے گھر میں نظر آتا ہے محفل شعر کا منظر
کہ اُڑ جاتا ہے پیہم شور و غل سے پھوس کا چھپّر
کسی ہوٹل کے زینہ پہ یا کسی کوچے کے نکڑ پر
کسی کے صحن خانہ میں، کبھی فٹ پاتھ کے اوپر
جنون شاعری سر سے اُترتا ہی نہیں دم بھر
کوئی خاتون جیسے درد زہ کے وقت ہو مضطر
کبھی مصرع ہی ہو جاتا ہے بحر و وزن سے باہر
کبھی جھنجھلا کے اٹھتے ہیں کبھی گرتے ہیں بستر پر
نہ جانے مجھ کو لے آیا کہاں تقدیر کا چکر
تو پڑھنے لگتے ہیں اشعار "مطلع عرض ہے" کہہ کر
"جواب بیگاں باشد خموشی" لحن سے پڑھ کر
تو کہتے ہیں، نہ سمجھو شاعروں کو ہیچ یا کمتر
میں ان کے ساتھ رہتا ہوں شریک بزم شعر اکثر

بہن یہ ہے نکمی منطق میرے پلّے نہیں پڑتی
کروں بھی کیا، میں رہ جاتی ہوں خوں کا گھونٹ پی پی کر

کرنل محمد خان

سوئٹزرلینڈ: حسنِ ازل کی نمود

— سوئستانی لڑکیاں اشتعال آور ہیں

سیڈکراس سے فارغ ہونے کے بعد بس نے اپنا سفر شروع کیا اور ہم نے اپنا باقی ماندہ لطیفہ چھیڑا اور ا
شاپ تک مس ٹیلر کو سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ پھر ایک طویل وقفے کے بعد بس رکی کہ سامنے جینوا یونیورسٹی کی عمارت
ا۔ یہ گویا مس ٹیلر کی جاگیر تھی۔ یہاں پہنچ کر نہ صرف ہمارا لطیفہ ختم ہو گیا بلکہ ہماری بالادستی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور مس ٹیلر کی
لداری شروع ہو گئی۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ شاگردانہ نیازمندی کے ساتھ مس ٹیلر کے جلو میں چلتے
یں اور سنتے جائیں اور جب سننا شروع کیا تو ہمیں بصد حیرت پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ مس ٹیلر دلچسپ باتیں بھی کر سکتی ہے،
تے چلتے ہم نے کہا:

آپ تو یونیورسٹی سے واقف معلوم ہوتی ہیں، ذرا اس کا دلچسپ ترین شعبہ تو دکھایئے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ مس ٹیلر کوئی
اب دے پائیں سامنے سے منی سکرٹ میں ملبوس دو سوئستانی دوشیزائیں آتی دکھائی دیں اور [illegible]
ر کر خیالی گھوڑی مار کر انہیں دیکھنے لگے۔ جب وہ پاس سے گزریں تو ہماری نگاہیں ان کے گھٹنے کے لمس کے ساتھ گھوم گئیں
بن اس "منظر پیچھے اور قدم آگے" کی حالت میں مس ٹیلر سے ہماری ٹکر ہو گئی اور ہم گرتے گرتے سنبھلے۔ اس پر مس ٹیلر بولی:

"اللہ نگہبان! اب دوسرا شعبہ کونسا دکھاؤں؟"

اور یہ کہہ کر مسکرا دی۔ گویا مس ٹیلر بھی ہمیں بیچ بیچ ملاحظہ کر رہی تھی جس کی بظاہر وہ نااہل نظر آتی تھی۔ ہمیں یہ غنیمت موقع
سوس ہوئی تو ہم نے اسی مضمون میں تھوڑی سی شرارت ملا کر اسے طویل کر دیا اور کہا:

"مس ... مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ شریف شہر میں سوئستانی لڑکیاں اس قدر اشتعال آور ہیں، میرا مطلب ہے

"بات یہ ہے" مسز رش کہیں ہوٹل سے ہلا تو بارش ہو رہی تھی سو پہاڑ پہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور تفریحی بس میں شہر کی سیر کو نکل پڑا۔"

"دریافت طلب بات صرف اتنی ہی ہے کہ ہمارے فوجی دلیر کا ارادہ بارش نے بدلا یا اس عینک نے؟"

"بارش نے، مسز رش، بارش نے" ــــــ ہم نے تاکیداً کہا۔ "عینکو غریب کی ساخت ایسی نہیں کہ کسی کا ارادہ بدل سکے۔"

مسز رش یہ سن کر کھل اٹھی اور بولی:

"سچ؟ یہ دل کی بات کہہ رہے ہو؟"

اور ہم نے کسی جھجک کے بغیر اپنا پرانا فارمولا دہرایا:

"قسم ہے اس کی جس نے پہاڑ اور دریا پیدا کئے ہیں کہ۔ ۔ ۔ ۔"

ــــــ اگر کراما ً کاتبین نے بے چارے مردوں کے ان چھوٹے چھوٹے جھوٹوں کو جو خواتین کے سامنے ذاتی دفاع کی خاطر بولنے پڑ جاتے ہیں نظر انداز نہ کیا یا بعد میں داور محشر نے بطور اسپیشل کیس رعایت نہ دی تو اگلی دنیا میں بہت کم مرد منطقۂ معتدلہ کی جانب نظر آئیں گے ــــــ خیر یہ تو اگلی دنیا میں دیکھی جائے گی؟ اس دنیا میں ہمارے جھوٹ کا نہایت خوش گوار اثر ہوا اور مسز رش کے لبوں پر عجب دیرینہ مسکراہٹ پھیل گئی لیکن عین اسی وقت چھوٹی مس رش جیں جیں کرتیں وکیں آ گئیں کہیں سے بیچ میں آ ٹپکی پہلے اس نے حاضرین کو ایک غضب آلود نگاہ سے دیکھا اور پھر اپنی خندہ بلب ماں کو بازو سے پکڑا اپنی تفریحی بس کی طرف کھینچ لے گئی۔ کیونکہ ایک عرصے سے ایک بے چین بیٹی کی ماں اور ایک بے صبر ڈرائیور کی مسافرہ لاپتہ تھی جو تلاش بسیار کے بعد ہم سے باتیں کرتی پائی گئی۔ یعنی کچھ اسی طرح جیسے تھوڑی دیر پہلے ہمارے ڈرائیور نے مس ٹیلر کو کیفے ٹیریا میں لیکچر پلاتے پایا تھا۔

مرنے میں تیزی کی کیا ضرورت ہے؟

جب مسز رش کی بس چل پڑی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو ہم نے اطمینان سے مس ٹیلر کی طرف رجوع کیا اور چاہا کہ مسز رش کی زیادتی کی معافی مانگیں لیکن مس ٹیلر کو کسی زیادتی کا علم یا احساس نہ تھا۔ اس پر پھر علم اقتصاد طاری تھا۔ ادھر ہماری بس ایک کشادہ چوک سے نکل کر تنگ و تاریک گلیوں سے گزرنے لگی جہاں قدم قدم پر تاریخ ہمارا دامن تھام رہی تھی۔ ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گائیڈ بولا۔

"نپولین اس گھر میں ایک رات مہمان رہا تھا۔ غوسو اس چوبارے میں پیدا ہوا تھا۔"

مس ٹیلر نے پھرتی سے اصلاح دی: "غوسو سے اس کی مراد روسو ہے۔"

گائیڈ نے اپنا کلام جاری رکھا: "آئن سٹائن اس کوچے میں ٹہلا تھا۔ ملٹن نے اس کھڑکی سے جھانکا تھا۔ ۔ ۔ ۔"

مشاہیر اس تیزی سے ہمارے سامنے سے گزر رہے تھے کہ ایک دوسرے میں تمیز مشکل تھی۔ پھر قدم قدم پر مجسمے اور چھپے چھپے پر کتبے جنہیں ہم نے دیکھا اور پڑھا اور پھر خدا جانے کیوں لیکن دفعتہً غیب سے خیال آیا کہ ہم

کی دیواریں بنا لیتیں اس لطف و سرور کے نت نئے سوتے سے ابلنے لگے۔ ریستورانوں اور رقص گاہوں کی رنگین روشنیوں سے گزر کر ہاں کے بادۂ ... تک رسائی ہوئی تو سیر فرنگ کا عرفان حاصل ہونے لگا۔

فرنگ میں شعاعوں کے نیچے بیٹھنے سے نہیں، کسی بہشت شمائل کے سایۂ گیسو میں رقص کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور جنت منظر کہ ہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم ——— یورپ میں دماغ اسی شخص کا ہے جس کا بازو تھامے کوئی غارت گر مہر تکلیف سعال ہوا اور یہ محض اتفاقیہ تھا کہ اس شب ہمارے بازو کا استعمال بھی کچھ اسی نوع کا تھا ——— آخر بعد نیم شب پانساں کو لوٹے تو مسز رش کے کمرے کی شمع گل ہو چکی تھی سو ایسی ہنگامہ خیز رات کے بعد اپنے کمرے تک بے محابہ پہنچ جانا اور اپنے بستر سے بے محابا ہم آغوش ہو جانا وہ عیش جو مغل حسین خان کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

جاں نثاری سے پہلے پرواز کا وقت آگیا

اس نشاط شبینہ کی سرمستی دوسرے روز دوپہر تک رہی اور نشہ اترا تو یاد آیا کہ آج تو لندن جانا ہے۔ تیزی سے رخت سفر باندھا۔ میڈم پیار رش سے رخصت لی اور قیمتی مال بیٹھ سے آنکھ بچا کر پانساں سے باہر نکلے۔ ایرپورٹ پہنچے تو ... کی مروت اور ... سوئستانی گرانڈ ہوسٹس بصد معذرت عرض پرداز ہوئی:

"کراچی سے آنے والا بوئنگ ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ لہٰذا ازراہ کرم یہ چٹ قبول فرمائیے اور ایرپورٹ کے ریستوران میں جا کر لنچ تناول فرمائیے۔"

ہمیں مفت کے لنچ کی ایسی خوشی نہ تھی کہ جہاز کی تاخیر کا شکوہ کہیں زیادہ تھا۔ لیکن اس ساحرہ کے اظہار معذرت سے دل گداز ہو گیا اور جا کر لنچ کھا لیا۔

لوٹ کر آئے تو اوقات آمد و رفت کے برقی بورڈ پر پی آئی اے کا بوئنگ مزید ایک گھنٹہ لیٹ دکھائی دیا۔ دل میں ایک احتجاج ابھرا لیکن پھر وہی دلآرام ایک چٹ اور مسکراہٹ لے کر نمودار ہوئی اور بولی:

"میں گڑگڑا کر معافی کی طلب گار ہوں۔ یہ چٹ قبول کریں اور بار پر جا کر اپنی پسند کا مشروب نوش فرمائیں۔"

کوئی اور ہوتا تو چٹ ہم اس کے منہ پر دے مارتے کہ ہمیں صرف لیٹ ہونے ہی کا شکوہ نہ تھا، پی آئی اے یعنی اپنی قومی ہوائی کمپنی کی سرعام رسوائی کا رنج بھی تھا۔ لیکن یہ چٹ باز حسینہ کوئی عام حسینہ نہ تھی، خود جان تو اخیر تھی اور سچ تو یہ کہ عالم حسین ہی نہ تھی ایک عجیب ہوشربا چارم CHARM بھی رکھتی تھی۔ یہ چارم قدرت کا چیدہ تحفہ ہے۔ یہ حسن کے بغیر ... ہوتا ہے۔ لیکن جب حسن کے ساتھ نازل ہو جیسا کہ اس ہوسٹس میں تھا تو اسد اللہ خان قیامت ہے!

یہی وجہ ہے کہ اقدام قتل کی بجائے دعائے زندگی دے کر ہم نے اس کافر سے تیسری چٹ بھی لے لی اور چوتھی چٹ کے سمرقند و بخارا بخشنے پر تلے بیٹھے تھے کہ جہاز آ گیا اور ہم بہ نفس نفیس ٹکٹ لیے بغیر لندن کو پرواز کر گئے۔

ایم۔ اے۔ حسّان ـــــــــــ

تبصرہ

جس طرح ہم نے ماں باپ کی خوشی کے لئے شادی کی۔ ٹھیک اسی طرح اپنی بیگم کی خوشی کے لئے کتاب چھپوالی۔

کتاب چھپوانے کے بعد کسی نہ کسی طرح اس کی رسم اجرا بھی کر ڈالی۔ البتہ رسم اجرا کے سلسلہ میں ہم سے ایک یہ سرزد ہوئی کہ کسی وزیر یا اعلیٰ عہدہ دار کو زحمت دینے کے بجائے ہماری نگاہ غلط انتخاب ایک ادیب [illegible] پر پڑی اور نتیجتاً ادیبوں اور شاعروں کی ساری مفلسی اس کی فروخت میں حائل ہوگئی۔ جس میں روایتاً سولہ سو کے ہونے کے بجائے صرف سوا چار سو ہوگئے۔

ادھر قارئین کرام نے بھی ہم سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اُلٹے ہماری وہ خبر لی کہ ساری خوشیاں کافور ہوگئیں ایک قاری نے ہمیں یہ تحریر کیا "آپ کی کتاب کی قیمت دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا (شکر ہے کہ قیمت دیکھ کر یہ صورتحال پیش آئی، ورنہ بعض لوگ مصنف کا نام دیکھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔) دوسرے نے سرورق کے بارے میں اپنے مشتعل جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ سرورق خوبصورت ہونا تو کجا نہایت بدشکل اور تکلیف دہ ہے۔ کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ آج کل کتابوں کی فروخت کا انحصار دیدہ زیب ٹائٹل پر ہوتا ہے اور بعض اوقات حسین سرورق بڑے نام کو بھی ٹکر دے جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی کی بات ہے کہ ایک مصنف کی کتاب کے سامنے [illegible] بک گئے اور کتابیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ شاید آپ کو اس حقیقت کا بھی پتا نہیں کہ بعض حضرات کتابت [illegible] دیکھ کر چھوٹی کتابیں خریدنا پسند فرماتے ہیں جس سے مطالعہ کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ آخر میں لکھا تھا کہ آپ نے [illegible] فلاں ابن فلاں سے کتابت کیوں نہیں کروائی۔ ان کی نوشتہ کتابیں تو اغلاط ہونے میں نمایاں مقام رکھتی ہیں" اور

بیں خصوصیت سے تحسین فرمائش سے خریدتا ہے بلکہ اچھا خاصا اصل قیمت سے دو گنی قیمت ادا کرنے پڑتے یعنی "بلیک" میں فروخت ہوتی ہیں۔ کاش آپ بھی ان کے دستِ مبارک سے کتابت کروا کر "بلیک لسٹ" میں شامل ہو جاتے۔

بہرحال قاری، قاری ہی ہوتا ہے۔ اس کی ستائش یا مذمت کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر قاری نقاد تو نہیں ہوتا۔ یوں بھی ادب میں صرف قاری کی ستائش کو شمار کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہم نے یہ مناسب سمجھا چند واقف اور تجربہ کار مدیروں کو دعوتِ تبصرہ دے کر ان سے خراجِ تحسین وصول کرنا شروع کر دیں اور ہر قسم کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو جائیں۔ ہمیں ان کے نام نامی، ذاتِ گرامی، شرافت اور دیگر خستہ اوصافِ حمیدہ سے تو امید تھی کہ وہ ہم سے انصاف کریں گے۔ کچھ ادب کا بھلا ہوگا اور کچھ ادیب کا۔

اسی نیک خیال کے زیرِ اثر ہم اپنی تصنیف کے متعدد نسخے ایڈیٹر صاحبان کو تحفتاً روانہ کر دیئے۔ اور اردو کے ہیرو کی طرح انتظار سے دل بہلانے لگے۔ قانونِ فطرت کے مطابق روز وقتِ مقررہ پہ سورج طلوع و غروب ہوتا سات دن مل کر ایک ہفتہ بنانے لگے اور چار ہفتے مل کر ایک مہینے میں تبدیل ہونے لگے اور اس حقیقت سے تو سب واقف ہیں کہ بارہ مہینوں کا ایک سال ہوا کرتا ہے۔ اس طرح بالآخر انتظار کی چوتھی سالگرہ پہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انتظار کے یہ پہاڑ جیسے چار برس ہم نے یہ سوچ کر کاٹ دیئے تھے کہ بیچارہ ایڈیٹر بھی تو آخر انسان ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں بھی سات، آٹھ اونس کا ایک دل دھڑکتا ہے جس میں وقت بے وقت بے شمار خواہشیں اور تمنائیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں۔ اسے بھی کچھ گھریلو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ صرف ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کرتے رہنا اور ان کی تصنیفات پر تبصرے کرنا ہی اس کی زندگی کا واحد مقصد نہیں ۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کنوارا ہو اور جس دن ہماری کتاب اُسے تبصرے کے لئے موصول ہوئی ہو، اس روز اس کی شادی ہو رہی ہو۔ ویسے بھی آج کل سیلابوں کا دور دورہ ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی مصنف اچانک سیلاب سے گھر گیا ہو اور کسی درخت کی شاخ پر بیٹھا ہیلی کاپٹر سے گرائے جانے والے غذائی پیکٹوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

لیکن جب ہمیں ان مدیران کا بخیر و عافیت ہونا معلوم ہوا اور انھیں اپنی روٹی پہ دال بلکہ مرغ کی دونوں ٹانگیں کھینچنے میں مصروف پایا تو ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور ہم نے ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم کچھ کر بیٹھتے، ہمارے نام کتاب بھیجے جانے کے ٹھیک چار برس بعد ایک ایڈیٹر کی جانب سے یہ ٹیلیگرام آیا کہ "ہم صرف نئی کتابوں پہ تبصرہ کرتے ہیں۔ جناب والا کی تصنیف شائع ہو کر کوئی چار سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس لئے ادارہ تبصرہ کرنے سے معذور ہے۔"

تو دوسرے نے اپنے اشہبِ قلم کو یوں چابک لگائی "ہم صرف ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہیں جو ہمیں بذریعہ رجسٹری روانہ کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ کہ آپ کی تصنیف ہمیں بروقت موصول ہوئی اور روا روی میں ہم نے اس پر تبصرہ بھی کر ڈالا۔ لیکن بذریعہ رجسٹری نہیں بھیجی گئی ہے۔ اس لئے ہم تبصرہ شائع کرنے سے قاصر ہیں ۔۔۔!!"

ایک صاحب ایمان نے نہایت دیانت داری کے ساتھ رقم کر دیا کہ "ہم صرف تاحیات خریداروں کی تخلیقا
ائع کرتے اور ان ہی کی تصنیفات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ غیر خریدار کی نہ تخلیق ہی شائع کی جاتی ہے اور نہ اس کی تصنیف پر
ن قسم کا تبصرہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آئندہ کتاب بھیجنے سے قبل ہماری خریداری قبول فرمالیں۔"
ایک بھولے بھالے مدیر نے یوں الفاظ کے موتی بکھیرے "آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف کے دو نسخے موصول ہوئے
شکریہ۔ دو اور نسخے ممتاز شاعر "یحییٰ یاشے معروف" کو بھیج دیجئے۔ ہم صرف ان ہی سے تبصرے کراتے ہیں۔
ں گرانقدر تصنیف کے مزید دو نسخے مشہور نقاد اور عالم سیاست داں و سائنسداں کرّا یا محمد کریم صاحب کو روانہ کر دیجئے
صرف کا شمار عجائبات ادب میں ہوتا ہے۔ انھیں زبان و بیان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ تبصرہ کرنے کے علاوہ
پ کی تصنیف کو صحیح ہاتھوں میں پہونچانا ہمارا اولین فرض ہے۔ البتہ مجھے کرنل محمد خاں کی کتاب "بجنگ آمد" کی چار جلدیں
لاری کولنز و ڈومینک لاپیر کی فریڈم ایٹ مڈ نائٹ (FREEDOM AT MID NIGHT) کی چند جلدیں روانہ فرمادیجئے
پکا تبصرہ کر دیا جائے گا۔
متذکرہ باتیں تو مختلف رسائل و جرائد کی پالیسیوں اور ہلکی پھلکی شرائط کی غماز تھیں۔ چند شریف النفس مدیران
تبصرہ کی نعمت سے بھی سرفراز کیا۔ اظہار تشکر گذاری کے لئے ہمیں آج تک موزوں الفاظ نہیں مل سکے۔ ہدیہ تشکر کے طور
صرف آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔
چنانچہ "پرکھ" کے زیر عنوان ایک نقاد نے یوں فصاحت کے دریا بہائے۔ "نہ جانے مدیر با تدبیر نے کیا سوچ
اور کس موڈ کے تحت مجھ باٹنی کے پروفیسر سے ادبی کتاب پہ تبصرہ کرنے کی خواہش کی۔ ہو سکتا ہے کہ اردو شاعرہ
میرے والہانہ لگاؤ کے پیش نظر انھیں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہو۔ جب کتاب مجھ تک پہنچ ہی گئی ہے تو اس کے بارے
کچھ نہ کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ اس لئے چند سطور سپرد قلم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ پوری کتاب میں کہیں بھی پھول
ں کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ لگتا ہے مصنف نے آج تک پھول پتے دیکھے ہی نہیں۔ ظالم نے کسی پھل یا سبزی کا نام لینا تک
ا نہ کیا۔ کبھی کبھی پھول کا پتوں کا ذکر بھی ہوتے رہنا چاہیئے۔
البتہ کتاب کا سرورق مجھے بے حد پسند آیا۔ ہو بہو نیلی کلوروفائی سی (CHLOROPHYCEAE) کے مکن و الانکس
کے (T.S.) سکشن جیسا ہے۔ اتنا واضح خاکہ میں نے کسی باٹنی کی کتاب میں بھی نہیں دیکھا۔
میری ناچیز رائے ہے کہ مصنف ادبی مضامین لکھ کر وقت برباد کرنے کے بجائے باٹنی کی کتابیں لکھنے کا سلسلہ
روع کر دے تو بیشتر کسانوں اور طالب علموں کا بھلا ہوگا۔
ایک صاحب نے چاروں نگارشات کرانچی کسوٹی پر یوں کسا کہ مصنف کے مضامین میں نہ پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس کا
طنز ہے اور "انشائیہ" جیسی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس نے مرکیز جیسا سادہ انداز تحریر بھی اختیار نہیں کیا۔ ادیبا
ستی اور کاہلی ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے ہندوستانی ادیب ین۔ سی۔ چودھری کا مزاحیہ تحریروں سے بھی کوئی استفادہ نہیں
اری تخلیقات اس کے اپنے ناقص ذہن کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں جو مجنونانہ باتوں سے کسی طرح کم نہیں۔

مصنف کو مغربی اور اُردو کے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے اور دیگر ممتاز ادیبوں کے مضامین پڑھنے کے بعد ویسا ہی لکھنا شروع کردینا چاہیئے۔

ایک صاحب نظر نے خادم کی تعریف کے پُل باندھے ہے۔ "میں ملزم کو عرصہ سے جانتا ہوں (شاید مصنف کے بجائے ملزم لکھ گئے ہوں) جہاں تک میری وسیع معلومات کا تعلق ہے۔ مصنف غیر شادی شدہ ہے اور عرصے سے مجرّد زندگی بسر کررہا ہے لیکن ایک مضمون میں اس نے اپنی بیوی کا ذکر کیا ہے۔ آخر قصہ کیا ہے۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے نیز اس سفید جھوٹ کی روشنی میں ہم کتاب میں کہی گئی مصنف کی کسی بات کا بھروسہ نہیں کرسکتے لہٰذا اسے پڑھنا ہی فضول ہے۔

اب سرورق پہ آجایئے۔ یہ نہ خوبصورت ہے اور نہ ہی اسے بدشکل کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے اچھا ٹائیٹل بنایا جاسکتا تھا۔ کتابت نہ اچھی ہے اور نہ بُری کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سے عمدہ کتابت ممکن تھی۔ قیمت نہ زیادہ ہے اور نہ کم ہے لیکن کچھ کمی بیشی کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ صرف جلد سازی ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے جس سے مصنف کے اصل رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ اس کو اسی صنف یعنی 'جلد سازی' میں طبع آزمائی کرنی چاہیئے۔

ان تبصروں کو پڑھ کر جب ہمارے اوسان خطا ہوگئے تو ہم نے فوراً ماتقی ایڈیٹروں کو ہماری کتاب پر تبصرہ نہ کرکے شکرگذار بنانے اور پہلی فرصت میں کتابیں لوٹا دینے کا مطالبہ کردیا۔۔۔۔

★

کرگس سہسوانی

"جمشید پور" ـــــ

بھائی نے بھائی کو لیا ہے لوٹ ؟ یہ خبر جھوٹ اور بالکل جھوٹ
بچے، غنڈوں کو مل گئی ہے چھوٹ ؟ یہ خبر جھوٹ اور بالکل جھوٹ
لاکھ اخبار کچھ لکھیں کرگس میرے نیتا تو کچھ نہیں کہتے
اقلیت کو کیا گیا ہے "شوٹ ؟" یہ خبر جھوٹ اور بالکل جھوٹ

"جمشید پور اور پٹنہ" ـــــ

اک طرف تو قتل اور غارت گری کا زور ہے
اک طرف ٹھاکر ہے کرسی چھین لینے کا پلان
اقلیت سب ہو گئی بے جان میرے شہر کی
پھر بھی اخبارات میں آیا نہ نیتا کا بیان

"ونوبا" ـــــ

نیتا نے کبھی ہند کے ایسا نہیں سوچا
ہو جب بھی کسی جا پہ تعصب کا دھماکا
انسان کی خاطر بھی کوئی رکھے مروت
ایسا بھی کوئی ملک میں پیدا ہو ونوبا

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آپس میں سب بھائی بھائی
اِسی لئے ہے ملک میں رائج بلوہ، جھگڑا، مار، کٹائی

غزل

جوہر بھارتی (پٹیالہ)

کولہو اگر چلاتے وہ پیپل کی چھاؤں میں سرسوں کا تیل ہم بھی لگاتے جٹاؤں میں
چاندی کا بھاؤ تیز ہے، پازیب کی جگہ باندھیں گے اب وہ ٹین کی جھانجھر جو پاؤں میں
کوئل کی کوک میں بھی نہیں اس قدر مزہ جو لطف آرہا ہے تری کاؤں کاؤں میں
چڑیا نے ان کو ٹانگ اٹھا کر گرا دیا! ہاتھی جو کھیلتے تھے کبڈی بھاؤں میں
چھاتا لئے وہ ٹھیک دوپہری میں آمرے وعدہ تو تھا کہ آئیں گے [illegible]
بستی کے سامنے کوئی ٹاپک نہ چھیڑیئے
جوہر وہ کافی بھونک چکے ہیں سبھاؤں میں

صنعتوں کا کلیدی کردار

ملک کے قلب میں واقع آندھرا پردیش کو قدرت نے وافر مقدار میں وسائل عطا کئے ہیں۔ تاریخ نے اس ریاست کے دارالخلافہ کو آفاقی اور مشترکہ تمدن دیا ہے جس میں زمانۂ ماضی کی بو باس بھی ہے اور عصری صنعتی دور کے لئے اساس بھی۔ آندھرا پردیش اُمیدوں اور اُمنگوں کی سرزمین ہے۔

اوسط اور بڑی صنعتیں جو تعداد میں ۲۶۰ ہیں اور جن میں ۲۷۸ کروڑ روپیوں کی متاثر کن مقدار سرمایہ مشغول ہے۔ ریاست کے صنعتی چہرے مہرے کے نکھار میں مصروف عمل ہیں۔ گذشتہ چار برسوں کے دوران ادارہ جاتی مالیہ سے استفادے میں چار گنا اضافہ عمل میں آیا ہے۔ کاکیناڈا میں ۲۳۲ کروڑ روپے لاگت والی جس فرٹیلائزر فیکٹری کا سنگ بنیاد ۷/ جولائی ۱۹۷۸ء کو صدر جمہوریہ نے رکھا تھا وہ ۱۹۸۱ء میں پیداوار دینا شروع کردیگی۔

ترقیاتی کارپوریشنز جیسے آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (اے پی آئی ڈی سی)۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ فینانشیل کارپوریشن۔ آندھرا پردیش انڈسٹریل انفرا اسٹرکچر کارپوریشن (اے پی آئی آئی سی) ان تمام برسوں کے دوران ریاست میں متوازن علاقہ جاتی ترقی کے سلسلے میں کلیدی کردار ادا کرتے آرہے ہیں۔

D.G.I & P.R. No. 47

معین اعجاز

مناسب قیمت پر مضمون خریدیئے

کچھ فرسٹریٹیڈ قسم کے سرپھروں نے یہ فیصلہ کیا کہ "چھوٹی صنعت" کے نام پر حکومت سے قرض لے کر ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں ہر قسم کی غزلیں، نظمیں، مضامین، خطبۂ صدارت، سہرے، مرثیئے، قصائد اور مختلف مواقع کی تقریریں ڈھلوائی جائیں اور انہیں مناسب قیمت پر فروخت کیا جائے۔ ایسا اس لیے ضروری ہے کہ "لوکل" قسم کے شاعروں اور ادیبوں میں پڑھنے سے زیادہ لکھنے اور لکھنے سے زیادہ چھپنے کا رجحان تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو ضرورت مند شاعروں اور ادیبوں کو ایک سنہری موقع ہاتھ آئے گا اور نوآموز بعض لیڈر بھی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس ادارے کا طرۂ امتیاز یہ ہو گا کہ کوئی بھی گاہکوں کے نام نہیں ظاہر کیے جائیں گے یعنی جو شاعر، ادیب یا لیڈر اس تنظیم سے کاروبار کرے گا۔ اس کی عزت و آبرو کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا اور اس کا نام ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے گا۔ لیکن دوسری شرائط خاصی سخت ہوں گی۔ مثلاً ہر شاعر یا ادیب کو اس کی صلاحیت اور مرتبے کے مطابق ہی اسے غزل یا مضمون مہیا کیے جائیں گے۔ کسی بھی مبتدی یا نئے شاعر کو "اے" کلاس کی کوئی چیز نہیں دی جائے گی۔ فن کاروں کو کم از کم تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ "اے" کلاس، "بی" کلاس اور "سی" کلاس۔ نئے لکھنے والوں کو ایک نشست میں بیٹھنا ہو گا۔ جو اس معیار پر پورا اترے گا وہ "سی" کلاس کی چیزیں خریدنے کا مجاز ہو گا کچھ دنوں تک اسے اس قسم کی چیزوں پر کام چلانا ہو گا پھر وہ بتدریج آگے بڑھتا جائے گا۔ اور اسی کے مطابق اس کی تخلیقات کا معیار بھی بڑھتا جائے گا۔

شرائط کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہو گی وہ یہ کہ کبھی ادارے سے اپنی تخلیقات خریدنے والے کی [illegible] پہچان بھی کبھی ظاہر نہ کی جائے گی۔ (سیاسی لیڈروں کے لیے البتہ ایسی شرط نہیں ہو گی) جہاں کہیں شاعر یا ادیب کی نشست ہو گی اس ادارہ مذکورہ کا کوئی نہ کوئی خفیہ نمائندہ شرکت کر رہا ہو گا کہ اس کا کام [illegible] زبان اور تلفظ کی غلطیاں [illegible]

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ اپنے اساتذہ سے لکھاتے تو صحیح ہیں لیکن پڑھتے غلط ہیں۔ غرضیکہ اس ادارے کا کام مبتدیوں کو صحیح معنوں میں فن کا رہنا نا ہوگا۔ جس طرح ڈاکٹر مریضوں کو ان کی بیماری کے مطابق دوا اور ٹانک استعمال کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اسی طرح اس ادارے سے رجوع کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کو اساتذہ کے دواوین اور مستند تصنیفات پڑھنے کی تلقین کی جائے گی تاکہ وہ ان کو فراہم کی گئی تخلیقات کے اہل ثابت ہو سکیں۔

شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ بعض لیڈروں اور وزیروں کو بھی حسب ضرورت تقریریں اور خطبۂ صدارت بھی سپلائی کیے جائیں گے کیونکہ لیڈروں کو اچانک کسی جلسہ میں تقریر کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کی قیمت دگنی وصول کی جائے گی۔ آئے دن وزیر اور لیڈروں کو مختلف قسم کے جلسوں میں مدعو کیا جاتا ہے اور ان سے موقع کی مناسبت سے تقریر کرائی جاتی ہے۔ بے چارے بعض نادار قسم کے وزیروں کا یہ المیہ ہوتا ہے کہ وہ غلط تاریخی حوالے دے کر جان بچاتے ہیں۔ لیکن بعد میں ان کی بڑی بدنامی ہوتی ہے۔ جب وہ اس ادارے سے تقریریں لکھوائیں گے تو انہیں اس قسم کا کوئی خدشہ لاحق نہیں ہوگا کیونکہ یہ تقریریں ماہرین سے لکھوائی جائیں گی۔

بعض شاعر اور ادیب اپنا "مقام" منوانے کے لیے کسی با اثر وزیر کو اپنی کتاب کی رسم اجرا کے موقع پر مدعو کرتے ہیں۔ ظاہر ہے بے چارے وزیر کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ وہ کتاب پڑھے اور تقریر کی تیاری کرے۔ ایسی حالت میں اگر وہ چاہے تو کم از کم اڑتالیس گھنٹے پیشتر اس ادارے میں کتاب جمع کر کے سیر حاصل مضمون یا تقریر لکھوا سکتا ہے۔ طرحی غزلوں کے خریدار بھی مصرعہ طرح پہلے سے دیدیں تو انہیں وقت مقررہ پر غزل مل سکتی ہے۔ یوں تو تقریباً تمام مستند اساتذہ کی اہم زمینوں پر پہلے سے متعدد غزلوں کا اسٹاک موجود ہوگا۔

ہر مکتبۂ خیال سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں کو ہر موقع کی تقریریں ریڈی میڈ میٹریل مل جائیں گی مثلاً الیکشن سے پہلے کی تقریر جس میں وعدوں کا طویل سلسلہ ہوتا ہے۔ وزیر بننے کے بعد کی تقریر جس میں ہر خرابی کی ذمہ داری گزشتہ حکومت کے سر ڈالی جاتی ہے۔ حکمراں جماعت کے لیڈروں کے لیے تقریر جس میں حکومت کے غلط اقدام کو بھی حق بہ جانب قرار دیا جاتا ہے۔ اپوزیشن لیڈر کے لیے تقریر جس میں حکومت کے اچھے کاموں میں بھی کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ قومی ایکتا پر تقریر۔ فرقہ پرستی کو فروغ دینے کی تقریر۔۔۔۔ غرضیکہ ہر موضوع پر ہر چیز آسانی سے دستیاب ہوگی!

نادار اور مسکین شاعروں کو رعایتی قیمتوں پر بھی تخلیقات مل سکیں گی۔ جو بہت زیادہ غریب ہوں گے۔ انھیں یہ رعایت حاصل ہوگی کہ وہ اپنی غریبی کا سرٹیفکٹ پیش کر کے مفت غزل یا نظم حاصل کر سکیں گے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بعض اساتذہ کے لیے بھی کچھ پروگرام شروع کیے جائیں گے۔ مثلاً یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل منظومات اور نثر پاروں کی تشریحات اور نوٹ تیار کر کے انھیں مناسب قیمت پر دیا جائے گا تاکہ وہ بازار کی سستی اور نقلی قسم کی چیزوں اور نثر حل سے پرہیز کر سکیں۔

نوٹ: ہر طرح کی تخلیقات کے لیے یہ ایک shop price fixed ہوگی۔ آزمائش شرط ہے۔

ظہیر الحق، ایم اے

زوجۂ محترمہ

نوٹ: زیرِ نظر مضمون مکمل ہونے کے بعد ہم نے "تاشقند اسپرٹ" کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے سب سے پہلے خود اپنی زوجۂ محترمہ کے سامنے مطالعہ کے لیے رکھا۔ انھوں نے ایک شرط پر اس کی اشاعت کی اجازت دیدی کہ وہ بھی "شوہرِ نامدار" کے عنوان سے ہمارے بارے میں ایک مضمون لکھیں گی۔ موصوفہ کا مضمون ابھی مکمل نہیں ہوا ہے اور ہماری یہ دعا ہے کہ یہ مضمون کبھی مکمل نہ ہو، ورنہ عجب نہیں کہ نرم مزاجی اور خوش اخلاقی کے سلسلہ میں ہم نے اب تک جو کچھ بھی نام کمایا ہے اس پر پانی پھر جائے۔

آج سے تقریباً پندرہ سال قبل جب ہم نے وقتِ نکاح بھری محفل میں قاضی صاحب کے سامنے "قبول کیا۔ میں نے" کہا تھا تو اس سے ہماری درپردہ مراد یہی تھی کہ ہم نے اپنی نئی نویلی دلہن کو اس کی تمام برائیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کیا۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ اپنی دلہن کے مزاج کے تعلق سے ہم نے نکاح کے دن ہی جو اندازہ قائم کئے تھے وہ بڑی حد تک صحیح تھے۔ شادی کے بعد پانچ چھ دنوں تک ہماری دلہن صاحبہ کا نہ صرف چہرہ گھونگھٹ میں رہا بلکہ ان کے مزاج کی گرمی، زبان کی تیزی اور آواز کی گھن گرج بھی گھونگھٹ کے اندر سے کمسناتی رہی اور پانچ چھ دن بعد جب انھوں نے اپنا گھونگھٹ اٹھا اور مزاج کی تیزی کے چند نمونے بتلانے لگیں تب ہم نے ایسا محسوس کیا جیسے انھوں نے گھونگھٹ کے ساتھ ہماری زندگی کا بازو بھی الٹ کر رکھ دی۔ چونکہ ہم نے بھری محفل میں "قبول کیا میں نے" کہا تھا اس لیے اس قبولیت کو قبولیت عطا کرنا بہر حال ضروری تھا۔ چنانچہ ہم نے طے کر لیا کہ اپنی دلہن کے مزاج کی گرمی اور زبان کی تیزی دونوں کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتے رہیں گے اور وہ بھی اس طرح کریں گے کہ ہماری شرافت اور رواداری کا احساس ان کی زندگی کے ہر موڑ ہر منزل پر پہلے سے کہیں زیادہ ہوتا رہے۔

اپنے شوہر اور سسرال والوں پر رعب جمانے اور انھیں اپنے کنٹرول میں لینے کے لیے انھوں نے پہلے گھر کی ماما پر رعب جمانا شروع کر دیا۔ بات بات پر وہ اسے ڈانٹتیں اور ہر بات پر اسے ٹوکا جاتا۔ کبھی سالن میں نمک کم ہونے کا شکوہ ہوتا تو کبھی مرچ کے زیادہ ہو جانے کا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ ڈانٹ ڈپٹ ہمیشہ کھلے گلے کے ساتھ ہوتی اور اس طرح ہوتی کہ اڑوس پڑوس کے بچے اپنے بڑوں کی ہدایت پر صحیح صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ہمارے گھر آتے۔

بڑی مغفرت وغیرہ کچھ کہہ دیتیں تو ان کا پارہ اور چڑھ جاتا احساس کا ابال ذکر دل پر نکلتا یا گھر کے برتنوں پر۔ اس طرح غصہ کا اظہار وہ اس انوکھے انداز سے فرما کر اپنے دل کی تسکین کا سامان تو کر لیتیں لیکن آج کے غصہ کے ساتھ ساتھ ان کی طرف سے جو نقصانات کے بوجھ کو بھی ہمیں ہی برداشت کرنا پڑتا۔ بہر حال اپنی زوجہ محترمہ کے غیض و غضب ان کی جا و بے جا تنقیدوں اور تلخ و ترش جملوں کی بوچھار کا ہم "فاسٹ بولنگ" بلکہ "بمپر" سے کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ ہم نے ایک کامیاب بیٹسمین کی طرح مقابلہ کیا اور کبھی بھی ان کے ہاتھوں "کیچ آوٹ" نہیں ہوئے ـــــ

اگر آپ شادی شدہ ہیں تو آپ کو بھی بیوی کی فضول خرچیوں سے ضرور واسطہ پڑا ہوگا اور اس کے نتیجہ میں شوہر کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا احساس بھی آپ کو ضرور رہا ہوگا۔ بیوی اگر قبول صورت ہو تب بھی وہ آرائش پر کچھ نہ کچھ خرچ کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ سینما ہفتہ میں ایک بار اور شوہر اگر نرم مزاج ہو تو دو بار ضرور دیکھا جاتا ہے۔ سہیلیوں کی دعوتیں بھی وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں۔ بچوں کی سالگرہ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی ضرور منائی جاتی ہے۔ اگر بچوں کی تعداد زیادہ ہو تو ہر دوسرے یا تیسرے مہینے کسی نہ کسی بچے کی سالگرہ آ ہی جاتی ہے اور شادی بیاہ کے دعوت نامے تو مرے پر سو دُرّے کا کام کرتے ہیں۔ شادی بیاہ یا دیگر تقاریب میں مع اہل و عیال شرکت کے ہم ہرگز خلاف نہیں ہیں بلکہ ایسی کسی بھی دعوت میں ہم بہ خوشی شریک ہوتے ہیں کیونکہ اس سے خاندان کے بہت سارے افراد سے ملنے ملانے کا ایک موقع نکل آتا ہے۔ لیکن شادی کی ہر دعوت میں نئے کپڑوں کا مطالبہ ہمارے لیے بہت پریشان کن ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مطالبوں سے شوہر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اعصاب کا بلڈ پریشر بھی کسی قدر بڑھ جاتا ہے۔ ایک تقریب میں پہنے ہوئے کپڑے اگر کسی دوسری تقریب میں پہن لیے جائیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ رشتہ دار اور سہیلیاں وغیرہ اگر تنقید کرتی ہیں یا طنز فرماتی ہیں تو انھیں ایسا کرنے دیجیے۔ ایسا کرنے سے خود ان کی "اعلیٰ ظرفی" کا مظاہرہ ہوگا۔ ہمارا تو کچھ جائے گا نہیں ـــــ اور پھر یہ کہ آدمی بڑا ہوتا ہے۔ کردار کی بلندی سے اعلیٰ معیار کی ڈریسنگ آدمی کو اعلیٰ نہیں بناتی لیکن ہماری زوجہ محترمہ کے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھتی ـــــ پہننے پہنانے کے معاملے میں ہم نے ان کے سامنے کئی بار خود اپنی زندہ مثال پیش کی ہے کہ کس طرح دو بشرٹس اور دو پتلونوں پر مکمل ایک سال گزار دیا اور اس ایک سال میں نصف درجن شادی کی دعوتوں کے علاوہ عقیقہ اور تسمیہ خوانی کی بے شمار دعوتوں میں شرکت کی لیکن کسی نے بھی ہمارے لباس پر تنقید نہیں فرمائی۔ محترمہ کو مزید متاثر کرنے کے لیے لباس کے علاوہ ہم نے اپنے جوتوں کا بھی ذکر کیا جنھیں آج سے ٹھیک پانچ سال قبل خریدا گیا تھا۔ درمیان میں وہ کئی بار خراب بھی ہوئے اور ریپیر (REPAIR) بھی ہوئے اور موجودہ سال کی آخری ریپیرنگ کے بعد موچی نے ہم سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ان جوتوں کی آخری ریپیرنگ ہے کیونکہ بار بار کی ریپیرنگ نے ان کے اوریجنل (ORIGINAL) شیپ (SHAPE) کو کافی بگاڑ دیا ہے۔ اس لیے آپ پھر ایک بار انھیں ریپیرنگ کے لیے نہ لائیں تو مناسب ہے ـــــ یہ سب مثالیں ہم اپنی زوجہ محترمہ کے سامنے وقتاً فوقتاً اس لیے پیش کرتے تاکہ وہ ہماری زندگی سے سبق لیں اور جس قدر ہو سکے ظاہری آن بان اور فضول خرچیوں سے احتراز کریں اور حتی المقدور پیسہ بچانے کی کوشش کریں تاکہ برے وقت میں ہمیں کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہ آئے لیکن شوہروں کی کارآمد اور بہترین باتوں کو کس "نصف بہتر" نے سنا ہے جو سنیں گی۔

یونان کا شہرۂ آفاق فلاسفر و مفکر افلاطون ہر میدان میں ہم سے بلند تر سہی لیکن اس میں اور ہم میں ایک قدرِ مشترک

ایسی ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتی ہے۔ اصل وجہ یہ کہ ہماری طرح افلاطون بھی اپنی زوجہ محترمہ سے بے حد نالاں تھے۔ دماغی سکون انھیں بھی حاصل نہ تھا اس لیے افلاطون زندگی کی ہر منزل اور ہر موڑ پر بیوی کو بھلا اور خدا کو بعد میں یاد کرتا تھا۔ بیویوں کی یار لوگوں نے کئی قسمیں بتائی ہیں لیکن اپنے مشاہدات اور ذاتی تجربات کی روشنی میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بیویوں کی دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں :

ا۔ سکون دینے والی بیوی

ب۔ سکون لوٹنے والی بیوی

اب یہاں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ افلاطون کی محترمہ اور ہماری زوجہ محترمہ دونوں کا شمار زمرۂ "الف" میں ہوتا ہے یا زمرۂ "ب" میں ———

ایک مغربی مفکر سے کسی نے شادی کے بارے میں اس کی رائے دریافت کی اور دریافت کرنے والے کو یقین تھا کہ موصوف شادی کی مخالفت میں رائے دیں گے۔

لیکن اس مغربی مفکر نے شادی کی تائید میں رائے دی اور کہا کہ میں ہر لحاظ سے شادی کے موافق ہوں کیونکہ بیوی اگر مرضی کے مطابق ملتی ہے تو زندگی بڑے ہی پرسکون انداز میں گزر جاتی ہے اور اگر بیوی خراب ملتی ہے یا مرضی کے مطابق نہیں ملتی تو اس کا ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شوہر کچھ نہ سہی فلاسفر ضرور بن جاتا ہے ——— یوں سمجھئے کہ ہم بھی یا تو فلاسفر بن چکے ہیں یا فلاسفر بننے کی منزل میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارے تمام ساتھیوں اور ہمدردوں غرض سب سے ہماری گزارش ہے کہ وہ جب بھی فرصت ملے ہماری جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ دماغ کی مکمل سلامتی کے لیے بھی خلوص دل سے دعا فرمائیں ———

قطعات

محبوب راہی

وہ شاعر جو اسٹیج پہ گا رہا تھا
دوبارہ ذرا اس کو آواز دینا
ڈھول ہو کہ سارنگی یا بنسری ہو
غزل جب وہ چھیڑے مجھے ساز دینا

خوشہ چینی چمن سے اوروں کے
سخت بے غیرتی ہے چوری ہے
میں بہ بانگِ دہل یہ کہتا ہوں
یہ سراسر حرام خوری ہے

ہے ہر مشاعرہ میں میری مانگ ان دنوں
جس میگزین میں دیکھئے بس چھپ رہا ہوں میں
بازار کا ہوں مال میں جنسِ گراں نہیں
بکتا ہوں کوڑی مول بہت کھپ رہا ہوں میں

نام میرا ہے سارق الدولہ
اور تخلص ڈزاف کرتا ہوں
میر تا فیض جتنے شاعر ہیں
ہاتھ میں سب پہ صاف کرتا ہوں

کچھ نئے لفظ ڈال دیتا ہوں
کچھ پرانے نکال لیتا ہوں
داغ و مومن کی فکر کے پیکر
اپنے سانچوں میں ڈھال لیتا ہوں

لوگ جھکتے ہیں جھکاؤ پیارے
نام اور مال کماؤ پیارے
کیا ضروری ہے کدِ فکرِ سخن
صرف سُر تال میں گاؤ پیارے

تضمین بر غزلِ غالب

نقیب اکولوی

نگارِ چلم کا جو دم دیکھتے ہیں
نظر جو دآئے وہ ہم دیکھتے ہیں
جو سکے جو نشے کو بجام دیکھتے ہیں
"جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں"

مرے درد کو پوچھ بگ سے بٹل سے
حکیموں کے [illegible] دل سے
پتہ مرض کا لے دواؤں کے بل سے
"سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں"

وہ آئینہ جو خود ہے جنوں کی عادی
تمہیں کیا بتلائے گا بیوٹی تمہاری
کبھی خود کو دیکھو نظر سے ہماری
"تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں"

ہے اہلِ کرم کا عجب کیس غالب
کرم میں دیا کچھ جواب [illegible] غالب
دکھاتے ہیں وہ [illegible] غالب
"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں"

شیخ محمد صہبا
ہنگولی

ابتداءً ہماری بیگم صاحبہ نے جب اس بات کا اظہار
تھا کہ وہ نہ صرف شاعری کا ایک اچھا خاصا ذوق رکھتی ہیں بلکہ
قع کے لحاظ سے کبھی کبھار طبع آزمائی بھی کر لیا کرتی ہیں تو یہ سن کر
ہمیں بے انتہا مسرت ہوئی تھی کہ چلو خود تو باوجود لاکھ کوشش
شاعر نہ بن سکے کم از کم ایک شاعرہ کے شوہر تو بنے۔ لیکن ع
"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"
کے مصداق جب بیگم صاحبہ کی شاعری نے اپنے گل کھلانے
شروع کئے تو ہمارا جینا دوبھر ہو کر رہ گیا۔ اسے آپ خوشگوار
ازدواجی زندگی کی ٹریجڈی ہی کہہ لیجئے جو شروع شروع میں ہم
کچھ از راہِ ستم اور کچھ بیگم کی حوصلہ افزائی کی خاطر ان کی شاعری
بجاسں کو نہ صرف زہر ہلاہل کیا بلکہ باقاعدہ ان کی شاعری سے دلچسپی
لینے لگے لیکن ہمیں یہ دلچسپی اس قدر مہنگی پڑی کہ ہمارا سارا ذہنی
سکون اس دوستی کی بھینٹ ہو کر رہ گیا۔

بیگم صاحبہ کے تخلیقی عمل میں حیرت انگیز تیز رفتاری کی
بڑی وجہ دراصل یہ تھی کہ جب ہم آفس کے لئے گھر سے صبح روانہ
ہو جاتے تو سوائے شام کے گھر واپس آنے کا اور کوئی
موقع ہی ہاتھ نہ آتا۔ اس دوران ہماری بیگم مکان میں
تنہا ہی ہوتیں۔ چنانچہ پہاڑ سا دن اور تنہائی۔ لہذا
بڑے اطمینان سے بیگم کی شاعری ہمارے مکان ہی میں
پروان چڑھتی رہی۔ اس کے علاوہ جب بیگم کی شاعری
زبردستی ہی ہمارے حواس پر بُری طرح مسلط ہوتی چلی
گئی تو ابتداً ہمیں بیگم سے اور بعد میں گھر سے وحشت سا
محسوس ہونے لگا اور ہم گھر سے جتنا ممکن ہو دور رہنے
کی کوشش کرنے لگے چنانچہ گھر سے ہمارا یہ گریز بھی بیگم کی
شاعری کے ارتقاء میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ گھر سے

قدر کی وجہ دراصل یہ تھی کہ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد آفس سے جب ہم تھکے تھکائے گھر لوٹتے تو بیگم کی نظریں بڑی بے چینی سے ہماری منتظر رہتیں اور صرف منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے تک ہی بیگم اپنی دو تین نئی غزلیں سنا چکی ہوتیں۔ خالی پیٹ بیگم صاحبہ کی دو چار غزلیں زہر مار کر لینے کے بعد بھلا کس کمبخت کو بھوک باقی رہتی لیکن بیگم کے بے حد اصرار پہ کسی طرح دو چار نوالے اور پھر مزید دو چار لقمے زہر مار کر ہی لینا پڑتا ہے اور تب جا کر کہیں یہ بات ہماری سمجھ میں آتی کہ آخر بکرے کو ذبح کرنے سے قبل پانی کیوں آفر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ گھر سے ڈر لاشعوری طور پہ ہمارے حواس پر مسلط ہو گیا اور ہم گھر جانے کے بجائے جہنم میں جانا زیادہ پسند کرنے لگے۔

بیگم صاحبہ کی شاعری نے ہمارے ذہنی سکون کے علاوہ جن چیزوں پہ اپنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اُن میں سب سے پہلا نمبر بے چارے سالن کا ہے۔ بیگم صاحبہ چاہے باورچی خانے میں ہوں یا حمام میں، ان کی فکری پرواز کے درمیان کوئی مادی شئے مطلقاً حائل نہیں لہٰذا حال یہ کہ اِدھر چولہے پر دال بگھاری جا رہی ہے کہ ادھر ایک شعر پیدا ہوا اور بیگم صاحبہ اپنی بیاض کی طرف لپکیں۔ بھاڑ میں جائے وہ دال ——— اور پھر تخلیقی معاملے میں ہماری بیگم صاحبہ فطرتاً اتنی کنجوس بھی واقع نہیں ہوئیں کہ بس آسی ایک شعر پہ قناعت کر کے فوری دال کی طرف متوجہ ہو تیں بلکہ پہلے پہل تو وہ یہ دیکھنے کی کوشش کریں گی کہ آیا اس بحر میں اور اس زمین میں ایک عدد غزل ممکن ہے۔ یا پھر کم از کم اسی موضوع کا مزید ایک شعر مل سکتا ہے تاکہ قطعہ مکمل ہو۔ جس طرح آج چلہ ایک پیسے کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں اور فقیر بھی اُسے آسانی سے قبول نہیں کرتا، اُسی طرح ہماری بیگم کے نزدیک بھی صرف ایک شعر کو کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ آخر کار کھانے کے دوران جب دال کی بدمزگی کا دبے لفظوں میں تذکرہ ہوتا ہے تو ان کا یہ فلسفیانہ استدلال ہوا کرتا ہے دال درحقیقت انسان کی ایک مادی ضرورت ہے اور شاعری ایک روحانی ضرورت۔ دال اور شاعری میں ترجیح بہرحال شاعری کو دینا چاہئے کہ چلو دال بگڑ گئی تو کیا ہوا ایک خوبصورت غزل تو ہوئی۔

بیگم کی شاعری سے ہماری معیشت بھی بڑی حد تک متاثر ہوئی ہے کیونکہ ہمیں ان کی شاعری پر اصلاح کی غرض سے ایک استاد جو مقرر کرنا پڑا۔ استاد کے تقرر کا وعدہ چونکہ ہم نے ہنی مون کے زمانے میں کیا تھا اس لئے ابھی تک بادلِ ناخواستہ نبھانا ہی پڑ رہا ہے۔ اگرچہ مہنگائی نے ہماری کمر توڑ کر رکھدی ہے لیکن استاد کا تقرر جوں کا توں برقرار ہے اس لئے وہ کھوسٹ استاد ہماری نظروں میں بڑا کھٹکتا ہے۔ جی میں آتا ہے اس کی گردن دبوچ لیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

صرف ایک استاد کے تقرر پر ہی اکتفا کر لی جاتی تو کوئی بات بھی تھی لیکن شاعری کی مادی ضروریات اتنی محدود نہیں۔ شاعری کی اوّلین ضرورت سامعین کا پیدا کرنا ہے۔ اگر اتفاق سے خواہ مخواہ داد دینے والے سامعین مل جائیں تو اور بھی اچھا ہے۔ دوسری ضرورت اخباروں اور ماہ ناموں کے ایڈیٹر حضرات سے دوستی پیدا کرنا ہے تاکہ کلام بے چوں و چرا شائع ہوتا رہے چنانچہ ہمیں بھی ان خطرناک مراحل سے گذرنا ہی پڑا۔ اگرچہ ابتداءً ہمارا شمار بھی سامعین کی فہرست میں ہوا کرتا تھا لیکن بعد میں شاید کیا ایک بیگم نے یہ محسوس کیا کہ ان کی شاعری ہمارے ذہنی معیار کی سطح سے کافی بلند ہو گئی ہے لہٰذا انہیں

مشاعرے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ گھر پر مشاعرے کا باقاعدہ اہتمام کیا جانے لگا جس میں عموماً شاعر حضرات کم اور سامعین زیادہ مدعو کرنے پر زور دیا جاتا۔ گھر پر مشاعرے کے اہتمام نے ہماری معیشت کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ ہماری فکر آمدنی اور خرچ میں توازن پیدا کرنے کی جد و جہد میں بڑھتی ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ نتیجتاً ہم گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بالآخر تنگ آکر ہم نے اپنے گھر پر مشاعرے کا اہتمام کرنا بند کر دیا۔ اور بیگم کو مشاعروں میں شرکت کرنے کی باقاعدہ اجازت دیدی۔ بالفاظ دیگر ہم نے ہماری بیگم کو اس بات کی اجازت دیدی کہ بیشک وہ اپنے جلوؤں سے بزم مشاعرہ کو رنگین بنا سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ بات ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ جس طرح ایک خوش گلو شاعر ترنم کا سہارا لے کر ناقابل داد کلام پر بھی داد حاصل کر لیتا ہے اسی طرح ہماری بیگم کو مشاعرے کے اسٹیج پر ان کے کلام کی نہ سہی ان کے حسن کی داد ضرور مل جائے گی۔ یوں بھی جب کسی مشاعرے میں کوئی خاتون غزل سرا ہو اور سامعین ہر شعر پر بھی مچل مچل کر داد دے رہے ہوں تو ہر شریف آدمی کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوا کرتا ہے کہ داد آخر کس چیز کی دی جا رہی ہے۔

جب سے بیگم صاحبہ نے مشاعروں میں شرکت کرنی شروع کی، ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے اچانک دنیا میں ہماری قدر و منزلت بڑھ گئی ہو۔ حالانکہ ہماری حیثیت جوں کی توں قائم تھی۔ پتہ نہیں اس کے پیچھے بیگم کی شاعری کار فرما تھی یا ان کے جلوے۔ بہرحال اس سے ہوا یہ کہ ہماری انا جو ابھی تک نہ جانے کہاں سو رہی تھی، اچانک بیدار ہو گئی اور بیدار ہوتے ہی اس نے اس تمام تر فساد کی جڑ بیگم کی شاعری کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور ہم بیگم کی شاعری کے خلاف بھوک ہڑتال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ "ہماری انا زندہ باد ـــ بیگم کی شاعری مردہ باد" وغیرہ وغیرہ ـــ اول اول تو بیگم نے ہماری بھوک ہڑتال کو انہی روایتی نظروں سے دیکھا جیسے میدان سیاست میں عموماً دیکھا جاتا ہے لیکن جوں جوں ہماری بھوک ہڑتال پروان چڑھتی گئی، بیگم کا دل پسیجتا گیا۔ طے یہ پایا کہ بیگم صاحبہ کسی قیمت پر بھی شاعری سے دست بردار نہ ہوں گی البتہ وہ اس شرط پر مشاعروں سے دست بردار ہو سکتی ہیں کہ ہمیں ان کی غزلیں، نظمیں وغیرہ وغیرہ پابندی سے سننی ہوں گی۔ 'مرتا کیا نہ کرتا' کے مصداق ہم نے بیگم کی یہ شرط قبول کر لی اور اس طرح بھوک ہڑتال سے دست بردار ہوئے۔ چنانچہ آجکل بیگم کی شاعری اپنے پورے شباب پر ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اقبال بلگرامی

چائے عجیب و غریب شے ہے۔ بگڑتے کام بناتی ہے اور بنتے کاموں کو استحکام پہنچاتی ہے یہ صرف ایک پیالی میں سماتی ہے [لیکن] اپنے اندر بہت بڑی طاقت رکھتی ہے۔ کوئی بھی کام کی ابتدا اسی چائے سے اور انتہا بھی اسی چائے پہ ہوتی ہے۔ [ش]ادی بیاہ کی بات چیت کے ابتدائی مراحل بھی چائے ہی سے شروع ہوتے ہیں اور شادی کے تمام ہنگامے اسی چائے پر [اپنے] اختتام کو پہنچتے ہیں۔

چائے سے کام بنتے ہیں ـــــ جی ہاں بالکل درست۔ عوام الناس کو اس تعلق سے کئی سابقے پڑ چکے ہوں گے۔ [او]ر انشاء اللہ آئندہ بھی پڑتے رہیں گے ـــــ اگر اس قسم کا سابقہ کسی صاحب کو نہ ہوا ہو تو ہم سے سماعت فرمائیے۔ فرض [کیج]یے آپ کو کسی آفس میں کام ہے اور آپ اس آفس میں پہنچ گئے تو سب سے پہلے آپ کو ایک مدقوق قسم کی شے نظر آئے گی [جو] اپنی سفید یا خاکی وردی میں بیٹھی اپنے منہ نما چیز سے بیڑی کا دھواں چھوڑتے ہوئے آپ اسے پائیں گے۔ وہی مدقوق شے [ص]احب کا چپراسی ہے آپ کو "صاحب" سے ملنے نہیں دے گا۔ لیکن اگر آپ اسے چائے کی پیشکش کریں تو پھر وہی جھریوں کا [مرق]ع صورت ڈھانچہ آپ کو مسکراتے ہوئے صاحب سے ملا دے گا۔ بلکہ صاحب سے آپ کی کچھ سفارش بھی کر دے گا۔ [ص]احب سے ملاقات کے بعد آپ کسی متعلقہ کلرک کے پاس گئے تو وہ پہلے تو بہت سست سست سے بچے بہانات کرے گا [لیکن ج]وں ہی آپ نے یہ کہا کہ جناب آپ ذرا باہر چلیے آپ ہم چائے پی کر آجائیں تو اس کی بے نور آنکھوں میں روشنی آجائے گی۔ [اور و]ہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے گا بلکہ اس کے ساتھی بھی فوراً کسی نہ کسی بہانے اس کے [س]اتھ ہو جائیں گے۔ اب صاحب معاملہ کو ایک چائے کی بجائے آٹھ دس چائے کے لیے تیار ہو جانا پڑتا ہے۔ اس حالت [میں مح]سوس کیا جاتا ہے۔ اگر حرف شکایت زبان پر لاتا ہے تو کام خراب ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے اس لیے وہ متعلقہ [...] کے چائے والوں کو بھی [illegible] لگاتا ہے ـــــ وہ سمجھتا ہے کہ چلیے چھٹی ہوئی۔

لیجیے جناب ——— وہ ابھی چائے کا بل ہی ادا کرتا ہے کہ یہ قافلہ پان کی دوکان پر اس طرح رک جاتا ہے جیسے یہ پان کی دوکان نہ ہو کوئی ملک کی سرحدی چیک پوسٹ ہو ——— ایک کہتا ہے کہ صاحب میرے لئے مگہئی پان بنوائیے۔ دوسرے کی فرمائش کچھ اور ہوتی ہے اور تیسرے کی کچھ اور غرض جتنے منہ اتنے مزے کے پان سگریٹ۔ جب یہ قافلہ دوبارہ آفس میں داخل ہوتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کل یا پرسوں آئیے آپ کا کام ہو جائے گا۔ اہل معاملہ صرف ٹھنڈی سانس لے کر ہی تو رہ جاتا ہے۔ آہ بھی تو بے چارہ کر نہیں سکتا اگر آہ کرتا ہے کام خراب ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے اب وہ کل آنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے اور پھر وہ سوچنے لگتا ہے کیا کل بھی مجھے چائے پلانی پڑے گی۔ دل کہتا ہے ال ——— ضرور ——— پلانی پڑے گی ——— ایک کو نہیں اتنی بڑی فوج کو ———

کچھ لوگ کہتے ہیں چائے میں چاہت ہوتی ہے اور اسی چاہت سے خلوص میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ خلوص محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بعض عشاق کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنی معشوقہ کو میٹھی میٹھی اصلی دودھ کی چائے پلا کر رام کیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان کی معشوقہ کو صرف اصلی دودھ میں پتی اور شکر ملا کر چائے پلائی اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے ان کی معشوقہ کو بالائی والی چائے پلا کر رام کیا۔ غرض جتنے بھی عشق لڑے جاتے ہیں یا لڑائے جاتے ہیں ان سب میں چائے کا مکمل ہاتھ ہوتا ہے۔ چائے سے کسی کو مفر نہیں۔

بعض وقت تو ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ چائے نہ پیش کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں ان کی آؤ بھگت چائے سے ہوتی ہے۔ اب اگر فرض کر لیجیے کسی صاحب خانہ نے ان سے چائے کے لیے نہ پوچھا تو سمجھ لیجیے قیامت آگئی وہ روٹھ گئے اور مہینوں اس گھر کا رخ نہ کیا۔

بعض لوگ صرف چائے پینے کے عادی اور مشتاق ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ نت نئے طریقوں سے چائے پیتے ہیں اکثر یہ لوگ جب آپ کی دوستوں کے ساتھ کسی ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے ہوں یہ صاحب آپ کے پاس اس طرح آکر بیٹھ جاتے ہیں جیسے آپ نے ان کو بلایا ہے یا وہ آپ کے مہمان خصوصی ہیں۔ آپ اخلاقاً چائے آفر کر دیتے ہیں۔ موصوف چائے پینے کے بعد اخبار میں کچھ اس طرح محو ہو جائیں گے جیسے ان کا تعلق آپ سے کبھی رہا ہی نہیں یا پھر چائے پینے کے بعد آپ سے اس خوش اخلاقی سے ایسے صاحب کا نام دریافت کریں گے جو ہوٹل میں موجود نہیں ہیں اور پھر یہ کہتے ہوئے نو دو گیارہ ہو جائیں گے کہ فلاں صاحب کو دیکھنے آیا تھا۔ خدا حافظ ———

کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے آپ اکیلے ہی اپنے خیالات و تفکرات میں گم ہوٹل میں بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور کوئی صاحب بلائے ناگہانی کی طرح آپ پر نازل ہوتے ہیں۔ سلام ہوا ——— خیریت پوچھی اور اخبار پڑھنے میں لگ گئے۔ آپ کی ایک پیالی چائے آگئی۔ آپ نے اخلاقاً کہہ لیجیے صاحب چائے حاضر ہے۔ صاحب موصوف نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر سپ کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے بیرے کو اپنے لیے چائے کا آرڈر دیا اور یہ صاحب آپ کی گرم گرم چائے اخبار کے ساتھ مزے لے لے کر پی رہے ہیں۔

اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ بہت ہی مخلص ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے ساتھ مزے لے رہے ہیں بلکہ ہم اس کے دکھ درد میں شریک بھی ہو جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی گرم گرم چائے بھی پلاتے ہیں [illegible]

...کی آخرہ خاص ... ہیں۔ جس وقت عجیب پرلطف سماں ہوتا ہے یعنی آپ اپنے چند مخصوص احباب عزیز و ...کے ساتھ چائے پی رہے ہیں۔ اب صاحب اہل غرض حضرات بھی آدھمکے ہوں تو ان کے ساتھ بھی وہی کچھ کرنا پڑتا ہے ...آپ ابھی اپنے مخصوص دوستوں اور عزیز و اقارب کے ساتھ فرما رہے تھے۔ پھر صاحب بیگم کو کہنا کہ مزید چائے نمکین اور ...وغیرہ کا انتظام فرما دیجئے۔ پھر بیگم کا تھکی تھکی آواز میں نوکرانی کو آواز دینا اور ان کی تھکی تھکی نگاہوں کا تاب لانا مشکل ہو جاتا ہے۔

اگر آپ بہت زیادہ سوشیل ہیں اور اپنے آفس اپنے علاقے اور اپنے محلے میں خدمت خلق کے لیے مشہور ہیں تو سمجھئے ...ہیں اور اس پر اگر آپ کی یہ عادت بھی معلوم ہو جائے کہ آپ لوگوں کا کام کرکے انہیں چائے کافی سے بھی سرفراز ...تے ہیں تو سمجھئے اور لوگ آپ کے پاس چلتے ہوئے نہیں بھاگتے ہوئے آئیں گے۔ ●○

غذا برائے کام

غذا برائے کام پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ جز معاشی اور بیروزگار افراد کے لئے فائدہ مند روزگار فراہم کرکے انھیں برادری کا ایک پائدار اثاثہ بنایا جائے۔

آندھرا پردیش میں یہ اسکیم فی زمانہ پورے زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔ ریاستی حکومت نے اس اسکیم کے تحت تقریباً ۱۴٫۵۵ کروڑ روپے لاگت کے کام شروع کر رکھے ہیں۔ اب تک ۱۰۵۶ کیلومیٹر نئی سڑکوں اور ۳۱۷۰ کیلومیٹر پختہ و نیم پختہ سڑکوں کی تعمیر و مرمت۔ ۱۷۰ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر اور ۳۴۲ وسائل آبپاشی کی تیاری کا کام شروع کیا جاکر مکمل کر لیا گیا ہے جس کی بدولت تقریباً ۹۳۹۲ کام کے دن بدست ہوئے۔

D.G.I.&P.R. 4B.

میرے دل کی ملکہ مس چندا بجلی

کل ہی آپ کی نئی فلم "ندرا نندنی" دیکھی اور یہ تصویر یہاں کر کی اس ط میری خاندانی خواہش پوری ہوئی۔ خاندانی اس طرح کہ میرے دادا جان دلی میں ایک تماشا دیکھا چندا بجلی تھی جس کو قریب سے دیکھنے کی خواہش اپنے دم میں گرفتار سینے میں لیے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر اس کے بعد میرے پتا جی کے دور میں بھی ایک چندا بجلی ایکٹرلیس تھی وہی فلم "سیل پری" والی چندا بجلی — ا قریب سے دیکھنے کے لیے پتا جی ہمیشہ ترستے رہے۔ لیکن بد قسمتی سے اب وہ چندا بجلی ریٹائر ہو گئی ہے اور فلمی ہیروئن ہو اس لیے پتا جی نے بھی قریب سے دیکھنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ غرض کہ ان کی بھی خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔ بس یہ سمجھیے میں خوش ہوں کہ میں نے آپ کو اپنے وقت کی مس چندا بجلی ہیروئن کو قریب سے دیکھا۔ اور میرے بچپن کی خواہش اور خاندانی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اب آپ بھی سوچتی ہوں گی۔ بھلا یہ بچپن کی خاندانی خواہش کیا بلا ہے۔ اور دیکھنے سے چندا بجلی صاحبہ! مجھے یہ بتلانے میں ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ مجھے اس جمیرمٹ میں آپ تک پہنچنے میں دھکے بھی برداشت کرنے پڑے (جیب کی صفائی برداشت کرنی پڑی) یہ میں ہی جانتا ہوں اور دوسرا کوئی جانتا بھی ہے نا؟

آج کے لیے بس اتنا ہی —— فقط تمہارا —....؟

اچھا نمستے جی ——

پھر لکھوں گا —— یاد زندہ خط باقی !

کماری کجا دیوی

کل آپ کی سالگرہ کی پارٹی میں میں بھی بن بلایا مہمان بن کر حاضر ہوا تھا۔ (بن بلائے آنے کی معذرت خواہ ہوں) آئندہ آپ ضرور بلایا کیجیے تاکہ میں بن بلائے نہ آیا کروں! واہ صاحب یا آپ نے کیا خوب تماشا دکھایا۔

کیک کاٹتے ہی فوراً آپ اپنی نئی فلم کے "کیمرہ مین" کے ساتھ نہ جانے کس کمرے میں جا کر بند ہو گئیں۔ ہیرو صاحب آپ کو ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ کچھ تو خیال کیا ہوتا دوسرے مہمانوں کا! —— ہم سب آپ کے تین گھنٹے منتظر رہے آپ کسی طرح بھی کسی کمرے سے جب برآمد نہ ہو سکیں تو لا چار سبھوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ ہاں آپ کے غائب ہونے کے بعد آپ کی اینگلو انڈین سکریٹری اور ہیر ڈریسر نے ہمارا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ واہ کیا چیز تھی سالی تازہ کھڑی کی ڈلی۔

آئندہ ہر تھرڈ پارٹی پر آپ کی یہ جانب داری نہیں چلے گی خیال رہے۔

فقط آپ کا

ایک دوسرا کیمرہ مین ——

مس کرم کملا صاحبہ

آپ نے اپنی نئی فلم "بھلا تو بھلا سیٹھ نندو" میں ہیرو صاحب کو یہ تاکر کہا نہیں کیا آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح ہم ہیروئنوں کی نقل کرتے ہیں ہماری بیویاں ہیروئن کی نقل کرتی ہیں۔ جب سے تمہاری یہ فلم میری بیوی نے دیکھی ہے ہر ہفتہ وار چھٹی پر ایک چانٹا بر وقت کر رہی ہیں۔

فقط —— ایک مظلوم شوہر

مس قیمہ مالتی

نمستے ہائے کس غضب کا تم نے اپنی تازہ گرم گرم نئی فلم "تازہ قیمہ باسی بلدی" میں کام کیا ہے۔ ویلن اور اس کے چمچوں کی غضب کی پٹائی کی ہے تم نے مجھ میں بھی جلا مردی کی آگ بھڑکا دی۔ ۔ ۔ جس کی وجہ سے اب میں بھی کراٹے اور جوڈو کے ذریعہ اپنی سیا مالتی کے بھیجے کی ہنٹ کرا اپنی سیا مالتی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا ——— تم بھی پیار رکھنا کرنا ———

فقط جوالمرد
گھسو جو چڑا

مس ندیا توش والی

یہ میرا پریم پتر پڑھ کر کہ تم ناراض نہ ہونا!

ہاں جی ——— میں تم کو اس وقت سے چاہتا ہوں ۔ پوجتا ہوں، پیار کرتا ہوں جب آپ کی کوئی بھی فلم آوٹ آف ڈیٹ ہو کر کسی تھیٹر میں چالو نہیں ہوتی تھی۔ ہاں جی ——— ہمارے گاؤں کے ایک ردی اخبار میں تمہاری بھٹیار تصویر چھپی تھی لیکن میں نے اپنے دل کی عینک سے دیکھا تھا ۔ اسی لیے وہ فوٹو اور فوٹو والی یعنی تم ——— ہائے میری کیا جی ۔ دونوں ہی بہت خوب صورت لگی تھی ۔ آج کا اتنا ہی خط ہے ۔

آگے تم ہی سمجھ دار ہو ——— باقی کا سمجھ لینا

کہو ——— کب بارات لے کر آ جاؤں ؟

میری طرف سے ایک میٹھا میٹھا ہوائی بوسہ

تمہارا پریم کمار من موہن

ہاں جی ——— !

پیاری پیاری ببلن جی

نمستے ——— تمہاری فلم دیکھنے گیا ——— اور پھر بے ہوشی کی حالت میں سرکاری ہسپتال پہنچا ——— ہوا یہ تھا کہ ندی کنارے کے سین میں تم کو ندی میں نہاتے دیکھ کر میرے دل پر قابو نہ رہا اور میں بھی پردے کے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی ۔

بس ——— پھر ——— لوگوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ——— اور بے ہوشی کی حالت میں سرکاری اسپتال پہنچ گیا ۔ یہ خط وہیں سے لکھ رہا ہوں باقی خط گھر جا کر لکھوں گا ——— تمہارا عاشق نامراد

چھکن میاں
چھینکنے والا

دیہی علاقوں میں پینے کا پانی

آندھرا پردیش میں دیہی علاقوں کے لئے پینے کے پانی کی سربراہی کے مسئلہ پر ترجیحی توجہ دی جارہی ہے۔

سال ۱۹۷۸ء کے دوران تقریباً ۳۵۰۰ سالانہ اوسط کے مقابلے میں ۳۹۳۰ بور ویلز کی کھدوائی عمل میں لائی گئی۔

مزید برآں ایک ماسٹر پلان کی تیاری کی گئی ہے جس کے ذریعہ سرگرمی کے علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ریاست میں فلورائڈ سے متاثرہ ۱۷۱ مواضعات میں محفوظ پانی کی سربراہی کے ایک پراجکٹ کو نیدرلینڈ کی اعانت سے مستقبل قریب میں روبہ عمل لانے کی تجویز ہے۔

DS, I&PR. No. 49.

مسز کمال

باورچی خانہ
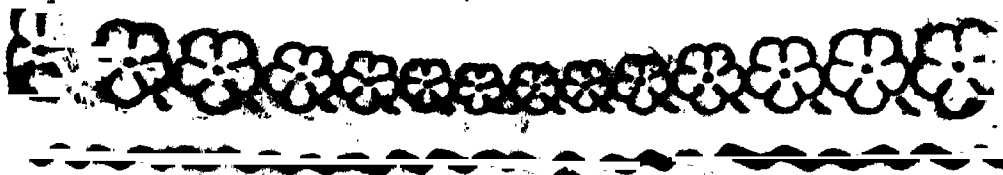
گھر میں باورچی خانہ کو وہی مقام حاصل ہے جو مرکز میں پارلیمنٹ کو یا ریاست میں اسمبلی کو بغیر پارلیمنٹ کے ملک کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھیک اسی طرح باورچی خانہ کے بغیر گھر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کا نظام پارلیمنٹ سے چلتا ہے اور گھر کا باورچی خانہ سے۔ گھر میں اور کچھ مثلاً ڈرائنگ روم، ریڈنگ روم، ڈائننگ روم، اسٹور روم نہ ہو تو کوئی بات نہیں مگر باورچی خانہ اور باتھ روم ضرور ہونا چاہیے۔ اور باتھ روم کی ضروریات بھی اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ باورچی خانہ اور باتھ روم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

"ارتھ شاستر" کے مصنف کوٹلیہ نے ایک مضبوط جمہوریت کے لیے پارلیمنٹ کا خاکہ پیش کیا تھا مگر بہت کم حضرات اس بات سے واقف ہیں کہ جناب کوٹلیہ کو پارلیمنٹ کا خاکہ اپنے ذہن میں رسوئی گھر یعنی باورچی خانہ میں ہی آیا تھا۔

باورچی خانہ دراصل خواتین کی پارلیمنٹ ہے۔ چولھے پہ ہانڈی رکھی ہوئی ہے۔ روٹی بیلتے بیلتے ایک عورت عجب سا منہ بنا کر ہلبٹ پر مسالہ پیستی دوسری عورت سے مخاطب ہوئی ———

"اجی کل وکیل صاحب کے یہاں گئے تھے۔ ان کی بیوی تو بالکل پھوہڑ ہیں۔ روٹی تک بیلنے نہیں آتا ہے۔"

"ہاں جی ٹھیک ہی کہو ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں بھی سب کا یہی حال ہے۔ دال تو ایسی بنتی ہے جیسے بھر بھر پانی" ———

ابھی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ محلے کی دو چار خواتین اور آ دھمکیں اور وہ لوگ بھی باورچی خانہ میں ہی آ کر براجمان ہو گئیں۔ پھر کیا تھا۔ وہی چار منٹ بعد پارلیمنٹ کی کارروائی بڑے ہی زور و شور سے شروع ہو گئی ———

"کمال ہے۔ بھولا میاں، بڑھاپے میں بھی آٹھواں بچہ پیدا کئے۔"

"اچھا نہ لگے ہے ہموں۔ بڑھا طوطا ا ۱۳۱ اللہ"

"نعمان میاں اور مشتاق میاں دونوں بھائی گھر کی جائیداد کے لئے لڑ گئے۔ دو کوڑی کی جائیداد اور خون خرابہ"

"نظیر کا بیٹا میٹرک میں پھر فیل ہو گیا" "حمیدہ کی بہو دن بدن سوکھی جا رہی ہے"

"ارے ہاں فخر صاحب کی ساس بے چاری پرسوں انتقال کر گئیں۔ کل بجو میاں یہاں گئے تھے وہیں معلوم ہوا"

"اوہ" سب نے کہا اور پھر پارلیامنٹ کی Candance meeting شروع ہو گئی تمام

ممبران نے مرحومہ پر بیان دینا شروع کیا۔

"بڑی نیک تھیں وہ" "کتنی پارسا تھیں بے چاری

یہ بھی کہنے کی بات ہے۔ دائی نوکر تک کو آج تک جھڑکتے اور تسبیح ہاتھ سے چھوٹتے نہیں دیکھا"

ابھی مرنے کے دن تھے ان کے بڈھے بڈھے لوگ بغیر ڈنڈا کی مدد کے مزے میں چل پھر رہے ہیں"

ابھی Condolence meeting چل ہی رہی تھی کہ پڑوسی ملک کا کوئی وفد بھی تیز چال اور آواز کے ساتھ

گرجتا اور ... کرتا ہوا آپہنچا اور آتے ہی شروع ہو گیا۔

"بھائی آخر تو ہم پڑوسی ہیں۔ پڑوس میں رہ کر اتنی بے اتفاقی۔ میرے یہاں ایک میونسپلٹی نل ہے جو حسب

معمول کم کھلتا ہے اور پانی کی ایسی قلت خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ آج جب ان کے یہاں کنویں سے پانی لینے بھیجا تو

صاف انکار کر دیا۔"

اب کیا تھا ایک اچھی خاصی بحث شروع ہو گئی۔ گویا نل کا مسئلہ نہ ہوا، فراخہ بیریج کا پرابلم ہو گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد League of nations کا قیام عمل میں آیا تھا تاکہ پھر کوئی جنگ

عظیم نہ چھڑ جائے۔ ساری دنیا خاص کر کمزور ممالک تو کانپ اٹھتے تھے۔ کمزوروں کی راحت کے لیے League

کا دفتر آباد ہوا تھا۔ باورچی خانہ بھی اسی کمزور اور طاقت وروں کے بیچ جنگ کے بعد کبھی کبھی حیرت ناک طور پر

آباد اور ویران ہوتا رہتا ہے۔ بیگم صاحبہ تخریبی

جماعت کے لیڈر کی طرح اس بات پر اڑ جاتی ہیں کہ "باورچی خانہ Desolne کرتی ہوں۔ دیکھتا ہے۔ آپ کیا

کرتے ہیں" بے چارہ کمزور شوہر چیلنج قبول کرتا ہے اور پھر ہانڈی، کڑھائی، چمچہ، ڈوئی، کفگیر، پلیٹیں، پیالے

کٹورے غرض کہ تمام اشیاء باورچی خانہ سے باورچی خانہ آباد کر دیا جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ بیڈ روم سے ہی یہ سارے

مناظر دیکھ دیکھ کر مزے لیتی رہتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کی اس حسین حرکت پر روم کے اس عجیب و غریب کردار نیرو کی

یاد آ جاتی ہے جب سارا روم جل رہا تھا اور نیرو مزے میں بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ ادھر بے چارہ مظلوم شوہر باورچی

خانہ کو درست کر رہا ہوتا ہے۔ اگر ماچس جل گئی تو اپلے آگ نہیں پکڑ سکتے۔ اپلے اگر آگ پکڑ لیتے ہیں تو کوئلے آنچ کا ساتھ

نہیں دیتے اگر گردش قسمت نے ساتھ دیا اور چولھا روشن ہو گیا تو روٹی بنانا ایک مسئلہ عظیم۔ کسی روٹی پہ جدید آرٹ کا گمان

ہوتا ہے تو کسی پہ افریقہ، سیلون اور اپنے پیارے ملک ہندوستان کے نقشے کا خیال۔ غرض کہ کسی طرح روٹی بن گئی کہ دفتر

کا وقت ہو گیا اور ادھر باورچی خانہ کی وہی حالت نظر آتی ہے جو ... وار کے بعد کسی تباہ زدہ ملک کی ہوتی ہے۔

ہر چیز ادھر ادھر بکھری ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے جاپان کی صورت باورچی خانہ کا ایک سرسری جائزہ

کچھ دنوں کے لیے نامنظور کردیا جاتا ہے کیونکہ اکثریت وقتی طور سے اس کی مخالف ہوتی ہے اس لیے کہ یہ چیز اسے پسند نہیں۔ ایک بل پھر پیش ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے۔ شاہی ٹکڑے یا مجھلی کا اور یہ بالاتفاق رائے منظور کرلیا جاتا ہے۔

باورچی خانہ کی اہمیت میں پارلیامنٹ کی اہمیت کی طرح اضافہ ہوتا جارہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب کوئی نئی عمارت بنتی ہے تو باورچی خانہ کے ڈیزائن اور خوب صورتی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اب وقت کے ساتھ ساتھ باورچی خانہ کا جدید سے جدید تر ہوا جارہا ہے۔

باورچی خانہ کی بناوٹ بھی U.N.O. کی بناوٹ کی طرح ہے۔ اس لیے اس کے مندرجہ ذیل خاص حصے ہیں:-

(۱) جنرل اسمبلی (General assembly) سرزمین باورچی خانہ ہی دراصل جنرل اسمبلی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں آج سے ہزاروں سال قبل جانکیہ نے جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی۔

(۲) سکیورٹی کونسل (Security Council) اس کا دفتر باورچی خانہ کے برابر ہی ایک کمرے میں ہوتا ہے Store Room کہا جاتا ہے۔

(۳) ٹرسٹی شپ کونسل (Trusteeship Council) : یہ بھی باورچی خانہ کا ایک خاص حصہ ہے اس کے ذریعہ اشیائے باورچی خانہ کی نگرانی کی جاتی ہے۔ وہ تمام چیزیں جو پڑوسی گھروں میں گئی ہوئی ہیں یا وہ چیزیں جو گھر ہی کسی کمرے میں ہیں مگر وہ باورچی خانہ سے تعلق رکھتی ہیں، سب کی نگرانی یہیں سے ہوتی ہے۔ گھر کے وہ فضول کپڑے جواب کسی کام کے نہیں مثلاً لنگی، تولیہ، گنجی، ٹیبل غلاف، بلینٹ وغیرہ یا دواؤں اور ویسلین وغیرہ، گلیسرین، بورلیں وغیرہ کے ڈبے تو باورچی خانہ اپنی policy کی mandate system کے تحت لے لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر تھیلا اور صفائی کا کام موخرالذکر ڈبوں کو نمکدان چینی یا چائے کی پتی رکھنے کا کام سونپ دیا جاتا ہے۔

(۴) سماجی اور معاشی کونسل (Economic and Social Council): گھر کی معاشی اور سماجی حالت کو مضبوط کرنے کا کام اسی محکمہ کے ذمہ ہے۔ کون کون سی چیزوں کی کمی ہے۔ کتنی چیزیں بیکار ہیں ا... ساری باتوں کا علم اس کونسل کو رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

(۵) محکمۂ انصاف (Court of Justice) داتی نوکروں یا ان کے صاحب زادوں یا نواسی پوتوں نے گھر کی تخریبی کارروائی میں کیا حصہ لیا اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اس کا فیصلہ یہی کورٹ کرتی ہے۔ یوں تو باورچی خانہ کے ممبر گھر کے تمام افراد ہوتے ہیں مگر Veto دینے کا اختیار صرف پانچ بڑوں کو ہوتا ہے اور "پانچ بڑے" ہوتے ہیں۔۔۔۔ دادا ابا، دادی اماں، امی جان، ابا جان اور بیگم صاحب سکریٹری جنرل کا عہدہ دادی اماں کے پاس ہوتا ہے۔ مگر موجودہ دور میں اس عہدۂ عظیم کو بعض جگہ نئی نئی بیگم صاحباؤں نے by force ہڑپ رکھا ہے۔ وہ ناتجربہ کار ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر میں Civil war شروع ہوجاتی ہے۔

شاعر کا پوسٹ مارٹم

شاعر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پیدائشی ہوتا ہے لیکن آج کل زمانہ اُلٹا چل رہا ہے ۔ اب تو شاعر پیدا نہیں ہو رہا ہے بلکہ بن رہا ہے اور کوئی عجب نہیں کہ چند سالوں میں TEST TUBE BABY کی طرح TEST TUBE POET بھی پیدا ہوں ۔ ویسے بھی فی الحال شاعر بننے کے لئے آج کل حالات کافی سازگار ہیں بس تخلص اپنانے کی دیر ہے ۔ کسی قسم کی مشقت اُٹھانی نہیں پڑتی ۔ چند چیزیں ملا جیسے ابا حضور کی شادی کی شیروانی ، دادا جان کا اقبال شاہی پاجامہ اور ایک عدد چھوٹا سا تخلص ۔ چلئے شاعر بن گیا۔

بس اب کسی ردی کی دکان پر ۴۰ یا ۵۰ سال پہلے کے رسالوں کی تلاش کر کے کسی ایسے شاعر کی غزل چرایئے جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہوں۔

لیکن آج کل کے شاعر تو بہت ہی کاہل اور سست ہو گئے ہیں ۔ رسالہ ڈھونڈنے کی فرصت کہاں ؟ بس کسی کی غزل سے اس کا تخلص نکال کر اپنا تخلص لگا لیا اور پھر مقطع بنالیا ۔ ہم ایک ایسے شاعر نما دوست سے واقف ہیں جنہوں نے غالب کی غزل پر اپنا تخلص چپکا کر کسی رسالے میں شائع کرانے کے لئے بھیج دیا لیکن ایڈیٹر نے یہ کہہ کر غزل واپس کردی کہ غزل غالب کی ہے اور تخلص آپ کا اس لئے ہم اسے شائع کرنے سے مجبور ہیں تب شاعر نما دوست کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ اپنے نازک ولمبے ہاتھوں کو نچاتے ہوئے کہنے لگے کہ غزل تو غالب کی ہوگی لیکن فوٹو تو میری تھی ۔ کم از کم فوٹو ہی چھاپ دیا ہوتا ۔ کیا قاری غالب میں اور مجھ میں تمیز نہیں کر سکتا ؟

پرانے زمانے میں شاعری درباروں میں تھی یا کسی مخصوص ادبی محفل میں ۔ لیکن آج شاعری ہوٹل میں چائے کی میز پر کا بالکل ہے جہاں سننے والے شعر کا کم اور چائے کا مزہ زیادہ لیتے ہیں اور شاعر کو داد اتنی ملتی ہے جتنا پیسہ وہ خرچ کرتا ہے ۔ پہلے لوگ شاعر کو سننے کے لئے آیا کرتے لیکن آج شاعر لوگوں کو سنانے کے لئے آتے ہیں ۔ پہلے شاعر کو لوگ ڈھونڈتے

تھے اور آج شاعر غزل کو برباد کرنے کے لئے ڈھونڈتا ہے۔ غالباً آپ کو وہ قصہ تو یاد ہوگا کہ ایک شاعر صاحب اتنے بیمار ہو گئے کہ جینے کی امید نہ رہی۔ ایک ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اگر شاعر صاحب آج کی رات بھر جاگتے رہیں تو وہ بچ سکتے ہیں۔ شاعر صاحب کو بچانے اور رات بھر انھیں جگانے کی ذمہ داری لے کر ان کے ایک رفیق شاعر کمرے میں چلے گئے۔ شاعر صاحب جو بالکل نحیف اور ناتواں تھے اور دو آدمیوں کے سہارے بھی اُٹھنے کے قابل نہ تھے پر اپنے یار کو دیکھ کر اچھل کر بیٹھ گئے تکیہ کے نیچے سے اپنا دیوان نکالا اور غزل سنانے لگے۔ صبح جب دروازہ کھلا تو دیکھا گیا کہ شاعر صاحب بھلے چنگے بیٹھے غزل سُنا رہے ہیں اور اُن کے رفیق اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاعر اپنی شاعری کو خونِ جگر سے سینچتا ہے جس کی وجہ سے شاعری میں نکھار پیدا ہوتا ہے لیکن آجکل کی شاعری ان تمام چیزوں سے کوسوں دُور ہے۔ آج کی شاعری صرف الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے جس کا مفہوم سمجھنے اور سمجھانے سے خود صاحب غزل بے بس اور مجبور نظر آتا ہے۔ کسی مشاعرے میں جائیے اور دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مشاعرہ گاہ بھی سیاست کا اکھاڑہ ہے۔ شاعر کے جتنے زیادہ دوست اور رشتہ دار ہوں گے اُسے اتنی ہی داد ملے گی چاہے وہ شعر کہے یا نثر پڑھے اور یوں بھی آج کل داد دینا تو فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ ایک مشاعرہ میں۔ ایک شاعر مائیک پہ پہونچ کر "السلام علیکم" کہنے ہی پائے تھے کہ فوری ایک صاحب نے "واہ واہ" شروع کر دی اور انتہا تو اس وقت ہوئی جبکہ دوسرے صاحب جو شاعر موصوف کے ہونے والے خسر تھے (جس کا پتہ بعد میں چلا) مکرر ــ مکرر چلانے لگے۔ اسی طرح ایک اور مشاعرہ میں ایک صاحب لہک لہک کر داد دے رہے تھے۔ ایک شعر پر تو جھوم پڑے اور لگے کہنے مکرر، مکرر۔ جب میں نے اُن سے شعر کا مفہوم پوچھا تو کہنے لگے کہ "معاف کرنا، میں سو رہا تھا۔ اس لئے شعر نہ سُن سکا۔"

یہ شاعر حضرات بھی مائک سے اس طرح چمٹ جاتے ہیں جس طرح جونک کسی انسانی جسم سے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ جونک خون چوس کر انسان پہ رحم کھاتی ہے لیکن شاعر صاحب دماغ کھا کر بھی رحم نہیں کھاتے۔ اسی طرح جس طرح ایک شاعر مشاعرہ میں اپنی غزل جھوم جھوم کر (ترنم کے نشے میں) سُنا رہے تھے اور اہل ذوق کی ہوٹنگ پر بھی داد سمجھ کر ایک ایک شعر کو قوالوں کی طرح بار بار دُہرا رہے تھے اور جب نشہ کا اثر ختم ہوا تو اپنی غزل ختم کی اور دیکھا کہ مشاعرہ گاہ میں صرف ایک صاحب بڑے انہماک سے انھیں سن رہے تھے۔ شاعر صاحب نے ان صاحب سے کہا کہ بھائی صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ جو اتنی دیر سُنتے رہے حقیقت میں صرف آپ ہی ایک شاعر شناس ہیں۔ ان صاحب نے کہا بھائی صاحب یہ بات تو نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ خوش قسمتی سے میں صدرِ مشاعرہ ہوں۔ پروگرام کے لحاظ سے آپ کے بعد مجھے ہی غزل سنانی ہے یہ کہکر جیب سے دیوان نکالا اور اچھل کر مائیک پر جھپٹ پڑے۔ اب آگے کا حال تو آپ خود جان گئے ہوں گے۔

بہرحال اگر یہی روش شاعروں کی رہی تو وہ دن دور نہیں جس کی پیشینگوئی سلیمان خطیب نے کی تھی ؎

اُٹھو کو صدنہ یہ بوسیا بھارت کا یہ رتن ہے ۔ اتول اس کے باتاں ہیرے کا ہر سخن ہے
عزت ہے میری کمتی دنیا کو تو بتا رئے ۔ بُھنتا ہوں کل سے باشا ایک جائے تو پلا رے

مجید نقش مجوی

قسط وار شیطانی آنت نمبر ۳۲

چہ خوب

—— میری بات نے آپ کو وقتی طور پر مشتعل کر دیا اس کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن میرا اشارہ صرف آپ کی طرف نہیں تھا، ایک آپ ہی تو مرحومہ کے ورثا میں شامل نہیں ہیں، ایک اور شخص بھی تو مرحومہ کا قریبی رشتہ دار ہے۔" اتنا کہہ کر طوطا پری نے پہلے شبو پھر ہماری طرف دیکھا پھر آگے بولا —— کس قدر تعجب کی بات ہے قبلہ نواب صاحب جیسے جہاندیدہ شخص کی نظر اصلی مجرم کی طرف نہیں گئی۔" پھر اس نے ہماری طرف طنزیہ نظروں سے دیکھ کر اپنی بات مکمل کی —— اور مسٹر شہزاد، آپ جیسے ذہین بہادر اور صاحب نظر کی نظر بھی دھوکہ کھا گئی —— بلکہ آپ تو نادانستہ طور پر اصل مجرم کے آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے —— "طوطا پری کی اس کراری چوٹ پر ہمارا ذہن گھڑی بھر کے لیے ماؤف ہو گیا۔

اسی لمحہ ایک نسوانی چیخ ابھری جس نے ہمارے ڈوبتے ہوئے ذہن کو دوبارہ جگا دیا۔ پھر دوڑتے قدموں کی آواز سن کر سبھی کی نظریں چھت کی طرف اٹھ گئیں، البتہ طوطا پری نے قدموں کی آواز کے اندازہ سے داہنی طرف والے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ اسی کمرے میں چھت کی طرف جانے والی سیڑھیاں تھیں —— طوطا پری نے جس وقت سے دروازے کی جانب چھلانگ لگائی تھی اسی وقت سے دوبارہ واپس اچھل کر فرش پر ڈھیر ہو گیا، ہماری متحیر آنکھوں کو یوں لگا جیسے وہ کسی ابر کے پہاڑ سے ٹکرا کر اپنے ہی زور میں الٹ کر آ گرا ہو جیسے ہی اس جھٹکے کا اثر کسی قدر کم ہوا ہم طوطا پری کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھے لیکن ہمارے قدم جہاں کے تہاں جم کر رہ گئے، فرش پر پڑا ہوا ڈھیر صرف طوطا پری کی واحد ذات پر مشتمل نہیں تھا بلکہ ایک عدد خاتون بھی شریک ڈھیر تھی —— غالباً کچھ دیر پہلے سنائی دینے والی نسوانی چیخ موصوفہ ہی کی تھی، کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر شاید نیچے کی طرف پوری قوت سے دوڑتی چلی آرہی تھیں اور ادھر سے طوطا پری نے بھی ٹھیک اسی وقت دروازے کی جانب چھلانگ لگائی نتیجۃً دو وجود ٹکرائے اور اپنے اپنے لفظوں میں کسی تیز رفتار گیند کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئے —— ہم نے چند ہی لمحوں میں حالات کا جائزہ لے لیا تھا اس لیے آگے جھک کر طوطا پری کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس نے ہمارا ہاتھ تھاما اور ابھی اس کا آدھا دھڑ فرش سے اونچا اٹھا تھا کہ داہنی طرف والے دروازے سے ایک بجلی سی کوندتی نظر آئی اور ابھی ہم اٹھتے ہوئے سے شکل و صورت دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ اس کی لمبی جست نے جو لات طوطا پری پر لگائی گئی تھی اس کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایک

اس سے پہلے کہ انسانی ڈھیر کے اس اجزائے ترکیبی کے عناصر کا ظہور ترتیب "بگڑتا" قبلہ چہ خوب اور شبو اس غیر دلچسپ تماشے نے مو حیرت کر دیا تھا۔ واپس اپنے حواسوں میں آگئے اور فوراً اس ڈھیر کی طرف جھپٹے اور پھر آن واحد میں قبلہ چہ خوب نے ہمیں اور شبو نے اپنی ہم جنس کو اس ڈھیر سے الگ کر لیا۔ اب جو ہم تماشے سے ہٹ کر تماشائی کے زمرے میں آئے تو دیکھا فرش پر طوطا پری کے ساتھ جو شخص گتھم گتھا تھا وہ بے دھڑک تھا جو آج کل کس میں ماہر روحانیات کا اہم کردار ادا کر رہا تھا ـــــ اور جو لڑکی مرحومہ نادرہ کی روح کا رول ادا کر رہی تھی۔ وہ یقیناً وہی لڑکی تھی جو اس وقت شبو کے پہلو میں کھڑی اپنے بکھرے ہوئے ہوش و حواس مجتمع کر رہی تھی۔ اگرچہ کہ ہم چند ہی سکنڈ کے لیے اس ڈھیر تلے دبے تھے لیکن ڈھیر کا بوجھ اس قدر باوزن تھا کہ ہمارے وجود کے مصرعے کے بحر سے خارج ہونے میں بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں جھٹک کر ہم اپنے وجود کے مصرعے کی "تقطیع" بھی نہ کر پائے تھے کہ بے دھڑک نے طوطا پری سے بدستور زور آزمائی کرتے ہوئے ہی ہمیں آواز دی ـــــ " وہاں کھڑے کھڑے کیا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ اپنے اصلی مجرم کو بے دست و پا کرتے ہیں۔ میرا ہاتھ بٹائیے ـــــ " قبل اس کے کہ بے دھڑک کی اس ہانک پر ہم لبیک کہکر دوبارہ میدان کارزار میں کود پڑتے۔ طوطا پری نے بے دھڑک کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیں ہانک لگائی ـــــ شہزادہ صاحب! اس بہروپیے رنگیلے سیار کا اصلی روپ دیکھنا ہو تو آئیے میری مدد کیجیے ـــــ دونوں اپنے اپنے طرحی مصرعے بھی الاپتے رہے اور فرش پر ایک دوسرے میں گتھے ہوئے لوٹیں بھی لگاتے رہے۔ ہمیں بہرحال کسی ایک کی آواز پر لبیک کہنا تھا لیکن ہمارا یہ حال تھا کہ اس مصرعے کی تفسیر بنے ہوئے تھے ع

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ـــ

اس بیچ قبلہ چہ خوب نے اچانک دھاڑ لگائی ـــــ "

بہت چہ خوب ہو گئے تم دونوں ہیں۔ اب اٹھو فوراً چھوڑو ایک دوسرے کے چہ خوب ـــــ "

قبلہ چہ خوب کی اس دھاڑ میں جس شئے نے وزن دار بنایا تھا وہ تھا ایک وزن دار پستول' جو موصوف شاید موقع کی نزاکت کے پیش نظر اپنی پتلون کے جیب میں اڑس لائے تھے۔ البتہ پستول کی موجودگی کا احساس انہیں بہت بعد میں ہوا تھا جیسے ہی پستول کی موجودگی کا احساس ہوا' موصوف نے اس کہاوت پر عمل کرتے ہوئے "کہ جہاں جاگے وہیں اپنا سویرا سمجھو" پستول تان کر مشہور زمانہ جاسوس زیرو زیرو سیون (007) عرف جیمس بانڈ کے بڑھاپے کا مرقع بن کر میدان میں کود پڑے۔ پستول کو دیکھتے ہی دونوں ہی سورما ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے دور ہٹ کھڑے ہو گئے ـــــ قبلہ چہ خوب نے اپنی دھاڑ کا خاطر خواہ اثر ہوتا دیکھ کر جو دراصل پستول کی مرہون منت تھی۔ پھر سے ایک دھاڑ لگائی ـــــ " تم دونوں میں سے کوئی ایک اصلی چہ خوب ہے ـــــ میں دس تک گنتی گنوں گا' تب تک تم دونوں میں سے جو بھی اصلی چہ خوب ہے اگر اپنی زبان سے اقرار کرے گا تو میں تم دونوں کو چہ خوب کر دوں گا" قبلہ چہ خوب کی اس احمقانہ للکار پر اگر کوئی اور موقع پر ہوتا تو یقیناً کئی فلک شگاف قہقہے بلند ہوتے لیکن موقع کی نزاکت اور تجسس کی بھرمار نے جس مزاج کی ہوا نکال دی تھی ادھر پستول کے ٹریگر پہ مضبوطی سے جمی ہوئی انگشت چہ خوب نے سنسنی خیز ماحول میں ایک نئی "تھرتھری" پیدا کر دی تھی۔ اس تھرتھری نے ہمیں خاص طور سے تھرا دیا تھا۔ حالانکہ

پستول کا نشانہ ہم نہیں تھے۔ لیکن موجودہ وجود پستول کی زد میں تھا اس میں سے یقیناً ایک بے گناہ تھا اور قبلہ چہ خوب کے تیز رفتار اعصاب نے ان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو بالکلیہ اپنے تابع میں کر لیا تھا اس لیے وہ گنہ گار کے ساتھ ایک بے گناہ کے خون سے بھی اپنے ہاتھ رنگنے جا رہے تھے۔ اب موصوف کے ساتھ ہم سب کی خیریت بھی اس میں تھی کہ موضوع بحث کو جاکر ایک اور پلٹا دیا جائے چنانچہ ہم نے شر چھیڑا ——— مجرم کبھی اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا اس واقعہ کا چشم دید گواہ "اس سارے آسیبی ڈرامے کا اہم کردار یہ لڑکی موجود ہے۔ یہی اصلی مجرم کی نشاندہی کر سکتی ہے ——— ہم نے شبو کے پہلو میں کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ابتدا ہی سے اس ڈرامے کا اہم حصہ رہی تھی۔ قبل اس کے مذکورہ لڑکی کچھ کہتی بے دھڑک نے مداخلت کی ——— یہ حرافہ دشمنوں سے مل گئی ہے شہزاد صاحب! اب ہمارے خلاف صرف زہر ہی اگلے گی ———
بے دھڑک کی بات ختم ہوتے ہی قبلہ چہ خوب ہماری طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے غرا کر بولے ——— ؟ برخوردار بے دھڑک کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اس سارے چہ خوب میں ملوث ہو ——— !" موصوف کے اس حملے پر ہماری [illegible] لازمی تھی لوگ تو رنگ لگا کر شہیدوں میں شامل ہوتے ہیں اور ہم بغیر رنگ لگائے شہیدوں میں شامل کر دیئے گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم صفائی میں کچھ کہتے طوطا پری کے قہقہے نے ہمارے ساتھ سبھی کو چونکا دیا۔ قہقہہ مکمل ہوتے ہی وہ بولا ———
"میں اگر چاہوں شہزاد صاحب تو اصل مجرم کے ساتھ آپ کو بھی شریک ٹھہرا سکتا ہوں۔ لیکن حق و انصاف کا خون کرنا نہیں چاہتا میں نے" اس نے نہایت ہی مودبانہ انداز میں قبلہ چہ خوب سے مخاطب ہو کر کہا ——— نواب صاحب قبلہ! آپ کے عزیز دوست شہزاد صاحب اس سارے ڈرامے سے لاتعلق ہوتے ہوئے بھی نادانستگی میں چالاک مجرم کے اس طرح آلہ کار بن گئے کہ یہ بھی بظاہر اس سارے آسیبی چکر کی ایک کڑی نظر آتے ہیں جبکہ حقیقتاً اس ڈرامے میں ان کی حیثیت بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ سمندر کے بیچ پیاسے کی ———!!

ہمارے بارے میں یہ مدلل صفائی پیش کرنے کے بعد طوطا پری نے بے دھڑک کی طرف طنز سے دیکھا جو اب سے کچھ دیر پہلے تک اس کی آنکھوں میں متحرک رہی تھی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھا ان کی آنکھوں کے خالی پن میں بھی ایک عجیب کیفیت تھی۔ ہمیں جانے کیوں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص قاتل بھی ہو سکتا ہے، بلکہ رہ رہ کر ہمارے دل و دماغ میں یہی فقرہ گونج رہا تھا۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن قاتل نہیں۔ طوطا پری اس شخص کے خلاف کوئی گہری چال کوئی لمبا داؤ چل رہا ہے۔ اگرچہ کہ طوطا پری ہی نے صفائی پیش کر کے ہمیں اس گندگی کے دھندے میں ملوث ہونے سے بچایا تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں بھی اس کی کوئی چال ہو ——— اس خیال کا آنا تھا کہ ہم نے بڑی تیاری سے بے دھڑک کو بچانے اور طوطا پری کو پھنسانے کے لیے داؤ چلا۔ یہ لڑکی ہمارے بیچ حلف کے تیکھے کا درجہ رکھتی ہے جب تک کہ اس کے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوتے، کسی قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ——— ہماری اس دلیل پر طوطا پری نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولا ——— بقول آپ کے آپ کی اس واحد چشم دید گواہ کے حواس جب بحال ہو جاتے ہیں تب تک آپ پر ایک اور انکشاف کر دوں، یہ لڑکی جس کے بارے میں ابھی کچھ دیر پہلے بے دھڑک صاحب نے یہ الزام تراشا تھا کہ دشمنوں سے مل گئی ہے۔ دراصل میرے ہی اشارے پر اس ڈرامے میں اس نے [illegible]

روشنی کی رفتار کا عمل ادا کیا ہے ——" طوطا پری کے اس انکشاف پر ہمیں یوں لگا جیسے ہم سب پر حیرتوں کا
پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ بے دھڑک پر تو اس انکشاف نے دھماکے کا کام کیا اور وہ کسی وزنی پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے
ڈھلان کی طرف تیزی سے لڑھک پڑتا ہے طوطا پری کی طرف اچھل پڑا۔ لیکن اس بار طوطا پری نے پھرتی دکھائی اور گ
کر ایک طرف ہٹ گیا۔ بے دھڑک اپنے ہی زور میں فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ نتیجتاً اس کا سارا زور ٹوٹ گیا اور غصہ میں ماند پڑ
گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ پلکیں جھپکاتا ہوا فرش پر چت لیٹا تھا —— طوطا پری نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک
انکشاف کیا —— "بے دھڑک صاحب! جن کرائے کے غنڈوں کو آپ نے میری نگرانی پر مامور کیا تھا وہ بھی میرے
ہی آدمی ہیں —— مسٹر بے دھڑک نادرہ کی ناگہانی موت کے بعد جس طرح آپ میرے کردار کو مشکوک ثابت کرنے
پر تل گئے اور میرے خلاف محاذ پر محاذ بناتے چلے گئے اسی طرح میں بھی روز اول ہی سے آپ کی ٹوہ میں لگ گیا —— آ
کا جس برتاؤ نے میری توجہ فوراً آپ کی طرف مبذول کروائی وہ آپ کے طرز گفتگو میں تبدیلی تھی، آپ اچانک اپنے زاویئے
اور پیمانے بھول گئے اور میں آپ کے گم شدہ زاویوں کی تلاش میں آپ کی ہر نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنے لگا —— طوطا
پری اتنا کہہ کر رک گیا۔ بے دھڑک اب فرش پر اکڑوں بیٹھا خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں تاک رہا تھا۔ مرحومہ ناد
کی پراسرار موت کے تعلق سے جسے پولس نے خودکشی قرار دیا تھا اور بے دھڑک اسے قتل باور کروانا چاہتا تھا۔ طوطا پری
بڑی ذہانت سے الجھی ہوئی گرہیں کھول رہا تھا۔ خصوصاً بے دھڑک کے متروک شدہ زاویے اور پیمانے والے تکیہ کلام کی
طرف اس کا اشارہ چونکانے والا تھا۔ حادثے کے ابتدائی دنوں میں تو اس طرف ہمارا خیال بھی نہیں گیا کہ بغیر زاویوں
اور پیمانوں کے جس شخص کو ہم نامکمل تصور کرتے تھے۔ اچانک اپنا مخصوص تکیہ کلام ترک کر چکا ہے۔ جب اس حادثے
کی سنسنی کسی قدر کم ہوئی تو ہمارا خیال اس طرف گیا ضرور، لیکن ہم نے اس تبدیلی کو اس نفسیاتی کلیہ کی روشنی میں معمولی
قرار دیا کہ اگر کسی کو اچانک کوئی ناگہانی حادثہ پیش آ جائے جس میں اس کی عزیز ترین شے اس سے ہمیشہ کے لیے جدا
ہو جائے تو انسان کی بعض ایسی مخصوص عادتیں جو دوسروں کو اس کی جانب متوجہ کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ ان میں یا تو
اچانک کوئی تغیر رونما ہوتا ہے یا پھر غیر محسوس طور پر انسان انہیں ترک کر دیتا ہے —— جس تبدیلی کو ہم نے اپنے
حساب سے معمولی قرار دیا۔ اس بات کو طوطا پری نے غیر معمولی سمجھا جس کا نتیجہ اس وقت ہمارے سامنے تھا، ہم ایک بے بس
تماشائی کی حیثیت سے تماشا دیکھ رہے تھے سارا ماجرا سن رہے تھے اور طوطا پری ایک ماہر معمہ باز کی طرح اس معمے کی تہیں
ایک ایک کر کے کھول رہا تھا —— سب کو اپنی طرف ہمہ تن متوجہ پا کر وہ آگے بولا —— "ابتدا میں میں نے بھی اسے خودکشی کا کیس
سمجھا اور شاید یہی سمجھتا رہتا، اگر مسٹر بے دھڑک میرے ماتحتوں کو اس میں الجھانے کی کوشش نہ کرتے ——"

طوطا پری نے اتنا ہی کہا تھا کہ قبلہ چہ خوب نے مداخلت کی —— "اس سارے چہ خوب کی غرض و غایت اگر تم پہلے
سے جانتے تھے تو تم نے اتنا انتظار کیوں کیا۔ بہت پہلے ہی اس چہ خوب کو ختم کر دیا ہوتا۔" طوطا پری نے جواباً کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا تھا کہ کوئی
سازشی چال ضرور چلا جا رہا ہے لیکن اس سے لاعلم تھا کہ یہ چال کب اور کس وقت چلا جائے گا اس لیے میں نے نہایت ہوشیاری
سے سر لینس اور اپنے چند معتبر آدمیوں کو کچھ اس طرح بے دھڑک سے ٹکرایا کہ انہیں کچھ ذرا سا شائبہ تک نہ ہو سکا [illegible]

چنانچہ مجھے ذہین مجرم کے بھاگنے قدم کی خبر ملتی رہی اور پھر دو روز قبل مجھے بے دھڑک کے مجرم ہونے کا مکمل یقین ہو گیا۔ جب یہ ڈائری مجھ تک پہنچی —— طوطا پری نے سرخ رنگ کی ایک چھوٹی ڈائری جو جیبی سائز کی تھی اپنی پتلون کی جیب سے نکال کر ہمارے حوالے کر دی۔ ہم نے ڈائری کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بے دھڑک کی طرف دیکھا، وہ بدستور فرش پر بیٹھا ہوا خلا میں نہ جانے کیسے تاک رہا تھا۔ ہم نے ڈائری کے اوراق الٹنے شروع کئے ہی تھے کہ طوطا پری نے کہا یوں تو اس ڈائری میں بے سر پیر کے مکالموں کی بھرمار ہے لیکن کچھ صفحات پر میں نے نشان دہی کے طور پر کاغذی تیر رکھ دیئے ہیں۔ یہ صفحات توجہ طلب ہیں ——

طوطا پری کی اس رہنمائی کی روشنی میں ہم نے انہی صفحات کی طرف توجہ دی، پہلے صفحے پر یہ جملہ لکھا تھا —

آج رات شہزاد صاحب کے کمرے میں ایک عدد غیر زہریلا سانپ چھوڑ گیا (صرف ڈرانے کے لیے)

اس تحریر کو پڑھتے ہی ہمارے رونگٹے جن کی ایستادگی میں کافی دیر سے کھڑے ہونے کی پاداش میں ذرا سا خم آگیا تھا ایک بار پھر خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بھیانک رات نظروں میں گھوم گئی۔ اس حرکت کے پیچھے جو جذبہ کار فرما تھا وہ ہمیں طوطا پری کی جانب بدگمانی کرنا تھا، اور اس میں بے دھڑک کو خاصی کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی —— ہم نے جھرجھری سی لے کر اگلا صفحہ پلٹا ——

پھوپھی اماں کی بلی ملا کر زہر دینے میں لطف بھی آیا اور دقت بھی پیش آئی۔ کم بخت بلی بڑی پھرتیلی اور سخت جان ثابت ہوئی ——

اس صفحہ پر بس یہی تحریر تھی، ہم نے اگلا صفحہ الٹا ——

سارا کام پلان کے عین مطابق ہوا۔ بلی کی زہر خورانی کو لے کر شہزاد صاحب کو بڑی آسانی سے پھوپھی اماں کی جانب سے بدگمان کر دیا ——

جیسے جیسے کوائف کھلتے جا رہے تھے ویسے ویسے حیرت کی تہیں چڑھتی جا رہی تھیں —— ڈائری کے تین ہی صفحات نے ہمارے چودہ طبق بلیک آؤٹ کر دیا تھا۔ ہم نے ڈائری بند کر کے پہلے تو طوطا پری کی طرف دیکھا۔ ہم سے نظریں ملتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ اس مسکراہٹ کی تاب نہ لا کر ہم نے بے دھڑک کی جانب دیکھا جو اس وقت پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا لیکن بڑا مضمحل اور بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ بڑی دیر بعد اس نے اب اپنی نظروں کا زاویہ [illegible] کرم جان داروں کی طرف کیا تھا۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر لال ڈائری پر پڑی۔ پل بھر کے لیے اس کی بے جان آنکھوں میں ایک عجیب سا رنگ لہرایا —— ایک مردہ سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لاتا ہوا بجھے ہوئے لہجے میں بولا —— سارا کھیل ختم ہو گیا یہ کیسی عجیب بات ہے —— کاغذ کے چند پرزے جو کل تک میرے راز دار تھے آج میری رسوائی کا باعث بن گئے —— اتنا کہہ کر وہ رک گیا پھر ایک بے ڈھنگا قہقہہ اچانک اس کے گلوگیر حلق سے آزاد ہو کر اور پھر وہ مسلسل تنہا چلا گیا۔ اس کی یہ مسلسل بلکہ لامتناہی ہنسی اس کی بتدریج بگڑتی ہوئی دماغی حالت کا ثبوت تھی۔ اچانک اس کی ہنسی میں بریک لگ گیا لیکن اس کا سانس بدستور دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ آگے بولا۔ یہ سچ ہے کہ سب کچھ میرے ہی ہاتھوں ہوا ہے مگر کیسے ہوا یہ میں نہیں جانتا۔ میرا خدا گواہ ہے۔ میں بالکل نہیں جانتا۔ لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ شاید پیسے کی خاطر دولت کی ہوس نے

شاید مجھے اندھا کر دیا تھا ——— پانچ لاکھ کا بیمہ بہت بڑی رقم ہے۔

یقیناً میں اندھا ہو گیا تھا، بلکہ اندھا ہوں، ——— !! اتنا کہنے کے بعد ہیریز پانی بننے کا دورہ اس پر پڑ گیا۔ جیسے یہ یہ دورہ تھا طوطا پری نے طنز سے کہا ——— مسٹر بے دھڑک اندھے پن کا ناٹک چھوڑیئے۔ پاگل پن کا ڈرامہ رچا کر آپ ہمیں مورکھ تو نہیں بنا سکتے۔ سچ سچ بتا دیجئے کہ مرحومہ نادرہ کا خون آپ نے دولت کی خاطر نہیں کیا بلکہ اب یہ بات آپ کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی کہ آپ کی بیوی آپ کے سامنے دوسروں کی بیوی کہلائے۔ دوسرے نوجوانوں کی محبوبہ کہلائے ——— !! طوطا پری نے اتنا ہی کہا تھا کہ بے دھڑک نے اچانک طوطا پری کے بجائے قبلہ چرخوب کی طرف چھلانگ لگائی جو مرحومہ نادرہ کے تعلق سے اس نئے دل خراش انکشاف کے بعد بت سے بن گئے تھے اور پستول والا ہاتھ بھی یوں لٹک گیا تھا جیسے بے جان ہو گیا ہو۔ بے دھڑک نے ان کی جانب چھلانگ اسی نیت سے لگائی تھی کہ ان کا پستول ہتیا لے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

(باقی باقی)

نظر برنی

شاطر جامعی کی ناگہانی موت

موت کے بارے میں دنیا کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے :

"تم کہیں بھی ہو" "موت" تم کو آکر رہے گی اگرچہ مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ ہو"

واقعی موت کی حقیقت کا ادراک اہل جامعہ کو اس وقت ہوا جب ان سے ۳۹ سالہ نوجوان ساتھی علاء الدین عباسی شاطر جامعی ۵ر اپریل کو ہمیشہ کے لئے اس عالم فانی سے رخصت ہو گیا۔ وہ اپنی زعفران زار شخصیت سے زندگی بھر دوسروں کو ہنساتا رہا اس کی بیوقت مفارقت نے یکایک سب کو رلا دینے پر مجبور کردیا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ یکم اپریل تک جو شخص ہم سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے وہ اصل میں ہمارے ساتھ اور خود اپنی زندگی کے ساتھ حقیقی اپریل فول منائے گا۔

علاء الدین مرحوم کی ایسی کوئی خاص عمر بھی تو نہیں تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ زیادہ طویل عرصہ تک منت کش علاج بھی نہیں رہے۔ بیٹھے بٹھائے یکم اپریل کی شب میں ان کو بخار نے بُری طرح جکڑ لیا اور ان کو اس وقت اپنی گرفت سے آزاد کیا جب وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

مرحوم کی زندگی جہاد پیہم سے تعبیر تھی۔ وہ ۱۹۶۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے مرکزی کتب خانہ میں ملازم ہوئے اور کلرکی کے راستہ سے اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدہ پر پہونچ گئے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ علاء الدین عباسی مرحوم ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ چوں کہ ان کو نام و نمود سے نفرت تھی اس لئے وہ اپنی پہچان کرانے سے بے حد کتراتے تھے انہوں نے جو کچھ کلام کہا، اس کو وہ اپنے قریبی ساتھیوں کو سنا کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ یا کبھی ایک آدھ اخبار یا رسالہ میں شائع کرنے کے لئے روانہ کر دیتے تھے۔ غالباً مزاج کی اسی کم آمیزی کا شاخسانہ تھا کہ انہوں نے ایک فرضی نام "شاطر جامعی" اختیار کیا اور زندگی بھر کسی مشاعرہ میں شرکت نہیں کی۔ ان کے قطعات میں طنز و مزاح کی آمیزش ہے۔ وہ سماج کی برائیوں کو ہدف ملامت بناتے ہیں، ان کو بے نقاب کرتے ہیں لیکن لہجہ بہت شگفتہ ہے۔ ان کے طنز میں تعمیری پہلو غالب ہے، کسی کی تضحیک مقصود نہیں۔

عباسی کی طبیعت میں جو شوخی اور ظرافت تھی، اس کا اظہار قدم قدم اور بات بات میں ہوتا تھا۔ وہ رعایت لفظی اور فقرے بازی سے مخاطب کو ہنسا دینے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

لیجئے، عباسی مرحوم (جو کہ ادبی حلقوں کے لئے شاطر جامعی تھے) کا طنزیہ کلام ملاحظہ فرمایئے جس میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادراک بھی ہے اور معاشرہ کی بعض برائیوں پر بھرپور طنز بھی۔

فریبی ملّا

ایک بوڑھے سے کیا عشق، تجھے کیا سوجھی
کیا تجھے یہ ہی "جوان" سارے زمانے میں ملا
تجھ کو معلوم نہیں اس کی حقیقت شاید
آنٹی بیوں کا یہ ابّا ہے "فریبی ملّا"

دل سیاہ

کام ان سے نہ کہو، کام کی عادت ہی نہیں
زندگی یوں ہی گذاری ہے، رہے بے پرواہ
حرکتیں سن ہی چکے حلیہ بھی دیکھو ان کا
بال ہیں برف کی مانند تو دل ان کا سیاہ

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

جمشید پور کے بہیمانہ فساد پر آج ہر چشم اشکبار اور ساری ہندوستانی قوم شرمسار ہے۔ کیا فولاد کے شہر کے آہنی بازو والے باشندوں نے اپنے دل بھی بدل ڈالے؟ ایسی ظالمانہ اور سنگدلانہ حرکتیں ہوئیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ایک سو سے زائد عورتوں اور بچوں کو بس میں زندہ جلا دینے کی خبر پہ تو یقین نہ آیا اور اس غیر یقینی کیفیت میں بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب اگر مذمت کریں تو کس کی کریں۔ فریاد کریں تو کس سے کریں، اور کب کہیں!

یہ حادثے اور یہ فسادات تو ملک کی روزمرہ زندگی کا لازمی جزو بن گئے ہیں۔ اسی طرح جیسے بھرے پرے شہر میں ٹرانک کے حادثے پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن ان ٹرانک کے حادثوں پر تو حکومت کچھ نہ کچھ سوچتی اور قدم اٹھاتی ہے۔ فسادات کے زہر کا اس کے پاس کوئی علاج نظر نہیں آتا ــــ حکمران قیادت میں سوائے صدر جمہوریہ ہند کے کسی نے بھی اپنی دلی تکلیف کا اظہار نہیں کیا ــــ ہمارے وزیر اعظم نے تو وہی رویہ اپنایا جو بھٹو کی پھانسی پر انھوں نے اختیار کیا تھا! مہر بہ لب ــــ گویا جمشید پور ان کی وزارت عظمیٰ کے حلقۂ اختیار سے باہر ہے! ــــ فولاد کی بھٹی کے اس شہر میں سیکولرازم پر فولادی عزم رکھنے والا ادیب زکی انور بھی قربان ہو گیا ــــ سیکولرازم کی بات کرنے والوں کے لئے لمحۂ فکر ہے کہ ــــ سیکولرازم پر ایقان رکھنے والے کا قتل، سیکولرازم کا قتل تو نہیں؟

●● "شگوفہ" کے عام شمارہ کی قیمت ۱۹۷۴ء سے ایک روپیہ پچاس پیسے ہے۔ لیکن ان چار پانچ برسوں میں کاغذ سے لے کر متعلقہ دوسری اشیاء کی قیمتوں میں تقریباً صد فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ہم نے آخر وقت تک کوشش کی کہ رسالہ کی قیمت میں اضافہ نہ ہو لیکن اس سے پرچہ کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہونے لگا تھا اس لئے بمجبوری معمولی سا اضافہ کیا گیا ہے۔ جون ۱۹۷۹ء سے عام شمارہ کی قیمت دو روپیے ہوگی اور سالانہ خریداری ۲۴ روپیے ــــ

امید ہے کہ قارئین 'شگوفہ' اس اضافہ کو قبول کر کے ہمیشہ کی طرح اپنے تعاون سے ہمیں نوازیں گے۔ سالانہ خریداروں سے خاص طور پر التماس ہے کہ وہ سالانہ خریداری کی تجدید کے لئے وی پی بھجوانے کا انتظار نہ کریں۔ منی آرڈر یا کسی اور شکل میں یہ رقم ارسال فرمادیں۔
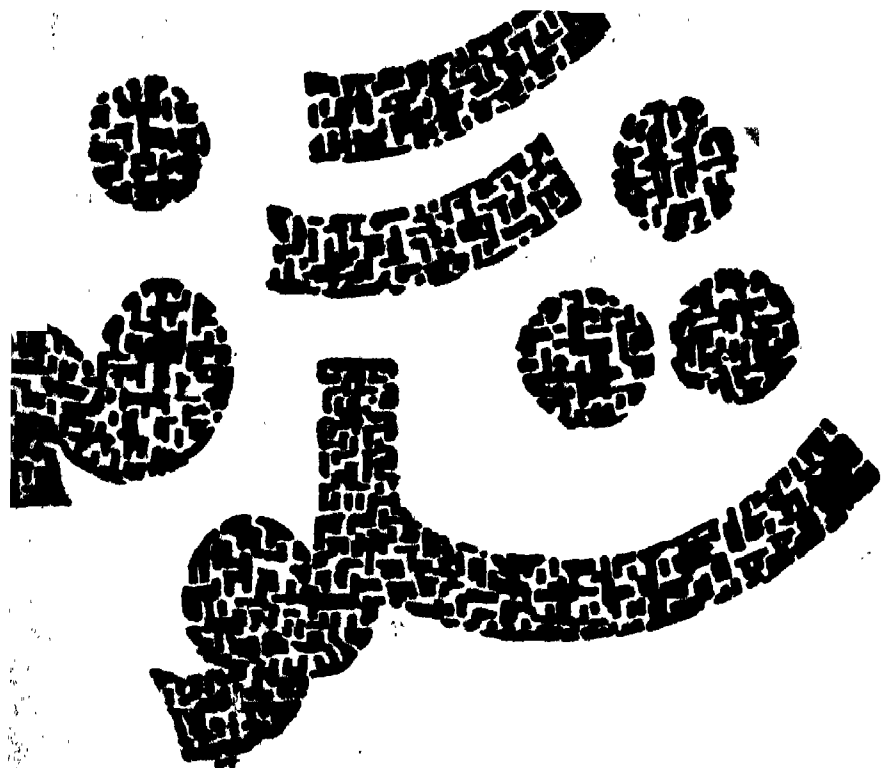
RIOTS IN BIHAR ALIGARH JAMSHEDPUR ETC ETC
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟
(غالب)

زندہ دلانِ حیدرآباد
کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

جلد	۱۲
شمارہ	۶
جون	۱۹۷۹ء

ایڈیٹر : سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت : حمایت اللہ، مسیح انجم

ٹائیٹل : شعیب

سرکولیشن منیجر : سیما جلیل

اعزازی منیجر : مظہر الزماں خاں

سالانہ ـــ ۲۰ ـــ روپے
بیرون ہند ـــ ۲۵ ـــ شلنگ
فی پرچہ ـــ ۲ ـــ روپیہ

طباعت : شمشیر ملک پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد ۲
باہتمام: ... حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۲۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون نمبر 57716

زندہ دلان حیدرآباد

کی دو نئی مطبوعات

ممتاز مزاح نگار

یوسف ناظم کے مضامین

فقط

قیمت چھ روپے

ممتاز مزاح نگار

بھارت چند کھنہ کے مضامین

کیا نام نہ ہوگا

قیمت آٹھ روپے

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور "سمن زار" کے مضامین بتوسط "شگوفہ"

رضا نقوی واہی

بیچارہ شاعر

کہا شاعر نے اپنے دوستوں سے، یارو، گھر والی
مری غزلوں کے حق میں بن گئی ہے مولوی حالی

بنا رہتا ہے میرا گھر سدا میدانِ پانی پت
ادا کرتی ہے وہ کردار احمد شاہ ابدالی

مری خوش فکریاں رہتی ہیں زد میں چاندماری کی
زباں اس کی فلیتہ ہے دہن بندوق کی نالی

نہ جانے شاعری سے اس کو بغض للّٰہی کیوں ہے
سمجھتی ہے مجھے قوّال، میرے فن کو قوّالی

محلے بھر سے شکوہ میری نااہلی کا کرتی ہے
دلوں کو موہ لیتی ہے بہا کر اشک گھڑیالی

کچھ اس انداز سے منہ گول کر کے بین کرتی ہے
کہ اردو میں کرے تقریر جیسے کوئی بنگالی

میں جب بھی شعر سازی میں ہمہ تن غرق رہتا ہوں
معاً آ کر سنانے لگتی ہے گھر کی زبوں حالی

کبھی کہتی ہے بچے بھوک سے روتے بلکتے ہیں
کبھی کہتی ہے آخر بک گئی کانوں کی بھی بالی

کچھ اس جھٹکے سے طعنہ میری بیکاری کا دیتی ہے
لچک کر ٹوٹ جاتی ہے مرے افکار کی ڈالی

مری ساری زباں دانی اٹک جاتی ہے تالو میں
نکلتے ہیں جو اس کے حلق سے الفاظ ٹکسالی

مرا ذہنِ رسا جولانیاں سب بھول جاتا ہے
نظر آتا ہے میدانِ ردیف و قافیہ خالی

مرے احباب جب بھی خوش گپّی کی خاطر آتے ہیں
سنا دیتی ہے، سب کچھ، ان بچاروں کو بجز گالی

میں اخلاقاً انہیں جب روکتا ہوں چائے پینے کو
تو بن جاتی ہے گھر جھگڑے کا، بس اک چائے کی پیالی

اسے سمجھاؤں کیونکر، شاعری ’فنِ لطیفہ‘ ہے
سدا رہتی ہے جس سے ذہن میں شاعر کے ہریالی

یہی وہ مملکت ہے، ’شیخ چلّی کی طرح‘ جس کا
بغیرِ شرکتِ غیرے، ہوں میں خود ساختہ والی

بس اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ چھوڑو اس نحوست کو
اسے چولھے میں ڈالو، پیٹ جب بچوں کا ہے خالی

میں اس حملے کے ڈر سے لرزہ بر اندام رہتا ہوں
کہ اس حملے سے میرے ذوق کی ہوتی ہے پامالی

ڈرا سہما ہوا بزمِ سخن سے گھر جب آتا ہوں
تو نذرِ طنز ہو جاتی ہے دل کی ساری ہریالی

سرِ بزمِ سخن ہوٹنگ سے ڈرتا نہیں لیکن
میں اس طوفان سے ڈرتا ہوں اٹھاتی ہے جو گھر والی

رضا نقوی واہی

نوارا تلخ تر می زن

جس تیزی سے فرقہ وارانہ فسادات بپا ہو رہے ہیں، اسی رفتار سے ملک کے طول و عرض میں مشاعرے بھی منعقد کئے جا رہے ہیں اور ہمارے شاعرانِ خوش نوا گردو پیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر، ان مشاعروں میں دادِ سخن حاصل کرنے کے لئے جوق در جوق شرکت کرتے رہتے ہیں
(واہی)

ہے فطرت شاعروں کی کتنی شوریدہ و سیمابی
برائے شرکتِ بزمِ سخن اللہ رے بے تابی

کہیں سے شعر خوانی کا بلاوا جب بھی آتا ہے
خوشی سے دل کے اندر چھوٹنے لگتی ہے مہتابی

بھیونڈی سے بنارس اور ٹاٹا سے علی گڈھ تک
وطن کی سرزمیں بنتی رہی تماکی سے عنابی

قیامت پر قیامت صبر سے گذری قوم و ملت کے
کلیجے سے لگی بیٹھی رہی، ان کی مگر ہا لی

کہیں کچھ ہو، انھیں کیا؟ وہ تو بس تب شعر سازی ہیں
مبارکباد کی ہے مستحق اُن کی یہ خوش خوابی

اُدھر جس تیز رفتاری سے ہیں خوں ریزیاں جاری
اِدھر دل میں ہے اتنی ہی غزل خوانی کی بیتابی

کلامِ حافظِ شیراز پہ شاید عمل کر کے
ہمارے شاعروں کے ذوق کی ہوتی ہے سیرابی

"حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی
نوارا تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

- نامور طنز نگار شاعر رضا نقوی واہی کی نظم ـ نوارا تلخ تر می زن ـ کے خلاف شعرائے مشاعرہ باز کا احتجاج خود واہی کی زبانی ـــ (ادارہ)

واہی کو شاعروں سے شکایت ہے برملا
کیوں ان کی صبح و شام ہے وقفِ مشاعرہ

حالاتِ گردو پیش سے کیوں بے نیاز ہیں
کیوں علتِ سخن میں ہیں دن رات مبتلا

جمشید پور اور علی گڈھ کا قتلِ عام
کرتا نہیں ہے کیوں متاثر انھیں ذرا

کیوں یہ حواس ہو کے لپکتے ہیں اُس طرف
آتی ہے جس مقام سے بوئے مشاعرہ

[illegible]
جو ـ دیکھئے کہیں نہ کہیں ہیں غزل سرا

واہی کی نکتہ چینی مگر واہیات ہے
اس کا یہ چار حاشیہ سراسر ہے یک رُخا

ہم شاعروں کی شرکتِ بزمِ سخن میں ہے
پوشیدہ، دال روٹی کا اپنی معاملہ

یہ تو ہے ایک مسئلۂ دوزخِ سخن
اپنے حصولِ رزق میں ہر شخص ہے لگا

ہر آدمی اسیر ہے شکنجۂ معاش میں
اس مسئلے پہ اُس کا نہ ذہن رسا گیا

اس کی ہے دال روٹی، برہینِ ملازمت
ہم سب کے رزق کا ہے وسیلہ مشاعرہ

ہم ڈیلی ویج والے، وہ تنخواہ دار ہے
دونوں کے سامنے ہے شکم کا مطالبہ

کیا اس نے چھوڑ دی کبھی اپنی ملازمت
وعدہ پڑا جو پہلے کبھی قتلِ عام کا

پھر ہم سے کیوں مطالبۂ ترکِ رزق ہے
دائم ہے جب فساد و تشدد کا سلسلہ

شہتیر اپنی آنکھ کا سوجھا نہیں مگر
تنکا ہماری آنکھ کا وہ دیکھنے لگا

محبوب مانبھوی

غزل

میں جو ہوں دل سے فدائے ابلیس
گھٹی مرے جی تو ہے گائے ابلیس

نامزد مجھ کو ہی کرتا اللہ
خالی ہوتی جو یہ جائے ابلیس

مجھ سے کیا بڑھ کے وہ ہوگا یارو
سامنے میرے تو آئے ابلیس

میرے کرتوتوں سے مانگے ہے پناہ
مجھ سے شرمندہ ہے ہائے ابلیس

کوئی خوش مجھ سے نہیں دنیا میں
سب ہی ناداں ہیں سوائے ابلیس

شکلِ انسان میں اس دنیا پر
ایک سے ایک ہیں چھائے ابلیس

کس نے لاحول پڑھا ہے محبوب
بھاگے ہے دُم کو دبائے ابلیس

کرنل محمد خاں

ایڈن برامیں

عورت کا آخری داؤ

ایڈن برامیں ہمارے رہنما لفٹیننٹ کرنل سپرڈ تھے۔ فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے لیکن اب دوبارہ بطور سویلین بھرتی ہو کر متفرق بیگاریں انجام دیتے رہتے تھے۔ مثلاً ہم جیسے مہمانوں کا استقبال کرنا، دوسروں سے ملانا، کھلانا پلانا، ہنسانا کھلانا الغرض انگریزی لفظوں میں لک آفٹر کرنا۔ لیکن کرنل سپرڈ اپنی رنگا رنگ شخصیت سے بیگار کو بھی بہار دیتے تھے۔ ہمارے لیے اور دلچسپ ثابت ہوئے کہ ایک عمر غیر منقسم ہندوستان خصوصاً پنجاب اور سرحد میں گزار چکے تھے۔ اردو خاصی بول لیتے تھے مگر ذرا بھاری بھرکم سی۔ کہتے تھے۔ پنجابیوں اور پٹھانوں کے ساتھ استعمال کرنے سے ذرا پتھریلی ہو گئی ہے۔ عمر کے لحاظ سے تو اب جوانی کو پیچھے چھوڑ آئے تھے لیکن باتیں بدستور رنگین مزاجوں کی سی کرتے تھے۔ ہمیں مختلف مقامات و شخصیات تک لے جانے لگے تو کار میں بیٹھتے ہی بولے:

"کرنل خان آپ غلط وقت پر ایڈن برا آئے ہیں۔ یعنی کوئی ایک مہینہ قبل از وقت۔"

کہا: "ایک مہینہ بعد کونسی نعمت تقسیم ہونے والی ہے؟ ہم پھر بھی آسکتے ہیں۔"

بولے: "ضرور آیئے۔ اگلے ماہ ایڈن برا میوزک فیسٹیول[*] شروع ہو رہا ہے۔ بڑی غضب کی رقاصائیں آئیں گی۔"

وہ تو ہم نے لندن میں بھی دیکھی ہیں۔ یہاں کی رقاصائیں کچھ غضب کی ہوتی ہیں؟"

"رقص کے اعتبار سے تو نہیں، لیکن لباس کے لحاظ سے یقیناً۔"

"کون سا لباس پہنتی ہیں۔؟"

"کوئی سا لباس نہیں پہنتیں۔"

---

[*] ایڈن برا میں ہر سال اگست کے مہینے میں رقص و موسیقی کا بین الاقوامی میلہ لگتا ہے۔

"تو یہی ہے وہ نعمت جس کی بشارت آپ دے رہے ہیں؟"

"بے شک۔"

یہ کہہ کر کرنل سیپرڈ ہمیں داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد عریانی وہ جنس نہیں رہتی جسے دیکھ کر آدمی بے قابو ہو جائے۔ بلکہ حیرت تھی کہ کرنل سیپرڈ ایک ایسے واقعہ کے تصور سے جو ایک ماہ بعد ہونے والا تھا، جوانی کو اس زور سے آواز دینے لگے تھے۔ ان کا طویل رنڈاپن بھی اتنی بیشگی چیخ پکار کا کافی جواز تھا۔ چنانچہ ہم نے کرنل صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"میرے دوست۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔"

بولا: "ہمدردی کا شکریہ۔ لیکن وہ رقاصائیں ظالم ہیں ہی بڑی صبر آزما۔"

"مجھے آپ سے بھی زیادہ ان رقاصاؤں سے ہمدردی ہے۔"

"ارے تمہارا دل ان ایمان شکنوں کے لیے بھی گداز ہونے لگا؟ بھلا کیوں؟"

"اس لیے کہ بے چاریاں زندگی کی دوڑ میں کپڑوں سمیت ناکام رہ گئیں تو کپڑے اتار کر دوڑنے لگیں۔"

"ارے میاں، یہ کپڑے اتارنا نہیں، محبوس جسم کو آزاد کرنا ہے۔ تم آزادیٔ حسن کو کیا ناکام کہتے ہو؟ حیف!"

ہم نے بھی فلاسفی جھاڑی اور کہا:

"کرنل، تمہارے اندر ایک حریص مرد بول رہا ہے ورنہ عریانی نسواں حسن کا آخری داؤ ہے۔ جس عورت نے اپنے حسن کی نمائش کے لیے برہنگی کا سہارا لیا، اس نے گویا اپنا آخری داؤ لگا دیا۔"

بولا: "ارے میں بھول رہا تھا۔ تم تو برقع فلاسفی کے قائل ہو۔"

"نہیں جناب۔ برقع ہم بھی ترک کر چکے ہیں۔ ہم شلوار قمیص فلاسفی کے قائل ہیں۔ خدا ہر درد کو استقامت بخشے۔"

"بڑی دل سے دعا نکل رہی ہے۔"

"اس لئے کہ ہماری شلوار اور قمیص بھی کچھ دنوں سے مائل اختصار سی ہیں۔"

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

اتنے میں کار ایک عمارت کے سامنے رکی جس کی پیشانی پر لکھا تھا: "سکاٹش کما د لائبریری"۔ یہ ہماری سیر و تماشا کی پہلی منزل تھی۔ اندر گئے تو دفتر میں ایک ادھیڑ عمر کی ایک معتبر صورت خاتون بیٹھی تھی جو لائبریرین لگتی تھی۔ سیپرڈ نے ہمارا تعارف کرایا تو محترمہ نے ہمیں پاکستانی پا کر قدرے فالتو شفقت سے خیریت مزاج پوچھی اور پھر بلا تاخیر وجہ شفقت بھی بیان فرما دی۔ یعنی یہ کہ آپ ایک پاکستانی داماد کی خوشدامن تھیں۔ لہٰذا ہم سے ایک رشتہ، ایک نسبت محسوس کرتی تھیں اور جواباً ہم نے بھی رشتہ داری کا اقرار اور اظہار کیا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک نوجوان سکاچ لڑکی قمیص شلوار پہنے مسکراتی مسکراتی کمرے میں داخل ہوئی۔ یہی محترمہ کی بیٹی یا ہمارے ان دیکھے پاکستانی بھائی کی بیوی تھی۔ اب سخن گسترانہ بات صاحب زادی کا پاکستانی بہو ہونا نہ تھا بلکہ پاکستانی قمیص شلوار میں ملبوس ہونا۔ ہم نے فوراً سیپرڈ کو بڑے فخر کے ساتھ اپنی خواتین کا لباس دکھایا

لڑکی نے لباس کی تعریف کو اپنی تعریف بھی سمجھا تو خوشی میں اٹھکھیلیاں کی لٹ جھٹکا کر 'فیشن پریڈ' کی ادا کے ساتھ اپنے گرد چکر لگا کر دکھایا۔ گویا کہتی ہو ـــــ "اب دیکھو" پھر اسی موڈ میں دلہنوں کی طرح دوپٹہ اوڑھ کر نگاہیں پہلے نیچی کرتے ہوئے اور پھر ذرا اوپر اٹھا کر حاضرین کو دکھایا جیسے کہتی ہو "یہ بھی دیکھو" ـــــ اس کے چہرے پر لٹوں کی بہار بھی دیدنی تھی۔ لیکن جب اس نے شفون کا دوپٹہ اوڑھ کر گھونگھٹ کا کونہ کھینچا تو غالب گواہ کہ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا ـــــ سیبرڈ کے لیے یہ شرقی ادائیں، جتنی اجنبی تھیں، اتنی ہی دلکش تھیں ـــــ مسحور سا ہوگیا اور اپنی ننگی رقاصاؤں کو دفعتاً بھول کر چلا اٹھا: "بیوٹی فل ـــــ" ہمیں تسلی ہوئی کہ پاکستانی قمیص شلوار ـــــ اور دوپٹے ـــــ کے متعلق ہمارا حسن ظن بجا تھا۔

سر آپ کا عصمت کی حفاظت کا انتظام کمزور ہے

لنچ کا وقت ہوا تو سیبرڈ ہمیں سکاٹش کمانڈ کے میس میں لے گیا جو جوان کے باتونی افسروں سے بھرا پڑا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے میں مزا ہے تو ان کے کھانے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی برجستہ باتوں اور پیوستہ گپّوں کی وجہ سے ہمارے فوجی میس کھانے کے لحاظ سے انگریزی میسوں سے بلاشبہ بہتر ہوتے ہیں لیکن جوکاری، کراری، مردانہ، بے باکانہ، بے دریغ، بھرپور 'ٹیبل ٹاک' انگریزی میسوں کا خاصہ ہے، ہمارے میسوں میں کم سنائی دیتی ہے ایک تو ہمارے میسوں میں فقط سینیئر بولتا ہے باقی سب سنتے ہیں اور آخر میں یس سر کہہ دیتے ہیں یا اس کے ہزار بار سنے ہوئے لطیفوں پر جی کڑا کر کے کھوکھلی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ اس کے برعکس برطانوی افسر ایک دفعہ میس میں آجائیں تو نہ کوئی بندہ رہتا ہے نہ کوئی بندہ نواز۔ بڑے بہت بڑے نہیں بنتے اور چھوٹے چھوٹے نہیں رہتے۔ جونیئر بولتا ہی نہیں موقع پاکر چوٹ بھی کرتا ہے جسے سینیئر خندہ پیشانی سے سنتا اور سہتا ہے لیکن دلیسی اور برطانوی میسوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمارے میسوں میں تند ترین مشروب لیمن سکواش یا کوکا کولا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے مشروب تزکیۂ نفس میں ممد ہوں تو ہوں، محفل کو گرمانے اور رنگ لانے کی خاصیت ان میں نہیں پائی جاتی۔ ادھر برٹش میسوں میں اس شئے کی فراوانی ہے جو ہمارے ہاں فقط شعروں میں ملتی ہے اور زبانی زبانی پی جاتی ہے مجھے بے شک حرام ہے لیکن رونق بزم مے نوشوں ہی سے ہے۔ یوں نہ ہوتا تو غالب ـــــ جو کسی برطانوی میس کے ممبر بھی نہ تھے ـــــ کبھی نہ کہتے کہ

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہم اینٹی روم میں داخل ہوئے تو افسروں میں کسی مسئلے پر بڑی پرجوش بحث ہو رہی تھی۔ کچھ سننے اور سمجھنے کے بعد پتہ چلا کہ برلن وال BERLIN WALL ہے۔ یہ وہ بدنام دیوار نہ تھی جو مشرقی اور مغربی برلن کے درمیان روسیوں نے بنائی ہے بلکہ ایک مقامی دیوار تھی جو افسروں کے کوارٹروں اور قریب کی شہری آبادی کے درمیان اس غرض سے کھڑی کی گئی تھی کہ شہری علاقے میں کچھ سرخ روشنی کے دھبے نظر آتے تھے جو اعلیٰ کمان کی نظروں میں افسروں کی اخلاقی صحت کے لیے فائدہ بخش نہ تھے۔ لیکن اب جونیئر افسر اور خصوصاً کنوارے افسر بالائی کمان کے اس ظلم پر احتجاج کر رہے تھے کہ یہ اقدام بنیادی انسانی حقوق کے منافی ہے اور یہ تعمیر ان کی ذاتی تفریح میں سدِّراہ ہے۔ اسی بیزاری کی شدت کے اظہار کے لیے ان لوگوں نے اسے ـــــ بدنام ترمعنوں میں۔ برلن کال کا نام دیا تھا۔ جونیئر افسروں کا ماؤ یلاسُن کر ایک بریگیڈیئر صاحب جو

حاضرین میں سب سے سینئر تھے بولے :

" یہ دیوار ضروری ہے یہ شادی شدہ افسروں کی خانگی مسرت اور کنوارے افسروں کی اخلاقی عصمت کی حفاظت کی ضامن ہے ۔"

ایک جوان کیپٹن بولا: " معاف کیجئے کانسر ، اگر مقصد وہی ہے جو آپ نے بیان فرمایا ہے تو آپ نے بیاہتا مسرت اور بن بیاہتا عصمت کا نہایت کمزور انتظام کیا ہے ۔"

بریگیڈیر صاحب کسی قدر حیرت سے بولے: " تمہارا مطلب ہے یہ پندرہ فٹ اونچی دیوار پھاندی جاسکتی ہے ؟ ناممکن ——— اگر کوئی افسر اس پر چڑھ کر دوسری طرف سالم اتر جائے تو میں اس کے لیے ملٹری کراس کی سفارش کر سکتا ہوں ۔"

اس پر ایک نوجوان سا میجر بولا :

" سر ، اگر یہ بات ہے تو کیپٹن گارڈنر کل رات سے ایم سی اینڈ بار کے لیے کوالیفائی کر چکا ہے ۔ یہ بہادر افسر نہ صرف دیوار پھاند کر اس طرف گیا بلکہ دوبارہ پھاند کر اس طرف بھی آیا اور سالم ۔ دیکھیں وہ بیٹھا ہے ۔"

اس پر جملہ حاضرین نے کیپٹن گارڈنر کی طرف دیکھا ۔ کیپٹن گارڈنر ایک خوش شکل اور خوش وضع افسر تھا ۔ اپنی نشست سے اٹھا اور جھک کر بریگیڈیر صاحب سے بولا :

" آپ کی نوازش کا شکریہ ۔ لیکن میرے لیے ملٹری کراس قبول کرنا شاید مناسب نہ ہوگا ۔ میری حقیر کوشش کا ثمرہ مجھے مل چکا ہے ۔"

اس پر جو قہقہہ بلند ہوا اس کی گونج بیشتر بریگیڈیر صاحب کے گلے کی مرہونِ منّت تھی ۔ جب قہقہہ تھما تو بریگیڈیر صاحب نے ازراہ مذاق کہا :

" جنٹلمین ——— آئیے اس معاملے میں ہم اپنے پاکستانی مہمان کو ثالث مقرر کرتے ہیں ۔"

پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولے ،

" کرنل خان ، بتائیے کیا رائے ہے آپ کی ؟ دیوار رہے یا گرا دی جائے ؟"

اب ایک ایسی محفل میں جہاں کنواروں یعنی دیوار شکنوں کی اکثریت تھی ، یوں بھی ہمارا قیام دیوار کی حمایت کرنا عقلمندی نہ تھا ۔ لیکن مڑ کر دیکھا تو غالب بھی سرگوشی کر رہے تھے :

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب ؟
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

چچا کا اشارہ پاکر ہم نے بے محابا انہدام دیوار کے حق میں ووٹ دیا اور ڈٹ کر اعلان کیا ،

" DEMOLISH IT " (گرا دو !)

اس پر کنواروں نے اس زور سے نعرہ بلند کیا جیسے دیوار گرانے کے لیے ڈائنا مائٹ پھٹ گیا ہو ۔

پرنس کریم آغا خاں اسمٰعیلیوں کے محلّے میں

سیر سے فارغ ہوکر ہوٹل پہنچے تو کچھ آرام کیا کہ رات ایک اور طاقت رُبا تقریب انتظار کر رہی تھی یعنی ایڈن برا یونیورسٹی میں ڈنر اور ڈانس پارٹی۔ اہل جامعہ یہ تکلف ہماری خاطر نہیں بلکہ حسب معمول اپنے طلبا اور طالبات کی خاطر کر رہے تھے۔ وہ تو اتفاق تھا کہ ہم بھی شہر میں موجود تھے اور پردیسی جان کر ہماری موجودگی کا بھی فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔

پارٹی پر جانے سے پہلے سوال پیدا ہوا کہ کپڑے کون سے پہنے جائیں۔ ڈنر جیکٹ تو ہمارے پاس تھا نہیں اور ایسی تقریب پہ عام سوٹ پہننا اگر نا جائز نہ تھا تو نامناسب ضرور تھا۔ ہم اپنے ساتھ ایک نسخہ اپنے قومی لباس کا بھی لے تو گئے تھے لیکن یہ خالص پاکستانی تقریب کے لیے تھا۔ اب کوئی حل نہ سوجھا تو ہم نے کرنل شیپرڈ سے رجوع کیا۔ بولا:

"قومی لباس پہن کر دکھاؤ پھر فیصلہ دوں گا۔"

ہم ڈریسنگ روم میں گئے اور تھوڑی دیر بعد سیاہ اچکن اور سفید شلوار پہن کر نمودار ہوئے تو شیپرڈ دیکھتے ہی چلّایا۔

THIS IS IT. "(بات ہوئی نا!)"

سو ہمیں اپنی اچکن اور شلوار کی نامعقولیت کا خوف نہ تھا لیکن ہم محض گھر سے نکل کر بازار سے نہیں گزر رہے تھے بلکہ ایک خاص تقریب میں شامل ہو رہے تھے۔ جہاں مرکز توجہ بننے کا اندیشہ تھا اور ہمیں اگر ایک چیز سے وحشت ہے تو وہ ہزاروں آدمیوں میں مختلف، نظر آنے سے ہے نگاہوں یا اشاروں کا نشانہ بننے سے ہے۔ حد یہ کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ زندگی کا لطف تماشا بننے میں نہیں، تماشائی ہونے میں ہے۔ اسی لیے گمنامی کو ہم نے ہمیشہ نعمت سمجھا ہے۔ لیکن آج ہم اس نعمت سے محروم ہونے والے تھے کہ فی الواقع ہزاروں میں ایک بن کر جا رہے تھے۔

ہال میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ جملہ زن و مرد مع جن و ملائک ہمیں ہی گھور رہے ہیں۔ ہمیں احساس ہوا کہ ہمارا چلنے کا طریقہ وہ نہیں جو ہم سے خاص تھا۔ بہرحال ہم شیپرڈ کے ساتھ چلتے رہے حتیٰ کہ آگے سے میزبان نے آکر ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمارا تعارف ابھی آدھا ہی کرایا جا چکا تھا کہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا:

"آپ کو اس شاندار لباس میں دیکھنا کس قدر پرلطف ہے۔"

پھر اپنی بیوی کو بلا کر کہنے لگا۔ "جینی آؤ۔ اپنے پاکستانی مہمان سے ملو۔ دیکھو۔ بالکل پکچر کارڈ کی طرح نہیں لگتا؟"

"بے شک لگتا ہے!" —— جینی نے اپنے خاوند کی تائید اور ہماری توصیف میں کہا۔ ...

قریب کھڑے ہوئے لوگ کچھ کہہ رہے تھے، چھوڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ یعنی وہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ ہمارے تماشا بننے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ لیکن سوچا کہ اس ریل سے اب کوئی مفر تو ہے نہیں۔ کیوں نہ وقار سے تماشا بنیں! اور ان معنوں میں تماشا بننا ایسا معیوب بھی نہ تھا۔ آخر ہر خاص آدمی عوام میں تماشا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے ذہن کو کسا اور اعتماد کو جھنجھوڑا اور تشکر میں تھوڑا سا روماں ملا کر اپنی میزبانہ سے کہا:

"داد کا شکریہ میڈم۔ لیکن کاش میں مصور ہوتا۔ پینٹ کرنے کو مجھے ایسی صورت پھر کبھی نہ ملے گی۔"

تعریف کی تپش سے ہماری میزبانہ کھڑی پگھل گئی۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو اپنے قدردانی کو دونوں جہاں بخش دیتی مگر فی الحال آنے والے مہمانوں کے استقبال میں مشغول تھی۔ چنانچہ زبانی فدا ہونے کے بعد ہمیں شیرڈ کو سونپتے ہوئے بولا:

"ٹونی۔ ہمارے پاکستانی مہمان کو آگے لے چلو اور دلچسپ لوگوں سے ملواؤ۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہمیں کسی سے ملوانے کی حاجت نہ تھی۔ دلچسپ اور غیر دلچسپ لوگ خود کھنچ کر ہماری طرف یعنی ہمارے لباس کی طرف آرہے تھے بعینہ جیسے اسمٰعیلیوں کے محلے میں بغیر اطلاع پرنس کریم آغا خاں آنکلیں ، مردوں سے ملنا آسان تھا۔ کسی نے ہمارے مزاج پوچھے ، کسی نے پاکستان کے اور ہم نے ہر دو کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ دونوں بہ اللہ کا فضل ہے لیکن عورتوں اور خصوصاً کالج کی چنچل لڑکیوں سے اس شتابی سے فارغ ہونا ناممکن نہ تھا کہ وہ مزاج سے کچھ زیادہ پوچھنا چاہتی تھیں۔ ایک نیم عریاں بڑی بی نے جو بظاہر انڈیا دیکھ چکی تھیں ، اپنا لال لگام سنوارتے ہوئے ، ہم سے سوال کیا:

"آف کورس ، تم مہاراجہ ہونا ؟"

کہا: "محترمہ آپ کو میرے گلے میں ہار یا کانوں میں بُندے نظر آتے ہیں ؟"

میرے گلے اور کانوں کا ذرا غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے بولیں : "نہیں تو۔"

عرض کیا، "تو پھر میں مہاراجہ نہیں ہو سکتا۔ اور بہر حال پاکستان میں بھیڑیا اور بن مانس تو ملتا ہے لیکن مہاراجہ نہیں پایا جاتا۔"

"تو پھر ضرور نواب ہوگے۔" ـــــــ یہ تشخیص ایک سگریٹ نوش تنگ قبا خاتون کی تھی جن کا گاؤن ان کے جسمانی رازوں کا اتنا ستار نہ تھا جتنا غماز تھا۔ پہلے تو خیال آیا کہ ہاں کہہ دوں۔ آخر ملک لالہ کا سرکاری مکان تو ہے ہی۔ اس میں تھوڑا سا مبالغہ ملا کر یعنی قرب و جوار کا کچھ علاقہ جمع کر کے نواب آف فیوڈل ایریا بن جاؤں لیکن ساتھ ہی اس نوابی کے کچھ ڈپلومیٹک عواقب بھی ذہن میں ابھرے۔ سوچا کہیں پیچھے سے[1] اسلام آباد کو پتہ چل گیا تو ہمیں اٹیڈن برا کیا سل کے کسی تہہ خانے میں بطور امانت منتقل نہ کر دیا جاؤں۔ چنانچہ ارادہ بدل لیا اور کہا:

"نہیں محترمہ ـــــ میں نواب بھی نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا ہو ؟" محترمہ نے فیصلہ کن مطالبہ کیا۔

میرا ہاتھ دیکھ کر یہ کہا

اُدھر سے رنگا رنگ گاؤنوں میں ملبوس چار پانچ نوجوان طالبات کی ایک ٹولی ہماری طرف بڑھتی نظر آئی اس ٹولی پر ہماری نگاہ پڑی تو ایک سرخ پوش ماہرو پر اٹک گئی کیونکہ وہی اس ٹولی میں خیز خبر کی شہ سرخی تھی اور دوسروں سے مطالعہ پر مجبور کر رہی تھی ـــــ ظالم کے سینہ پر گاؤن کا یہ عالم تھا جیسے دو چیتوں پر تھامینہ تنا ہوا ہو۔ قریب آکر بولی :

---

[1] ...... میں ماہرین پڑھا نہ جائے۔

گفتگو کا آخری حصہ سننے کے بعد ہم سے مخاطب ہوئی :

"مجھے معلوم ہے تم کیا ہو : تم پامسٹ ہو۔"

اب ہم دست شناس تو نہ تھے لیکن تھوڑے سے میم شناس ضرور تھے اور جب دیکھا کہ ایک نہایت ہی خوب صورت تجربے کے زیر مطالعہ آنے کا امکان ہے تو اقبال کر لیا اور کہا :

"ینگ لیڈی۔ میں پیشہ ور پامسٹ تو نہیں لیکن گاہے گاہے ازراہ شوق اس سے شغل سے انکار بھی نہیں۔"

"تو پھر، پلیز، میرا ہاتھ دیکھو۔" سرخی نے اچانک مطالبہ کیا۔

"یوں کھڑے کھڑے ہاتھ نہیں دیکھا کرتے، یہ بڑا یکسوئی، انہماک اور تنہائی کا معاملہ ہے۔"

بولی : "تو پھر آؤ۔ ساتھ کے کمرے میں چلتے ہیں۔"

اور نیک بخت نے ہمارا بازو پکڑا یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اپنا بازو پکڑوایا اور ہمیں اس کمرے میں لے گئی اور ہمیں صوفے پر بٹھا کر اپنا ہاتھ ہمارے زانو پر رکھ دیا۔ پھر کسی قدر اشتیاق بھرے انداز میں ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی :

"میں ایک مدت سے پاکستانی پامسٹ سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ بڑی اچھی قسمت بتاتے ہیں۔"

"آپ کو کسی پاکستانی پامسٹ کا تجربہ ہے ؟"

"ہاں ہاں، میری سہیلی الزبتھ کا ہاتھ بھی ایک پاکستانی ہی نے دیکھا تھا اور اسے قسمت کا حال صحیح صحیح بتا دیا تھا۔ حتیٰ کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی شادی بھی ہو گئی۔"

"کس کے ساتھ ؟"

"اسی پاکستانی کے ساتھ۔"

ہم نے اپنے ہم وطن کو دل ہی دل میں شاباش دی اور سرخ پوش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ لیکن اپنے ہم وطن کے نقش قدم پر چلنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا یا یوں کہیں کہ توفیق نہ تھی لہٰذا منجھے ہوئے نجومیوں کی طرح سب سے پہلے اپنے معمول کا یہی مغالطہ دور کیا اور ایک مدت تک ہاتھ پر نظر جمائے رکھنے کے بعد ایک پُراسرار آواز درسے میں کہا :

"اے لڑکی۔ تیری قسمت میں پاکستانی نہیں لیکن غم نہ کر۔"

"تو پھر کون ہے ؟" لڑکی نے جائز مطالبہ کیا۔

"ایک لمبے بالوں والا شہزادہ جو تمہاری طرف چل پڑا ہے۔"

"شہزادہ ؟ اور کہاں سے ؟"

ہم نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ لہرایا جس سے تقریباً چاروں سمتیں ظاہر ہوتی تھیں اور اس کی نگاہ میں اگر کسی طرف کوئی شاہزادہ تھا تو اپنی پسندیدہ سمت چن سکتی تھی۔

"کب آئے گا ؟"

اس سوال پر ہمیں وہ شعر یاد آیا جس میں غائب یار سے ملاقات کا ابتدائی ٹائم ٹیبل درج ہے :

میرا ہاتھ دیکھ برہمنا میرا یار مجھ سے ملے گا کب تیرے منہ سے نکلے خدا کرے اسی سال میں اسی ماہ میں

ہم دل میں شعر تازہ کر رہے تھے کہ سرخ پوش نے بے تابی میں سوال دُہرایا ۔
"کب آئے گا پلیز ؟"
ہم نے اس کے ہاتھ کو ذرا ترچھے زاویے سے دیکھا اور کہا ۔ اسی سال میں ۔"
"سچ ؟" ــــــ اس نے پھول کی طرح کھلتے ہوئے پوچھا ۔

" بلکہ اسی ماہ میں ۔"
"سچ مچ ؟ اوہ ؟" ــــــ اور مکمل کنول بن گئی ۔

اور پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی معمول نے اپنے عامل کا ہاتھ کامل شوق کے ساتھ اٹھایا اور لبوں تک لے گئی ۔ لیکن اس حسین کلائمکس پر پہنچتے ہی چار اور لڑکیوں نے ہماری جانب ہاتھ بڑھا دیئے ۔ انہماک میں ہم نے یہ نہ دیکھا تھا کہ صوفے کے پیچھے امیدواروں کا کیو لگ رہا ہے ۔ لیکن وہاں تو ہاتھ دیکھنے کے لیے پوری رات تھی ۔ آپ کے پاس یہ کہانی سننے کے لیے وقت کہاں ؟ آپ سو جائیے ۔ شب بخیر ۔ کل آپ سے لندن میں ملاقات ہوگی ۔

دوسرے روز شام کو لندن پہنچے ۔ رات پھر آرام سے سوئے کہ یہی گزشتہ شب کے رت جگے کا تقاضا تھا اور اگلی صبح منہ دھو کر چاند سا مکھڑا لیے مس پارس کو سیر ایڈن برا کی رپورٹ دینے چل پڑے کہ یہی مس موصوفہ کا تقاضا تھا ۔ مس پارس کے پاس مہمانوں کے لیے اسکاٹ لینڈ کی سیر سب سے دل کش تحفہ تھا اور ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہماری روداد سفر سننے کو بیتاب اور سُن کر نہال ہوگی ۔ ایڈن برا میں ہمارا وقت یوں بھی خاصا گزرا تھا ۔ پارس کو نہال کرنے کے لیے ہم نے کچھ مزید رنگ بھرا ۔ بالخصوص یونیورسٹی کے ڈنر اور اپنے لباس کا ذکر کیا تھا تو پھڑک اٹھی لیکن جب اپنی پامسٹری کا واقعہ سنایا تو ذرا بگڑنے لگی جیسے اپنے گھر کا جوتشی اور دیکھا دیکھے غیروں کی !" ہم نے کہا :

بگڑنے کی کوئی بات نہیں ۔ ہم آپ کی ریکھا بھی دیکھ لیں گے ۔ ذرا فراغت میسّر ہولے ۔"
اور پھر اپنے سکّہ بند جملے کا اضافہ کیا : یہ یکسوئی ، انہماک اور تنہائی کا معاملہ ہے ۔"
مس پارس عقل مند لڑکی تھی ۔ ہماری بات سمجھ گئی اور اسی خوشی میں ہمیں مژدہ سنایا :
"اگلے ہفتے منگل کو آپ آکسفورڈ یونیورسٹی کا دورہ کر رہے ہیں جہاں جوڈی ایڈن آپ کی گائیڈ ہوگی ۔"
اور ایک ہی قہقہے کے بعد اضافہ کیا ۔
" اللہ آپ کا نگہبان ہو !"

اس پر ہم نے سوالیہ " ہوں ؟" کی تو ادھر سے جواب آیا " نہ " پہ بات ختم ہوگئی ۔
لیکن آکسفورڈ جانے سے پہلے ہمارا ان دنوں تم مصروفیتیں تھیں ہفتے کے دن بریگیڈیر حسن کی پارٹی میں جو وہ رخصت ہونے والے ہائی کمشنر کے اعزاز میں دے رہے تھے ۔ اور اتوار کو برائٹن کی سیر جس کا انتظام محمد اقبال اور محمد نواز نے مل کر کیا تھا ۔

ابن انشاء

کراچی میں آجکل دودھ کا مسئلہ چل رہا ہے یوں تو آٹے کا مسئلہ بھی ہے لیکن وہ ایسا تشویشناک نہیں کیونکہ لوگوں
روٹی نہ ملے تو کیک کھا سکتے ہیں۔ دودھ کی بات اور ہے یہ ہمارے ملک کے لوگوں کی مرغوب غذا ہے۔ بچوں کی تخصیص نہیں
مارے ملک کے بڑے بڑے سیاستدان بھی جب بات کرتے ہیں تو یہی لگتا ہے جیسے دودھ پیتے بچے بول رہے ہوں۔ خیر سیاستدانوں
کا کیا ہے۔ پیسے والے لوگ ہوتے ہیں دودھ نہ ملے تو گرائپ واٹر پی سکتے ہیں۔ لیکن عوام الناس کی دودھ کی ضروریات تو دودھ
ی سے پوری ہوسکتی ہیں اِتنا گرائپ واٹر کہاں سے آئے گا۔

دو تین دن جو دودھ کا کال پڑا۔ ہم اتفاق سے یہاں نہیں تھے۔ لاہور میں تھے اس لئے اپنا ذاتی تجربہ نہیں رکھتے ہمارے
یک ہم قلم نے البتہ جو بپتا لکھی ہے وہ دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں چوری چھپے دودھ سپلائی کرنے والے گوالوں کی تلاش میں میں نے اپنے
یک بھائی کو کورنگی دوڑایا دوسرے کو نیو کراچی بھیجا۔ اور خود ناظم آباد کی سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ دیکھا کہ ایک شخص پراسرار حالات
ں لوگوں سے نظروں سے بچتا بچاتا کچھ دامن میں چھپائے لئے جا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دودھ کی بوتل ہوگی۔ بس اس کے پیچھے بھاگا
ے بھاگتے دیکھ کر لوگ میرے پیچھے بھاگنے لگے لین ڈوری بندھ گئی جب اس شخص نے دیکھا کہ اب میں پکڑا جاؤں گا تو بوتل گھما کر پاس
یک تالاب میں پھینک دی۔ ڈھکنا کھل گیا۔ اور تالاب میں مل گیا۔ وہ جو پانی کا تالاب تھا۔ کراچی والوں کے حساب سے دودھ کا
لاب بن گیا کیونکہ اس میں دودھ اور پانی کا تناسب عین وہی تھا جس کے کراچی والے عادی تھے۔ لوگ گھروں کو بھاگے گئے اور
ر بالٹیاں بھرنا شروع کردیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تالاب خالی ہوگیا۔

ممکن ہے سطحی نظر والوں کو اس واقعہ میں کس قدر مبالغے کی بو آئے لیکن یہ بات ایک موقر کالم نگار نے لکھی ہے اور ہمارے
دیک اس کی صداقت پر کسی قسم کا شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

پھر اگلے روز کراچی کی انتظامیہ نے دودھ کی قیمت مقرر کردی جو دودھ کی بلیک مارکیٹ قیمت سے چنداں زیادہ نہ تھی۔ عام شہریوں کو دودھ دو روپے سیر ملا کرتا تھا کہیں کہیں سوا روپے سیر اور بند بوتل میں بہت ہی خالص چاہیئے تو ڈیڑھ روپے سیر لیکن حکام وقت نے شہریوں اور گوالوں سے کہا کہ ہم انصاف کرتے ہیں نہ تمہارا مطالبہ منظور کہ دودھ دو روپے سیر ملا کرے، نہ گوالوں کی بات قبول کہ نرخ ڈیڑھ روپے کیا جائے۔ ہم ایک روپیہ دس آنے قیمت مقرر کرتے ہیں۔ شادیانے پٹنے لگے، لوگ بھنگڑا ناچنے لگے۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ گھی کے چراغ جلانے کے لئے بناسپتی گھی کی دکانوں پر پل پڑے۔

یہاں سے پھر ہمارے انہی دوست کا قصہ شروع ہوتا ہے کہ اگلے روز گوالا علی الصبح آیا۔ ہمارے دروازے پر دستک دی اور جب ہم گئے تو آدھ سیر دودھ ہمیں تھما دیا۔ ہم نے کہا بھیا ہم تو سیر دودھ لیا کرتے تھے۔ بولا صاحب آجکل حکومت سختی کر رہی ہے اور لوگ بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تو میں اتنا ہی دے سکتا ہے۔ باقی ضروریات کے لئے عقبی دروازے پر چاہیئے" ہم نے عقبی دروازہ کھولا وہاں گوالے کا بھائی کھڑا تھا اس نے ڈول میں سے آدھ سیر پانی کا ڈونگا ہمیں بھر کر دیا اور یوں سیر بھر دودھ بنا۔ صاحب مضمون فرماتے ہیں اندازِ انصاف اتنا کھوں گا کہ اس طرح جو دودھ بنا وہ اس دودھ سے کسی قدر گاڑھا تھا جس کی بالٹیاں ہم نے پہلے روز تالاب سے بھری تھیں، یہ بات کچھ کچھ ہمارے بھی جی کو لگتی ہے۔

ہم نے چیزوں کی قیمتیں اوپر چڑھتی تو دیکھی ہیں، اترتی کبھی نہیں دیکھیں۔ جب ٹیکسی اور رکشا والے اپنے پیسے بڑھواتے ہیں۔ تو یہی کہتے ہیں کہ اب ہم خوش، ہمارا خدا خوش" اب ہم اپنے میٹروں میں قطعی گڑبڑ نہ کریں گے اور بقیہ عمر ہنسی خوشی، ایمان داری میں گزاریں گے۔ گوالوں کے پیسے بھی یہ کہہ کر بڑھائے گئے ہیں کہ اب دودھ خالص ملا کرے گا۔ ممکن ہے ایک آدھ روز خالص ملے بھی لیکن گوالا تالاب کے پاس سے گزرتا ہے۔ پانی کو دیکھتا ہے۔۔۔ تو

ع "اٹھ ہی جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجئے" آخر عمر بھر کی عادت ہے کیسے جا سکتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ حکومت نے اسمگلنگ کے انسداد کے لئے کمیٹی بنا دی ہے۔ ملاوٹ کی روک تھام کے لئے کمیشن مقرر کر دیا ہے اور گرانی کے انسداد کے لئے نئی وزارت قائم کر دی ہے ان باتوں کے درمیان ہمیں کوئی خاص رشتہ نظر نہیں آتا کمیٹی اپنی جگہ بیٹھی رہتی ہے۔ گرانی اور ملاوٹ اپنی جگہ ترقی کرتی رہتی ہے۔ کسی نے رمضان شریف میں دوپہر کو ایک مولانا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولانا نے کھولا، اس شخص نے کہا "یا حضرت! آپ کی داڑھی میں چاول اٹکا ہے۔ آپ دوسروں کو روزہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور خود آپ کا یہ حال ہے۔ ؎

جنت میں گئے شیخ تو اعمال ندارد جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

مولانا نے کہا اے بے وقوف! کیوں بدگمانی کرتا ہے۔ معدہ اپنی جگہ ہے، چاول اپنی جگہ ہے۔

آٹا جب سستا ہوتا ہے تو آدمی آٹے کو کھاتا ہے اور جب مہنگا ہوتا ہے تو آٹا آدمی کو کھاتا ہے۔ اور گیہوں کی طرح نہیں، گھن کی طرح کھاتا ہے۔ یہی حال دودھ کا جانیئے۔ حضرت مولانا روم نے اپنی طرف تو تجنیس خطی کا کمال دکھایا تھا جو لکھا تھا

؎ آں یکے شیرے کہ مردم می خورد آں یکے شیرے کہ مردم می خورد

یعنی ایک شیر وہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو کھاتا ہے اور ایک شیر وہ ہوتا ہے جسے لوگ کھاتے ہیں یا پی جاتے ہیں۔ مولانا نے پہلے شیر سے شاید جنگل کا بادشاہ مراد لیا تھا اور دوسرے سے دودھ لیکن سچ پوچھئے تو ہمیں تو دونوں جگہ دودھ کا مضمون نظر آتا ہے۔ صحیح مطلب تو محقق لوگ ہی جانیں جن کا کام ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہوتا ہے۔

محمد برہان حسین

آخری سوال پہلے کیجیے

پرانی کہاوت ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں ایک بار پارس ضرور ملتا ہے۔ پارس ایک ایسا پتھر ہے جو معمولی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر دیتا ہے اور جو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ شفیق الرحمٰن نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک صاحب جو خیر سے کسی سرکاری دفتر میں ٹوپی میز پر رکھ کر چائے پینے چلے جاتے تھے .... یعنی کلرکی کرتے تھے ان کی نظر سے یہ پارس والی بات گذری تو انھوں نے جھٹ اپنا بٹوہ نکال کر اس کے ایک خانے کے نوٹ دوسرے میں منتقل کر دیئے۔ وہ نوٹ اور وہ خانہ لاٹری کے ٹکٹ کی خریدی کا تھا۔ اور اب لاٹری پر سے ان کا اعتقاد اٹھ گیا تھا۔

انھوں نے موٹی موٹی لوہے کی زنجیریں بنائیں، دفتر سے بغیر تنخواہ کی تین ماہ کی چھٹی لی اور پہاڑوں میں نکل گئے۔ تین ماہ تک زنجیروں کو پہاڑوں پر لڑاتے گھسیٹتے رہے کہ کہیں پارس سے ٹکرائیں تو سونا بن جائیں لیکن وہی ڈھاک کے تین پات یعنی تین ماہ بعد زنجیریں لوہے ہی کی رہیں البتہ ان کے جوتے کی کیلیں سونے کی ہو گئیں۔ کیلوں کو فروخت کیا تو پورے تین ماہ کی تنخواہ ہاتھ میں تھی، انھوں نے چند نوٹ بٹوے کے لاٹری والے خانہ میں رکھے اور ٹوپی لے کر دوبارہ دفتر میں جا بیٹھے۔

اب ہماری یعنی میری اور شرفو بھائی کی داستان سنیئے۔ ہمارے ایک دوست نے جو عرب میں ہزاروں روپے ماہانہ کماتے تھے از راہِ مہربانی ہم دونوں کو چھ چھ ہزار روپے بھجوائے تاکہ ہم دونوں اسکوٹر بک کروالیں اور جب الاٹ ہو جائے تو اس کو بلاک میں فروخت کر دیں جو آجکل اکثر شریف و تعلیم یافتہ ہندوستانی بزنس کے نام پر کر رہے ہیں ــــــ شرفو بھائی تو بے چارہ ذہین آدمی نہیں ہیں فوراً اسکوٹر بک کر آئے، ہم نے کہا "میاں! ہم قلم سے روپیہ کما سکتے ہیں تو یہ غیر شریفانہ حرکت کیوں کریں۔ ہم اپنی کتاب چھپوا کر فروخت کریں گے اور روپیہ کمائیں گے۔

ہم اردو کے ایک مشہور ادیب کے پاس پہونچے اور یوں گفتگو کی :

ہم نے پوچھا : "آپ کی نئی کتاب کتنے میں چھپی تھی ؟"

وہ بولے، "چھ ہزار"
"خوب، آپ نے خود چھپوائی تھی؟"....
"جی ہاں"
"اور خود ہی فروخت بھی کی؟"
"جی ہاں"

ہم نے پورے چھ ہزار لگاکر اپنی معرکتہ الآرا ناول "ٹوٹتی کمر" چھپوادی، دوستوں کو تحفتاً دی۔ رسم اجراء ہوئی اور ایجنٹوں کے ہاں یہ اسے فروخت رکھوادی۔

ایک سال گذرا، ایک پیسہ نہ ملا، اُدھر شرفو بھائی کی اسکوٹر آئی اور دس ہزار میں بک گئی پورے چار ہزار فائدہ ہوا۔ ہم نے بلبلانا شروع کیا۔ شرفو بھائی نے کہا "میاں اب رونا بند کرو نفع کا خیالِ عبث دل سے نکال دو اور تین مہینے کی تنخواہ وصول کرلو"
ہم نے پوچھا "وہ کیسے"
انھوں نے جواب دینے کی بجائے چند کتابیں گٹھے سے لیں اور چلدیئے۔

ان کی یہ حرکت اسوقت تو سمجھ میں نہ آسکی مگر ہم خاموش رہے کیونکہ اس شخص نے ہمیں عقل کے میدان میں چار ہزار کے فرق سے شکست دیدی تھی۔ تین ماہ بعد اخباروں میں خبر شائع ہوئی کہ ہماری "ٹوٹتی کمر" کو دو ریاستوں کی اردو اکاڈمیوں نے دو دو ہزار روپے انعام دیا تھا۔ یہ انعام ایسا ہی تھا جیسے "ریپ" کہ جو بُرا سامنے آئے گا اسکو ٹپ دینا ہی پڑتا ہے۔

اب ہمیں اس ادیب پر غصہ آرہا تھا جس سے ہم نے مشورہ کیا تھا ہم پھر اس مردِ ناداں کے پاس پہنچے۔
ہم نے پوچھا "آپ نے کہا تھا آپ کی کتاب چھ ہزار میں چھپی تھی؟"
مختصر جواب "جی ہاں"
پوچھا "آپ نے خود چھپوائی تھی؟"
"جی ہاں"
پوچھا "اور خود ہی بیچی تھی؟"
"جی ہاں"
ہم نے کہا "مگر میرے چھ ہزار تو ڈوب گئے"
وہ بولے "میرے بھی ڈوب گئے تھے"

ہم لوٹ آئے کیونکہ آخری سوال ہم نے اس وقت نہیں کیا تھا جو سب سے اہم تھا۔ اس پر ہمیں ایک بہت پرانا قصہ یاد آیا۔

ایک صاحب کی گائے کے گلے میں رسولی ہوگئی تھی۔ کسی نے رائے دی کہ ختو خاں کی گائے کے گلے میں بھی

ہی ہوا تھا۔

وہ صاحب حنّو خاں سے ملے اور پوچھا "آپ کی گائے کے گلے میں رسولی نکلی تھی"

"جی ہاں"

آپ نے کیا علاج کیا تھا؟"

میں نے فنائیل اور چونا ملا کر پلا دیا تھا"

وہ صاحب دوڑے ہوئے آئے اور گائے کو یہی پلا دیا اور وہ فوراً جاں بحق تسلیم ہو گئی۔ وہ دوبارہ پہلے سے زیادہ تیز دوڑتے ہوئے حنّو خاں کے پاس پہنچے۔

آپ نے کہا تھا آپ کی گائے کے گلے میں رسولی نکلی تھی

"جی ہاں"

"اور آپ نے اسکو فنائیل اور چونا پلایا تھا"

"جی ہاں"

"مگر میری گائے تو پیتے ہی مر گئی"

"میری بھی مر گئی تھی"

بس یہ آخری سوال بڑا اہم ہوتا ہے بلکہ عقل کا تقاضہ ہے کہ اس سوال کو پہلے ہی حل کر لینا چاہیئے۔ ●

سورج کا قتل کس نے سرِ شام کر دیا

جوہر سیوانی

شیخِ حرم کے نام مئے و جام کر دیا
ساقیِ میکدہ نے نیا کام کر دیا

جنتا نے کانگرس سے ڈبل کام کر دیا
لوگوں میں جاتی واد کا دھوکا عام کر دیا

جنتا نے دو ہی سال میں تغلق کے دور کا
پاگل پنی میں بڑھ کے ہر اک کام کر دیا

اپنے بجٹ میں چودھری صاحب نے بے دریغ
جنتا کو بیچ چوک پہ نیلام کر دیا

اہلِ دوَل کو چھوٹ دی لوٹا غریب کو
یہ کارنامہ قابلِ انعام کر دیا

اشیائے خوردنی کو گراں کر دیا مگر
کمپوسٹ اور کھاد کا کم دام کر دیا

رائٹ کے کاروبار میں اچھی ہے منفعت
یاروں نے اس ٹریڈ کو اب عام کر دیا

اُلّو ہی نے تباہ کیا باغ کو مگر
بلبل کو سب نے موردِ الزام کر دیا

جس دن لڑی نظر سے نظر کر لیا نکاح
آغاز ہی آپ نے انجام کر دیا

ایسی دوا مریض کو دے دی حکیم نے
نزلہ کو ایک ڈوز میں سرسام کر دیا

ہپی بنے تو زلف کی ادائیں بھی بگڑ گئیں
فیشن نے نوجوانوں کو گلفام کر دیا

کیا امتحاں میں نورِ نظر نے لکھا جواب
سیتا کو رام، سندھ کو آسام کر دیا

پوچھا پلک پلک کے ستاروں نے چاند سے
"سورج کا قتل کس نے سرِ شام کر دیا"

ساڑی نہیں خریدی تو میکے چلی گئیں
بیگم نے اتنی بات پہ کہرام کر دیا

ماں سے کبھی لڑائی، کبھی مجھ پہ نائٹرنگ
بیگم نے خاندان کو ویتنام کر دیا

بیگم کے گھر میں بھیڑیے چرتے ہیں گاؤں کا
سیواں کو میرے دوست نے آسام کر دیا

لکھوائی تھی غزل تو فدا پڑھتے ٹھیک سے
لکھی تھی جس نے اس کو بھی بدنام کر دیا

لفظِ عوام فٹ نہیں ہوتا تھا بحر میں
شاعر نے اس کو کھینچ کے عوام کر دیا

کم مائیگیِ فہم کا کر کے مظاہرہ
ساری برادری ہی کو بدنام کر دیا

تم نے حسد کی آگ میں اے حاسدِ سخن
دل کو جلا جلا کے سیہ فام کر دیا

اپنی لنگوٹی چھوڑ کے بھاگا حریفِ فن
یاروں نے اس کو ایسے تہہ دام کر دیا

اہلِ سخن نے ہُوٹ کیا آپ کو مگر
جوہر کو ناحق آپ نے بدنام کر دیا

ڈاکٹر حبیب ضیاء

ساس نے کیروسین ڈال کر بہو کو جلا دیا!

اخبار آتے ہی ہم انتہائی اشتیاق سے ایسی خبر پڑھنے کے لیے صفحے الٹنا شروع کر دیتے تھے کہ آج کون سے محلے کی ساس نے اپنی بہو کو جلا دیا۔ اس کی وجوہات بھی ساتھ ہی مل جاتیں کہ ساس نے جہیز نہ لانے پر بہو کو جلا دیا یا پھر صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا کرنے پر بہو کا خاتمہ کر دیا۔ اب یہ سرخی ہم پڑھنے کے لیے ترس گئے ہیں۔ بالکل اسی طرح، جس طرح کہ سا سیں بہو پر کیروسین انڈیلنے کو ترس گئی ہیں۔ البتہ گذشتہ چند دنوں میں ایک دلچسپ خبر پڑھنے کو ملی کہ ساس اور بہو دونوں ایک ساتھ جل گئیں۔ ہم نے حسرت سے اپنے دل میں کہا کہ ساس اور بہو میں محبت ہو تو ایسی ہو کہ زندہ رہیں تو ایک ساتھ اور مریں بھی گئیں تو صرف آدھا شیشہ کیروسین سے کام چل گیا۔ بعد میں کھوج لگانے پر پتہ چلا کہ دراصل حالات دوسرے تھے۔ جہیز میں تمام سامان کے علاوہ گنگال نہ لانے پر ساس نے بہو پر کیروسین ڈال کر آگ لگا دی تھی۔ بہو ماڈرن تھی۔ اس نے خاموشی سے جل جانے کی بجائے پھرتی کے ساتھ ساس کو بھی "آغوش بہو دی" میں لیتے ہوئے کھینچ لیا "آری میّا! دونوں ایک ساتھ مریں گے۔ تیرے لیے پھر کیروسین کہاں سے آئے گا۔"

سڑکوں پر، گلی، کوچوں کے نکڑوں پر، ہوٹلوں میں اور گھروں میں دن بھر بات کرنے لوگوں کے لیے مختلف موضوعات ہوا کرتے تھے۔ اب تمام موضوعات ختم ہو چکے ہیں۔ چلتا ہوا موضوع ہے "آپ کے محلے میں تیل مل رہا ہے یا نہیں؟"

ڈینگیں مارنے والوں کو زریں موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ ایک صاحب نے فخریہ انداز میں کہا کہ تیل کے ڈیلرس سے ان کے اتنے خوشگوار تعلقات ہیں کہ انھیں بغیر قطار میں کھڑے بغیر پانی ملا ہوا تیل مناسب داموں مل سکتا ہے۔ انکی ڈینگوں کے جال میں آکر ہم نے انھیں تیل کے لیے پچاس روپئے، رکشے کے کرایہ کے لیے آٹھ روپے اور دو خالی ڈبے دے دیئے جیسے ہی وہ ہمیں دو ڈبے تیل فراہم کر دیں۔

وہ صاحب روپے اور ڈبے سمیت غائب ہیں۔ وہ پہلی تاریخیں گزر چکی ہیں، دور دور تک ان کا پتہ نہیں۔ سنا کہ اب وہ شہر سے باہر خالی ڈبوں کا بیوپار کرتے ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے "کاروبار" کافی منافع سے چل رہا ہے۔

ہر بیوپاری کا دھندا شاندار طریقے پر چلنے کے لیے ملاوٹ کی چیزیں مختص ہیں۔ دھنیے کا پوڈر بیچنے والا لفیس اور ملائم گوبر ہی ملائے گا۔ آٹے والا املی کے بیج، چاول والا ریت اور ہوٹل کا باورچی پسینہ شامل کر کے کھانے میں برکت اور کھانے والوں کے ہاتھ پاؤں میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ گوالا اب تک تو پانی ہی ملاتا آیا ہے۔ پانی سے سستا مائع اگر مل جائے تو ہم پورے اعتماد سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ صرف پانی ہی ملائے گا۔ بہر حال جب سے مٹی کے تیل کی قلت ہوئی ہے گوالوں کی پالیسی پر تیل کے بیوپاری بھی عمل کرنے لگے ہیں۔

ایک دن کا سچا واقعہ ہے، آنکھوں دیکھا حال نہیں آپ بیتی ہے۔ ہمارے پاس تیل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ تینوں چولھوں میں کچھ تیل دیکھ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا کر دو پہر میں تو گھر والوں کو کھانا دیا جا سکتا ہے۔ ہم نے پہلا چولھا جلایا تو وہ سسکنے لگا، دوسرا رونے لگا اور تیسرے نے تو ماچس کی ڈبیا کو دیکھ کر ہی دم توڑ دیا۔ از سر نو جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ چولھوں میں تیل تو تھا مگر وہ پانی کی سی تاثیر رکھتا تھا۔ یعنی کھانے کو پکنے دینا اس کا کام نہیں تھا بلکہ بتیوں کو صرف جلا کر ختم کر دینا وہ خوب جانتا تھا۔

راستے میں مختلف طبقے کے لوگ ہاتھوں میں تیل کے ڈبے لئے چلتے پھرتے، بھاگتے دوڑتے نظر آتے ہیں۔ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ جو عموماً راستے بھر اگلی سیٹ کی کمر میں باہیں ڈال کر اسے دق کیا کرتی تھی اس کی جگہ اب مٹی کے تیل کے ناگوار بو والے ڈبے نے لی ہے۔ وہ بڑی شان سے مالک کے ساتھ ہمارے شہر کی سیر کر کے مالکن کا دل جلانے کے لیے خالی واپس آتا ہے۔

ایک صاحب کی بیوی نے علی الصباح انھیں بغیر ناشتہ دیئے تیل کا ڈبہ اور کچھ ریزگاری ہاتھ میں تھما کر گھر سے بھگا دیا کہ وہ قطار میں جا کر کھڑے ہو جائیں۔ دن کے دو بجے تیل آنے والا ہے۔ گیارہ بجے کسی کام سے وہ صحن میں آئیں تو دیکھا کہ شوہر صاحب ڈبہ ہاتھ میں لیے دروازے ہی پر کھڑے ہیں۔ وہ آپے سے باہر ہو گئیں، منہ سے کف جانے لگا۔ انھوں نے تیل چھڑک کر خودکشی کرنی چاہی مگر قسمت کی خرابی کہ تیل نہیں تھا۔ چولھا صحن میں پھینکتے ہوئے وہ میکے چلے جانے کی دھمکی دینے لگیں۔ دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جوں ہی وہ دروازے کے باہر گئیں، کھسیانی ہو کر الٹے پاؤں واپس آ گئیں۔ ان کے شوہر واقعی تیل کی لائین ہی میں کھڑے تھے۔

پرانے شہر میں تو غضب ہی ہو گیا۔ تیل کی قطار میں کھڑے رہ کر واپس آنے والے ایک صاحب کو بیوی بچوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وہ بے چارے اپنے ننھے بچوں کے سروں پر باری باری ہاتھ رکھ کر قسم کھا رہے تھے اور بیوی سے کہہ رہے تھے کہ میں وہی تمہارے منے کا باوا ہوں۔ لیکن نہ منا پہچانتا تھا نہ منے کی اماں۔ زندگی کے پچھلے واقعات سنانے کے بعد بڑی مشکل سے بیوی نے میاں کو قبول کر لیا لیکن دوسرے ہی لمحے جھولے میں نورانی بچے کو دیکھ کر شوہر نے صاف کہہ دیا "میرے تو صرف آٹھ بچے تھے۔ یہ سفید سر والی نو بچوں کی ماں میری بیوی نہیں ہو سکتی۔"

محلے والوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں کی شناخت کروانے میں مدد دی۔ اس کے بعد کہیں بیوی کو تیل کا خیال آیا۔

کہنے لگیں "تیل کا شیشہ تو دے دو۔ چولھے خالی پڑے ہیں" وہ صاحب ناک سے روئی کا پھایا نکال کر دیتے ہوئے بولے "یہ لو تیل۔ آئندہ سے شیشہ دے کر مجھے ذلیل مت کیا کرو۔ تیل والے نے قطاری لوگوں کے سامنے مجھے دنیا بھر کی باتیں سنائی ہیں۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ عطر کی دوکان بازو ہے۔ شیشہ وہاں لے کر جاؤ۔ یہاں صرف روئی لایا کرو۔"

شہر میں جہاں کہیں تیل کی قطاریں ہوتی ہیں ہم ان کا تفصیلی جائزہ لیا کرتے ہیں۔ قطار کہاں سے شروع ہوی اور کہاں ختم ہوی پتہ نہیں چلتا۔ لوگ مختلف مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ کوئی شطرنجی بچھا کر کھانا کھا رہا ہے۔ کوئی چائے سگریٹ پر ہی اکتفا کر رہا ہے اور اکثریت لڑنے میں مصروف ہے۔ ایک جگہ، قطار کے لوگ حلقے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اطراف تیل کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے دائرہ کی شکل والی قطار کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں "ساٹھ اور چالیس" کا کھیل چل رہا ہے اور بنڈی کے آنے سے پہلے ہی تمام لوگوں کے تیل کے روپیے ایک ماہر کھلاڑی سمیٹ کر چلتے بنے۔

ایک دوکان پر تیل والا ہاتھ میں ایک موٹی سی چھڑی لے کر لوگوں کو مار کر قطاریں کرتے ہوئے باری باری پوچھ رہا تھا۔ "تیل کاہے کے لیے چاہیے؟" ایک صاحب نے کہا "میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔"

دوکان دار بگڑ کر کہنے لگا۔

"خودکشی کے اور بھی تو زود اثر طریقے ہیں۔ کسی اونچی عمارت سے کود پڑو، کھٹمل مار دوا پی جاؤ، کسی بڑے تالاب میں چھلانگ لگا دو یا کسی لاری کے نیچے آجاؤ۔ یہ ناممکن ہے تو صرف تیل کی قطار میں ہی کھڑے رہو۔ اپنی موت آپ مر جاؤ گے" دوکان دار نے انھیں آگے سے گھسیٹتے ہوئے سب سے آخر میں لا کھڑا کر دیا۔ خودکشی کے لیے مٹی کا تیل ضائع کرنے والوں کا یہی انجام ہے۔

۵۵

صنعتی محاذ پر پیش رفت

آندھرا پردیش صنعتی محاذ پر نئی سرحدوں کی سمت پیش رفت میں مصروف ہے۔ آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے اب تک کوئی ۱۸۰ پراجکٹوں کو آغاز کیا گیا ہے یا ان کے آغاز میں مدد دی ہے۔ ان پراجکٹوں میں جملہ ۶۶۵ کروڑ روپیوں کا سرمایہ مشغول کیا جائے گا اور ان میں ۱۷۵۰۰۰ افراد کے لئے روزگار کی گنجائش بدست ہوگی۔

ریاست کے گیارہ اضلاع میں ضلعی صنعتی مراکز کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جن کا کام چھوٹی صنعتوں کے آغاز کے سلسلہ میں رہنمائی کرنا اور سہولتیں فراہم کرنا ہے یہ مراکز ایک صنعت کار کو نہ صرف صنعتی سرگرمیوں کے شعبے کے انتخاب میں مدد دیں گے بلکہ صنعت کے قیام سے لے کر خام مال کی فراہمی۔ قرض کی بہم رسائی اور مشنری کے حصول یعنی ہر معاملے میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔

وہ دن دور نہیں جب آندھرا پردیش
ایک عظیم صنعتی ریاست بن جائے گی

عزیز صدیقی

حقِ مزاج پرسی

ہندوستانی خواتین اپنے شوہروں کے جیب کی صفائی میں بڑی چابک دستی اور ہنرمندی کا ثبوت دیتی ہیں لیکن اپ ٹو ڈیٹ کرسٹی تہذیب اور کلچر میں یہ یوروپی اور امریکن خواتین کے مقابلے میں صدیاں پیچھے ہیں، اہل نظر کی رائے ہے کہ اس پسماندگی کا سبب یوروپ و امریکہ کی خواتین کی طرح ہندوستانی خواتین کو اپنے شوہروں کی مزاج پرسی کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ یوروپ و امریکہ میں ہندوستانی گھرانوں کی طرح زن و شوہر میں ہر بات پر چخ چخ نہیں ہوتی بلکہ معاملہ جو تعلقات کی نوبت سے بڑھ کر گلو خلاصی کی منزل تک چشم زدن میں پہنچ جاتا ہے اور فریقین کو ہر سال کی کوفت اور تو تو میں میں سے بہ آسانی نجات مل جاتی ہے اور پھر ع

تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

اسے کہتے ہیں تہذیب نو کی عنایتیں اور آزادیٔ نسواں کے حقوق کا صحیح و برمحل استعمال، جہاں تک سرزمین ہند کا تعلق ہے، "نہ جان ہی نکلتی ہے اور نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے"۔

آئین میں آزادیٔ نسواں کے بہتیرے حقوق گنوائے ہیں لیکن کہیں بھی شوہروں کی مزاج پرسی کے حق کا دور دور تک تذکرہ نہیں ہے۔ اس زبردست آئینی فروگذاشت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج بھی کروڑوں ہندوستانی مرد سیتا اور ساوتری کا نام لیکر اس بے زبان مخلوق جو خیر سے اب زبان دراز ہوتی جا رہی ہے (ابھی حال ہی میں دلی کی خواتین اور پٹنہ یونیورسٹی کی طالبات کے مظاہرے اور نمائش بطور مثال زبان درازی پیش کی جا سکتی ہیں) کو تختۂ مشق بناتے رہے ہیں۔ مردوں کی بربریت اور ظلم و تجاہل کی انتہا یہ ہے کہ انہیں ناقص العقل قرار دے کر گھونسے، لات جمانے کے من پسند اور دلچسپ کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ ایسی ہی بربریت کا ایک منظر راجہ مہدی علی خاں مرحوم نے ان لفظوں میں پیش کیا ہے ؎

پہلے تو وہ دیتے ہیں میری کمر پہ لات
پھر مجھ سے پوچھتے ہیں سینے پہ دھر کے ہات

کمر کو کر بلند اتنا کہ ہر اک لات کے پہلے
میاں بیوی سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

سیاسی جماعتیں بھی اپنے انتخابی منشور اور فلک شگاف نعروں میں ہندوستانی خواتین کے اس روایتی ظلم کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہتیں۔ ماتم تو اس بات کا ہے کہ کہیں بھی اس فعل جگر خراش پر ایک بوند مگر مچھ کے بھی آنسو نہ ملیں گے اور چلے ہیں "تقدیس مشرق" کے گیت الاپنے۔ سیاست دانوں نے خواتین کے اس پیدائشی حقوق سے روگردانی کر کے اس بے زبان مخلوق کے ساتھ زبردست بے انصافی کا مظاہرہ کیا ہے۔

موڈرن کلچر کا تقاضہ یہ ہے کہ مغربی ملکوں کی طرح "مزاج پرسی" کا یہ حق بجائے مردوں کے الٹرا موڈرن خواتین کو منتقل کر دیئے جائیں۔ بحمداللہ بعض ارسٹوکریٹ گھرانوں میں اس مقدس فریضہ کی شروعات کر دی گئی ہے "حق مزاج پرسی" کے اس انتقال پر ملال سے ملک کے زبردست مسائل اور سنگین جرائم پر بہ آسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔ جنت نظیر گھروں میں نو اس کرنے والی اپسراؤں سے منہ موڑ کر رستوران کو آباد کرنے والوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہوم منسٹر کو معتدل رکھنے والے سب سے اہم شعبہ کی نگرانی ایک ایسی شخصیت کے سپرد کر دی جائے جس کے حق میں حضرت حالی بھی فرما گئے ہیں ؎

دنیا کی زینت حسن سے ہے
قوموں کی عزت حسن سے ہے

مزاج پرسی کے اس انتقال بے مثال دلا زوال کے بعد حضرت اکبر کی طرح پھر کسی کو یہ شکایت نہ رہے گی کہ ؎

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

اس متاع گم شدہ کی بازیافت کے بعد بیویاں امور خانہ داری یعنی ہوم منسٹری اور بعض کلچرڈ گھرانوں میں امور خارجہ کی بھی ذمہ داریاں خود سنبھال لیں گی۔ اور شوہروں کی اونچ نیچ اور ان سے پیدا شدہ آلائشوں پر نظر رکھیں گی۔ مثال کے طور پر، جیسے ہی صاحب بہادر دبے پاؤں گھروں میں داخل ہوئے کہ بیگم کی جوتیاں تڑا تڑ ان کے سروں پر برسنے لگیں اور رات کی سیاہیوں میں بھی شوہر نامدار کو تارے نظر آنے لگے۔ ادھر بیگم ہیں کہ بغیر فل اسٹاپ اور سیمی کولن کے جوتیوں پر جوتیاں برسائے جا رہی ہیں۔ ادھر صاحب بہادر ہیں کہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے "ہیں ہیں" کر کے "بابا معاف اب ایسی بھول نہ ہوگی۔ ادھر وہ کان پکڑ کے اٹھا بیٹھی کر رہے ہوں دوسری طرف بیگم پر فاتحانہ مسکراہٹ کی ایک بہار آ رہی ہو۔ کتنا دلکش ہوگا یہ منظر۔ ان حسین و جاذب نظر مناظر و مواقع سے وہی خوش نصیب صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو سکتا ہے جسے اس طرح کے "نشاط کرب" سے گزرنا نصیب ہوا ہو ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

کتنے اچھے تھے وہ دن کے حبیب
جوتیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اس طرح دل فریب منظر کا تصور کیجیے کہ صاحب نے میم صاحبہ کو سینما کے فرسٹ شو کا سبز باغ دکھایا ہو دفتری الجھنوں اور بڑے صاحب کی ہیجہ گیریوں میں میم صاحبہ کے اس حسین عہد و پیماں" کو بھول بیٹھے ہوں کہ اتنے میں کسی طوفانِ بدتمیزی کی طرح دفتر ہی میں میم صاحبہ کی یلغار ہو اور تڑاتڑ صاحب کے سر پر جوتیوں کی بارش شروع ہو جائے اور دوسرے بابو لوگ بھی بہ نظر استعجاب ع

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کی حسین آرزوئیں لیے اس اچانک مگر دلچسپ مناظر سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اگر واقعی ہمارے دفتروں میں اس طرح کے دو چار واقعات رونما ہو جائیں تو آفس "سکریٹریوں" اور گرلز فرینڈز" کے ساتھ گلچھرے اڑانے کی تمام لعنتیں یک لخت جہنم رسید ہو جائیں گی۔

○

خواتین ہند کی حوصلہ افزائی کے لیے مزاج پرسی کے اس مقدس فریضہ کو قومی پروگراموں میں شامل کرنے کی ناگزیر ضرورت ہے۔ فلاح کنبہ اور اصلاح معاشرہ کے لیے اسے پنج سالہ منصوبوں میں خاص اہمیت دی جائے اور سب سے زیادہ پیٹنے والی خاتون کو "کوئین آف دی ایر" کے قومی اعزاز اور تمغات سے سرفراز کیا جائے۔

اس راکٹی دور ترقی میں "سائنٹیفک مزاج پرسی" کے دلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس جیسے میٹروپولین شہروں میں مراکز کھولے جائیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سائنٹیفک مزاج پرسی کے دلچسپ مناظر پیش کیے جائیں تاکہ عوام کا شعور بیدار ہو اور ملک دن دونی رات چوگنی ترقی کے منازل طے کر کے مغربی ممالک کے دوش بہ دوش پہنچ جائے۔

مزاج پرسی کے یہ پروگرام محض انفرادی نہ رہیں اور نہ صرف گھر کی چہار دیواریوں کے اندر مرکوز کر دی جائیں بلکہ قومی پروگراموں میں اسے اجتماعی شکل بخشی جائے تاکہ صدیوں سے خواتین ہند کے ساتھ جو کھیل گھر کی چہار دیواریوں کے اندر کھیلے جاتے رہے ہیں۔ اس کا اجتماع اور انتقامی مظاہرہ عالم ہو اور خواتین برسرِ عام اپنے شوہروں کی خبر گیری کر سکیں۔

مزاج پرسی کے اس متبرک فریضہ کی ابتدا، افتتاح کسی بڑے پبلک جلسے سے کی جائے جہاں ملک کے چوٹی کے سیاست داں جلسہ عام کو ایڈریس کر کے جنتا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہوں کہ اتنے میں بیگموں کا ورد ہو اور ڈائس پر ہی ایک نددار چانٹے سے وہ مزاج پرسی کا افتتاح کر دیں اور تمام خواتین تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اس مبارک اقدام کا پرجوش خیر مقدم کر دیں۔ فرض کیجیے کہ ایک بڑے ہال میں انگلش لیڈی اور بیگم بھر ٹوچ سے لے کر شریمتی سرو ج تک سب کی سب ایک ساتھ اپنے شوہروں کو کنگھی دے کر اٹھا بیٹھی کرا رہی ہوں تو یہ دن ہماری اگلی نسلوں کے لیے یادگار دن ہوگا اور تاریخ میں یہ یادگار دن سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔

مزاج پرسی کے اس نسخہ کیمیا کا اگر حرف بہ حرف استعمال کیا جاتا رہا اور بیویاں خود آگے بڑھ بڑھ کر اپنے اس پیدائشی حق کا بروقت استعمال کرتی رہیں تو ہمارا دعویٰ ہے کہ چند ہی دنوں میں ہندوستان کے کتنے ہی گھر سورگ بن جائیں گے اور کتنے ہی خوش نصیب شوہر اپنی زندگی میں سورگ باش ہو جائیں گے۔

○○

چیلنج کے مماثل ایک مسئلہ

آندھرا پردیش میں دیہی ترقیات کا مسئلہ ایک چیلنج کے مماثل ہے اس لئے حالیہ زمانہ میں سرعت کے ساتھ شہروں کے فروغ کے پیش نظر ایک ایسے ادارہ کی ضرورت ناگزیر ہوگئی جو نہ صرف ہمارے شہروں کے پھیلاؤ میں باقاعدگی پیدا کرے بلکہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی شہری ترقی کے لئے منصوبہ سازی کا کام بھی انجام دے۔

چنانچہ حیدرآباد۔ وشاکھاپٹنم اور وجے واڑہ میں تین شہری ترقیاتی اداروں کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ ادارے اس وقت ماسٹر پلانس اور زونل پلانس کی تیاری میں نیز شہری ترقیاتی پروگراموں کی عمل آوری میں مصروف و سرگرم ہیں۔

شہری ترقیاتی منصوبے مستقبل میں ہمارے

شہروں کی توسیع و ترقی کے آئینہ دار ہیں

ڈی۔آئی۔پی۔آر/۵۲

غمگین غلام نبی
بارہ مولا، کشمیر

داستانِ دل

غزلیات کے ذخیرہ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس کی بنیاد ایک محبوب پر قائم ہے جس کی صفت بے وفائی، سنگ دلی، بے پروائی، بے رحمی، رقیب نوازی وغیرہ ہے ایک ایک مصرعہ اس کی بے رحمی اور جفا پسندی پر دلالت کرتا ہے۔ جس دیوان کو بھی اٹھا کر دیکھیں عشق و محبت، ہجر و وصال اور کیفیت بیخودی جامعہ شعریت میں ملبوس ہو کر ہر جگہ نظروں کا استقبال کرتی ہے۔

جدید دور کے شاعروں نے گو اس بنیاد کو بدلنا چاہا تھا لیکن روایت سے بغاوت ایک شاعر کے لیے ممکن نہیں تھی شاعر کی صفات تو کاہلی، سستی اور سستی ہیں۔ پس حضرت عاشق کا خون بہتا ہی رہا۔ گرم گرم آنسوؤں کا تار بندھتا ہی رہا۔۔ عاشق زار کی بے بسی کو ثابت کرنے کے لیے سرد سرد آہیں نقشہ کھینچتی ہی رہیں۔ کوئی دعاؤں کے عوض گالیاں کھا کر بھی بے مزا نہیں ہوتا ہے۔ کوئی اگر نئے تقاضے نہیں کرتا تو پرانے ہی وعدے یاد دلاتا ہے۔ خنجر، تیر، بھالے، تلوار، نیزے، توپ غرض ہر طرح کا ہتھیار ہاتھ میں لیے محبوب برسرِ پیکار ہے اور جناب عاشق کے دل و جگر کے ٹکڑے ہوا میں اڑتے دکھائی پڑتے ہیں ـــــ اور ان اڑتے ہوئے ٹکڑوں کو یک جا کرنے کی غرض سے ہم نے جب شعرا کرام کے کلام کو پڑھنے کی زحمت گوارا کی تو جی میں آئی کہ اپنا سر کسی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش کریں۔ انسانی جسم کا ایسا کون سا عضو ہے جسے محترم شاعر نے تماشا بنا کر نہ چھوڑا ہو۔ اور جہاں تک دل کا تعلق ہے ایک غزل میں جب تک کہ "دل" کا مضمون نہ بندھ جائے محترم شاعر کا پانی ہضم نہیں ہوتا اور ہم جس قدر بھی باریک بینی سے مطالعہ کرتے رہے اتنا ہی آنکھوں میں نور اور دل کا سرور جاگتا رہا۔ کتنے نادان تھے کہ دل کو محض گوشت، خون کو صاف کرنے کی مشین سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی دل کی حقیقت کیا ہے ـــــ؟ تو آگے چل کر یہ ان شعرا حضرات سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔۔

ایک صاحب، دل کے معاملے میں خاصے وسیع دل ثابت ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں ـــــ

دل ہے خانہ، دل بت خانہ، دل شہر تنہا کوئے ہوس
اللہ کا گھر تسلیم مگر، اللہ کا گھر معلوم تو ہو

واہ صاحب واہ! چار خانے والا گوشت کا ٹکڑا مے خانہ، بت خانہ، شہر تمنا، کوئے ہوس، اللہ کا گھر ورنہ جانے کیا کیا ہے۔ اتنا ہی ہوتا تو دل پر پتھر رکھ کر صبر کر لیتے لیکن ایک اور صاحب ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں فرماتے ہیں:

عبادت کو نیا معیار اس کے دم سے قائم ہے
خرد سجدے کرے جس کو اک ایسا آستاں ہے دل

بہر حال دل کیا ہے۔ جان لینے کے بعد لگے ہاتھوں اس کی چند خصوصیات کا جائزہ بھی لیں۔
ایک صاحب، دل کی خاصیت کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

سر وہی سر جو ہر سنگ سے ٹکرائے
دل وہی دل جو شائستۂ غم ہو

ایک صاحب نہ جانے کیوں دل کو اذیت پسند ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ عرض کرتے ہیں

دل جو کافر کہ سدا عیش کا ساماں مانگے
زخم پا جائے تو کم بخت نمک داں مانگے

دل کو دل ہی رہنے دینا تو بعد کی بات ٹھہری۔ دیکھنا یہ ہے کہ دل 'دل' بنتا کیسے ہے۔ اگر آپ اسے کمال قدرت سمجھتے ہیں تو فوراً اپنی غلط فہمی دور کیجئے کیونکہ

زندگی نکھری سدا تہذیب غم سے
دل ہمیشہ دل بنا ہے چوٹ کھا کر

دل بننے کا مسئلہ تو حل ہوا اب اگر 'ایک موڑ اور سہی' کے عنوان کے تحت اپنی بات کو ایک موڑ دوں تو عرض ہے کہ 'باپ کا مال سمجھنا' ہمارے لیے ہمیشہ ایک مشکل محاورہ رہا ہے۔ لیکن ایسا کون سا محاورہ ہے جو شعرائے کرام نے بالتفصیل سمجھانے کی سعی نہ کی ہو۔ یقین نہ ہو تو باپ کا مال سمجھنے کی ایک مثال پیش خدمت ہے

کبھی وہ دن تھے اپنے دل کو ہم اپنا نہ کہتے تھے
مگر اب ہر بشر کے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں

اسی طرح ہم نے اکثر ہاتھوں کے طوطے اڑنا، سنا تھا۔ ابھی ہم یہ محاورہ سمجھنے کی زحمت فرما ہی رہے تھے کہ ایک صاحب کے ہاتھوں سے دل نکلنے لگا۔

ارے ارے میرا دل میرا دل
میرا دل ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے

انتظار فرمائیے وقت آ رہا ہے جب جگر، گردے، پتے، پھیپھڑے وغیرہ بھی ہاتھوں سے نکلنے لگیں گے

ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے اور بزرگوں سے سنا ہے کہ دل سینے میں بائیں طرف ہوتا ہے۔ لیکن کبھی تو ہماری

طرح خوش قسمت ہیں نہیں کہ ایسی باریک اور راز کی باتیں جانتے ہوں۔ ذرا غور فرمائیے ؎

مجھے تو ڈھونڈنے پر بھی نشاں اس کا نہیں ملتا
ذرا آنکھیں ملا کر تم ہی بتلاؤ کہاں ہے دل

طوالت سے بچنے کے لیے ہم اس بحث کو یہیں پر چھوڑ دیتے ہیں اور اب ہم آپ کے مطالعہ فہم و فراست، علم و مہارت، محنت و عقل میں وسعت، گہرائی اور گیرائی لانا چاہتے ہیں۔ دل، صرف، چار خانے والا گوشت کا ٹکڑا ہی نہیں ہے بلکہ ہم آپ کو مثالوں سے ثابت کر کے دکھا دیں گے کہ اس میں دروازے، کھڑکیاں، دامن، زمین، زبان، وادیاں وغیرہ سبھی کچھ ہیں۔

تو آئیے دل کے دروازوں سے شروع کرتے ہیں ؎

دل کے دروازے پہ آ کے لوٹ جائے گا کوئی آرزو اس بار بھی دلہن بنی رہ جائے گی

اسی طرح ؎

کوئی قیام کرے آکے شب اندھیری ہے
کھلا ہے آج بھی دل کا یہ باب جیسا تھا

دل کی زمین کے بارے میں عرض ہے ؎

یاد کو ان کی بسا کر غم الفت کی قسم
اشک فردوس زمین دل کی بنا دی میں نے

جب دل کی زمین ہے تو وہاں وادیاں بھی ہونی ہی چاہییں ؎

ہیں غبار آلود دل کی وادیاں
بچ کے اس ماحول سے جائیں کہاں

اور ان حالات میں کم از کم ایک دامن ضروری ہے ؎

دل کے دامن میں ہیں کانٹے بہت
موسم گل نہیں اس چمن کے لیے

جہاں زمین ہو، وادیاں ہوں، دامن ہو وہاں آفاق نہ ہونا غیر یقینی بات ہوگی ؎

ذہن کی سطح سے اترو تو کوئی بات بنے
دل کے آفاق میں پھیلو تو کوئی بات بنے

صرف دل کے آفاق میں پھیلنے ہی میں اس مسئلے کا حل نہیں، ایک مجرب نسخہ یہ بھی ہے ؎

بڑی گہرائیاں ہیں دل کے اندر
کبھی اترو تو بحر بے کراں میں

بہر حال یہ پتے کی بات جاننا تو آپ کے لیے بے حد ضروری ہے! ؎

آسمان کتنے، زمیں کتنی، مناظر کتنے
دل کی تہہ میں ہیں تمنا کے مقابر کتنے

اور جہاں تک دل کی زبان کا تعلق ہے عرض ہے ؎

وفا کا رنگ اور حسن بتاں میں
بڑی تاثیر ہے دل کی زباں میں

اب اگر آپ یہ سوال کریں کہ کیا دل کی آنکھیں، کان، ناک وغیرہ بھی ہیں تو ہم سوائے اپنے ناقص مطالعے کے اعتراف کے اور کیا کر سکتے ہیں۔

بہر حال ان تفصیلات کے بعد ہم دل کو ایک ایسا گھر تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہیں جس میں کھڑکیاں، دروازے سبھی کچھ موجود ہیں۔ آئیے اب اس گھر کو ایک نام دیں اور ظاہر ہے ہر چیز اللہ کے نام سے ہی منسوب ہے یا یوں کہئے کہ جملہ حقوق بحق اللہ محفوظ ہیں ؎

کہنے کو تو اللہ کا گھر ہے حرم دل
اب اک بت کافر بھی وہاں رہنے لگا ہے

یہ بت کافر کون ہے اور کیوں ہے ؟ ؎

کون ہے کیوں ہے نہیں معلوم
اک سہانی سی دل میں صورت ہے

لیجئے صاحب! بولتی بند آگے سوال کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ بے خوابی ہمیشہ ایک پریشان کن مسئلہ رہی ہے۔ سائنس داں اس مسئلے کو حل کرنے میں گو ناکام رہے ہیں لیکن شعرا حضرات ناکام نہیں رہنے والے۔ غور کیجئے۔

کیسے پہنچے نیند آنکھوں تک
بیٹھا ہے دل رستہ گھیرے

اسی طرح ایک اور مسئلہ ہے زخم دل یا داغ دل یا درد دل ——— واقعہ یہ ہے کہ اگر دل دھڑکنا بند کر دے تو بولو نابود ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی اہم واقعہ یہ ہے کہ اگر دل معمول سے زیادہ دھڑکے یا معمول سے کم دھڑکے تو جینے کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اللہ اللہ ایک طرف تو یہ نزاکت اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ دل کے زخموں سے اب بدبو بھی اٹھنے لگی ہے۔ لیکن شاعر صاحب ہیں کہ جیتے ہی چلے جاتے ہیں اور اپنی طویل طویل غزلیں سنا کر ہمیں جیتے جی مارنے پر تلے ہوئے ہیں ؎

داغ دل اگر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں" کے مصداق دوسرے صاحب فوراً پہنچتے ہیں ؎

اک ترا ہی دل نہیں گھائل درد کے مارے اور بھی ہیں
کچھ اپنا کچھ دنیا کا غم دیکھنے والے دیکھتے جا

اب اس مسئلے کے حل کے لیے ایک صاحب کو منتخب کیا گیا جو اس کا علاج ڈھونڈ لائے۔ وہ صاحب گلی گلی، نگر نگر گھومتے رہے اور آوازیں دیتے رہے ؎

دل کے درد کا درماں کر دے کوئی ہے اس قابل بابا
بستی بستی گھوم رہا ہوں لے کر اپنا دل بابا

قسمت نے یاوری کی اور ان صاحب کو آخرش ایک قابل آدمی مل ہی گیا ؎

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

یہ سننا تھا کہ حضرت شاعر۔ حواس باختہ ہوگئے۔ اور ایک سرد آہ کے درمیان فرمانے لگے ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

اور پھر فوراً نہ جانے کیا خیال آیا کہ دوست سے کہنے لگے ؎

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اُن کا دوست بھی بڑا شاطر تھا۔ پہلو بچانا خوب آتا تھا۔ فوراً جواب دیا ؎

اک دل ملا ہے وہ بھی نہیں اختیار میں   اک غم ملا ہے وہ بھی غم معتبر نہیں

اور شاعر صاحب نے اپنی روایتی شرافت سے مجبور ہو کر فوراً اثبات میں گردن ہلائی اور مان لیا کہ انہیں جو ایک دل ملا ہے وہ بھی ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ذرا سی آہٹ ہوئی اور دل اچھلنا کودنا شروع کر دیا ؎

ان کی آنکھوں کی مرضی پہ طوفان سے گذر جائے   دل ورنہ وہ شے ہے جو آہٹ سے بھی ڈر جائے

داستانِ دل طویل ہے۔ اتنی طویل کہ شعراء کرام عمر بھر دل کی داستان کہتے رہتے ہیں اور پھر بھی کہتے ہیں۔

بتائیں ہم بھی حقیقت کچھ ان کے وعدوں کی   ہمارے دل کا فسانہ کوئی سنے تو سہی

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر۔ عظمت دل بیان کرتا کرتا مبالغہ کی حد بھی پار کر دیتا ہے ؎

دلیلِ عظمت آدم، غرورِ جسم و جاں ہے دل   ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی اک داستاں ہے دل

اب آپ اسے احساس کمتری کہیں یا کسر نفسی کہ ؎

شاداں جو غم میں ہوں تو خوشی میں اداس ہوں   میں داستانِ دل کا عجب اقتباس ہوں

الغرض شعراء کرام کا کلام بے لگام پڑھ پڑھ کر سن سن کر قارئین و سامعین کی حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ برسرِ عام شعرا حضرات سے کہتے پھرتے ہیں ؎

گزر رہی ہے جو مجھ پر وہ تجھ پہ بھی گزرے   میں تیرا حشر بھی اپنا سا دیکھنا چاہوں

آپ نے یہ محاورے تو سنے ہی ہوں گے۔ بات میں بات نکالنا، بے پر کی اُڑانا، یا بال کی کھال نکالنا۔ ہمارے آلوچک بھی کچھ اسی قماش کے آدمی ہیں۔ انہیں ان چیزوں سے محاورتاً یا عادتاً ہی نہیں بلکہ حقیقتاً عشق ہے۔ تنقید ان کے لفظ لفظ میں ٹھسی ہوتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے حتیٰ کہ سوتے میں بھی نکتہ چینی ان پر سوار رہتی ہے۔ ایک دفعہ ایک نئے لکھنے والے نے انھیں اپنا ایک افسانہ دیا کہ نادر صاحب ذرا اسے دیکھ لیجیے گا۔ دوسرے دن انھوں نے وہ افسانہ بغیر پڑھے اس ریمارک کے ساتھ لوٹا دیا کہ آپ کی تحریر اچھی نہیں اس لیے آپ افسانے اچھے نہیں لکھ سکتے۔

آلوچک کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ان کے علاوہ اوروں کو لکھنا تو کجا بولنا تک برابر نہیں آتا۔

ہمارے والد ہمارے دادا سے راوی ہیں کہ ایک ولی اللہ کی بیوی ہر وقت ان پر نکتہ چینی کیا کرتیں۔ ایک دن وہ بزرگ کہیں باہر سے آئے تو ان کی بیوی کہنے لگیں، "تم کیا ولی ہو، ولی اللہ لوگ تو ہوا میں۔ ابھی آج ہی میں نے ایک ولی کو دیکھا ہے۔ میرے گھر کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے گئے ہیں۔ بزرگ نے کہا "نادان عورت! تم مجھے پہچان نہ سکیں وہ میں ہی تو تھا"

آلوچک اور اُن کی تنقیدیں

خالد صدیقی

بیوی نے کہا اچھا! تو وہ تم ہی تھے جبھی تیڑھے بیڑھے اڑ رہے تھے۔ کچھ اسی طرح کی فطرت آلوچک کی بھی ہے۔ اگر آپ کے سامنے کسی چیز کی تعریف کریں تو آلوچک اس میں ضرور کیڑے نکالیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس چیز کی برائی کریں تو آلوچک اس کی پچاس اچھائیاں آپ کے روبرو پیش کر دیں گے۔

آلوچک اپنی تعریف سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ فطرتاً ہر آدمی اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے مگر آلوچک اس معاملے میں اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

کبھی کبھی آلوچک مصلحت پسندی سے بھی تحمل کر لیتے ہیں اور کسی کا احسان اپنے اوپر باقی رکھنا اپنی عین فطرت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حال ہی میں کسی طرح ریڈیو پر انھیں اپنا ایک تنقیدی مقالہ پڑھنے کا موقع مل گیا۔ اس مقالے میں آلوچک نے ایک ادیب کو دورِ جدید کا سب سے اچھا ادیب اس لیے قرار دے دیا کہ اس نے اپنے کسی مضمون میں آلوچک کی تعریف کر دی تھی۔

آلوچک کی تنقیدیں کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں "مصنف دورِ جدید کا ایک اچھا افسانہ نگار ہے اپنے اس

افسانے میں اس سے اس دور کی صحیح عکاسی کی ہے مگر اور جدید افسانہ نگاروں کی طرح وہ بھی اپنے نقطۂ نظر کو واضح نہیں کر سکا ہے اور اگر وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکا ہے تو قاری کو اس سے ہم آہنگ نہیں کر سکا ہے۔ اور قاری اگر اس سے ہم آہنگ ہوا بھی ہے تو اُسے سمجھ نہیں سکا ہے اور اگر قاری اسے سمجھ نہیں سکا ہے تو یہ قاری کی کمزوری کے ساتھ ساتھ اس افسانے اور افسانہ نگار کی بھی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مگر ان سب باتوں سے قطع نظر یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ ہے کہ مصنف اس دور کے ایک بہترین افسانہ نگار ہیں اور انھوں نے ایک اچھی تخلیق پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ایک شاعر کی کتاب پر آلوچک اپنا تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"کتاب طباعت و ضخامت کے لحاظ سے مہنگی نہیں ہے کہ اس دور میں آفسٹ پر چھپی چار سو صفحے کی کتاب ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس بات سے شاعر کی خوش حال زندگی اور اس کی شاعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سرورق پر شاعر کی زندہ دل تصویر قاری پر اچھا اثر ڈالتی ہے اور شاعر کی پُر وقار شخصیت کا رعب اور دبدبہ قاری کے دل و دماغ کو مسحور کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ شعروں کا مطالعہ کرتا ہے تو بے معنی شعروں کی بھی داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔ مگر باوجود اس کے کہ شاعر اپنے آپ کو جدید دور کا عکاس کہتا ہے۔ اس کے شعروں سے جگہ جگہ قدامت پسندی اور روایت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ جس کی واحد وجہ اس کے علاوہ اور کوئی سمجھ میں نہیں آتی کہ شاعر اس کوٹ پتلون کے دور میں بھی شیروانی اور پاجامہ کو اپنا بہترین لباس سمجھتا ہے۔" اسی طرح کے ایک لمبے چوڑے تبصرے کے بعد آخر میں آلوچک لکھتے ہیں "مگر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ موصوف کا شمار دور جدید کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ موصوف اپنا ایک الگ اسلوب ایک الگ رنگ رکھتے ہیں جو دورِ جدید کے اور شاعروں میں مفقود ہے کہ ان کے یہاں سوائے نقالی کے اور کچھ نہیں پایا جاتا اور صرف یہی ایک خوبی ہی موصوف کو جدید شاعروں کی صف میں نمایاں رکھنے کے لئے کافی ہے۔

آلوچک کی تنقید اور نکتہ چینی صرف شاعروں یا دیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ راہ چلتے مسافروں، لوگوں کی پسند ناپسند، عورتوں کے لباس حتیٰ کہ جانوروں پر بھی نکتہ چینی سے بعض نہیں رہتے۔ ایک مرتبہ آلوچک میرے ساتھ بمبئی کے نواحی علاقے میں گھوم رہے تھے۔ اتفاقاً پاس سے گذرتے ہوئے ایک گدھے نے رینکنا شروع کر دیا۔ آلوچک جھلا کر بولے "عجیب نالائق جانور ہے گدھے کی طرح چلا رہا ہے۔"

عورتوں کے پسندیدہ لباس میکسی کے بارے میں آلوچک کا خیال ہے کہ اس لباس نے میونسپل کارپوریشن کے محکمہ صفائی کو اور بھی سست و کاہل بنا دیا ہے۔

اپنی نکتہ چیں طبیعت کی وجہ سے آلوچک اپنی کئی محبوباؤں سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں۔ ان کی ایک محبوبہ صرف اس لیے انھیں چھوڑ گئی کہ انھوں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر تمہاری ناک ذرا سی چوڑی نہ ہوتی تو تم بہت ہی خوب صورت لگتیں۔

ایک اور محبوبہ سے آلوچک نے کہا "یہ تم ہنستے وقت اپنے منہ پر رومال کیوں رکھ لیتی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے چھوٹے چھوٹے موتی جیسے دانت کتنے پسند ہیں۔ تمہارے یہی دانت تو تمہاری خوب صورتی ہیں ورنہ.... محبوبہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھا تم آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھ پھیلاؤ میں آج تمہیں ایک یادگار تحفہ دوں گی۔" آلوچک نے آنکھیں بند

کرکے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ محبوبہ نے اپنی نقلی بتیسی نکال کر آلوچک کے ہاتھوں پر رکھ دی اور وہاں سے ایسا بھاگی کہ آلوچک اپنا سا منہ اور اس کی بتیسی لے کر رہ گئے۔

کبھی کبھی آلوچک کے ساتھ وابستہ ٹریجڈیز (Tragedies) بھی ان کی تنقید کی شدت کا باعث بن جاتی ہیں۔ ایک ادبی نشست میں آلوچک نے ایک افسانہ نگار پر سخت تنقیدیں کیں جس کا کہ وہ قطعاً مستحق نہ تھا۔ محفل برخاست ہونے کے بعد میں نے آلوچک سے کہا تم نے تو آج اس بے چارے پر بڑی سخت تنقیدیں کر دی۔ کہنے لگے "ہاں! آج بیگم سے لڑ کر آیا تھا۔"

ویسے بھی آلوچک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں جب تنقیدی مقالے لکھنے ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی سے جھگڑا ضرور کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ آلوچک سے کسی دوست نے انھیں خط لکھا آلوچک نے اس کا جواب لکھنے کے بعد خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ تمہارے خط میں املا کی اتنی غلطیاں تھیں اتنے الفاظ تم نے غلط معنی میں استعمال کئے اتنے جملوں کی بندش قواعد کی رو سے صریحاً غلط تھی اس لیے آئندہ خط لکھتے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا اور احتیاط برتنا اور اسی احتیاط کے پیشِ نظر اس دوست نے انھیں پھر کبھی خط نہ لکھا۔

غرض آلوچک اور ان کی تنقیدیں اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک آلوچک ہمارے درمیان موجود ہیں اور ان کی تنقیدوں کی بدولت ادیب کو جو مزہ آتا کوئی خطرہ نہیں کہ:

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار

نوٹ: اگر اس مضمون کے کردار کو کوئی صاحب اپنی ذات سے منسوب کرنا چاہیں تو مصنف کو از حد خوشی ہوگی۔ OO

نوید مسیح الدین

علامت بیدار مغزی کی

کسی مفکر کا قول ہے "اخبار بینی بیدار مغزی کی علامت ہے"۔ یہ عبارت اس وقت ہماری نظروں سے گذری تھی جب ہم ابھی پرائمری اسکول کے طالب علم ہی تھے۔ اس عمر میں تو ہمارا ذہن ابھی جمع تفریق کی علامتوں میں ہی الجھا ہوا تھا بیدار مغزی کی علامت کیا جانیں۔ لیکن جوں جوں ہمارا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ وسیع تر ہوتا گیا معلوم ہوا کہ اکثر بیدار مغز گنجے ہوتے ہیں اور یہی بیدار مغزی کی علامت ہے۔ ہم نے جن قوم کے رہنماؤں، دانشوروں اور دنیا کی عظیم شخصیتوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ ان کے چہروں پر بیدار مغزی کی علامتیں ابھر رہی تھیں۔ چنانچہ ہماری نظر جب بھی کسی گنجے شخص پر پڑتی تو ہم سمجھتے تھے کہ یہ شخص بیدار مغز ہے۔ لیکن چند تلخ تجربوں سے گزرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اکثر بیدار مغز گنجے ہوتے ہیں۔ لیکن ہر گنجا بیدار مغز نہیں ہوتا۔ اب اس انکشاف کے بعد مذکورہ اشخاص کو کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہماری بھی یہ شدید خواہش رہی کہ ہمارا شمار بھی دانشوروں میں ہو، چنانچہ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہر حال میں اپنا مغز بیدار رہے۔ لیکن اتنے برسوں سے اخبار دیکھتے رہنے کے باوجود بھی ہمارے چہرے پر کوئی بیدار مغزی کی علامت ظہور پذیر نہ ہو سکی۔ اور ہم یہ بھی فیصلہ نہ کر سکے کہ اخبار دیکھنے سے مغز بیدار ہوتا ہے یا وہی لوگ اخبار دیکھتے ہیں جن کا مغز ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اپنا مغز تو صرف اس وقت تک ہی بیدار رہتا ہے جب تک اخبار ہماری نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ بڑے آرام سے محو خواب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دارالمطالعہ یا ہوٹل سے اخبار دیکھ کر لوٹتے ہیں تو ہمیں اخبار کی اہم سرخیاں تک یاد نہیں رہتیں۔ پھر بھی ہم اپنا شمار بیدار مغزوں میں ہی چاہتے ہیں۔ اس لئے کچھ دیر کے لئے سہی ہر روز اپنے مغز کو بیدار رکھتے ہیں۔ ہم اپنے کمزور حافظے سے اس قدر نالاں ہیں کہ کچھ بیان نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی ان بیدار مغزوں کی محفلوں میں ہمیں بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ یہ لوگ ہماری معلومات عامہ کا امتحان اس طرح لیتے ہیں جیسے کوئی مشاق پہلوان اپنے

حریف کو شکست فاش دینے کے لیے تابڑ توڑ حملے کرتا ہے۔ ایسے سنگین وقت میں بھی لاکھ کوششوں کے ہمارا مغز بیدار ہونے کی زحمت تک گوارا نہیں کرتا اور ہم ان کے کسی سوال کا صحیح جواب نہیں دے پاتے۔ اس طرح کے حادثات ہمیں آئے دن اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اکثر دفعہ نوجوانوں کو بیدار مغز ضعیفوں یا وظیفہ خواروں سے بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ ان آثار قدیم نما ضعیفوں کا یہ حال ہے کہ ان کا مغز سارا دن بیدار رہتا ہے۔ یہ جب گھر سے نکلتے ہیں تو ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ، ایک پیالی چائے کی قیمت میں دو چار روزنامے جن کی مالیت ڈیڑھ دو روپیہ ہوتی ہے معہ چائے چٹ کر آئیں۔ ایسے حضرات صبح سویرے ہی منہ ہاتھ دھو کر اپنی مخصوص ہوٹل میں آدھمکتے ہیں اور تمام روزناموں کو اکٹھا کر کے کسی کونے کی پرسکون میز پر جم جاتے ہیں۔ اور انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ ان کا کوئی آشنا اخبار دیکھنے کی غرض سے آئے تو ان کو بھی چائے فری میں مل جائے۔ ایسے موقع پر کسی نوجوان کی کیا مجال کہ اپنے مغز کو بیدار کرنے کی جرأت کر سکے۔ ایسے موقع پر اگر کوئی نوجوان ان حضرات سے اخبار حاصل کرنے کی جستجو کرے تو اسے قہر آلود نگاہوں سے اس انداز میں گھورتے ہیں۔ جیسے وہ کوئی وحشی آدم خور ہوں۔

ہر شخص ایک خاص مقصد کے تحت اخبار دیکھتا ہے، گویا ایک خاص مقصد کے تحت ہی اس کا مغز بیدار رہتا ہے۔ ہمارے ایک بہت ہی اچھے دوست ہیں جو اتفاق سے لیڈر بھی ہیں۔ وہ محض اس لیے اخبار دیکھتے ہیں کہ ہر روز قومی یا بین الاقوامی صورت حال سے واقف ہو جائیں اور وقتاً فوقتاً اقلیتی طبقہ یا پسماندہ طبقہ کے ساتھ ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاجی جلسے اور جلوس منعقد کر سکیں اور ہمدردی کے اظہار کے طور پر مگر مچھ کے آنسو بہا سکیں یا سیاسی تغیرات پر نظر رکھیں عین وقت پر "دل بدلی" کا انتظام کر سکیں۔ اس سے ہٹ کر ان کی نظر جب عوامی مسائل کے کالموں پر پڑتی ہے ان کا مغز فوری آنکھیں موند لیتا ہے ان کا خیال ہے کہ اگر عوامی مسائل حل ہو جائیں تو لیڈروں کے لیے کچھ نہیں بچتا' مزا تو جب ہے کہ سانپ بھی نہ مرے اور لکڑی بھی نہ ٹوٹے بھلا وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو۔ چنانچہ وہ اسی نظریہ کے تحت اپنے علقوں میں بہت بڑے دانشور مانے جاتے ہیں۔

بعض نوجوان صرف اور صرف فلمی اشتہارات کے لیئے ہی اخبار دیکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کا مغز صرف چند لمحے ہی بیدار رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کی جنرل نالج کا بڑا عجیب حال ہوتا ہے۔ ہماری دانست میں ایسے لوگوں "کو بے مغز" کہا جائے تو بہتر ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ہم نے اپنے ایسے ہی ایک بے مغز دوست سے گفتگو کے دوران اپنی بیدار مغزی کا ثبوت دینے کے لیے کہا "پرسوں سمندری طوفان کی وجہ سے ویتنام میں بڑی بھاری تباہ کاری ہوئی اور ہزاروں لوگ اپنے جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھے" وہ کچھ دیر ہماری باتوں کو بڑی بے دلی سے سنتے رہے اور یوں گویا ہوئے "ہاں سعودی عرب کی خلیجی ریاستوں میں اکثر اس طرح کے طوفان آتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے ویتنام میں پٹرول کے بڑے بڑے ذخائر ہیں جن کو حالیہ طوفان سے کافی نقصان پہنچا ہے۔"

ہمارے محلہ میں ایک بہت ہی بیدار مغز صاحب پائے جاتے ہیں جو سارا سارا دن اخباری مطالعے میں غرق رہتے ہیں۔ گویا اخبار ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ اس وقت تک اپنے گھر نہیں پہنچتے جب تک کہ وہ دو چار روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کا ایک ایک نقطہ "الف" سے "والسلام" تک پڑھ نہ ڈالیں اس دوران انھیں کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا ایک دن ان کی حالت پر حیرت زدہ ہو کر ہم نے مالک ہوٹل سے پوچھا کیا یہ حضرت کھانا کھانے کے لیے بھی گھر نہیں جاتے؟ مالک ہوٹل شاید ان سے کافی ناراض تھا کہنے لگا "بھلا اخبار خوروں کو بھوک کہاں؟"

ہمارے ایک بہت ہی نکمے دوست ہیں جن کا شمار صفحہ اول کے بے روزگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے شوق بڑے نرالے ہیں وہ اس قدر کاہل ہیں کہ اپنی طلب اور شوق کی تکمیل کے لیے بھی دو چار آنے نہیں کماتے لیکن ان کی ساری توانائی دوسروں کے مغز کو بیدار کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ ہر روز ناشتہ سے فراغت پاکر ہمارے ہاں پہنچتے ہیں اور بڑی ہی سنجیدگی سے کہتے ہیں "چلو یار اخبار تو دیکھ آئیں"۔ لیکن ان کے اس اخبار دکھالانے میں بڑا راز مضمر ہوتا ہے۔ انھیں یہ توقع ضرور ہوتی ہے کہ اخبار بینی کے دوران چائے کا دور بھی چلے گا اور سگریٹ نوشی بھی ہوگی۔ اس طرح وہ تمام دن اپنے ہر دوست اور ملاقاتی کو اخبار دکھالاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے پاپی پیٹ کے لیے ہمیشہ اپنے مغز کو بیدار رکھتے ہیں۔ خدا بچائے ایسے بیدار مغزوں سے!

مختار یوسفی
مالیگاؤں

ارے باپ رے باپ

ہے واعظ ترے نام ارے باپ رے باپ — کوئی شوخ پیغام ارے باپ رے باپ
تقدس کی چادر ہے جن کے بدن پر — پئیں جام پر جام ارے باپ رے باپ
خدا جانے اب رات گذرے گی کیسے — ہے جھگڑا سرِ شام ارے باپ رے باپ
کریں شیو اب جاکے کس کی دکاں پر — ہیں رخصت پہ حجام ارے باپ رے باپ
نہانے کی خاطر مری جھونپڑی میں — وہ مانگے ہے حمام ارے باپ رے باپ
کسی شئے کا اسٹاک جب بھی کیا ہے — تو فوراً گھٹے دام ارے باپ رے باپ
اچھلتا ہے کتنا چہکتا ہے کتنا — رقیب سیہ فام ارے باپ رے باپ

شب و روز مختارؔ ہے فکر اس کو
کروں کس طرح رام ارے باپ رے باپ

چوبیس گھنٹے سائیکلون ریلیف کارروائیاں

ہلاکت آفریں سائیکلون جس نے ۱۴ مئی ۱۹۷۹ء کو آندھرا کے ساحلی اضلاع کو نقصان پہنچایا اپنے پیچھے موت اور تباہی کا المناک منظر چھوڑ گیا ہے جبکہ ۶۰۰ ہلاکتیں واقع ہوئیں مجموعی نقصان ۱۸۱ کروڑ روپے کا ہوا۔

آج امدادی اور بازآبادکاری کے پروگرام کو جنگی خطوط پر روبہ عمل لایا جارہا ہے

۴۸ر۳ ۸۵ لاکھ روپے اب تک امدادی کاموں پر خرچ کئے گئے۔

۳۸۶ر۱۳ ٹن چاول اور پانچ لاکھ سے زیادہ دھوتیاں اور ساڑیاں طوفان کے متاثرین میں اب تک تقسیم کئے جاچکے ہیں۔

۸۳ر۱۷ کروڑ روپے پرکاشم اور نیلور ضلعوں میں فصلوں کی از سر نو اگانے کے لئے کاشت کاروں کو دیئے جائیں گے۔

پرکاشم اور نیلور ضلعوں کے ساحلی علاقوں میں ۲۵ کروڑ کی لاگت سے ابتداءً ایک لاکھ مکانات تعمیر کئے جائیں گے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش حیدرآباد

(D.I.P.R.)

مناظر عاشق ہرگانوی

پیکرانِ بے سخن

بھُس بھرے لوگ

ایک پولیس چیف نے دیکھا کہ ایک افسر ایک ٹھگ کو بُری طرح پیٹ رہا ہے۔ اسے بے حد غصہ آیا اور اس نے افسر کو بلا کر ڈانٹ بتائی "آئندہ سے تم ایسا نہیں کروگے، ورنہ تمہیں نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا۔"

"مجھ سے ایسی سختی سے پیش نہ آئیے" افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو اسے ایسے ڈنڈے سے مار رہا تھا جس میں بھس بھرا ہوا ہے۔"

"خواہ کچھ بھی ہو" پولس چیف نے کہا "ایسی مار یقیناً تکلیف دہ رہی ہوگی چاہے اس سے چوٹ نہ بھی پہنچی ہو۔"

"لیکن" افسر نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس ٹھگ میں بھی تو بھُس بھرا ہوا تھا۔"

اس بات پر اطمینان ظاہر کرنے کے لیے پولس چیف نے اپنے ہاتھ کو اتنی تیزی سے آگے بڑھایا کہ اس کی بغل لکلکلا پھٹ گئی اور زخم سے بھُس گرنے لگا۔ پولیس چیف میں بھی بھس بھرا ہوا تھا۔

گپ شپ کی جگہ

شہر پہنچ پر ایک شخص نے اپنے ایک دوست سے ملنے کے لیے وقت مقرر کرنے کے سلسلے میں اسے فون کیا۔

جواب ملا۔ "ارے بھئی گھر پر تو نہیں مل سکوں گا، بہت کام رہتا ہے، ہاں گھومتے پھرتے آفس چلے آؤ وہیں پر اطمینان سے گپ شپ کریں گے۔"

ترکیب

ایک ہاکر ایک مصنف کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ دروازہ مصنف کی بیوی نے کھولا۔ ہاکر نے فوراً ایک کتاب دکھائی "شاید آپ اس کی ضرورت محسوس کریں اور خرید لیں۔ بڑی اچھی کتاب ہے۔"

"کیا نام ہے کتاب کا؟"

"بیویوں کے لیے پانچسو بہانے۔"

"تو یہ میرے کس کام کی ہے۔؟"

ہاکر نے دال گلتی دیکھ کر فوراً ایک ترکیب سوچی، "آپ کے شوہر نے ابھی ابھی خریدی ہے۔"

ٹیوشن

ایک لڑکی ایک بہت بڑے گھرانے میں ٹیوشن کر رہی تھی۔ اسے اچھی خاصی تنخواہ بھی مل رہی تھی۔ لیکن یکا یک اس نے ٹیوشن کرنا چھوڑ دیا۔ باپ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ "بچہ بہت ہی بیک ورڈ ہے اور اس کا باپ بہت ہی فارورڈ۔"

صحیح عمر

کورٹ میں جج نے کسی گواہ عورت سے کہا "آپ قسم کھا کر اپنی صحیح عمر بتائیں۔"

"جی! میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی" عورت نے کہا۔

"اچھا تو پہلے اپنی صحیح عمر بتائیں پھر قسم کھائیں۔"

"ہاں میں ایسا کر سکتی ہوں۔" عورت نے جواب دیا۔ ●

رؤف رحیم ایم اے

ہلمٹ

ہم اپنی اسکوٹر پر سوار شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنے وظیفہ یاب والد محترم کا پٹرول جلاتے پھر رہے تھے کہ ایک بے رحم ہاتھ نے ہمیں روکا۔ بارہا سوچا کہ کوئی پری پیکر نازک مرمریں ہاتھ ہلاکر ہم سے لفٹ مانگے لیکن ہائے ری قسمت! کانسٹبل صاحب کے روبرو پسینے میں تر بتر ہوگئے۔ ہم جانتے تھے کہ جب وہ روکیں گے بغیر جرمانے کے ہمارا گھر لوٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور ہم ٹھہرے بے روزگار پوسٹ گریجویٹ۔ جیب میں ایک عدد کنگھا، دستی کے علاوہ ایک ڈائری جو ہمارے مفلس یعنی شاعر ہونے کا عملی ثبوت ہے۔

کانسٹبل نے رعب دارانہ انداز میں کہا "کیا آپ نے ریڈیو نہیں سنا، اخبار نہیں پڑھا کہ ہر شین سے چلنے والی دو پہیہ گاڑی سوار پر ہلمٹ کا لزوم ہے۔" ہم نے معصومیت سے جواب دیا "انسپکٹر صاحب ہمارے پاس ریڈیو سننے اور اخبار پڑھنے کی فرصت کہاں؟" "پھر آپ کیا کرتے ہیں؟" کانسٹبل صاحب نے کرخت لہجہ میں کہا

"صرف اسکوٹر پر گھومتا ہوں کبھی ایمپلائمنٹ کے چکر تو کبھی منسٹر صاحب کے گھر کے چکر۔ کانسٹبل صاحب نے صرف وارننگ پر اکتفا کرلیا۔ ہم پسینہ پونچھ کر روانہ ہوگئے۔ اسکوٹر کو گلیوں کوچوں سے لے جاکر اپنی منزلِ مقصود پہنچے۔ کسی طرح والد بزرگوار سے ہیلمٹ کی ضرورت بتائی کہ اگر ہلمٹ نہ ہو تو حادثہ میں آدمی مارا جاتا ہے۔ وہ چونکہ بہت معصوم ہیں اور اس نااہل بیٹے کو حد سے زیادہ پیار کرتے ہیں بغیر کسی عذر کے قیمت خرید دے دی۔ یہ کہتے ہوئے کہ جان ہے تو جہان ہے بیٹا۔

ہم ہلمٹ کی دوکان پہنچے جہاں گاہکوں کی بھیڑ نظر آرہی تھی کل تک سیٹھ صاحب ہر آنے جانے والے کو مایوسی سے دیکھا کرتے تھے اب انھیں نظر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ تھی سیلس مین نے "ہلمٹ" کی تعریف میں قصیدے پڑھنے شروع کردیئے۔ "صاحب! خریدنے میں جلدی کیجیے ورنہ پھر نا کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی" صاحب اگر حادثہ پیش آئے تو انسان

مرجائے گا لیکن اس کا سر صحیح سلامت رہ جائے گا۔ ایک بار آزما کر دیکھئے۔ ہم نے سوچا کہ واقعی یہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے جسم پر تو یہی ایک اہم چیز ہے ایک شاعر اور بے روزگار امیدوار کے لیے دماغ کا رہنا لازمی ہے چاہے جسم نہ ہو۔ دکاندار نے فخریہ انداز میں کہا آج اسے ہر شخص خرید رہا ہے جس کے پاس موٹر سائیکل ہو وہ بھی اور جس کے پاس نہ ہو وہ بھی۔ ہم مبہوت ہوکر استفسار کرنے لگے۔ آخر وہ لوگ کیوں خرید رہے ہیں جن پر اس کا لزوم نہیں۔؟

جواب میں دکاندار نے کہا کہ صاحب اس ہلمٹ کے کئی فائدے ہیں ابھی جنہوں نے ہلمٹ خریدی ہے وہ گنجے سر ہیں۔ دن بھر ہلمٹ لگائے گھوما کریں گے یہ نسخہ انہیں اپنے ایک دوست سے ملا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گرمی کی شدت اسے وہ گھومتے ہی رہیں گے۔ خدانخواستہ کا غذ چننے۔ یہ دیدہ زیب ہلمٹ جس کو ہم نے دگنی قیمت میں اس نوجوان کو بیچی ہے۔ اس کے پاس بھی اسکوٹر نہیں ہے وہ اپنے آپ کو اسکوٹر ہولڈر کہلوانا چاہتا ہے۔ اس ہلمٹ پر "I love you" لکھا کر اپنے اظہار محبت کا وسیلہ بنانا چاہتا ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ اور تعریف کرتا ہم نے تاخیر کے بغیر ہلمٹ خرید لی۔ سیلس من کے ہاتھوں تاج پوشی (ہلمٹ پوشی) کی رسم پوری ہوئی۔ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر دیکھا اپنے آپ کو پہچاننے میں تاخیر ہوئی۔ غور سے دیکھا بے ساختہ آنسو امنڈ پڑے۔ کیونکہ ہم نے عرصہ دراز سے اپنے بالوں کو لاڈ و پیار سے پال کر زلف دراز کر لیا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے سیلون میں اُسے ترشوایا تھا۔ لوگوں اور خاص کر حسینوں کو ہمارے خوب صورت بال ہی پسند تھے اور اب وہ نظروں سے اوجھل تھے۔

ناز تھا جس پہ میرے سر پہ وہی بال نہیں

ہم دست بدعا ہوگئے کہ قانون ایسا ہو جائے کہ ہلمٹ بالوں کے نیچے رہے۔ شاید بدقسمتی ہمارا ساتھ چھوڑ دی ہے نہ چھوڑے گی۔ ہم بندشوں کے غلام ہوگئے۔ جمہوریت میں بھی آزاد نہیں۔ بہرحال بڑبڑاتے ہم نے ہلمٹ کو سر پر سوار کیا ایمپلائمنٹ کے لیے رخت سفر باندھا جیسے ایک سپاہی سر پر کفن باندھے میدان جنگ جاتا ہے۔

ایمپلائمنٹ آفیسر صاحب کے روبرو ہلمٹ ہاتھ میں اٹھائے پہنچے انھوں نے ہم پر جائزہ لیتی نظر ڈالی اور اطمینان کے ساتھ ٹال دیا جیسے کہ ہم کو ملازمت کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم نے بڑے ادب سے رخصتی سلام کیا کیونکہ ہمارے پاس پست اقوام کی سند ہے نہ تو ہم درج فہرست اقوام سے تعلق رکھتے ہیں لہذا ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ ہم نے دیکھا کہ ہماری طرح کئی نامراد بیروزگاروں نے جو ہڑتال پر آمادہ تھے سنگ باری شروع کر دی۔ ہم نے جھٹ پٹ ہلمٹ پہن لی۔ ہمیں احساس ہوا کہ یہ واقعی کارآمد چیز ہے۔ کئی پتھر جسم پر لگے۔ لیکن جس دماغ کی ہمیں ضرورت ہے وہ کھوپڑیوں یعنی ہلمٹ کی طفیل بچا رہا۔ کسی طرح لنگڑاتے تڑپتے وہاں سے رخصت ہوئے۔

گھر میں ہلمٹ کی آمد سے بچوں میں کھلبلی مچ گئی کوئی اسے تربوز کا چھلکا کہتا تو کوئی دیگچی سمجھ کر کھونٹی پر ٹانگا دیا گیا صبح اٹھ کر دیکھا ہلمٹ تو اس کے اندر دو انڈے اور ایک جوڑا چڑیوں کا نظر آتا ہے۔ انھیں تیار شدہ گھونسلہ مل گیا تھا۔ ہماری ملازمہ کبھی ڈھانپ کے طور پر استعمال کرتی ہے تو کبھی کچرا پھینکنے کی ٹوکری کی طرح۔

ہمیں رفتہ رفتہ ہلمٹ کے فوائد کا علم ہوتا گیا کہ کچھ صاحبان نے جو ٹوپی کو معیوب تصور کرتے تھے ہلمٹ کو اس کی جگہ دے دی ہے۔ مقروض حضرات نے اسے پہن کر اپنے قرضدار کی آواز کو ہوا میں تحلیل کر دیا شوہروں نے اپنی بیگمات کی

کی گالیوں اور فرمائشوں سے تنگ آکر گھر میں بھی اس کے الزام کو قانوناً ضروری قرار دیا۔ برسات کے اولے اس سے ٹکرا کر اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہیں۔ معمر حضرات اسے پہن کر اپنے سفید بالوں کو چھپا رہے ہیں اور خضاب کی لعنت سے بچ رہے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ماڈرن فقرا کشکول کی جگہ ہلمٹ استعمال کرنے لگے ہیں۔ بدلتے فیشن کا ہر شخص پر اثر بے حد ضروری ہے۔ خواتین کے ہلمٹ پہننے پر شعرا نے زلفوں کی جگہ ہلمٹ پر قصیدے لکھنے شروع کر دیئے۔

ہلمٹ کے فوائد دیکھ کر ہم اس کی اتنی ہی حفاظت کرتے ہیں جتنی ایک ماں اپنے بچے کی۔ جس کا جدا ہونا گوارا نہیں۔ اپنے سینے سے لگائے دفاتر سنیما گھر، ہوٹل ہر جگہ اسے لیے پھرتے ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ یہ قانون ہر جاندار پر لازم ہے۔ پیدل جانے والے راہرو بھی حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں۔

جہاں ہر ہلمٹ جانی فائدہ کی چیز ہے وہیں کارخانے دار کے علاوہ کان اور سر کے ڈاکٹر کیلئے مالی فائدہ کا باعث۔ ہم جس ہلمٹ سے متنفر تھے اب وہ ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔

غزل

جگر نظام آبادی

آپ کی بیٹی کی شادی میں آؤں گا ضرور
ہو بگھارا یا کہ بریانی میں کھاؤں گا ضرور

لوگ چرواہا کہیں یا مجھے ڈھنگر کہیں
بکریاں قاضیوں کی اپنے میں چراؤں گا ضرور

بند کر لو کان اپنے روئی ان میں ٹھونس لو
میں ہوں شاعر رات دن میں گنگناؤں گا ضرور

موچ کھا جائے کلائی ٹوٹ جائیں انگلیاں
کچھ بھی ہو پنجہ عدو سے میں لڑاؤں گا ضرور

میری عادت ہے بُرائی کیا کروں مجبور ہوں
جوتیاں مسجد میں جا کر میں چراؤں گا ضرور

داد دی ہے تم نے میرے پھسپھسے اشعار کی
آدھی پیالی چائے کی تم کو پلاؤں گا ضرور

آپ آ جائیں جو چکر میں تو کوئی کیا کریں
میں ہوں چکر اپنا چکر میں چلاؤں گا ضرور

انصاری اصغر جمیل ناگپور

چند حسینوں کے جوابات

خیال انصاری مالیگانوی کی معرفت ہمارے نام ہمارے عاشقوں کے خطوط، بہ عنوان "چند حسینوں کو خطوط" ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد کے شمارہ مئی ۷۹ء میں شائع ہوئے۔ ان خطوط کے جواب دینا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ لہذا ہم یہ بندہ انصاری اصغر جمیل کے کاندھوں پر رکھ کر ناگپور سے چلا رہے ہیں "گر قبول افتد زہے عز و شرف"

فقط چند حسینائیں

جواب بنام چھوٹو بھائی موٹو

آداب! آپ کا خط ملا۔ شکریہ

فلم برسات ہوتی رہی کی پسندیدگی کا شکریہ۔ یہ فلم آپ جیسے چھٹیچر لوگوں کے شہر میں چھٹیچر سنیما گھر میں ہی ریلیز کی جا رہی ہے۔ اس فلم کو دیکھنے کے لیے آپ کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اس کے لیے میں معذرت خواہ کیسے ہو سکتی ہوں؟ آپ نے میری ہر فلم دیکھی ہے، کیا آپ کے سسر صاحب تھیٹر میں ملازم ہیں؟ اچھا ہی ہوا جو آپ نے میری پہلی فلم اب تک نہ دیکھی ورنہ ......"فلم برسات ہوتی رہی" میری آخری فلم ہے کیوں کہ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران فلم کے ہیرو بوگس کمار سے میں نے باقاعدہ طور پر شادی کر لی ہے جس کی سند ایس کمار کے فلمی مقدمے والے وکیل صاحب کے پاس موجود ہے۔

بوگس کمار کو چانٹا مارنا، موٹر کار سے لے زمین پر گرا دینا وغیرہ یہ سب در اصل میری شادی شدہ زندگی کے معمولات ہیں جنہیں ڈائرکٹر صاحب نے ہماری اجازت سے فلم بند کیا ہے۔ اس شارٹ نے خواتین میں جاگرتی پیدا کی ہے اس کے لیے میں بوگس کمار کی احسان مند ہوں۔ آپ کیسے مرد ہیں کہ ایک غیر عورت کو کپڑوں سے بے نیاز ہو کر سمندر کے کنارے نہاتے دیکھ کر کہتے ہیں کہ وہ گرم گرم منظر آپ کو بہت اچھا لگا۔ کیا آپ ابھی تک کنوارے ہیں؟

رہا صابن والا معاملہ تو اس کا نام آپ اپنی .... سے پوچھ لیں۔ ہم دونوں ایک ہی صابن استعمال کرتی

جواب بنام مظلوم شوہر:

آج پہلی بار کسی شوہر کے مُنہ سے خود کو مظلوم کہتے سنا تو بے حد خوشی ہوئی۔ جی چاہ رہا ہے کہ آپ خود کو مظلوم کہتے رہیں اور میں سنتی رہوں۔ آج تک تو بیوی خود کو مظلوم اور شوہر کو ظالم سمجھتی تھی۔ لیکن آپ کا کیس بالکل الٹ ہے۔ مشہور ڈاکٹر کرم کلّا کا کہنا ہے کہ بیوی کے ایک طمانچہ میں جتنی تاثیر ہے اس قدر مچھلی انڈا، دودھ وغیرہ میں بھی نہیں وہ مزید کہتے ہیں کہ ہر شریف شوہر کو روزانہ صبح شام اپنی بیوی کا ایک طمانچہ کھانا چاہیے جو اس کی صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اپنی بیوی کے طمانچے کو بلا چوں وچرا قبول کرتے جایئے۔ انشاءاللہ تعالیٰ تقدیر آپ کے مقدموں پہ ہوگی اور آپ مقدر کے بادشاہ کہلائیں گے۔

فقط

مس گڑبڑ گھٹالا

جواب بنام گھسو چوپڑا:

آپ کا مردانہ لیٹر ملا۔ کاش کہ ملک کا ہر عاشق آپ ہی کی طرح دلیر ہو جائے۔ اگر ہر عاشق اپنے دلہن اور اس کے چمچوں کو پٹائی شروع کردے تو یقیناً محبوبائیں بھی شیر ہو جائیں۔ اور اپنی چوڑیاں بجا بجا کر اپنے عاشقوں کے ساتھ بھاگنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں مجھے آپ کی سیما مالتی پر رشک آرہا ہے جسے آپ جیسا جوان مرد عاشق ملا ہے۔ میری شبھ کامنائیں۔ آپ کے ساتھ ہے۔ مجھے آپ جیسے ہی جوان مرد عاشق کی تلاش ہے۔ اگر کسی بازار میں دستیاب ہو تو مطلع کریں۔

فقط

مس قیمہ مالتی

جواب بنام پریم کمار من موہن:

بھاڑ میں جائے تمہارا پریم پتر۔ جس دن سے تمہارا پتر ملا ہے میری دنیا ہی اُجڑ گئی ہے۔ میرا گھر والا تمہارے شہر میں تمہاری تلاش میں پھر رہا ہے اور میرا بڑا لڑکا اپنے چھ چمچوں کے ساتھ اس ردّی والے کی تلاش میں ہے جس کے پاس سے تمہیں میری چیتھڑ تصویر ملی ہے۔ دونوں مل کر تمہارا قیمہ بنا دیں گے۔ ویسے وہ لوگ رحم دل بھی ہیں۔ اگر تم انہیں دس ہزار روپے کی پیش کش کردو تو وہ مان جائیں گے۔ ورنہ ....

فقط

ندیا توش والی

جواب بنام چھکن میاں جھنجھنے والا

آپ نے تو چچا چھکن کو بھی مات کردیا۔ انھوں نے تو صرف تصویر ٹانگتے ٹانگتے اپنے انگوٹھے میں کیل ہی ٹھوکی تھی لیکن آپ تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ مجھے فلم میں ندی کے کنارے نہاتے دیکھ کر آپ نے پردے کے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ خیر زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟ خدا کرے آپ زیادہ دن اسپتال میں نہ پڑے رہیں۔ جلدی جلدی اچھے ہو جایئے اور اپنی جھنجھنے کی دوکان سنبھالیں۔ اور ہاں اسپتال میں طبیعت نہ لگے تو کسی بھی نرس سے دل لگا لیجیے۔

فقط
بیلن

ہیں۔ اور ہاں مجھے آپ کو چھوٹو موٹو مخاطب کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں آپ کو چھوٹو بھائی موٹو ہی کہوں گی۔ بھائی کے اضافے سے آپ کا نام ذرا وزن دار لگتا ہے۔

فقط آپ کی چھوٹی بہن
سپنا دیوی

جواب بنام ......

میرے پیارے ...... کاکا! نمستے!

آپ کا پتر پڑھ کر پتہ ہوا۔ پتر پڑھ کر مجھے میرے پتا جی کی یاد آگئی۔ میرے پتا جی کو سورگباش ہوئے کئی برس بیت گئے پرنتو آپ کا پتر پڑھا تو لگا کہ ابھی پتا جی جیوت ہیں۔ میں خوب دھاڑیں مار مار کر روئی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ سچ مچ! آپ کے اور میرے پریوار کی اچھائیں بالکل ایک سمان تھیں۔ وہ تو میں غلطی سے ہیروئن بن گئی۔ میرے پتا جی کی بھی مجھے ہیروئن بننے کے بعد قریب سے دیکھنے کی اچھا تھی، پرنتو افسوس کہ میرے ہیروئن بننے سے پہلے ہی میرے پتا جی سورگباش ہو گئے آپ کو بھگوان ابھی سورگباش نہ کرے۔ آپ کو میری فلم "زور آزوری" کے پریمیر پر مجھ تک پہنچنے میں بہت دھکے، مکے کھانے پڑے۔ جس کا مجھے افسوس ہے کاکا جی میں آپ کی بیٹی سمان ہوں۔ اگر بیٹی تک پہنچنے کے لیے باپ کو دھکے مکے کھانا پڑے تو انھیں افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں بھگوان کو ساکشی مان کر آج سے آپ کو اپنا پتا مانتی ہوں۔ اپنی بیٹی کی رکھشا کریں گے نا آپ؟ بھگوان آپ کو سدا سکھی رکھے۔ آپ کے پتر کا انتظار رہے گا۔

فقط آپ کی بیٹی
مس چندا بجلی

جواب بنام دوسرا کیمرہ میں

آپ کا شکایتی خط موصول ہوا۔

سب سے پہلے تو یہ جواب دیجئے کہ آپ جیسے الو کے پٹھے کو کس بے وقوف نے میری برتھ ڈے پارٹی میں گھسنے دیا۔ آپ کو کیا معلوم کہ کتنی مصیبتوں کے بعد میری سالگرہ پارٹی وجود میں آئی۔ آپ جیسے بن بلائے لوگوں کے لیے ناظم انصاری صاحب نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ

جتنی ہزار کئے جا کے چڑھی ہے یہ ہنڈیا
حرام خوروں کو لنگر دکھائی دیتا ہے

آپ نے لکھا ہے کہ کیک کاٹتے ہی میں فوراً نئے کیمرہ مین کے ساتھ کمرہ میں بند ہو گئی۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ کیمرہ مین دراصل میرا چوتھا شوہر ہے۔

اچھا تو آپ میری سکریٹری اور ہیر ڈریسر پر اپنے دانت جمائے ہوئے ہیں۔ میں انہیں مطلع کیے دیتی ہوں اور ہاں اگر آپ نے آئندہ میری برتھ ڈے پارٹی میں بن بلائے گھسنے کی کوشش کی تو ......

فقط
کنچنا دیوی

مینک
مترجم: کالیکا پرشاد

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ سب سے بڑا بے ہودہ پن کیا ہے تو میرا جواب ہوگا ـــــ "باپ بننا" تجربہ بھی شاید آپ کا یہی کہتا ہوگا لیکن آپ میری طرح خم ٹھوک کر کہہ نہیں پائیں گے۔ اس کو تسلیم کرنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت ہے۔ آدمی کے جیسے ہی داڑھی مونچھ آگتی ہے، وہ شادی کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اگر اسے شرم لگتی ہے تو بڑے بزرگ لوگ ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ ہر طرح سے سمجھا بجھا کر، ڈرا دھمکا کر شادی کرا ہی دیتے ہیں۔ ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ شادی کا نشہ صرف سہاگ رات تک ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد اترنے لگتا ہے اور ایسا اُترتا ہے کہ دوبارہ چڑھنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

شادی کرتے ہی انسان کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے کہ وہ جلد باپ بن جائے۔ بڑے بوڑھوں اور بڑی بوڑھیوں کا بس چلے تو سہاگ رات کے اگلے ہی دن اسے باپ بنا دیں، ایک دن کا انتظار بھی نہ کریں مگر قدرت کم از کم نو ماہ تو انتظار کرا ہی دیتی ہے۔ یوں تو ایسے بھی آدمی مل جائیں گے جو کنوارے ہو کر بھی باپ بن جاتے ہیں وہ شادی کا انتظار نہیں کرتے۔

اس کلجگ کے زمانے میں اگر کسی کی حالت سب سے زیادہ خراب ہے تو وہ ہے "باپوں" کی۔ بھارت نے ہر میدان میں ترقی کی مگر ان باپوں کی حالت سدھارنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ بے چاروں کی حالت آج بھی بڑی نازک ہے۔ عورتوں کی ترقی کے لیے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل بھی ہوتا ہے لیکن آج تک ان "باپوں" کی حالت سدھارنے کے لیے نہ تو کوئی منصوبہ بنا ہے اور نہ کوئی کمیشن بیٹھا ہے۔

باپ باپ ہوتا ہے مگر اسے کئی ناموں سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ کسی کو ڈیڈی کہا جاتا ہے، کوئی پاپا ہے، کوئی بابا کوئی بابو۔ کسی بھی نام سے پکارا جائے، باپ باپ ہی رہتا ہے۔ یہ نام اس کی پوزیشن کو کمزور نہیں کر سکتے۔ ویسے باپ بننے والوں میں ایک طرح کی اکڑ ضرور آ جاتی ہے۔ باپ نہ بن پانے والے سدا سکڑے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد کچھ سال

تک باپ نہ بن پانے والے کو لوگ یوں گھورتے ہیں جیسے دُم دبا کر بھاگنے والے گیدڑ کو۔ اس کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے ڈاکٹروں کا علاج، سادھو مہاتماؤں کی جھاڑ پھونک اور مندر و مسجد میں پوجا اور عبادت۔

پہلی منت تو لڑکے کی ہوتی ہے۔ لڑکا نہ ہو تو لڑکی پر بھی قناعت کر لی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ لڑکے کے بغیر نجات نہیں ملتی مگر میرا کہنا ہے کہ لڑکا پیدا ہوتے ہی نجات مل جاتی ہے۔ کم از کم بیوی سے تو نجات مل ہی جاتی ہے۔ اس کے بعد صاحبزادے جیسے جیسے بڑے ہوتے ہیں اپنے باپ کو نجات کی جانب لے جاتے ہیں۔

باپ عموماً شیر ہوتا ہے اور بیٹا چوہا مگر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ موقع پا کر بیٹا شیر ہو جاتا ہے اور باپ چوہا۔ ویسے اسی بات کو دھیان میں رکھ کر بزرگوں نے لکھا ہے کہ سولہ برس کی عمر کے بعد بیٹے کو دوست سمجھنا چاہیے۔ میں اس بات کو مان نہیں سکا۔ بیسویں صدی میں مجھے کہنا پڑا کہ سولہ برس کی عمر کے بعد بیٹے کو باپ جیسا سمجھو وہ جو کہے کرو، اس کی حکم عدولی نہ کرو، ورنہ پانی کی چند بوندوں کو ترس جاؤ گے۔

کامیاب باپ وہ ہے جو جوانی اور بڑھاپا بیٹے کی خدمت میں گزار دے۔ نصف کامیاب باپ وہ ہوتے ہیں جو بیٹے کی خدمت سے بڑھاپے میں نجات پا لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ سبھی باپ ناکام ہوتے ہیں۔ جوانی میں باپ بیٹے کے لیے شیر ہوتا ہے اور بڑھاپے میں دروازے کا کتا۔

باپ کی اونچی ناک کو کٹوانے میں اکثر بیٹا بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ موقع ہاتھ لگ جائے تو بیٹی بھی پیچھے نہیں رہتی۔ ناک کی آر صاف ہو جانے سے باپ کو جو کچھ صاف نظر آتا ہے وہ اُسے خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ شریف اور لائق لڑکے اور لڑکیاں باپ کی مونچھیں جھکاتے یا جھکواتے دیکھے گئے ہیں، ناک کٹواتے نہیں۔ پتہ نہیں کیسے یہ چند جاہل اور گنوار پیدا ہو جاتے ہیں جو نہ باپ کی ناک کٹاتے ہیں اور نہ مونچھیں جھکاتے ہیں۔ لعنت ہے ان کم بختوں پر جو باپ کے ساتھ کوئی "نیکی" نہیں کر پاتے۔

دنیا کے وجود میں آنے سے آج تک یہ نہ دیکھا گیا ہے اور نہ سنا گیا ہو کہ کوئی باپ بن کر چین سے پایا ہو پھر بھی لوگ باپ بننے کے لیے تڑپتے ہیں۔ باپ بننے کے بعد جوانی اکیلی اور کہیں بدل کر گزرتی ہے اور بڑھاپا صدر دروازہ کے باہر گزرتا ہے۔ بیوی نے چاہا تو ردی کا ٹکڑا ڈال دیا۔

باپ کے سب سے بڑے بُرے اعمال کا پھل اسے اس وقت ملتا ہے جب وہ خسر بنتا ہے۔ اگر بیٹے ہوئے تو بہوؤں کا اور بیٹی ہو تو داماد کا۔ ویسے بہو تو صرف کتیا بن کر بھونکا کرتی ہے مگر داماد جونک بن جاتے ہیں۔ بہو صرف بھیجہ کھا کر مزہ لیتی ہے مگر داماد خون چوس کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہنسی اس وقت آتی ہے جب باپ یعنی خسر کسی طرح سے خودکشی کرنے کی سعی نہیں کرتے۔ بے شرمی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

بوڑھا باپ سدا گلے ہوئے ناخنوں اور ٹوٹے دانتوں والا ہوتا ہے۔ بیٹا جب تک جوان پٹھا ہو جاتا ہے۔ کس بوڑھے پہلوان کی مجال ہو کہ اپنے پٹھے سے بھڑ جائے۔ داؤ پیچ کرنے کے بعد بھی سبکی ہو جاتی ہے۔ ہوشیار باپ بڑھاپے میں بیٹے کی "جی حضوری" قبول کر لیتے ہیں۔ کچھ باپ اپنا سابقہ رعب جھاڑتے ہیں تو فٹ پاتھ پر نظر آتے ہیں۔ اگر ان کی نوکری پنشن والی نہ ہو تو بھیک کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

باپ بننے کا گناہ ہر ایک کو کرنا پڑتا ہے۔ کچھ اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اور کچھ بزرگوں کو کچھ سماج کے ڈر سے اور کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی باپ بن جاتے ہیں۔ جیسے بھی بن جائیں مجبوری میں نبھانا سب کو پڑتا ہے۔ جس باپ کی رگوں میں خون زیادہ ہوتا ہے اُسے "قابلِ تعظیم والد صاحب" کہا جاتا ہے۔ جس باپ میں عام اوسط خون ہوتا ہے اُسے "محترم والد صاحب" کہا جاتا ہے اور جس میں خون نہیں اُسے بس "باپ" کہہ دیا جاتا ہے وہ بھی بہ وقت ضرورت یا کسی فارم کی تکمیل پر۔ باپ کی یاد اسی وقت آتی ہے جب کبھی لکھنا یا بتانا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ یاد کرنے کے لائق جاندار نہیں۔

باپ بننے کے بعد انسان میں ایک مخصوص صفت آجاتی ہے۔ یہ صفت دل پر پتھر رکھنے کا آرٹ ہے یہ صفت از خود آجاتی ہے۔ جب باپ بننے سے قبل کسی کو کسی معاملہ میں دل پر جبر کرنا پڑتا ہے تو وہ صرف خوب اچھلتا، غصیلے بچھڑے کی طرح پکاتا ہے۔ اداسی لیے گھومنے لگتا ہے۔ باپ بننے کے بعد اولادوں کے لیے دل پر پتھر رکھنا بہ خوشی قبول کر لیتا ہے۔ یعنی تمام آرام و آسائش کو خیرباد کہہ کر اولاد کے لیے ہی سب کچھ کر گزرتا ہے۔

کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ اولاد باپ کا نام اونچا کرتی ہے۔ جو آدمی زندگی میں کچھ نہیں کر پاتا وہ اولاد کے سہارے نام اونچا کرنے کا خواب دیکھنے لگتا ہے۔ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ باپ کے اونچے نام کا فائدہ اولاد اٹھا لیتی ہے مگر اولاد کے اوچھے پن کا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ باپ کی جگہ نام چھپ جاتا ہے جسے شاید ہی کوئی پڑھتا ہو یا یاد رکھتا ہو۔ میں نے تو معلوماتِ عامہ کے ممتحنوں کو بھی باپ کا نام پوچھتے نہیں دیکھا ہے۔

کبھی کبھی لوگ باپ کے لیے روتے بھی دیکھے گئے ہیں۔ اصلی آنسو تو ان کے ہوتے ہیں جن کو فارغ البال گزر بسر کے لیے باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی لوگ سماج کی رسم ادا کرتے ہیں۔ باہر تو نقلی آنسو لڑھک جاتے ہیں مگر اندرونی غم اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کسی پالتو جانور کے مرنے، اس کے بعد دسواں اور تیرھواں کرتے ہیں۔ شرادھ کرتے ہیں اور برہمنوں کو بھوجن کرایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ سماج میں ان کی ساکھ بنی رہے اور لوگ تعریف کریں۔

شادی بیاہ میں بھی باپ کو ٹھونیا یا جاتا ہے۔ ماں کے لیے قیمتی لباس اور باپ کے لیے نیم کی مسواک بھی نہیں۔ دولہے کو کافی کچھ ملتا ہے جو بچتا ہے وہ لڑکے کی ماں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ باپ کو صرف احترام ملتا ہے۔ ایک دانش مند نے بتایا تھا کہ ماں یعنی سمدھن کے لیے یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اصلی ہوتی ہے۔ باپ کا اصلی ہونا شک سے خالی نہیں ہے لہٰذا اس کے لئے کچھ بھیجنا مناسب نہیں۔

سچ پوچھیئے تو تمام جانداروں کی دنیا میں سب سے گیا گزرا جاندار باپ ہی ہوتا ہے۔ بہت سے نوجوان اپنے باپ سے اس طرح کہتے سنے گئے ہیں ـــــ "اگر آپ ہماری خواہشات کی تکمیل نہیں کر سکتے تو پیدا ہی کیوں کیا تھا" بے چارہ باپ سوائے خاموش سننے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ اپنی بے وقوفی پر پچھتانے کے لیے بھی اس میں قوت ارادی نہیں ہوتی آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد اور ان کی ماں ایک طرف اور باپ تنہا دوسری طرف۔ اس حالت میں باپ "میسا" کا قیدی بنا آنسو بہایا کرتا ہے کیونکہ نہ اس کے پاس وکیل ہوتا ہے نہ اپیل ہوتی ہے اور نہ کوئی دلیل ہی ہوتی ہے۔

بہت سی اولادیں دیش کے لیے کارآمد بھی ثابت ہوتی ہیں۔ جہاں دیش کے لیے جان دے دیتے ہیں وہیں دیش کی جمہوریت کو بھی بچا لیتے ہیں۔ پرانی کہاوت ہے کہ باپ اولاد سے ہی ہارتے ہیں۔ بڑے بڑے تیس مار خاں اولاد کے آگے

جھکنے اور دبتے دیکھے گئے ہیں۔ منّتوں مرادوں کے آگے باپ سدا گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

یہ میں جانتا ہوں کہ سچائی سے واقف ہونے کے بعد بھی آپ باپ بننے کی تمنّا دل سے نہیں نکالیں گے خواہ ہمارے دیش کی آبادی چین کو بھی مات دینے لگے۔ یہ سچ ہے کہ ہم باپ بننے میں جتنے کامیاب ہیں کسی اور کام میں نہیں۔

میری رائے ہے کہ باپ بن کر اولاد پیدا کرنے کی بجائے کچھ اور کارآمد چیزیں تیار کی جائیں تو انسان زیادہ خوش حال بن سکے گا۔ آدمی ہی نہیں اس کی قوم بھی۔

اسمٰعیل سعیدی آذرؔ

کابلی والا

اک موٹا ولا مچھی والا مرد سیاہ فام
نام اس کا پھکٹ سنگھ ولد جھاڑ جھنک رام
ٹھگتا ہے روپے کے نچا پنج برس سے
واپس ہی کیا ہے نہ بگڑتا ہے کبھی نام

اُلّو کا پٹّھا کب تلک آئے گا نہ گھر میں
ہم خان کی اولاد ہے بیٹھے گا اور میں

تنخواہ کے ملتے ہی روپی دینے کو بولا
وہ سود اصل ہمرا سبھی دینے کو بولا
ہر بار ملا جب بھی وہ خنزیر کا بچہ
اس قرض کے جھنجھٹ سے چھٹّی دینے کو بولا

اس پہلا کو آجاؤں گا ہم آپ کا گھر میں
ہم خان کی اولاد ہے بیٹھے گا اور میں

ہم پہلا ہی سمجھایا کہ مرجائے گا دیکھو
تم اتنا روپی لے کے کدھر جائے گا دیکھو
لینے کا گھڑی آپ تو شرمائے گا کمّی
دینے کا وخت جاستی ڈر جائے گا دیکھو

بچنے کی کوئی راہ نہ پھر ہو گی نہ نظر میں
ہم خان کی اولاد ہے بیٹھے گا اور میں

جب گھر میں گیا ہم تو وہ آفس میں گیا ہے
آفس میں مگر روز کا چھٹّی بھی لیا ہے
گھر میں کبھی چھپتا تو کبھی راہوں میں بچتا
وہ کون سا موقع ہے کہ بازی نہ کیا ہے

سو بار دغا ہم کو دیا شام و سحر میں
ہم خان کا اولاد ہے بیٹھے گا اور میں

اک اور نئی چال اِدھر کو ہے نکالا
باہر کا کواڑی میں لگاتا ہے وہ تالا
اندر اگر آتا ہے تو اک چور کا مافک
پچھواڑے کی دیوار سے آتا ہے وہ سالا

اس جیسا بے ایمان نہ دیکھا ہے نگر میں
ہم خان کی اولاد ہے بیٹھے گا اور میں

دیکھے گا یہ دروازہ کبھی تک کھلے گا
کب تک یہ پھکٹ سنگھ کا بچہ نہ ملے گا
دو روز میں تین روز میں آئے گا کبھی بھی
گردن سے پکڑ کر اسے تھانہ کو چلے گا

اک بال نہ بچ پائے گا خنزیر کے سر میں
ہم خان کی اولاد ہے بیٹھے گا اور میں

●●

بال کی کھال

تبصرے

میڈم! آپ کہاں سے شروع ہوتی ہیں؟

یہ استفسار اس وقت ہوا، جبکہ کالے رنگ کی ایک عورت، کالے کپڑے پہنے، کالے ہی رنگ کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

خیر وہ سفید کپڑے پہنے ہوتیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا تعین نا ممکن ہی نہیں، حدِ ادب سے بھی پرے ہے۔

لیکن نعیم زبیری کے افسانے، بیچ سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ عمل کہانی کو کہانی بنا دیتا ہے اور رچاؤ بھی اور اسے قصہ یا داستان گوئی سے ممیز کرتا ہے۔ ورنہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماری اکثر کہانیاں "ایک دفعہ کا ذکر ہے" کا جملہ استعمال نہ کرتے ہوئے بھی، انداز یہی اختیار کیے ہوتی ہیں۔ کہانی کی تعریف اب اس حد تک کھل گئی ہے کہ صحافتی روداد قتل کی رپورٹ سے لے کر [illegible] [illegible] کی پیچیدگی تک ہر چیز کہانی ہے۔ اگر اس کثیر الآباد دنیا میں سب چہرے ایک ہی سے نظر آئیں تو اس میں قصور کس کا ہے؟

دوسری خصوصیت جو نعیم زبیری کی کہانیوں کو پڑھ کر واضح اور منوالیتی ہے وہ ہے کہانی کی پیشکش اور اس کے کرداروں کا عجیب الخلقت ہونا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ 'ڈھلانے شدہ' یا 'گمشدہ احساس کا بچہ'، غیر خاکی ہیں اور کسی مبہم طشتری میں بیٹھ کر اس دنیا میں آئے ہیں۔ وہ یہیں کے ہیں اور یہی بات ہماری حیرانی میں اضافہ کرتی ہے کہ موجودہ 'نظام' میں ایسی ہی بدنظمی ہے۔ ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جن کا پیرا ہوا، جن کی بود و باش نہ صرف ہماری دینی بلکہ معاشی زندگی کا بھی منہ چڑاتی ہے۔ یہ 'ڈھیلے کیوں لانچیکی' کس دنیا کی پیداوار ہیں؟ کیا وہ ہمارے اسی اندھیرے کا حصہ ہیں، جس میں فہم کی روشنی بھی اجالا کر سکے گی؟ یا ہم نے صرف کافکا کی مایوسی کا تتبع کیا ہے؟ میرے نزدیک حیرانی کی حقیقت یہ نہیں کہ ابھی دنیا میں لوگ بستے ہیں، رہتے چلاتے ہیں بلکہ یہ کہ ان سب پیچیدگیوں کا شکار رہتے ہوئے بھی وہ بیچ میں ہنس دیتے ہیں۔ ایسی زندگی یہ ہنسا دینے سے بڑی حقیقت ہے کیونکہ ایمادی پٹا ئیں کیسیوں کے بارے میں بڑی حقیقت ہی بکتے ہیں۔ سب سے بڑی دہشت یہ ہے، کہ کوئی دہشت ہی نہیں۔

گونگے دریچے

نعیم زبیری

کے

افسانوں کا مجموعہ

صفحات ۱۳۲ ٹائٹل، سعادت علی خاں

قیمت دس روپے

مقدمہ، راجندر سنگھ بیدی

فرشتہ ڈائی مینشن کو چھوڑ کر نسیم زبیری کی سب کہانیاں اسی قبیل کی ہیں۔ فرشتہ ڈائی مینشن، عرف عام کی کہانی کی طرح سے کھلتی اور بند ہوتی ہے۔ اگرچہ کہانی کے آخر میں پتہ چل جاتا ہے کہ بچو کا مرنے کے باوجود وہ کتاب پھر خریدے گا۔ انسان کی علم کی جستجو کو بچو کے پیٹ پہ فوقیت دے گا۔ شرط استواری نبھائے گا۔۔۔۔۔۔۔ اس کے باوجود کہانی میں بڑا مزا آتا ہے۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ انسان کہانی کا انجام چونک کر جاننا چاہتا ہے اور کبھی اسے یہ جان کر بھی خوشی ہوتی ہے کہ آخر میں اتنا بے وقوف نہیں، جتنا کہ نظر آتا ہوں۔

'بدمعاش' کا اسرار بھی الگ ہونے کے باوجود ایک پیاری چیز ہے وہ ہر بات پر 'بچے' کو سلٹ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کلکتے میں طفرڈ سے عشق کیا تھا اور اس بات کا یقین نہ ہونے پہ بھی کہ طفرڈ کے پیٹ میں بچہ اس کا ہے وہ اس کی ماں کے پاس روپے ماہانہ تقاضے کے عوض پچیس روپے ماہانہ بھیجنا شروع کرتا ہے۔ اب وہ سیٹھ رسی والا کی لڑکی سے عشق صرف اس لیے کرتا ہے کہ خود کرتا ہے۔ جب سیٹھ کا دیوالہ پٹ جاتا ہے تو وہ لڑکی کے محبت ناموں کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہے ۔۔۔۔۔ اور ایک دن دھماچوکڑی مچاتا پھر 'بچے' کو سلٹ کرنے چلا آتا ہے۔ ایرانی رستوران میں دیوالیہ سیٹھ کی لڑکی بیٹھی ہے جو اسرار کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اسرار اسی سے شادی کرنے کی ذمہ داری لے لیتا ہے اور یوں اجالے اندھیروں پر فتح پا لیتے ہیں۔

نسیم زبیری کم لکھتے ہیں۔ اس کی وجہ ان سے پوچھنے کی بجائے میں خود اپنے آپ سے کیوں نہ پوچھوں کہ میں کیوں نہ لکھنے کے برابر لکھتا ہوں؟ یہ تو بار زندہ صحبت باقی کا مضمون ہے۔ اسی خیال ہی میں نسیم صاحب مجھ سے ملنے آئے تو ان سے مل کر مجھے یوں لگا" وہ عنقریب 'ماں' بننے اور الٹی تکون کی دھجیاں اڑانے والے ہیں۔

(از: راجندر سنگھ بیدی)

شب گرد

(کنزا نظموں کا مجموعہ)

مترجم:- حمید الماس

تبصرہ نگار:
رؤف قریشی

حمید الماس اُردو کے جدید طرزِ فکر کے شعراء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ 'شب گرد' ان کی اپنی شاعری نہیں۔ کنڑا نظموں کے اُردو ترجمہ پر مبنی انتخاب ہے ترجمہ کا فن بڑی ریاضت اور چابکدستی کا فن ہے۔ ایک طرف جہاں مترجم کا خود اس زبان پر عبور لازمی ہے جس میں کہ وہ ادبیہ پاروں کو منتقل کر رہا ہو، وہیں دوسری طرف اسی زبان کو بھی کم از کم اعلیٰ سطح پہ جاننا نہایت ضروری ہے جس کو اس نے ترجمہ کے لئے منتخب کیا ہو۔ دونوں باتوں سے ہٹ کر ہر زبان

کی اپنی کچھ (PECULIARITIES) ہوتی ہیں اور کوئی ضروری نہیں کہ من وعن ہر زبان کے نعم البدل الفاظ یا محاورے دوسری زبان میں مل جائیں۔ یوں بھی نثر کے مسائل اور ہیں، شاعری کے اور۔ بہر حال زیر نظر مجموعہ کو پڑھنے کے بعد ایک تعجب خیز اور تحسین آمیز خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ حمید الماس علاقہ کرناٹک سے تعلق رکھتے ہیں اور کنڑا زبان سے خوب واقف ہیں۔ ان کی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں نے ترجمہ کو مکھی پہ مکھی مارنے کی بدعت سے اٹھا کر تخلیق کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں "کنڑا شاعری کا مختصر جائزہ" کے عنوان سے حمید الماس نے کنڑا شاعری کی مختصر لیکن بھرپور انداز میں تاریخ بیان کی ہے جس سے اس زبان کی شاعری کے عہد بہ عہد بدلتے ہوئے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ حمید الماس نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ کنڑا شاعری کا مزاج اردو شاعری سے بالکل نہیں ملتا۔ اس کی اپنی مخصوص کیفیات ہیں، اس کی اپنی تشبیہات ہیں۔ اس کی اپنی تلمیحات اور روایات ہیں۔ کنڑا نظموں کی ساخت کا انداز بھی جداگانہ ہے جس کی وجہ ان نظموں کے ترجمہ میں انھیں کئی دقتیں پیش آئیں۔ ان دقتوں کے باوجود زیر نظر ترجموں کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مشکل منصب سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوئے ہیں بلکہ نظموں کو بالکلیہ اردو شاعری کی تہذیب میں ڈھال دیا ہے۔

بیشتر ترجمے اردو کی مروجہ بحور و اوزان میں کئے گئے ہیں اور اکثر ترجمے نثری نظموں پر مشتمل ہیں۔ ایک نظم کا مصرعہ ہے "تمہاری چشم کہ کیری کی پھانک ہو جیسے" کیری بمعنی کچا آم اور پھانک بمعنی قاش، دکنی ہندوستان میں مستعمل ہیں۔ اگر ان الفاظ کی جگہ ہندوستان گیر سطح پر سمجھے جانے والے الفاظ لائے جاتے تو بہتر تھا۔ مثلاً یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا۔ "تمہاری آنکھ کہ ہے جیسے کچے آم کی قاش" ایک جگہ "خواہشیں" کو خواہیشیں" اور "یُرْہنہ" کو بُرْہنہ" ر کو بالجزم باندھا گیا ہے۔ یہ غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ اس سے قطع نظر ترجمہ کی زبان نہایت شستہ رواں اور تفہیم کے مافی الضمیر کو ابلاغ کا حسن بخشتی ہیں۔ "شب گرد" ترجموں کے باب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اور گٹ اپ اوسط ہے۔ قیمت دس روپیہ زیادہ نہیں۔ (رؤف خلش) ★★

زنجیر و زنار (مجموعۂ کلام)

تیس سال بعد (۴۸ - ۱۹۷۸ء) وطن سے دکن پہونچا تو جن نئے احباب نے خلوص سے مجھے اپنے گھیرے میں لیا ان میں شمس الدین تاباںؔ بھی تھے۔ سنجیدہ، شائستہ، پرانی دکنی تہذیب کے نئے علمبردار شاعر خوش فکر اور صفیؔ اور تنگ تمادی جیسے استاد کے شاگرد تاباںؔ نے مجھے اپنے کلام کا مجموعہ دیا کہ اس پہ اظہار رائے کروں۔ کچھ تو ان دنوں کی علالت، بہت کچھ حیدرآباد میں صبح سے رات دیر گئے تک کی بے پناہ اور کبھی بے وجہ مصروفیت میں حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ کراچی لوٹا تو سب سے پہلے تعمیل ارشاد میں یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

فیض احمد فیضؔ کا خیال ہے کہ "شعر کہنا جرم نہ سہی لیکن بے وجہ شعر لکھتے رہنا ایسی دانشمندی بھی نہیں" جہاں تک اور جس طرح میں نے تاباںؔ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے میرا خیال ہے کہ وہ شعر نہ کہتے تو جرم کے مرتکب ہوتے، ان کی دانشمندی یہ ہے کہ انھوں نے بے وجہ شعر نہیں کہے یا بہت کم کہے ہیں۔ صفیؔ کے شاگرد ہیں ان کا رنگ اپنایا۔ اپنا رنگ الگ جمایا۔ کچھ زمانے نے انھیں سمجھایا کچھ انھوں نے زمانے کو سمجھایا ــــــ میں ان لوگوں میں ہوں جو قلم کی ہر کاوش کو قرطاس پر دیکھنا اور اس کا

محفوظ ہوجانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ اقلیت میں ہیں اور بڑی اکثریت، معیار پر جان دیتی ہے۔ میرا یہ کہنا ہے کہ مستقبل اس معیار کی سب سے بڑی چھلنی ہے جس کے ذریعہ معیاری اور غیر معیاری کی چھان پھٹک ہوجاتی ہے۔ "معیاری" کے خبط یا غیر معیاری کے خوف سے نہ جانے کتنی گراں قدر تحریریں برباد ہوگئیں۔

مجھے خوشی ہے کہ تاباںؔ کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا ہے آئندہ زمانہ خود طے کرے گا کہ انھوں نے اپنا اور اپنے اُستاد کا نام کس حد تک روشن کیا جہاں تک حال کا تعلق ہے، میری طرح بہتوں نے ان کا کلام پسند کیا ہے۔

—— مرزا ظفر الحسن (کراچی)

ادارہ 'شگوفہ' کے توسط سے

حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعۂ کلام	۳/۵۰
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
مزاح شریف	رشید قریشی	"	۳/۵۰
چھیڑ چھاڑ	پرویز یداللہ مہدی	"	۶/-
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/-
مکرر ارشاد	برق آشیانوی	مجموعۂ کلام	۴/-
فقط	یوسف ناظم	مضامین	۶/-
در پردہ	مسیح انجم	"	۶/-
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-
چوڈی کے غلام	"	مضامین	۷/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	مضامین	۸/-
سخن زار	خواجہ عبدالغفور	مضامین	۸/-

خرافات

(مراسلے)

آداب! امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ مئی کا شمارہ موصول ہوا۔ شگوفہ کا معیار بڑھتا ہی جا رہا ہے خدا کرے یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہے۔ تازہ شمارے میں "بیگم کی شاعری" اور خیال انصاری کا چند حسینوں کو خطوط پسند آئے۔

انصاری اصغر جمیل ناگپور

محترم مصطفیٰ کمال بھائی سلام و نیاز
شگوفہ کا تازہ شمارہ ملا۔ کرنل صاحب کا سلسلہ تو بڑا زبردست ہے۔ خوب لکھتے ہیں وہ۔ ہاں شفیقہ فرحت صاحبہ تو کمال کرتی ہیں۔ انشائیہ لکھنے میں وہ ماہر ہیں۔ بہت ہی شگفتہ لکھتی ہیں آلو کا ذکر کس خوبی سے انھوں نے کیا ہے۔ میری طرف سے انھیں مبارکباد پہنچا دیں۔ ایک انشائیہ "اقبال اور میں" ارسال خدمت ہے۔ امید ہے شگوفہ کے لیے پسند فرمائیں گے۔

تمنا مظفر پوری گیا۔

ڈرامہ نمبر نظر سے گزرا۔ اس صنف پر اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی دستاویز ہے اس قدر خوبصورت ڈرامے انتخاب کرنے پر ساگر سرحدی اور ادارہ شگوفہ کو مبارکباد یقین ہے کہ ایسے خصوصی نمبر چھپتے رہیں گے۔ رو نیہ دوست، بمبئی

• مدیر گرامی۔ آداب عرض ہے۔

آپ کیا خوب پرچہ نکالتے ہیں۔ ہر ماہ آپ کے پرچے کو دیکھ کر آپ کے عزم اور حوصلے کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شگوفہ کا ڈرامہ نمبر بھی دیکھا۔ شگوفہ کی یہ خصوصی اشاعت اتنی ضخیم اور پُر مغز ہے کہ بلاشبہ اس کی دستاویزی اہمیت مسلّم ادب میں مسلم ہے۔ شگوفہ میں جہاں آپ پاکستانی مزاح نگاروں کے معیاری مضامین شامل کر کے آپ مزاح کے چاہنے والوں کی تشنگی بجھاتے ہیں وہیں میری گزارش ہے کہ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے بھی آپ مزاح کے تراجم شائع فرمائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو ہمارے قدیم کلاسیکل مزاح یا اردو کے بھی کچھ نمونے اودھ پنچ وغیرہ سے بھی شامل کریں۔

عبید اللہ انصاری۔ بمبئی

• ماشاء اللہ آپ کیا خوب صورت رسالہ نکالتے ہیں۔ اردو میں شگوفہ ایک مزاحیہ رسالے کی حیثیت سے آپ اپنا جواب ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ایسے رسالے کم ہوں گے۔ جو ہر ماہ صرف اور صرف مزاحیہ نثر اور شاعری کی اشاعت کا اہتمام کرتے ہوں۔ علاوہ ازیں آپ کے رسالے کا گٹ اپ بھی آپ کے ذوق اور محنت کی غمازی کرتا ہے۔

احقر پونوی۔ پونے

کارآمد تحفہ

ایک خاتون دکان میں داخل ہوئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دوکاندار کے پوچھنے پر کہنے لگی کہ اُسے اپنے شوہر کو دینے کے لئے کوئی اچھا سا تحفہ چاہیئے۔ دوکاندار نے خوبصورت شوخ ٹائیاں دکھائیں تو اس نے کہا کہ نہیں وہ اس عمر سے گذر چکے ہیں۔ دوکاندار نے عمدہ سینٹ پیش کیا تو اس پر بھی خاتون نے یہی بات کہی۔ پھر دوکاندار نے کتابوں کا سیٹ خریدنے کا مشورہ دیا۔ تب بھی خاتون نے یہی بات دہرائی۔ دوکاندار نے ایک کونے سے چھڑی نکالی اور خاتون کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، غالباً ان کی عمر چھڑی پکڑ کر چلنے کی ہے لیجئے یہ بہت نفیس چھڑی ہے
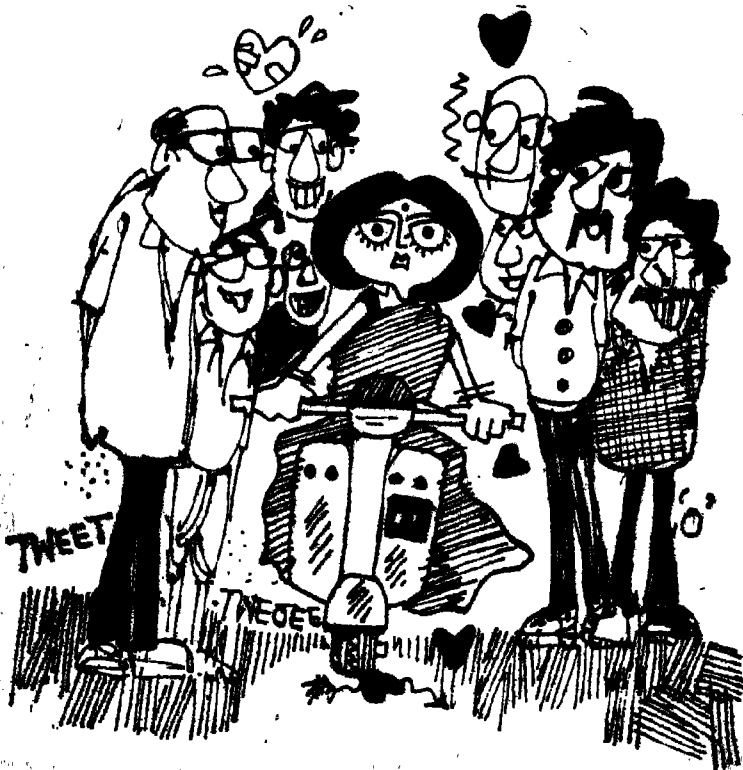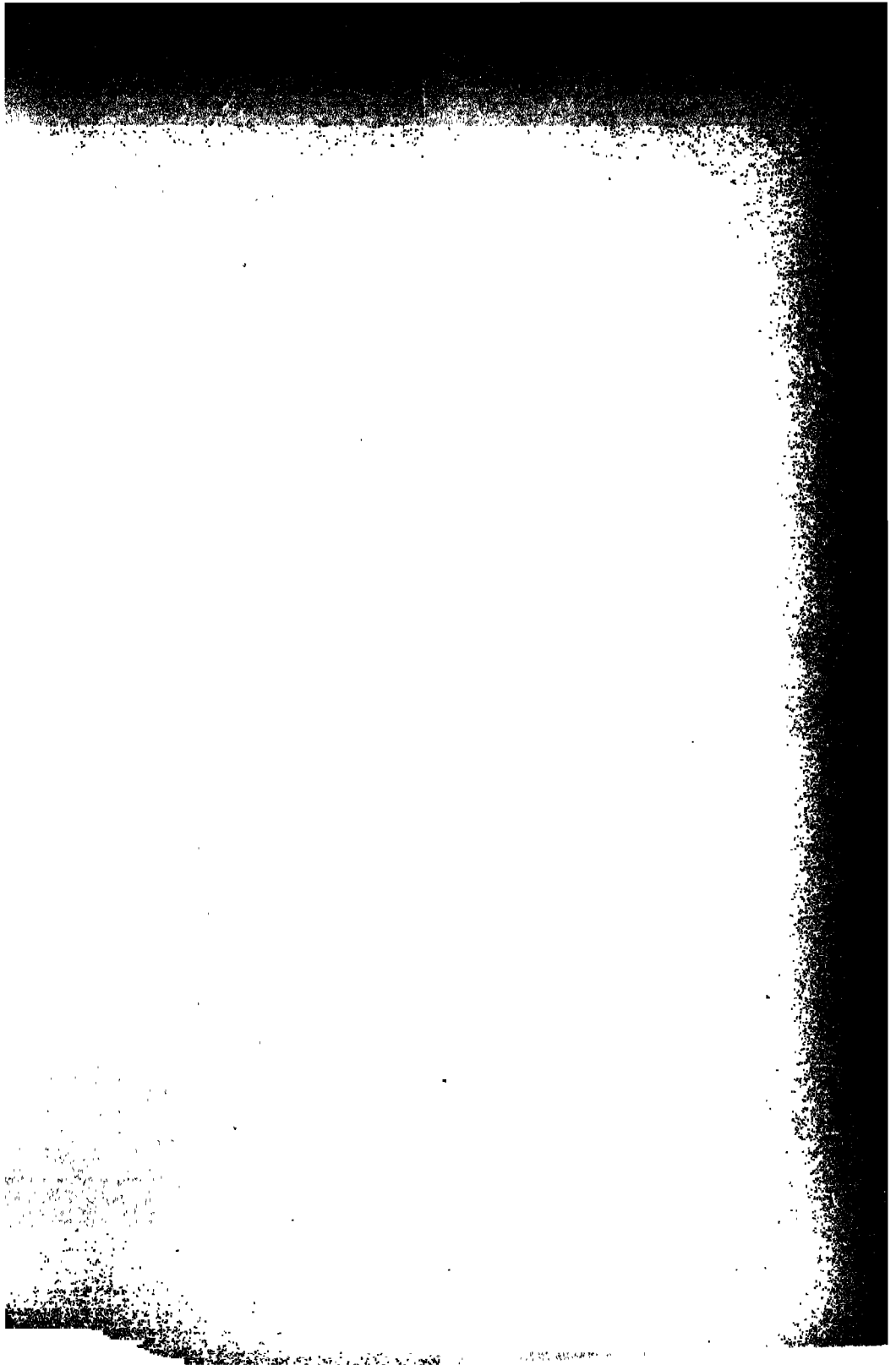
شگوفہ

"LIFT PLEASE"

ماہنامہ

جلد ۱۲ شمارہ ۷ جولائی ۱۹۷۹ء

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر : سید مصطفیٰ کمال
مجلس ادارت : حمایت اللہ، مسیح انجم

مجلس مشاورت

راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

سالانہ ۲۲ روپے
بیرون ہند سے ۳۵ شلنگ
فی پرچہ ۲ روپے

جنرل منیجر : سمیع جلیل
منیجر : مظہر الزماں خاں

طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار برائے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲
بائنڈنگ: محمودیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ
کراچی بیکری
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
ڈسٹری بیوٹرس برائے :
۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ انڈین ییسٹ کمپنی لمیٹڈ
۳۔ ہمدرد، روح افزا
۴۔ پانی پت فوڈ پراڈاکٹس
۵۔ ڈبرو فوڈ پراڈاکٹس
۶۔ کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۷۔ سونا فوڈ پراڈاکٹس
۸۔ ہارکو، سری نگر
۹۔ ڈرک بھٹان فوڈ پراڈکٹس
۱۰۔ میڈونا کیننگ کمپنی وغیرہ

PURANDAS RANCHHODDAS & SONS
INDIA
کشمیری قوام
KASHMIRI QUIVAM

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

مالِ مُفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

بال کی کھال

چوُرن (نظمیں)

جشنِ ظرافت

رضا نقوی واہی

کچھ ماہیٔ فردوشانِ سخن کو ہے شکایت
پٹنہ میں بپا ہوتا ہے کیوں جشنِ ظرافت
چھوڑا تھا شگوفہ جو کبھی اہلِ دکن نے
قائم ہوئی اس شہر میں بھی کیوں وہ روایت
اس جشن نے پبلک کا مذاق ایسا بگاڑا
بننے لگی اب عام نشستوں کی حجامت
قوالوں کا تھا بزمِ سخن پر جو اجارہ
ہوتی تھی جہاں لحن و ترنم کی تجارت
اندھیر ہے اندھیر کہ بس چشم زدن میں
طوفانِ تبسم نے گرادی وہ عمارت
پڑھتے تھے مُچرائی ہوئی غزلیں جو مُغنّی
ان کی بھی گلے بازی ہے اب بار سماعت
پبلک انھیں سُننے کو روادار نہیں ہے
ہوٹنگ سے بن جاتی ہے بیچاروں کی دُرگت
پٹ جاتے ہیں بقراط سے بقراط "غزل گا"
اس درجہ گھٹی بزم میں سُرتال کی قیمت
کوئی بھی ہو تقریبِ سخن، رہتی ہے بے کیف
جب تک کہ نہ ہو چاشنیٔ طنز و ظرافت

اک مولوی صاحب نے یہ فتویٰ کیا صادر
حقا کہ شریعت کی نظر میں ہے یہ بدعت
یہ لہو و لعب، صورِ سرافیل ہے، لوگو
آثارِ قیامت ہیں یہ آثارِ قیامت
مولانا تھے اس درجہ غضب ناک کہ اک دن
کر بیٹھے خود اپنا ہی بپا "جشنِ حماقت"

کچھ لوگ کہ ہیں پیشۂ ہوٹنگ میں ماہر
ان کو بھی ہوئی طنز و تبسم سے شکایت
گلتی نہیں دال انجمن زندہ دلاں میں
کر دیتے ہیں خود ہُوٹ انھیں اہلِ ظرافت

کچھ لوگ ادب میں جو سیاست کے ہیں قائل
ان کو بھی شکایت ہے کہ یہ جشن، یہ جدت
ہے چین کی یا کانگریس آئی کی کوئی چال
حاصل ہے جنھیں ارسؔ کی در پردہ حمایت
القصہ ہر اک کور نظر اپنی جگہ پر
دُہرانے میں مصروف ہے "ہاتھی کی حکایت"

اربابِ تعرّض سے ہے واہیؔ کی گذارش
بھاگیں نہ حقیقت سے شُترمرغ کی صورت
دونوں میں بہر حال ہے تفریح کا پہلو
غزلوں کی وہ محفل ہو کہ ہو بزمِ ظرافت
حاصل ہو مگر دل کو جہاں لطف زیادہ
ہوگی صفِ جمہور میں مقبول وہ صحبت
جمہور کی آواز ہے نقّارہ خُدا کا
کس نے نہ سنی ہوگی یہ مشہور کہاوت
جب طنز و تبسم ہے پسندیدۂ جمہور
پھر کیوں نہ بپا شہر میں ہو جشنِ ظرافت
اس طرح کی تعریض کے پردے میں نہاں ہے
"چُھٹ بھیئوں" کا بُغض و حسد و رشک و رقابت

یوسف ناظم

ایک پردیسی کا سفرنامہ ہندوستان

(سفر نمبر ۲)

اتفاق دیکھئے کہ ہمیں پھر ہندوستان آنا پڑا اور اچانک۔ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ہمیں اس قدر جلد یہاں دوبارہ آنے کا موقعہ مل جائے گا۔ پچھلی مرتبہ جب ہندوستان آئے تھے تو زیادہ گھوم پھر نہیں سکے تھے۔ اس ملک کی سیاحت کے لئے تو ایک عمر چاہیے۔ یہ ملک کہاں ہے' اچھا خاصہ براعظم ہے۔ ہماری جغرافیہ کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے اس لیے ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ دنیا کو صرف ۶ براعظموں میں تقسیم کرنے کا پلان کب بنا تھا اور کس نے بنایا تھا۔ اس نقشے کا تصور کوئی شخص واحد تھا یا یہ معاملہ کسی سہ رکنی کمیشن نے طے کیا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو۔ اس شخص یا کمیشن نے ایسا معلوم ہوتا ہے تفریح زیادہ کی اور کام کم کیا۔ (یہ سلسلہ ازل سے چلا آرہا ہے) اگر یہ کام زیادہ توجہ سے انجام پاتا تو ہندوستان کو براعظم قرار دیا جاتا ——— خیر اب یہ بہت پرانی بات ہوگئی اور اس قسم کی بنیادی غلطیاں تو ہر معاملے میں ہوتی ہیں۔ ان سب غلطیوں کو ٹھیک کرنا اب ممکن نہیں ہے۔

ہمارے ہندوستان دوبارہ آنے کا مقصد وہی تجارت ہے جسے یہاں اسمگلنگ کہا جاتا ہے۔ یہاں تو اچھے خاصے روپیے کو بھی کالا روپیہ کہا جاتا ہے حالانکہ اس روپے کے علاوہ اب دوسرا روپیہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ سُنا ہے یہاں اور چیزوں کی قیمتوں کی طرح وائٹ روپے کے بھی دام کافی اونچے ہیں۔ بہت سے دولت مند لوگ تو اپنا کاروبار صرف اس لیے نہیں پھیلا سکتے کہ وائٹ روپے کے معاملے میں ان کا ہاتھ تنگ ہے۔ ایک اور محاورہ یہاں سننے میں آیا جو تقریباً ہر شخص کی زبان پر ہے۔ وہ محاورہ ہے۔ انڈر ٹیبل روپیہ ——— انڈر ٹیبل روپیہ کے بارے میں گفتگو میز پر ہی ہوتی ہے لیکن روپیہ میز پر نہیں رکھا جا سکتا ——— ہمیں بتایا گیا کہ یہاں اب بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو اس تہہ میزی روپئے کو بے میز کہتے ہیں لیکن انھیں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

اس مرتبہ ہندوستان میں ہمیں اجنبی پن محسوس نہیں ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہاں کی زبان۔

بولنی آگئی۔ ہم نے اپنے دوستوں سے پرشین گلف میں خوب خوب اُردو سیکھی اور اب ہمارا اس زبان میں شاعری کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ یہاں کا عام دستور ہے کہ زبان کوئی سی ہو ذرا سی بھی آجائے تو اس میں شاعری ضرور کرنی چاہیئے۔ خاص طور پر اُردو اور ہندی میں یہ سب ضروری ہے۔ اردو شاعری کے بارے میں البتہ ہمارے دوست ہمیں بتا رہے تھے، صرف شاعری سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا ترنم بھی سیکھنا چاہیے۔ وہ بھی سیکھ لیں گے۔ ہمیں فرصت ہی فرصت ہے۔ کہتے ہیں ترنم شاعری سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ اس میں سب سے زیادہ مشکل اب یہ ہے کہ ترنم اپنا ذاتی ہوتا ہے جب کہ شاعری کا ذاتی ہونا ضروری نہیں ہے (یہ نکتہ ہماری سمجھ میں آگیا ہے)

ہمیں اپنے اس دورے میں ہندوستان کے کئی شہر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہاں شہروں کے بھی گریڈ مقرر ہیں۔ بعض شہر اے گریڈ سٹی ہیں تو بعض بی گریڈ۔ ہوٹلوں اور شہروں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہوٹلوں میں باضابطہ ایک تختی لگانی پڑتی ہے جس پر ہوٹل کا گریڈ درج ہوتا ہے۔ جب کہ شہروں کے معاملے میں یہ پابندی نہیں ہے۔ صرف ویلکم بورڈ لگا دینا کافی ہوتا ہے (چاہے شہر میں سلوک کیسا ہی کیا جاتا ہو)۔!

اپنے کاروبار کے سلسلے میں صرف ہمیں بار بار پونا جانا پڑا۔ اس شہر کا صحیح تلفظ "پونے" تو ہم یہ سمجھے کہ جمع ہے، جیسے لڑکا، لڑکے، بکرا، بکرے۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ جمع نہیں واحد ہے۔ پہلے یہاں ایک مقام تھانہ ہوا کرتا تھا اب اسے بھی تھانے کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے پہلے جو نام تھے وہ غلط تھے ــــــ اس قسم کی غلطیوں کو درست کرتے رہنا یہاں کی پسندیدہ ادا ہے۔

پونے بمبئی سے کوئی سو سوا سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس لیے جو لوگ بمبئی میں رہتے ہیں وہ پونے میں ملازمت یا کاروبار کرتے ہیں اور جو لوگ پونے میں رہتے ہیں وہ بمبئی میں ملازمت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جو روزانہ بمبئی سے پونے اور پونے سے بمبئی، اَپ اور ڈاؤن کرتے رہتے ہیں۔ یہ معاہدہ برسوں پہلے ہوا تھا جس پر نہایت ایماندارانہ طریقے سے عمل کیا جاتا ہے۔

بمبئی سے پونے کے سفر کے لئے ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں اور بسیں تو خیر ہیں ہی۔ ان کے علاوہ ٹیکسیاں بھی ہیں جو ہر پانچ منٹ پر مل جاتی ہیں۔ کہتے ہیں ہندوستان میں ایک مرتبہ ملک بھر میں ریل ہڑتال ہوگئی تھی (ہوگئی تھی سے مطلب اہتمام کے ساتھ کی گئی تھی) اس اسٹرائک کے زمانے میں پونے اور بمبئی کے درمیان ٹیکسی گاڑیاں دوڑائی جانے لگیں۔ اسٹرائک تو خیر جبھی ختم ہوگئی لیکن ٹیکسی کا سفر کچھ اتنا مقبول ہوا کہ سارا راستہ ٹیکسیوں ہی سے بھرا رہتا ہے۔ پونے کا سفر ہمیشہ کار سے کرنا چاہیئے۔ گھاٹ پر مزا آتا ہے۔ یہ گھاٹ زمین سے کافی بلندی پر ہے۔ پہلی مرتبہ ہم اس گھاٹ پر چڑھے تو یہ سمجھے کہ بس اوپر ہی اوپر چلے جائیں گے۔ لیکن اس میں دوسری طرف اترنے کا بھی انتظام ہے جو ہمیں پسند آیا۔ چڑھائی اور اُترائی دونوں خطرناک ہیں۔ اس چڑھائی پر ایسے ایسے موڑ آتے ہیں کہ کیا کسی کی زندگی میں آئیں گے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے راستہ سر پر رکھا ہوا ہے۔ اُترائی کا بھی یہی حال ہے۔ راستہ سامنے نظر نہیں آتا۔ اوپر سے جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔ راستے کے دونوں طرف گہری گہری وادیاں ہیں۔ موٹر چلانے کا صحیح امتحان تو یہیں ہوتا ہے۔ ہماری رائے ہے کہ روڈ ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ کا آفس اسی گھاٹ پر ہونا چاہیے اور جو شخص بھی وہاں تک ۔۔۔ اسے موٹر چلانے کا لائسنس، فیس کے ساتھ نہیں "تحفتاً" دیا جانے چاہیئے۔ (لیکن

معلوم ہوتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں تحفے دیئے جانے کا رواج نہیں ہے) ہمیں اس راستے پر ہر سفر میں دو چار ٹرک الٹے پڑے نظر آئے۔ ہم ٹھیک سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ ٹرک یہاں برسوں سے پڑے ہوئے ہیں یا روزانہ تازہ ٹرک الٹتے ہیں۔ یہاں ہر ٹرک کی پشت پر انگریزی میں یہ ضرور لکھا ہوتا ہے۔ براہ مہربانی ہارن بجائیے لیکن ٹرک ڈرائیور کے کانوں تک کسی ہارن کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ خود ٹرک کے انجن سے صور اسرافیل کی آواز آتی ہے بعض گاڑیوں پر اردو اشعار بھی لکھے نظر آئے مثلاً

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ہمارے دو اردو داں دوستوں میں تو اس شعر پر گرما گرم بحث ہوگئی (یہ دونوں اردو داں دوست صرف اردو داں ہی نہیں شعر خواں بھی تھے) ایک نے اعتراض کیا، اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا۔ ع

اب تو جاتے ہیں میکدے کو میر

دوسرے نے کہا، میر ایسی غلط زبان نہیں لکھ سکتے تھے۔ پہلے نے کہا، میں زبان پر توجہ نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں، یہ شعر میکدے جاتے وقت بہتر معنی دیتا ہے۔ دوسرے دوست نے کہا لیکن شعر میں میکدے کا لفظ ہے ہی نہیں میر نے 'بت کدے' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہم نے پوچھا۔ یہ بت کدہ کیا ہے؟

دونوں ایک ساتھ بولے۔ تم ادبی معاملوں میں دخل مت دیا کرو۔ باہر سینری دیکھو۔ ہمیں بھی سینری دیکھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ ہمیں اتنا البتہ معلوم ہوگیا ہے کہ یہاں میر اور غالب دو شاعر ایسے گذرے ہیں جن کے کم سے کم دو شعر ہر شخص ضرور یاد رکھتا ہے اور اس پر دل کھول کر بحث کرتا ہے۔ کاش یہ طریقہ سب ملکوں میں رائج ہوتا۔ اس طرح سفر ہی نہیں زندگی بھی آسانی سے کٹتی ہے۔

پونے سے بمبئی تک کا راستہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ گھاٹ پر تو خیر تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کیا جاسکتا لیکن گھاٹ کے ادھر (یہ بھی تقریباً گھاٹ ہی ہوا) موٹریں اور کاریں اس تیزی سے بھاگتی اور دوڑتی ہیں جیسے کوئی مقابلہ ہو رہا ہو۔ یہ راستہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور آبادیوں سے بھی گذرتا ہے لیکن کیا مجال کہ کسی گاڑی کی رفتار میں فرق آجائے۔ سڑک پار کرنے والے آنکھیں بند کرکے سڑک پار کرتے ہیں۔ آنکھیں کھلی رکھنے کی ہمت ان میں نہیں ہوتی۔ خود کو حادثے کا شکار ہوتا کون دیکھ سکتا؟ لیکن اب سڑک پار کرنے والے لوگ بھی برق رفتار ہو گئے ہیں۔ اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔

پونے کے راستے میں لونا والا اور کھنڈالہ بہت خوب صورت جگہیں ہیں۔ ہرے بھرے درختوں کے گھنے سایوں میں چھوٹے چھوٹے بنگلے اور کاٹیج دیکھ کر ہمارے ایک دوست نے ہمیں غالب کا مصرعہ سنایا۔ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں۔ مطلب بھی سمجھایا۔ غالب کی بڑائی کے ہم قائل ہوگئے۔ لیکن ہمارا خیال ہے ایسے حسین و جمیل مقامات پر اینٹ پتھر اور سمنٹ کے مکانات نہیں بننے چاہئیں۔ جاپانیوں کی طرح لکڑی کے بنے مکانوں میں رہنے کی عادت یہاں کے لوگوں کو بھی اپنانی چاہیے۔ جاپان کتنا اچھا ملک ہے۔ لوہے اور سمنٹ کا جھگڑا ہی نہیں۔ ہندوستان میں سمنٹ کے بوروں کے لیے لوگ جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ مہینوں تپسیا اور ریاضت کرتے ہیں۔ تب کہیں جاکر ایک بوری سمنٹ کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔ لونا والا اور کھنڈالہ کی سینری دیکھ کر ہمارا جی خوش ہوگیا۔ ایک مرتبہ تو ہمیں شبہ ہوا کہ ہم

ہندوستان میں ہیں بھی یا نہیں۔ لوناوالہ کی سبزی اتنی مشہور نہیں۔ جتنی یہاں کی چکی مشہور ہے۔ چکی کو جتنا کیڈ بری کہنا چاہیئے۔ یہ ہمارے ہندوستان میں بھیجی اور بیچی جاتی ہے۔ دلی اور آگرے کی گجک کا جواب بھی چکی ہے۔ کانپور کی ریوڑیوں کا بدل بھی چکی ہے۔ بنارس کے لڈوؤں اور متھرا کے پیڑوں کی تجارت کو نقصان پہنچانے والی چیز بھی چکی ہے۔ جو بھی لوناوالا چکی کے ۱۰ پیکٹ ضرور خریدتا ہے۔ کئی لوگ تو گھر سے نکلتے وقت کوئی سامان ساتھ لے کر نہیں جاتے کیونکہ انہیں واپسی میں چکی کے پیکٹ خریدنے ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی اس کا ذائقہ چکھا۔ جس طرح بعض ادیبوں اور شاعروں کو ان کی حیثیت سے زیادہ شہرت مل جاتی ہے یہی حال اس چکی کا ہے۔ دلی کی گجک، آگرے کے میٹھے اور متھرا کے پیڑوں کی بات اور ہے۔

ایک مرتبہ ہم گرمیوں کے دنوں میں اس راستے سے گذرے تو سڑک کی دونوں طرف یعنی سڑک سے ذرا ہٹ کر تربوزوں کی دوکانوں کی دکانیں نظر آئیں۔ اور ان میں ایسے ایسے تربوز نظر آئے کہ اٹھائے نہ بنے۔ یہ یہاں کا خاص نہیں بلکہ خاص الخاص پھل ہے۔ ایسے سرخ اور تر و تازہ تربوز شاید ہی کہیں اور ہوتے ہوں۔ دوکانوں پر ترشی ہوئی قاشیں رکھی رہتی ہیں اور ساری دوکان لہولہان نظر آتی ہے۔ سرخابوں سے سجی ہوئی یہ دوکان، بس چار دن کی چاندنی کی طرح ہوتی ہے۔ ہمارے دوستوں نے جب بھی دو چار تربوز خریدے ٹیکسی کی ڈکی لبریز ہوگئی۔ اس واردات پر بھی کسی نے ایک شعر سنایا تھا جس کا بس ایک ہی لفظ ہمیں یاد رہ گیا۔ تنگ دامانی یا اسی قسم کا کوئی لفظ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ڈکی کو اپنے مختصر ہونے کا افسوس ہوا۔ (ہمیں بھی ہوا)

انجیر بھی بکثرت دکھائی دیئے۔ یہ پھل ہمیں زیادہ پسند ہے۔ چھوٹا ہے تو کیا ہوا۔ یہ مختصر ہے لیکن جامع۔ انجیروں کے درختوں پر لگا ہوا دیکھنا چاہیئے۔ انجیر کے درخت خود سب معقول ہوتے ہیں۔ مناسب قد و قامت کے لوگ بھی چاہیں تو آسانی سے انجیر توڑ لیں۔ یہ نہیں کہ سیڑھی لگائی جا رہی ہے اور ایک ایک پھل کے لیے ورزش ہو رہی ہے۔ یہ تو درخت کی ہوئی۔ اب رہے انجیر تو یہ جب پکنے پر آتے ہیں تو بے ساختہ باچھیں کھول دیتے ہیں۔ یہ کلی کی مسکراہٹ نہیں، باضابطہ قہقہہ ہوتا ہے۔ کسی فلسفی نے ہم سے کہا تھا کہ آدمی نے ہنسنا اسی طرح سیکھا تھا۔ ہم نے یہ سن کر اسی وقت اس فلسفی سے بحث کرلی تھی اور اسے شکست فاش دی تھی ہمارا اعتراض یہ تھا کہ آدمی ہنسنے کے لیے اتنی دیر ٹھیر نہیں سکتا۔ پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ہنسنا بھی کوئی ہنسنا ہوا۔ اس وقت تو آدمی کھسیایا کرتا ہے (ہندوستان میں کھسیانا عام ہے۔ ہم نے سنا بلا بلیاں بھی کھسیانی ہوا کرتی ہیں) ہندوستان میں ہنسنے کا رواج ذرا کم ہوا ہے۔ یہاں لوگ سنجیدہ ہی نہیں رہتے دن رات منہ پھلائے رہتے ہیں۔ کسی نے اطلاع دی کہ منہ پھلائے رکھنا یہاں دانشوری کی علامت ہے۔ لیکن ہماری عقل کہتی ہے کہ یہ خبر غلط ہوگی۔ زرد صحافت کس ملک میں نہیں ہوتی لیکن ہندوستان میں زبانی زرد صحافت ذرا زیادہ ہی ہے جب ہم نے اپنے اس خیال کا اظہار اپنے دوستوں سے کیا تو انہوں نے یوں تصحیح کی کہ زبانی زرد صحافت کو صحافت نہیں فصاحت کہا جاتا ہے۔

ایک اور نئے قسم کا پھل ہمیں نظر آیا۔ گول گول اور جیسنوی بھی۔ سیاہی مائل رنگ۔ جس میں قرمزی رنگ کی جھلک ہو۔ اسے یہاں جامن کہتے ہیں۔ ایسے تر و تازہ دلچسپ پھل ہمارے طرف ہوتے ہی نہیں۔ اس پھل کے نام پر تو یہاں جامنی رنگ رواج پاگیا۔ جامن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اس جادو کی طرح ہوتا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے مطلب یہ ہے کہ اسے کھاؤ تو زبان جامنی ہوتی ہے اور گھنٹوں جامنی رہتی ہے۔ ہم نے تو جب بھی جامن کھائے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد اپنی

زبان باہر نکال کر دیکھ لی۔ اس میں بھی مزا آیا۔ ایسے جیبھ کالی کرنے والے پھل یہاں بہت ہیں۔ لیکن ان میں جامن کا سا ذائقہ نہیں۔ جامن کھانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک پلیٹ میں جو گہری ہوئی ہے جامن رکھو اور نمک چھڑکو (جیسے زخموں پر چھڑکا جاتا ہے) اس پلیٹ کو ایک اور پلیٹ سے ڈھانک دو اور دونوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر خوب ہلاؤ تھک بھی جاؤ تو پرواہ مت کرو اور ہلاتے ہی رہو۔ ۱۰ منٹ تک ہلانے کے بعد رک جاؤ اور جامن والی پلیٹ یعنی گہری پلیٹ کو کھول کر دیکھو۔ جامنوں کا لباس تار تار ہو گا۔ اور سارا نمک ان جامنوں میں انٹرو وینس انجکشن کی طرح جذب ہو چکا ہوگا۔ اب جامن کھاؤ اور دیکھو کہ ذائقہ کیا چیز ہوتا ہے۔ ہم نے تو سنا کہ یہاں جامنوں سے علاج بھی کیا جاتا ہے۔ جامن کی گٹھلی، جامن کے درخت کی چھال، اور جامن کے درخت کی جڑ میں حکیموں کی جان اٹکی رہتی ہے۔ مطلب یہ کہ حکیم ان سب چیزوں پر اپنی جان چھڑکتے ہیں اور مریضوں کو چٹکی بجاتے اچھا کر دیتے ہیں (فیس میں رقم بھی معقول لیتے ہیں لیکن اتنی نہیں کہ ڈاکٹر دکھائی دینے لگیں) اب کے ہم پرشین گلف گئے تو کم سے کم دو ڈرم جامن ضرور ساتھ لے جائیں گے۔ ہاں، خوب یاد آیا۔ ایک مرتبہ ہم اپنی جامنی زبان کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو ہمارے ایک ادب نواز دوست نے ایک مصرعہ پڑھا ع

رنگ لاتا ہے یہ پھل منہ میں پس جانے کے بعد

پھر انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ اصل مصرعہ مہندی کی پتیوں کے بارے میں کہا گیا ہے ع

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

مہندی کا درخت بھی ہم نے یہیں دیکھا۔ یہ عجیب و غریب ملک ہے۔ ہمیں تو یہاں ہر جگہ جادو ہی جادو نظر آتا ہے۔ مہندی کے درخت کی ہری ہری پتیاں پیس کر یہاں کے لوگ ہاتھوں میں لگاتے ہیں۔ یہ ہرے رنگ کا مسالہ رات بھر ہاتھوں میں لگا رہتا ہے اور صبح دھو دیا جاتا ہے۔ ہاتھ سرخ ہو جاتے ہیں۔ بالکل گلنار۔ یہ یہاں کا حسین ترین سنگھار ہے۔ اسے مہندی رچانا کہتے ہیں۔ دلہنوں کے ہاتھوں میں مہندی ضرور بالضرور رچائی جاتی ہے۔ انہیں مہندی لگے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر دلہنیں شرماتی ہیں۔ دست حنائی کی تعریف میں یہاں سینکڑوں اشعار کہے گئے ہیں جو لوگوں کو منہ زبانی یاد ہیں۔ اب تو مہندی لگانا ایک آرٹ ہو گیا ہے۔ ہتھیلیوں پر پھول بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ انگلیوں کی پوروں پر چاند تارے درج کئے جاتے ہیں۔ اچھے اچھوں کو صرف ان ہاتھوں سے قتل ہونے کی خواہش میں مرتے دیکھا ہے (لیکن انہیں قتل کر کے کون رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر تیار ہوگا) اس مرنے کو یہاں شہید ہونا کہا جاتا ہے (شہادت کی ایسی سہولت اور کسی ملک میں دستیاب نہیں ہے)

ہم کہاں سے کہاں بہک گئے۔ کہنا چاہ رہے تھے پونے کی بات اور چل پڑی جامنوں اور مہندی کی بات ——
پونا اچھا خاصا بڑا شہر ہے اور دن بدن بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ کہتے ہیں آج سے ۱۰ تا ۲۰ سال پہلے تک یہ بڑا پرسکون شہر تھا اور جو بھی اپنے کاروبار سے دست بردار ہوتا یا ملازمت سے وظیفے پر بھیجا جاتا پونے میں زندگی گذارنے کا خواہش مند تھا پونے عرصے تک وظیفہ یابوں کا شہر کہا جاتا رہا۔ یہ مقام بمبئی کے مقابلے میں ٹھنڈا ہے (یہ بات ہمیں مبالغہ آمیز نظر آتی) آب و ہوا بہتر ہے (یہ بھی ہمیں افواہ معلوم ہوئی) بمبئی کے مقابلے میں پونے سستا ہے (یہ سراسر بہتان ہے) پونے میں اتنی بھاگم بھاگ نہیں ہے جتنی بمبئی میں ہے (یہ کچھ کچھ ٹھیک ہے)

پونے میں کنٹونمنٹ یعنی چھاؤنی کا علاقہ بھی ہے اور ہم سے کہا گیا ہے کہ صفائی دیکھنا ہو تو چھاؤنی کا علاقہ دیکھنا چاہیئے۔ ہم چھاؤنی کے علاقے میں ضرور گئے لیکن صفائی دیکھنے کی غرض سے نہیں (صفائی ہم نے بہت دیکھی ہے)

یہاں کا سب سے مشہور علاقہ دکن ہے۔ اس جگہ ایک جمخانہ ہے جس کا نام دکن جمخانہ ہے اس لیے پورا علاقہ دکن مشہور ہو گیا ہے۔

پونے کی ساری آبادی دن میں ایک مرتبہ دکن ضرور جاتی ہے۔ مجبوری ہے شام کے وقت تو یہاں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ پورا علاقہ آٹو رکشاؤں سے پٹ جاتا ہے۔ اور آٹو رکشا وہ سواری ہے جس میں سائیلنسر نہیں لگایا جاتا اس سواری میں جو ہارن لگائے جاتے ہیں۔ ان کی آواز کچھ ایسی خوفناک ہوتی ہے کہ راہ گیر خود اچھل کر پرے ہٹ جاتے ہیں۔ پونے میں آدمیوں اور آٹو رکشاؤں کی تعداد برابر برابر ہے۔

پونے شہر ہرا بھرا نظر آیا۔ ہم جب بھی کوئی کمپاؤنڈ اور صحن والا گھر دیکھتے ہیں تو لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ابھی تنگ نہیں ہوئی ہے۔ لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ یہ وسعت اور فراخی بس چند سالوں کی مہمان ہے۔ فلیٹ بننے شروع ہو گئے ہیں۔ فلیٹ ہمیں صرف اس لیے بھاتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ دوسرے کے گھر میں کیا پک رہا ہے یا کیا ہو رہا ہے آپ بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ آدمیوں کو اتنے قریب قریب تو رہنا ہی چاہیئے۔ ورنہ بھائی چارہ کیا ہوتا؟

پونے کے لوگ نیچر پرست نظر آئے۔ جو شخص بھی پودوں، پھولوں اور سبزہ زاروں میں دلچسپی لے گا، نیچر پرست کہلائے گا۔ اس سے زیادہ نیچر پرستی کی فرصت ابھی کسی کے پاس ہے بھی نہیں۔ ہر شخص ورڈز ورتھ تھوڑے ہی ہو سکتا ہے۔ ہم نے آثارِ قدیمہ، میوزیم، باغ، پارک بہت دیکھے ہیں اس لیے ہم کوئی اور چیز دیکھنا چاہ رہے تھے۔ وہ ہم نے دیکھ لی پونے میں فلم انسٹی ٹیوٹ ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا تھا اور اس کا موقع مل گیا۔ یہ ٹی وی انسٹی ٹیوٹ بھی ہے ہمارے دوستوں میں سے ایک دوست یہاں کسی صاحب کو جانتے تھے۔ بس ان سے ملاقات کے بہانے ہم چلے گئے۔ یہاں پہرہ اور قاعدہ قانون سخت ہے۔ دروازے ہی پر آنے جانے والوں کے نام لکھ لیئے جاتے ہیں۔ اندر آنے کی وجہ، علت اور اسباب پوچھے جاتے ہیں۔ حلیے اور لباس وغیرہ پر بھی تھوڑا بہت غور کیا جاتا ہے۔ اس انتظام کا ہم پر کافی رعب پڑا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں ہاسٹل ہیں عمارت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک اسٹوڈیو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ شانتارام اسٹوڈیو ہے جو پونا کا واحد اسٹوڈیو ہے اور ہندوستان کے تاریخی اور اہم اسٹوڈیوز میں اونچے درجے کا اسٹوڈیو مانا جاتا ہے۔ یہاں لوگ شانتارام کا نام ذرا ادب سے لیتے ہیں) یہاں ہم نے ایک کینٹین میں چائے پی۔ اس کینٹین کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ اس کینٹین میں فلاں ہیروئن یہیں بیٹھ کر چائے پیتی تھی اور فلاں ہیرو یہیں بیٹھ کر آلو کے ویفر کھاتا تھا۔ ہمیں اور بھی کئی باتیں بتائی گئیں لیکن اب ہم ساری کہانیاں تو اپنے سفرنامے میں لکھنے سے رہے اور یہ ایسی کوئی غیر معمولی باتیں ہیں بھی نہیں۔ یہ تو روزمرہ کے واقعات ہیں جو ساری دنیا میں شب و روز ہوتے رہتے ہیں ——— یہ جگہ ہر حال ہمیں پسند آئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہم کسی یونیورسٹی کیمپس میں جا پہنچے ہوں۔ اپنی عمر بھی کم محسوس ہوئی۔

ہر بڑے شہر میں سینما ہال اور ہوٹل ہونے ضروری ہیں لیکن اتنے نہیں جتنے پونے میں ہیں۔ یہاں اتنے

ہوٹل موجود ہیں پھر بھی لوگوں کو ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ پیس کے زمانے میں تو سنا ہے باہر سے آنے والے لوگ زبردستی گھروں میں گھس کر ٹھیر جاتے تھے۔ کوئی منع کرے تو یہ لوگ بمبئی واپس ہو جاتے ہیں۔ بمبئی کی طرح یہاں بھی ڈبل روٹی کا رواج عروج پر نظر آتا ہے۔ قدم قدم پر ایک بیکری دکھائی دی۔ جسے دیکھو ڈبل روٹی خرید رہا ہے (لوگوں کو اس کے علاوہ بھی کوئی چیز کھانی چاہیئے) بیکری کے بعد فہرست میں پان کی دوکانوں کا نمبر آتا ہے۔ پان یہاں کی مرغوب غذا ہے پانوں کی قسموں میں پونا پان سب سے زیادہ مقبول پان ہے اور کلکتہ پان اور بنارسی پان بھی کھائے جاتے ہیں بمبئی اتنا بڑا شہر ہے لیکن اس کے نام سے کوئی پان مشہور نہیں ہو سکا۔ پونا کا چوڑا بھی مشہور ہے۔ اسے چوڑا ہی کہا جاتا ہے۔ پونا چوڑا کھانے سے صحت بنی رہتی ہے۔ تیسرے نمبر پر مٹھائی کی دوکانیں ہیں۔ بمبئی اور پونے میں لوگ اپنے منہ کو آرام کا وقفہ (انٹرول) دینا پسند نہیں کرتے (ہم خود اب اتنا بولنے لگے ہیں کہ کبھی کبھی تو ہمیں سوچنا پڑتا ہے یہ ہم بول رہے ہیں یا کوئی اور) ٹھیک بھی ہے۔ جب آنکھیں اور کان ہمیشہ کھلے رہتے ہیں تو منہ نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے بند رکھا جائے۔

عاق شاہ

اگر کھانے کو کچھ نہ ہو اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تو آم کھائیے ۔ اور خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے جس نے آپ کے لیے ایسی نعمت پیدا کی اور اس نعمت کے لیے آپ کو پیدا کیا۔!

قدرت کے رازسے قدرت ہی واقف ہوتی ہے اور وہ جانتی ہے کہ آم کو انسان کے لیے اور انسان کو آم کے لیے کیوں پیدا کیا گیا۔ دونوں کی تخلیق کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کے تعلقات کو آپس میں استوار اور مستحکم کیا۔ ورنہ کہاں آدم اور کہاں آم!!

جواب نہیں اس عجیب وغریب میوہ کا۔ اُردو غزل کے محبوب کی طرح اسے ہر ایک پسند کرتا ہے۔ اگر کوئی اس میوے کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرے تو اس کی شخصیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ غور فرمایئے کیا اہمیت ہے اس میوے کی جو اچھے خاصے انسان کی مٹی پلید کر دیتا ہے!

کسی زمانے میں اُردو کے ایک شاعر مرزا غالبؔ ہوا کرتے تھے جنہوں نے آم سے عشق ہی نہیں کیا بلکہ اس سے اپنا پیٹ بھرنے لگے اور آپ جانتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھانا کبھی صحت کے لیے مفید نہیں ہوتا!

لیکن اس کے باوجود غالب کی صحت آخر وقت تک اچھی رہی۔ اور انھوں نے اپنے رویئے سے یہ ثابت کر دیا کہ آم، جام نہیں۔ جام آم نہیں۔ آم آم ہے۔ لہٰذا کھائیے اور سیر ہو کر کھائیے۔ واہ واہ بجا ارشاد ہوا۔ نثر میں شاعری اسی کو کہتے ہیں!

غیر منقسم ہندوستان میں آم صرف ہندوستان میں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد یہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی پیدا ہونے لگا۔ لعنت ہے اس پیداوار پر۔ اپنے ملک سے غداری اسی کو کہتے ہیں۔!

وفاداری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اپنے ملک پر قربان ہو جاتا اور دوسروں کی دہلیز پر قدم نہ رکھتا۔ لیکن آموں میں خصوصیت کے ساتھ طوطا پری وہ آم ہے جو طوطے کی طرح اپنی نظریں پھیر لیتا ہے۔ اسے محاورے کی زبان میں طوطا چشمی کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کا نام طوطا پری رکھا گیا ہے۔ اچھے، معزز اور اعلیٰ خاندان کے لوگ اسے

لفٹ نہیں دیتے۔ ہاتھ لگانا تو بڑی بات ہے، چھو کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس لیئے طوطا پری فٹ پاتھ کا مقدر بن گیا۔ عورتیں اس پر نظر نہیں ڈالتیں۔ اگر اس پر اتفاق سے کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ اپنا راستہ بدل کر دوسرے راستے پر چلنے لگتی ہے۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے!

بیگن پلی کے آم سے تو عورتیں گھبراتی ہیں۔ بعض تو اس کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتیں۔ نازک مزاج پر واقعی یہ بار ہے۔ بدذوقی کی حد ہوگئی۔ ورنہ کہاں آم اور کہاں بیگن۔ غور کیجیئے ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے ۔۔؟! اس کے باوجود کسی نے ان کے ملاپ کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن کوئی پوچھے تو نام رکھنے والے سے کہ اس نے ایسی غیر فطری حرکت کیوں کی؟

ویسے یہ آم کا نام نہیں ہے۔ بیگن پلی تو مقام کا نام ہے۔ اور یہ آم مقام کے نام سے مشہور ہے یا مشہور کر دیا گیا ہے۔ بہرحال اس کے پیچھے کسی نہ کسی چالاک شخص کا ذہن کام کر رہا ہے اور ایسے لوگ سماج اور سوسائٹی کے لیے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ آم کا نام بدلتے ہوئے انسان کے نام بدلنے لگتے ہیں۔ اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ کسی نے انجانے میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے! خدا بچائے ان سے!

تو کھایئے یہ آم ہے بیگن پلی کا!

یہ حیدرآباد کا ______

یہ دلی کا ______

یہ لکھنو کا ______

اور یہ بمبئی کا! ______

شہر شہر، گاؤں گاؤں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہر شہر اور ہر گاؤں کا مال رکھا ہے۔ طلب کیجیئے۔ کوئی بھی دکان والا آپ کی خدمت میں اسے پیش کر دے گا!

آم کھانا اور کھلانا اس ملک کی ایک شریفانہ روایت ہے۔ اور آج بھی یہ روایت ہزارہا سال سے چل رہی ہے! کھانے والا ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کو کھلائے۔ اور میزبان بننے کا شرف حاصل کرے۔ اگر کوئی دوست آم کی دعوت قبول نہ کرے تو اس کا بہت برا مانا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات تو مہینوں اور برسوں تک میزبان کا دل صاف نہیں ہوتا۔ اور دل کی صفائی صرف اسی وقت ممکن ہے جب مہمان بغیر کسی دعوت کے میزبان کے گھر پہنچ جائے اور دگنے تگنے آم کھا کر اپنی پوزیشن صاف کرلے!

غیروں سے تعلقات بڑھانے کے لیے آم کے تحفے بھیجے جاتے ہیں۔ آم پارٹیوں میں کھانے کا میوہ نہیں۔ اور نہ ڈائننگ روم میں استعمال کرنے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف بڈ روم کے لیئے پیدا کیا ہے۔ اور جو چیز جس مقصد کے لیے پیدا کی جاتی ہے اس کا وہیں استعمال ہونا چاہیے۔!

اسی لیے بڈ روم سے باہر پارٹیوں میں یا ڈائننگ روم میں لوگ اس کی ایک دو قاش زبان پر رکھ کر "بس، بس" کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان کا جی تو چاہتا ہے کہ پلیٹ میں جتنے آم رکھے ہیں وہ سب کے سب چٹ کر جائیں۔ لیکن آم سے ہاتھ گندے ہو جاتے ہیں اور بعض وقت اس کا رس اچھل کر فوارے کی طرح کپڑوں پر آ گرتا ہے۔ اس سے کون بچائے؟

ویسے بے تکلف دوستوں کی محفل میں یہ سب چلتا ہے !
آم بالکل عوام کا میوہ ہے۔ خواص کبھی کبھی تفریحاً اسے استعمال کر لیتے ہیں۔ جب تک آم کا موسم رہتا ہے عوام کبھی چاول، گیہوں یا اناج کی قسم کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بس دن رات آم ہی کھاتے رہتے ہیں!
آم ہندوستان کا وہ واحد میوہ ہے جو ہر چالیس قدم پر مفت دستیاب ہوتا ہے۔ ہر دس گھروں میں ایک گھر ایسا ہوگا جس کی انگنائی میں آم کے ایک دو پیڑ ضرور کھڑے رہیں گے یا آبادی سے ایک میل آگے نکل جائیے ہر سمت میں امرائی ہی امرائی ہوگی ـــــ امرائی وہ مقام ہوتا ہے جہاں آم کے سینکڑوں پیڑ نیلے آسمان کے نیچے کھڑے اپنے چاہنے والوں کے منتظر ہوں گے!
اس لیے تھوڑی سی زحمت کیجیے۔ امرائی جائیے اور اپنی پسند کا پھل توڑ لیجیے۔ پھل توڑنا بری بات نہیں اور نہ یہ کسی ملک کی اخلاقیات کے کوڈ بل کے خلاف ہے۔ پھل ہوتا اسی لیے ہے کہ کھایا جائے۔ البتہ براہ راست درخت سے توڑ کر کھانے والے اصل میں وہ ذہین اور سمجھ دار لوگ ہوتے ہیں جو خداوند قدوس کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں۔!
ورنہ دنیوی قانون کے ڈر سے جو پھل نہیں توڑتا گھاٹے میں رہتا ہے۔ ایسے شخص کو عام زبان میں بزدل کہتے ہیں۔
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھل کوئی دوسرا توڑ لیتا ہے یا پک جانے کے بعد ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اسے زمین پر ٹپک دیتا ہے اور وہ کیڑے، مکوڑے اور چونٹیوں کی غذا بن جاتا ہے۔ اے ہائے کتنا بڑا سانحہ ہے۔ وہ پیدا کسی اور کے لیے ہوا تھا۔ اور گیا کسی اور کے پیٹ میں۔ اے آدم زاد! اپنے باطن کی آنکھ کھول۔ اور پہچان کہ تو کیا تھا اور اب کیا ہے۔ تو خلیفۃ الارض ہے۔ اس زمین پر رہنے والی ہر شئے تیرے استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہے اور تو اس سے غافل ہے۔ افسوس، صد افسوس!
اگر گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تو آم کھائیے اور خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے جس نے آپ کے لیے ایسی نعمت پیدا کی۔ اور اس نعمت کے لیے آپ کو ــــــ
اگر اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے اور ایک آواز پر دو جنوں نوکر دوڑ کر آتے ہیں تو بھی آپ کو آم کھانا چاہیے۔ ورنہ قدرت کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ اور اسے ناشکری سمجھا جائے گا۔!
یوں بھی آم کھانے اور کھلانے میں بہت سے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خلوص بڑھتا ہے اور دوسرا یہ کہ جسمانی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ جیب کی صحت بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ آم جسمانی صحت اور جیب کی صحت کے بیچ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے!
ویسے آم کھلانے کی کوئی خاص ٹکنک نہیں ہوتی۔ البتہ کھانے کی ٹکنک ہوتی ہے۔ اور وہ بھی ایک نہیں کئی تکنیکیں ہیں اس کی، بشرطیکہ آدمی سمجھدار ہو!
حیدرآباد کے حضور پرنور کی مثال سامنے ہے۔ وہ بڑے سلیقہ سے ایک آم کے عوض دس پندرہ ہزار روپے بڑی آسانی سے حاصل کر لیتے تھے اور وہ بھی اس وقت جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے۔
دو پیسے میں انڈا بکتا تھا۔ اور مرغی کی قیمت چار آنے تھی۔ لیکن اس پر بھی لوگ بھاؤ تاؤ کرتے تھے۔ غور فرمائیے اس وقت اتنی بڑی رقم لوگوں کی جیب سے نکلوا لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

حضور پرنور حکیم السیاست کرتے یوں تھے کہ آپ ... عمدہ قسم کا بڑا آم کٹواتے تھے۔ اور اس کی پندرہ یا بیس جتنی قاشیں نکلتی تھیں۔ انھیں اپنے جاں نثاروں کے یہاں ایک ایک پلیٹ میں ایک ایک قاش رکھ کر بھیج دیتے تھے۔ پھر کیا ہوتا یہ شہر میں دھوم مچ جاتی۔ اور سب کو اطلاع ہو جاتی تھی کہ سرکار نے اپنے غلام ابن غلام کو نوازا ہے!

غلام ابن غلام کی زندگی میں وہ لمحہ بڑا ہی اہم اور اکسائٹنگ ہوتا جب حضور پرنور کے باوردی سپاہی کے گھر پر ایک بڑے سے خوان میں رکھی ہوئی پلیٹ میں وہ اکلوتی قاش دے آتے!

اگر غلام مسلمان ہوتا تو شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھتا، ہندو ہوتا تو مندر جا کر گھنٹہ بجاتا یا پھر جس مذہب کا ہوتا اس انداز میں اپنے خدا کو دھنیکس کہتا کہ اس کی مہربانی اور فضل سے آخر حضور کی نظر اس پر پڑ ہی گئی!

پھر وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس قاش کو چکھتا!

دوسرے دن وہ ٹیکس لگا کر حضور پرنور کے دربار میں پہنچتا۔ اور جھک کر حسب قاعدہ پانچ یا سات فرشی سلام بجا لاتا!

حضور پرنور مسکرا کر ارشاد فرماتے، کیسا تھا ہمارا بھیجا ہوا آم؟

اتنا سنتے ہی غلام سات فرشی سلام بجا لاتا۔ اور دست بستہ عرض کرتا، خداوند نعمت! غلام اور اس کے اہل و عیال نے آج تک اتنا میٹھا اور عمدہ آم نہیں کھایا۔ تادم زیست اس کا ذائقہ یاد رہے گا۔!

حضور پرنور جواب سے بے حد خوش ہوتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے رانوں پہ مار کر کہتے سچ کہا، حق کہا ———!

پھر غلام حسب حیثیت حضور کی خدمت میں اشرفیاں پیش کرتا۔ اشرفیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ کچھ بھی ہو سکتی تھی لیکن کم از کم دو ہونی چاہیے تھیں۔ ویسے یہ کوئی شرط نہیں تھی۔ لیکن یہ ایک روایت تھی جو حضور کے خاندان غلاماں میں سینہ بہ سینہ سفر کر رہی تھی!

حوالے کے لئے قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ جدید تاریخ میں ورائٹی بہت آگئی ہے اس لیے ناموں کے علاوہ ہر شئے بدل گئی ہے لیکن پرانی تاریخ میں کہیں کہیں صرف ناموں کی گڑبڑ ہے۔ ورنہ واقعات حرف بہ حرف صحیح ہیں۔ یاد رکھیئے یہ خاندانِ غلاماں وہی ہے جو بعد میں تخت پر رونق افروز ہوا!

ہندوستان کی تاریخ کا سنہرا باب!

آقا اور غلام دونوں ایک ہی تخت پر بیٹھ گئے۔ اللہ اللہ کیا محبت تھی اور کیا خلوص تھا کہ آقا نے غلام کو پاس بٹھا لیا اور سچ پوچھیے تو ان کو ملانے والا آم تھا!

ایک آم اور کئی اشرفیاں!

کئی اشرفیاں اور ایک آم!!

حضور پُرنور کی خدمت میں اشرفی پیش کرنے کے اس عمل کو نذرانہ کہا جاتا تھا۔ لیکن بعض تنگ نظر اور تنگ دل حضرات نے اسے رشوت کا نام دیا ہے۔ لعنت ہے ان پر۔ خدا غارت کرے انھیں!

جب تک حضور کا دم خم تھا کیا مجال کہ کوئی ان کی طرف نظر بھی اٹھا لیتا۔ اللہ تو بڑی بات ہے۔ لیکن جب سے انھوں نے

آنکھیں بند کرلیں ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اپنی اپنی زبان اور انداز میں بڑا اہم رہا ہے!

حالانکہ جمہوریت میں بھی نذرانے کی رسم بڑی زور و شور پہ چل رہی ہے۔ بغیر نذرانے کے کوئی چپراسی بھی فائل ایک میز سے اٹھا کر دوسری میز پہ نہیں رکھتا۔ کلرک اور افسر تو بڑی بات ہے۔ حضور پرنور خواہ مخواہ بدنام تھے!

لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اور شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہ سب حضور پرنور کا صدقہ ہے کہ انھوں نے جاگیردارانہ سماج کو نذرانے کی رسم عطا کی۔ اور آم کا تحفہ دیا۔!!

آم کا جاگیردارانہ تہذیب سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو اس تہذیب نے آم کو آم باقی رکھا اور آم کو باقی رکھنے میں جو نمایاں رول انجام دیا اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ اور انشاء اللہ مستقبل میں بھی ملنے کی کوئی امید نہیں!

آم کی پیداوار نہ قوتوں کو اس تہذیب نے بڑھاوا دیا۔ آم کے سینکڑوں اور لاکھوں پیڑ اور باغ اس سچائی کے خاموش گواہ ہیں

قسم قسم کے آموں کے انھوں نے نام بھی رکھے ——

بھئی جواب نہیں تھا ان سب کا۔ واہ واہ کیا نام رکھا ہے۔

دل پسند، بے نشان!

ملغوبہ!

حمایت!

جہانگیر!

شاہجہاں!

اور —— اور عورتیں تو اس نام سے ڈر جاتی ہیں۔ باپ رے باپ ——

—— کالا پہاڑ

مگر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ یہ کوئی شیطان اور بھوت کا نام تھوڑی ہے جو ان بے چاریوں کو ہڑپ کرلے!

البتہ اس نام پہ تو وہ مسکراتی ہیں۔ ان میں سے ایک آہستہ سے کہتی ہے ——

لنگڑا!

لنگڑا تو آم کا نام ہے۔ لیکن ان میں چھیڑ چلتی ہے۔ اور ایک دوسرے کو کہنی مار کر آنکھ مار کر کہتی ہے، لنگڑا ہے تو کیا ہوا —— مگر ہے مزہ کا!

پھر وہ زبان سے چٹخارہ لیتی ہوئی اپنی سہیلی سے کہتی ہے، لے تو بھی دیکھ نہ اس لنگڑے کو!

سہیلی اس کی کمر میں چٹکی لیتی ہوئی کہتی ہے، نہ بابا نہ —— یہ لنگڑا لولا تجھے ہی مبارک ہو۔ میں تو کالے پہاڑ سے نبٹ لوں گی!

قلمی آم اصل میں ایسی تہذیب کی دین ہے!

قلمی آم اور دوسرے آموں میں صرف ایک فرق ہوتا ہے غیر قلمی آم بیج سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ...

پیڑ بننے تک اس پہ سے دس موسم گذر جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد پھل آتا ہے!
لیکن قلمی آم کا درخت ایک سال میں ہی اپنا سر اٹھاتا ہے۔ یہ دو درختوں کی ٹہنیوں کو ایک ساتھ ملا کر زمین
میں بو دیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں سے "کراس بریڈ" کہتے ہیں۔ اور اردو زبان میں ——
سال گذرنے کے بعد جب پھول آتا ہے تو اُسے فوراً توڑ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وقت سے پہلے کی بلوغیت
میں ہمیشہ کچا پن ہوتا ہے۔ اور اولاد غیر صحت مند اولاد پیدا ہوتی ہے لیکن ایک مناسب وقفے کے بعد جب اس درخت کی
[illegible] پہچانی جاتی ہے اور لوگ اُسے دیکھتے ہی کہہ دیتے ہیں دوغلا آم —— دوغلا آم
اس آم میں دو مختلف پیڑوں کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اگر دونوں پیڑ کے پھل میٹھے ہوں تو کیا کہنے۔ ورنہ دوغلا
آم کھٹاس اور مٹھاس کی آمیزش کا یہ ایک نایاب نمونہ ہوتا ہے! بعض لوگ اسے شوق سے کھاتے ہیں۔ کیونکہ
انہیں ایک آم میں دو آموں کا مزہ چھپا رہتا ہے!
بچپن سے بعض لوگ میٹھا رغبت سے کھاتے ہیں اور بعض کا رجحان کھٹے کی طرف ہوتا ہے۔ اس میں مرد اور عورتوں
کی کوئی تخصیص نہیں۔ لیکن میٹھا کھانے والی عورتیں اگر میٹھے کو چھوڑ کر اچانک کھٹی چیزیں کھانے لگیں اور کھٹا کھانے والی
خواتین میٹھے کی طرف اپنی رغبت کا اظہار کریں تو یقیناً ذات کے کرب کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ان خواتین کو کسی
ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے۔ چھپ چھپ کیری کھاتی ہیں، اور انہیں کسی ماہر نفسیات سے جو کیری کھانے کی عمر میں رس گلے
کا استعمال فرماتی ہیں۔!
کب تک چھپے گی کیری پتوں کی آڑ میں!
مشہور کہاوت ہے جو ایک خاموش راز کی طرح صدیوں سے اپنا سفر طے کرتی ہوئی آئی ہے سینہ بہ سینہ۔
لیکن اس کھلے جھوٹ کو سب قبول کر لیتے ہیں۔ کیری تو اپنے سبز رنگ سے فائدہ اٹھا کر پتوں کی آڑ میں خود کو
بہرحال چھپا لیتی ہے۔ لیکن پکے ہوئے آموں کا للچائی ہوئی نظروں سے چھپانا بہت ہی مشکل ہے!
شریف سے شریف آدمی بھی گذرتے ہوئے ان پر ایک بری اور چبھتی ہوئی نظر ڈال ہی لیتا ہے!
ہرے ہرے پتوں سے جھانکتے ہوئے پیلے پیلے پکے ہوئے آم ——
لال لال اور رس سے اُبلتے ہوئے آم!
آم جن کے درجنوں نام ہیں!
اور جن کی کئی قسمیں ہیں!
لیکن ایماندارانہ بات یہ ہے کہ آم کی کوئی قسم وسم نہیں ہوتی۔ آم، آم ہوتا ہے۔ میٹھا یا کھٹا۔ اور اس سے زیادہ
کچھ نہیں۔ اگر اس کی تقسیم ضروری ہی ہے تو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے!
(۱) رسل
(۲) غیر رسل
رسل وہ آم ہوتا ہے جسے چوس کر کھایا جائے
غیر رسل وہ ہوتا ہے جسے چھری کانٹے کی مدد سے استعمال کیا جاتا ہے!

غیر رسل وہ ہوتا ہے جسے چھری کا۔ ٹے کی مدد سے استعمال کیا جاتا ہے!
ویسے اس کی پابندی کوئی نہیں کرتا۔ جس کے جی میں جو آئے وہ کرتا ہے
بشرطیکہ آم بڈرروم میں کھائے جارہے ہوں!
ورنہ عام طور پر سب کے سامنے اخلاق اور تہذیب کی مروجہ قدروں کو اپنانے کی ممکنہ کوشش کی جاتی ہے!
جوں توں چوسنے والے آم پسند کرتے ہیں وہ کاٹ کر کھانے والے آموں کی طرف پلیٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔
اور جو آم کو کاٹ کر کھانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں وہ چوسنے والے آموں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے اور بعض لوگ انٹرنیشنل
قسم کے واقع ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُدھر بھی ہوتے ہیں اور ادھر بھی۔ اس میں جنس کی کوئی قید نہیں ہے عورتیں اور مرد
دونوں ہی میں برابر کے شریک ہیں۔ لیکن آم چوسنے کی تکنک کو عورتوں نے جو حسن عطا کیا ہے اس کے مقابلے میں مرد صفر ہیں۔
وہ لمحہ بڑا حسین ہوتا ہے جب کوئی اونچی پوری حسین عورت دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر چسر چسر آم چوسنے لگتی ہے اور دیکھنے
والے حیرت سے اپنا مُنہ کھول دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وقت ٹھہر جائے اور منظر کبھی نہ بدلے۔!
آم چوسنا ایک آرٹ ہے۔ ہمارے ملک نے دنیا کو اس آرٹ سے واقف کرایا۔ لیکن اب یورپی ممالک کی خواتین ہمارے
یہاں کی عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے بڑھ گئی ہیں۔ شاگرد اگر ذہین ہو تو استاد کا یہی حشر ہوتا ہے!
آم نے غیر ترقی یافتہ ممالک کو ترقی یافتہ اور ترقی یافتہ ممالک کو اور زیادہ ترقی یافتہ بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔
آم محبت، پیار، امن اور دوستی کا سمبل ہے۔ اس لیے اس سمبل کو خریدنے اور بیچنے کی اصطلاحوں میں نہیں سوچنا چاہیئے
بلکہ حضور پُر نور کے مبارک نقش قدم پر چل کر آم کا صحیح انداز میں استعمال کرنا چاہیئے۔!
جاگیر دارانہ تہذیب کے علاوہ آم کا اُردو تہذیب سے گہرا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو بولنے والا بچہ سب سے پہلے جب
اردو پڑھتا ہے تو اس کا پہلا سبق آم سے شروع ہوتا ہے۔!
اور وہ بھی اس طرح ——

آم لا
لالہ آم لا
لالہ دو آم لا
لا لا لا، آم لا
دو آم لا!!

سوالات

(۱) لالہ کو دو آم لانے کے لیے کیوں کہا گیا؟ تین کیوں نہیں؟ تفصیل سے روشنی ڈالیئے۔
(۲) قاش کی تعریف کیجئے۔ اور بتائیے کہ حضور پُر نور کی خدمت میں ایک قاش کے عوض کتنی اشرفیاں پیش کی جاتی تھیں!
(۳) ان عورتوں کی نفسیات پر روشنی ڈالئے جو آم چوس کر کھاتی ہیں!
(۴) ذیل میں کسی دو پر مختصر نوٹ لکھئے:

(i) بیگن پلی کا آم (ii) لنگڑا (iii) کالا پہاڑ

نوٹ: خوش خطی کے پانچ نمبر محفوظ ہیں۔

ادریس بانکے

غزل

(روحِ پرویز شاہدی سے معذرت کے ساتھ)

دل کے مٹکے کو مئے عشق سے بھرنے نہ دیا
"غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا"

پاؤں دہلیز پہ کمبخت نے دھرنے نہ دیا
ان کے کتّے نے مرا عشق اُبھرنے نہ دیا

کیک کس طرح بھلا دل کا کھلاتے ان کو
جن کو فرصت ہی کبھی تونس بھرنے نہ دیا

دیکھ کر واعظِ بدخُو نے ہماری بکری
اپنے میداں کی ذرا گھاس بھی چرنے نہ دیا

تھی تمنّا کہ رہِ راست پہ لاتے اس کو
اس کے چمچوں نے مگر اس کو سدھرنے نہ دیا

ان کے چلنے کے لئے ٹاٹ بچھایا دل کا
غم کی کیچڑ سے اُنھیں ہم نے گذرنے نہ دیا

ان سے رخصت جو ہوا کہہ کے میں بائی بائی
دو قدم ساتھ مرا ان کی نظر نے نہ دیا

دل کی بھٹی پہ سدا آگ تپایا بانکے
میں نے سردی میں کبھی ان کو ٹھٹھرنے نہ دیا

کرگس سہسوانی

اندھیرے میں

بدلے مری قسمت کے حالات اندھیرے میں
ناکام پلٹ آئی بارات اندھیرے میں
کیا کیا نہ ہوئیں سرزد حرکات اندھیرے میں
شیطان مسلّط تھا جنّات اندھیرے میں
غیروں سے اگر رازِ اُلفت کو چھپانا ہے
دے جاؤ مجھے کوئی سوغات اندھیرے میں
تعویذ و فلیتوں کی اس واسطے حاجت ہے
لپٹے ہیں بہت سارے جنّات اندھیرے میں
میں اپنی وفاؤں کا اظہار کروں کیسے
تم خود ہی سمجھ لوگے حالات اندھیرے میں
اغیار سے ہوتی ہیں کھل کھل کے ملاقاتیں
رکھتے ہو مگر میری ہر بات اندھیرے میں
اے حسنِ جفا پیشہ عشاق ہیں پژمردہ
اب ان کی نہ ہو جائیں اموات اندھیرے میں
دربان سے پٹوا کر اُس نے یہ کہا آخر
تُو بھول گیا اپنی اوقات اندھیرے میں
آجائے گی جب لائٹ اشعار سنادوں گا
بے لطف رہیں گے سب قطعات اندھیرے میں
رستم کا لقب پھر تو مل جائے گا کرگس کو
دے پٹخے اگر اُس نے چھ سات اندھیرے میں

O

خالد محمود

بیوی اور ہم

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

کسی بیاہتا شاعر کا یہ مصرع سن کر ہمیں بھی اپنا زمانہ یاد آ گیا۔ سبحان اللہ! کیا عجیب دن تھے۔ ہم سینکڑوں نگاہوں کا مرکز تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ہمیں بزرگوں کی تقلید میں ایک عدد بیوی کا شوہر بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ ویسے ہم اتنے نالائق کبھی نہیں رہے کہ بزرگوں کی برابری کا خیال بھی دل میں لاتے مگر ایک تو خود بزرگوں کا اصرار تھا دوسرے ہم نے یہ بھی سوچا کہ بھلا ایک دو شادیوں سے بھی کہیں بزرگوں کی برابری کسی نے کی ہے جو ہم کریں گے۔ چنانچہ ہم اپنی شادی خانہ آبادی پر راضی ہو گئے۔ شادی سے پہلے اللہ رکھے زندہ دلوں کے تمام شوق ہمارے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ شادی کے بعد ہماری بیوی اگرچہ ہماری ایکٹنگ وٹیلنٹ سے خوش نہیں تھیں مگر کچھ ایکٹنگ و تھیٹر سے بہت مسرور و مطمئن تھیں۔ مثلاً گھر میں بیٹھ کر دوستوں کی آواز پر کہلا دینا کہ گھر میں نہیں ہیں اسی طرح ہمارے دوسرے کھیلوں پر بھی ان کو کوئی اعتراض نہ تھا بس ایک شرط تھی کہ دنیا بھر کے سارے ان ڈور اور آؤٹ ڈور کھیلوں میں ہماری پارٹنری کا شرف صرف بیوی کو حاصل ہوگا اس کے علاوہ ہماری چند اور بیز توان کو بہت زیادہ عزیز تھیں مثلاً ہمارے کھانا پکانے برتن صاف کرنے اور کپڑے دھونے کے شوق کو وہ بہت زیادہ سراہتیں، کبھی کبھی ان کی تعریف پر ہم ایسے جذباتی جوش کا مظاہرہ کرتے کہ ان کے کپڑے بھی دھو ڈالتے۔ البتہ ہماری شاعری والی دل چسپی سے وہ بہت بیزار تھیں اس لیے ہم چوری چھپے یا ان کی غیر موجودگی میں اس شوق کی پرورش کرتے رہتے کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

چنانچہ آج بھی ایسا ہی ایک دن تھا ہماری بیوی کو میکے گئے ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ ہمارے اندازے کے مطابق ابھی [illegible] میکے کے جانے والا ناخوش گوار واپس لوٹ آنے کی حد تک ختم نہیں کیا ہوگا۔ اس خیال کے پیش نظر شعری نشست کا بندوبست کر لیا تھا۔ چند احباب شام ہی سے ہمارے دولت کدہ پہ جمع تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر

شروع ہوئی جو بہت جلد شباب پر آگئی۔ ہم بے چینی سے اپنی باری کے منتظر تھے کہ ہمارے نام کا اعلان ہوا اور ہم اپنی غزلوں کی ڈائری میں پھنسی ہوئی انگلی سنبھالتے ہوئے اٹھے ہی تھے کہ دروازہ بجنے کی آواز آئی صاحب خانہ ہونے کی حیثیت سے یہ سوچ کر کہ کوئی مہمان ہوگا اخلاقی تقاضہ کے پیش نظر صدر کی اجازت ہم بہ نفس نفیس دروازے پر پہنچے اور دروازہ کھول دیا پھر جیسے ہی نو وارد پر نظر پڑی ڈائری ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آرہی۔ (جس کو ہم نے برق رفتاری سے اٹھا کر اپنی دانست میں چھپالیا) اور ہکا بکا کھڑے ہو گئے۔ ہماری وارفتگی سے غالباً آپ بھی نئے آنے والے کو پہچان گئے ہوں گے جی ہاں! آپ بالکل صحیح سمجھے یہ ہماری بیوی ہی تھیں جو ہماری بوکھلاہٹ پر اس انداز سے مسکرا رہی تھیں جیسے کسی شیر کے جال میں پھنس جانے پر شکاری مسکراتا ہوگا۔ ابھی ہم اپنے ہوش و حواس ٹھکانے کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے کہ بیوی کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیا میرا آنا آپ کو ناگوار گزرا یا نصیب دشمناں طبیعت ناساز ہے ہم نے موزوں الفاظ کے ساتھ بدقت تمام خوش مزاجی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ آپ بخدا آپ یعنی کہ بیوی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ہمیں تو آپ کو دیکھ کر یقین کیجیے ایسی خوشی ہو رہی ہے کہ بیان نہیں کر سکتے دراصل آپ خود سوچیے دیکھیے نا پروگرام کے مطابق میں بھلا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس وقت اچانک یوں چلی آئیں گی دراصل آپ کا اس وقت یکا یکی آنا کچھ اور نہیں تو کرامت ضرور ہے کل ہی میں نے آپ کو یاد کیا تھا۔ سچ ہے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے وہ جو کسی نے کہا ہے نا! ؟" ہم نے لیکارا اور تم چلے آئے"۔ بیوی ہماری ان اول فول باتوں پر شاید ذرا مسکرانا چاہتی تھیں کہ ہماری شاعری والی ڈائری پر نظر پڑگئی بس پھر کیا تھا ماتھے پر شکنیں ڈال کر بولیں اچھا تو یوں کہو، شاعری ہو رہی ہے، کیوں جی میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہوگا کہ اس آفت ماری کا پیچھا چھوڑ دو مگر خدا جانے اس کم بخت میں ایسا کونسا جادو ہے کہ اچھے اچھوں کو دیوانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہم بیوی سے واقف تھے کہ اب وہ کسی صورت بند نہیں ہونے والیں اس لیے کہ ان کا ہولڈال اٹھایا اور مکان کے دوسرے حصہ کی جانب چل دیئے بیوی بھی بڑبڑاتی ہوئی ہمارے پیچھے چلی آئیں غصہ ندامت اور خوف سے ہمارا برا حال تھا خاموشی سے مشاعرہ گاہ میں پہنچے اور انتہائی غم زدہ چہرہ بنا کر بیوی کے ایک قریبی عزیز کے انتقال پر ملال کی خبر سنائی چنانچہ اب بجائے اس کے کہ ہم سے معذرت طلب کرتے لوگ ہم سے شرمندہ نظر آنے لگے سب نے انگریزی طرز پر ہمارے غم میں شرکت کا اظہار کیا اور چلے گئے۔ اب ہم نے ایک اچٹتی سی نظر گھر پر ڈالی۔ ہر چیز اپنے مقام سے محروم تھی یہاں آپ کو یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہماری بیوی "شامت اعمال" انتہائی سلیقہ شعار واقع ہوئی ہیں۔ کیا مجال جو ماچس اپنا کام کر کے جگہ پر واپس نہ آئے یا فرش پر تنکا نظر آجائے۔ انتہا تو یہ ہے کہ پانی کے برتنوں کے ڈھکن ٹیڑھے ہوں یا کتابیں بکھرنا تو بری بات ہے آگے پیچھے رکھی نظر آئیں تو انھیں اختلاج ہونے لگتا ہے۔ جبکہ ہمیں ایسا نہ ہونے پر اختلاج ہوتا ہے لیکن خیر ہم تو شادی کے بعد سے ہی اختلاج کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ اس کی شکایت نہ ہونے پر اپنے آپ کو بیمار نظر آنے لگتے ہیں۔ مختصراً آج گھر کا حلیہ بیوی کا ہارٹ فیل کرنے کے لیے کافی تھا مثلاً چولھے کے سارے بغیر دھلے ہوئے برتن پانی کے مٹکوں کی جگہ پڑے تھے کتابیں تخت کے نیچے پھنسی تھیں پان کی پیکوں سے گھر کے بہت سے حصے لہولہان تھے سگریٹوں کے ٹکڑوں نے کپڑوں کی بے حرمتی کر کے رکھ دی تھی۔ دروازے کی ریشمی چلمن میں بنا ہوا روشن دان یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگ کی چنگاری کا مرہون منت تھا یا سگریٹ کے کسی جلے ہوئے ٹکڑے کا۔ دوسرے کمرے میں گھر کا سارا بستر مشاعرہ کا فرش بنا ہوا

تھالی فون کو موڑ کر گاؤ تکیے تیار کیے گئے تھے۔ مختصر یہ کہ گھر کی ہر چیز ہماری فطرت کی نمائندگی کر رہی تھی۔ ہم گھر کی اس درگت سے ایسے ڈرے کہ بیوی کو خوش کرنے کی فوری تدبیریں سوچنے لگے۔ سب سے پہلے فرسٹ ایڈ کے طور پر ہم نے جلدی جلدی سب سامان اپنے اپنے مقام پر پہنچانا چاہا ہمارا یہ عمل ایسا ہی تھا جیسے کوئی کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سامان لے جانا چاہتا ہو ایسے غیر فطری عمل کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ہوا یعنی جو سامان اپنی جگہ برقرار تھا وہ بھی آؤٹ آف برقرار ہوگیا اور جو چیزیں اب تک کسی طرح محفوظ رہ گئی تھیں وہ بھی خطرے میں آگئیں۔ اس کی کارروائی سے فارغ ہوکر ہم بیوی کے پاس پہنچے اور نفسیاتی مار کے طور پر ان کے میکے کے حالات پوچھنے لگے بیوی جو پہلے ہی سے منہ پھلائے بیٹھی تھیں جھنا کر بولیں، آپ کو کسی کے مزاج سے کیا سروکار آپ کو تو بس شاعری سے مطلب رکھتا ہے۔ ہم نے کہا بیوی آخر آپ کو شاعری جیسی عظیم چیز سے بیر کیوں ہے آپ کو نہیں معلوم شاعروں نے تو بیوی کو حور کہا ہے۔ کیا آپ نے کبھی نہیں سنا "کیسی بھی ہو بیوی شوہر کے لیے حور ہے" بیوی ابھی تک اندر کے حالات سے بے خبر تھیں چنانچہ ہماری چاپلوسی کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آیا اور موڈ میں آکر بولیں اس مصرع سے یہ کہاں پتہ چلتا ہے کہ اپنی ہی بیوی شوہر کے لیے حور ہے۔ ہم نے کہا بیوی آپ بھی کمال کرتی ہیں اس کا پہلا مصرع بھی تو دیکھیے صاف کہا ہے " اپنی اپنی بیوی پہ سب کو غرور ہے "۔ کہنے لگیں۔ شاعر کے دل میں چور رہے ورنہ اپنی اپنی زبان سے کہنے کی کیا مار تھی ہم بیوی کی اس دلیل پر مصلحتاً دل ہی دل میں جل کر خاموش ہو گئے اور ان کو اٹھتا دیکھ کر ہمدردانہ لہجے میں بولے اب اس وقت کہاں چل دیں چھوڑیے۔ اب سارے کام صبح پر رکھیے اور آرام کیجیے ہماری اس خلاف معمول اور خلاف توقع ہمدردی نے بیوی کو کشمکش میں ڈال دیا ہم ان کو سوچنے کا موقع دیکر کسی شک میں نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے۔ اس لیے انتہائی پیار بھرے لہجے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولے آپ کی غیر موجودگی میں آپ کو نہیں معلوم سارا گھر ہمیں کھانے کو دوڑتا ہے کسی نے بالکل صحیح کہا ہے۔ سارے گھر کی رونق بیوی کے دم سے ہے چنانچہ اتفاق دیکھیے بیوی کے نام کے حروف سے بننے والے الفاظ سے بھی کیا اچھے معنی پیدا ہوتے ہیں جیسے "ب" سے "بوٹی" (سارے گھر کی) "ی" سے "یاد" (جو ہمیشہ بیوی سے وابستہ رہتی ہے) "و" سے "وسیلہ" (ساری خوشیوں کا) دوسری "ی" سے دوسری مرتبہ "یاد" ہم نے کھینچ تان کر اچھے الفاظ بنانے کی کوشش کی بیوی بھلا کہاں چوکنے والی تھیں۔ فوراً تنک کر بولیں لیکن عملاً تقریباً تمام شوہر اپنی بیوی کو "ب" سے "باندی" "ی" سے "یلدوت" "و" سے "وبال" اور دوسری "ی" سے "یخنی" جبکہ خود عموماً "ش" سے "شکی" "و" سے "وہمی" "ہ" سے "ہونق" اور "ر" سے "رنگروٹ" ہوا کرتے ہیں ہم نے بیوی سے کہا بیوی! آپ زیادتی کر رہی ہیں آپ نے شوہر اور شاعر دونوں کی توہین کی ہے جبکہ دونوں رحمت ہیں۔ شاعر نے حور کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں، بولیں جی ہاں! غیر عورت کی شان میں اپنی بیوی کی تو کسی نے منہ بھی تعریف نہیں کی ہم نے کہا یہ سراسر الزام ہے دور کیوں جاتی ہیں لیجیے ہماری ہی شاعری دیکھیے ——— اور بیوی کی تعریف میں ایک غزل سنا دی۔ ہماری غزل سن کر بیوی کے لطف و مسرت کے جذبات چھپانے کی کچھ دیر بڑی کامیاب ایکٹنگ کی مگر جذبات نے جب شدید برتاؤ کیا تو تیزی سے گھر کے اندرونی حصہ کی جانب چل دیں گویا۔ دل جس سے ڈر رہا تھا وہی بات ہوگئی" ہم بھی گھبرا کر ان کے پیچھے پیچھے تقریباً دوڑتے چلے گئے۔ پھر جیسے ہی ان کی نظر اس گھر کا حلیہ دیکھا ان کے دل و دماغ کے ہیروشیما اور ناگاساکی پہ گویا بمبارمنٹ ہوگیا، بالکل سکتہ کا عالم طاری

خود یہ سوچ رہے تھے کہ ؎

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت

یہاں تک کہ جب واپس آئیں تو ع

وہ ہم کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہم جس حالت میں کھڑے تھے آپ کیا تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ہمارے خیال میں بیوی سوچ رہی ہوں گی کہ وہ انتہائی کوشش کے بعد بھی سامان میں ایسی افراتفری نہیں لا سکتیں ورنہ ہر ایک چیز کو کم از کم ایک مرتبہ ضرور اٹھا کر پھینکیں ساری فضا خاموش تھی لیکن اس خاموشی میں اتنے سوالات چیخ رہے تھے کہ تصور کے کان بہرے ہونے کا اندیشہ تھا پھر نہ جانے کیسے بیوی کی نگاہوں سے ہماری نگاہیں ٹکرا گئیں۔ ہمیں ایسا لگا جیسے بیوی رونے کا ارادہ کر رہی ہیں اور نہ جانے کیوں بے ساختہ اور بلا ارادہ ہماری زبان سے نکلا ع

"اور نکھر آئی ہیں غصّہ میں ہماری بیوی"

اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک بیوی مسکرا دیں ہمیں بالکل ایسا لگا جیسے پانی برستے میں اچانک دھوپ نکل آئی ہو۔

۵۵

نظر برنی

چمچہ گیری بھی انکساری ہے
یہ وہ فن ہے جو سب پہ بھاری ہے
اس لئے بھی ہے لاجواب گدھا
سب سے بہتر یہی سواری ہے
لیڈری سے یہ فائدہ تو ہوا
ایک کوٹھی ہے ایک لاری ہے
جس کو کہتے ہیں سب چلم بھرنا
ان کے نزدیک دستکاری ہے
اپنی اولاد کو نہ جھڑکو تم
آج وہ کل تمہاری باری ہے
چمچہ گیری نہیں نیا پیشہ
اس کا قرنوں سے فیض جاری ہے
ایسا حلیہ ہے خاک پہچانیں
کون ہے مرد کون ناری ہے
کچھ نہ پوچھو نظر میاں کا حال
وہ شرابی ہے اور جواری ہے

نظریات

محمد برہان حسین

چپکے سے اس کو میں نے جو چھیڑا لب سڑک
پولیس کو اس نے آج بلایا لب سڑک

سب سے چھپا کے ہم نے لکھے تھے اُسے جو خط
کہتے ہیں اس نے سب کو سنایا لب سڑک

گھر میں گئے تو پھیر لیا منہ اِدھر اُدھر
پاؤں پڑے گلے سے لگایا لب سڑک

بچ کر تو ہم نکل گئے بیگم کی آنکھ سے
سسرے نے پان ہم سے منگایا لب سڑک

بھوکا رکھا نہ پانی دیا جس کو سال بھر
نوٹوں کا ہار اس کو پہنایا لب سڑک

لب سڑک

اقبال شانہ

بس دو یا تین شعر کی غزلیں سنائیے
لیٹسٹ شاعری کا طریقہ بتائیے

بیچارے سامعین پہ کچھ رحم کھائیے
مطلع کے ساتھ ساتھ ہی مقطع سنائیے

صاحب نے نوکری سے نکالا ہے آپ کو؟
گھر جا کے "میم صاب" کو مکہ لگائیے

جوتے کھلا کے پیار سے کہتے ہیں وہ مجھے
اب زندگی میں جو بھی ہوا بھول جائیے

نعروں سے کچھ ملے گا نہ اُردو زباں کو
شانہ لنگوٹ باندھئے میداں میں آئیے

غزل

منصوبے نئے خدوخال کے ساتھ

آندھرا پردیش کے وسط مدتی منصوبے پر جملہ ۳۹۶۶ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے جبکہ اس کے مقابلہ میں ۷۹-۱۹۷۴ء کی مدت میں پانچویں منصوبے پر ابتداً ۱۵۰۰ کروڑ روپے کا خرچ پیش نظر تھا۔ آندھرا پردیش کمزور طبقات کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کا بالکلیہ تہیہ کر چکا ہے اس لئے ہمارے منصوبوں میں روزگار کے مواقعات کی گنجائش نظر ثانی شدہ اقل ترین ضروریات کے پروگراموں کی عمل آوری اور درج فہرست اقوام۔ درج فہرست قبائل۔ پسماندہ طبقات اور دوسرے علم طبقات کے لئے بہبود کے کاموں پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

چنانچہ اس سمت میں پہلا قدم ۱۳ کروڑ روپے مالیت کی ایک ایسی اسکیم کی تیاری ہے جس کی بدولت پندرہ ہزار سے زائد بیروزگار افراد کے لئے روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے اور علاوہ ازیں ان کو سودمند اور منفعت بخش پیشوں کی تربیت ہمدست ہوگی۔

ہمارے منصوبے روزگار کے
نئے نئے مواقعات فراہم کرتے ہیں۔

ڈی پی آئی آر/ ۵۵

LR.No. 737/ADVT/C4/79 Dt/24.5.79

اعجاز علی ارشد

مرض دو طرح کے ہوتے ہیں ۔ ایک مرض وبائی اور دوسرے مرض آبائی۔ وبائی امراض تو آپ سمجھ گئے ہوں گے ، یعنی یہی ہیضہ ، چیچک اور پلیگ وغیرہ۔ لیکن یہ مرض آبائی کون سی بلا ہے ؟ اسے یوں سمجھیے کہ جس طرح جائیداد ، مکان دولت اور کبھی کبھی نفرت بغض و عداوت پشت در پشت منتقل ہوتی رہتی ہے یا جس طرح بعض نادر اور نایاب نسخے سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہوئے حکیم اجمل خاں سے لے کر موجودہ دور کے کسی حکیم مہمل تک آ پہنچے ہیں ، اسی طرح بعض بیماریاں بھی باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتی رہی ہیں اور ہر نئے دور میں کم ہونے کے بجائے اور زیادہ شدت سے ابھری ہیں گویا ؎ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ایسی ہی بیماریوں میں ایک بیماری عورت پرستی بھی ہے۔ دشواری بس یہ ہے کہ اس سے چھٹکارا پانے کی ظاہراً تو سبھی کوشش کرتے ہیں مگر دل سے خواہش نہیں رکھتے ۔ ایک غالب ہی کو لیجئے ایک طرف تو دو سروں کو لیکچر چھانٹتے ہیں کہ ؎ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا ۔ اور دوسری طرف ایک ستم پیشہ ڈومنی کے عشق میں مبتلا ہو کر یہ نالۂ دل خراش بلند کرتے ہیں :

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

میرؔ کو دیکھئے - ایک طرف تو محبت کی پاکیزگی کا یہ حال ہے کہ ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

اور دوسری طرف یہ حالت ہے کہ ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

صرف یہی نہیں ، بلکہ ؎

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اک اضطراب کی سی ہے

ویسے ہمارے شاعروں کا حال بھی عجیب ہے۔ انہیں خود کسی سے محبت نہ بھی ہو مگر مانگے تانگے کا عشق لگ بیٹھے (؟) روئیں گے ضرور۔ وہ ابھی تک محبوب کی گردِ راہ کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے پر آمادہ ہیں اور یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اگر دھول غلطی سے محبوب کے چہرے پر بھی پڑ جائے تو اس کا سارا میک اپ غارت ہو جاتا ہے۔ رہی بات یہ کہ صرف شاعر ہی اس صورتِ حال سے دوچار نہیں ہیں۔ عورت پرستی کے اس حمام میں سبھی ننگے نظر آتے ہیں۔ اقبال بڑا نبض شناس تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

دراصل عورت روزِ ازل سے ہی مردوں کے دل و دماغ پر چھائی رہی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ دنیا کا پہلا قتل عورت ہی کے سبب ہوا تھا۔ حسن کا جادو بھائی کی محبت پر غالب آگیا تھا اور ہابیل نے قابیل کی جان لے لی تھی۔ تب سے حسن پرستی کا یہ بھوت نازی ڈکٹیٹر ہٹلر سے لے کر پاکستانی ایڈمنسٹریٹر یحییٰ خاں تک سبھوں کے سر پر سوار رہا۔

غالبؔ دن بھر بھلے ہی اونگھتے رہتے ہوں، انھیں رات کے وقت نیند بہت کم آتی تھی۔ دورِ حاضر میں رات کو نیند نہ آنا مہذب ہونے کی علامت ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا۔ گاؤں کا ایک نوجوان شہر کے کسی ہاسٹل میں رہتا تھا۔ ایک بار رات کے تقریباً گیارہ بجے گاؤں سے اس کے والد ملاقات کی غرض سے ہاسٹل پہنچے۔ لڑکے کو جاگتا دیکھ کر انھوں نے پوچھا "کیوں ابھی تک جاگ رہے ہو؟" نیند نہیں آرہی ہے؟" یہ لڑکے کا جواب تھا۔ "کیا روزانہ ہی ایسا ہوتا ہے؟" انھوں نے سوال کیا۔ "پتہ نہیں! روزانہ تو اس وقت میں کلب میں ہوتا ہوں" لڑکے نے کہا۔ بہرحال ایک جدید ترین تحقیق کے مطابق رات کو نیند نہ آنے کا سبب عشق کے علاوہ پیٹ کی گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے پتہ نہیں غالبؔ عشق میں مبتلا تھے یا معدے کی خرابی میں۔ ویسے یہ عشق بھی عجیب بلا ہے۔ اردو شاعری ہو یا ہندی کویتا ہر جگہ محبت کی داستان بکھری نظر آتی ہے۔ مزا تو یہ ہے کہ ہمارے آبا و اجداد جس محبوب کے عشق میں مبتلا تھے۔ ہمارے لڑکے بھی اسی کے پیار میں دیوانے ہو رہے ہیں۔ ہماری شاعری دو سو سال پرانی ہوگئی مگر معشوق کے انداز نہیں بدلے۔ وہی گلابی ہونٹوں اور شرابی آنکھوں والی حسینہ جو میرؔ کے خوابوں میں آتی تھی، فراقؔ کو بھی پریشان کرتی ہے۔ پہلے عشق ہو جاتا تھا، اب کیا جاتا ہے اور جو نہیں کرتا اسے بے وقوف سمجھا جاتا ہے بلکہ بلندیِ کردار کی معراج اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ شادی سے پہلے کم از کم ڈیڑھ درجن عشق کرلیے جائیں۔ پریس ایشیا انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ کے مطابق ملک کے اسّی فیصد لڑکے لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ساٹھ فیصد کو اظہارِ حال کا موقع مل بھی جاتا ہے۔ البتہ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آخرکار کامیابی کتنوں کو ملتی ہے اور سینڈل کتنے فیصد کو نصیب ہوتے ہیں۔؟ افسوس صرف یہ ہے کہ سینڈل کھانے کے بعد بھی یہ مردِ میدان یہ نہیں سوچتے کہ محبت کھیتوں کی ہریالی، کلیوں کی خوب صورتی، پھولوں کی شگفتگی، اور بچوں کی معصومیت سے بھی تو کی جاسکتی ہے۔ صرف عورت ہی کیوں؟ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ کسی کالج کے ایک خاص شعبہ میں لڑکوں کی تعداد صرف اس لیے دوگنی ہوگئی چونکہ وہاں ایک لیڈی لکچرر کی بحالی ہوگئی تھی۔

بات مردوں اور عورتوں کی ہو رہی ہے تو آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ مردوں اور عورتوں کی مختلف قسمیں

ں۔ ایک عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ ایک وہ ہوتی ہے جس سے
ں کے شوہر کے علاوہ ہر مرد خوش رہتا ہے۔ زیادہ تر مرد ایسے ہوتے ہیں جنہیں اپنی بیوی کے علاوہ دنیا کی ہر عورت خوبصورت
ظر آتی ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جنہیں اپنی بیوی سب سے حسین نظر آتی ہے (ویسے اس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی وجہ ضرور
ہوتی ہے)۔ کچھ "قلمی عورتیں" ہوتی ہیں جو کوئلہ بیچنے والے کے دماغ میں بھی بسی رہتی ہیں اور کتابیں لکھنے والوں کے دل میں
بھی ڈیرہ ڈالے رہتی ہیں۔ جنہیں سپاہی بھی پسند کرتا ہے اور چور بھی۔ شاگرد بھی اور استاد بھی۔ میرے خیال سے تو
ہ قومی یک جہتی کا بہترین نشان ہیں۔ کچھ قلمی عورتیں ہوتی ہیں جو کتابوں اور رسالوں میں لکھتی لکھاتی ہیں۔ بلکہ لکھتی
نہیں لکھواتی زیادہ ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھے خاصے ادیب اور شاعر فرضی عورتوں کے نام سے مضامین لکھ کر
ن کے نادیدہ عاشقوں سے تحفے بٹورتے ہیں، چونکہ ویسے تو کچھ ملنے سے رہا!

بہر حال، عورت جیسی بھی ہو اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پینا ما بلیڈ اور ہمپنگ سیٹ کا اشتہار ہو یا اخبار
رسائل کا سر ورق ہر جگہ عورت ہی عورت نظر آتی ہے۔ ہمارے نوجوان بھی دن بدن لڑکیوں کی وضع قطع اختیار کرتے جا رہے
ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے لندن ٹائمز میں پڑھا ہوا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک لڑکی کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس پر الزام یہ
تھا کہ وہ شہر کی مختلف سڑکوں پر ایک گھنٹہ تک مادر زاد برہنہ گھومتی رہی تھی۔ جج نے تمام واقعات سننے کے بعد اس سے
سوال کیا "کیا تم میں ذرہ برابر بھی شرم و حیا باقی نہیں رہی ہے" لڑکی نے فوراً جواب دیا "شرم آئے بھی تو کس سے؟ کوئی مرد
تو شکل دکھائی تو دے"

بات طویل ہو گئی لیکن چند اہم باتیں ابھی باقی ہیں۔ اول تو یہ کہ اکثر مردوں کے اعصاب پر جو عورت سوار ہو گئی
ہے وہ اس کی بیوی نہیں ہوتی۔ بیوی کے علاوہ اور کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے ایک کمپنی کے خرچ پر پیرس جانے کا پروگرام
بنانے والے چند ملازموں نے اپنا سفر یہ سنتے ہی ملتوی کر دیا تھا کہ انہیں اپنی بیویوں کو بھی اپنے ساتھ لے جانا ہوگا اور کمپنی کی
طرف سے واپسی ٹکٹ براہ راست بیویوں کو روانہ کئے جائیں گے۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ مردوں کے اعصاب پر
عورتوں کے قبضہ کرنے میں صرف مردوں کا قصور ہے یا عورتوں کا بھی۔ میں نے اکثر یہ سوچا ہے کہ جب ڈوپٹہ صرف گلے کا
زین جائے اور بلاؤز کی تنگی اور گریبان کی وسعت کے سبب حسن کی شراب جسم کے پیمانے سے چھلکتی نظر آئے تو مرد
بے چارہ کب تک اپنا ایمان بچا سکتا ہے؟ ایک بار برطانیہ کے ایوانِ وزارت میں تقریر کرتے ہوئے ایک حسین خاتون
ممبر نے کہا "دنیا کے سارے مرد پاگل ہوتے ہیں" چرچل فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔
"لیکن مادام! انہیں پاگل بنایا کس نے ہے؟"

۵۵

جب لاد چلے گا بنجارہ

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ
کیا سادھو سنت فقیر میاں، کیا اگھڑ پنڈت اور مُلّا
کیا کلّو جمّن دھوبن کا، کیا بمبئی کا سیٹھ عبداللہ
کیا لڈو پیڑا کانتی کا، کیا کلکتے کا رس گُلہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کیا ململ ادھی ڈھاکے کا، کیا ٹیرلین ٹیرین جاپانی
کیا چنری لال بنارس کی، کیا جیکٹ مُندر افغانی
کیا کھادی ریشم اور تسر، کیا لنگی صدری ایرانی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کیا مُلّٹ جاوا اور انفیلڈ کیا لمبریٹا کیا ویسپا ہے
کیا کار فیٹ کیا اسٹنڈرڈ، کیا ای لینڈ ہے کیا ٹاٹا ہے
کیا بوئنگ ہے کیا راکٹ ہے، کیا جیٹ اپولو گیارہ ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

وہ بال دِلیپ کٹ مونچھ کمان، وہ ڈریں پاجامہ کیا کہنا
وہ ڈاگ ٹیل وہ بیل بٹم، وہ ذوق غرارہ کیا کہنا
اس "کٹ" کی دوڑ میں ناک کٹے تو کچھ نہ پروا کیا کہنا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

آگے پیچھے لشکر شاہی یہ راج بھون کی شان میاں
سب یہی جگت میں دیکھ چکے، فرعون کے آن وبان میاں
دھرتی پہ مورکھ بوجھ نہ بن، اتنا نہ سینہ تان میاں
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نانی پوتا، بیٹی بیٹا، دھرتی کا مایا جال ہے سُن
سونا چاندی گھوڑا ہاتھی، ہر ایک حسین جنجال ہے سُن
دھنوان بڑا بلوان بڑا، پل بھر میں جب کنگال ہے سُن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

یہ جگ کی ریت پرانی ہے، جو آوت ہے سو جاوت ہے
اس جگ کی کھیتی کے سب پھل، اس جگ میں ہی مل پاوت ہے
جو بیٹھ گیا دھیرج تج کے، وہ انت سمے پچھتاوت ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

دھن دولت مورکھ کس کا ہے، دھن دولت پہ اتراوت ہے
دو چار دنوں کا جیون ہے، کیوں بات بڑی بتیاوت ہے
بلوان بھیو کس کے بل پر کیوں جھوٹی شان بگھارت ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

پاپی من کے سمجھاوَن کو، کیوں چنتا سے ہلکان بھیو
دمڑی دمڑی پہ جان دیو، کوڑی کوڑی دھنوان بھیو
دھن دھنیو دھرتی چھوڑ گیو، جس کے چلتے شیطان بھیو
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نعیم حمیدی
دھنباد

خلیل اکمل

صاحب کو دگے کے پاؤں کی نہاری بنانے کے لیے آپ کو پریشر کوکر خریدنا ہی ہوگا۔" احمد نے کلک سے کہا "میاں تمہاری
...ا کا پریشر ہماری جیب پر ویسے بھی بہت ہے۔ ۔ایک کلک کے ہوتے
...ے پریشر کوکر کی کیا ضرورت ؟ تمہاری اس فرمائش پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔" کہتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا۔"
...ی جمال الدین نامی باغ عام کے ایک منتظم تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ڈرائیور نے ان سے ایک اسکروڈرائیور خریدنے
خواہش ظاہر کی۔ اس پر انھوں نے برہم ہوکر کہا۔" ڈرائیور بھی رکھوں اور اسکروڈرائیور بھی خریدوں یہ نہیں ہوسکتا۔"

احمد ایک کلرک ہی سہی۔ آخر ایک کلرک بھی تو انسان ہوتا ہے۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ جدید آسائش زندگی سے استفادہ
...ے لیکن اپنی معاشی پستی کے سبب وہ ہمیشہ ان چیزوں کے تاریک پہلوؤں پر نظر ڈالکر اپنی خواہش کو دبا دیا کرتا تھا۔ آخر کا
...سانے اپنی حسب استطاعت پریشر کوکر خریدنے کا فیصلہ کرلیا۔ جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ تصور کیا جاسکتا ہے
...ے دن اس نے بغرض خریدی ڈیلر سے ایک اچھا سا کوکر دکھانے کے لیے کہا۔ ڈیلر نے کوکر دکھانے سے قبل احمد سے پوچھا
جناب آپ کے کتنے بچے ہیں ؟" کیا بیوی کہیں ملازم ہے"۔ آپ پکوان کے لئے گیاس استعمال کرتے ہیں یا لکڑی ؟ احمد نے
...ن تمام سوالات کا بڑے صبر و تحمل سے جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے ڈیلر سے کہا۔ جناب اب آپ چند اور سوالات کرنا بھول
...یئے۔ جیسے آپ کھاتے وقت قبلہ رخ ہوتے ہیں یا نہیں ؟ لکڑی سا گوان کی استعمال کرتے ہیں یا دوو صیا کی ؟ کہیں آپ کا بڑا
...یشر تو نہیں ہے ؟ احمد نے جھلاکر کہا مگر ہم کو تو کوکر میں بکرے پکانا ہیں گے۔ ڈیلر نے کہا جناب آپ خفا کیوں ہوتے ہیں
...یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنی فیملی کی ضرورت کے مطابق کوکر مہیا کروں۔ احمد نے پھر کہا فیملی یعنی بکرے کے لیے چاہیئے۔"

احمد کوکر خرید کر گھر لے آیا۔ اس کی بیوی تو بہت خوش ہوی لیکن اس کی دادی ماں بہت ناراض ہوی۔ کہنے لگی۔
... داتی برتنوں سے پکوان کے ذائقہ کی بات اور ہی ہے۔" لیکن احمد کی بیوی اور بہن نے کہا کہ کوکر کے استعمال سے وقت کے
...ساتھ ساتھ ایندھن کی بھی بچت ہوتی ہے۔ غرض تھوڑی دیر تک خوب گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ ایک

ہی گھر سے دو امیدوار دو الگ پارٹیوں سے الکشن لڑ رہے ہوں اور ہر امیدوار اپنی پارٹی کی تعریف میں راگ الاپ رہا ہو۔ آخر کار جب ہر ایک کی قوتِ گویائی جواب دے چکی تو دادی ماں نے پھر تازہ دم ہونے کی نیت سے کہا "بہو ایک پیالی چائے تو بنا لاؤ" احمد نے موقع کی نزاکت سمجھ کر اپنی بیوی کو اشارہ سے چائے بنانے سے باز رکھا۔ اب مسئلہ کوکر کی افتتاحی تقریب کا درپیش تھا۔ کسی نے مرغ مسلم بنانے کو کہا تو کسی نے نہاری کی فرمائش کی۔ مرغ کے نام سے احمد نڈھال ہو گیا۔ کیونکہ کوکر کی خریدی سے وہ ادھ مرا ہو چکا تھا۔ پھر مرغ مسلم کی فرمائش پوری کرنے کی سکت کہاں تھی؟ احمد نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ آج کل مرغ کے استعمال سے ہارٹ اٹاک اور بلڈ پریشر جیسی مہلک بیماریاں لاحق ہونے کا امکان ہے۔ بھلا اپنی جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ ہارٹ اٹاک کے نام سے تمام نے چپ سادھ لی۔ آخر احمد نے نہاری کی تجویز کو متفقہ طور پر منظور کروا ہی لیا۔

ایک تعطیل کے دن خاص دوست احباب اور قریبی رشتہ داروں کو اس افتتاحی تقریب میں مدعو کیا گیا۔ پائے کی خریدی کے لیے مارکٹ سروے کر کے کم سے کم ٹینڈر دینے والے قصاب کو آرڈر دیا گیا۔ اس دوران احمد نے کوکر کے طریقہ استعمال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا بلکہ حفظ بھی کر لیا۔ اس نے طریقہ کے مطابق کوکر میں پاؤں کے ساتھ پانی کی مقررہ مقدار ڈال کر چولھے پر رکھ دیا۔ اب تمام مہمان کوکر کی سیٹی کے منتظر تھے۔ جو نہاری تیار کرنے کا انتظار کرتی ہے۔ عموماً اس سیٹی کے لیے ۲۰ تا ۲۵ منٹ درکار ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک گھنٹہ کے انتظار کے بعد بھی سیٹی کے امکانات موہوم ہو چکے تو احمد نے کوکر کا معائنہ کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ربر کا حلقہ جو کوکر کے ڈھکن میں بھاپ کو لیک کرنے سے روکتا ہے۔ فٹ نہیں کیا گیا۔ فوراً اس نے حلقہ کو فکس کر کے کوکر کو پھر چولھے پر رکھ دیا۔ اس دفعہ سیٹی کی آواز سننے کے لیے گھر میں سناٹا طاری کیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نحیف سیٹی کی آواز سنائی دی۔ جس سے تمام مہمانوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ سیٹی قریب کے ریلوے اسٹیشن سے گزرنے والے ایک ریل کے انجن کی تھی۔ احمد عالم پریشانی میں جوں ہی کوکر کی طرف بڑھا۔ کوکر سے ایک زوردار آواز آئی۔ اس آواز کے ساتھ ہی احمد کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ اس چیخ کو مہمانوں نے باجماعت ادا کی۔ احمد کے ہاتھوں میں رعشہ اور پاؤں میں تھرتھراہٹ تھی۔ وہ کوکر سے بالکل ناامید سا ہو گیا۔ اُن کی دادی ماں کو تو بس موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے کارروائی ہاتھ پہ لی اور کوکر کی ہجو سنانے لگیں۔ اس دھماکہ کی وجہ احمد کی سمجھ سے باہر تھی۔ اب اس میں کوکر کے قریب جانے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے دوستوں کی ہمت پر کوکر کا جائزہ لیا۔ دھماکہ کی وجہ یہ معلوم ہوی کہ جو پانی کوکر میں بھاپ بنانے کے لیے ڈالا گیا تھا وہ کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے بھاپ کی غیر موجودگی میں کوکر کا "سیفٹی والو" دھماکہ سے پھٹ پڑا۔ احمد نے ایک دوسرا والو فٹ کر کے پانی کی مقررہ مقدار ڈال دی۔ جونہی اس نے کوکر کو چولھے پر رکھا۔ تمام بچے اور بڑے ایک محفوظ مقام پر پناہ لینے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ہوائی حملہ ہونے والا تھا۔ اس بار احمد بہت مطمئن تھا کہ کسی بھی غلطی کا امکان نہیں تھا وہ اطمینان کا سانس لینے دوسرے کمرے میں گیا ہی تھا کہ کوکر میں ڈالا ہوا پانی فوارہ کی شکل میں خارج ہونا شروع ہوا۔ جیسا کہ پلیٹ فارم پر بہت دیر سے ٹھیرا ہوا ریل کا انجن پریشر کو کم کرنے کے لیے بھاپ خارج کرتا ہے۔ اب احمد کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ وہ کسی بھی طرح اس کوکر سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ تمام مہمان نہاری سے ناامید ہو کر یکے بعد دیگرے کھسکنا شروع ہوئے۔ اب احمد نے تہیہ کر لیا کہ وہ نہاری پکا کر ہی دم لے گا۔ اس نے

ایک دوست کی کراش ہلمٹ پہن لی اور ایک موٹا سا کوٹ زیب تن کر کے ایک لمبا سا چمٹا لے کر کوکر کی طرف جانے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک خلا باز چاند کی سطح پر بڑی احتیاط سے چہل قدمی کر رہا ہو۔ اسی دوران مسز کھنہ جو احمد کی پڑوس میں رہتی تھیں۔ دھماکہ کی آواز سن کر تشریف لائیں۔ ان کو کوکر کا تمام قصہ سنایا گیا۔ جس پر وہ بہت ہنسیں اور نہاری بنانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ انھوں نے پانی کے اس طرح خارج ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ جو وزن کوکر کے ڈھکن پر بھاپ کے دباؤ کو کنٹرول کرنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ وہ برابر فٹ نہیں ہوا تھا اور وہ بھاپ کے دباؤ سے کہیں گر گیا اور پانی پوری قوت سے کوکر خارج ہونا شروع ہوا۔ مسز کھنہ نے نہاری تیار کر کے بچے کچے مہمانوں کی تواضع کی احمد نے مسز کھنہ کی پریشر کوکر استعمال کرنے کی مہارت سے متاثر ہو کر پوچھا "آپ کے پاس کتنے پریشر کوکر ہیں۔ وہ بولیں۔ نا بابا! ہمارے پاس پریشر کوکر کے مالکان کی فہرست ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پریشر کوکر دے کر چلی گئیں اور صرف اتنا کہا " اگر کبھی ضرورت پڑے تو منگوا لینا"۔ ■

ایک سماجی و معاشی پروگرام

بے گھروں کے لئے مکانات کی فراہمی کا پروگرام ایک سماجی و معاشی پروگرام ہے جو آندھرا پردیش کے واسطے عظیم اہمیت کا حامل ہے۔ حالیہ زمانہ میں اس پروگرام کو خاصہ بڑھاوا ملا ہے۔

آندھرا پردیش اب تک تقریباً ۱۱ لاکھ رہائشی جگہیں تقسیم کی گئی ہیں جن میں لگ بھگ نصف تعداد میں پسماندہ طبقات کو ملی ہیں۔

جن لوگوں کو رہائشی جگہیں تفویض کی گئی ہیں ان کو مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں مدد کرنے کے لئے ایک حوصلہ افزا، تعمیر امکنہ کا پروگرام آغاز کیا گیا ہے۔

دیہی و شہری علاقوں میں مستقل نوعیت کے مکانات کی تعمیر کے پروگراموں سے تقریباً ایک لاکھ خاندانوں کو فائدہ پہنچے گا اور ان پروگراموں کو ادارہ جاتی قرض کی امداد حاصل رہے گی۔

بے گھروں کے لئے
مکانات کی فراہمی کا پروگرام تیزی سے جاری ہے۔

ڈی۔ کے۔ کنول

ملیریا

فرض کیجئے برسات کا مہینہ جون یا جولائی کا ہو۔ برسات اپنے شباب پر ہو۔ ملیریا نے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے سارے شہر پر حملہ کر دیا ہو، کیا شاعر، کیا ادیب، کیا معشوق اور کیا عاشق، کیا حلوائی اور کیا نان بائی، مبتلائے بخار ہوں تو ایسے میں اگر شہر کے کسی کونے کھدرے سے آپ کو یہ آواز سنائی دے کہ شہر واسیو! میری طرف دیکھو۔ میں کتنا شگفتہ اور شاداب نظر آ رہا ہوں۔ اس شہر میں دندناتے ہوئے لاکھوں کروڑوں مچھر میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ مجھے کسی طور بھی خائف نہیں کر سکتے کیونکہ میں...... پر یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں کوئی ما فوق الفطرت مخلوق ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح گوشت و پوست کا انسان ہوں مگر ہم لوگوں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ تم لوگ ملیریا کے بخار سے دبنگ پڑے ہو اور میں عشق کے بخار میں مبتلا ہوں۔

تو ہاں صاحب لگے ہاتھوں میں آپ کو یہ بتا تا چلوں کہ مجھ پر عشق کے جراثیم حملہ آور ہوئے کیسے ۔ ہوا یوں صاحب کہ میں سکھا رام دندان ساز کے کلینک کی شہرت سُن کر ایک بار اس کے پاس چلا گیا۔ شاید ان دنوں کسی پاگل کتے نے کاٹا تھا یا ہو سکتا ہے کہ میں نے کسی پاگل کتے کو کاٹا ہو۔ (حافظہ ذرا کمزور ہو چکا ہے)

سکھا رام دندان ساز، دانت بنوانے میں نہیں بلکہ دانت توڑنے میں ماہر تھا۔ غالباً اس کی شہرت کے اصل محرکات یہی تھے۔ سکھا رام دندان ساز نے ایک ہی جھٹکے میں میری بتیسی باہر نکال کر مجھے شہر کے معتبر اور معزز شہریوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔

شاید میں نے کافی مبالغے سے کام لیا ہے۔ کیا کروں میرا حافظہ بہت کمزور ہو چکا ہے۔ دراصل دانت بنوانے نہیں بلکہ سکھا رام دندان ساز کی اکلوتی بیٹی پھول رانی سے آنکھ لڑانے گیا تھا۔ اور آنکھ لڑانے کے جرم میں میں نے اپنے بتیس دانتوں سے ہاتھ دھو لیا تھا۔ اگر اس آڑے وقت میں پھول رانی میری مدد کو نہ آتی تو اغلب تھا کہ سکھا رام دندان ساز میرا منہ بھی بگاڑ کر رکھ دیتا۔

بہرحال مجھے اپنے دانتوں کی جدائی کا کوئی افسوس نہ تھا۔ محبوب کے دل کی چوٹی کو سر کرنے کے لیے تو بڑے بڑے معرکے سر کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے تو اپنے بتیس دانت ہی کھو دیئے تھے۔

بعد میں جب سکھا رام کو اصل سبب کا علم ہوا تو اسے بڑا افسوس ہوا۔ اس نے فوراً مجھے اپنے کلنک میں طلب کیا اور میرے منہ میں مصنوعی بتیسی فٹ کر کے مجھے پھر سے جوان بنا دیا۔ اسی شام سکھا رام دندان ساز مجھے پکڑ کر مندر میں لے گیا اور پنڈت کے سامنے مجھے پیش کر کے بولا۔

"یہ لو پنڈت۔ یہ رہا میرا داماد۔ اب کرلو اس کا بیڑا پار ——— !

پنڈت نے چند منتر پڑھ کر سچ مچ میرا بیڑا پار کرلیا۔ یعنی میری اور پھول رانی کی شادی کردی۔ پھول رانی کوئی نازک سی کلی نہیں بلکہ گوبھی کے پھول کی طرح تھی۔ اور اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے اپنی عینک کے شیشے بدلوا دیئے ——— وہ بھی سات پھیرے لینے کے بعد

پھول رانی پر فلمی ہیروئن بننے کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی ہیما مالینی کی طرح مٹک مٹک کر چلنے لگتی تو مجھے لگتا تھا جیسے زبردست بھونچال آگیا ہو جس سے میرے مکان کی بنیادیں تک ہل گئی ہوں۔

پھول رانی کو سمجھانا یا ڈانٹنا چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا ——— اس لیے میں قہر درویش برجانِ درویش کے مصداق اپنے آپ ہی پر میں غصہ نکال دیتا تھا۔

ہائے کتنے رنگین اور کتنے حسین تھے وہ دن جب میں نے پھول رانی سے آنکھ لڑائی تھی ——— مجھے کیا معلوم تھا ہزار آفتیں ہیں ایک دل لگانے میں۔

شاید خدا نے میری سن لی۔ مہینہ جون، جولائی کا تھا۔ برسات اپنے شباب پر تھا۔ ملیریا نے بغیر کسی اطلاع کے شہر پر حملہ کر دیا تھا۔ پھول رانی بھی ملیریا کے چھپیٹے میں آگئی۔ دس دن کے بخار نے سارے کس بل نکال دیئے اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ فلمی بھوت سر سے اتر گیا اور وہ ایک پتی ورتا استری کی طرح پہلی بار میری طرف دیکھ کر شرما گئی اس ادائے محبوب سے میں رشتہ خطمی ہو گیا۔

اس روز پہلی بار میرے منہ سے ملیریا کے حق میں کلمۂ تحسین نکل گیا۔

OO

شبیر شمشیری

مشاعرہ کی کنوینری

آپ نے مشاعرہ کے کنوینر کو دیکھا ہوگا یا کبھی آپ کی زندگی میں ایسا حادثہ پیش آیا ہوگا کہ آپ خود کسی مشاعرہ کے کنوینر ہوں ۔ آپ کو اندازہ ہوگا کنوینر ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ بات تو قابل فخر ہے کہ آپ کنوینر ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں آپ کی عزت ہے۔ آپ بھی فخر سے پھولے نہ سماتے ہیں۔ ہر جگہ آپ کنوینر صاحب کہلاتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ آپ کی چال میں اترآہٹ ہوتی ہے۔ آپ لیٹر پیڈ اور وزیٹنگ کارڈ چھپواتے ہیں جس میں بہت سے فخریہ انداز سے اپنے نام کے نیچے "کنوینر آل انڈیا مشاعرہ" چھپواتے ہیں۔

کنوینر بننے پر چھوٹے بڑے سبھی ہوٹلوں کا مزہ مل جاتا ہے۔ کبھی کباب چل رہا ہے تو کبھی کوکاکولا۔ کہیں مرغ چل رہا ہے تو کہیں کافی۔ رکشہ اور ٹمپو سے نیچے کی بات ذہن میں آتی ہی نہیں ہے۔ سگریٹ بھی اول درجہ کا جیب میں رہتا ہے۔ مانا کہ کچھ پریشانیاں بھی رہتی ہیں لیکن ان تمام چیزوں کے بعد پریشانیوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

جب آپ کنوینر ہوں گے تو ہمیشہ کچھ لوگ آپ کے پیچھے چلیں گے۔ آپ کو بھی فخر ہوتا ہے کہ میرے پیچھے فوج ہے اور ان کو بھی خوشی ہوتی ہے کہ ہم کنوینر کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ راستے میں کسی دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں " کیا کہوں کافی مشغول ہوں بالکل فرصت نہیں ملتی۔ آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ جس کی ذمہ داری ہم لوگوں کے سر بھی ہے۔ کچھ چندے کے سلسلہ میں گھوم رہا ہوں تاکہ شاندار پروگرام کر سکوں اور ان سے ملیے یہ جناب کنوینر صاحب ہیں " کنوینر کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ پھر کنوینر صاحب کہتے ہیں " بھائی جلدی چلیئے وقت بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ۔ ابھی جسٹس فلاں سے ملنا ہے اور گورنر کو بھی وقت دیا ہے۔

بڑے بڑے شعرا سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر شاعر سے زادراہ کی رقم پوچھی جاتی ہے۔ پھر ان کا جواب آتا ہے اور اپنے بجٹ کے مطابق شعراء کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ اس درمیان میں اگر کسی شاعر

خط وکتابت میں نوک جھونک ۔ ہو گئی تو پیسے ... شاعر کی ۔ وزی ... اور اس کو بلایا نہیں جاتا ہے ۔ آپ کنوینیر ہیں اس لیے آپ کو پورا حق ہے جس شاعر کو چاہیں بلائیں ۔ اگر زیادہ رقم ہضم کرنے کی خواہش ہوتی ہے تو کم پیسے والے شاعر کو بلا دیا ۔ اب محفل میں ہوٹنگ ہو یا پڑھنے ہی نہ دیا جائے ۔ یہ سب شاعر کی قسمت پر ہے ۔ کبھی ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ پرانا لطیفہ سننے کا موقع ملتا ہے ۔ آپ بھی سن لیجیے ۔" سامعین میں کچھ لوگوں کے پاس ڈنڈا دیکھا گیا ۔ ان سے پوچھا گیا کہ بھائی مشاعرہ میں ڈنڈا کی کیا ضرورت پڑ گئی تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ آپ شاعر ہیں اور مہمان بھی ہیں ۔ آپ جتنا چاہیں ہمیں بور کر سکتے ہیں ۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ۔ مگر میں تو کنوینیر کو تلاش کر رہا ہوں تاکہ پوچھوں کہ ان سے ایسی غلطی کیوں ہو گئی ۔"

گویا کنوینیر صاحب کی بری گت بنتی ہے اور کافی گالیاں سننے کا موقع ملتا ہے ۔ مگر کنوینیر اتنا بے حس ہو جاتا ہے کہ غالب کی طرح "گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا" والی مثال بن کے رہ جاتا ہے ۔ وہ یہ سب برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے کہ چلو کنوینیر بننے سے ایسا ہوتا ہی ہے مگر روپیہ تو بچ گیا ۔

اگر مشاعرہ کے بعد لوگوں نے زیادہ ضد کی کہ مشاعرہ کا اکاؤنٹ دیا جائے تو آمدنی کم اور خرچ زیادہ دکھلا دیا تاکہ پھر لوگوں کی آواز اس سلسلے میں نہ اٹھ سکے اور ہم چین و سکون کے ساتھ رہ سکیں ۔ مگر کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ مشاعرہ کے بعد بھی چین و سکون نہیں ملتا اور زندگی عذاب میں پڑ جاتی ہے ۔ گناہ ایک بار کیا کہ مشاعرہ کے کنوینیر بنے اور عذاب زندگی بھر کا لیا ۔ ہر طرف سے فقرے کسے جا رہے ہیں ۔ کبھی بیٹھ پیچھے اور کبھی سامنے بھی گالیاں دی جا رہی ہیں ۔

بعض اوقات مشاعروں کے پیشہ ور کنوینیر مسلسل دو تین بار حساب نہ دینے کی علت میں معطل کر دیے جاتے ہیں ۔ چونکہ مشاعروں کے برپا کرنے کا تجربہ انھیں ہوتا ہے اس لیے صدر استقبالیہ یا سرپرست بن کر کنوینیری کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں چاہے گالیوں سے دھمکیوں اور پھر مار پیٹ کی حد تک نوبت کیوں نہ آئے ۔ ہر اردو کے شہر میں ایسی دو شخصیتیں ضرور مل جائیں گی ۔ بعض مشاعروں کے منتظمین ایک بدھو قسم کے شخص کو کنوینیری کے لیے ڈھونڈھ لیتے ہیں اور اس کے نام سے ہر وہ قابلِ اعتراض حرکت کر جاتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ! ایسے لوگوں کے آگے پیشہ ور کنوینیر بھی شرما جاتے ہیں !

□□

شگوفے

ایک خوبصورت عورت سے کسی پارٹی میں اس کی ایک نئی سہیلی نے باتوں باتوں میں اس کے لاکٹ کی تعریف کی تو عورت بولی
"جی ہاں — یہ سلیم ہیرا ہے — دنیا کے مشہور ہیروں میں سے ایک —
نئی سہیلی کہنے لگی "سُنا ہے ہیروں کے ساتھ کوئی بڑی نحوست بھی وابستہ ہوتی ہے۔ کیا اس ہیرے کے ساتھ بھی کوئی نحوست لگی ہوئی ہے؟
"جی ہاں۔ بوڑھے سلیم صاحب"

استاد نے کلاس میں پوچھا
"بچو! کسی نے ہاتھی کا گوشت کھایا ہے؟"
ایک بچے نے ہاتھ اٹھا دیا۔ استاد نے کہا
"خوب! بتاؤ اس کی ہڈیوں کا کیا کرتے ہیں؟"
بچے نے فوراً کھڑے ہوکر جواب دیا "جی! وہ ایک خالی پلیٹ میں ڈالتے جاتے ہیں۔

جج نے چوری کے جرم میں گرفتار ملزم سے دریافت کیا
"تمہارا وکیل کہاں ہے؟"
ملزم :- "حضور والا! وکیلوں کو معلوم ہوا کہ میں نے کوئی چیز نہیں چرائی ہے تو کوئی وکیل میری پیروی کرنے کے لئے تیار نہ ہوا"

★

گھر کے اندر دو آدمی جھگڑ رہے تھے اور باہر ایک گدھا دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ ایک بیل اِدھر سے گذرا تو اس نے گدھے سے پوچھا کہ وہ یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے
گدھے نے جواب دیا "اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا ہوں کہ وہ باہر نکلے تو اُسے ساتھ گھر لے جاؤں"
"تیرا بیٹا!" بیل نے حیرت سے کہا "وہ اندر کیا کر رہا ہے؟"
گدھا بولا "یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ دونوں آدمیوں نے لڑتے لڑتے ایک دوسرے کو گدھے کا بچہ کہا ہے"

چھوٹے کسانوں کے لئے بڑے پیمانے پر امداد

اسمال فارمرس ترقیاتی ایجنسیوں نے جو آندھرا پردیش میں گذشتہ پانچ چھ سال سے سرگرم عمل ہیں۔ تقریباً ۳۱ کروڑ روپیوں کا ادارہ جاتی قرضہ فراہم کر کے قریب قریب ۳۰ لاکھ چھوٹے اور مارجینل کسانوں کو فائدہ پہونچایا ہے۔

یہ ایجنسیاں چھوٹے اور مارجینل کسانوں کو خصوصاً کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے کسانوں کی تیز رفتار ترقی کی مدد و معاون کی حیثیت سے بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

مشترکہ دیہی ترقیاتی پروگرام جو آندھرا پردیش میں (۱۷۴) بلاکوں پر محیط ہے شناخت کردہ خاندانوں کی اس وقت تک امداد جاری رکھے گا جب تک کہ خود کفالت کی سطح تک نہ پہونچ جائیں۔

چھوٹے کسان
ہماری زرعی معیشت کے فروغ میں
ایک عظیم کردار ادا کرتے ہیں۔

صبیحہ شاہ

افسانہ لکھئے

لوگ سمجھتے ہیں کہ افسانہ لکھنا بڑا مشکل کام ہے مگر جناب! ہمارا خیال ذرا مختلف ہے ذرا کیا، بالکل ہی مختلف ہے، کیونکہ ملک کے تمام کونوں سے شائع ہونے والے خواتین کے پرچوں کے وسیع و عمیق مطالعہ کے بعد ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آپ ... ہم ... ہم میں سے ہر وہ فرد جو دل میں یہ تڑپ لئے جئے جا رہا ہے کہ ہائے کاش ایک آدھ افسانہ ہی لکھ سکتے۔ لکھ کر کہیں شائع کرا سکتے ... تو ایسا ضرور ہو سکتا ہے۔

اسی خیال سے ہم نے سوچا کہ زندگی کی شمع کا کیا بھروسا۔ اب گل ہوئی تب گل ہوئی ... تو اس جہانِ فانی سے کوچ کرنے سے پہلے کیوں نہ اپنے زرّیں خیالات، تجربات رقم کرتے جائیں کہ کیا عجب کہ ہمارے مشوروں، تجربات و خیالات کی روشنی میں کوئی خدا کا بندہ یا بندی کوئی ایسا افسانہ لکھ مارے جو دنیائے افسانہ میں تہلکہ مچا دے۔

تو اے دنیائے افسانہ نگاری میں ہلچل مچا دینے کے خواہشمندانِ کرام! آیئے ـ اور افسانہ لکھنے کا نسخہ فرما فرمالیجئے سب سے پہلے تو ایسا کیجئے کاغذوں کا ایک دستہ کہیں سے حاصل کیجئے اور گھر کے سب سے بہترین قلم میں کسی بھی رنگ کی روشنائی بھر لیجئے اور جب سارا عالم محوِ خواب ہو جائے، ستارے جھلملانے لگیں۔ چاند کسی درخت کی شاخوں میں اُلجھنے لگے اور گلی کے کتّے گریہ وزاری کرنے لگیں تو قلم ہاتھ میں لے کر میز کرسی پہ ڈٹ جایئے یا بستر پہ اوندھے جا یئے اور ... ا ... ہ ... ے ... مگر ٹھہریئے ... سُنئے! اگر آپ خاتون ہیں تب تو خیر ... کیونکہ اس صورت میں آپ کو زیورات، ملبوسات اور لذیذ و جدید کھانوں کے متعلق پُر مغز معلومات تو حاصل ہوں گی ہی لیکن اگر آپ مرد ہیں، تب افسانہ لکھنے کے لئے قلم کا کیپ اتارنے سے قبل آپ کو مندرجہ بالا تینوں شعبوں، یعنی زیورات، ملبوسات اور لذیذ و جدید کھانوں کے بارے میں تمام تر تفصیلات ازبر ہونی چاہئیں اور اگر مرد حضرات دنیائے افسانہ میں وارد ہونے سے قبل اپنا نام سمیع الرحمٰن کے بجائے ثمینہ رحمٰن، جمیل الدین کے بجائے جمیلہ نورین، رفیع احمد کے بجائے رفیعہ ناز رکھ لیں تو کیا ہی کہنے ... نہ ڈھیروں ڈھیر آپ کے نام توصیفی خطوط نے اخبار یا رسالے کے پوسٹ بکس پہ دھاوا بولا ہو تو صبیحہ شاہ نام نہیں میرا .... ہاں تو اب لکھنا شروع کر دیجئے۔

کیا؟ ارے کچھ بھی لکھئے بھئی ... جو دل میں آئے لکھ مارئیے دراصل یہ دور جو ہے ناں تجریدیت کا دور ہے۔ جب ہی تو تجریدیت ادب وفن کے دیگر میدانوں کے علاوہ اب افسانوں میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ آج فنکاروں، قلمکاروں نے ثابت کر دیا ہے کہ کچھ لکھنے، کچھ کہنے، کچھ بتانے کے لئے خیال، پلاٹ، کا ہونا ضروری نہیں، بس لکھتے جاؤ، لکھتے جاؤ...
اور پھر ایک لفافے میں رکھ کر کسی اخبار یا رسالے کے مدیر کو پوسٹ کر دو۔ اب یہ اس نیک بندے کا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے آیا تمہارا شہ پارہ وہ نثر کے حصّے میں شائع کرے یا شعری ادب کے کھاتے میں ڈالے۔! بالکل ایسے ہی جیسے آج کوئی مصوّر بہت سے رنگوں کو ایک پیالے میں ڈال کر اور آہستہ سے پھینٹ کر کینوس پر دے مارتا ہے اور بلاعنوان ہی آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے لٹکا دیتا ہے۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ اس میں آئیڈیا تلاش کریں۔ (جو اکثر تلاش کر لیا جاتا ہے)

اگر کوئی نظم یوں لکھی جاسکتی ہے۔ شائع ہوسکتی ہے کہ

اونٹوں نے کافی پی
بیٹھ کر کرسی پر
اور قئے کی

دیواروں پر

تو آپ بھی اپنا افسانہ یوں شروع کرسکتی/سکتے ہیں کہ

ششنگر ینہ نے فضا میں قلا بازی کھائی، اس کے پاؤں موسیقی کی دھرنے پر دھیرے دھیرے تھرک رہے تھے۔ ثمران نے اس کی ہوا میں لہراتی معطر ابریشمی زلفوں کو ہاتھ میں لے کر کہا۔ تمہارے بنا میرا جیون ادھورا ہے۔ تم ـــ تم تو میری ہر سانس میں بسی ہو .... اور تب ہی وہ ایک دم اپنی باریک سی آواز میں بھونکنے لگا... ووف .... ووف شونا سیہ بھاگتی ہوئی، احمریں لبوں کو 'او' کی شکل میں بنائے وسل بجاتی کوریڈور میں داخل ہوئی تو وہ اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ دُم ہلا ہلا کر سُرخ سُرخ زبان سے اس کی جاپانی لیدر کی نگینے جڑی سینڈل کو چاٹتا رہا۔

ایسے افسانوں کو 'علامتی' کہا جاتا ہے۔ مگر صاحب ایسے افسانے لکھنا تو آپ تب کے لئے اٹھا رکھئے جب آپ کہنہ مشق ہوجائیں۔ ابھی تو آپ بس یہ خیال رکھئے کہ افسانوں میں کرداروں کے ناموں کے سلسلے میں انوکھاپن اور جدّت برقرار رہے (تاکہ لوگوں کو اپنے نومولود بچوں کے نام رکھنے میں کوئی دشواری نہ ہو) مثلاً ششنگرینہ، ثمران، شونا سیہ، ضومانیہ، ضوحاب وغیرہ وغیرہ۔

ہر چند کہ افسانہ لکھنے کے لئے کسی پلاٹ کی پرورش و پرداخت ضروری نہیں مگر کہیں یہ نہ بھول جائیے گا کہ ہر افسانے میں ایک ہیرو اور ایک ہیروئن ضرور ہوتی ہے۔ ہیرو بڑا شبریہ، حاضر جواب، اونچا لمبا، سُرخ و سفید گہری گہری جھیل جیسی نیلی آنکھوں والا ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی اس کی رنگت سانولی سلونی بھی ہوجاتی ہے مگر آنکھیں تو ہمیشہ متوالی دیوانہ کر دینے والی ہوتی ہیں۔ اور مسکراہٹ (ہائے) ایسی کہ کنواری بالیاں تو رہیں ایک طرف چار چار بچوں کی ماؤں کے دل بھی دھڑک دھڑک اٹھتے ہیں۔ ہیروئن .... صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی ان ہی خصوصیات کی حامل ہوگی۔ اس کی زلفیں کمر سے نیچے جھولتی ہوں یا شانوں پہ لہراتی ہوں۔۔ بہرحال ان کا کام یہی ہوگا کہ ہر دم معطر رہیں اور وہ ہر آنے جانے والے کو اس میں اُلجھاتی رہیں۔ اب

نجانی سٹمر مائی، چھوٹی موٹی ٹائپ لڑکیوں کا زمانہ لد گیا ہے، اس لئے ہیروئن ڈینامائٹ یا رائفل توپ کا گولہ ٹائپ ہوگی۔ سخت اکھڑ، ناک چڑھی اور خوددار ہوگی۔ اتنی کہ ہیرو کو اس وقت تک منہ نہیں لگائے گی جب تک افسانہ سکینڈ لاسٹ پیراگراف تک نہیں پہونچ جاتا۔ ہیرو بھی کم نہ ہوگا مگر بہرحال مرد ہے۔ لہذا اظہار میں پہل وہی کرے گا۔ ابتداء میں منہ کی کھائے گا مگر رفتہ رفتہ حالات سدھرتے جائیں گے۔

ہیروئن کے علاوہ افسانے میں کچھ آنٹیاں، انکل، ڈھیروں کزن، بہت ہی پیارے پیارے دوست، سہیلیاں ہونا بھی ضروری ہیں جو سب کے سب بے حد حسین ہوتے ہیں اور امیر کبیر (ہیرو، ہیروئن سے کم) جن کا کام نت نئی، انوکھی انوکھی شرارتیں کرنا۔ پبلک پارکس میں چھلانگیں لگانا۔ ریستورانوں میں آئس کریم کھانا، کافی پینا اور فارغ اوقات میں عشق لڑانا، کبھی کبھی پڑھ لینا اور امتحان میں گڈ، سکینڈ ڈویژن لے لینا ہوگا۔ فرسٹ ڈویژن اور پوزیشن ہیرو، ہیروئن کے نام الاٹ ہے ... خیال رہے ...) سب سے اہم بات یہ کہ ہیرو اگر متوسط طبقے کا فرد ہے تو ہیروئن لازماً شہر کے رئیس اعظم کی اکلوتی لخت جگر ہوگی۔ اگر ہیرو کسی مشہور بیرسٹر کا نورِ چشم ہے تو ہیروئن کسی بھکّی نشین کی گدڑی میں چھپا لال.. ویسے اگر کبھی ہیرو ہیروئن کی باجی کا دیور یا بھابی کا بھائی ہو یا ہیروئین، ہیرو کی آپی کی نند، بھابی جان کی بہن یا چچی کی بھانجی ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسا تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔

باجی کی نندوں، بھابی کے بھائیوں والے افسانے عموماً کامیڈی ہوں گے۔ کیونکہ صاحب گھر کی بات ہوگی گھر ہی میں رہے گی۔ چند چکر کھا کر، قلابازیاں لگا کر آخر کار میل ملاپ ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن اگر فریقین میں سے کوئی ایک جیب میں کھنکتے سکّے نہیں رکھتا تب افسانے کا فارمولا یہ ہوگا کہ ..... یونیورسٹی، کالج یا آفس میں ٹکراؤ ہوگا۔ پھر وغیرہ وغیرہ ہوگا اور پھر ہیرو کا رئیس اعظم باپ ظالم سماج بن کر حائل ہونا چاہیے گا۔ تب ہیرو کی غیرت و محبت بھی جوش مارے گی .... دولت کو ایک زوردار لات مارے گا اور اپنی دلہنیا (ہیروئن) کو لے کر کہیں دور دیس جا بسے گا اور ظالم "سماج" منہ تکتا رہ جائے گا ... اپنا سا۔ کیونکہ "وہ" تو جا چکے ہوں گے) اگر ہیرو یتیم و یسیر، لاوارث ہوگا تب یہ ہوگا کہ ہیروئن جو کہ سیٹھ شہباز احمد کی اکلوتی بیٹی ہے ... دونوں اس تضاد کو بھلا کر یونیورسٹی میں کلاس میں بجائے لکچر سننے کے ایک دوسرے کا مکھڑا دیکھ دیکھ کر مسکرائیں گے، بہت کچھ ہوگا (جو بھی آپ کی سمجھ میں آئے)

پھر پارکوں اور یونیورسٹی کے فنکشنز میں ہونے والی رنگین ملاقاتیں اس وقت دم توڑ دیں گی جب ہیروئن ایک دن اپنی غزالی آنکھوں سے موتی ٹپکاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر ہیرو سے سب کچھ بھلا دینے کی درخواست کرے گی کہ اس کی شادی سیٹھ کرم داد فضل دین کے ان پڑھ، گنوں کے پورے بیٹے سے ہو رہی ہے اور چونکہ وہ "مشرقی" لڑکی ہے اس لئے کچھ نہیں بول سکتی۔ تب ہیرو ... آخری مرتبہ ہیروئن کو سینے سے لگائے گا۔ اس کے آنسو اپنے ہونٹوں سے صاف کرے گا اور "فی امان اللہ" کہہ کر اسے رخصت کرکے اپنے کمرے میں جھلنگی چارپائی پہ اوندھا لیٹ کر ڈھیروں نیر بہائے گا۔ تب ہی کہیں دور سے لہروں کے دوش پہ اڑتی ریڈیو سے ابھرنے والی آواز آئے گی۔

چاندی کی دیوار نہ توڑی، پیار بھرا دل توڑ دیا

(ہائے یہ ریڈیو والے بھی کیسے محل موقع سے گانے نشر کرتے ہیں) ارے، سب سے ضروری بات تو بھول ہی گئے

وہ یہ کہ اپنے ملک میں تعلیم کا رواج کچھ زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور پھر ہیرو ہیروئن تو ہونگے ہی۔ یونیورسٹی یا کانونٹ کالجوں کے اسٹوڈنٹ۔ لہٰذا بیشتر گفتگو، لڑائیاں اردو ملی انگریزی میں ہوں گی۔ خاص کر غصہ اور حیرانی تو ضرور ہی انگریزی میں ہوگی۔ سب سے آخری اور اہم ہدایت یہ کہ اگر آپ کا افسانہ اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی خاطر خواہ طویل نہیں اور افسانے کے بجائے محض افسانچہ معلوم ہو رہا ہے تب بھی فکر کی کوئی بات نہیں اسے طویل بھی کیا جا سکتا ہے۔ کچھ یوں کہ ....

وہ حریری پردے ایک جانب سرکا کر فرانسیسی طرز کے دریچوں میں جھک گئی۔

دل کی اُداسی، تنہائی نے بے کل سا کر دیا تھا
چاند یوکلپٹس کی اونچی ٹہنیوں میں گویا اُلجھ سا گیا تھا
بالکل اس کی اپنی زندگی، ذہن کی طرح ....
چاند ....
زرد زرد چاند ....
(بالکل کسی یرقان کے مارے مریض کی آنکھوں کی مانند)
اداس اداس چاند
تنہا چاند
جو ہمیشہ سے تنہا ہے
تنہا رہے گا
اور اس کی کرنیں
زرد زرد
بیمار کرنیں
دلوں میں ــــ اُداسیوں
تنہائیوں کا احساس دوچند کرتی رہیں گی۔

تو صاحبو! محترماؤ!! آپ افسانہ لکھئے۔ ضرور لکھئے ہمیں یقین ہے کہ ہماری ہدایات، ہمارے مشورے آپ کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔ افسانہ لکھئے اور کسی خواتین کے اخبار، ماہنامے یا ہفت روزہ اخبار کو ارسال فرما دیجئے۔ انشاءاللہ ضرور شائع ہوگا آپ کا افسانہ۔ ہاں مگر ایک عدد کاپی اس رسالے یا اخبار کی جس میں آپ کا افسانہ شائع ہو۔ ہمیں .... صبیحہ شاہ کو بطور ہدیہ یا شکریہ ارسال کرنا نہ بھولئے گا۔ کیونکہ ہم ہی تو ہیں جس نے ۲۲

مسودات صاف، خوش خط اور صفحے کے ایک جانب لکھئے۔ ناقابلِ اشاعت تخلیقات واپس نہیں کی جائیں گی۔

کرنل محمد خان

چار شہر ——— اُڑتے خاکے

محبت فرانسیسی کی بجائے مادری زبان میں کرنا چاہیئے

اگلی صبح اُٹھ کر حساب کیا تو ہماری چھٹی کے آٹھ دن باقی تھے۔ اِن دِنوں کو ہم نے چار ملکوں ——— فرانس، جرمنی، ترکی اور ایران ——— پر تقسیم کیا۔ ہر ایک کے حصے میں دو دو دن آئے۔ ہم نے جلد جلد ناشتہ کیا اور پہلے دو دن فرانس کو بخشنے کی نیت سے، صبح کی پہلی پرواز سے عازم پیرس ہوئے۔

پیرس کے حسن و جمال کے قصے بچپن سے سن رکھے تھے لیکن دس سال پہلے کی طرح اس دفعہ بھی ایئرپورٹ پہ اترے تو اہل پیرس کو بارش اور برساتیوں میں مبتلا پایا اور برساتی میں حسن و جمال کا وہی رنگ ہوتا ہے جو حزن و ملال کا ہوتا ہے۔ یورپ کی برسات وہ پاک دھنک، دھانی دوپٹوں، مستانی پینگوں اور دیوانی جوانیوں والی برسات نہیں کہ حسن بھیگ کر اور نکھرتا ہے۔ یورپ کی برسات میں حسن گیلا ہو جائے تو گدلا ہو جاتا ہے۔ پھر اہل پیرس سے بات کرنے کی نوبت آئی تو موسم کے حزن کے علاوہ زبان کے ملال نے بھی آ گھیرا۔ لکھی ہوئی فرانسیسی پڑھی جائے تو کئی انگریزی الفاظ فرانسیسی بھیس میں بھی پہچانے جا سکتے ہیں اور ٹوٹا پھوٹا کچھ مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے لیکن بولی ہوئی فرانسیسی؟ خدا کی پناہ! معلوم ہوتا ہے بولنے والا یا بولنے والی شاں شاں، شاں کر رہی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ خود ایک دوسرے کو کیسے سمجھتے ہوں گے۔ سنا کرتے تھے کہ دنیا کی سب سے میٹھی اور اظہار محبت کے لیے موزوں ترین زبان ہے تو فرانسیسی! اب اس کا صحیح جواب تو فرانسیسی میں محبت کرنے کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر فریقین دم محبت ایک دوسرے کے کان میں موسلا دھار شاں شاں کرنے لگیں تو اس طوفان محبت کس حد تک فروغ پائے گی اور اگر آتش جذبات ذرا زیادہ بلند آواز میں بھڑک اٹھی تو ہمسایہ کا بچہ سمجھتا رہے گا اور کیوں نہ فی الفور فائر بریگیڈ طلب کرے گا۔

بہر حال فرانسیسیوں کے متعلق تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن اپنے ہم وطنوں کے لیے ہمارا ناچیز مشورہ یہ ہے کہ

محبت فرانسیسی کی بجائے ... زبان ہی میں کرنا چاہیے یا زیادہ سے زیادہ ذہن اُردو میں اور بہر حال دھیما انداز میں کہ ممکن ہے پڑوس میں کوئی بیمار ہو یا کوئی طالب علم امتحان کی تیاری کر رہا ہو۔

حسینانِ پیرس و مہمانانِ پیرس

وسیع و عریض پیرس کی گلیوں سے گزرنے کے بعد ہوٹل میں پہنچے تو ایک دھچکا سا لگا کہ ہوٹل مگر یہ تنگی چشم حسود تھا۔ کمرہ دیکھا تو پلنگ کے سامنے صرف اتنا حاشیہ بچا تھا جس پر سلیپر ایڑیوں کے بل کھڑے ہو سکتے تھے۔ لیٹ نہیں سکتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا پلنگ رکھ کر اس کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کردی گئی ہیں۔ غسل خانے کا پتہ پوچھا تو سات کمرے چھوڑ کر ایک دڑبے کی طرف اشارہ کیا گیا اور ہمیں بتایا گیا کہ ہم اس کے سات دعویداروں میں سے ایک ہیں۔ نیز آج تک کوئی دعویدار ہمسایوں سے بلوہ کئے بغیر غسل خانے کی منزل تک نہیں پہنچ سکا — ہم نے اپنے فرانسیسی قیام سے غسل خارج کر دیا۔ اور غصے سے تپنے لگے۔ ہوٹل کا انتخاب اور ریزرویشن ہمارے لیے مس پارس نے لندن سے کیا تھا۔ جی چاہا کہ پارس سے بذریعہ فون احتجاج کریں لیکن احتجاجی فون کی فیس ہمارے غصے کی شدت سے کہیں زیادہ تھی۔ چنانچہ فون کرنے کی بجائے غصہ کو پی لیا۔ دوسرے یاد آیا کہ کم خرچ ہونے کے علاوہ کم ظرف بھی نکلا۔ اب اس لغزش کی تلافی کی ایک ہی صورت تھی کہ سوائے رات کے چند گھنٹوں کے اس ہوٹل سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے اور باقی وقت میں ایک انگریزی محاورے کے مطابق پیرس کو سرخ پینٹ کیا جائے یا — اگر ایک اردو محاورہ ایجاد کرنے کی اجازت ہو تو — اسے سلطانی مہندی لگائی جائے۔ ہمیں پیرس سے بہت تفصیلی آشنائی تو نہ تھی لیکن چند ایسی جگہوں کا علم ضرور تھا جہاں مہندی کا لگانے سے رنگ چوکھا اُسکتا تھا۔ اور مناسب سے پہلے ہمارے ذہن میں کیفے دو ماگو (Les deux magots) کی یاد نے آنکھ کھولی جس کی موجودگی میں پیرس کی رونقوں اور رعنائیوں کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہ تھی کہ اس طعام گاہ کے برآمدے کی نشستیں پیرس کی جملہ رونقوں اور رعنائیوں کے لیے سلامی کا چبوترہ تھیں۔ ہم میٹرو سے سیدھے شین ژرمے (ST. GERMAIN) گئے اور کیفے دو ماگو کی واحد خالی کرسی پہ سرِ شام قابض ہو گئے۔ بارش تھم چکی تھی۔ مطلع صاف تھا اور روشنیاں بتدریج روشن تر ہونے لگیں۔ پھر ہمارے سامنے سے حسینانِ پیرس کی پریڈ گزرنے لگی۔ ان کے ملبوس ہاٹ پینٹیں (HOT PANTS) دہکتی پینٹیں، بلکہ اِکّا دُکّا بھاپ دیتی پینٹ۔ نیچے کھولتی انگیائیں، اوپر ابلتی بلاوزیں اور بعض اوقات نہ انگیائیں نہ بلاوزیں، فقط کھلے پیٹ کی ہوا دار بنیانیں، ان پر شوخ رومال اور نکیلے منکے۔ دوسری طرف مردوں کی خودسر زلفیں اور خودرو داڑھیاں۔ مونچھیں۔ جیسے پردہ گوشۂ لب سے جونکیں جھول رہی ہوں اور قلمیں جیسے کانوں سے جرابیں لٹک رہی ہوں — اور اس ہزاروں کی برات میں شاذ ہی کوئی اکیلا یا اکیلی ہے۔ ہر طرف جوڑے ہی جوڑے ہیں۔ جوڑا اگر پیدل ہے تو وہ اپنی ہم خرام کو بازوؤں میں لپیٹے رواں ہے۔ اور اگر سکوٹر پر سوار ہے تو یہ اپنے ہم جلیس کو کلاوے میں لئے اڑتی جا رہی ہے اور جب ٹریفک

؎ paint the town red یعنی رنگ رلیاں منانا

بتی لال ہو جاتی ہے تو ہم بیک لحنت اسکوٹر روکتا ہے اور اس خداداد فرصت سے رخ پیچھے موڑتا ہے پھر یہ جھکتا ہے، کچھ دہ ابھرتی ہے۔ لب لبوں سے ملتے ہیں اور غیر معینہ مدت کے لیے ملے رہتے ہیں تا آنکہ کوئی تیز مار موٹر سوار ہارن دے کر بتی کے سبز ہو جانے کی خبر بد سناتا ہے اور اس وقت تک دونوں کی یہ دعائیں سنتا ہے جب تک کہ اگلے چوک کی لال بتی نہیں آجاتی۔

اور ادھر دیکھیے: یہ بی بی خلاف معمول تنہا چلی آتی ہے۔ چلی آتی ہے حتیٰ کہ ہمارے بالکل قریب آگئی ہے۔ اللہ بچ مچ کوئی فتنہ روزگار ہے بالکل ارما لا ڈیوس لگتی ہے۔ اگر وہ نہیں تو اس کی سگی بہن ہے۔ ہم اسے ارما ہی کہیں گے۔ سکے گریباں کی وی (V) کی شاخوں کی کشادگی اور زاویے کی گہرائی تو ملاحظہ فرمائیں۔ اگر یہ وی ایک سوت اور زیادہ ہوتی تو سینے کی سرکشی راز نہ رہتی۔ اور اب یہ راز جو جزوی طور پر ہی سربستہ ہے مکمل طور پر افشا ہونے کے لیے ایک چھوٹی سی چھینک یا ہلکی سی ہچکی کا محتاج ہے۔ ارما ہماری نشستوں کے بالمقابل پہنچ کر ہماری طرف پیٹھ موڑ کھڑی ہوگئی۔ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے دو فرانسیسیوں نے ارما کو غور سے دیکھا۔ باہم نوٹ ملائے اور پھر انہوں فرانسیسی زبان میں ایک پھبتا ہوا آوازہ کسا جو ہماری سمجھ میں تو نہ آیا لیکن یوں معلوم ہوا جیسے کہتے ہوں" کاش تیرے گریباں کا زاویہ ذرا اور کشادہ ہوتا" ——— اس پر ارما نے مڑ کر انہیں سوالیہ انداز میں دیکھا اور سینے کو مزید تان کر بغیر مسکرا دیا۔ لیکن جو کچھ ارما نے انہیں کہا تھا، ارما کی مسکراہٹ نے کہہ دیا۔ اور چونکہ مسکراہٹ کی زبان فرانسیسی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہم بھی ارما کا مدعا پا گئے۔ ارما کہہ رہی تھی:

میری اتنی روشنی سے دل و جاں سلگ رہے ہیں
میں ذرا سی لو بڑھا دوں تو بزم جل نہ جائے!

اور بلاشبہ یہ خطرہ بالکل حقیقی تھا کہ ہمارے گرد و پیش ابتدائی دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن لتے میں کہیں سے ایک اُن دُھلا لونڈا آنکلا اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے عالم ارما کو اپنے بازوؤں میں لے کر پیڈ میں شامل ہو گیا۔

تفریحی بس میں تاریخی پیرس کی سیر

دوسرے روز ہمارا قبل دوپہر کا پروگرام تاریخی پیرس کی سیر تھی۔ وقت کم تھا۔ شہر دیکھنے کے لیے تفریحی بس سے بہتر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چنانچہ ہم دس بجے کے قریب جاگے اور تیس منٹ کے اندر اندر شیو بناتے، ڈرائنگ کرتے، ناشتہ، ٹھکراتے بس میں جا بیٹھے۔ سیر کی ابتداء فرانس کے مشہور اوپرا (OPERA) سے ہوئی۔ اوپرا کی عمارت بے شک دل کش تھی۔ اور پاکستان میں ہوتی تو اور دل کش ہوتی لیکن نہیں تھی۔ لہٰذا جب دو سرے لوگ اترنے لگے تو ہم نے یہ تکلف نہ کیا۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ ایک اور بھوکے ساتھی کے ساتھ کیفے دی لا پے (DE LA PAIX) میں ——— جس کا تاریخی عزم اپنے ہمسایہ اوپرا سے کسی طرح کم نہ تھا ——— ناشتہ کے لیے

---

* اسی نام کی فلم میں ایک طوائف کا کردار جسے شیرلی میکلین نے ادا کیا۔

داخل ہوگئے اور ناشتہ کیا۔ کانٹی نینٹل ناشتے کا نشہ تو یاد گار رہا لیکن اس کا حجم بہت کم مقدار میں تھا یعنی ایک پیالہ چائے، ایک ملکیہ لبسکٹ، تھوڑا سا مکھن۔ خوش آمدید اور بس۔ بسے ایں قدر بود کہ رنج خمار برد۔

ہماری اگلی منزل میڈلین چرچ تھا: ہمیشہ ادب ہماری ہمرکاب۔ یوں تو شاہی مسجد لاہور کا نمازی جس کے دل پر ایسے خوب صورت خانۂ خدا کا رعب جمال چھایا ہو، اس کی آنکھوں میں کسی فرنگی عبادت گاہ کی شان نہیں جچتی۔ تاہم انگلستان یا کولون کے گرجوں اور خود فرانس کے ناٹرڈیم کے ہوتے ہوئے میڈلین جیسے ٹھوس اور مختصر چرچ کی ناز برداری ایسی واضح نہ تھی لیکن شاید ضخامت میں کچھ کشش ضرور ہے ورنہ زمین چاند کی بجائے سورج کے گرد نہ گھومتی، چڑیا گھر میں ہرن کی بجائے ہاتھی مرجع عوام نہ ہوتا اور ٹیلی ویژن پر آلن[1] کی جگہ ننھا مرکز توجہ نہ بنتا۔ میڈلین گرجے سے سلام کر کے کنکارڈ میدان میں پہنچے۔ یہ میدان پیرس کے مشہور شاہراہ شانزلیزے کی ابتدا ہے۔ چند گھنٹے پہلے ہمارے گائیڈ نے کہا تھا کہ پیرس کو رومانی موڈ میں دیکھنا مقصود ہو تو بارش کے بعد پہلی دھوپ اس کی دوست بنا کر دیکھو۔ اتفاق سے ہوا بھی یہی، بس کنکارڈ میں داخل ہوئی تو اس کی سطح پر اس صبح کی آخری بوندیں چمکی تھیں اور بہار کی نرمی باقی رہی تھی۔ ہم نے اپنی گائیڈ کے مشورے کے مطابق ایک دفعہ آنکھ بند کر کے اچانک کھولی کہ رومان ہی رومان ہو۔ لیکن دیکھا تو ٹریفک کا طوفان تھا اور رومان سے دوچار ہونے کی بجائے کسی کار سے ٹکرانے کا زیادہ امکان تھا۔ بلکہ معاً ایک ٹکر سے بچنے کے لیے ہمارے ڈرائیور نے بس کو یک لخت بریک لگائی اور نتیجہ ہماری ایستادہ گائیڈ بادل سے اکھڑ کر اپنے قریب کے تین چار مسافروں کی مشترکہ گود میں جا پڑی۔ محترمہ کے چہرے سے ظاہر تھا کہ انہیں اپنے حصے کا رومان حاصل ہوگیا ہے۔

کنکارڈ سے شانزلیزے میں داخل ہوئے اور یہی پیرس کا دل ہے۔ شانزلیزے سے گزرتے ہوئے ہمیں اپنے لاہور کی مال یاد آئی۔ وہی چھب اور وہی فیشن۔ وہی روپ اور وہی بانکپن۔ کوئی فروشگاہ دیکھی تو الفلاح یاد آئی کوئی ریستوران دیکھا تو شیزان یاد آیا۔ آئرن دیکھی تو نسرین یاد آئی اور موسیو مارخیم دیکھے تو حمید ابراہیم یاد آئے۔ بس میں بیٹھے کسی قدر تیزی سے گزر رہے تھے۔ ہم نے شانزلیزے سے وعدہ کیا کہ تیزی معاف ہم بعد میں تمہارے حسن کا تفصیلی تماشہ کریں گے۔ تھوڑی دیر میں ہم محراب الفتح (ARC DE TRIUMPHE) پر جا نکلے اور آناً فاناً ٹریفک کے گرداب میں پھنس گئے جس نقطے سے پوری بارہ سڑکیں پھوٹتی ہوں اور جس کے گرد ہر لحظہ کوئی بارہ سو گاڑیاں گھومتی ہوں اسے گرداب کہنا زیادتی نہیں۔ زیادتی یہ ہے کہ اس گرداب میں ایک بار پھنس کر کوئی بے زیاں یا بے داغ نکل آئے۔ اور ہمارے فرانسیسی ڈرائیور کی چابک دستی نے یہ معجزہ بھی دکھلا دیا۔ بہرحال ہماری بس گرداب سے بائیں ہاتھ مڑ کر محراب کے گرد سے ہوتی ہوئی آئفل مینار کے سامنے میں جا کھڑی ہوئی۔ پھر جا بہ سیر بلیں بس سے اترے اور مادام گائیڈ نے آئفل مینار پر اپنا رٹا ہوا لیکچر دہرانا شروع کیا۔

---

[1] آلن — ۱۹۷۱ء کے بی۔ بی۔ سی۔ ڈرامہ سیریز الیف لون کے دو کردار، آلن پتلے سے اور ننھا خوب موٹا۔

فرانسیسی مرد و زن اور پاکستانی چڑیاں چڑے

ہم لیکچر سن رہے تھے کہ بغل سے ایک فرانسیسی عجائب فروش نے ایک ہاتھ سے کھیسے سے ٹپوت کف ٹپن دکھا کر دوسرے سے کہنی کی اوٹ میں چند تصویر بتاں کی جھلک دکھائی۔ جی ہاں، یہ وہی تصاویر تھیں جن میں بتوں کے علاوہ بت پرست بھی محو پرستش نظر آتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ کارڈ پیرس کا تحفہ سمجھے جاتے تھے لیکن آج کے پیرس میں یہ تصویریں دکھانا دریائے سین کے کنارے بٹھا کر تیمم کرانا ہے کیونکہ جن تصاویر کے لیے کیمروں کو بھی خواب گاہوں کے روزن تلاش کرنے پڑتے تھے، وہ اب پارکوں میں بالمشافہ کھینچی جا سکتی ہیں بلکہ ہنگام تصویر کشی کیمرہ مین طرفین سے مسکراہٹ کی فرمائش بھی کر سکتا ہے۔ آج کل پیرس کے بیڈ روم بتدریج پھیل کر سڑکوں اور بازاروں کو دامن میں لے رہے ہیں اور اکثر فرانسیسی جوڑے جملہ مراحل محبت پارکوں ہی میں طے کرتے ہیں ــــــ ان لوگوں کے مقابلے میں پاکستانی چڑیاں چڑے بھی زیادہ خلوت پسند واقع ہوئے ہیں ــــــ بہر حال ہم نے کارڈ فروش کو کسی قریبی پارک یا بار میں جا کر بننے ٹھننے، کھیلنے یا انگ چوسنے کا مشورہ دیا اور خود مادام گائیڈ کے منہ سے آئفل مینار کی تاریخ سننے اور بھلانے لگے ــــ عجائب کو دور سے دیکھنا اور دیکھ کر لطف اندوز ہونا چاہیے۔ ان کی لمبائی چوڑائی کے کوائف گھر میں بیٹھ کر کتابوں میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔

آئفل مینار سے آگے ہماری منزل نپولین کا مقبرہ تھا جسے انولید بھی کہتے ہیں۔ دراصل یہ تعمیر پیدائشی مقبرہ نہیں۔ کبھی لوئی چہار دہم کے سپاہیوں کی اقامت گاہ تھی۔ نپولین نے اسے موت کے بعد فتح کیا اور ایسا اندر داخل ہوا کہ اب اس کے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ نپولین کی طرف سے مکان خالی کرنے میں اب بھی مزاحمت کا امکان ہے بلکہ یہ ممنون فرانسیسی اپنے نامور ہیرو کو اسی عالی شان عمارت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ اپنی فتوحات کی بدولت نپولین اس مقبرے کا مستحق بھی ہے۔ نپولین ان آمروں میں سے نہیں تھا جن کی زندگی کی جملہ فتوحات ایک دو بنگلوں، دو چار کارخانوں اور پانچ سات عصمتوں پر مشتمل ہوتی ہیں جو اخباروں کے خاص ضمیمے چھپوا کر اپنی عظمت کی ہفتہ وار یاددہانی کراتے رہتے ہیں۔ انہیں مرنے کے بعد مقبرہ تو کیا، قابل شناخت قبر بھی مشکل سے میسر ہوتی ہے۔ ان سب باتوں سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اپنی عظمت کے اندازے میں غیر ضروری تیزی نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے لیے پہلے مرنے کی ضرورت ہے کہ اندازے کے وقت ساری رقمیں حساب میں لی جا سکیں۔ پھر یہ حساب عموماً ٹھیک بیٹھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے ملک میں سینکڑوں بڑے آدمی مر چکے ہیں لیکن قوم نے صرف دو ہی مقبرے تعمیر کیے ہیں، ایک لاہور میں اور دوسرا کراچی میں۔

مونالزا کھمبا نوچنا چاہتی ہے

آپ کے سامنے مشہور عالم عجائب گھر لوور ہے جس میں لاکھوں نوادر رکھے ہیں۔ لیکن روایتاً محض اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مونالزا کی تصویر بھی دھری ہے۔ دانشوروں کا مقولہ ہے کہ اگر آپ نے پیرس جا کر مونا

کی تصویر نہیں دیکھی تو آپ کا ذوق مشکوک ہے اور سفر مجہول ہم لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم نے ڈنٹ کر پیرس دیکھا۔ ڈٹ کر لوور کا عجائب خانہ بھی دیکھا۔ مگر مونا لیزا سے اجتناب کیا اور وجہ یہ نہیں کہ ہم دانشوروں کی توقع سے پیر پانی پھیرنا چاہتے تھے ——— اگرچہ یہ ایک علیحدہ کار ثواب ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ہم مونا لیزا کا مان توڑنا چاہتے تھے۔ اصل میں اس عورت کو لوگوں نے بلا وجہ لگاڑ رکھا ہے، اس کی مسکراہٹ کی داد کچھ اسی انداز سے دی جاتی ہے جیسے ہمارے مشاعروں میں طرفدار لوگ اپنے یاروں کے گھٹیا شعروں کو دیتے ہیں: سبحان اللہ! مکرر! اور پھر شاعروں سے زیادہ سامعین مشاعرہ کرتے ہیں۔ کوئی منچلا طرف دار بھی مونا لیزا کی مسکراہٹ پر ایک دفعہ واہ واہ کہہ تو بیٹھتا ہے اب باقی سامعین روکے نہیں رکتے۔ حالانکہ سچ پوچھیں تو مونا لیزا ایک گھامڑ سی خاتون ہے جو کھسیانی سی مسکراہٹ مسکرا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے آج بھی اگر یہ تصویر کسی کھمبے کے ساتھ کھڑی کر دی جائے تو مونا لیزا تصویر سے نکل کر کھمبا نوچنا شروع کر دے۔ لیونارڈو دونچی نے اس سے بہتر تصاویر بھی بنائی ہیں اور اس میں بھی مونا لیزا کے ہونٹ نہیں، دونچی کی شہرت مسکرا رہی ہے ورنہ مونا لیزا تو بے چاری وہی خاک ہے جو تھی۔ بلکہ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ مونا لیزا کی تصویر مونا لیزا سے کہیں قدرے بہتر ہے ——— اکثر تصویریں اپنی مونا لیزاؤں سے بہتر ہوتی ہیں۔ ہم نے زندگی میں فقط دو چیزیں ایسی دیکھی ہیں جو اپنی تصویروں سے زیادہ خوب صورت نکلیں: ایک تاج محل اور دوسری غزالہ اور دونوں کو علم نہیں کہ ہم نے انہیں کس حال میں دیکھا۔ مگر او خدایا! ہم مونا لیزا سے کہاں آ گئے! تاج محل دیکھ کر ہم شاہجہاں کے غم میں کھو گئے اور غزالہ کی دید نے ہمیں اپنا غم دے دیا۔ لیکن حاشا، ہم شکایت نہیں کر رہے ہیں نہ تاج محل کو پشیمان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ غزالہ کو کہ

یہ غم نیا نہ ستم نیا کہ تری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

گلے ملنا مستحسن فعل ہے مگر

تاریخ پیرس کے بعد ہم نے تجارتی پیرس کو توجہ دی۔ یوں تو ہم جملہ ضروریات اور تحائف وغیرہ لندن سے خرید کر لائے تھے تاہم تبرکاً کچھ پیرس کی نشانی بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ خصوصاً بیگم کے لیے کہ مہکتے مسکراتے پیرس کے برگ سبز بھی نسوانی دنیا میں پارہ زمرد کی تاثیر رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم پیرس کے ایک مشہور ڈیپارٹمنٹل سٹور میں گئے۔ قریب ترین کونٹر پر رنگ رنگ کے خوبصورت سویٹرز رکھے تھے۔ ہم نے سیلز گرل کو سویٹر دکھانے کو کہا۔ وہ خود ہماری انگریزی سمجھ نہ سکی مگر شتابی سے ایک اور سہیلی کو پکڑ لائی جو انگریزی بھی بول سکتی تھی۔ انگریزی داں لڑکی مسکراتی آئی تو اپنی انگریزی دانی کی اہمیت سے ہی نہیں شکل و صورت سے بھی انتخاب نظر آئی بالکل ریشمی بارود لگتی تھی۔ ہم سے انگریزی زبان مگر فرانسیسی لہجے میں بولی:

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مجھے ایک زنانہ سویٹر چاہیے۔"

"اپنی لیڈی کے لئے؟"

یہ سوال غیر ضروری تھا لیکن بڑی تواضع سے پوچھا گیا تھا لہٰذا ہم نے بھی مناسب خوش مزاجی سے جواب دیا:

"جی ہاں ـــــ بالکل۔"

"کیا سائز ہے؟"

اور ہمیں پہلی دفعہ پتہ چلا کہ سویٹر خریدنے سے پہلے اس کا سائز معلوم ہونا چاہیے جو ہمیں معلوم نہ تھا۔ ہمیں اپنی سادہ لوحی کا احساس ہوا اور معافی مانگ کر لوٹنے ہی کو تھے کہ برشی بولی:

"ٹھہریئے۔"

اور فرانسیسی میں ذرا بلند آواز سے کسی کو پکارا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف اونچائیوں اور گولائیوں کی چھ لڑکیاں اپنے کاؤنٹر چھوڑ کر ہمارے سامنے سینہ تان کر قطار میں کھڑی ہوگئیں برشی نے ہمیں دعوت دی:

"موسیو ـــــ ان لڑکیوں کو دیکھیں اور بتائیں کہ ان میں کس کا سائز آپ کو بیگم کی یاد دلاتا ہے۔"

لڑکیاں دیکھنا شروع کیں تو جس پر نگاہ پڑتی اسی کا کرشمہ دامنِ دل کھینچ کر کہتا ہے جا اینجاست۔ اور بیگم کی یاد کی طرف بڑھنے نہ دیتا۔ کسے چنتے اور کسے رد کرتے؟ کچھ فیصلہ ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ آخر ہم نے ناکامی اور نفی میں سر ہلا دیا لیکن اس پر بھی برشی مایوس نہ ہوئی۔ وہی فاتح عالم مسکراہٹ لیے بڑی بے تکلفی سے آگے بڑھی اور ہمارے روبرو ملی میٹر کے فاصلے پر آ کھڑی ہوئی۔ پھر آرام سے ہمارے دو بازوؤں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور ہمیں دعوتِ پیمائش دی۔ جونہی ہمیں برشی کے منصوبے کا اندازہ ہوا ہم نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا:

"میڈم موزیل، مجھے اتنے صحیح ناپ کی ضرورت نہیں۔ بس اپنے ہی سائز کا سویٹر دے دیں۔"

ہم نے اپنی جارحانہ سیلز مین شپ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گلے ملنا بنیادی طور پر بے شک مستحسن فعل ہے لیکن اس کے پیچھے کچھ شوق، کچھ محبت کا جذبہ ہونا چاہیے۔ وہ گلے ملنا کس کام کا جس کا محرک سویٹر فروشی کا جذبہ ہو ـــــ بہرحال صحیح یا غلط ہم نے برشی کے سائز کا سویٹر خرید لیا لیکن جب برشی نے سویٹر کا بل پیش کیا تو محسوس ہوا کہ اس میں جتنی قیمت سویٹر کی ہے اتنی ہی فیس معانقہ بھی شامل ہے۔ یعنی دو قدم پیچھے ہٹنے کا قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

سویٹر کا بل ادا کرنے کے بعد ہمارے مزید شاپنگ کے عزائم کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ چنانچہ ہم نے خالی ہاتھ شانزالیزے کا الوداعی چکر لگانے کا فیصلہ کیا اور جب تھک گئے تو کھانے کے لیے ایک جگمگاتے رستوران میں داخل ہوگئے جہاں ایک ملائی ویٹرس یا میزبانہ نے ہمارا خیر مقدم کیا، ہمیں میز تک لے گئی اور ہمارا آرڈر لیا۔ لیکن جب کھانا لائی تو اس پر نہ رستوران والی جگمگاہٹ تھی نہ میزبانہ والی جھلملاہٹ۔ بالکل بے رنگ اور بے جان سا پکوان تھا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ پکوان سے کہیں زیادہ میزبانہ غذائیت سے بھرپور نظر آتی تھی۔ لیکن نیک بخت کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ہماری بیوی کی سائز کے متعلق استفسار کرتی حالانکہ یہ بھی برشی کے شہر میں رہتی تھی۔ ناچار ہم کھانا ہی کھا کر ہوٹل کو لوٹ گئے۔

اگلی صبح جرمنی جانا تھا، صبح سویرے اٹھ کر تیاری شروع کی پیرس کا قیام ہمیں کچھ موافق نہیں آرہا تھا۔ لیکن تیاری کے تیس منٹوں میں پیرس نے ہمیں تین نئے چرکے لگا دیے۔ شیو کے بعد نہانا چاہا تو یاد آیا کہ اس عیش کے ہم ایک ہفتے تک مستحق نہیں۔ ناچار ہم نے خشک تولیے سے تیمم کر لیا ـــــ پھر بڑھیا ناشتہ لائی تو اتنا قلیل کہ اگر کسی خوددار تیتر کے آگے رکھ دیا جاتا تو احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دیتا۔ ہم رات کے بھوکے تھے چنانچہ ناشتہ تو کھا لیا لیکن تیتروں کے غائبانہ

طعنے مسلسل سنتے رہے کہ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی وغیرہ۔ لیکن ہم نے کہا اقبال کی اور بات ہے مگر ہم ایسے پیغام میٹروں کی زبانی نہیں سنا کرتے پھر بل ادا کیا اور ایئر ٹرمینل تک جانے کے لیے ٹیکسی والے نے سیدھے منزلِ مقصود کو لے جانے کی بجائے گولہ پھینکنے والوں کی طرح پہلے تو تین چکر ہمارے ہوٹل کے گرد لگائے اور پھر ایک میل کے پانچ میل بنا کر ایئر ٹرمینل پر جا پہنچا۔ ہم نے انگریزی میں احتجاج کیا وہ فرانسیسی جھاڑا۔ ہم نے چپکے سے کرایہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کہ ہم چار پیسوں کی خاطر فرانس اور پاکستان کے تعلقات نہیں بگاڑنا چاہتے تھے حالانکہ فرانس نے ہمارے مزاج سنوارنے کا ــــــ باستثنائے برشی ــــــ کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔

○○

گلیم میدکی

غزل

ہوئی ہے جب سے رغبت شاعری سے — نہیں ہے اُن کو فرصت شاعری سے
نہ مجھ سے ہے نہ بچوں سے ہے میرے — جو ہے ان کو محبّت شاعری سے
نہیں ہے بوریا گھر میں بچھانے — مگر حاصل ہے شہرت شاعری سے
یہی تو ہے ادب کی فاقہ مستی — کہ فاقوں کی ہے صورت شاعری سے
میں کہتی ہوں مگر سنتے نہیں وہ — کہ گھر میں ہے نحوست شاعری سے
غنیمت ہے غزل پڑھ کر جو آئے — وہ لے کر سر سلامت شاعری سے
کوئی مہماں جو بدقسمت ہو اُن کا — تو کرتے ہیں ضیافت شاعری سے
مجھے گر چھیڑنا ہوتا ہے اُن کو — تو کرتے ہیں شرارت شاعری سے

گلیم ایسے تو تم قابل نہیں تھے
مگر ہوتی ہے حیرت شاعری سے

تبصرہ نگار
محبوب راہی

چوں چوں کا مربّہ

پاگل عادل آبادی کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ

آم کا مربہ ہم نے (نہیں نے کیا سبھی نے) کھایا ہے آنولے کا مربہ کھایا ہے اور بھی بہتیرے مربے کھائے، چکھے یا سونگھے ضرور ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان تمام مربّوں کی شہرت اپنی خوش ذائقیوں چٹخارہ دار لذتوں اور گوناگوں خصوصیتوں کے باوجود ادبی شاعروں کی طرح دسترخوان ہی تک محدود رہی جبکہ چوں چوں کا مربہ گلے باز شاعروں کی طرح دور دور تک اپنی شہرتوں کے جھنڈے صدیوں سے گاڑے ہوئے ہے۔ چوں چوں کے مربہ کا ہم نے بچپن سے صرف نام سنا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے آبا و اجداد نے بھی اپنے بچپن سے اور ہمارے آبا و اجداد کے آبا و اجداد نے بھی اپنے بچپن سے اس جنس نایاب کا صرف نام ہی سنا ہوگا۔ آج تک کسی خوش نصیب اس نعمت لازوال کے کھانے، چکھنے بلکہ سونگھنے تک کی سعادت حاصل نہ ہو سکی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی چیز جس کا وجود ہی مشتبہ ہو اس سے لذت کام و دہن کے حصول کے بارے میں سوچنا ہی پاگل پن کی علامت ہے۔ پھر ہم ایسے پاگل پن کو کیا کہیں گے جو قرنہا قرن سے مفقود العدم چیز کو یعنی چوں چوں کے مربّے کو دسترخوان پر سجا کے صلائے عام دے رہا ہے کہ آیئے اور اس نعمت آفاقی سے لذتیں اٹھایئے جس کے حصول کی تمنا لیے نہ جانے کتنے اس دنیا کے خوان تلخ و ترش سے منہ موڑ کر جنت کے خوان شیریں پر جا ڈٹے ہیں۔ بتلایئے ایسے دانشمند پاگل کو پاگل کہہ کر ہم عادل کیونکر کہہ سکتے ہیں پھر بھی اس مملکت عجائب و غرائب، مسکن آلام و مصائب یہ ایک پورا پورا شہر جو عادلوں سے بسا ہوا ہے اس شخص کو پاگل کہہ کر اپنے آپ کو عادل آباد کہلا کر فخر محسوس کرتا ہے۔ اب یہ بات پاگل جانے یا اس آبادی عادل کہ آیا پاگل خود اپنے آپ کو پاگل کہلانے پر بضد ہے یا عادل آباد کے عادل اسے پاگل بنائے ہوئے ہے۔

ویسے اس نام کے اجزائے ترکیبی میرے لیے ہمیشہ کنفیوژن کا باعث رہے ہیں کہ کبھی تو میرے ذہن میں پاگل عادل آبادی آتا ہے اور کبھی عادل پاگل آبادی اور میرے خیال میں دوسری ترکیب زیادہ صحیح اور برمحل معلوم ہوتی ہے آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ ہم ایک ایسی بستی کو عادل آباد کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں جو ایک اچھے خاصے بلکہ اچھے خاصے سے بھی کچھ زیادہ (کہ جس نے ایجاد و اختراع کا سہرا اپنے

سر باندھ رکھا ہے) ہوشمند آدمی کو پاگل قرار دے رکھا
ہے۔ یقیناً اس بستی کو پاگل آبادی اور اس کے باسیوں کو
پاگل کہنا چاہیے اور پاگل کو عادل نہ اپنے آپ کو پاگل مشہور
کر کے عادل آباد کے نام کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہے۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ پاگل عادل آبادی
کی اس بحث ہی سے چوں چوں کے مربہ کا تصور ذہن میں ابھرنے
لگتا ہے اور اسی شخص کو چوں چوں کے مربہ کا خالق یا موجد
کہلائے جانے کا حق پہنچتا ہے جو عادل آباد کا پاگل یا پاگل
آباد کا عادل ہے۔

اس بحث بحثی سے قطع نظر پاگل عادل آبادی واقعی
ایک ایسا فن کار ہے جس نے چوں چوں کا مربہ شعر و ادب
کے دستر خوان پر پیش کرنے کا شرف حاصل کیا ہے اور
اب دور کھڑا ان لوگوں کا تماشہ دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا
ہے جو اس نعمت غیر مترقبہ سے تلذذ کی سعادت حاصل
کرنے کے لیے دستر خوان ادب پر لوٹ پڑے ہیں۔ چوں
چوں کا مربہ چکھ رہے ہیں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق
مختلف قسم کے ذائقے محسوس کر کے طرح طرح کے منہ
بنا رہے ہیں۔ پاگل یہ سب دیکھ رہا ہے اور اپنے ہونٹ
منہ اور پاگل پن پر بغلیں بجا رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں بھُس
میں چنگاری ڈال بی جمالو دور کھڑی۔

چوں چوں کا مربہ دراصل ملک کے نوجوان مزاح
نگار شاعر پاگل عادل آبادی کی طنز و مزاح پر مبنی
غزلیات کا ایک خوب صورت اور قابل قدر مجموعہ ہے۔
انتہائی کم عمری اور قلیل ترین تخلیقی سفر میں پاگل عادل آبادی
کا یہ دوسرا ادبی کارنامہ ہے اس سے قبل اگر علم پیش کر کے
میدان طنز و مزاح میں اپنے پاگل پن کے جھنڈے گاڑ چکا ہے

آج کا خون آشام دور جس میں ہر انسان اپنے
اجداد کی صالح اور لطیف قدروں کی شکست و ریخت سے
دو چار ہوتے ہوئے اس قدر بے بس ہے کہ ٹک ٹک دیدم
دم نہ کشیدم کی مصداق بے چارگی کا مجسمہ بنا کھڑا ہے۔
آج کے ناگفتہ بہ حالات جن کا ہر لمحہ انسان کو خون کے
آنسو رلا رہا ہے۔ آج کے مسائل جو دو چکی کے پاٹوں کی طرح
انسان کو پیس رہے ہیں۔ ان حالات میں کہ ہر آدمی اپنے
اپنے کندھوں پر اپنے اپنے مسائل کی لاش اٹھائے نالاں
و گریاں نظر آ رہا ہے۔ ہر آنکھ میں محرومیوں کے آنسو
اور ہر لب پر مظلومیت کی فریادیں ہیں۔ ہر دل مصائب کے
زخموں سے چھلنی اور ہر سینہ مشکلات کے ناسوروں کی
آماجگاہ ہے۔ ایسے حالات میں کہ ایک تبسم کو ہونٹ ترس
جائیں۔ اگر کوئی شخص دنیا کے لیے مسکراہٹوں اور قہقہوں کی
سوغات لیے کچھ دیر ہنسنے ہنسانے کے اسباب فراہم کر
دیتا ہے تو یقین جانئے اس سے زیادہ نیک آج کے دور میں
کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہنسی علاج غم ہے۔ غم بجائے ایک متعدی
مرض ہے اور ایک وبا کی شکل میں تمام دنیا انسانیت کو اپنی
لپیٹ میں لے چکا ہے۔ ہنسی جیسے تیر بہدف نسخہ کے
ذریعہ پاگل عادل آبادی ایک ماہر فن اور ہمدرد مسیحا کی طرح
انسانی معاشرے سے بیماریٔ غم کے جراثیم کا قلع قمع کرنے کی
سعیٔ مشکور کی ہے۔

پاگل عادل آبادی ہنستا ہے اور ہنساتا ہے عوامی
مسائل کے بے ہنگم پن پر، آج کی فیشن پرستی پر، دنیا کی
دورنگی پر، انگوٹھے چھاپ رہبروں پر، پیشواؤں پر، تہذیب
کے گندے انڈوں پر، شاعرانہ انداز پر۔ وہ پھبتیاں
کستا ہے چمچوں کی ابن الوقتی پر، دفتر بلدیہ کے حسن انتظام
پر گھوڑے جوتنے کی رسم پر اور خود اپنے آپ پر۔ اس نے
نشتر زنی کی ہے رسموں اور رواجوں کے کھوکھلے پن پر
اور آج کل کے انسان کی نمائش پسندی پر۔ اس کی نظر
ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں تک پہنچ جاتی ہے جن کا انسانی
زندگی سے گہرا تعلق ہونے کے باوجود جنھیں عام طور سے
نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار پیش خدمت ہیں

مرغوں کی کچھ خطا ہے یا مرغیوں کی سوچو
تہذیبِ نو کے انڈے گندے نکل رہے ہیں

کچھ ایسا چٹکارہ دکھا دیتے ہیں چمچے
گھوڑے کو گدھا پل میں بنا دیتے ہیں چمچے

خدمتِ شعر و سخن سے پیٹ بھر سکتے نہیں
رو رہے ہیں قسمتوں کو شاعرانِ انڈیا

پایا نہ جو کسی نے وہ ایوارڈ پائے گا
کھیتی سے زعفران کی بیگن اگا کے دیکھ

بات سمجھا تھا جسے ان کا وہ شوہر نکلا
بعد تحقیق کے کوا یہ کبوتر نکلا

کھٹی چیزوں میں جی ہے بیگم کا
پھر نیا گل کھلائے جیسا ہے

پاگل عوامی شاعر ہے زبان کی سلاست۔ اندازِ بیان کی سادگی، محاوروں کی برجستگی اور عوامی مسائل کی ترجمانی پاگل کی شاعری کی بنیادی خصوصیات ہیں جو اس کے بقائے دوام کی ضامن ہیں۔ پاگل کی شاعرانہ خصوصیات پر شیخ حمید الزماں نے تیسری آنکھ کے عنوان کے تحت استعارہ کی زبان میں مختصر لیکن بے حد خوب صورت جائزہ پیش کیا ہے۔ پاگل بقول ناظم انصاری بڑی سوجھ بوجھ سے کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اپنے بل بوتے پر کہتے ہیں۔۔۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں پاگل نے اپنی شاعری کے لیے عوامی زبان کا سہارا لیا ہے لیکن کہیں کہیں وہ سطحیت پر اتر آتے ہیں۔ اور ان کے کچھ اشعار پر عریاں پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر پاگل اگر کچھ ہوش مندی سے کام لیں تو بہت جلد ملک کے صفِ اوّل کے مزاح نگاروں میں نمایاں مقام حاصل کر لیں گے۔

خرافات

(مراسلے)

★ آپ کے بے حد اصرار پہ "سفرنامہ" لکھنا شروع کر دیا ہے اور یہ سلسلہ اب جاری رہے گا۔

یوسف ناظم
بمبئی

★ شگوفہ ہمارے ہاں آتا ہے، ڈرامہ نمبر بھی پہنچا محنت اور سلیقے سے مرتب ہوا ہے۔ آپ سب کو مبارکباد

مخمور سعیدی
نئی دہلی

★ شگوفے سے مجھے اتنی دلچسپی ہے کہ میں شگوفہ خریدتے ہی پہلے دو دن میں پڑھ کر ختم کر دیتا ہوں اور آئندہ اشاعت تک بے چین رہتا ہوں۔ میرا ایک حقیر مشورہ یہ ہے کہ آپ اگر شگوفہ کو ایک ماہ کے بجائے ایک ہفتہ کی مدت کر دیں تو بہتر ہوگا۔ شگوفہ واقعی ایک دلچسپ رسالہ ہے اور میرے سب لوگ اس کو پڑھتے ہیں۔

سید اصغر حسن عابدی
ہوٹل ہورائیزن بمبئی ــــ ۵۴

★ ناگپور میں آپ کے رسالہ کا بڑا زور ہے میرے دوست انصاری اصغر جمیل اکثر تعریف کرتے رہتے ہیں سنترے کا یہ شہر میرا دطن ہے ....
رسالہ نکالنے اور برقرار رکھنے پہ مبارکباد دیتا ہوں۔

عبد الحیٔ ناصر
آل انڈیا ریڈیو، رتناگیری

★ شگوفہ کے لئے دعا گو ہوں کہ وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہے اور ہر دل میں شگوفے کھلاتا رہے اور لوگ بغیر کھائے پئے فیضیاب ہوتے رہیں تاکہ اناج کی بچت ہو۔

انصاری سلام الدین
بھیونڈی (مہاراشٹرا)

★ شگوفہ کا ڈرامہ نمبر خوب ہے۔ ادھر دہلی اور اور نئی دہلی کے ادبی حلقوں، اداروں اور اردو جرائد و رسائل و اخبارات و ادبا و نقادوں اور شعرا، و صحافیوں میں کافی مقبول ہوا ہے، میری جانب سے بھی تہنیت قبول فرمائیے۔

ظہیر کیفی امروہوی
دہلی

★ شگوفہ کا ڈرامہ نمبر دیکھا۔ یقین نہ آیا کہ حیدرآباد سے اتنا ضخیم اور خوبصورت پرچہ بھی نکل سکتا ہے۔ ادارہ شگوفہ واقعی قابل مبارکباد ہے۔ اسٹیج اور ڈرامہ کو جہاں حیدرآباد میں آج کل مقبولیت حاصل ہے وہیں ڈرامہ نمبر ایک دستاویز کی شکل حیدرآباد کے ڈرامہ آرٹسٹ اور فن کاروں کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے۔

مقبول وحید
حیدرآباد

میں نے کپڑا اسی لئے باندھ دیا ہے کہ تمہاری جیب پھٹی ہوئی ہے جیب میں ریزگاری ہے۔

شگوفہ

PEDESTRIAN CROSSING

جلد (۱۲) ○ اگست سنہ ۱۹۷۹ء ○ شمارہ (۸)

سالانہ (۲۲) روپے — بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ — فی پرچہ (۲) روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲
بائنڈنگ : محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ ۳۱ ۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ ؛ فون : 57716.

INDIA

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

شاندار عید کے لئے
شاندار
عطریات
عید کی خوشیوں کو دوبالا کرنے والے
لاثانی و بے مثال
عطریات
حکیم اینڈ کمپنی
جنرل مرچنٹس اینڈ پرفیومرس
پتھر گٹی حیدرآباد ۲ فون نمبر 43769
(تنویر)

اسکائی لیب

گرا اسکائی لیب آخر جب ایوان سیاست پر
تو ریزہ ریزہ ہوکر سورماؤں کے بھرم نکلے
عجب منظر تھا، لنگڑاتے ہوئے ملبے کے نیچے سے
لئے ہاتھوں میں 'پشکولا' کا جگ اک محترم نکلے

سن اسٹروک
(SUN STROKE)

ایسی تپش تھی حزبِ مخالف کے شور میں
توڑ اس کا" راج نیتی کے کولر نہ ہو سکے
SUN STROKE سخت تھا' پر دھان منتری
'آبِ حیات' پی کے بھی جانبر نہ ہو سکے

ظالم دِلّی

کہا اک محترم نے تو بڑی ظالم ہے اے دلّی
نہ جانے کتنی دستاروں کے تجھ سے پیچ و خم نکلے
ہمیں بھی تو نے آخر' دودھ کی مکھی بنا ڈالا
"بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے"

رضا نقوی واہی

رسم الخط

(اُردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کے مشورہ پر)

اک افسرِ اعلیٰ نے پڑھا ایک مقالہ
"ہندی میں لکھیں اُردو تو ہو لطف دوبالا
ہندی ہی کی لپی میں اب اُردو کی بقا ہے
ورنہ دہنِ اُردو پہ پڑ جائے گا تالا
کہتے تھے کہ ہو جائیں گے حل سارے مسائل
املا ہی کی گڑبڑ ہو نہ انث کا گھٹالہ'
کانٹے کے عوض رہن نوامیسِ گلستاں
ذرّے کے حوالے مہہ و انجم کا قبالہ!
اُردو کی ہو بنیاد میں ہندی تو یقیناً
ہو محکم و پائندہ ادب کا بھی شوالہ
باتوں نے مگر ان کی، کوئی دل ہی نہ جیتا
کہنے لگے ہے ایک غزل ہو کہ کویتا
کچھ فرق نہیں ان میں رباعی ہو کہ دوہا
رضیہ ہو کہ روزینہ سلیمہ ہو کہ سیتا
صوفی بھی تو کہتے ہیں، فنا ہی میں بقا ہے
"اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا" [1]
اردو میں جو ہندی ہے تو ہندی میں ہے اردو
"گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا" [2]
اُردو کی مگر ایک ہی مشکل ہے کہ کچھ ہو
"مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے مسیتا" [3]

بے چین حیدرآبادی

[1] تا [3] اقبال

ڈرامہ نمبر

ماہنامہ شگوفہ کا تاریخی و دستاویزی اہمیت کا حامل

مہمان مدیر ۔ ساگر سرحدی

فن ڈرامہ پر مضامین ★ مراٹھی، بنگالی، سنسکرت، پنجابی، تلگو، اڑیا اور گجراتی ڈراموں کے تراجم کے علاوہ

- نقن سیٹھی ۔ ساگر سرحدی ۔ فکر تونسوی ۔ اظہر افسر
- احمد جمال پاشا ۔ غلام جیلانی ۔ وجاہت علی سندیلوی
- غلام یزدانی ۔ بھارت چند کھنہ ۔ خواجہ عبدالغفور
- مقصود علی خاں ۔ ڈاکٹر سمیع الحق ۔ پرویز یداللہ مہدی
- شفیقہ فرحت ۔ خالد عابدی ۔ برق آشیانوی

کے ڈرامے

● اتنی عرق ریزی، جاں سوزی اور دیدہ ریزی کے بعد شگوفہ کا جو ڈرامہ نمبر مرتب کیا گیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ شگوفہ شگوفہ نہ رہا بلکہ گلدستہ بن گیا ۔۔۔ اچھے اور معیاری ڈراموں کا گلدستہ ۔۔۔۔۔

محمود ایوبی
ہفتہ وار "بلٹز"

"... میں مدیران نمبر کو ان کی کاوشوں کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہوئے اردو کے چاہنے والوں کی خدمت میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ یہ ڈرامہ نمبر یقیناً اس قابل ہے کہ اسے بطور یادگار گھر میں رکھا جائے۔"

بھارت چند کھنہ (تبصرہ مطبوعہ "سیاست")

ممتاز آرٹسٹ سعادت علی خاں کا بنایا ہوا خوبصورت سہ رنگی سرورق

ضخامت :- ۴۵۴ صفحات

قیمت :

سالانہ خریداروں سے
Rs. 15/-

عام خریداروں سے
Rs. 20/-

لائبریری ایڈیشن
Rs. 25/-

رقم بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر وصول ہونی چاہیئے۔

منیجر شگوفہ
۳۱۔ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱۔

کرنل محمد خان

چار شہر اُڑتے خاکے

یہ ارضِ جرمنی ہے

دم پرواز ہم اس قدر خوش تھے کہ ہمارا پاؤں زمین پر نہیں پڑتا تھا اور ارضِ جرمنی پہ پاؤں رکھا تو ہم خوشی سے اڑنے لگے۔ دراصل جرمنی کی فضا ہی کچھ فرحت ساماں سی ہے۔ وہ اس کی صاف ستھری طویل و عریض شاہراہیں، وہ اُجلے اُجلے جلی حروف میں سڑکوں کے سائن بورڈ، وہ بھاری بھرکم دوہرے باربردار ٹرک، وہ ہلکی پھلکی تیز رفتار مرسیڈیز کاریں، وہ اونچے لمبے درختوں کے امنڈتے چھاتے، وہ گہری سبز گھاس کے پھیلتے قالین وہ ہر چیز کا ستھراپن، سوہناپن اور بانکپن۔ الغرض جرمنی پہلی نگاہ پر یوں نظر آتی ہے جیسے ابھی ابھی بیوٹی سیلون سے بن ٹھن کر نکلی ہو۔ ہٹلر بے شک دیوانہ تھا ورنہ اتنی خوب صورت سرزمین کو جنگاہ نہ بناتا۔ اس خطۂ ارض کے حسن کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کی حدود کے اندر پٹاخہ چھوٹنا بھی عروسِ فطرت کی سمع خراشی سمجھا جائے۔

ایرپورٹ پر کارل کو لینے کے لئے سیڈین آئی ہوئی تھی ا ب۔ اس نے تواضع کی رو میں ہمیں بھی ساتھ بٹھالیا اور گھر جانے سے پہلے ہمیں اپنے ہوٹل میں چھوڑتا گیا۔ ہوٹل دیکھا تو ایسا ہی تھا جیسے جرمنی کے ہوٹل کو ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی بالکل فسٹ کلاس جس میں ایک کشادہ اور آراستہ کمرے کے ساتھ ایک ایسا دل کش غسل خانہ بھی شامل تھا کہ دیکھتے ہی کپڑے اتار پھینکنے اور نہا لینے کو جی چاہتا تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اپنے جی کا کہا نہ مانتے۔ چنانچہ نہائے اور اس زور سے کہ پیرس کی دو روزہ نحوست ایک وار میں اتار پھینکی۔

سر منڈاتے ہی روٹھی رن منانا پڑ گئی

اب فرینک فرٹ میں ہماری مصروفیتیں تھیں۔ ایک تو وہی جو آپ کو پہلے ہی معلوم ہے، کارل کے ساتھ لنچ کھانا لیکن یہ آنے والے کل کی بات تھی۔ دوسرے اور آج ہی ایک دس سال پہلے کے پرانے، پیارے، خوش مزاج اور مہمان نواز

امریکی دوست کرنل مارک مرفی اور اس کی خوب صورت مگر تیز مزاج بیوی ریناتہ سے ملنا اور تیسرے حسب معمول کچھ شاپنگ کچھ شغل اور کچھ آوارہ گردی کرنا۔ نہانے کے بعد ہم نے فون اٹھایا اور بسم اللہ کرنل مرفی سے کی۔ ویسے ہم نے اسے لندن ہی سے اپنی آمد کی اطلاع دے رکھی تھی۔ فون کے جواب میں بولا:

"تم آ گئے؟ اچھا ہوا۔ اسی وقت آ جاؤ۔ مجھے ایک ہمدرد کی فوری ضرورت ہے۔"

ہم ٹھٹک سے گئے اور کہا: ہمدرد؟ خیر تو ہے؟

بولا: "تم آؤ تو سہی۔ مجھے مل کر تو شاید تم ایسے خوش نہ ہو گے لیکن مجھے بہت خوشی ہوگی۔" حیران تھا کہ ہوا کیا۔ مارک کی آواز میں مہمان نوازی تو تھی لیکن خوش مزاجی سنائی نہ دی۔ بہرحال دروازے پر انتظار کرتا پایا اور اس مسکراہٹ کے باوجود اس نے ہمارے مقدم میں پیدا کی خاصا خستہ حال نظر آیا۔ غور سے دیکھا تو چہرے پر بڑی واضح اور خوش خط خراشیں نظر آئیں۔ ہمیں شک سا ہوا کہ کہیں یہ بے حجابی ریناتہ کے ناخنوں کی تحریر نہ ہو۔ ہم نے خراشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا شرارتاً پوچھا:

"صاحب بہادر۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا؟"

جواب میں مارک ہم سے لپٹ گیا اور ایک گھٹی سی ہچکی کے بعد بولا:

"ہم لڑ پڑے ہیں۔"

اس "ہم" کے صیغے میں کرنل صاحب اور ان کی بیوی شامل تھے گویا ہمارے شک کی تائید ہو گئی اور یہی ان کے لپٹنے کی وجہ تھی۔ جس آدمی سے اس کی بیوی لڑ پڑے اسے دوسروں پر بڑا پیار آتا ہے۔ غریب چاہتا ہے کہ ہر ایک سے گلے مل کر روئے ورنہ عام حالات میں یہی کرنل مارک مرفی ہم سے مردانہ وار ہاتھ ملایا کرتے تھے اور اپنی بپتا بیان کرنے کی بجائے ہم سے خیریت مزاج دریافت کیا کرتے تھے۔ اب کرنل کو ہم سے ہمدردی کی توقع تھی جس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم بھی اس کے ساتھ مل کر آہ و زاریاں شروع کر دیتے اور کرنل صاحب کا بیڑہ مزید غرق کرنے اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اسے کچھ جسمانی اور کچھ ذہنی گدگدی کرتے اور غریب کو رنج و محن کے گہرے گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے چنانچہ ہم نے اس کے دکھتے ہوئے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"پھر لڑ پڑے ہو؟ شاباش پھر راضی بھی ہو جاؤ کہ بڑا مزا اس ملاپ میں ہے۔۔۔۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ وہ لڑ کر چلی بھی دی ہے۔"

"تو کیا برلن وال پار کر گئی ہے۔ لاؤ فون، میں روسی سفیر سے بات کرتا ہوں۔"

"پھر مذاق؟ وہ یہیں کسی ہوٹل میں گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک سوٹ کیس تھا۔"

"تو پھر وہ آج نہیں تو کل ضرور لوٹ آئے گی۔ کوئی عورت صرف ایک سوٹ کیس کے ساتھ مستقل طور پر نامعلوم نہیں رہ سکتی۔"

بولا: "وہ خود کبھی نہیں لوٹے گی۔"

اور پھر ہمارا بازو تھام کر، ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا:

"خان —— تم اسے متاثر نہیں لاسکتے پلیز"۔

پچھلے ہم گھر سے جرمنی کی سیر کو نکلے تھے اور جرمنی میں سر منڈاتے ہی مدبھی رات (عورت) منانا پڑ گئی جو کسی سیاحت کے ذیل میں نہیں آتا تھا۔ ورنہ کوئی ایسا واقعہ ہیون سانگ کو بھی پیش آیا ہوتا۔

بہرحال جب ہم نے لندن سے مرفی کو خط لکھا تھا تو ہمارا خیال تھا کہ میاں بیوی ہمارے لیے چشم براہ ہوں گے اور حسب سابق پھولوں اور پھلجھڑیوں کے ساتھ ہمارا استقبال کریں گے۔ مگر دیکھا تو بے چارے کرنل کے پھول مرجھا چکے تھے اور پھلجھڑی جھڑ چکی تھی —— بہرحال کرنل کی مدبھری درخواست کو ہم مذاق ہی مذاق میں قائل نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے لیے کوشش واجب تھی چنانچہ پوچھا:

"معلوم ہے کس ہوٹل میں گئی ہے؟"

"یقین سے تو نہیں کہہ سکتا: البتہ پچھلی دفعہ ہوٹل پارک میں گئی تھی"۔

"تو ایک مرتبہ پہلے بھی روٹھ چکی ہے؟"

"جی نہیں، سات مرتبہ!"

ہم نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا: "ٹھیک ہے ہمیں ہوٹل پارک لے چلو۔ اگر ریتانہ وہیں ہوئی تو ہمیں ہوٹل میں اتار کر تم کہیں گم ہو جانا"۔

"گم ہونے کی بجائے میں ہوٹل کے دروازے پر تم دونوں کا انتظار کرتا رہوں تو کیا حرج ہے؟"

"حرج یہ ہے کہ اگر ریتانہ نے تمہیں ہوٹل کے دروازے پر دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے کہ اس کا شوق تحریر تمہارے بارے پر چند نئی سطروں کا اضافہ کر دے اور عبارت آگے ہی کافی گنجان ہے"۔

کرنل مرفی نے اتفاق میں سر ہلایا، چہرہ سہلایا اور کہا:

"ٹھیک ہے میں گھر آجاؤں گا اور آپ کا انتظار کروں گا"۔

ہم نے اپنے دوست کی فراست کی داد دی: "شاباش، تم بڑے معاملہ فہم دوست اور ... شناس شوہر ہو"۔

کرنل مرفی ہمیں پارک ہوٹل کے دروازے تک لے گئے۔ ریسپشن سے پتا چلا کہ مسز ریتانہ مرفی اسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔ ہم مالک کو ٹاٹا کیا اور خود ریتانہ کے کمرے کو چل پڑے۔ دروازے پر دستک دی تو ریتانہ نمودار ہوئی۔ ذرا جھجکی اور پھر اسی روایتی چہلے سے ہمارا خیر مقدم کیا:

"آہا مسٹر خان۔ آپ کا آنا کس قدر خوشگوار سرپرائز ہے"۔

ہمارا یوں ٹپک پڑنا سرپرائز ضرور تھا۔ لیکن اس کی خوشگواری خاصی مشکوک تھی۔ کیونکہ ریتانہ نے دروازہ اس توقع پر کھولا تھا کہ باہر کرنل مرفی دست بستہ کھڑا ہوگا۔ بہرحال ہم نے روٹھی بھاوج کی سہیلی کو خوشگوار کرنے کی کوشش کی اور کہا:

"مسز مرفی، آپ کو ملنا ایک ایسی مسرت ہے جس کے لیے فرینک فرٹ کے جملہ ہوٹلوں کی تلاش جائز ہے"۔

ریناتہ نے اپنا خراج پالیا تو مسکراتے ہوئے بولی:
"فنٹسٹک یہ۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اس ہوٹل میں ہوں؟"
"علم نجوم کے ذریعے" ہم نے کہا اور نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔
"سچ؟" —— ریناتہ نے مسکرا کر پوچھا۔
"نجوم کے علاوہ کچھ مارک نے بھی مدد کی تھی" —— ہم نے سچی بات کہہ دی۔
مارک کا نام سنتے ہی ریناتہ کے نتھنوں سے دو ننھے سے شعلے نکلے۔ بولی:
"تو آپ اس سے مل چکے ہیں؟"
"نہ ملنے کے برابر۔ میں گیا تو وہ سامان باندھ کر ایرپورٹ کو جا رہا تھا۔"
"ایرپورٹ؟ کس لئے؟" ریناتہ نے چونک کر پوچھا۔
"امریکہ جا رہا تھا۔ تیزی میں تھا۔ کہتا تھا جہاز کے جانے میں چند ہی منٹ باقی ہیں"
اب اس کے جواب میں ریناتہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ "جائے جہنم میں" مگر اس نیک بخت خاتون نے وہی کچھ کہا جس کی توقع ہم نے یہ بے ضرر جھوٹ بولا تھا۔
"مسٹر خان۔ پلیز روکو اُسے۔ وہ مجھ سے خفا ہو کر جا رہا ہے۔"
ساتھ ہی ریناتہ کے نتھنوں کے دو ننھے شعلے بجھ گئے اور اس کے دونینوں میں نیر بھرنے لگا۔ اتنا فوری انقلاب چپلی کے علاوہ ایک عورت کے چہرے پر ہی آسکتا ہے۔ بہرحال ہم نے مسز مرفی کو یاد دلایا:
"لیکن آپ بھی تو مارک سے خفا ہیں نا؟"
ریناتہ گھگیا کر بولی:
"میں کوئی خفا نہیں مسٹر خان، مجھے اس سے محبت ہے۔ پلیز دیر نہ کرو۔ چلو ایرپورٹ۔"
اور بیشتر اس کے کہ ہم کچھ کہتے ریناتہ ہمیں کھینچ کر ٹیکسی تک لے گئی اور ہم ایرپورٹ کو روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم نے خاموشی توڑنے کے لیے کہا:
"مسز مرفی۔ یہ آپ دونوں کی ناراضگی کیسی؟"
بولی "آج تک لڑنے کے بعد مجھے منانے جاتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اسے اس حد تک دق کر دوں گی۔ او مسٹر خان، سب غلطی میری تھی۔"
اور معاً ریناتہ کے منہ سے پیاری سی چیخ نکلی اور ہمیں کندھے کے ساتھ سر کے ٹکنے کا احساس ہوا —— کوئی پندرہ منٹ میں ہم ایرپورٹ پہنچ گئے۔ ٹیکسی سے اترے تو ریناتہ بھاگ کر دفتر معلومات میں گئی اور ایک سانس میں کلرک سے پوچھ ڈالا:
"نیویارک جانے والا جہاز جا تو نہیں چکا؟"

کلرک نے سر جھٹک کر دائیں طرف بورڈ کو دیکھا اور پھر اپنی گھڑی دیکھ کر بولی:

"اسے ٹیک آف کئے کوئی تیس منٹ ہو چکے ہیں۔"

ہم ریناتہ کے پیچھے ہاتھ پھیلائے اس انتظار میں کھڑے تھے کہ اگر ریناتہ ناموافق جواب سن کر لڑکھڑا جائے تو اسے تھام سکیں۔ قصۂ مختصر اُسے تھاما اور مزید حوصلہ افزائی کے لیے کہا:

"مسز مرفی۔ اگر جہاز گئے آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے تو ہو سکتا ہے کہ مارک نے جہاز مس کر دیا ہو۔"

ریناتہ بولی، تو پلیز چلو۔ گھر چلیں۔"

اور گھر گئے تو آگے مارک مرفی صاحب اپنا سا نجر درج مُنہ لئے بیٹھے تھے۔ لیکن ریناتہ کے لیے اب یہی مُنہ یوسف گم گشتہ کا مُنہ تھا۔ زلیخا سے کہیں زیادہ بے تابی کے ساتھ اپنے یوسف سے لپٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے اپنے لبوں سے اس کے لب ڈھونڈنے لگی۔ کرنل مرفی نے بھی۔ ـــــ ہمیں آنکھ مارتے ہوئے ـــــ مناسب اور مساوی جواب دیا مگر بیچارہ حیران تھا کہ یہ کیا اور کیسے ہو رہا ہے۔ ہم نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"مارک۔ تم تو امریکہ جا رہے تھے۔ کہیں جہاز تو مس نہیں کر دیا؟"

مارک نے مدعا پایا تو ایک لمحے کے لیے بوسے سے الگ ہو کر بولا:

"اوئیس۔ میں دو منٹ دیر سے پہنچا تھا اور شکر ہے دیر سے پہنچا۔"

اور پھر اپنی جملہ توجہ کا رخ ریناتہ کے رُخ کی طرف موڑ دیا۔ لیکن اب جب کہ میاں بیوی باہمی دلچسپی کے امور پر کھلے دل سے تبادلۂ التفات کر رہے تھے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی فلمی دھن گنگنائیں اور گنگنائی:

"یوں ہی پہلو میں بیٹھے رہو، آج جانے کی ضد نہ کرو۔"

ایک مدت کے بعد پیار کا مطلع صاف ہوا تو مدت کے روٹھے ہوؤں کو ثالث بالخیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دفعتاً ہم سے لپٹ کر ـــــ باستثنائے بوسہ ـــــ اسی زور سے اظہار معذرت کرنے لگے جس زور سے باہم اظہار محبت کر چکے تھے اور کہانی پھر وہیں سے شروع ہوئی جہاں سے شروع ہونا چاہیے تھی۔ یعنی اس چائے سے جس پہ ہمیں بلایا گیا تھا لیکن اب یہ دودھ چینی والی چائے نہ تھی۔ ہمارے میزبانوں نے ہمارے آگے دل گھول کر رکھ دیئے ـــــ ہم نے اتنا ممنون خاوند زندگی بھر نہ دیکھا تھا اور نہ اتنی متشکر بیوی۔ ا ـــــ رات گئے ہم نے دوستوں سے رخصت لی تو محسوس ہوا کہ گلی میں شاہِ سویڈن ہمارے لیے نوبل پیس پرائز لیے کھڑے ہیں۔

یہ جاپانی بغیر چابی کے چلتے ہیں

دوسری صبح جاگ کر ناشتے کے لیے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہال میں جاپانی آئے ہوئے ہیں یعنی کچھ اسی تعداد اور انداز میں جیسے ٹڈی دل آیا کرتا ہے، بے شمار مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اور ہر ایک آدھ

دوربین لٹکائے ہوئے ۔ معاً ذہن میں سوال اٹھا کہ کیا یہ سب کے سب جیتے جاگتے حقیقی جاپانی ہیں یا پلاسٹک کے گڈے گڑیاں ہیں ۔ کیونکہ اتنی تعداد میں اصلی جاپانیوں کا جاپان سے باہر یکمشت پایا جانا باور نہ آتا تھا ۔ لیکن بھیڑ سے گزرتے ہوئے ایک دو سے ہمارے دست و بازو چھو گئے تو گوشت پوست کا احساس ہوا ۔ سو یہ سچ مچ زندہ اور چابی کے بغیر چلنے والے جاپانی تھے لیکن گڈے گڑیے ہی تھے ۔ سارا ڈائننگ ہال کھلونوں کی دکان معلوم ہوتی تھی ۔ بہ مشکل ایک آدھ خالی میز پر جگہ ملی ۔ میز کا دوسرا نصف ایک معتبر سے جاپانی کے قبضے میں تھا ۔ بیٹھنے کی اجازت چاہی تو شریف جاپانی اٹھ کر کرسی جھک کر ہمیں پہلے بٹھا کر خود بیٹھنے کی جسارت کی ۔ خیر یہ تو اضع متوقع تھی ۔ جاپانی تو اپنے دشمن کو قتل کرنے سے پہلے بھی کورنش بجالاتے ہیں ۔ پھر اپنے کیے پر انتہائی ندامت کا اظہار کرتے ہیں اور آخر میں پورے احترام سے معزز دشمن کا سر قلم کرتے ہیں ۔

ہم نے اپنے ہم نوالہ ساتھی سے اس تعداد میں جرمنی پر جاپانی یلغار کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ جاپان اب اسی بیماری میں مبتلا ہے جس کا آج تک صرف امریکہ مریض تھا ۔ یعنی فالتو دولت کی بیماری زور یکٹے تو کیمروں ، کاروں ، کارخانوں ، سیر و سیاحتوں اور سرمستیوں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے ۔ ہم نے دل میں کہا : خدایا یہ بیماری پاکستان کو کیوں نہیں لگتی ؟ ایشیا میں جاپان کے بعد گراں خواب چینی بھی سنبھل گئے ہیں ۔ انشاء اللہ اب اگلا نمبر ہمارا ہی ہو ۔ حکیم الامت ہمیں بشارت تو کب کے دے چکے ہیں ۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اور ہر چند کہ سحر کے آثار پیدا ہیں ، تاہم ابھی نور عام ہے نہ ظلمت کے پاؤں ہی میں جنبش آئی ہے بہر حال حکیم الامت کے کہے پر اعتبار ہے ۔ یہ ظلمت ایک دن ضرور چھٹے گی اور پھر ہم بھی گلے میں کیمرے لٹکائے سیر جہاں کو نکل پڑیں گے ۔ ایک باکس کیمرہ تو ہمارے پاس پہلے ہی موجود ہے ۔

اگر ہماری ساری حسرتیں پوری ہو جائیں تو ....

معاف کیجیے گا ہم جاپانیوں اور ان کے کیمرہ مسنوں کو ٹھگانے لگے ۔ آخر دل ہی تو ہے لیکن ناشتے کے بعد قیصر صاحب مرا سے میں شاپنگ کے لیے گئے تو یہی دل جرمن مصنوعات پہ ڈولنے لگا اور اگر جرمن دکانوں اور ان کی کھڑکیوں میں مختلف چیزیں دیکھنے کے بعد ہمارے دل کی جملہ حسرتیں پوری ہو جاتیں تو بازار سے لوٹتے وقت ہم اپنی نئی مرسیڈیز کار میں بیٹھے ہوتے پیچھے ڈگی ، کیمروں اور ٹیپ ریکارڈروں سے بھری ہوتی اور اس کے پیچھے کاروان میں مخملیں سفری بستر ، رنگین ٹی وی سیٹ اور نمکین سوڈا فونٹین فٹ ہوتے اور ہمارے پہلو میں ہماری ریشمیں سکرٹیلی ...... لیکن چھوڑیے ان قصوں کو کہ خواہ مخواہ آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد ۔ مختصر یہ کہ ہم ایک بال پوائنٹ پنسل خرید کر پیدل لوٹ آئے کہ زرمبادلہ یہ اندازہ کھا رہا تھا ۔ بارہ بجنے کو تھے ہوٹل میں پہنچے تو آگے اسکاٹی لارکند کا ڈرائیور سیڈین لیے ہمارا انتظار کر رہا تھا ہمیں حیرت ہوئی کہ اتنا سویرے لنچ کیوں ۔ ڈرائیور سے پوچھا تو بولا :

"سر، ہمیں لنچ تک پہنچنے میں بھی گھنٹہ پون گھنٹہ لگ جائے گا۔"
پوچھا: "سکیلکارس صاحب فرینک فرٹ میں لنچ دے رہے ہیں یا واشنگٹن میں؟"
"ہوٹل شلاس میں جو یہاں سے بیس میل دور ہے۔"
"اس ہوٹل میں کیا خوبی ہے جو بیس میل بیرون شہر جانا پڑتا ہے؟"
"سر، اس میں تین خوبیاں ہیں، ایک تو ہوٹل شلاس کسی زمانے میں شاہی محل رہ چکا ہے اور کسی محل کا شاہی رہ چکنا بڑی بات ہے۔ دوسرے اس کے ساتھ دنیا کا خوب صورت ترین گالف کورس ہے اور کارلی صاحب گالف کے دلدادہ ہیں تیسرے اکثر فیشن ایبل لوگ اسی ہوٹل میں جاکر شادی کرتے ہیں۔ اور کارلی صاحب آج گالف کھیلنے سے پہلے شادی کر رہے ہیں۔"
تو یہ بات تھی۔ کارلی نے یہ سارا اہتمام ہماری سرپرائز کے لیے ہم سے خفیہ رکھا تھا۔ ہم نے کہا:
"لیکن سکیلکارس صاحب نے تو کھانے کے علاوہ ہمیں اپنی سکریٹری دکھانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔"
جی ہاں۔ اپنی سکریٹری کے ساتھ ہی ان کی شادی ہو رہی ہے وہ بھی وہیں ہوگی۔"
یہ ہماری سرپرائز کی پشت پر آخری تنکا تھا۔ خیر، ہم سیڈن میں بیٹھے ہوٹل شلاس کو روانہ ہوئے۔ شہر سے بالکل باہر نکلے اور جرمنی کے سبزہ زاروں سے گزرنے لگے تو پھر وہی جادو ہو گیا جو ہمیں سبزہ زاروں سے گزرنے پر ہوا کرتا ہے۔ ایک مدت کے لیے ہم ہوٹل شلاس، کارلی اور اس کی سکتر کو بھول گئے اور فطرت کی حسین آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسحور بیٹھے گئے۔ لیکن میرے محترم شہری قاری شاید آپ کو بنوں سے وہ عشق نہ ہو جو ہم دیہاتیوں کو ہے۔ لہٰذا آئیے، آپ کو ہوٹل کے اندر لے چلیں۔
ارے یہاں تو ہر طرف امریکی ہی امریکی بھرے پڑے ہیں: لمبے تڑنگے امریکی اور بانکے امریکنیں۔ موٹے امریکی اور بھدی امریکنیں اور وہی ناگزیر کیمرے، گاگلز اور دوربینیں۔ یہ سب کارلی کے براتی تھے۔ لیکن خود کارلی اور اس کی دلہن کہاں ہیں؟ ہم نے ایک لمحے کے لیے ایک خالی کرسی پر کھڑے ہو کر ہجوم کا معائنہ کیا تو ہمیں کارلی اور اس کی سفید پوش دلہن ہاتھ میں ہاتھ لیے مہمانوں سے باتیں کرتے آہستہ آہستہ چلتے نظر آئے۔ ہم نے بلندی سے ہاتھ لہرایا تو کارلی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ ہم نے بڑھ کر کارلی سے ہاتھ ملایا اور مبارکباد پیش کی:
بولا: "شکریہ۔ اور ملیں میری سکریٹری اور (گھڑی دیکھتے ہوئے) نصف گھنٹے کی بیوی، جیکی سے ——— جیکی یہ کرنل خان ہیں، میرے پاکستانی دوست۔"
جیکی نے دلہن بن کر خوب روپ نکالا تھا۔ ہم نے اس سے رسماً مزاج پوچھا اور شرارتاً کہا: "کارلی، اگر ہم تمہاری دلہن کو بتا دیں کہ تم اسے بطور سیکریٹری محض گنوار سمجھتے تھے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟"
بولا: "اگر جیکی کو جواب پر اصرار نہ ہو تو میں خاموش رہنے کو ترجیح دوں گا۔"
جیکی نے بناوٹی غصے سے کہا: "مجھے یقیناً اصرار ہے جواب پر۔"

کارلی بولا: "جانِ من۔ تم بیوی تو بالکل بے نظیر ہو مگر بطور سکریٹری تم گزارے کے لیے بھی ناکافی ہو۔ تمہاری جگہ ٹائپ کرکرکے میری تو انگلیاں فگار ہوگئی ہیں۔"

اور یہ کہہ کر اس نے معائنے کے لیے ہمارے سامنے اپنی انگلیاں پھیلادیں۔ لیکن جیکی نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آنکھیں بند کرکے انہیں اپنے سینے سے لگا لیا ـــــ نئی شادی کی محبت بڑی طوفانی ہوتی ہے اور ہاتھوں کو سینے سے لگانا تو ہوائے محبت کا نرم سا جھونکا تھا۔

کارِ جہاں دراز ہے

ہم کارلی سے بہت دیر باتیں نہیں کرسکتے تھے کہ بہت سے دوسرے مہمان مبارکباد دینے کے لیے اس کی راہ میں کھڑے تھے۔ اور جب یہ راہ طے کرچکا تو اس کے سامنے دروازے کے باہر شلاس کا مخملیں گالف کورس تھا۔ جہاں گالف کے کھلاڑی اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ کارلی نے دوستوں کی بے تابی کو بھانپ کر جیکی کو اجازت طلب نگاہوں سے اپیل کی۔ جیکی نے جواب میں فقط اپنی محبت طلب آنکھوں سے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ ایسے فصیح جواب کے آگے جملہ دلیلیں باطل اور اپیلیں بے بس ہوجاتی ہیں۔ گویا کارلی کی اپیل سرسری سماعت پر ہی نامنظور ہوگئی اور بے چارا کچے دھاگے میں جکڑا جیکی کے ساتھ ایک کمرے کی سمت روانہ ہوگیا۔ گالف کے کھلاڑیوں کا خیال تھا کہ کارلی کھیل کے لیے لباس تبدیل کرنے جارہا ہے لیکن ایک مدت گذرگئی اور کارلی باہر نکلا اور نہ کوئی پیغام ہی آیا سوائے ایک مصرعے کے جو حجلۂ عروسی کے کسی روزن سے نکل کر مہمانوں میں منادی کرنے لگا:

"کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر"

کارلی کے ہوٹل سے اپنے ہوٹل کو لوٹے تو ہمارے پاس اتنا ہی وقت تھا کہ سامان باندھ کر ایرپورٹ پر پہنچیں اور پہنچ کر معلوم ہوا کہ استنبول جانے والے جہاز کے آخری مسافر ہم ہی ہیں۔

○○

ممتاز مزاح نگار

خواجہ عبدالغفور

کے مضامین کا مجموعہ

سمن زار

قیمت ۸ روپیے

بتوسط شگوفہ

ناظر خیامی

خمار بارہ بنکوی

ناظر خیامی لکھنوی کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ یہ خاندان ہمیشہ سے علم وادب اور زہد وتقویٰ کا مرکز رہا ہے۔ اس خاندان میں مولوی سبط حسن، مولوی علی نقی مجتہد، مولوی کلب حسین مجتہد، ذاخر لکھنوی، اولاد حسین شاعر لکھنوی (للن) اور سالک لکھنوی جیسے باکمال پیدا ہوئے۔ آج بھی مولوی کلب عابد، ڈاکٹر کلب صادق مہدی نظمی اور ماہر لکھنوی اس گھرانے کا نام روشن کئے ہوئے ہیں ناظر مرحوم مولوی اولاد حسین شاعر کے فرزند تھے جو ایک قادر الکلام شاعر اور جادو بیان خطیب تھے۔ مرحوم نے انہیں سے تعلیم وتربیت پائی۔ اپنی بے پناہ ذکاوت وذہانت کے باعث بہت جلد انھوں نے شاعری وذاکری پر عبور پالیا۔ ابتدا میں انھوں نے ذاکری کرنا شروع کی۔ ان کی سحر بیانی سے اس وقت کے دوسرے ذاکرین کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ناظر کے سامنے ان کا چراغ روشن نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ ایک منظم سازش کے ساتھ انہیں شراب نوشی پر لگا دیا۔ مرحوم مرزا غالب کے حد شدت پسند تھے انھوں نے شراب پینا شروع کی تو شراب نوشی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ذاکری ترک کر دی اور شعر کہنے لگے۔ شروع میں ناظر سنجیدہ شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ اس زمانے کا ان کا یہ قطعہ زبان زدِ خاص وعام ہوا ؎

شاداب ادائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
مخمور فضائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
جوڑے کو ترے دیکھ کے آیا یہ خیال
ساون کی گھٹائیں بھی سمٹ سکتی ہیں

کچھ دنوں بعد وہ طنز ومزاح کی طرف مائل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اس میدان میں ایک منفرد مقام کے مالک بن گئے۔ اور ان کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔ ملک کا کوئی بھی بڑے سے بڑا مشاعرہ ناظر کے بغیر پھیکا پھیکا نظر آنے لگا۔ ان کی طنزیہ نظموں میں غالب اللہ کے حضور، اور مرا رجی سے دو دو باتیں، بہت مشہور ہوئیں۔ ان کا ایک طویل قطعہ جس کا عنوان "مہترانی" ہے بھی بے حد پسند کیا گیا۔ وہ قطعہ

بندے کا پورا مجھے یاد نہیں لیکن اس قطعہ کے سلسلہ میں مرحوم کا دوسرا قطعہ یاد ہے۔ آپ بھی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ہائے کمبخت میری فکرِ رسا
خوب مجھ کو ذلیل کروایا
"مہترانی نے جو قطعہ میرا سنا
چیر کے بیوی نے میری مجھ سے کہا
دل بھی آیا تو مہترانی پہ
جھاڑو پھر جائے اس جوانی پہ

ہندوستانی فلم اسکرین کی عظیم ترین اداکارہ مینا کماری خوب پیتی تھی۔ مرنے سے قبل ڈاکٹروں کے مشورے پر مینا نے مے نوشی ترک کر دی تھی۔ وہ اپنی زندہ جاوید فلم "پاکیزہ" کی نمائش کے چند دن بعد ہی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس وقت ناظر نے یہ برجستہ قطعہ کہا۔

مینا کی موت میرے لیے تجربہ بنی
ناظر شرابِ ناب نے مجھ کو بچا لیا
مینا شراب پیتی تھی رہتی تھی سب کے ساتھ
پاکیزہ بن گئی تو خدا نے بلا لیا

مرارجی نے جب پیشاب نوشی کا اعتراف کیا تو ناظر مرحوم نے بڑے اچھے اچھے قطعات کہے، ایک قطعہ کے آخری دو مصرعے مجھے یاد ہیں ؎

نالی میں جو بہتے تھے وہ منھ تک پہونچے
پیشاب کے قطروں کی ترقی دیکھو

اسی طرح لکھنؤ میں جب شراب بندی ہوئی تو ناظر نے کہا ؎

اب بہت دشوار جینا ہو گیا
لکھنؤ مکہ مدینہ ہو گیا

ناظر مرحوم ریا اور منافقت سے قطعاً ناواقف تھے۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ شراب پیتے تھے اور ڈنکے کی چوٹ پر پیتے تھے۔ دوسروں کی طرح چھپ چھپ کر نہیں پیتے تھے۔ وہ خلوص اور محبت کا پیکر تھے۔ اس خود غرض ریاکار اور کاروباری دور میں ناظر جیسے بے لوث بے ریا اور مخلص انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ حالی کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے ؎

بہت جی خوش ہوا ناظر سے مل کر
ابھی انسان باقی ہیں جہاں میں

ناظر کیا مرے، انسان مر گیا۔ ناظر کی ایک اور بڑی خوبی تھی، وہ بے حد نڈر، بے باک اور صاف گو تھے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ مرکز اور ریاستوں کے وزرا مشاعروں میں موجود ہیں، اراکینِ مشاعرہ ناظر سے درخواست کر چکے ہیں کہ وہ ایسی نظمیں یا قطعات

قطعات نہ پڑھیں جن میں ارباب حکومت پر تنقید کی گئی ہے مگر ناظر پڑھنے کھڑے ہوئے تو انھوں نے وہی کلام پڑھا جسے سنانے سے انہیں روکا گیا تھا۔

ناظر مرحوم نے میری خدمتیں کی تھیں، کیا معلوم تھا کہ ان خدمتوں کے بدلے وہ مجھ سے ایسی خدمت لیں گے جو تمام عمر مجھے تڑپاتی رہے گی۔ ۷ جولائی کو وہ میرے ہمراہ بجنور (یوپی) کے مشاعرے میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ ۸ جولائی کی صبح کو ہم دونوں لکھنو واپس ہوگئے۔ واپسی پر ٹرین ہی میں ان پر شدید ترین قلبی دورہ پڑا (اس سے قبل وقفہ وقفہ سے دو ادر شدید ترین قلبی دورے ان پر پڑ چکے تھے) اور یوں گھنٹے کے اندر اندر انھوں نے میرے ہاتھوں پہ دم توڑ دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مرتے وقت ان کی عمر چوالیس برس کی تھی۔ گھر پر ان کی بیوی بچے ان کی واپسی کے منتظر تھے۔ میں آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ رات کے دس بجے ناظر کی لاش ان کے اعزا و اقربا کے سپرد کی۔ راستے میں بے اختیار یہ قطعہ موزوں ہو گیا تھا۔

جو مرے ساتھ رہا خلوت و جلوت میں خمار
اس نے رستے میں اکیلا ہی مجھے چھوڑ دیا
موت برحق ہے مگر ہائے لیے مرگ ناظر
میرے ہاتھوں پہ اک انسان نے دم توڑ دیا

۰۰

انتخابِ کلام — ناظر خیامی

فیصلہ

جنوں بدوش تو دیوانگی کے ساتھ رہے
سیاہیوں کے نہ تو روشنی کے ساتھ رہے
مجھے یہ فکر نہیں تو کسی کے ساتھ رہے
جہاں بھی تو رہے لیکن خوشی کے ساتھ رہے
یہ جانتا ہوں سرِ دار یاد آئیں گے!
وہ تیرے گیسوئے خم دار یاد آئیں گے
وہ تیرے پھول سے رخسار یاد آئیں گے
بُنا دتیں نہ رکیں جبر و انقلاب سے بھی
یہ اُوس اٹ نہ سکی روح کے عتاب سے بھی
یہ دل بہل نہ سکا نکہتِ گلاب سے بھی
یہ زخم بھر نہ سکا مرہمِ شباب سے بھی
بجائی جائے گی ڈھولک سجائی جائے گی تو
مری نگاہ سے یکسر چھپائی جائے گی تو
کسی کے سیج کی زینت بنائی جائے گی تو
نقوشِ چشم کو کاجل سے جب بھائیں گے
ترے جمال کو کچھ اور بھی نکھاریں گے
سہیلیوں کے پہرے جب تجھے سنواریں گے
تری کلائی کے کنگن مجھے پکاریں گے

وہ تیری زلفِ مسلسل کی آہنی زنجیر
وہ تیرا جسم کہ جیسے کڑی کمان کا تیر
وہ تیری مدبھری آنکھوں میں موج مئے کی لکیر
سدا تو شاد رہے میرے خواب کی تعبیر
ہے موت دور مری زیست کے سفینے سے
جو تو نے کر دیا مایوس مجھ کو جینے سے
مجھے لگا لیا بنتِ عنب نے سینے سے
مہک شراب کی آنے لگی پسینے سے
غمِ حیات دیا خیر کوئی بات نہیں
مرے لبوں کو سیا خیر کوئی بات نہیں
مجھے تباہ کیا خیر کوئی بات نہیں
کسی بھی آنکھ کے کاجل سے پیار کر لوں گا
کسی بھی زلف کے بادل سے پیار کر لوں گا
میں تجھ سے چھوٹ کے بوتل سے پیار کر لوں گا
بس اب فسانوں میں گزرے گی زندگی میری
غلط بیانوں میں گزرے گی زندگی میری
کھلے ٹھکانوں میں گزرے گی زندگی میری
خراب خانوں میں گزرے گی زندگی میری
سدا تو شاد رہے میرے خواب کی تعبیر

●

وہ نظر کیا رخِ ساقی پہ جو موڑی نہ گئی
بخدا کیا وہ توجہ کہ جو توڑی نہ گئی
لاکھ لاحول پڑھی حفظِ تقدس میں مگر
شیخ سے جام میں اک بوند بھی چھوڑی نہ گئی

●

نہلا رہا تھا سردی میں بلی کو ایک شخص
میں نے کہا کہ سردی سے مر جائے گی یہ یار
کہنے لگا کہ جاؤ کرو اپنا کام تم!
سن کر یہ بات ہو گیا موٹر میں میں سوار
لوٹا جب اپنے کام سے تو دیکھتا ہوں کیا
بلی مری پڑی ہے وہ بیٹھا ہے سوگوار
رک رک کہا یہ میں نے کہ آخر کو مر گئی
سن کر یہ بات بولا مری ہو کے بے قرار
یہ ہے غلط کہ سردی سے بلی گذر گئی
میں نے اسے نچوڑ دیا اس سے مر گئی

●

کیا گنہ گار پہ ہو سکتی نہیں ہے رحمت
کیا کبھی بر نہیں آ سکتی ہے دل کی حسرت
جس کو تو چاہے گا رہ جائے گا بتلا زاہد!
کیا ترے باپ کی بنوائی ہوئی ہے جنت

●

اک شرابی کے مسلمان بنانے والے
جال میں حور کے رندوں کو پھنسانے والے
ہیں اگر ہم جو گنہ گار سزا دے گا خدا
تم بھلا کون ہو ٹانگ اپنی اڑانے والے

کیا کوئی جرم ہے دلدادۂ آب ہی ہونا
کیا خطا ہے کوئی شیدائے گلابی ہونا
شیخ کہتا ہے جو کچھ کاتبِ تقدیر سے کہہ
میری قسمت ہی میں لکھا تھا شرابی ہونا

●

زاہدوں کو بتاؤ کیسے بتائیں
منظرِ کیف کس طرح سے دکھائیں
ایسی کھلتی ہے کاگ بوتل کی
لڑکیاں جیسے انگلیاں چٹخائیں

●

ہر کارِ جنوں اب تو جوابی ہو جائے
ایمان میں تیرے بھی خرابی ہو جائے
اے شیخ وہ وقت آئے کہ اللہ کرے
میری ہی طرح تو بھی شرابی ہو جائے

●

دماغِ کیف پرور میں بسی تھی تلخ تر بدبو
تری بوسیدہ ساڑھی کا پڑا تھا ریشِ پہ پلو
کمر پہ ٹوکرا سینہ میں دل اور ہاتھ میں جھاڑو
خرامِ تیز جیسے چوکڑی بھرتا ہوا آہو
ہے صناعِ ازل کے مرمریں ڈھالے ہوئے بازو
کمر میں لوچ آنکھوں میں دمکتے یمان شکن ابرو
جبیں مہتاب چہرہ چاند اور کالی گھٹا گیسو
وہ شہزادی ہو جیسا مہترانی سب پہ آتی ہے
تمہیں معلوم ہے ناظر جوانی سب پہ آتی ہے
ارے کم بخت میری فکر رسا نے تو نے مجھ کو ذلیل کروایا
مہترانی قطعہ جو میرا سن کے بیگم نے مری مجھ سے کہا
دل بھی آیا تو مہترانی پہ جھاڑو پھر جائے اس جوانی پہ

•

وطن کے نامی گرامی مرارجی سن لیں
شراب بندی کے حامی مرارجی سن لیں
تمام ملک کی بدنامیوں پہ کرکے نظر
حضور آپ چھڑانے چلے شراب مگر
شراب قلب و جگر کو سکون دیتی ہے
شراب نقطۂ حرارت کو خون دیتی ہے
شراب مرکز انوار حق پناہی ہے
شراب اہل گلستاں کی کج کلاہی ہے
شراب گونگوں کو طرز بیان دیتی ہے
شراب اہل ادب کو زبان دیتی ہے
شراب کفر نہیں ہے شراب ایماں ہے
شراب درد نہیں ہے شراب درماں ہے
شراب خانے سے کیوں دور دور رہنے لگے
شرابیوں سے خفا کیوں حضور رہنے لگے
یہاں اُدھم نہیں مچتا اسمبلی کی طرح
یہاں بدلتے نہیں لوگ لیڈری کی طرح
یہاں نہ آپسی جھگڑے نہ باہمی رنجش
یہاں خلوص کے بادل بہار کی بارش
گناہ گاروں کو راہ نجات ملتی ہے
یہاں شکستہ دلوں کو حیات ملتی ہے
ہر ایک ذرّہ یہاں آسمان ہوتا ہے
یہاں ضعیف بھی آکر جوان ہوتا ہے
یہاں مرہٹی کوئی یہاں نہ بنگالی
یہاں تعصب ذہنی کا نام ہے گالی
یہاں نہ شیعہ نہ سنی نہ برہمن نہ پیر
یہاں نہ کوئی گورنر یہاں نہ کوئی وزیر
یہاں نہ پنڈت و مُلّا کی ذہنی عیاشی
یہاں نہ مسجد و مندر، نہ کعبہ و کاشی
یہاں کے ذہنوں پہ حاوی نہ کفر نہ اسلام
یہاں نگاہ میں تُلتا ہے زندگی کا نظام
یہاں نہ بیدی کی حاجت ہے اور نہ لُٹیا کی
یہاں نہ داڑھی کی عزت ہے اور نہ چوٹیا کی
یہاں حلال ہے ہر وقت رسم مے نوشی
یہاں حرام ہے لیکن ذخیرہ اندوزی
بجھاؤ قمقمۂ آفتاب تو جانیں
چھڑاؤ ہم سے بھلا تم شراب تو جانیں
شراب کھیتی ہے ارباب زندگی کے لیے
شراب کھیتی نہیں ہے مرارجی کے لیے
یہاں ودھان سبھا کی طرح کے چور نہیں

•

یہ میرا قول ہے خیال رہے
وقت پُر ہول ہے خیال رہے
شادی کرنے کو کیجیے لیکن
برتھ کنٹرول ہے خیال رہے

•

نہ وہ آب رواں ہیں، اور نہ طوفاں ہیں
آرزو کتنی دل میں باقی ہیں نہ اب ارماں ہیں
اک جواں کہتا ہوا نکلا یہ نس بندی کے بعد
ہم سے ملیے آئیے، ہم بے ضرر انساں ہیں

•

یہ سان پہ رکھا ہوا خنجر تو ہٹا
ہونٹوں میں نہ چبھ جائے یہ نشتر تو ہٹا

اے شیخِ حرم چوموں گا تیرے گالے
چہرے سے ذرا ڈاڑھی کا مفلر تو ہٹا

•

مجھ کو افسوس نہیں تم جو برا کہتے ہو
میں نے مانا، میں شرابی ہوں بجا کہتے ہو
لیکن اک بات ہے اس کو بھی بتاتے جاؤ
خونِ انساں جو پیے تم اسے کیا کہتے ہو؟

•

افلاس و غم و یاس کو کھو دیتا ہوں
تقدیر کا لکھا ہوا دھو دیتا ہوں
وہ اور ہے دنیا نے ڈبویا ہے جسے
میں جام میں دنیا کو ڈبو دیتا ہوں

•

کیا میں دل و نگاہ کا سینا بھی چھوڑ دوں
نظارہ ہائے کوئے حسینہ بھی چھوڑ دوں
جھوٹی تسلیاں بھی نہ دوں اپنے دل کو میں
یاروں کی آرزو ہے کہ پینا بھی چھوڑ دوں!

•

سب مانی و بہزاد کے فن ٹوٹ گئے
آئینۂ رنگیں کے بدن ٹوٹ گئے
وہ زورِ جوانی تھا کہ اللہ غنی
انگڑائی جو آئی تو بدن ٹوٹ گئے

•

اسٹیل ہو گئے، کبھی فولاد ہو گئے
واللہ حسن و عشق کی بنیاد ہو گئے
کل رات ان کو دیکھ کے شیطان نے کہا
لو آج ہم بھی صاحبِ اولاد ہو گئے

اس وقت کہ جب دوست دغا دیتے ہیں
اس وقت کہ جب اپنے بھلا دیتے ہیں
ہم ہاتھ میں پیمانہ اٹھا کر ناظر
دنیا کو نگاہوں سے گرا دیتے ہیں

•

زندگی کا اصول ہو جیسے
کافروں میں رسول ہو جیسے
شبِ تاریک میں ہے یوں مہتاب!
تیرے جوڑے میں پھول ہو جیسے

•

شاداب ادائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
مخمور فضائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
جوڑے کو ترے دیکھ کے آیا یہ خیال
ساون کی گھٹائیں بھی سمٹ سکتی ہیں

•

امینِ کیف و وفا ہوں میں تن فروش نہیں
سمجھئے ہوش میں مجھ کو کرم فروش نہیں
جنابِ حضرتِ واعظ رہے یہ گوش گزار
میں بادہ نوش ہوں لیکن حرم فروش نہیں

•

آغوشِ مئے و جام کے بالوں کا کور ہے
گوروں کا کور اور ہے کالوں کا کور ہے
بوسوں سے بچا لیتی ہے چہرے کو ہمارے
ڈاڑھی نہیں اے دوست یہ گالوں کا کور ہے

•

کل اک جوان جوڑا سینما کے روبرو
ہنس ہنس کے کر رہا تھا کچھ اس طرح گفتگو!

جیسے زمیں کے بوسے کو جھکتا ہے آسماں
جیسے غریب فکر میں روزی کے ہو رواں
جیسے بہار گا نٹھے سواری بہار پہ
جیسے دھنک کا رنگ رخِ آبشار پہ
جیسے کسی کتاب کا رنگین تر ورق!
جیسے لباسِ قوس میں دوشیزۂ شفق
قاتل کے روبرو کوئی قاتل ہو جس طرح
آئینہ آئینے کے مقابل ہو جس طرح
یوں بے خیالیوں میں چلاتے تھے ہاتھ پاؤں
جیسے خرام ناز میں مصروف دھوپ چھاؤں
اک دوسرے کے کاندھے پہ رکھ رکھ کے ہاتھ!
ہونٹوں کا رس بھی پیتے تھے سگریٹ کے کش کے ساتھ
میں آب و تابِ زیست سے گھبرا کے رہ گیا
ہر راہ گیر راہ میں للچا کے رہ گیا

●

وہ ناظر ریل ہو یا ہو پسنجر لیٹ جاتی ہے
مسلسل لیٹ جاتی ہے برابر لیٹ جاتی ہے
کوئی چپکے سے جا کر یہ مری سرکار سے کہہ دے
میں جس گاڑی پہ چڑھتا ہوں وہ اکثر لیٹ جاتی ہے

●

اوروں کے لئے کچھ اور بھی لوں تو چلوں
میں دامن صد چاک کو سی لوں تو چلوں
بس بس ملک الموت فقط اتنی دیر!
جو جام میں باقی ہے وہ پی لوں تو چلوں

●

کیسے ذرا کچھ سوچ کے ایسی ہوں گی!
ایسی نہیں منظور تو ویسی ہوں گی!

یہ بات بتانا ہی پڑے گی اے شیخ!
جنت میں جو حوریں ہیں وہ کیسی ہوں گی

●

کرکے میں ہائے ہو نہیں پیتا
جا کے میں کو بہ کو نہیں پیتا
میں تو پیتا ہوں مے مگر ناظر
مفلسوں کا لہو نہیں پیتا

●

یہ اونچی ہیل چپل، یہ تنگ تر شلوار
کھنچا کھنچا سا یہ جمپر، یہ جمپی رخسار
یہ الجھے الجھے سے گیسو کہ جیسے ابرِ بہار
کھنچے کھنچے سے یہ ابرو کہ جس طرح تلوار
جھکی جھکی سی یہ پلکیں کہ جیسے شامِ نگار
یہ لانبے لانبے سے بازو، سڈول اور گردار
ہر ایک جسم کا حصہ نگاہِ بد کا شکار
ہمارے عہدِ ترقی کی یہ امانت ہے
قسم خدا کی یہ دنیا نہیں ہے جنت ہے

●

وہ تیری آنکھیں کہ تاروں پہ جس طرح مضراب
وہ تیری چال کہ پانی میں جس طرح مہتاب
وہ تیرے عارضِ رنگیں کہ سرخ سرخ گلاب
وہ تیرا جسم کہ شیشے کے پیرہن میں شراب
یہ دن دکھائے محبت کی حکمرانی نے
تباہ کر دیا مجھ کو تری جوانی نے

●

مینا کی موت میرے لئے تجربہ بنی
ناظر شراب و شعر نے مجھ کو بچا لیا
مینا شراب پیتی تھی رہتی تھی سب کے ساتھ
پاکیزہ بن گئی تو خدا نے بلا لیا

رشـــیـــد الدین

ہمارے نرالے دوست

جناب، دوستوں کی ان دنوں کمی نہیں۔ کیا گھر کیا باہر، کیا اڑوس کیا پڑوس اور کیا کوچے جدھر منہ اٹھایئے دوست چلے آتے ہیں۔ اور ہوٹلوں، پارکوں، دفتروں اور کالجوں کا کیا کہنا یہ تو دوستوں کے اصل مراکز ہیں ہی جہاں دوست یوں ڈھالے جاتے ہیں جیسے ٹکسال میں سکّے۔ قصّہ مختصر یہ کہ فی زمانہ وہ کونسی جگہ ہے جہاں خدا کی یہ مخلوق نہ پائی جاتی ہو اس طرح وہ لوگ جو ہمارے اس دور کو "خلاء کا دور" کہتے ہیں سخت غلطی پر ہیں۔ اس دور کو تو اصل میں دوستوں کا دور کہنا چاہیے اور کیوں نہ ہو زمانہ بھی تو آج کل عالمی بھائی چارگی اور خیر سگالی کا ہے۔ آج کے اس پُر آشوب دور میں کوئی ملک یا قوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر نہیں کرسکتا۔ پھر فرد کی کیا بساط ہے۔ فرد تو بہر حال فرد ہوتا ہے جو مفکر اعظم ارسطو کے الفاظ میں "سماجی جانور" ہے بھلا یہ سماج سے کیونکر الگ رہ سکتا ہے یا اپنے حرکات و سکنات اور سرگرمیاں کس طرح صرف اپنی ذات تک محدود رکھ سکتا ہے۔ اسے ایک سماجی جانور ہونے کے ناطے اپنے دوسرے بھائیوں کو بور کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ یہ دوستوں کا دور ہے اور دوست بھی ایسے جفا والا کہ کسی زمانے میں بھی کسی بندہ خدا کو ان سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا چونکہ آج زمانہ ترقی کرگیا ہے اس لیے دوست بھی ترقی یافتہ ہوگئے ہیں۔ آج کی دنیا میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں اور چونکہ دوست بھی ان ہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں اس لیے ان کا بھی بھانت بھانت کا ہونا ضروری ہے آیئے ہم اس بھیڑ میں ایک دوسرے کو تلاش کریں کیونکہ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کا تو دوست ہوگا ہی۔ آج کا آدمی بھیڑ کا آدمی ہے وہ گوشہ نشین نہیں اس لیے اس بھیڑ میں کسی کو تلاش کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن دوستوں کا معاملہ اس سے الگ ہے کیونکہ آپ سب کچھ بھول سکتے ہیں کسی دوست کو نہیں بھول سکتے۔ وجہ کے لیے ہم حضرت غالبؔ سے رجوع ہوتے ہیں ؎

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھائے
جو دوستوں سے اپنے ہم دیکھتے ہیں

بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو تکلیف اپنوں سے پہنچتی ہے وہ غیروں سے نہیں۔ پہلے یہ بات کچھ حلق سے نہیں اترتی تھی لیکن اب جبکہ ہم مسلسل ۲۰ سال سے عملی زندگی کی چکی میں پِس رہے ہیں تو بزرگوں کی دانائی کا قائل ہونا پڑا اور کیوں نہ ہو انھوں نے بھی یہ دانائی یوں ہی نہیں سیکھ لی تھی بلکہ اس کیلیے، انھیں بھی بڑے دھوکے کھانے پڑے تھے۔

پہلے زمانے میں غم گساری، چارہ سازی اور دوستی ایک ہی مثلث کے تین زاویئے تھے لیکن اب زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ مثلث ایک خطِ مستقیم میں تبدیل ہو گیا ہے اور اس طرح ان تینوں کا مل جانا لگتا ہر محال ہی نظر آتا ہے۔ اس لیے دوستوں سے غم گساری یا چارہ سازی کی توقع ہی فضول ہے۔ البتہ ذہنی طور پر آپ کو اپنے دوستوں کی جانب سے ہر طرح کی دل آزاری سہنے اور پند و نصیحت سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ غالب علیہ الرحمہ کو بھی اپنی زندگی میں ایسے دوستوں سے سابقہ پڑا تھا۔ اسی لیے تو ایسا تڑپتا ہوا شعر کہا ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

ناصح دوست بہرحال ان دوستوں سے بہتر ہوتے ہیں جو ہر وقت آپ کی بدخواہی میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بظاہر آپ کی دوستی کا دم بھرتے ہیں لیکن در پردہ آپ کی کاٹ میں لگے رہتے ہیں۔ آپ کی ترقی یا خوشحالی انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ لیکن آپ کی پریشانی اور درماندگی پہ ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ آپ خواہ کتنا ہی بڑا تیر ماریں ان کے کان پہ جوں تک نہیں رینگتی۔ لیکن جہاں آپ سے تھوڑی سی لغزش ہو جائے ان کے ہاتھ ایک موقعہ آ جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں مرحوم سلیمان اریب کہہ گئے ہیں ؎

دوستی کے پردے میں دشمنی بھی دیکھی ہے
کون کتنا مخلص ہے یہ بھی ہم سمجھتے ہیں

ہمیں بھی ایک ایسے دوست سے سابقہ پڑ گیا تھا لیکن کئی سال تک انھیں جھیلنے اور ان کی دوستی نما دشمنی کا شکار رہنے کے بعد ہم نے بہ مشکل تمام ان سے گلو خلاصی حاصل کی۔ لیکن یہ آج بھی یکطرفہ گلو خلاصی ہے کیونکہ وہ ہمیں آج بھی اپنے دوستوں کی فہرست سے خارج کرنے کے لیے تیار نہیں اور ہماری ہر کامیابی پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور ہر ناکامی پر بغلیں بجاتے ہیں۔ جب کہ ہمارا یہ حال ہے ہم یہ بھی بھول چکے ہیں کہ ایسے کسی شخص سے ہماری کبھی دوستی بھی تھی کیونکہ ہم یاروں کے یار اور دشمنوں سے بیزار قسم کے آدمی نہیں۔ ہمارے یہ سابق دوست اصل میں غالب کے اس خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

جہاں بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کی کسی بھی چیز سے متاثر ہونا نہیں جانتے وہیں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بس متاثر ہونے کے لیے کسی بھی موقعہ کے متلاشی ہوتے ہیں آپ نے کوئی اچھا کام کیا اور یہ لگے آپ کو چنے کے دَرخت

بھلانے۔ ایسے لوگوں کو عرف عام میں خوشامدی کہا جاتا ہے یہ آپ کی ذات میں ایسی ایسی خوبیاں تلاش کر لیتے ہیں کہ جن
ے خود آپ بھی لاعلم رہتے ہیں۔ ایسے دوستوں پر تالاش کی اصطلاح صادق آ سکتی ہے اور وہ مثل تو آپ نے سنی ہی ہو گی
نادان کی دوستی جی کا کال۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ
لہ نادان کہلائیں وہ نادان ہرگز نہیں رہتے بلکہ اپنے کو نادان بنا کر اصل میں آپ کو بے وقوف بناتے ہیں۔ ایسے لوگ
طیر اکبر کے اس نسخہ پر عمل پیرا رہتے ہیں کہ

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں

اس لیے ان کا یہ عمل یعنی اظہار خوشنودی کسی خلوص پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس میں ان کی غرض شامل ہوتی ہے اور یہ
بسا کر کے محض اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں ان کو نہ کسی کی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ترقی سے سروکار بلکہ وہ
من سب کو ملا کر رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن نتیجتاً کسی کو بھی ملا کر نہیں رکھ سکتے۔ پھر بھی بعض نا سمجھ لوگوں
یہ الّو بنا کر اپنا الّو سیدھا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک ایسے ہی خوشامدی دوست راستہ میں ایک صاحب
بڑے تپاک سے ملے۔ سلام کیا، ہاتھ ملایا۔ ان کی خیریت پوچھی، پھر ان کی بیوی بچوں اور رشتہ داروں کی خیریت پوچھی
راس تپاک سے انھیں رخصت کر کے آگے بڑھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب سے خاص
لق خاطر رکھتے ہیں اور کافی طویل عرصہ سے ان سے واقف ہیں تو انھوں نے جواب دیا۔ جی صاحب، لعنت بھیجئے
ق خاطر پر اور بھٹکار ہو طویل شناسائی پر۔ میں تو صرف اہل محلہ ہونے کی وجہ سے ان کا چہرہ شناسا ہوں اور یہ بھی
یں جانتا کہ ان کے کوئی اہل و عیال یا عزیز و اقارب بھی ہیں۔

ہمارے ایک اور ایسے ہی کرم فرما ہیں۔ جب بھی ملتے ہیں کہتے ہیں "اجی آپ تو ہند و پاک کے مسلمہ ادیب ہیں"۔
جل ہی ہم نے پیٹھ پلٹائی یہ کہتے ہوئے پائے۔ اجی کہاں کے ادیب و دیب ادھر سے نقل ادھر سے اصل کر کے مضمون
رکر لیتے ہیں اور کیا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں غالب خوش کلام کہہ گئے ہیں

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں آپ کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ ان کی دلچسپی کا محور خود
لی اپنی ذات ہوتی ہے۔ جب بھی ملیں گے اپنی ہی کہیں گے اور انداز بیان کچھ اس قسم کا ہوگا کہ

جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوتا

ایسے لوگ ماضی کے سہارے جیتے ہیں، حال پر بوجھ بنے رہتے ہیں اور جن کا مستقبل عام طور پر تاریک ہوتا
،۔ یہ پدرم سلطان بود کی مثال ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے خاندان اور حسب نسب کا ذکر لے بیٹھتے ہیں۔ ایسے لوگ
پنے بچوں کی ذہانت، اپنی بیوی کے سلیقہ اور اپنے نوکروں کے جنتی ہونے کا آپ سے ذکر کیے بنا نہیں رہ سکتے حالانکہ
ن کے بچے انتہائی کند ذہن ان کی بیوی انتہائی جاہل اور نوکر سرے سے غائب ہوتے ہیں۔ ہم اپنے ایسے دوستوں کی
ن کو ہمیشہ طرح دے جاتے ہیں کہ بے چاروں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔

دوستوں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو اپنی ہی ہانکنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ہانکتے رہنے کے لیے کسی موضوع کا ہونا ضروری نہیں ہوتا اس لیے اکثر بے پر کی اُڑاتے ہیں مثلاً آپ کسی ایسے دوست سے ملیے بس وہ ملتے ہی پچھلی ملاقات سے اب تک ان کی ذاتِ ناتواں پر جو کچھ گزری وہ سب بلاکم وکاست بیان فرما دیں گے۔ بھلا اس سے آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ دوستی ہے اس لیے دوستی میں سب کچھ روا ہوتا ہے۔ ہر بار جب یہ آپ سے ملتے ہیں ایک نئی اور سنسنی خیز خبر ضرور اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور کسی وقت اتفاق سے کوئی خبر نہ ملے تو اپنی طرف سے بھی گھڑنے کم نہیں کرتے۔ کیونکہ خبر انھیں بہر حال سنانی ہوتی ہے ورنہ ان کے معمول میں فرق جو آئے گا۔ اکثر یہ خبریں کسی بڑے شاعر ادیب کے انتقال یا ان کے درمیان جھگڑے سے متعلق ہوتی ہے۔ یا پھر کسی نئی کتاب کے چھپنے یا کسی نئے مضمون کی اشاعت کی بابت ہوتی ہے۔ لیکن ادیبوں یا شاعروں کے درمیان جھگڑا یا ان کا انتقال روز نہیں ہوتا اس لیے تان آکر فلموں پر ٹوٹتی ہے۔ کیونکہ فلم تو بہر حال روز ریلیز ہوتے ہیں۔

بعض دوست اس کے بالکل الٹ ہوتے ہیں۔ لیے دیئے خصوصی موتی سے خاموش بے زبان کم آمیز و اپنے خول میں بند۔ آپ نے کچھ پوچھا اور منہ ہی منہ میں جواب دے دیا۔ ایسے لوگ بہت با تکلف، باوضع اور نوک پلک سے درست ہوتے ہیں۔ جب تک آپ سے ملیں گے اس طرح رہیں گے کہ معلوم نہیں کہاں آکر چھپیں گے۔ کب اس سے ٹوٹے اور رہائی پائیں۔ ایسے لوگوں سے ملنے کے بعد آپ کو استاذ ذوق کا یہ مصرعہ بے تحاشا یاد آجاتا ہے کہ ع

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

لیکن فی زمانہ ایسے دوستوں کی تعداد کم ہی پائی جاتی ہے۔

قرض کو ہمیشہ دوستی کی قینچی کہا گیا ہے مگر ہمارے بہت سے دوست ہم سے مسلسل قرض لیے جا رہے ہیں اور دوستی بھی برقرار ہے۔

اب آپ اسے ہماری شرافت نفس کہہ لیجیے کہ ان کا خلوص کہ باوجود قرض لینے کی روش میں فرق نہیں آنے دیتے ہمارے ایک دوست ہیں۔ ہمیشہ اس طرح قرض مانگتے ہیں جیسے قرض نہیں مانگ رہے ہیں بلکہ اپنا پیا تا قرض وصول کر رہے ہیں۔ پھر ان کے پاس قرض لینے کے لیے کسی بڑی رقم کی شرط بھی نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک روپیہ کا قرض لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ چھوٹے قرض کا فائدہ یہ ہوتا ہے مگر اسے واپس کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر وہ قرض ہمیشہ پیسوں کے حساب سے مانگتے ہیں۔ مثلاً انھیں ایک روپیہ مانگنا ہو تو وہ کہیں گے ایک سو پیسے تو دینا۔ پانچ روپیہ مانگنا ہو تو وہ پانچ سو پیسے کہتے ہیں اور دس روپیہ مانگنا ہو تو ایک ہزار پیسہ کہتے ہیں اس سے زیادہ کا معاملہ ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے زیادہ قرض انھوں نے کبھی مانگا نہیں اور نہ مانگا ہوا قرض کبھی واپس کیا۔ اس کے باوجود آج بھی ان سے ہماری دوستی دفعا حل ہی کی طرح برقرار ہے۔

دوستوں کا ذکر چھڑے اور اس میں بے تکلف دوستوں کا موضوع نہ آسکے یہ ناممکن ہے۔ ہمارے بھی ایسے بے شمار دوست ہیں اور سچ پوچھیے تو ان ہی کے دم قدم سے اس دنیا کی دلچسپیاں قائم ہیں۔ آپ چاہے سنجیدہ موڈ میں

ہوں یا کچھ سوچ رہے ہوں۔ خاموش رہنے کے موڈ میں ہوں یا کچھ پڑھنے کے لیے بلاتکلف آپ کے کمرے یا میز پر آ دھمکتے ہیں اور قہقہے بکھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی زبان ایسی چلتی ہے کہ کوئی قینچی بھی کیا چلے گی۔ اگر یہ لوگ صرف زبان ہی چلائیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن بعض اوقات تو معاملہ ہاتھ چلانے کا بھی آ جاتا ہے۔ دھول دھپہ ان کے پاس کوئی معیوب بات نہیں۔ دوستی کی یہ قسم کافی عام ہے کیونکہ زندہ دل آدمی کہاں نہیں ہوتے۔ مگر بعض اوقات یہ زندہ دلی بڑی سوہان روح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے ہی دوستوں کے بارے میں سجاد حیدر یلدرم نے کہا تھا کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" اور میر تقی میر نے ان سے بچنے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ غالب بھی اپنے ایسے دوستوں سے تنگ معلوم ہوتے تھے تب ہی تو کہا تھا ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اپنے ان دوستوں کا ذکر کیے بنا نہیں رہ سکتے جو صحیح معنی میں ہمارے مخلص دوست ہیں اور سچ پوچھیے تو ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے ورنہ کب کی ختم ہو جاتی۔ جس طرح دنیا نیک لوگوں سے کبھی خالی نہیں رہی اسی طرح وہ اچھے دوستوں سے بھی کبھی معرّیٰ نہیں رہی۔ ایسے لوگوں کے وجود کی وجہ سے زندگی پر سے آپ کا اعتماد نہیں اٹھتا اور آپ کی زندہ رہنے کی خواہش کو مہمیز ملتی ہے ہمارا دامن بھی ایسے دوستوں سے خالی نہیں ہے جن کے بارے میں کہا بھی جا سکتا ہے کہ دوست آں باشد۔ ایسے دوست جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں خون تو نہیں گراتے بلکہ کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو آپ کا پسینہ بھی نہ گرنے پائے ایسے دوستوں کے بارے میں ہمارے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن فی الحال ہم ؎

حسابِ دوستاں در دل

کہہ کر آپ سے رخصت ہوتے ہیں۔

ہ ہ

غزل

ہم نوا آپ کا بن جاؤں تو آلو کہیے
جھوٹ کے سچ پہ جب اَڑ جاؤں تو ٹٹو کہیے

اک قلمدان ہے جس میں نہ سیاہی نہ قلم
اب اگر کچھ بھی لکھتا ہوں تو جادو کہیے

کوچۂ یار میں دیدار کی جالی تانے
دل کی آری پہ جو پھرتا ہوں تو لٹو کہیے

دورِ جمہور میں سیکھا ہے یہی ہم نے سبق
گھر کے چمچے کو بھی اخلاق سے سیّد کہیے

اپنی لیلیٰ سے رلاتا ہے جب آنکھیں مجنوں
کوئی غافل بھی ٹپک جائے تو چالو کہیے

پھول آنگن میں کھلیں دو سے زیادہ نہ کھلیں
کل ہونٹ ہاتھ پہ کھینچیں تو نکھٹو کہیے

اس سے پہلے کہ پڑے رنگ میں کچھ بھنگ جلیل
بس نکل جائیے آرام سے یا ہُو کہیے

رشید عبدالسمیع جلیل

میں

کیا زمانہ تھا، وہ تھی زلفِ معطر اور میں!
اب ہیں بچے تین، گھرداری کا چکر اور میں
ہجر کی راتوں میں اک الٹا مثلث بن گئے
چارپائی ایک پیکٹ ایک بستر اور میں!
جھوٹ دھوکا اس طرف ہے اس طرف دو نمبر
کس طرح ہوں گے اکٹھا ایک لیڈر اور میں
میونسپلٹی کا الیکشن جیتنے کے واسطے!
رات دن ہے وارڈ کی گلیوں کا چکر اور میں
میونسپلٹی کی صدارت مل گئی تو دیکھنا!
پھر برابر ہوں گے قارون و سکندر اور میں"
کل ہوا میں بور کتنا آپ اندازہ کریں
سارا دن تھے ساتھ گھر پر ایک شاعر اور میں
چائے کی دعوت پہ وہ راضی ہوئے لیکن ظہیر
شکریہ کہہ کر کہا " آئیں گے فادر اور میں"

ظہیر ابن قدسی

تو

ایک ہی تھالی میں گر کھائے منسٹر اور تو!
بن نہیں سکتا ترا بگڑا مقدر اور تو!
فائدہ بیٹا نئے فیشن سے اتنا تو ہوا!
ایک جیسے لگ رہے ہو تیری سسٹر اور تو
مولوی سے کہہ دو سدھرے گی نہیں یہ حشر تک
قوم کے سر پر پڑیں کتنے ہی پتھر اور تو!
تو کرے تقریر چاہے جس کسی اسٹیج سے
ہوں گے بس دو ہی مقابل اک سلیپر اور تو
دیکھ کر ہمراہ تیرے اک جواں گیسو دراز
یوں لگا مجھ کو یہ ہے تیری نصف بہتر اور تو
دن کو محنت اور مشقت رات سروس پیار کی
ہو گئے یکساں جہاں میں ایک ٹیچر اور تو
کیا ہوا ہے کیا بات ایسی ہو گئی ہے اے ظہیر
رات دن تسبیح کے دانوں کا چکر اور تو

محمد برہان حسین

رسوا ور نگلی.......
مشہور تنقید نگار

رُسوا..... یہ کیسا نام ہے بھائی جان۔ کس لیے رسوا ہیں یہ؟"

میں نے بھائی سے پوچھا۔ انھوں نے دندانِ بالا کو دندانِ زیریں پر خوب گھس کر تیز کیا پھر کہا۔ "ابھی تو یہ دوسروں کو رسوا کرتا ہے۔ ان کے رسوا ہونے میں ابھی شاید کچھ وقت لگے۔

میں نے پوچھا "آپ ان سے بڑی نفرت کرتے ہیں۔ کون صاحب ہیں یہ؟"

بھائی جان نے کہا "یہ تنقید نگار ہیں۔ ہر ایک کی بُرائی کرنا ان کا نام ہے۔"

میں نے کہا "تو آپ بھی تنقید سیکھ لیجیے۔ کون سکھاتا ہے یہ کام؟"

بھائی جان نے کہا "مچھلی کے بچوں کو تیرنا کون سکھاتا ہے؟ یہ لوگ شروع سے ہی بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب کوئی عورت بچے نہیں پیدا کر سکتی تو ساس بن کر بہو کے ہر اچھے کام پر تنقید کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح جب کچھ لوگ خود کوئی اچھی نظم، مضمون یا کہانی نہیں لکھ سکتے تو تنقید نگار بن جاتے ہیں۔"

ایک دفعہ ایک تنقید نگار صبح دس بجے ایک شاعر کے مجموعہ پر شدید تنقید کر رہے تھے کہ عشق اور مجردی عاشق پہ اردو کے بڑے شعرا میر، غالب، مومن، ذوق، فانی، رفیق اور بدذوق (یہ رسوا کے دادا تھے) نے اتنا کچھ کہا ہے کہ اب اس قسم کے اشعار کی ضرورت [illegible] کو تو کیا تلگو زبان کو بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اس قدر شدید تنقید کی کہ تقریر کے دوران وہ آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ جب وہ تقریر ختم کر کے بیٹھے تو ان کو شربت پلایا گیا پھر معتمد نے ان کے کان میں کہا "رسوا صاحب! یہ تنقید کتاب حکومت نے فیملی پلاننگ پہ شائع کی ہے۔"

رسوا صاحب نے کہا "اتنی اچھی پر مغز تقریر ضائع کرا دی۔ واہ صاحب پہلے کیوں نہ بتایا۔ میں کچھ نہیں جانتا لائیے وہ لفافہ مطلب معاوضہ شام میں وہ ایک افسانوں کے مجموعہ کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ یعنی منٹو، کرشن چندر، عصمت، بیدی، جلیس اور بدذوق (وہ اپنے دادا مرحوم کا نام ایسے لیتے جیسے فلموں کی کاسٹ میں بدذوق وہ اپنے دادا مرحوم کا نام ایسے لیتے ہیں جیسے فلموں کی کاسٹ میں آخر میں "اور" کے بعد ویلن کا نام لیا جاتا ہے)......"

کسی نے پوچھا "بھئی ان کی تعریف یا مذمت کا کوئی معیار بھی ہے۔ چونکہ کتاب کو پڑھتے تو نہیں ہیں پھر کیا سکہ اچھال لیتے ہیں کہ چت، پڑ جائے تو تعریف کریں گے اور پٹ پڑ جائے تو مذمت"

وہ صاحب بولے۔ جی نہیں! اگر کتاب کسی عام ادیب کی ہو تو یہ ہمیشہ مذمت کرتے ہیں اور اگر کسی منسٹر یا آئی اے ایس عہدہ دار کی ہو تو تعریف کرتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتیں بے شک تعمیری ہوتی ہیں۔"

تعمیری؟ وہ کیسے؟"

وہ ایسے کہ ان کا خیال ہے کہ معمولی لوگ مذمت سے دل برداشتہ ہو کر لکھنا چھوڑ کر اور ٹائم کر لیتے ہیں اور معاشی حالت اچھی ہو جاتی ہے۔ اور منسٹر یا بڑے عہدہ دار کی تعریف ہو تو وہ لوگ رسوا صاحب کی مالی حالت اچھی کر دیتے ہیں .... دونوں تعمیری پہلو ہیں بہر حال۔"

ہم بیچ میں کود پڑے۔" واہ! پھر ایسے شخص کو کیوں مدعو کیا جاتا ہے۔"

وہ صاحب بولے۔" دیکھئے دوست! اس وقت یہاں جتنے سامعین آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب شاعر ہیں یا ادیب جب تک ان میں سے کوئی ایک شاعری یا نثر نگاری چھوڑ کر تنقید نگاری نہیں شروع کر دیتا۔ ہم سب انہی کے یعنی رسوا صاحب کے محتاج ہیں۔"

"واہ"۔ کیا بغیر تنقید کام نہیں چل سکتا؟" ہم نے پوچھا۔

وہ بولے "جی نہیں تنقید کروانا۔ رسم دنیا بھی ہے دستور بھی ہے۔ اور آپ تنقید نہ کروانے کہہ رہے ہیں؟ ارے صاحب! یہ بھی بس ان کی زندگی تک ہے کیونکہ ان کے لڑکے نے تو ادب سے منہ موڑ کے ہم سب کا دل توڑ کے بھینسیں خرید لی ہیں۔"

تنقید نگار ساری زندگی تنقید کرتا رہتا ہے۔ ایک تنقید نگار کو تجربتاً ایک لق و دق ریگستان میں چھوڑ دیا گیا نہ جھاڑ، نہ پہاڑ نہ آم نہ آدم زاد..... دیکھنا ہے کہ وہ کس پر تنقید کرتے ہیں وہ کچھ دیر ادھر اُدھر دیکھتے اور گھومتے رہے آخر تھک کر ڈھیر ہو گئے پھر بولے "واہ صاحب! ریت کیسے دمک رہی ہے۔ جیسے دلہن کے گالوں پر افشاں اور وہ دور جھیل آسمان کے پس منظر میں کس قدر خوب صورت لگتی ہے۔ مگر اللہ میاں! بھئی اس خوب صورتی کا کوئی دیکھنے والا ہونا چاہئے۔ وہ تو آج میں ادھر نکل آیا ورنہ اقبال صاحب کا کڑھنا بالکل بجا تھا کہ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ دوسری طرف جنگل میں مور ناچا کسی نے نہ دیکھا..... یہاں دیکھا بھی تو مجھ بدذوق کے پوتے اصلی بدذوق نے کہ نہ میں شاعر نہ مصور میں نے کبھی زندگی میں برش تک نہیں پکڑا..... اور مجھ میں اچھا ذوق پیدا بھی کیسے ہوتا..... بیوی میری چچا زاد بہن اور میری ہی طرح بدصورت۔ پڑوسن خوب صورت ہے مگر وہ بھی کھڑکی ہمیشہ بند رکھتی ہے۔"

وہ اٹھے اور بولے " خیر بھئی اب میں پہلے اس جھیل پر جا کر خوب پانی پیوں گا۔ بڑا ہی لذیذ پانی معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ چکٹ کپڑے دھو کر دو تین گھنٹے نہاؤں گا اس دوران کپڑے خشک کرنے کے لیے ریت پر پھیلا دوں گا۔ مگر ان پہ پتھر ضرور رکھوں گا۔ ورنہ ایک دفعہ عثمان ساگر پر کم بخت ہوا نے مجھے بالکل ننگا کر دیا تھا۔ اللہ میاں یہاں تو ننگا رہوں یا کپڑے پہنوں کوئی دیکھنے والا نہیں یا اللہ کیا بے کسی ہے تیرے بندے پہ"

وہ اُٹھے اور تیز تیز چلتے رہے پھر آہستہ چلنے کی تعمیل ہوتی تو ٹلتی وہ پھر ڈھیر ہو گئے۔ اور بولے "واہ اللہ میاں! اس قدر بے کار تخلیق میں آپ نے وقت گنوایا۔ بے وزن۔ بے ربط جگہ جگہ محاورہ کی غلطیوں کی طرح ٹیلے بکھرے پڑے ہیں۔ خشک بے جیسے کنفیوشس کا فلسفہ"

پیاس بڑھتی جا رہی تھی وہ بولے "یا اللہ معاف کر دے مالک اب کسی غریب ادیب یا شاعر کی کتاب کی مذمت نہیں کروں گا اور کبھی منسٹروں اور عہدہ داروں کی خوشامد نہیں کروں گا۔ اور ۔ ۔ ۔ اور کبھی اقبال، میر و غالب کے ساتھ داداجم بدذوق کا نام نہیں جوڑوں گا۔ ایک دفعہ عثمان ساگر کے کنارے پہنچا دے مالک نہیں تو حسین ساگر ہی پہنچا دے۔ ابھی ہوی بیلوں کو ہٹا کر دو گھونٹ پانی پی لوں گا"

△▼

مشتاق رضا
(بھیونڈی)

اگر میں ..... ہوتا

ہم منشی جی سے بہت بدکتے ہیں وہ اس لیے کہ منشی جی اپنی بلا دوسروں کے سر منڈھنے کے فن میں یکتائے روزگار ہیں۔ والد بزرگوار کے دوستوں میں سے ہیں اس لیے ان کے ذریعے لادی گئی بلاؤں کا بارگراں برداشت کرنا ہمارے لیے عین سعادت مندی ہے بلکہ فرض فرزندی ہے۔ زیادہ پوچھ تاچھ مناسب نہ سمجھی اور اپنے کمرے کی طرف چل دیئے کہ وہی گوشۂ عافیت ہو سکتی تھی مگر توبہ کیجیے۔ برآمدے سے گذر رہے تھے کہ منشی جی کی آواز نے آ دبوچا شکاری کی گھات میں بیٹھے ہوئے تیندوے کی طرح۔

"کیوں برخوردار کہاں چھپے چھپے پھرتے ہو؟" طبیعت جل کر خاک ہوگئی مگر خاک کو بکھرنے نہیں دیا مصنوعی تبسم ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا (مصنوعی اس لیے کہ قدرت نے ہمیں قدرتی تبسم کی خوبی ودیعت ہی نہیں کی ہے اور اگر یہ دُرِ نایاب ہمیں قدرت کے خزانے سے عطا ہوا بھی ہوتا تو ہم ایسی خالص چیز ملاوٹ کے زمانے میں مفت کیوں بانٹتے پھرتے)

"کون چچا جان، آیئے آیئے کیا بات ہے؟"

لپک کر آگے بڑھ آئے اور کہا "میاں تم تو گھاسلیٹ ہوگئے ہو"۔ "عید کا چاند" محاورہ سنا تھا "یہ گھاسلیٹ" کیا بلا ہے۔ ہم نے تو اس نادر استعارے پر غور کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ منشی جی اچھوتی تشبیہیں اور محیر العقل استعارے گھڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں یہ بات اگر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے تو ہمیں یقین ہے کہ انھیں اصطلاحات مدوّن کرنے کے صلے میں انعام ملے گا۔ جواباً خاموش پاکر ہی ہی کرتے ہوئے گویا ہوئے:

"بیٹا اپنے فہیم کے لیے ایک مضمون لکھ دو۔ کم بخت مضمون نویسی میں ذرا کم زور ہے"۔ اب ہم کیسے کہیں کہ منشی جی کے فرزند نا خلف، جنہیں وہ مضمون نویسی میں کمزور بتاتے ہیں کسی بھی مضمون میں شہ زور نہیں ہیں۔ ششماہی امتحان کا ترقی نامہ ہماری نظر بد سے بھی گذرا تھا موصوف کے تمام مضامین سرخ خط بہ دار تھے۔ سوائے ان مضامین کے جن کا امتحان نہیں

لیا جاتا ہے۔ فقط نمبر دیئے جاتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ حضرت نے منشی جی کی کم علمی کا ایسے فائدہ اٹھایا کہ تو بہ ہی بھلی (کم علمی کا اس لیے کہ منشی جی نرے جاہل نہیں ہیں) محاورۃً ہم اُسے اُلّو بنانا کہہ سکتے مگر کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ کیونکہ بنے ہوئے کو مزید بنانا لگانے کے مترادف ہے اور ہم بگاڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ بہرحال صاحب زادے نے ان سے کہا تھا کہ جو مضامین خط کشیدہ ہیں ان میں کامیاب ہیں اس پر منشی جی کو فرزند ارجمند کی علمی دلچسپی اور میدان علم میں ترقی کا یقین ہو گیا تھا اور اس کے مستقبل سے مطمئن ہو کر انہوں نے انہیں شاباشی بھی دی تھی۔ وہ فہیم کو فہیم سمجھتے ہیں اور ہم یتیم کیونکہ پیدل کو سوار کہنے کی ہماری عادت نہیں ہے عادت بُری ہے مگر کیا کریں۔ عادت سے مجبور ہیں۔ منشی جی عدیم الفرصت انسان ہیں۔ ہم انہیں "Busy without business" کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے بعجلت تمام شیروانی کی جیب سے کاغذ کا مڑا تڑا ٹکڑا نکالا اور ہمارے حوالے اس انداز سے کیا جیسے وہ کاغذ کا ٹکڑا نہ ہو جگر کا ٹکڑا ہو۔ آب دیدہ ہو کر بولے۔

"پہلے کسی بھی صورت شام تک یہ مضمون لکھ دو تاکہ وہ اسے ازبر کر سکے" ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پیشگی شکریہ ادا کر کے چلے گئے اور ہم نے بھی شکر ادا کیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ہم نے "جگر کے ٹکڑے" پر نظر ڈالی اور قلم کاغذ سنبھال کر رائٹنگ ٹیبل پر آ بیٹھے۔ اب جو بغور عنوان کا تو خیال گذرا کہ کہیں منشی جی نے غلطی سے اپنی آزاد نظم والا کاغذ تو نہیں دیا۔ منشی جی خود کو شاعر کہلواتے ہیں۔ پرانے خول میں نئے آدمی ہیں۔ جدید شاعری کے زبردست حامی۔ کہنے کو تو آزاد نظمیں کہتے ہیں۔ مگر ان کی آزادی میں بھارت کی آزادی میں بھارت کی آزادی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اوزان کی قیدان کی طبع سلیم پر ہمیشہ گراں رہی ہے۔ شاید اسی لیے انہیں ردی کاغذ کی ردی دکان کو تالا لگانا پڑا تھا۔ ہم نے پھر عنوان پر غور کیا لکھا تھا۔ "اگر میں ...... ہوتا!"

ایک لمحہ کے لیے ہمیں ایسا لگا جیسے ہم فہیم ہوں ...... بڑا عجیب عنوان تھا یوں بھی دنیا میں وہ چیزیں عجیب ہوا کرتی ہیں ہیں جو آسانی سے عقل کے کوزے میں سماتی نہیں ہیں۔ اس عنوان کی نوعیت ہمارے فہم وادراک سے بالاتر اس لیے کہ ہم فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اسے محض ایک خواہش تصور کریں یا دعویٰ سمجھیں اور اس عنوان پر خامہ فرسائی کرنے کے لیے کسی ایک بات سے اتفاق کرنا ضروری تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے اسے ایک خواہش تسلیم کیا۔ اب خانہ پری کا مسئلہ آن کھڑا ہوا خواہش ہو لیچر اور گھٹیا قسم کی نہ ہو اس میں بچکانہ پن نہ ہو۔ "اگر میں وزیر اعظم ہوتا" مگر وزیر اعظم بن کر کرتا کیا؟ علم شہریت کا مطالعہ ڈھنگ کا ہوتا تو شاید اس سوال کا جواب مل بھی جاتا مگر یہاں تو ذہن میں سناٹا تھا۔ ہم نے لکھا عنوان کاٹ دیا۔ "اگر میں ڈاکٹر ہوتا" میں صدر بلدیہ ہوتا" یا اسی قسم کا کچھ اور ہوتا۔ ان تمام عنوانات سے ہمیں کچے دودھ کی مہک آتی محسوس ہوئی۔ لکھنا تھا فہیم کے لیے جو ماشاء اللہ رٹتے رٹاتے، فن نقل بازی کے سہارے کچھ اپنی کوششوں سے مگر زیادہ تر مہربان اساتذہ کی کرم فرمائیوں کے بل بوتے پر بارہویں تک جا پہنچے ہیں۔ ویسے ہونا تو انہیں چاہیے تھا چودھویں میں۔ مطلب کہنے کا یہ کہ ہمیں فہیم کا نہ سہی مگر بارھویں جماعت کے معیار کا خیال رکھنا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم فہیم کو کیا بنائیں اُلّو بنانے کا موقع تو ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ذہن عجیب کشمکش سے دوچار تھا۔ اور ہم لاچار تھے۔ آج ہی صبح بھائی صاحب نے کسی بات پر کہا تھا اگر میں تمہاری جگہ ہوتا ...... مگر نہیں وہ تو محض شیخی تھی دعویٰ تھا۔ اب آپ ہی بتایئے بھلا وہ ہماری جگہ کیوں ہونے لگے اور اگر انہیں مشیت

کی خلاف ورزی کرکے ہماری جگہ ہوتا تھا تو پھر ہم اپنی جگہ ہوتے ہی کیا؟ لوگ کتنی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ اگر میں . . . ہوتا! تو یوں کرتا توں کرتا۔ گذشتہ دنوں الیکشن کے موسم میں اس طرح کی باتیں بہت کچھ سننے میں آئیں خالی خولی دعوے تھے۔ اگر میں . . . . ہوتا! اور اس کے بعد لامتناہی سناٹا تھا خاموشی تھی آواز تو تب ہوتی جب عمل کی پہل قدمی شروع ہوتی مگر عمل تو موخر تھا۔ سرگرم عمل ہونے کا سوال ہی کب اٹھتا تھا!

خوش کن تمناؤں کا تصور روح افزا ہوتا ہے۔ اسی کے سہارے تو انسان جیتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے اظہار پر پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی ہے ہر خواہش اپنے ساتھ تکمیل خواہش کا عملی جذبہ لگائے رکھتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بندریا اپنے نوزائیدہ بچے کو پیٹ سے چمٹائے رکھتی ہے اس لیے خواہش کرنے والا اپنی خواہش کے ساتھ عملی پہلو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے ہم ہچکچاتے ہیں کہ اگر اپنی آرزو ظاہر کر بھی دیں تو عمل کے تعلق سے کیا کریں گے۔ انسانی دل بھی عجیب شے ہے۔ اس میں خواہشات کی کھچڑی ہمیشہ پکا کرتی ہے اس لیے خیال آیا "اگر میں دولت مند ہوتا" اس عنوان کے تحت کچھ لکھیں عنوان تو ڈھنگ کا لگتا تھا مگر سوال یہ تھا کہ ہم دولت مند کیوں ہونے لگے۔ کہنے کی بات ہے اس لیے کہہ رہے ہیں کہ دولت مند ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ویسے بری بات بھی نہیں۔ فلم "سب سے بڑا روپیہ" ہم نے بھی دیکھی ہے۔ دولت سب کچھ نہ سہی مگر ہے بہت کچھ۔ چاہے جو ہو ہمیں تو لکھنا ہے۔ اس لیے اسی عنوان پر قلم طرازی ہوتے ابھی ڈھنگ سے اپنا مافی الضمیر کی وضاحت بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک نئے خیال نے ذہن کے اندھیرے کو روشنی بخشی۔

"اگر میں فلم ایکٹر ہوتا" ہم نے احتیاطاً فلم ایکٹر لکھا ہے صرف ایکٹر لکھتے تو اسٹیج ایکٹر سمجھے جانے کا احتمال تھا۔ ہاں تو اس نئے خیال نے ہمارے پرانے خیال پر ضرب لگائی اور حاصل ضرب صفر آیا۔ تو ہمیں لگا کہ دونوں میں کسی ایک خیال کی قیمت صفر کی ضربی خاصیت کی رو سے صفر ہونی چاہیے۔ مگر کس خیال کی؟ اس کا جواب اگر کوئی ریاضی داں دے سکتا ہو تو دے ہم تو قاصر ہیں۔

بہر حال ہم نے خیال ثانی کو خیال اول پر ترجیح دی اور لکھنا شروع کیا۔ بہت کچھ لکھنے کے بعد فلم "چلا مراری ہیرو بننے" کے کچھ ایسے مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے جو ہمیں دل برداشتہ کردینے کے لیے کافی تھے۔ قلم اڑیل بیل کی طرح اڑ گیا اور ہم غور کرتے ہی رہ گئے۔ ناگاہ ہماری نظر کھڑکی سے باہر ہرے بھرے میدان میں گئی جس کے بنجر حصے میں جہاں برائے نام ہریالی تھی۔ ایک گدھا چر رہا تھا۔ ایک خیال ذہن میں ابھرا "اگر میں گدھا ہوتا! نہ جانے کیا بات ہوئی کہ گدھے نے چرتے چرتے سر اٹھایا اور ہم نگاہ ہٹا نہ پائے تھے کہ آنکھیں چار ہوگئیں۔ شاید ٹیلی پیتھی کا اثر تھا۔ ہم نے اتنی دور سے بھی اس کے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ تاڑلی شاید وہ ہمارے گدھے پن پر مسکرایا ہو۔ ہم نے زیادہ سوچنا مناسب نہ سمجھ کر اسی عنوان پر اس طرح لکھنا شروع کیا۔

گدھا ایک منکسر المزاج، عالی ہمت اور صابر چوپایہ ہے۔ مذہب اور ادب میں اسے ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ شریف النفس اور معاملہ فہم ہونے کی وجہ سے گدھا کہلاتا ہے اس لیے دنیا کا ہر وہ شخص جو شریف ہو بھولا بھالا ہو۔ دنیاداری کے داؤ پیچ سے ناواقف ہو گدھے کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ گدھا حضرت عیسیٰ کا ہو یا کرشن چندر کا یا گنگیا دھوبی کا۔ اس کی

خدمات سے لوٹ ہیں اور اس کی کارکردگی پر شاید ہی کسی گدھے کو تردد ہو.... اتنا ہی کچھ پائے تھے کہ میدان والا گدھا رینکا اور تسلسل ٹوٹ گیا۔ ہم نے جھلا کر قلم کی دولتی لکھے ہوئے پر جھاڑی اور خانہ پری کے لیے نیا لفظ ڈھونڈ نکالا "اگر میں انسان ہوتا۔ عنوان تو عجیب ہی تھا مگر خانہ پری نے اسے عجوبہ ہی بنا دیا۔ اکبر نے نواب سعادت سے پوچھا تھا کہ بتاؤ دنیا میں وہ کونسی چیز ہے جو بے شمار ہے۔ پھر بھی کم یاب ہے۔ نواب نے جواب دیا تھا" انسان" ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی انسان بن کر انسانوں کی قلیل آبادی میں ایک کا اضافہ کریں اور محسن انسانیت کہلائیں۔ آج کے دور میں جب کہ آدمیوں کی آبادی بڑھ رہی ہے اور انسانیت کی قدریں گھٹ رہی ہیں انسان کا از سر نو پیدا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم نے آخری فیصلہ کر لیا کہ ہم اس عنوان پر اپنے خیالات زیب قرطاس کریں گے۔ پہلو بدل کر قلم سنبھالا اور شروع ہو گئے ابھی بسم اللہ کا بے نہ لکھ پائے تھے کہ ایک فوج طفلاں زبردست شور و غوغا کا مظاہرہ کرتی ہوئی کمرے میں در آئی اور کوہ خیالات کی انتہائی بلندیوں سے ہم نے جو چیدہ خیالات قفس ذہن میں قید کئے تھے پھر اڑ گئے۔ پنجرہ خالی رہ گیا اور انسان کی تخلیق ادھوری۔ جھلا کر اٹھے ریڈیو کا سوئچ آن کیا کوئی غالب کی غزل گا رہا تھا۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

اقبال مسعود
(بھوپال)

اداکار بننے کی خواہش

بعض اشعار میں ضرورت سے زیادہ آفاقیت ہوتی ہے۔ میر صاحب کا یہ شعر کب اور کہاں استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اس شعر کی تاثیر تھی کہ ہم نے سوچا عمر عزیز کی پچیس[۲۵] خزائیں یونہی ضائع ہوئیں۔ پتہ نہیں کب چل چلاؤ کا وقت آجائے اس لیے ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔ پر کیا کرکے چلو؟ بہت سوچا، بہترا دماغ لڑایا پر یہ بات ہماری ناقص عقل میں نہ آتی تھی اور نہ آئی۔ وہ تو بھلا ہو ہمارے دوست نازغ بیابانی کا کہ انھوں نے فرمایا "بھئی بیکار مباش کچھ کیا کر نہیں تو اداکار بننے کی خواہش کرو۔ ہم نے سوچا واہ یہ نسخہ تو شہرت کا سب سے آسان ذریعہ ہے۔ پہلے خیال آیا کہ ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے جائیں۔ ہمیں یقین تھا کہ ہمارے جیسا اداکار روئے زمین پر کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ ہم ہنستوں کو رلا سکتے تھے اور روتوں کو دھاڑیں مار مار کر رونے پر مجبور کرسکتے تھے۔ مگر دا ‍ نہ حسرتا کہ کسی ڈرامہ ڈائرکٹر نے ہمیں پوچھنا تو درکنار گھاس تک نہ ڈالی، البتہ ایک سرکس کمپنی نے ہمیں بن مانس کا رول ادا کرنے کے لیے ضرور منتخب کیا۔ جس کو ہم نے اپنی اور بن مانس دونوں کی توہین سمجھا اور سخت احتجاج کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری خواہش کہ کچھ کر گزریں شدید ہوتی گئی۔ ڈراموں سے ہم مایوس ہو چکے تھے۔ تب ہمارے احباب نے سمجھایا کہ بھائی سیاست میں حصہ لو، وہاں بھی تو اداکاری کی ضرورت ہے۔ مگر ہم سیاست کے مدوجزر سے بہت ڈرتے تھے کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے کئی حضرات ایک لمحہ میں تو آسمان پر ہوتے اور دوسرے ہی پل زمین پر چاروں خانے چت پڑے ہوتے، اب یہ اور بات ہے کہ وہ پھر اُٹھ کر آسمان چھونے کی کوشش میں لگ جاتے اور بار بار یہ کہتے

ایک بار دیکھا تو بار بار دیکھنے کی ہوس"۔ مگر ہمیں زمین پہ چاروں خانے چت پڑے آدمی بہت بُرے لگتے ہیں۔ بھئی آدمی کو تو دو پاؤں پہ کھڑا ہونا چاہیئے۔ اگر کل اشرف المخلوقات نے یہ روش اختیار کر لی تو جانور ضرور ایجی ٹیشن شروع کر دیں گے کہ لو صاحب آدمی نے ہمارے قدرتی کردار کا ہی استحصال شروع کر دیا ہے۔

زاغ بیابانی بہرحال یہاں بھی کام آئے۔ فرمایا "اے عزیز رخت سفر باندھو اور جنوب مغرب کی طرف عازم سفر ہو تو ضرور اپنی مراد پائے گا"۔ ہم نے گڑگڑا کر عرض کیا "پیارے بھائی کیا ہم واقعی اداکار بن جائیں گے"۔ جواب ملا۔ "دریں چہ شک" مگر اب تم سفر پہ روانہ ہو جاؤ۔ چلتے چلتے تم ایک ایسی نگری میں پہنچو گے جہاں کٹھ پتلیاں حکمراں ہیں۔ وہاں قسم قسم کے ہزارہا پھول کھلے ہوں گے اور طیور خوش الحان نغمہ سرائی میں مصروف ہوں گے۔ آسمان سے رنگوں کی برسات ہو رہی ہوگی۔ مگر یاد رکھنا یہ سب سحر کے ہوں گے نہ پھولوں میں خوشبو، نہ طیور گوشت پوست کے، نہ آسمان کے رنگ پھیلیں گے سمٹیں گے۔ تب تم جان لینا کہ تم منزل مراد پہ پہنچ گئے ہو"۔ یہ کہا اور زاغ بیابانی اٹھ کر چل دیئے۔ ہم نے دوڑ کر قدم لیئے اور التماس کی کہ "خدارا یہ تو بتاتے جایئے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہوگا۔" "سخت برہم ہوئے"۔ "ہم کیا جانیں۔ وہاں جا کر اس طلسم کو خود سر کرنا۔ ہر ایک بات گانٹھ میں باندھ لو کہ وہاں جانے سے پہلے دن میں صدق دلی سے کم از کم چار بار فلمیں دیکھو پھر دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے شہر کے تمام سینما گھر کھنگال ڈالے۔ ہر قسم کی فلمیں اور ان کی تمام تفاصیل ہماری یادداشت کا جزو بن گئیں اب یہ اور بات ہے کہ ہمارے چشمے کا نمبر بڑھا سو الگ اور پھر ہم یہ سمجھتے تھے کہ ع

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

سو وہ رنگ لائی اور نتیجہ میں ہم ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے اسٹیشن پہونچے اور جنوب مغرب کی طرف جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے اور دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائے کہ اس نے حضرت انسان کو اتنی عقل دی کہ انھوں نے میلوں کی مسافت گھنٹوں اور لمحوں میں سمیٹ لی۔ ڈبے میں بیٹھے بیٹھے ہم نے جائزہ لیا تو ہماری نظر ایک صاحب پہ جم گئی۔ چہرے پر ان گنت لکیروں کا جال۔ بے حد نحیف و نزار مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ ان کی پلی پلائی بے حد گھنی مونچھیں تھیں۔ درحقیقت ان کا چہرہ مونچھ کے لیئے بس پس منظر مہیا کر رہا تھا۔ ان کی یہ شاندار بلکہ جاندار مونچھیں دیکھ کر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ اسی جثہ کے ایک حضرت اپنے گھر کے ٹیرس پر کھڑے تھے۔ ان کے دوست نے کہا۔ اماں ہوا تیز چل رہی ہے۔ کہیں اڑ نہ جانا فرمایا "ہماری مونچھیں روک لیں گی۔ غرض اسی طرح سوتے جاگتے، سوچتے، ہنستے ہنساتے ہم منزل مقصود پہ پہونچ گئے۔ واقعی فلم نگری ایک کارخانہ طلسم تھی جہاں فلمیں بنانے والوں کا اژدھام تھا اور ہر سال اس طرح کمی و بیشی ہوتی رہتی کہ پرانے شکاری نئے اور نئے شکاری پرانے جالوں میں پھنسے رہتے۔ باکس آفس اور کالے دھندے کا چکر بھی چلتا اور عشق و عاشقی کا بازار بھی گرم رہتا۔

فلمیں یہاں پر کافی لمبی لمبی بنتی ہیں۔ کم لمبائی کی فلمیں بنانا ویسے بھی ممکن نہیں، ظاہر ہے کہ جس موضوع پہ فلم بنائی جاتی ہے۔ وہ لاکھ بار کا گھسا پٹا سہی بہرحال دریا ہوتا ہے" اور آج کل کوزے بہت چھوٹے ہوتے ہیں جس زمانے میں نل، ٹب اور شاور نہیں تھے غسل کے لیے ایک مٹکی پانی کافی ہوتا تھا۔ آج اتنا پانی تو فلش میں بہا دیتے ہیں اور ایسی فراوانی کے دور میں دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے۔ دریا کو بہنے دیجئے۔ کبھی کبھار بے جان دریا بھی اپنا رخ

بدل لیتے ہیں۔ کھوٹا سکہ بھی چل جاتا ہے سو ہم بھی اس دریا میں ہاتھ دھونے کے لیے بے چین ہوا ٹھے اور فلمی اداکاروں، پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں وغیرہ کے یہاں چکر پہ چکر لگانے لگے کہ شاید ہماری قسمت زور مار جائے اور تھوڑا بہت فلموں میں ہمیں بھی کہیں کوئی چانس مل جائے۔

ایک ڈائرکٹر کے بنگلے پر جب ہم نے جاکر حاضری دی تو اس نے ہماری صورت دیکھتے ہی ارشاد کیا "سالا ہمیں کوئی سو ہورسو گھر فلم نہیں بنانی" اور ابھی ہم اس کو جواب دینے ہی والے تھے کہ اس کے پٹھان چوکیدار نے ہماری گردن پر ہاتھ رکھ دیا اور اس دست دولت آفریں نے ہمیں اس شفقت سے باہر دھکیلا کہ ہم اپنی گدی دبائے کئی فرلانگ نان اسٹاپ چلتے چلے گئے اور اپنے ٹھکانے پر ہی جاکر دم لیا، مگر اس وقت ہمارا یہ home کئی لوگوں کے تصرف میں تھا اور وہاں سبزی فروش بیٹھے مچھلی بازار کا سماں پیش کر رہے تھے۔ ناچار ہم ایک مشہور فلمی کہانی نویس کے یہاں جا پہنچے۔ وہ ہمارا پرانا شناسا بلکہ ایک زمانے میں لنگوٹیا یار تھا اور ابھی پچھلے ہی دنوں ہم نے اسے ایک تحفہ بھیجا تھا کہ ہم نے اپنے اس یار کو مہربان کرنے کے لیے اس کی سالگرہ کے موقع پر ایک کم قیمت تحفہ کی تلاش شروع کی کہ ہماری جیب زیادہ کی متحمل نہ تھی گر سارا بازار چھان مارا اور کم قیمت تحفہ نہ مل سکا آخر بعد تلاش بسیار ہمیں بلجیم کا بنا ہوا ایک خوب صورت سا شیشے کا گلدان مل گیا، جس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ دوکان دار صرف دو روپے میں اس گل دان کو ہمارے دوست کے پاس بھیجنے کو آمادہ ہوگیا۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے یہ کہانی کار شناسا یہ سمجھیں گے کہ گل دان راستے میں ٹوٹ گیا ہوگا۔ اس لیے دکان دار کو ان کا پتہ دے کر اور ایک خوب صورت ڈبے میں گل دان بھجوانے کی ہدایت کر کے ہم لوٹ آئے "اب آج ہم نے جیسے ہی دروازہ پر لگی برقی گھنٹی دبائی وہ آ حاضر ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر ان کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ غصے کے ساتھ بولے" گل دان کے تحفے کے لیے شکریہ اور جس احتیاط کے ساتھ آپ نے دونوں ٹکڑے الگ الگ رنگین کاغذوں میں لپیٹ کر بھیجے اس کے لیے مزید شکریہ یہ فرمایا اور دروازہ بند کر لیا۔ اب ہم کیا کرتے کہ عقل مندی دکھانے کے سلسلے میں شاید ہماری عقل کا دیا با لکل ہی بجھ گیا تھا جو ہم نے اس نادان کو تحفہ بھیجنے کے لیے کہا۔

فلم اداکار بننے کے سلسلے میں ہم نے ہیرو سے لیکر ولین اور ہیروئن سے لے کر ایکسٹرا سپلائر تک کہاں کہاں کی خاک چھان نہ ماری کہ ہمارے جوتوں نے ہماری بے بسی پر اپنے دانت نکوس دیئے۔ بالوں نے بڑھتے بڑھتے ہمیں ہپی بنا دیا مگر واہ ری ہماری ہمت کہ ہم برابر ناکامیوں کے باوجود کمر ہمت کس کر صبح صبح کسی نہ کسی ایکسٹرا یا ہدایت کار کے گھر کاسۂ گدائی لیے حاضر ہو جاتے۔ کبھی کوئی دھتکار دیتا۔ کہیں دھکے دیکر نکلوا دیا جاتا اور کبھی کبھی ان کے یہاں کے پلے ہوئے کتے ازراہ مہربانی دور تک ہماری خیر و عافیت دریافت کرتے

آخر ہماری قسمت کے ستاروں نے پلٹا کھایا کہ ایک دن تو گھوڑے کے دن بھی بدل جاتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ایک صبح جب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آج چائے کس سے پی جائے کہ ایکسٹرا سپلائر آپہنچا۔ اس نے ہمیں چائے تو پلوائی ہی ساتھ ساتھ ناشتے کا بھی انتظام کیا۔ ہم دل ہی دل میں اس کی اس مہربانی پر بہت خوش ہوئے۔ مگر بظاہر بے مروتی سے کہا "کہو کیسے آئے؟" بھائی ہم بے حد بزی ہیں ابھی چار فلموں میں کام مل گیا ہے اور ہمیں دو تین گولڈن جوبلی ہیروئن ہمارے مقابل ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر صاحب تو یہ کہیے جو اس پر ذرا بھی ہماری باتوں کا اثر پڑا ہو۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور بولا" دیکھو کالیا۔ ہمارا ٹائم کھوٹی مت کرو۔ ادھر ادھر ہوم مارنے کی ضرورت ناہیں۔ ہم تمہارے لیے ایک فلم

کا آفر آیا ہے۔ بھلا کیا بولتا ہے۔؟" ہم نے بنا کچھ سوچے سمجھے "ہاں" کر دی اور نہ صرف ہاں کر دی بلکہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایکسٹرا سپلائر بڑا حیران ہوا "یار کالیا اداکاری مت دکھاؤ، کل آکر کانٹراکٹ پر دستخط کر دینا" یہ کہا اور چل دیا۔ ہم کو رات بھر خوشی کے مارے نیند نہ آئی۔ آسمان کے تارے گنتے گنتے ہی رات گزر گئی۔ صبح ہم بن سنور کر آفس جا پہنچے۔ ہدایت کار نے ہمیں دیکھ کر صاد کر دیا۔ فلم کا نام تھا "ٹارزن اور بغداد کی ملکہ" ہمیں اس فلم میں ایک جنگلی سردار کا رول ملا تھا۔ فلم کا پہلا شاٹ کچھ یوں تھا کہ بڑا سا ایک کڑھاؤ چڑھا ہے۔ اس کے نیچے آگ جل رہی ہے۔ جنگلیوں کا سردار اور اس کا ساتھی دو آدمیوں کو کڑھاؤ میں ڈالے ابال لینے کی فکر میں ہیں کہ ٹارزن مدد کو آ پہنچتا ہے۔ ہم کو آگ کڑھاؤ کے نیچے نہ جلا کر تھوڑا ہٹ کر جلانی تھی۔ البتہ کیمرہ اس کو اس زاویے سے فلم بند کرتا کہ آگ کڑھاؤ کے نیچے بھڑکتی ہوئی لگتی۔

ہدایت کار نے جیسے ہی "ریڈی" کہا ہم اپنے میک اپ میں اچھلتے ہوئے "ٹانگا، مانگا، نیکا" کہتے ہوئے نکل آئے اور کڑھاؤ کے چاروں طرف اپنے نیزے لے کر ناچنے لگے۔ موسیقی کی لے بتدریج تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور ہماری رگوں میں خون جوش کھا رہا تھا۔ ہم نے سوچا اب دیکھنا ہم ایسی دھانسو ایکٹنگ کریں گے کہ سب کے چھکے چھڑا دیں گے۔ اس جوش میں ہم ہوش کھو بیٹھے اور کڑھاؤ کے بالکل نیچے آگ بھڑکانا شروع کر دی۔ کڑھاؤ میں کھڑے ایکسٹرا پہلے تو زرا بے چین ہوئے پھر بڑبڑانے لگے۔ "ارے آگ کم کرو۔ پانی گرم ہو رہا ہے۔ پھر مادر پدر پر اتر آئے، مگر ہم آگ بڑھاتے ہی گئے اور اس سے پہلے کہ پانی پوری طرح ابلنے لگتا۔ ٹارزن آ آ آ، او، او کرتا ہوا ہمارے سر پر آ دھمکا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اُچک کر ایسا شاندار فلائنگ کک لگایا کہ میاں ٹارزن کو دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ ہدایت کار چلایا "ارے یہ تو سچ مچ کا مارا ماری ہونے لگی۔ بے وقوف اس آدمی پر ہمارا ہزاروں روپیہ لگا ہوا ہے۔" اتنے میں ٹارزن اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اب جو اس نے ہمارے اوپر تابڑ توڑ حملے کئے اور دولت کا زور دکھانا شروع کیا تو صاحب ہم سے اپنا پٹنا گنا بھی نہ گیا اور ہم گر کر آناً فاناً غش یعنی بے ہوش ہو گئے۔

اس وقت ہم اسپتال کے بیڈ پر پڑے ہیں۔ سر سے پیر تک پٹیوں میں لپٹے مگر صاحب ہم ہمت ہارنے والے نہیں۔ اداکار بننے کی خواہش نے ابھی دم نہیں توڑا ہے بلکہ یہ خواہش ہمارے دل میں منہ زور گھوڑے کی طرح سرکش ہے۔ خیر پائندہ، فلمیں باقی۔

اقبال شیدائی
ورنگل

بچپن میں ایک نجومی نے ہمارے ہاتھ کی ریکھاؤں کو دیکھ کر ہماری والدۂ ماجدہ کو بتایا تھا کہ ہمارے ستارے بہت کمزور ہیں۔ اسی لیے کسی بھی وقت ہم پر کسی بھی بھوت پریت کا سایہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم بچپن ہی سے سائے سے بہت ڈرتے تھے۔ کبھی تو اپنے ہی سائے سے بدک جاتے تھے۔ عنفوانِ شباب میں داخل ہوئے تو کلّو کھلے شاہ کی تعویذ ہمارے گلے میں باندھی گئی۔ اور ایک گنڈہ ہمارے ڈنڈ پر کسا گیا۔ حکیم راگی حال گلبدنی کا دم کیا ہوا چھلہ ہمارے داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہنا دیا گیا۔ اس طرح ہم مطمئن ہوئے کہ چلو اب سایوں سے چھٹکارہ نصیب ہوا۔ باقی زندگی آرام سے کٹے گی۔ مگر قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کے رہا۔ اور ایک دن سایہ نے ہم پر حملہ کر ہی دیا۔

ٹریجڈی یہ تھی کہ ہم عام حالات میں بالکل نارمل رہتے۔ لیکن جیسے ہی انور حسین انور کے "انڈا محل" کے سامنے سے گزرتے، ہم پر سوار بھوت ایکشن میں آ جاتا۔ وجد ہم پر طاری ہو جاتا۔ وجد کے عالم میں انڈوں سے ٹکرا جاتے اور بچپن تیس انڈوں کو توڑ پھوڑ دیتے۔ دس بارہ انڈوں کو نگل جاتے اور انور کو بل ادا کر کے چلے آتے۔

ایک ہفتے کے اندر اندر آدھی تنخواہ صاف ہو گئی اور بیگم سناٹے میں آ گئیں۔ انہیں یہ گمان گزرا کہ کہیں ہم جوا وغیرہ تو کھیلنے نہیں لگ گئے۔ انہوں نے ایک دن ہمارے ایک دوست خواجہ پاشاہ کو بلا کر کہا کہ وہ ذرا ہماری مصروفیات کو چیک کرتے رہیں۔

دوسرے دن جب ہم انور کی دوکان پر ہنگامہ برپا کر رہے تھے کہ ایک بڑا مجمع ہمارے اس مفت کے تماشے سے محظوظ ہو رہا تھا ان میں خواجہ پاشاہ بھی تھے اور شہر کی مشہور خاتون جو "منتر اماں" کے نام سے پکاری جاتی تھیں ہمارا معائنہ فرمایا۔ حاضرات کا عمل کیا اور اطلاع دی کہ ہم پر ایک انڈے کا سایہ ہو گیا ہے۔

اس اطلاع کے ملتے ہی خواجہ پاشاہ نے انور کو ناپا۔ "دیکھو انور میاں! یہ ہمارا یار اقبال شیدائی تو تمہاری ہی دکان کے انڈے کھاتا ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں کے صدقے، اتارے کے انڈے لا کے بیچتے ہو کہ اچھے خاصے آدمی کو تم نے [illegible] کر دیا۔

ایک طرف مدیوں کی بربادی ہو رہی ہے تو دوسری طرف بیوی بچے پریشان ہیں۔ یہ بات تو اٹل ہے کہ تمہاری دکان ہی کا انڈا کھا کر وہ آسیب کا شکار ہوا ہے۔ تمہاری نیک نامی اسی میں ہے کہ تم بغیر حیل و حجت اس کا علاج کروا دو ورنہ تمام شہر میں تمہیں بدنام کر دوں گا کہ تم صدقوں کے انڈے بیچتے ہو۔"

بے چارے انور حسینی انور عزت دار آدمی تھے اور خواجہ پاشاہ شہر کے چھٹے ہوئے دادا۔ انور صاحب نے کہا ـــــ وہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ تو معلوم ہو کہ اس نامعقول انڈے پر آخر کس کا سایہ تھا۔

منتر المّا نے پھر غور کیا اور ارشاد فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے اس انڈے پر کسی شاعر کا سایہ تھا۔"

ارے اقبال شیدائی بھی تو شاعر ہے یہ اسی کا سایہ ہو سکتا ہے۔" انور میاں نے کترا جانے کی کوشش کی۔

"تم بھی تو بڑے شاعر ہو ـــــ" خواجہ پاشاہ بولے ـــــ یہ سایا تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ پیارے ہمیں چکمہ دینے کی کوشش نہ کرو ورنہ۔"

" ارے چکمہ کون دے رہا ہے ـــــ" انور حسینی بولے ـــــ" منتر المّا! نمٹ لیجئے اقبال شیدائی سے فیس ہم دیں گے۔"

چنانچہ منتر المّا کے حکم پر ہمیں بچھاڑا گیا۔

دو صاحبین دونوں ٹانگوں پر سوار ہو گئے۔ دو صاحبین نے دونوں ہاتھ تھامے۔ ایک صاحب سینے پر سوار ہو گئے۔ خواجہ پاشاہ نے ایک ہاتھ سے ناک کو اور دوسرے ہاتھ سے تھوڑی کو پکڑ کر مخالف سمتوں میں کھینچا تو منہ اچھا خاصا کھل گیا۔ منتر المّا نے انور کی دوکان سے سب سے بڑے انڈے کا انتخاب کر کے اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ انڈے کو مونگ پھلی کے تیل میں بھگو کر ہمارے منہ پر رکھا اور زور سے چٹکی بجائی تو انڈا اسٹریم لائننگ شدہ ڈبے کی طرح شکم میں داخل ہو گیا اور ہم ایک زبردست قسم کی جماہی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اللہ اللہ کر کے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم پر ایک مرغی کا سایہ ہو گیا۔

ہوا یوں کہ ایک دن ہم گھر میں تنہا تھے۔ بیگم میکے گئی ہوئی تھیں۔ قسمت کی ماری ایک مرغی ہمارے گھر میں آ گئی۔ اور ہم اسے قورمے میں تبدیل کر کے چٹ کر گئے۔ بس غضب ہو گیا۔ مرغی کا سایہ ہم پر سوار ہو گیا۔ جب کبھی کوئی مرغی ہمیں نظر آتی ہمارا دھڑ پنڈولم کی طرح ہلنے لگتا۔ ہمارا یہ تماشہ دیکھنے کے لیے جیوں ہی مرغی ہمارے قریب آتی ہم اس پر جھپٹ پڑتے ایک ہاتھ میں مرغی کی گردن اور دوسرے ہاتھ میں نرخرہ پکڑ کر وہ زوردار جھٹکا دیتے کہ گردن اکھڑ جاتی۔ مرغی کا خون پی کر اسے پھینک دیتے۔ ایک دن بیس مرغیوں کی شامت آئی اور بیگم کو دو سو روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ سالوں کو جب اطلاع ملی تو وہ ایک زبردست قسم کے عامل کو پکڑ لائے۔ عامل نے بتایا کہ ہم پر کسی انتہائی جدید جن کا سایہ ہو گیا ہے۔

بہرحال انھوں نے ایک بہت بڑی سی کالی مرغی منگوائی۔ اس پر نہ جانے کیا کیا پڑھ کر پھونکا اور مرغی کو ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولے ـــــ اے بچہ۔ تم بہت سچا۔ اس مرغی کو کھا لو بچّا۔"

علیکم چھیتو۔ نہیں کھاتے ہم۔ ہم تمہارے غلام تھوڑے ہی ہیں۔ ہم نے کہا۔ عامل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ انھوں نے وہ زناٹے

کا تھپڑ ہمارے گال پر جڑ دیا کہ ہم چاروں شانے چت ہو گئے۔ عامل نے ہماری طرف مرغی کو بڑھایا تو ہم مرغی کو چٹ کر گئے ـــــ اس طرح ہم مرغی کے سایہ سے بھی نجات پا گئے۔

لیکن ـــــ لیکن ہماری قسمت میں روزِ ازل ہی اور بھی خطرناک سایوں سے نبٹنا لکھ دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم یکے بعد دیگرے سایوں سے نبٹتے رہے۔ ایک طویل مدت بعد ہم بھلے چنگے ہوئے تو یار لوگوں نے ہماری صحت یابی کی مسرت میں ایک مخصوص مگر شاندار مشاعرہ رکھوایا۔ ہم مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور شہر کے نوجوان شاعر آفاق افقی نے صدارت کی۔

دوسرے دن ہم دفتر سے جیسے ہی گھر لوٹے، دیکھتے کیا ہیں کہ بیگم جدید شاعر گرداب بھنوری کی جدید شاعری کا ضخیم مجموعہ "نقطہ اور خلا" کا مطالعہ فرما رہی ہیں۔ ہم کسی بھوکے شیر کی طرح کتاب پر پل پڑے اور قلابازیاں کھانے لگے۔ پھر ہم نے یہ ضخیم کتاب یوں کھا گئے جس طرح بچپن میں گنّے کھایا کرتے تھے۔ بیگم حیرانی و پریشانی کے عالم میں یہ ناقابلِ فراموش منظر دیکھتی رہیں۔ جب ہماری حالت بحال ہوئی تو بیگم نے دریافت کیا ـــــ اوی اللہ یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا ڈارلنگ؟

کچھ نہیں، جانِ من۔ ہم اچھے موڈ میں ہیں اور تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے کہا۔

ہمارا لڑکا جو ہماری قلابازیوں سے ڈر کر میز کے نیچے چھپ گیا تھا باہر نکل آیا۔ ہماری طرف پیٹھ کر کے اپنی ماں سے مخاطب ہوا ـــــ ممی ممی! گوشت کی دکان پر مشتر چاچا اپنے کسی دوست سے کہہ رہے تھے کہ اقبال شیدائی صاحب پر کسی دیوان کا سایہ ہو گیا ہے۔ کل کے مشاعرے میں شیدائی صاحب آفاق افقی صاحب اور تبریز صاحب کے دیوان اسی طرح کھا گئے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ شہر کے تمام شعرا نے مشاعروں میں بابا کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ اب بابا کو کسی مشاعرے کا دعوت نامہ نہیں ملے گا۔ لیکن ان کے کھانے کے لیے روز نئی نئی کتابیں کہاں سے لائی جائیں گی۔ اگر یہی حالت رہی تو ایک دن یہ مجھے اور تمہیں بھی اسی طرح چبا جائیں گے۔ میں تو ان کا معقول علاج کرواؤں گی۔ چاہے رہا سہا زیور بھی کیوں نہ بک جائے۔ سنا ہے ہندوستان کے مشہور عالم پرتو بلوری ان دنوں شہر ہی میں آئے ہوئے ہیں۔ بھوت پریت، افریت، بھانامتی، شیخ سدو، شاہ جنات، بڑے سے بڑے جن کا آسیب بھی بھگا دیتے ہیں۔ کل ہی میں انہیں عامل پرتو بلوری کے یہاں لے جاؤں گی۔

عامل پرتو بلوری ہماری خیالی تصویر سے بالکل ہی الگ نکلے۔ سولہ سترہ برس کے لونڈے معلوم ہوتے تھے۔ پالسٹر کی سرخ قمیص پہنے تھے کہ جس کی آستینوں کا گھیرا کم از کم ڈیڑھ میٹر تھا۔ ٹری وول کا ایلیفینٹ باٹم پتلون تھا۔ پتلون کیا بس یوں سمجھیے کہ شرارا تھا۔ قمیص اور ایلیفینٹ باٹم کے سنگم پر جہاں غالباً عامل صاحب کی کمر تھی چار انچ چوڑا بیلٹ لگا تھا جس سے سانپ کی کھال منڈھی ہوئی تھی۔ ابھی ہم عامل صاحب کا جائزہ پوری طرح لے بھی نہیں پائے تھے کہ عامل صاحب کا عمل چالو ہو گیا۔ عامل صاحب نے ایک بٹن دبایا تو کمرے کا دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا دوسرا بٹن دبایا تو کمرے میں رنگ برنگے بلب روشن ہو گئے۔ تیسرا بٹن دبایا تو کمرے میں عود و لوبان کے دھوئیں کے مرغولے

اٹھنے لگے۔ جو تھا بٹن دبایا تو وہ خود ہوا میں معلق اٹھنے لگے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو پھیلا دیا جس طرح ہوائی جہاز زمین چھوڑتے وقت ایروڈرم کے چکر لگاتا ہے۔ اسی طرح وہ کمرے کے چکر لگانے لگے۔ ایک لمحہ کے لیے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں ہم دانستہ طور پر کسی بھوت کے جنگل میں تو نہیں پھنس گئے۔ ہم راہ فرار اختیار کرنے کے تعلق سے سوچ ہی رہے تھے کہ عامل صاحب نے ہمارے ارادے کو بھانپ کر فرمایا۔" جناب اقبال شیدائی صاحب! اب آپ مکمل طور پر میرے ریخ میں آچکے ہیں۔ آپ بھاگنے کی کوشش مت کیجیے۔ اب آپ اپنے کیس کی ہسٹری ہمیں سنائیے۔"

ہم نے انہیں چند واقعات سنائے اور چند واقعات سنائے اور چند عمداً حذف کر دیئے۔

شیدائی صاحب۔ کیا کبھی آپ پر جوتے کا سایہ بھی ہوا ہے۔" عامل صاحب نے دریافت کیا؟

ہم نے شرماتے ہوئے عرض کیا ——" ہاں جناب ایک بار ہم نے صابر صاحب کی دوکان سے ایک جوتا خریدا تھا۔ ہم پر جوتے کا سایہ ہو گیا۔ ہم جوتے کھا جاتے تھے۔ یہ سایہ بڑی مشکل سے پوچھا چمار کے سفلی عمل نے فعال تھا۔"

"کیا کسی بکرے کا سایہ بھی ہوا تھا آپ کو۔" عامل پرتو بلوری نے دریافت کیا۔

"جی ہاں ——" ہم نے کہا۔ ایک بار ہم مارکیٹ گئے تو بکرے کے گوشت سے ٹکرا گئے۔ بس بکرے کا سایہ ہم پر ہو گیا۔ ہم دوکان پر جاتے اور کچا گوشت چبانے لگتے۔ ایک دو دن تو قصاب نے صبر کیا تیسرے دن اس نے چھرا گھونپ ہی دیا۔ اور ہم ذبح ہوتے ہوتے بچ گئے۔ ہم دو ماہ تک دواخانے میں اڈمٹ رہے۔ ان دو مہینوں میں ڈاکٹروں نے ہمیں درست کرنے کے تمام حربے استعمال کیے لیکن افاقہ کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر انھوں نے ہمیں یہ کہہ کر ڈسچارج کر دیا کہ میاں اقبال شیدائی آخری دو چار دن اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سکون سے گزار کر مر جاؤ۔ جب ہماری زندہ لاش مکان لائی گئی تو پڑوسی نے بیگم کو مشورہ دیا کہ اب تو شیدائی صاحب کا چل چلاؤ ہے۔ ان کی زندگی میں یہ ٹوٹکا بھی کر کے دیکھو تو کہ بعد میں اس کا افسوس نہ رہے۔ ایک بکرا شیدائی صاحب پر سے صدقہ کر کے چھوڑ دو!

چنانچہ بیگم نے اپنی منگنی کی انگوٹھی فروخت کر دی اور ایک بکرا اس وقت ہم پر سے وار دیا گیا جب کہ ہم انتہائی گہری نیند سو رہے تھے۔ ہم پر سے وارے جانے کی مسرت میں بکرے نے جو جھیر دیں چھیڑی تو ہماری نیند ٹوٹی اور ہم بھوکے گدھ کی طرح بکرے پر جھپٹے اور اسے یوں چٹ کر گئے جیسے آپ آئس کریم چٹ کر جایا کرتے ہیں۔

"اچھا اقبال شیدائی صاحب!" عامل نے کمرے کا چکر مارتے مارتے رک کر دریافت کیا۔" فرمائیے آپ بحیثیت شاعر کیا محسوس کرتے ہیں؟"

عرض کیا —— جناب اب ہم سمجھنے لگے ہیں کہ دنیا میں ہمیں واحد شاعر ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ کسی بھی مشاعرے میں تشریف لانے والے ہم ہی پہلے شاعر ہوا کرتے تھے۔ پڑھنے کا موقع ملتا تو اسے اپنی خوش بختی تصور کرتے۔ لیکن اب مشاعرے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اگر کسی مشاعرے میں شرکت کرتے بھی ہیں تو اس وقت جب کہ جناب صدر کا نام پکارا جانے والا ہوتا ہے۔ مشاعرے میں جانے سے قبل اپنی عمدہ بیاض عموماً بھول جاتے ہیں۔ اس لیے چیدہ چیدہ اشعار سناتے ہیں۔ مقطع سے شروع کر کے مطلع پر ختم کرتے ہیں۔ مہمل قسم کے اشعار لکھ کر اس بات کے متمنی رہتے ہیں کہ لوگ

توڑ کر داد دیں ۔ ان سے ایسے نئے نئے و حیرت انگیز معانی ومطالب اخذ کریں جن کا ہم نے بھی کبھی خواب میں تک تصوّر نہ کیا ہو۔ پہلے مصرعے ہی پر داد نہیں ملتی تو ما بقی اشعار نہیں سناتے ۔

" واہ واہ ! گھٹا چھا ----- " عامل صاحب نے اچانک تالی بجا کر کہا ----- " آپ پر تابوت کا سایہ ہو گیا ہے "

" تابوت کا سایہ ----- یہ کون سے نئے جن ہیں عامل صاحب ----- ہم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا ۔

ایک زبردست قہقہہ لگا کر عامل صاحب گویا ہوئے ----- " مسٹر یہ جن نہیں بلکہ آپ کے شہر کے جدید شاعر تابوت علقی ہیں یہ حضرت تابوت کب سے جن صفت ہو گئے عامل صاحب " ہم نے حیرت کے سمندر میں سے سوال کیا ۔

عامل صاحب بولے ---- بات دراصل یہ ہے اقبال شیدائی کہ یہ جو تابوت علقی ہیں نا ان پر شاہ جدات کا سایہ ہو گیا ۔ شاہ جدات یہ کہاں کے جن ہیں عامل صاحب ۔ ہم نے مزید حیران ہوتے ہوئے پوچھا ۔

" دیکھو بابا ----- " عامل صاحب بولے ----- یہ فقرا کی باتیں ہیں ۔ تم عاملانہ رموز سمجھ نہیں پاؤ گے ۔ پھر بھی ہم کچھ شدبد بتانے کی کوشش کریں گے ۔ شاہ جدات یہ جو ہیں نا ۔ وہ انتہائی جدید قسم کے جن ہیں اور بہت کم عمر ہیں ۔ اور انتہائی جدید شاعری اور کسی سایوں کے ناجائز اختلاط کی علت میں عالم وجود میں آئے ہیں اور موجودہ تمام جنات میں سب سے زیادہ خطرناک تصور کئے جاتے ہیں ۔ شاہ جدات کی اڑان بہت اونچی ہے ۔ وہ عام عاملوں کے ہاتھ نہیں آتے ۔ کوئی ہم جیسا جید عامل ہی ان کا سراغ پا سکتا ہے " ۔

یہ سن کر ہمارے دل میں جناب تابوت علقی کے لیے غیر معمولی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا ۔ ہم نے تاسفانہ لہجے میں دریافت کیا ۔ قبلہ عامل صاحب ! کیا آپ بتا سکیں گے کہ غریب تابوت علقی صاحب اس سفاک جن کے کیسے اسیر ہو گئے " ۔

یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے بچہ ۔ " عامل بڑی بلوری بولے ---- کوئی خم کا خم پی کر بھی حواس بحال رکھتا ہے ۔ اور کوئی ایک آدھ پیگ ہی میں ہوش گنوا دیتا ہے یہی ٹریجڈی تابوت کے ساتھ ہوئی ---- جب کبھی کوئی شاعر یہ چاہتا ہے کہ اس کی شاعری و افکار میں اچانک ہی آفت آ جائے ۔ وہ جو بھی بات کہے وہ حیرت انگیز ہو ۔ اس کا لہجہ گمبھیر ہو جائے ۔ وہ گو اپنے ہی ملک کے ادیبوں اور قلم کاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن غیر ملکی ادیبوں کے نظریات سے الجھ جاتا ہے ۔ ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جو خود اس کے پلے نہیں پڑتیں ۔ اونچے اونچے خواب دیکھتا ہے ۔ گویا ہوا میں اڑنے لگتا ہے ۔ بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے ۔ اور جب انھیں عملی جامہ پہنانے کا وقت آتا ہے تو اس کے ظرف کا کم مایہ کٹورا حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے ۔ سپنوں کا شیش محل ڈھیر ہو جاتا ہے ۔ مایوسیوں اور محرومیوں کا اژدھا پھنکارتا ہوا اس کی سمت بڑھنے لگتا ہے تو اسے اپنے اطراف کی ہر شے دھواں دھواں سی نظر آنے لگتی ہے ۔ اسے اپنا وجود بھی سایہ سا معلوم ہونے لگتا ہے ۔ اس کو ہر چیز ہاتھ نہ آنے والا سایہ معلوم ہوتی ہے ۔ گھر ، سایہ ۔ بیوی بچے سایہ ، لوگ سایہ ، زمین سایہ ، آسمان سایہ ، شاعری سایہ ، سایہ ، سایہ سایہ ۔ یہاں تک کہ وہ سائے میں جذب ہو جاتا ہے اور سایہ اس میں انہیں کیفیات سے جب میاں تابوت گزرے تو شاید جدات ان پر بڑی آسانی سے مسلط ہو گئے ۔ اور ---- اور وہ کام سے گئے ۔

اس اثناء میں ان بزرگ کا بھی جن جن پہ سایہ پڑا وہ بھی کام سے گئے ۔ یوں تو شہر کے کئی شاعروں پہ تابوت کا سایہ

پڑا۔ لیکن چونکہ ان کے ستارے زبردست تھے اس لیے وہ معمولی سے ذہنی کرب کے بعد بحال ہو گئے۔ لیکن آپ کے ستارے نہایت کمزور تھے۔ اس لیے آپ راست طور پر تابوت کے سائے سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ تابوت صاحب ایک بار الفت کی دوکان پر آئے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے ایک انڈے کو چھوا۔ وہی انڈا آپ نے خرید کر کھایا اور آپ پر انڈے کا سایہ ہو گیا۔ تابوت کا سایہ ایک مرغی پر پڑا۔ وہی مرغی آپ کے دسترخوان پر تڑپ مر گئی اور آپ مرغی کے سائے کا شکار ہو گئے۔ صائب صاحب کی دوکان پر تابوت کا چھوا ہوا جوتا آپ نے خریدا اور جوتے کے سایہ نے آپ پر حملہ کر دیا۔ الغرض جس جس چیز کو بھی مسٹر تابوت نے چھوا یا اس پران کا سایہ گرا وہ آپ کے استعمال میں آ گئی اور آپ اس کے سایہ میں مبتلا ہوتے گئے۔ خدا کا احسان ہوا کہ آپ نے سرکس کے ہاتھی کو ہاتھ نہیں لگایا ورنہ آپ پر ہاتھی کا سایہ ہو جاتا اور آپ اس سایہ کے متحمل ہوتے۔

یہ حیرت انگیز تفصیل سن کر ہم نے عرض کیا ــــ قبلہ وکعبہ! بتائیے کہ ہم تابوت کے سایہ سے کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں!"

عامل پیر تو ملوری نے کہا ــــ صاحبزادے! یہ مت بھولو کہ تم پر تابوت کا سایہ ہوا ہے اور تابوت پر شاہ جدات کا سایہ ہے اس لیے جب تک تابوت کے وجود سے شاہ جدات کا سایہ نہیں ہٹتا، تم سکون سے نہیں رہ سکتے۔

ہم نے مضطربانہ عرض کیا ــــ" حضرت قبلہ! پھر بتائیے نا کہ تابوت کے وجود سے شاہ جدات کا سایہ کیسے برخواست کیا جا سکتا ہے۔" یہ جو شاہ جدات کا سایہ ہے نا یہ نئے زمانے کی پیداوار ہے۔ عامل پیر تو ملوری نے گلفشانی کی۔ "یہ ایک سائنٹیفک اور ادبی سایہ ہے۔ اور اس کا علاج ظاہر ہے۔ نہایت ہی سائنٹیفک اور ادبی ہی ہونا چاہیے۔"

بجا ارشاد ــــ" ہم نے بیتابانہ عرض کیا ــــ اور وہ ــــ وہ کیا ہے عامل صاحب؟"

عامل صاحب نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ پھر نہایت ہی گمبھیر لہجے میں آنکھوں کو بند کئے ہی فرمایا ــــ ! اور وہ علاج ہے ــــ وہ علاج ہے تابوت صاحب کی مہمل شاعری کا مزاحیہ انداز میں پوسٹ مارٹم۔ جیسے جیسے تیکھے انداز میں آپ تابوت صاحب کے اشعار کی تشریح فرماتے جائیں گے ویسے ویسے شاہ جدات کا سایہ تابوت کے وجود سے دور ہٹتا جائے گا۔ اور تابوت کا سایہ آپ کے وجود سے پناہ مانگتا جائے گا۔ اور ــــ اور ــــ آپ کے ستارے مضبوط ہوتے جائیں گے۔

اور ــــ اور جب سے یہ سائنٹیفک اور ادبی نسخہ ہمارے ہاتھ آیا ہے اس وقت سے کوئی بھی سایہ ہم پر اثر انداز نہیں ہو پا رہا ہے ــــ

دیویندر پرتاپ اہوجی

مترجم: کالیکا پرشاد

جب سے سن ۱۹۷۵ء کو بین الاقوامی عورتوں کا سال قرار دیا گیا ہے، تب سے ہماری بیگم صاحبہ کا دماغ جیسے ساتویں آسمان پر ہے۔ دسمبر ۱۹۷۴ء تک میرے حساب سے وہ ایک مثالی عورت تھی۔ میرے دیر یا جلد آنے پر کوئی میں میخ نہیں نکالتی تھی۔ میری قمیصوں اور پتلونوں میں بٹن برابر لگے ہوئے رہتے تھے۔ ہمیشہ چائے گرم ملا کرتی تھی۔

مگر یکم جنوری ۱۹۷۵ء کی صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کا پہلا جملہ ہی بے حد حیران کن تھا۔ "آج کھانا ہوٹل میں کھا لینا۔" وہ بولی۔

"نیا سال مبارک"۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا اور اس کی کلائی پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔

"میرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"آپ کو بھی مبارک۔ ویسے میں نے جو بات کہی ہے وہ سن لی ہے نا؟ آج کھانا ہوٹل میں کھا لینا۔"

"کیوں؟" میں نے آنکھیں پوری طرح کھولتے ہوئے پوچھا۔

"بخار آگیا ہے کیا؟ تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"بخار آئے میرے دشمنوں کو۔" وہ بولی۔

"تو پھر"؟

"گیارہ بجے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

"میٹنگ! کیسی میٹنگ؟"

"ٹوکا مت کرو۔ ہے ایک میٹنگ ـــ محلے کی عورتوں کی۔ اس بین الاقوامی عورتوں کے سال میں ہمیں کیا کیا کرنا چاہیئے۔ ہماری کیا خواہشات ہیں؟ صدیوں سے ہم عورتوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں اور غیر انسانی بار لادے جا رہے ہیں۔

ان سے کس طرح نجات حاصل کی جائے، ان تمام مسائل پر غور و خوض کے لئے ایک میٹنگ بلائی گئی ہے۔

"کس نے بلائی ہے ؟"

"شریمتی ثریا خانم نے"

"ارے وہ عورت ؟"

شریمتی جی ڈریسنگ ٹیبل سے جھٹکے سے پلٹیں اور میری آنکھوں میں سلگتی ہوئی آنکھیں ڈال کر بولیں ———

"جی ہاں وہ عورت۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ جس انداز میں آپ نے " وہ عورت " کہا اس کا کیا مطلب ہے۔ ؟"

میری خواہش تو ہوئی کہ صاف صاف الفاظ میں شریمتی ثریا خانم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کردوں۔ مگر یہ دیکھ کر کہ شریمتی جی کا موڈ خراب ہے اور میں جو کچھ کہوں گا' اس سے بات کچھ بننے کی نہیں تو میں نے فوری موضوع بدل دیا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں"۔ میں نے ایک مسکان چہرے پر لاتے ہوئے کہا ——— "اب مذاق پر بھی ناراضگی"

شریمتی جی کا میکہ بمبئی میں ہے۔ اس لیے جملے کے آخر میں " بس کیا " لگا کر ان کے لیے آسان کر دیا۔

" ایسا مذاق اچھا نہیں۔" وہ ذرا نرمی سے کہنے لگی۔

شریمتی ثریا خانم ہمارے محلے کی سب سے قابل خاتون ہے۔ ایم۔ اے تو خیر وہ ہے ہی مگر اس کے علاوہ شکاری بھی اول نمبر کی ہے۔ ان کی دونالی بندوق اکثر قرب و جوار کے جنگلوں میں تباہی مچاتی رہتی ہے۔ ابھی ایک ہفتہ قبل ہی انھوں نے ایک بارہ سنگھا مارا تھا۔ اس کا سر کل ہی دیوار پر ٹانگا گیا ہے۔"

میرے دل میں آیا' پوچھوں کہ اپنے مرحوم شوہر کا سر بھی کیوں نہیں بارہ سنگھے کے سر کے ساتھ ٹانگ لیا لیکن پھر کہیں ان کا پارہ نہ چڑھ جائے اس خوف سے دل مسوس کر رہ گیا۔

یہ افواہ گرم تھی کہ ان کی بیوی نے ہی زہر دے کر ختم کردیا تھا کیونکہ وہ ان کے خفیہ معاشقہ کے کباب میں ہڈی کا رول نبھانے لگے تھے۔

"بے شک بے شک" میں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "عورت بڑے کانٹے کی ہے۔ ایک دم [illegible]۔ میرا اسلام دیجئے گا اور اب میری ناچیز رائے میں آپ چائے بنا ڈالیں تو اچھا ہے۔ ساڑھے سات بج گئے [illegible]

"ارے ہاں —" انہوں نے کہا۔ "مگر آج چائے تمہیں ہی بنانی ہوگی۔ مجھے کئی ٹیلی فون کرنے ہیں۔" [illegible] کی جانب لپکیں اور وہیں سے چلائیں۔ "ایک پیالہ مجھے بھی دے جانا۔ نہیں میٹھا کم۔ ہاں ایک آدھ بسکٹ [illegible]

" مارا گیا برہما چاری" گنگناتا ہوا میں بستر سے اٹھا اور کچن کی طرف بڑھا۔ جب تک میں نے چائے بنائی تب تک شریمتی جی نے دنادن ۱۰ ' ۱۲ فون کھڑکا ڈالے۔ جب میں چائے اور بسکٹ لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچا اس وقت وہ کسی خاتون سے کہہ رہی تھیں۔

" جی ہاں ٹھیک گیارہ بجے۔ نہیں' یہ بات ٹھیک نہیں شریمتی کھنہ۔ آپ کو ضرور آنا چاہیے۔ آپ کا شمار اس محلے کی ترقی پسند خواتین میں ہے۔ بین الاقوامی عورتوں کا سال بار بار نہیں آتا . . . . . تو آئیں گی نا ؟ شکریہ"

"او' چائے لے آئے۔" وہ میری جانب مخاطب ہو کر بولیں ——— "دیکھیں کیسی بنائی ہے۔ ؟"

انھوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور منہ بچکاکر کہا ۔ "بس کر دیا نا کوڑا؟ پانی پوری طرح نہیں اُبالا..... چائے بھی کم ڈالی ..... اور میٹھا؟ رام رام کتنے چمچہ جھونک دیئے اس میں۔؟

"ڈھائی"

"ڈھائی جبکہ میں ایک لیتی ہوں۔

"میڈم" میں نے غصہ تھوکتے ہوئے کہا ۔ "آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ میں نے آج پورے ایک سال بعد چائے بنائی ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ آپ کتنا میٹھا لیتی ہیں؟ میں خود پانچ چمچے لیتا ہوں تو سوچا کہ تم بھی کم از کم ڈھائی تو لوگی ہی ..... دوبارہ بنا دوں؟"

کافی رُوکھی آواز میں" جی نہیں شکریہ" کہہ کر میرا آفر ٹھکرا دیا۔ ایک کاغذ پنسل اٹھا کر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔

"کیا لکھ رہی ہو..... چٹھی؟"

"نہیں .....میمو"

"میمو!"

ہاں مٹینگ میں میں یہ تجویز رکھوں گی کہ ہر مرد کے لیے چاہے وہ شوہر ہو یا بیٹا، وقتاً فوقتاً "ریفریشر کورس" کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ موقع پڑنے پر بالکل بدھو نہ ثابت ہوں اور ایسے چھوٹے موٹے کام کر سکیں جیسے چائے بنانا پراٹھے سینکنا، جھاڑو لگانا کپڑے دھونا ان پر استری کرنا وغیرہ۔"

"بٹن لگانا، سینا پرونا، کڑھائی بنائی، بچے پالنا وغیرہ بھی لکھ لو۔" میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

ہاں، ہاں بالکل ٹھیک۔ بڑی اچھی تجویز ہے۔"

"وقت تو مردوں کو کافی ملے گا ہی یہ سب کام کاج سیکھنے اور کرنے کے لئے۔

"اور نہیں تو کیا؟ سات آٹھ گھنٹے آفس میں بیٹھنے کے علاوہ کرتے ہی کیا ہیں یہ؟ یہ سب چیزیں بھی تو آخر ہنر ہی ہیں سیکھ لیں گے تو صرف انھیں کے نہیں سارے خاندان کے کام آئیں گے۔" اور وہ میمو ڈرافٹ کرنے میں لگ گئیں۔

"کھانا ہوٹل میں کھانا ہے، کھانا ہوٹل میں کھانا ہے۔" یہ بات دماغ میں رٹتے رٹتے میں وہاں سے کھسک گیا اور آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔

شام کو جب واپس لوٹا تو دیکھا کہ شریمتی جی گھر پر نہیں ہیں۔ اور ڈرائنگ روم میں میز پر کھلی چٹھی رکھی ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ "۶ سے ۸ بجے تک ایک اور میٹنگ ہے اس میں جا رہی ہوں۔ دودھ کی بوتل فرج میں رکھی ہے۔ دودھ ابال کر چائے بنا لینا۔ پتی ایک چمچہ سے زیادہ مت ڈالنا اور میٹھا بھی تمہیں کم لینا چاہیے۔ ٹوکری میں چار آلو ابال کر رکھ دینا۔ پتہ نہیں آٹا گوندھ سکتے ہو کہ نہیں۔ اگر ہاں تو دو کٹوری آٹا گوندھ کر اسے کپڑے یا طشتری سے ڈھک کر رکھ دینا۔ میری نئی چپل نہیں ملی۔ معلوم نہیں کہاں رکھ دی ہے اسے ڈھونڈ کر میرے شو ریک پر رکھ دینا اپنا رومال، کنگھی اور چڈی دھوکر سوکھنے ڈال دینا۔ میری بہت ہی زیادہ ضرورت پڑے تو شریمتی رحمٰن کے گھر فون کر لینا۔ میں وہیں ہوں گی ..... بائی ....

ایک مجنوں کی طرح "بائی بائی ٹو یو" گنگناتے ہوئے میں نے چٹھی کو چوما اور پھر اسے بڑے پیار سے دھیرے دھیرے

جھاڑ ڈالا۔ کاغذ کے پرزوں کو شریمتی جی کی ڈریسنگ ٹیبل پر سجا کر رکھ دیا، پھر دودھ، آلو اور آٹے کی تلاش میں کچن کی طرف بڑھا۔

یہ ہر پہلی جنوری ۱۹۷۵ء کا قصہ ہے۔ اس کے بعد تو بین الاقوامی عورتوں کا سال سانپ کے زہر کی طرح میرے خون میں تیزی سے سرایت کرنے لگا۔ دوسری یا تیسری میٹنگ میں شریمتی جی کی قرارداد اکثریت سے پاس ہو گئی اور اس کے اگلے دن محلے کی عورتوں کا ایک خاصا بڑا جلوس نکلا جس میں مردوں کے خلاف اور عورتوں کی تائید میں طرح طرح کے نعرے لگائے گئے۔ کئی ایک خواتین اپنے ہاتھوں میں بینر لیے تھیں جن پر لکھا تھا:

"عورتیں جانور نہیں انسان ہیں۔"

"ظالم مرد ——— مردہ باد"

"مرد گھر کا کام کرنا سیکھیں۔"

"ہمیں بھی ہفتے میں ایک دن کی چھٹی چاہیے۔"

"بلا معاوضہ کام ——— نہیں کریں گے، نہیں کریں گے!"

"خود غرض مرد۔ ہائے ہائے۔ وغیرہ۔

جنوری کے آخری اتوار کی صبح میں مزے سے چائے پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ اخبار پڑھ رہا تھا۔ کچھ دنوں سے بین الاقوامی عورتوں کا سال" فرنٹ پر امن تھا اور محلے کے مرد اپنے آپ کو مبارک باد دینے لگے تھے کہ جلو جان چھوٹی۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور شریمتی جی نے کچن سے چلا کر کہا ——— "اجی ذرا دیکھنا کون ہے؟ اگر کیلے والی ہو تو کہہ دو کہ آج کیلے نہیں چاہئیں۔"

میں نے دروازہ کھولا اور دو عورتوں کو کھڑی دیکھ کر فوراً کہا ———"

"آج کیلے نہیں چاہئیں۔" ان عورتوں نے بیک وقت کہا "جی؟"

"آج کیلے نہیں چاہئیں۔ آج کیلوں کی چھٹی۔"

"جی، ہم کیلے بیچنے نہیں آئی ہیں"۔ ان میں سے ایک نتھنے پھلا کر بولی ——— "ہمیں شریمتی ثریا خانم نے بھیجا ہے۔ معاف کیجئے گا...... کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟

میں دروازے سے ہٹ گیا اور وہ دونوں بے دھڑک اندر آکر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"میں ہوں شیلا ورما" ان میں سے ایک بولی "اور یہ ہے ودیا مصرا۔"

"او..... نمستے۔"

"آپ مسٹر پرشاد ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"نمستے۔"

نمستے۔" ودیا مصرا نے کہا۔

نمستے۔" میں نے جواب دیا۔

اتنے میں شریمتی جی کچن سے نکل کر آ گئیں۔

"ارے شیلا ورما، ودیا مصرا، نمستے، نمستے۔ کہیے آج کیسے درشن دیئے؟"

"آپ بھول گئیں۔ آج سے پرشاد جی کو ٹریننگ میں ڈالنا ہے"۔ "او ۔۔۔۔ ہاں میں بھی بھول گئی تھی۔ دیکھئے جی ۔۔۔"
وہ میری طرف مخاطب ہوئیں۔ "جی ہاں" میں نے ایک اندرونی خوف کے تحت کہا
"آج آپ کلب نہیں جائیں گے۔ شریمتی جی زوردار آواز میں بولیں۔ "آج آپ ٹریننگ لیں گے شیلا ورما آپ کو چائے بنانا،
دیا مصرا جھاڑو لگانا اور سبزیاں کاٹنا سکھائیں گی۔ شریمتی جی بولیں۔
ٹریننگ ختم ہونے میں چار اتوار نکل گئے اور اس کے آخر میں خود شریمتی ثریا خانم نے ہماری کٹیا میں پدھار کر میری آزمائش
لی اور مجھے کامیاب قرار دیا۔
اور اب حال یہ ہے کہ ہر اتوار کو شریمتی جی عورتوں کے کلب کو چلی جاتی ہیں اور بندہ گھر کے سارے کام کاج کرتا ہے۔
"بہت خوب" شریمتی جی نے گزشتہ اتوار کو میری بنائی ہوئی ترکاریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج کپڑے بھی بہت
اُجلے دُھلے ہیں۔ دیکھا نا، بین الاقوامی عورتوں کے سال نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے!" ○○

اسکائی لیب

اسکائی لیب ٹوٹ کے جب تک گرا نہ تھا　　اس کے سوا زباں پہ کوئی تذکرہ نہ تھا
ہر شخص کو تھا وسوسۂ مرگِ ناگہاں　　وہ بھی تھے بدحواس جو تھے رستمِ زماں
تھا جن کو امتحانِ اذیت بہت پسند　　جو چاند پہ چلے تھے کبھی ڈال کے کمند
مرنے کی بات سن کے بھرم ان کا کھل گیا　　ڈٹ کر نہ ان سے ہو سکا اس کا مقابلہ
جتن چچا بھی بھول گئے اپنی چوکڑی　　دن رات چھوٹتے تھے جو ڈینگوں کی پھلجھڑی
یوں بدحواس ہو کے بہاتے تھے اشک تر　　اسکائی لیب جیسے گرے گا انہی کے گھر
بھولے سے بھی نہ آئی جنہیں ماسوا کی یاد　　آنے لگی تھی ان کے بھی دل میں خدا کی یاد
تا عمر یادِ حق سے رہے تھے جو بے نیاز　　ردِّ بلا کے واسطے پڑھنے لگے نماز
جاری تھے مندروں میں بھی بھگوان کے بھجن　　چڑھتے تھے دیوتاؤں پہ کالے سفید دھن
بامِ عروج پر تھیں تو ہم پرستیاں　　اس کی اسیر آئیں نظر ایسی ہستیاں
افکار میں جو اپنے ترقی پسند تھیں　　لینن کی اور ماؤ کی جو بھائی بند تھیں
ماؤں نے دودھ بخش دیئے تھے سپوتوں کے　　وردِ زباں تھے موت کے دن رات مرثیے
دیتی تھی ساس اپنی بہو کو یہ بد دعا　　تکنی کا ناچ اور کوئی دن مجھے نچا
کب تک رہیگا مجھ پہ ترا ظلم ناروا　　اسکائی لیب تجھ پہ گرے گا ٹھہر ذرا
القصہ اپنے طور پہ اسکائی لیب کا　　ہر شخص کی زباں پہ مسلسل تھا تذکرہ
لیکن نہ شاعروں پہ اثر تھا روایتاً　　وہ اپنی شاعری میں شب و روز تھے مگن
ان کے لیے وہ بن گئی تخئیل آفریں　　"اسکائی لیب نے جو عطا کی نئی زمیں
نظم و غزل کے سگنے لگے ڈھیر چار سو　　ہونے لگے مشاعرے دن رات کو بہ کو
گیارہ جولائی کو وہ گرا جب زمین پہ　　سنتے رہے مشاعرہ مختار رات بھر

مختار یوسفی

پرویز یداللہ مہدی

(آخری قسط آئندہ شمارہ میں)

بے دھڑک کے ہاتھ پستول کیا لگا ہم سب کی ہوا نکل گئی۔ بلکہ اُترے ہوئے چہرے پر ایسی بشاشت لوٹ آئی تھی جیسے کسی پلپلے غبارے میں دوبارہ ہوا بھر دی گئی ہو۔ لٹکی ہوئی گردن تن گئی تھی۔ بجھی ہوئی آنکھوں میں پھر سے تھرکے الاؤ روشن ہو گئے تھے۔ اور ہمیں رہ رہ کر قبلہ چہ خوب کی حماقت مآبی پر غصہ آرہا تھا۔ ایسی جان لیوا دھماکو شئے ساتھ لانے کی ضرورت ہی کیا تھی جو جس کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے اسی کے گن گاتی ہے اور اگر حفظ ماتقدم کے طور پر پستول اپنی جیب میں اڑس لائے تھے تو اسے باہر نکال کر اس کی نمائش کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے مارے گھبراہٹ کے تھوک نگلتے ہوئے ایک بار پھر غیر شعوری طور پر پستول کی طرف دیکھا جو بے دھڑک کی مضبوط گرفت میں لپلپاتی ہوئی فولادی زبان نکال کر ہمیں منہ چڑاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ——— ہم نے سوچا دیگر پستولوں کی طرح اس پستول میں بھی چھ عدد گولیوں کی گنجایش ہوگی جبکہ پستول کی زد پر صرف تین عدد وجود تھے۔ گویا ہر ایک کے حصے میں دو عدد گولیوں کا آنا یقینی تھا۔ ہم نے ایک بار پھر قبلہ چہ خوب کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا کہ کس اعتماد سے اپنے ساتھ ہماری موت کا سامان کر کے خود یوں ہکا بکا کھڑے ہیں جیسے ابھی ابھی زندگی کے سب سے بڑے شاک سے دوچار ہوئے ہوں۔ ویسے سچ پوچھئے تو ابھی کچھ دیر پہلے طوطا پری نے مرحومہ نادرہ خانم اور بے دھڑک کے تعلق سے جو انکشاف کیا تھا اس نے چند لمحوں کے لیے ہمارے دل و دماغ کو بھی ماؤف کر دیا تھا۔ قبلہ چہ خوب کے لیے تو یہ ان کی زندگی کا آخری شاک ثابت ہو سکتی تھی کہ موصوف نام نہاد ہی سہی پر تھے تو مرحومہ کے شوہر اور جو شخص کہ ساری بستی میں مرحومہ کا کزن مشہور تھا وہ .... سوچوں کی دوڑ اس سرے پر پہنچ کر ہمارے لیے پھندا بن گئی۔ کیا واقعی بے دھڑک نادرہ مرحومہ کا اصلی اور جائز شوہر ہے؟

یہ سوالیہ جملہ جواب طلب ہوتے ہوئے بھی جواب کا محتاج نہیں محسوس ہوتا تھا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو طوطا پری کی

زبان پر ایسی بات آتی ہی کیوں ظاہر ہے اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ضرور ہوگا ـــــ دوسرے خود بے دھڑک نے ابھی تک اس بات کی تردید نہیں کی تھی قبلہ جیہ خوب کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لینے کے باوجود وہ چپ کھڑا تھا۔ اور اس کی یہ خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ طوطا پری کے ایک ایک لفظ میں سچائی ہے ـــــ اور یہی سچائی ہمیں اس بات کو ماننے پر مجبور کر رہی تھی کہ نادرہ مرحومہ کا قاتل طوطا پری نہیں بلکہ خود بے دھڑک ہے۔!!! اب ہمیں بے دھڑک ایک ایک انچ قاتل نظر آرہا تھا۔ جس نے خود اپنی بیوی کا خون کر کے اپنے لیے پھانسی کا پھندہ منتخب کر لیا تھا۔ اب اگر وہ مزید تین خون کرتا ہے تو بھی قانون اسے پھانسی ہی دے گا جو اس کا مقدر بن چکی ہے۔ ایک ایسے سفاک قاتل سے رحم کی امید کرنا فضول تھا جس نے اپنے ہاتھوں سے خود اپنی بیوی کا خون کیا ہو ـــــ اپنی ہی سوچوں کے وار خود ہمارے احساسات کو معطل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہماری زبان میں اتنی بھی سکت باقی نہیں رہی کہ بے دھڑک کو اپنی دوستی کا واسطہ دے کر اپنی جان بخشی کی درخواست کرتے ـــــ قبلہ جیہ خوب بیت بنے کھڑے تھے۔ شیوا اور فینی 'ڈر' خوف' درد کرب اور حیرت کی تصویر بنی تھیں اور طوطا پری اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے بعد یوں گنگ کھڑا تھا جیسے اس ایسی ڈرامے میں اس کا پارٹ ختم ہو گیا ہو ـــــ !

فضا پر ایک ایسا سکوت طاری تھا جس کے آگے شہر خموشاں کا سکوت بھی شرما جائے۔ گویا قضا کا تسلط تھا اس سکوت مرگ کو چیرتی ہوئی ایک آواز ابھری ـــــ شہزادہ صاحب!

یہ آواز یقیناً بے دھڑک کی تھی لیکن اس قدر بدلی ہوئی اس قدر اجنبی کہ ہمیں خود اپنی سماعت پر تعجب ہوا ـــــ بے دھڑک نے اپنی اجنبی آواز میں آگے کہا ـــــ میں جانتا ہوں شہزادہ صاحب اب ہمارے بیچ نہ وہ پہلی سی دوستی باقی رہی ہوگی نہ یاری' اب میں آپ کی نظر میں سراپا' قاتل ہوں' قاتل' ہا ہا ـــــ " اس کا بھیانک قہقہہ ماحول کے سینے کو بھی شق کر گیا۔

پھر اس کا یہ بھیانک قہقہہ اس حد کو چھونے لگا جہاں پہنچ کر ہر ہنسی ہر قہقہہ کرب کی پہنائی سے ٹکرا کر آنسوؤں کے ابلتے چشمے جاری کر دیتا ہے۔ وہ دیوانگی کے عالم میں مزید بول اٹھا۔ میں نے نادرہ کا خون کر دیا' ہاں ہاں میں نے اسے ختم کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا کیونکہ۔ کیونکہ اس نے مجھے ختم کر دیا تھا' بہت پہلے میرے اندر کے مرد کو وہ مار چکی تھی اپنے ہاتھوں سے اپنا گلہ گھونٹ چکی تھی' اب سے سات برس پہلے جب اس نے پہلی بار سیٹھ ہاشم بھائی کو اپنایا تھا ـــــ !!!

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رک گیا جیسے اپنے جذبات پر قابو پانا چاہتا ہو۔ لیکن اس بات میں اسے سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ چنانچہ اسی طرح جذباتی لہجے میں اس نے آگے کہنا شروع کیا ـــــ مجھے نادرہ کے ہرجائی پن پر کبھی غصہ نہیں آیا میں بس ہمیشہ اپنی بے غیرت زندگی پر لعنت ملامت بھیجتا رہا۔ لیکن نہ نادرہ کا دامن چھوڑ سکا اور نہ زندگی سے اپنا دامن چھڑا سکا ـــــ بس دیکھتا رہا اپنی بیوی کو' بوالہوس بوڑھوں کے پہلو گرماتے دیکھتا رہا ـــــ سیٹھ ہاشم بھائی کے بعد خان بہادر' شیخ آدم اور پھر ..... اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ٹکٹکی باندھ کر قبلہ

پھلکیوں دیکھنے لگا اور قبلہ چرخوب کو ہم نے اتنے عرصے میں شاید پہلی بار اس حال میں دیکھا کہ کاٹو تو لہو نہ روح نہ زندگی ـــــــ صرف قبلہ چرخوب ہی کیوں اطراف واکناف کا سارا ماحول ہی بے روح ہو چکا تھا، اسی بے روح ماحول میں بے ڈھنگے ہونٹ کا ایک اور دلخراش قہقہہ گونجا اور پھر وہ کسی خودکار ٹیپ ریکارڈر کی طرح شروع ہو گیا۔ کتنی عجیب وغریب عورت تھی وہ جو بیک وقت میری بھی بیوی تھی اور دوسروں کی بھی، لیکن صرف بیوی بنا لینے سے کیا ایک مرد عورت کے دل دماغ اور جسم کے چپے چپے پر قابض ہو سکتا ہے۔ نہیں ـــــــ اور پھر نادرہ جیسی عورت جو عورت ہوتے ہوئے بھی عورت نہیں تھی۔ پوچھوں ان مردوں سے جنہوں نے اسے عورت سمجھ کر اپنے آپ کو اسکے حوالے کیا، لیکن میں جانتا ہوں ان میں سے کسی نے اسے ازدواجی زندگی کی طرف راغب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ـــــــ سب اس کے نام نہاد شوہر تھے ـــــــ پوچھو نواب صاحب سے کیا انھیں کبھی نادرہ کا صحیح معنوں میں شوہر بننے کا شرف حاصل ہوا ـــــــ قبلہ چرخوب پر یہ براہ راست حملہ تھا جس کے جواب میں اگر وہ بے دھڑک کی دھجیاں بھی اڑا دیتے تو کم تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا بلکہ الٹا قبلہ چرخوب کی دھجیاں اڑتی اڑتی بکھری نظر آرہی تھیں، اس بات کا کھلا ثبوت تھیں کہ بے دھڑک کے ہر لفظ کی بنیاد سچائی پر ہے۔ اس کے باوجود ہمیں بے دھڑک کا یوں ذاتیات پر اتر آنا اچھا نہیں لگا۔ قبلہ چرخوب کی گردن میں پڑے شرم اور ندامت کے کئی من وزنی طوق کا بوجھ پتہ نہیں کیوں خواہ مخواہ ہمیں اپنے سر پر بار محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ اس بات سے بے پروا ہو کر کچھ دیر پہلے ماحول کی حبس بے روح نزاکت نے ہماری بولتی بند کر دی تھی اس کی نزاکت میں سرِمو فرق نہیں آیا تھا، پھر بھی نہ معلوم کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ بے دھڑک پر جوابی حملہ کر دیا ـــــــ بقول آپ کی مرحومہ کے دیگر شوہر صرف نام کے شوہر تھے۔ چلئے ہم اسے مان لیتے ہیں۔ لیکن جناب کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے ـــــــ !!!

ہمارے اس ترکی بہ ترکی حملے پر شبو نے گڑبڑا کر پہلے تو ہماری جانب دیکھا پھر گھبرا کر بے دھڑک کی طرف بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ بے دھڑک کے ہاتھ کی گرفت میں پھنسے پستول کی طرف دیکھا کہ کیا پتہ اس کراری چوٹ پر جھلا کر وہ ہم پر فائر جھونک مارے۔ غالباً یہی سوچ کر شبو لیں تیار کھڑی تھیں جیسے ہی فائر جھونکنے کی طرح گولی چلے گی اور ہمارے درمیان سینہ سپر ہو کر تاریخ محبت میں خود کو لیلیٰ، شیریں، ہیر، جولیٹ سے بھی بلند درجہ پر فائز کر جائیں ـــــــ سچ ہے جب عورت محبت کرنے پر آتی ہے تو اپنے محبوب پر آنے والی ہر مصیبت ہر بلا کے آگے سینہ سپر ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی شبو کا تعلق سینہ سپروں کی جنس ہی سے تھا۔

شبو کی خاموشی چاہت کے اس بولتے ہوئے انداز بہت کچھ کہتی ہوئی ادا پر ہمیں پیار تو بہت آیا لیکن ناموافق حالات نے اظہار کا موقع نہیں دیا ـــــــ ادھر بے دھڑک خود کو ہمارے سوال کے جواب میں تیار کر چکا تھا۔ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لب ولہجہ میں بولا ـــــــ اس کا اور میرا رشتہ کیا تھا یہ کوئی نہیں جانتا۔ شاید میں بھی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے آپ مجھے بھی اس کے نام نہاد شوہر کے نام سے مخاطب کریں۔ اگر آپ ایسا کریں تو میں برا بھی نہیں مانوں گا۔ لیکن اصلیت پر آج تک جو پردے پڑے رہے اب انھیں اٹھانے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ نادرہ کے دیگر نام نہاد شوہروں سے خود کو میں اس لیئے الگ سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ نادرہ کو صرف عورت سمجھ کر اسے اپنی ہوس کی ڈور میں باندھنے کی ناکام کوشش

کرتے رہے جبکہ میں نے اسے کبھی عورت کے اور وہ بھی بیوی کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی غلطی نہیں کی۔ اسے دنیائے محبت کا معبود سمجھ کر اس کی پرستش کرتا رہا۔ اور یہ جان کر آپ کو میرے پاگل پن پر یقین نہیں آئے گا کہ میں اس وقت سے اس کی پرستش کرتا ہوں جب وہ بھی چھوٹی سی بچی تھی۔ معصوم دنیا کے مکر و فریب سے دور جوانی کے تقاضوں سے نابلد اور میں بھی بچہ ہی تھا، اور اسے خوب صورت تتلی سمجھ کر اس کے پیچھے دوڑتا رہتا ——— وہ سچ مچ ایک تتلی تھی مگر سچ مچ کی تتلیوں سے قطعی مختلف، اس کے رنگ بھی پکے تھے اور پر بھی مضبوط اور پرواز تو اس قدر بلند تھی کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ آسمانِ محبت کی تمام تر وسعتوں پر یوں چھا گئی ——— وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ہم نے مداخلت کی ——— کتنی عجیب و غریب ہے محبت کی یہ داستان جو عاشق اپنے معشوق کو اپنے ہاتھوں اونچا اٹھاتا ہے اتنا اونچا کہ وہ خدا بن جاتا ہے اور پھر ایک دن اپنے انہی ہاتھوں سے اپنے خدا کا گلا بھی گھونٹ دیتا ہے۔ ——— ہم کہنے کو یہ سب کہہ گئے۔ لیکن کہہ چکنے کے بعد خود پر حیرت بھی ہوئی۔ اور تعجب بھی۔ آخر اتنی ہمت ہم میں آ گئی کہاں سے؟ یا پھر ہو سکتا ہے ہمت کا وہ کوٹا جو ماحول کے اسرار اور حالات کی دہشت زدگی کی وجہ سے منجمد ہو گیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ پگھلنے لگا تھا۔ ہماری اچانک مداخلت پر بے دھڑک کی زبان کی روانی میں بریک کا لگ جانا اتنا تعجب خیز نہیں تھا جتنا کہ اچانک اس کی آنکھوں کا سرخ ہو جانا، ناک کے پہلے ہی پھیلے ہوئے نتھنوں کا پھیل کر یوں اکڑ جانا جیسے اندر سے کسی نے دو شاخی پھنسا دی ہو ——— پتہ نہیں ہم نے نادانی میں اس کی کس رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کے جسم کا سارا لہو چہرے پر کھنچ آیا تھا۔ اس کے متغیر حالات دیکھ کر ہم تمام کی حالت کا غیر ہو جانا یقینی تھا۔ اس نے اپنی سرخ انگارہ جیسی آنکھوں سے باری باری سب کی طرف دیکھا پھر ہماری گھبرائی ہوئی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گڑھواتے ہوئے بولا ——— کون کہتا ہے میں نے اپنے خدا کا گلا گھونٹ دیا ——— ؟ انسان کے ہاتھوں بھی خدا مر سکتا ہے ——— ؟ اتنا کہہ کر پھر ایک بار اس نے اپنا مخصوص قہقہہ لٹایا۔ اس بار یہ قہقہہ آلود ہونے کے ساتھ "کف آلودہ" بھی تھا ——— بے دھڑک کے اس مجنونانہ سوال کے جواب میں اس بار بڑی دیر کے بعد طوطا پری نے منہ کھولا ——— "پاگل پن کا ڈھونگ رچا کر مسٹر بے دھڑک تم اب خود کو قانون کے مضبوط شکنجے سے چھڑا نہیں سکتے ——— تمہاری اپنی آواز میں تمہارا اپنا اقبال جرم یہاں سے راست پولس کنٹرول روم میں ریکارڈ ہو چکا ہے ——— طوطا پری کے اس انکشاف پر جیسے چونک پڑنا چاہیے تھا۔ وہ تو پاگلوں کی طرح ایک ایک کا چہرہ تکتا رہا جبکہ دیگر تمام نفوس یوں حیرت کی تصویر بنے ایک دوسرے کو گھورتے رہے جیسے پولس کنٹرول روم میں بے دھڑک کے اقبال جرم کے بجائے ہم سب کا اعمال نامہ ریکارڈ کر کے مرتب کیا جا چکا ہے اور اگلے کسی بھی پل پولس والے یہاں پہنچ کر ہمیں گرفتار کرنے والے ہوں۔ طوطا پری کے اس انکشاف پر ہمیں خیال ہوا کہ یہاں کی تمام باتیں کسی ٹرانسمیٹر ہی کے ذریعہ پولیس کنٹرول روم تک پہنچائی جا رہی ہوں گی پھر تو یقیناً اس ویران بنگلے کے کسی نہ کسی حصے میں کچھ پولس والے بھی موجود ہوں گے۔ اب جبکہ بے دھڑک نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے تو پولس والوں کو چاہیے کہ فوراً موقعہ واردات پر پہنچ کر مجرم کو گرفتار کر لیں جو ابھی تک آزاد تھا لیکن پولیس کے دور دور تک آثار نہیں تھے۔ البتہ طوطا پری نے اچانک اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے بے دھڑک کو مخاطب کیا ——— میں تمہیں نادرہ

مرحومہ کی محبت کا واسطہ دیتا ہوں' پستول پھینک دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو ———!!! جواب میں بے دھڑک نے پستول کا رخ طوطا پری کی جانب کرتے ہوئے قہر آلود لہجے میں کہا۔ اپنی ہوسناک زبان سے محبت کا نام مت لے کمینے تو مجھے نادرہ کا قاتل کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں نادرہ اور اس جیسی کئی عورتوں کو تو اور تیری یہ اعلیٰ سوسائٹی ڈس چکی ہے ———" قیمتی لبادوں اور مصنوعی چہروں کی قدر کرنے والی یہ سوسائٹی صرف بے ضمیر قاتلوں کو پناہ دیتی ہے ——— مجھے نہ تیری اس سوسائٹی میں پناہ چاہئے اور نہ میں دوبارہ اس قاتل سماج میں لوٹنا چاہتا ہوں، میں نے صرف ایک ہی منزل کا انتخاب کیا تھا۔ نادرہ ——— زندگی میں بھی وہی میری منزل تھی اور اب موت کے بعد بھی وہی میری منزل ہے ——— اسی لمحے اچانک او پری منزل پر گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی پھر وزنی جوتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شاید پولیس پہنچ چکی تھی ——— ان آوازوں پر سبھی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ بے دھڑک کو بھی یقیناً یہ آوازیں سنائی دی ہوں گی۔ لیکن اس کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دی بلکہ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولنے لگا ——— شاید پولیس والے ذرا جلدی ہوش میں آگئے۔ لیکن مجھے ہوش میں نہیں پائیں گے ———" یہ بے ربط سا جملہ کہتے ہوئے اس نے کسی جنگی سورما کی طرح پستول اپنی کنپٹی پر رکھا اور اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اس پر جھپٹتا' لبلبی دب چکی تھی اور پھر دھائیں کی آواز کے ساتھ وہ اپنے ہی زور پر الٹ کر گرا۔ اگرچہ کہ گولی نشانے پر ٹھیک ہی لگی تھی لیکن چونکہ سخت جان تھا اس لیے ہمارے پاس پہنچنے تک اس کی اکھڑی اکھڑی سانس اکھڑ رہی تھی۔ چہرہ خون میں تر ہو چکا تھا۔ بہ مشکل تمام ایک ہاتھ سے داہنی آنکھ پر سے پیلے کی شکل میں بہنے والے لہو کو صاف کیا اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور پھر ہم پر نظر پڑتے ہی اس کا لفافہ والا ہاتھ ہماری طرف اٹھا لیکن اگلے ہی پل اجل نے اٹھا ہوا ہاتھ جھٹکے سے کھینچ لیا۔ ادھر لفافہ ہمارے قدموں میں لڑھک آیا اور ادھر بے دھڑک کی گردن دوسری طرف کو ڈھلک گئی ———!

(باقی آئندہ)

اداریہ

● مقبول عام شاعر ناظر خیامی گذشتہ مہینے اچانک ہم سے جدا ہو گئے ———
ناظر خیامی نے ۱۹۷۴ء میں زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کی۔ اور بے حد پسند کئے گئے تھے۔ ۱۹۷۵ء کے مشاعرہ میں بھی انھیں مدعو کیا گیا تھا۔ اس بار ملازمین ریلوے کی ہڑتال کی وجہ سے مہمان شعراء حیدرآباد پہنچ نہ سکے لیکن ناظر خیامی کسی طرح بذریعہ طیارہ آ گئے۔ اور زندہ دلان کا یہ مشاعرہ محض ان کی شرکت کی وجہ سے اپنی روایتی آن بان برقرار رکھ سکا اور شعراء کی کمی کا احساس نہ ہو سکا ———

ناظر خیامی کا اپنا الگ انداز تھا۔ شراب ان کا خاص موضوع تھا۔ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ہم نے اس شمارہ میں ان پر ایک مضمون اور ان کے کلام کا انتخاب شامل کیا ہے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بھارت بھاگیہ ودھاتا
15 اگست 1947 کو ہم بھارت کے لوگ اپنے مقدر کے مالک (بھارت بھاگیہ ودھاتا) خود بنے۔
آیئے آزادی کی 32 ویں سالگرہ پر آج :
★ اپنی کامیابیوں سے قوت اور تحریک حاصل کریں۔
★ مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے تازہ دم ہو کر کام کریں۔
آزادی کے 32 برسوں میں.....
★ ہم نے سب بیرونی حملوں کو پچھاڑ کر ملک کی سالمیت کی حفاظت کی ہے۔
★ ہماری متوقع اوسط عمر 32 سے بڑھ کر 52 سال ہو گئی ہے۔
★ ہم نے اناج کی پیداوار دُگنی سے بھی زیادہ بڑھا لی ہے۔
★ ہماری صنعتی پیداوار میں چار گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔
★ ہمارے بدیشی سکے کے ذخائر 5,000 کروڑ روپے سے زائد ہیں۔
"قوم بجا طور پر ناز کر سکتی ہے کہ ہماری معیشت جو جامد اور دوسروں کی دست نگر تھی جدید اور خود کفیل بن گئی ہے" یہ ہمارے رواں پانچسالہ منصوبے کے ڈرافٹ کا اقتباس ہے۔
آزادی اور خوشحالی کی خاطر اتحاد اور یکجہتی قائم رکھیں۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۱۲

شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۷۹ء

سالانہ (۲۲) روپے	
بیرون ہند سے (۳۵) شلنگ	
فی پرچہ	Rs. 2/-

خط و کتابت کا پتہ:۔ شگوفہ ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

ایسی کی تیسی (تنقید)

بال کی کھال (تبصرہ)

چورن (نظمیں)

ماہنامہ شگوفہ کا تاریخی و
دستاویزی اہمیت کا حامل

ڈرامہ نمبر

مہمان مدیر: ساگر سرحدی

مضامین

فن کار اور سماج: ایڈورڈ باونڈ (انگریزی)
ترجمہ: ابراہیم رنگلا

ایک شخص: ابراہیم رنگلا

اردو ڈرامہ: سرسری جائزہ، سعادت علی خاں

اردو ڈرامہ میں مزاح: ابراہیم یوسف

کہ عشق آساں نمود اول: ساگر سرحدی

ڈرامائی شگوفے:

اے کے ہنگل، قادر خاں
ساگر سرحدی، جاوید خاں
سعادت حسن منٹو، پربودھ جوشی
رمیش تلوار، چندرا کانت زدیری

تراجم:

برتولت بریخت (جرمن)
وسنت آباجی ڈھاکے (مراٹھی)
رتنا کر متکری (مراٹھی)
چھایا داتار (مراٹھی)
نواب حیدر (بنگلہ)
بی ایس۔ جی پترو (تلگو)
نکولائی گوگول (روسی)
راجہ مہندر وکرم (سنسکرت)
دارا روچی (سنسکرت)
بلونت گارگی (پنجابی)

پربودھ جوشی (اردو)
بلراج ساہنی (اردو)
ویاس کوئی فقیر موہن (اڑیا)
چندرا کانت زدیری (گجراتی)

اردو ڈرامے

زنتی سیٹھی
ساگر سرحدی
فکر تونسوی
اظہر افسر
احمد جمال پاشا
غلام جیلانی
وجاہت علی سندیلوی
غلام یزدانی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
مقصود علی خاں
ڈاکٹر سمیع الحق
پرویز یداللہ مہدی
شفیقہ فرحت
خالد عابدی
برق آشیانوی

ممتاز آرٹسٹ سعادت علی خاں کا بنایا ہوا خوب صورت سہ رنگی سرورق

ضخامت: ۲۵۶ صفحات

قیمت:

سالانہ خریداروں سے
Rs. 15/-

عام خریداروں سے
Rs. 20/-

لائبریری ایڈیشن
Rs. 25/-

رقم بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر وصول ہونی چاہیے

منیجر شگوفہ
۲۱۔ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

یوسف ناظم

جدید کھلنڈرا شاعر: ندا فاضلی

مجرے اور کیبرے تو خیر کہیں بھی دیکھے جاسکتے ہیں لیکن اگر کبھی آپ کے دل میں مور کو ناچتا دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھے تو یہ تمنا یا تو کسی جنگل میں پوری ہوسکتی ہے یا کسی زو میں۔ اس میں بھی آپ کی خوش قسمتی کو دخل ہونا چاہئے کیونکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ مور کی جائے تفریح یا اس کی رہائش گاہ پر جائیں اور وہ آپ کی آمد کی خوشی میں اپنے رقص کا سپاس نامہ آپ کی خدمت میں پیش کر دے۔ مور کسی دفتری ڈیکورم اور سیاسی پروٹوکول سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں فرمائشی پروگرام کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ ان کا اپنا موڈ ہوتا ہے اور جب کسی مور کا رقص کرنے کو جی چاہتا ہے تو تماشائیوں کے انتظار میں باادب باملاحظہ کھڑا نہیں رہتا۔ جب وہ اپنے خوبصورت پروں کا چھتر نصف دائرے کی شکل میں پیراشوٹ کی طرح بے ساختہ کھول دیتا ہے تو اس سے رنگوں کی ایک پھوار سی برسنے لگتی ہے۔ میں تو یہ نہیں کہتا اتنی ہی دلفریب کیفیت ندا فاضلی کے نئے مجموعہ کلام "مور ناچ" میں ہے لیکن ہے یہ اسی قبیل کی چیز۔ رشتہ داری دور کی ہی کیوں نہ ہو رشتہ تو رشتہ ہوتا ہے اور پھر یہ تو بات قرابت ہی کی نہیں قربت کی بھی ہے۔

"مور ناچ" میں ندا فاضلی نے ایک جست لگائی ہے۔ یہ ایک کامیاب پول والٹ ہے۔ ندا فاضلی نے بہت جلد جان لیا کہ جدید شاعر بننے کے لئے انہیں مصنوعی یعنی مصنوعاتی شعر کہنے کی ضرورت نہیں (مصنوعاتی شعر اس شعر کو کہتے ہیں جسے شاعر بڑی محنت سے بگاڑتا ہے) انھیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اچھے، باوزن اور بامعنی شعر کہہ کر بھی وہ جدید شاعر رہ سکتے ہیں۔ ان کی ذہانت سے یہی توقع تھی۔ میں اگر کوئی باضابطہ تبصرہ نگار ہوتا تو شاید یہی چھوٹی سی بات دس بیس جملوں میں کہتا۔

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی

اس معرکۃ الآرا شعر نے قارئین کو جو تکلیف اور خود شاعر کو جو نقصان پہنچایا تھا "مور ناچ" سے نہ صرف گھاٹا پورا ہوگیا بلکہ ان کی شاعری کا نرخ اچانک معدنیات کے نرخ کی طرح اونچا ہوگیا (معدنیات سے مراد سونا چاندی ہے) ماہرین کا خیال ہے کہ سونے چاندی کے نرخ میں ابھی اور اضافہ ہوگا۔ (آخر کب تک ہم غریب ملک کہلاتے رہیں گے۔ ندا فاضلی کے کلام کے بارے میں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ

کچھ سیڑھیاں اور اوپر چڑھیں۔

میں نے کئی سال پہلے جب ندا فاضلی کا یہ شعر سنا تھا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ ندا فاضلی شاید اسی قسم کے "فاضل" اشعار کی وجہ "فاضلی" کہلاتے ہیں لیکن یہ خیال نہیں صرف وسوسہ تھا۔ ندا فاضلی کے ہاں اس وقت بھی معقول اور خوبصورت شعر تھے اور اب تو "مور ناچ" نے اس کی مزید تصدیق کر دی ہے۔ (مرغ اور مور کا بہر حال تقابل مقصود نہیں ہے)

اس بات کا شاید آپ کو بھی علم ہوگا کہ ندا فاضلی کو بڑی سبک اور نرم زبان ملی ہے (اتفاق کی بات ہے) ان کی شاعری میں میں نے بھاری بھرکم اور موٹے موٹے الفاظ ڈھونڈے جو نہیں ملے (افسوس ہوا)۔ ندا فاضلی نے "مور ناچ" میں اعلیٰ قسم کے اور نفیس کپڑوں کی کوئی دوکان نہیں کھولی ہے وہ اپنے شعروں کو نہ تو اطلس و کمخواب کے غرغل پہناتے ہیں ہیں نہ زری کے کام کی وزنی پشواز۔ ہر شعر کو دلہن بنا کر پیش کرنا ضروری بھی کیا ہے۔ بول چال کے معمولی الفاظ سے بتا کوئی کرتب دکھاتے، ندا اپنے شعر کو بولتا ہوا شعر بنا دیتے ہیں (بولتے ہوئے شعر کے بارے میں میری معلومات یہ ہیں کہ ایسے شعر میں بولنے کی آواز نہیں' بولنے کی کیفیت ہوا کرتی ہے) 'مور ناچ' میں اس کیفیت کے شعر کم نہیں ہیں۔

ندا فاضلی، لفظوں کے پل سے بخیر و خوبی گذر گئے۔ ان کی پا پیادہ شاعری اب خوش رنگ بادلوں میں لپٹی شاعری ہے "مور ناچ" پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ کہا جائے کہ شاعر نے کیا قد نکالا ہے (لیکن یہ قد' اشتہاری قد نہیں ہے)

سانسوں کی گذر گاہ سے تنہا نہ گذریئے
دو چار قدم بعد یہ دشوار بہت ہے
آوارگی شائستہ ہوئی' باقی ہے ورنہ
اس دور میں گنجائش انکار بہت ہے

ندا فاضلی کے شعروں میں اب احتیاط ہی نہیں' احتیاط سے بھی آگے کی چیز آگئی ہے یعنی بزرگانہ اور مشفقانہ پن کے نزدیک کی کوئی چیز۔

گھر سے نکلے ہو تو سوچا بھی کدھر جاؤ گے
ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے
اتنا آساں نہیں لفظوں پہ بھروسہ کرنا
گھر کی دہلیز پکارے گی جدھر جاؤ گے

اور تو اور ندا کو اب یہ بھی کہنا آگیا ہے کہ —

پہلے ہر چیز نظر آئے گی بے معنی سی
اور پھر اپنی ہی نظروں سے اتر جاؤ گے

اس قسم کے اشعار کا پس منظر ظاہر کرنے کے لئے پانچ سات غیر ملکی فلسفیوں کا حوالہ دینا مفید ہوتا ہے لیکن میں مرکبات پہ مفردات کو ترجیح دیتا ہوں)

وہ شاعر ہی کیا جس کے ہاں رومان اور اس قسم 'کا' دوسرا سامان نہ ہو۔ ندا بھی اس معاملے میں کسی سے دبے نہیں بلکہ ان کے ہاں اس کا رنگ کچھ زیادہ ہی چوکھا ہے

ہم تم وہی ہیں آج بھی' موسم کی بات تھی
کچھ دن تو سارا شہر ہی پھولوں سے ڈھک گیا

یہ کن دنوں کی بات ہے پتہ نہیں لیکن شاعر کو اتنا جھوٹ تو بولنا ہی چاہیئے ورنہ پھر وہ شاعر ہی کیا ہوا — ندا کی شاعری میں ان کا مخاطب نہ تو کوئی بت طناز ہے نہ کوئی محبوب عشوہ طراز بلکہ انہی کے نمونے کی ایک الھڑ سی لڑکی ہے جو جگہ جگہ آکھڑی ہوتی ہے۔

ایک چپ چاپ سی لڑکی نہ کہانی نہ غزل
یاد آئے تو کبھی ریشم و کمخواب لگے

اسی لڑکی کو جب وہ جین اور سفاری پہنا دیتے ہیں تو اس کی یاد صیغۂ تانیث کی بجائے صیغۂ تذکیر اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً:

ہر شہر میں کہیں نہ کہیں یاد آئے تم
آنکھیں مہک اٹھیں کہیں ماتھا چمک گیا

ایسے بے ساختہ اور بے تکلف شعر پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ شاعر شاید سچ کہہ رہا ہو گا۔

ندا کے ہاں یہ لڑکی مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہے (اب ہر کسی کو پرمننٹ ہونے کا حق حاصل ہے۔) "لفظوں کے پل" میں بھی "ایک لڑکی" موجود تھی جو کافی مشہور ہوئی۔ بلکہ شہرۂ آفاق ہوئی (شہرۂ آفاق ہونا مشہور ہونے کی اعلیٰ قسم ہے)۔ "مور ناچ" میں بھی ایک لڑکی کا عمل دخل ہے جو "وہ لڑکی" کے نام سے چھب دکھلا رہی ہے۔

سیلی رات
اب بھی
جب کبھی گھونگھٹ اٹھاتی ہے
لچکتی کہکشاں جب بنتے بنتے ٹوٹ جاتی ہے
کوئی البیلی خوشبو، بال کھولے مسکراتی ہے
وہ لڑکی یاد آتی ہے

مزید ایک نکتہ جو میری سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری کا یہ کھلنڈرا پن ان کی شاعری کے کٹیلے اور تیکھے پن کو مجروح نہیں کرتا۔ میں اسے ان کی فن کاری نہیں کسی اور کی دین سمجھتا ہوں۔ اس میں ان کی سُبکی کا پہلو نہیں نکلتا۔ یہ دین ہے اس تعلق کی جسے انھوں نے جدید ہونے کے باوجود کلاسیکیت سے برقرار رکھا ہے۔ ان کی شاعری کو زبان کے لوچ نے صحیح علامتوں اور خیال کے نئے پن کو "قبول صورت" بنایا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو وہ ایسے اچھے شعر نہ کہہ سکتے جیسے کہ یہ دو شعر ہیں۔

برسات کا بادل تو دیوانہ ہے کیا جانے
کس راہ سے بچنا ہے کس چھت کو بھگونا ہے
گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

"مور ناچ" ایسے ہی چمکیلے شعروں کا مجموعہ ہے (ندا فاضلی نے بہت ترقی کر لی ہے) یہ کہنا تو شاید شرعی اور شعری غلطی ہوگی کہ "مور ناچ" میں کوئی شعر "فاضل" نہیں ہے لیکن یہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ یہ مجموعہ کلام ہے انتخاب نہیں۔

جب آدمی کی ذات میں حشو و زوائد ہو سکتے ہیں تو یہ تو شاعری ہے۔ اس میں کئی چیزوں کی اجازت ہوتی ہے۔

ندا نے اپنی شاعری کا رشتہ دیہات سے قائم رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں نرماہٹ وہیں سے آئی ہے۔ جب وہ نیبو کی پھانکوں سے نینا رسیلے کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں نہ صرف ہندوستانی رہنا پسند ہے بلکہ قصباتی ہونے میں بھی انھیں باک نہیں ہے۔ ندا فاضلی کو اپنی عمر کے حساب سے اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے سراپا کا بغور مطالعہ کریں اور اپنے نتیجۂ فکر سے اپنے پڑھنے والوں کو مطلع کریں۔

یہ نتیجۂ فکر ان کے بعض گیتوں میں موجود ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ندا فاضلی جب "بند کمرے" سے کھلی فضاء میں اور پتھریلی سڑک پر آتے ہیں تو ان کا شعور ان سے "سلیقہ" جیسی نظم کہلوا لیتا ہے۔

دیوتا ہے کوئی ہم میں
نہ فرشتہ کوئی
چھو کے مت دیکھنا
ہر رنگ بکھر جاتا ہے
ملنے جلنے کا سلیقہ ہے ضروری ورنہ
آدمی چند ملاقاتوں میں مر جاتا ہے۔

میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ شاعری کا کینوس چھوٹا رہے تو رنگ زیادہ ابھرتے ہیں۔ ندا فاضلی شاعر تو خیر اچھے ہیں ہی۔ آدمی بھی کچھ کم غنیمت نہیں۔ بیسیوں شعر انھیں زبانی یاد ہیں اور ایسے شخص کو جسے اتنے ڈھیر سارے شعر یاد ہوں خود شعر کہنے کی ضرورت

بھی نہیں ہوتی ۔ وہ بہت خوبصورت لطیفے گڑھتے ہیں۔ عمدہ عمدہ کہانیاں بناتے ہیں۔ کوئی بھی قصہ کسی سے بھی منسوب کر دیتے ہیں۔ کسی کا شعر یاد نہ آئے تو فی البدیہہ شعر کہہ کر نوح ناروی، جلیل مانک پوری کے دیوان میں ٹانک دیتے ہیں اور "خدا کی قسم" کہنا بھی نہیں بھولتے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند ہے اور شاید میں ہمیشہ ان کی اسی ادا کا گھائل رہتا لیکن "مور ناچ" نے مجھے ان کے معاملے میں سنجیدہ کر دیا ۔ اس شاعر پر اچھی شاعری کے معاملے میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔
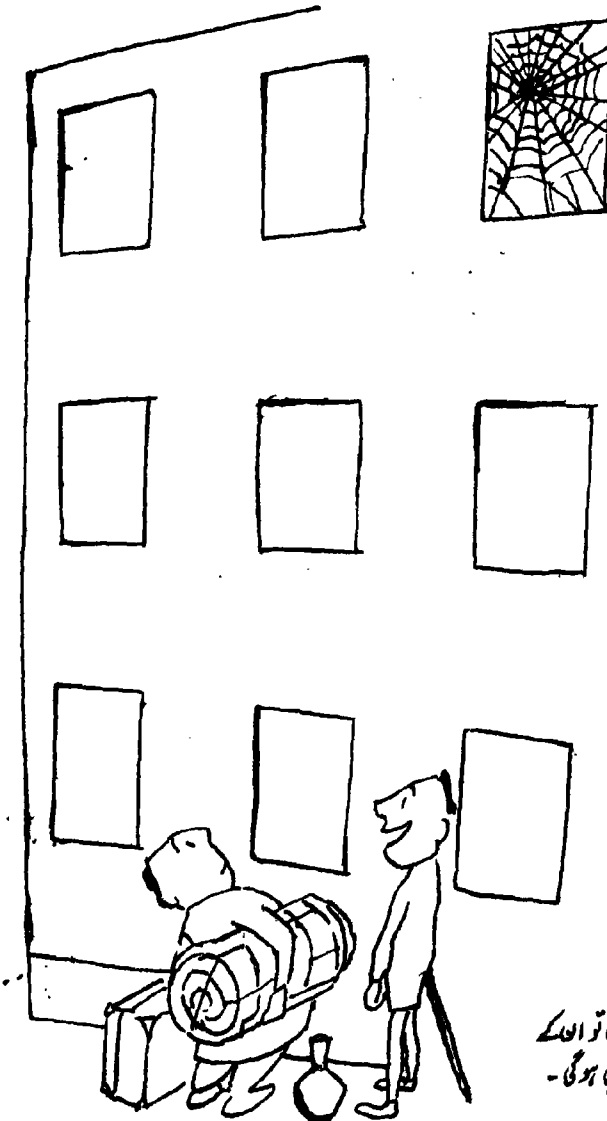
اگر آپ کے دوست کنوارے ہیں تو ان کے مکان کی تلاش میں مشکل نہیں ہوگی ۔

فرمائش

رضا نقوی واہی

ایک مدیر محترم آئے تھے ملنے کو جو کل
بعد کچھ تمہید کے مجھ سے یہ فرمانے لگے
شوخ سی اک نظم لکھئے سالنامے کے لئے
جس کا ہر ہر شعر روح و دل کو تڑپانے لگے
شاعری کے ساز سے اک راگ ایسا چھیڑئیے
جس سے روحیں مست ہوں فطرت کو بیند آنے لگے
شعر کے ہر لفظ سے ہو جذب و مستی آشکار
کیف بن کر جو فضائے قلب پر چھانے لگے
نظم کا ہر شعر ہو آئینہ دار رنگ و بو
جو دلِ افسردۂ عاشق کو گرمانے لگے
نظم میں کچھ اس طرح تعریف حسن و ناز ہو
جس کو پڑھ کر نازنینوں کو بھی وجد آنے لگے

سن کے یہ ساری ہدایات مدیر خوش نہاد
آگئی دل میں محمد شاہ رنگیلے کی یاد

واہ، خوش منظر ہے کتنا فکر کا حسنِ تضاد
جاگتے رہنا تھا جن ذہنوں کو وہ ہیں محو خواب
وقت سے کس درجہ ہم آہنگ ہے ذوقِ ادب
آگ کے موسم میں ہے فرمائش چنگ و رباب
مانگتا ہے شوق، افسردہ دلوں سے زندگی
ڈھونڈھتے ہیں ہم خزاں دیدہ گلستاں میں گلاب
فرقہ وارانہ سیاست سے مکدر ہے فضا
ہے گہن میں قسمت جمہوریت کا آفتاب
"آگ ہے نمرود ہے اولاد ابراہیم ہے"
کشتِ انسانی پہ اُمڈا ہے جفاؤں کا سحاب
سینۂ ابر سیہ میں کوندتی ہیں بجلیاں
جھانکتا ہے اپنی کینچل سے "مکمل انقلاب"

اور ایسے دور میں بھی حلقۂ اہل ادب
ہے صراحی در بغل، مینا بہ کف، ساغر بہ لب

سن اسٹروک SON STROKE

گذشتہ شمارے میں "SUN STROKE" کی بجائے "SON STROKE" شائع ہوگیا جس سے شعر کے STROKE میں فرق آگیا۔ اس لئے یہ قطعہ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

ایسی تپش تھی جذبِ مخالف کے شور میں
توڑ اس کا راج نیت کے گولڈ نہ ہو سکے
SON STROKE سخت تھا، پردھان منتری
"آبِ حیات" پی کے بھی جانبر نہ ہوسکے

بڑھ رہیں ایسی ہمدردیاں چپکے چپکے
دھڑکنے لگا دِل یہاں چپکے چپکے

دکھا کر "خسارہ بجٹ" ہر مہینے
خریدی گئیں ساڑیاں چپکے چپکے

ابھی شیخ منبر سے اُترے نہیں تھے
کہ آنے لگیں لُٹیاں چپکے چپکے

کریں کیا کثیر العیالی کے باعث
پکاتے ہیں ہم کنکیاں چپکے چپکے

وظیفہ کے دن جیسے نزدیک آئے
تو بڑھنے لگیں ڈاڑھیاں چپکے چپکے

وہیں ماتھا ٹھنکا جو بیگم کو دیکھا
کہ کھاتی ہیں نارنگیاں چپکے چپکے

جہاندار علی امیر
(کریم نگر)

جس کو کسی سے پریم ہو میری کتھا سُنے
کیا اہلِ دل کی بات کوئی سر پھرا سُنے

گاؤ کچن میں گیت کڑاہی توا سُنے
آٹا اگرچہ سُن نہ سکے ڈالڈا سُنے

پانی سے دوستی نہیں کھانے سے پیار ہے
دعوت کبھی نہ دے جو مرا ناشتہ سُنے

زُلف دوتا میں باندھ دو کالی گھٹا کا پاؤں
بنسی بجاؤ نیند کی ٹھنڈی ہوا سُنے

ملتا نہیں ہے ووٹ یہاں نوٹ کے بغیر
کوئی کسی کی بات سُنے بھی تو کیا سُنے

بے پر کے اُڑ کے سیر کرے آسمان کی
بانکے مری ہزل جو کوئی پر کٹا سُنے

ادریس بانکے کٹک

بیٹھے کیوں ہو مُنہ کو موڑے
نام بڑا اور درشن تھوڑے
مُفت جہیز میں کون ہے دیتا
بنگلہ، موٹر، جوڑے گھوڑے
صورت ان کی بھولی بھالی
لیکن باتیں سر پہ ہتھوڑے
اب ان کی کل کل سے سب کے
کان بنے ہیں پکّے پھوڑے
ہم نے جو کی، سالن کی شکایت
ہانڈی لا کر سر پہ پھوڑے
لوگ کہیں گے دل کے پھپھولے
ہستی صاحب خوب ہیں پھوڑے

یوسف ہستی

انجم + غالب

گھر میں بیوی نظر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
شرم چمچہ گری پہ آتی تھی
اب کسی بات پر نہیں آتی
گو پڑوسی کا مرغ اچھا ہے
پر طبیعت اُدھر نہیں آتی
کیسا مرہم تھما دیا تو نے
جو کبھی سلے چارہ گر نہیں آتی
دیکھا سرکس میں موت کا بھی کنواں
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اعجاز انجم (مالیگاؤں)

کرنل محمد خان

چار شہر۔ اڑتے خاکے

یہ ہپی ہمیں نماز پڑھوا کر چھوڑے گا!

ہمارا جہاز استنبول کے ہوائی اڈے پر اترا تو اندھیرا چھا رہا تھا۔ شام کا جھٹپٹا کسی اجنبی شہر میں پہنچنے کے لیے موزوں وقت نہیں ہوتا۔ نہ مسافر شہر کے رنگ و رخ کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ شہر مسافر کے حسن و ہنر کا۔ اور جب تک باہمی محاسن کا انکشاف اور اتصال نہ ہو، سیر و تماشا کی ابتدا نہیں ہوتی۔ خیر یہ باہمی لطف و سرور تو بعد کی باتیں تھیں۔ فوری سوال یہ تھا کہ کسی ہوٹل میں پہنچ کر بستر تو کھولا جائے لیکن جس ہوٹل میں گئے۔ جواب ملا: "اگلی گرمیوں میں تشریف لائیے گا، اس سیزن کے لیے ہوٹل پُر ہو چکا ہے۔" یہ کیفیت ہم نے لندن میں بھی دیکھی تھی۔ لیکن استنبول سے ہمیں بہتر سلوک کی توقع تھی۔ آخر اس شہر سے ہم علاقائی تعاون کے رشتے میں منسلک تھے لیکن آج شب اس شہر نگاراں کو سر رشتۂ وفا کا ذرا خیال نہ تھا اور اس اندھیرے میں ہمارے ہاتھ میں سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ ہر ہوٹل پر ناکام دستک دیئے جائیں۔ آخر بیسویں یا اکیسویں ہوٹل سے یہ امید افزا جواب ملا کہ اگر ایک دوسرے مسافر کے ساتھ ٹھہرنے میں اعتراض نہ ہو تو ایک خالی بستر موجود ہے۔ دوسرے مسافر کے ساتھ ٹھہرنے میں اعتراض یا اشتیاق کا اظہار تو مسافر دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے لیکن نزاکت حالات کے پیش نظر ہم نے اس شرط پر بھی اصرار نہ کیا اور ہاں کہہ دی: شاید کہ غزال خفتہ باشد — لیکن کمرے میں پہنچے تو پلنگ[1] ہی نکلا: لمبی مونچھیں، چوڑی قلمیں، پھول دار قمیص اور جھول دار پتلون ہپّی — لیکن بڑا خوش مزاج۔ مونچھوں اور قمیص کے علاوہ چیتے سے کچھ مشابہت ہی نہیں رکھتا تھا۔ کمرے میں قدم رکھا تو ہمیں اس ادب اور اشتیاق سے ملا جیسے ہم کوئی ہپّی گرو ہوں۔ بے شک ہمارے سر کے بال کئی دنوں سے حجامت کے لیے چلا رہے تھے، تاہم مجموعی طور پہ

---

[1] بمعنی چیتا۔

ہماری حالت اتنی غیر تھی کہ رشی بابا نظر آتے ۔ دراصل یہ ہپی تھا ہی خوش طبع اور خوش زبان۔ ہمیں دیکھتے ہی خوش آمدید کہا۔ ہم سے مزاج پوچھا پھر ما حضر کے طور پر ہمیں چرس کا سگریٹ پیش کیا۔ اس تبرک کی عنایت پر ہم بدکے تو ذرا برہم نہ ہوا بلکہ فی الفور ہماری پسند کا ایک غیر ہپی مشروب یعنی کوکا کولا منگوالیا۔ تعارف پر پتہ چلا کہ نام نیلسن ہے۔ سویڈن کا رہنے والا ہے اور دوستوں کے ساتھ سیر جہاں کو نکلا ہوا ہے۔ کوکا کولا کا گلاس ختم کرچکنے تو نیلسن نے ہماری تھکاوٹ کے پیش نظر ہمیں غسل کا مشورہ دیا۔ ایک ہپی کو غسل کی تلقین کرتے دیکھ کر ہمیں تعجب ہوا لیکن تعجب سے زیادہ اطمینان ہوا کہ اس شخص کے ساتھ ایک کمرے میں ٹھہرنا گراں نہ ہوگا سوائے اس کے کہ آدھی رات کو جگا کر ہمیں تہجد کے لیے بھی مجبور کرنے لگے۔ اس ناصح ہپی سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

کھلی بنولے کے ساتھ کچھ اُردو شاعری بھی برآمد کریں :

غسل کے بعد غسل خانے سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے پلنگ دوست کے ساتھ دو غزال بھی بیٹھے ہیں۔ تعارف پر ایک لوزینہ اور دوسری لو تاشہ نکلی۔ یہ بھی سویڈنی ہپنیں تھیں۔ پوشش اور آرائش کے معاملے میں انھوں نے اپنے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کر رکھا تھا لیکن فطرت نے ان کے ساتھ برا شاہانہ سلوک کیا تھا یعنی انہیں حسن بھی دے رکھا تھا اور شباب بھی۔ اور سچی بات ہے۔ ان دو بنیادی حقائق کے بعد لباس اور آرائش کا عدم یا وجود برابر تھا اور ان دونوں نے عدم کو ترجیح دی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو چار گرہ کپڑے کو چھوڑ کر غیر از ننگا ہ اب کوئی حائل نہیں رہا۔ باتیں شروع ہوئیں تو یہ نیلسن سے بھی زیادہ پیاری اور رواں انگریزی بولنے لگیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ہم پاکستانی ہیں ان کا شوق گفتگو اور تیز ہو گیا کہ لوزینہ نے اپنے ہپی دوستوں سے پشاور اور پنڈی کے اندر دلڑکے وہ الف لیلائی قصے سن رکھے تھے جن سے ہم پنڈی اور پشاور میں ایک مدت گزارنے کے باوجود نا واقف تھے۔ بہر حال ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے ہمیں ذرا ڈراما ئی پارٹ ادا کرنے کی ضرورت تھی۔ خصوصاً لوزینہ کے ساتھ کہ اسرار پاکستان سمجھنے کے لیے ہمارے قریب آبیٹھی اور بولی :

"انگریزی آپ کی مادری زبان ہے ؟"

ہم نے کہا : "خدا تمہیں بھی زندگی دے ، انگریزی نہیں اُردو۔ وہی میر اور غالب کی زبان۔ معلوم ہے غالب کون تھا ؟

بولی : "کیا کہا ، کیلب ؟"

ہم نے کہا "کیلب[1] پاکستانی کرسچین ہے اور ٹینس کھیلتا ہے غالب ترک تھا اور شعر کہتا تھا۔"

---

[1] پنڈی کی ایک شخصیت

پوچھنے لگی: "آپ کے ہاں شاعر بھی ہوتے ہیں؟"

عرض کیا: "شاعروں کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ شاعری کے علاوہ کوئی دوسرا کام تو ہم اتفاق یا قسمت ہی سے کرتے ہیں۔"

"تو پھر کوئی اچھا سا شعر سناؤ۔"

ہم نے غالب کی بجائے ظفر علی خاں کا شعر سنایا کہ اس وقت وہی حسب حال تھا:

سرمایۂ نشاط تری ساق صندلیں

پیمانۂ سرور ترا مرمریں بدن

جب ترجمہ سنایا تو پھڑک اٹھی اور کہنے لگی:

"شاعر نے یہ کس کے متعلق لکھا ہے؟"

"اپنی محبوبہ ◻ کے متعلق۔"

"تو وہ بڑی حسین ہوگی۔"

"کچھ تم سے ملتی جلتی ہوگی۔"

"کیا میں سچ مچ اتنی پریٹی (pretty) ہوں؟"

"تو کیا تمہیں آج تک کسی نے نہیں بتایا؟"

"ان لفظوں میں نہیں۔"

"یہ تمہاری شاعری کا قصور ہے۔"

بولی: "آپ کی شاعری تو جادو معلوم ہوتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کرکے گہرا سانس لیا اور جب آنکھیں کھولیں تو ان میں ننھے ننھے تارے تیر رہے تھے۔ پھر اچانک اپنی کرسی سے اٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور ایک خود فراموشی کے عالم میں آسمان کو تکنے لگی۔

دیکھا آپ نے! اردو شاعری جسے وطن میں بیکار مشغلہ سمجھا جاتا ہے پردیس میں کیا مقام رکھتی ہے۔ ذرا ایکسپورٹ پروموشن بیورو والوں سے کہہ دیں کہ کھلی اور بنولے کے ساتھ ساتھ با ترجمہ اردو شاعری کی برآمد کے امکانات پر بھی غور کریں۔

بہر حال لوزینہ کے بعد ہم بھی اٹھے اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہوئے۔ دور مسجد کے میناروں کے پیچھے

◻ علامہ نے یہ شعر اپنی محبوبہ کے متعلق نہیں بلکہ ایک اور ضمن میں کہا تھا۔

سے چاند ابھر رہا تھا اور استنبول پر ایک ہلکی سی چاندنی پھیل رہی تھی۔ لوزینہ نے ایک رومان انگیز لہجے میں کہا:

"کتنی پیاری چاندنی ہے!"

اردو شاعری کے پاس اس صورتِ حال کا جواب بھی تھا۔ ہم نے بلا تامل کہا:

"یہ چاندنی نہیں تیرے قدموں کی دھول ہے"

اور ساتھ ہی تشریح بھی پیش کی۔ لوزینہ پر مطلب کا کھلنا تھا کہ اس کی آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ ذرا سنبھلی تو بولی:

"کتنا پیارا شعر ہے! کس کا ہے؟"

خدا جانے یہ کس شاعر کا مصرع ہے ـــــ بہرحال ہم نے تھوڑی دیر کے لیے اُدھار لے لیا اور کہا:

"اپنا ہی ہے۔"

"سچ؟ تو آپ بھی شاعر ہیں؟"

"نہیں، میری جان۔ میں بالکل شاعر نہیں ہوں۔ ایسا شعر تو تم سے انسپائر INSPIRE ہو کر ہر پاکستانی کہہ سکتا ہے۔ تم نے ہمارے حقیقی شاعروں کا کلام تو سنا ہی نہیں۔"

بولی: "اگر میں پاکستان جاؤں تو کسی حقیقی شاعر سے مل سکوں گی؟"

"پاکستانی شاعروں کو اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ ہوگی۔"

قصہ مختصر، اس گفتگو کا اور تھوڑی سی مزید گفتگو کا وہی نتیجہ نکلا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ لیکن خیر، نیلسن اور ہم نے مل کر بالآخر لوزینہ کو قائل کر لیا کہ آج اور اسی وقت پاکستان کو چل پڑنے کی بجائے اگر وہ آتی سردیوں تک انتظار کرلے تو پاکستان کے حقیقی شعرا میں کمی آجانے کا کوئی خطرہ نہیں اور نہ ان کے شوقِ ملاقات کے سرد ہو جانے کا امکان ہے۔ لوزینہ کو پاکستان میں پشاور کے راستے داخل ہونے کا شوق تھا اس کی مزید دل جوئی کے لیے احمد کے نام سفارشی خط بھی لکھ دیا۔ اس خط سے کچھ احمد فراز کے دردِ آشوب کا مداوا بھی مقصود تھا کہ بے چارے ایک مدت سے نہ صرف بذاتِ خود بلکہ بذریعہ مہدی حسن بھی کسی لوزینہ ہی کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں:

"رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ"[1]

اور لوزینہ اگر دل لبھانے کا گر جانتی تھی تو دل دکھانے کی تکنیک سے بھی واقف تھی! ان سویڈنی ہپیوں کی موجودگی کے پیشِ نظر ہماری استنبول کی سیر خاصی ہونہار دکھائی دیتی تھی لیکن صبح جاگے تو معلوم ہوا کہ نیلسن اپنی غزالاؤں کو منہ اندھیرے ہی سمیٹ کر چل دیا ہے۔ ہماری بے خبری میں صحبت یار بڑی بے دردی سے آخر ہوئی تھی۔

---

[1] احمد فراز کی اس غزل کو مہدی حسن نے ایک درد انگیز لے میں گایا ہے۔

اُڑ گیا ماہیا پنچھی بن ماراں منجیاں تے

خیر، مسافر کو ایسے گرم سرد مرحلے پیش آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کو ہم نے ایک گرہ میں باندھ کر خوشگوار یادوں کے خانے میں ڈال دیا اور استنبول کا قیام جاری رکھا یعنی کپڑے بدل کر نیچے کھانے کے کمرے میں گئے اور ہوٹل کے انتظام اور انتظامیہ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس چھوٹے سے ہوٹل کی پردھان مادام چھما گلو تھیں جو اپنی مسند کی وجہ سے ہی نہیں، رنگ و رخ کے اعتبار سے بھی پردھان لگتی تھیں۔ باقی کارندوں کے درمیان یوں نظر آتی تھیں جیسے چند ٹمٹماتے دیوں کے درمیان ایک مرکزی بلب روشن کر دیا جائے۔ مادام کے جلو میں ایک بوڑھا سا گھسا پٹا شخص بھی تھا جو بیک وقت مادام کا خاوند بھی تھا اور خادم بھی۔ بے چارہ زمانے کی گردش کے علاوہ مادام کی گردش کے نیچے بھی آیا ہوا لگتا تھا۔ شکل و صورت سے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے قدرت نے اسے پاؤں دابنے[1] کے لیے پیدا کیا ہو۔ مادام بھی بظاہر قدرت کا اشارہ سمجھ کر ہی اس سے سلوک کرتی تھی۔ چنانچہ ہر چند کہ ہمارے سامنے اس شخص نے مادام کے پاؤں نہ دابے تاہم اُسے مادام کے قدموں سے بہت دور بھی نہ پایا۔

ناشتے کے بعد ہم ہوٹل سے نکلے اور سیدھے پی آئی اے کے دفتر میں گئے کہ اگلی پرواز کے لیے دن کی روشنی میں ہی اپنی نشست پکی کرا لیں ورنہ ہمارے جہاز کا وقت رخصت تو آتی رات کے تیسرے پہر کے قریب تھا۔ یہ ہو چکا تو ہمیں یاد آیا کہ یہاں کے پی آئی اے کے سربراہ تو ہمارے یار گاہے عم زاد آغا ارشد ہیں۔ کیوں نہ اس اجنبی شہر کی سیر کے لیے ان سے رشد و ہدایت حاصل کریں ــــــ بابو نے بتایا کہ آغا صاحب ابھی گھر سے نہیں آئے۔ ہم نے ٹیلی فون پر ہی آغا صاحب سے اپنا تعارف کرایا اور مدعا عرض کیا کہ ہمیں سیرِ استنبول کی ترکیب درکار ہے۔ ادھر سے جواب آیا:

"آپ دفتر میں ہی تشریف رکھیں میں ایک پاکستانی جوڑا لیے سیرِ استنبول کو نکلنے والا ہوں اور آپ ہی کے راستے آ رہا ہوں۔ کار میں چوتھی نشست خالی ہے۔"

دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

خدا بے شک مسبب الاسباب ہے۔ رات اس نے سویڈنی ساتھی پیدا کر دیئے تھے اور علی الصباح انہیں چھین لیا ــــــ اور شاید اس میں بھی ہماری فلاح کا پہلو تھا ــــــ تو دن چڑھے ایک احسان اور کر دیا یعنی آغا ارشد مہیا کر دیئے اور وہ بھی کار اور ساتھیوں سمیت۔ سیر کو نکلے تو سب سے پہلے عجائب گھر کے اس حصے میں جا پہنچے جہاں ہمیں نعمت میسر آ گئی یعنی حضور صلعم کے ذاتی تبرکات کی زیارت: آپ کی مہر مبارک کی

---

[1] میرا محبوب چلا گیا اور میں گھر کی چارپائیاں ٹٹولتی پھرتی ہوں۔

آپ کے فرمان کی اور اس صندوق کی جس میں آپ کا لبادہ بند تھا۔[1] اللہ میرے نصیب۔ کیا میں واقعی وہ اشیا دیکھ رہا تھا جنہوں نے سرورِ کائنات کے ہاتھوں کو مس کیا تھا؟ کیا میں سچ مچ اس دولت بیدار سے بہرہ ور تھا جو بے استحقاق میرے حصے میں آئی تھی؟ میرے کان میں قاری کی آواز گونجی: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ○ میں سوچتا، کہاں یہ گنہگار آنکھیں اور کہاں یہ نعمتِ دیدار!

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم اس عجائب گھر کے باقی عجائبات پہلے دیکھتے اور آثارِ نبوی بعد میں کہ سفر بتدریج اپنی سیر کی معراج کو پہنچتے۔ اب اس مقام پاک سے نکلے اور عجائب گھر کے دوسرے کمروں میں ــــ جو دراصل پرانے شاہی محلات کے کمرے تھے ــــ داخل ہوئے اور طلا و نقرہ کی نادر مصنوعات، حریر و پرنیاں کے قدیم ملبوسات، لعل و جواہر سے مرصع تیغ و تفنگ اور نقش و نگار سے مزین چینی کے ظروف دیکھے تو وہ لطف نہ آیا جو آنا چاہیے تھا یہ نہیں کہ ان شاہکاروں کے خالق یا ان کے عثمانی سرپرست لائقِ تحسین نہ تھے۔ فقط یہ کہ ان نوادرات کو باقیات پیغمبر کے پہلو بہ پہلو رکھ کر داد کی توقع رکھنا عبث تھا۔

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حورِ بہشت
پر کہاں یہ شوخیاں، یہ طرز، یہ محبوبیاں (میر درد)

دراصل ان تبرکات کو عجائب گھر کا حصہ بنانا ہی، اگر بے ادبی نہیں تو بے سلیقگی ضرور تھی۔ ان کے لیے صحیح مقام کسی خانۂ خدا کے اندر ہی ہو سکتا تھا۔ مسجد سلطان احمد میں جو ہماری سیر کی دوسری منزل تھی۔

سلطان احمد کی تعمیر کردہ یہ مسجد، جسے نیلی مسجد بھی کہتے ہیں، استنبول کی سینکڑوں مسجدوں کی سرخیل ہے اور ان کے ہزاروں میناروں میں کہ جن پر ہجوم نخیل کا گماں ہوتا ہے، اسی مینار کے چھ مینار جلیل بھی ہیں اور جمیل بھی، کبیر بھی ہیں اور کثیر بھی ــــ لیکن یہ مسجد کا اندرونہ ہے جو ہمارے لیے نیا بھی ہے اور نرالا بھی۔ ہر ملک میں تعمیر مساجد کا فن جداگانہ ہے۔ برصغیر کی مساجد کھلی محرابوں اور وسیع صحنوں کے طفیل کم و بیش (OPEN-AIR) تعمیرات لگتی ہیں، لیکن شاید یہ آب و ہوا کا تقاضا ہے یا ہمسایہ عیسائی معبدوں کا اثر کہ یہاں کی مساجد کا بنیادی اصولِ تعمیر بند ڈبے کا سا ہے جس پر سپاٹ چھت کی بجائے اونچے گنبد کا ڈھکنا رکھ دیا جائے اور پہلوؤں پر مینار کھڑے کر دیئے جائیں۔ اس طرزِ تعمیر کا اپنا حسن ہے لیکن ایک پاکستانی زائر کو چند لمحوں کے لیے نامانوس سا لگتا ہے۔ اسی مسجد کے اندر فرش پر بقدر دو قدم آدم اونچا شہ نشین بھی بنا ہوا ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ سلاطین ترکی اس بلندی سے نماز میں شامل ہوتے تھے۔ یہ سوچ کر کہ شاہی مسجد لاہور میں سلاطین ہند اور مسجد نبوی میں شاہ و دوسرا فرش زمین پہ سجدہ ریز ہوتے تھے: سلاطین ترکی کا اندازِ عبادت نامانوس سا لگا، لیکن خیر یہ قصہ ماضی ہے جدید ترکی

---

[1] یہ اندازِ بیان مستنصر حسین تارڑ سے لیا گیا ہے۔

ہیں اس شہ نشین کا کوئی غیر جمہوری استعمال نہیں۔ اب کوئی ہماری مانے تو تبرکات رسالت مآبؐ کو عجائب گھر سے نکال کر اس خالی شہ نشین پر شیشے کے کیسوں میں دیدار عام کے لیے رکھ دے تاکہ آپ کے آثار تک ان غریبوں کی بھی رسائی ہو سکے جن کے وہ آقا و مولا تھے

آئیے مادام چیما گلو کی چھاؤں میں سستائیے :

معلوم ہوتا ہے کہ استنبول کی اکثر عمارات کی تقدیر میں عجائب خانی لکھا ہے۔ کیونکہ جن مقاصد کے لیے استنبول کے دو ہزار سال کے حکمرانوں نے کئی ہزار عمارتیں تعمیر کر دی ہیں۔ وہ مقاصد تو مر چکے ہیں لیکن عمارتیں زندہ ہیں اور بے مقصد عمارتوں کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں کہ انہیں عجائب خانہ بنا دیا جائے اور عمارتوں ہی پر کیا موقوف ہے۔ بے مصرف انسان بھی میوزیم پیس (MUSEUM PIECE) ہی لگتے ہیں۔ دیکھیے ہمارے ہوٹل کے مسٹر چیما گلو کو جو چیما گلو کا خاوند کہلانے کے کام آتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ یہ مقصد بھی اچھی طرح پورا نہیں کر رہے۔ چنانچہ وہ اس مجسمے سے بہت مختلف نہیں جو لاہور میوزیم کے دروازے پر رکھا اور جس پر نگہبانوں سے آنکھ چرا لونڈے اپنے دستخط کندہ کر جاتے ہیں۔ اس روز سیر کے بعد ہوٹل کو لوٹے تو مسٹر چیما گلو کو مادام سے اسی فاصلہ پر جو تقدیر نے اس کے لیے مقرر کر دیا تھا، ساکت بیٹھے پایا اور پھر ایک لمحے کے لیے ہمارے اندر کے لونڈے نے یہ اختیار چاہا کہ اس کی گنجی چمکتی چندیا پر بال پوائنٹ سے اپنا نام مع تاریخ کھود کر لکھا جائے لیکن مادام کی سیاست سے ڈر گیا اور بال پوائنٹ کو کھولنے کی بجائے دانتوں میں دبا کر رہ گیا۔ رہی خود مادام تو وہ بھی عجائب گھر سے دس بارہ سال کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ بے شک عمر کے لحاظ سے وہ بھی کوئی کامنی کرنل نہ تھی بلکہ ہمارے تنے کے شاہ بلوط کی طرح پختہ اور پائیدار، مگر وہ شاہ بلوط جو لب جو اُگ رہا ہو سرسبز، شاداب اور سایہ دار۔ اسے دیکھ کر ایک غریب الوطن مسافر کا جی چاہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اس کی گھنی چھاؤں میں سستا لے مگر عرض کیا ہے ناکہ ہمارے پاس وقت کم تھا اور کچھ شاید اس شاہ بلوط کا سایہ بھی ہماری ضرورت کے مقابلے میں زیادہ گھنا تھا۔ □□

کھاتا ہے قلابازیاں نیتا مرے آگے

نثار عباسی
(الٰہ آباد)

ہوتا ہے الیکشن کا جو چرچا مرے آگے
کھینچا ہے "مینیفسٹو" کا نقشہ مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
کھاتا ہے قلابازیاں "نیتا" مرے آگے

"نیشن" کی کسے فکر "ڈکشن" پہ نظر ہے
"اسٹنٹ" الیکشن ہے نیتا مرے آگے

یہ آرٹ سیاست کا دکھاتا ہے تماشے
"جنتا" مرے پیچھے ہے اجنتا مرے آگے

جب چاہوں انھیں طفل تسلی سے کروں خوش
اک مجمعِ اطفال ہے جنتا مرے آگے

میں ووٹ تو ہر طرح سے کر لیتا ہوں حاصل
تھیلی مرے پیچھے ہے تو تھیلا مرے آگے

میں صحرا نوردئ سیاست کا ہوں "ہیرو"
مجنوں مرے پیچھے ہے تو لیلیٰ مرے آگے

آمد ہے الیکشن کی خوشامد میں گھرا ہوں
"چمچی" مرے پیچھے ہے تو "چمچا" مرے آگے

میں حلقۂ نسواں کا بھی منظورِ نظر ہوں
نرگس مرے پیچھے ہے تو "شہلا" مرے آگے

میں دیس کا "سیوک" ہوں نرا نیتا ہوں نیتا
بھائی مرے پیچھے ہے بھتیجا مرے آگے

لالچ میں وزارت کا کیا کرتے ہیں لیڈر
ہوتا ہے شب و روز یہ سودا مرے آگے

اس حوض میں ننگے ہی نظر آتے ہیں سارے
اٹھتا ہے سیاست کا جو پردا مرے آگے

آتا ہے ڈراما جو ادا ہے جو الیکشن
کیا دیکھیں دکھاتا ہے "ڈراما" مرے آگے

کیا وقت دکھائیں گے خدایانِ سیاست
کیا وقت اب آئے گا خدایا مرے آگے

کیا رنگ نثار اس میں بھرے دیکھیں زمانہ
کھینچا ہے سیاست نے جو نقشہ مرے آگے

ھزل

ناچیز حیدرآبادی

کمپیوٹروں کا راج ہے انسان کی جگہ
اب بینک پوجے جاتے ہیں بھگوان کی جگہ

سرکار نے مکان تو بنوا دیئے، مگر
رہنے کی اُن میں جا ہے نہ سامان کی جگہ

بیٹھے بٹھائے گھر کا بجٹ اور بڑھ گیا
سگریٹ کی طلب ہے انھیں پان کی جگہ

اُن کے ڈرائینگ روم کا ماحول، الاماں
بندوق ایک رکھی تھی گلدان کی جگہ

یہ کال یہ گرانی یہ تنگی کہ گھر تو گھر
باقی رہی نہ دل میں بھی مہمان کی جگہ

ناچیز تم کہاں چلے اب اُن کے گیٹ پر
السیشین مہتمم ہے دربان کی جگہ

طارق جامی
ساد تی (سعودی عربیہ)

پروفیسر اعوذ باللہ

اللہ بخشے نام تو ان کا معتصم باللہ تھا یا عارف باللہ مگر اپنے احباب اور لاڈلے شاگردوں میں پروفیسر اعوذ باللہ کے نام سے معروف تھے اور وجہ تسمیہ کچھ یوں ہے کہ ان سے ملنے کے بعد اگر انسان کے منہ سے کوئی کلمۂ خیر نکل سکتا ہے تو وہ 'اللہ کی پناہ' ہوتا جس کا ترجمہ عربی والوں نے اعوذ باللہ پہلے ہی سے کر رکھا ہے۔

تھے تو وہ ایک اسکول ٹیچر مگر کہا کرتے تھے کہ ـــــ انگلش میں ایم اے کیا ہے لیکن ان کی گفتگو اور دیگر کوائف سے لگتا تھا "ایویں" میں انگلش کیا ہے۔ ہاں البتہ شام کو گھر ایف اے کے طالب علموں کو بھی پڑھاتے تھے۔ اس لئے اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھا کرتے تھے۔ لیکن ان کی پروفیسری کا بھرم زیادہ تر دست شناسی اور ستارہ فہمی کی بنا ر پہ قائم تھا۔ لہذا لوگوں کو ان کے پروفیسر ہونے پہ کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ موصوف کو خود اس پہ بہت بڑا اعتراض تھا اور وہ یوں کہ ان کے اس دعوے کو کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جس طرح انھوں نے ایم اے کیا ہے ، اب کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اور اس سلسلے میں جذباتی ہو جاتے تو بلا لحاظ و تمیز ہر شخص سے کہہ دیتے کہ اگر تم انگریزی میں ایم اے کر دکھاؤ تو میں اپنی سند پھاڑ دوں گا۔ اور اس ضمن میں اپنے ایک پڑوسی پرنسپل صاحب کو بھی نہیں بخشتے تھے جو بیچارے کہیں باہر سے انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کئے ہوئے تھے۔

پروفیسر صاحب کو ، لوگوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کا

مشغلہ عارضے کی حد تک لاحق تھا۔ ہم ان کی زد میں یوں بھی تھے کہ ہمسائیگی میں پہلا نمبر ہمارا تھا اور اسلام میں جو حقوق ایک ہمسائے کے دوسرے پر ہو سکتے ہیں (یا نہیں بھی ہو سکتے) وہ ہم سے وصول کر کے رہتے تھے۔ یوں جہاں گھر کے استعمال کی چیزیں ان کے ادھار کی زد میں رہتیں، ہم ان کے مہمانوں کے نرغے میں رہتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہم شام کو کہیں جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں کہ موصوف تشریف لے آتے۔ ان کا سوال صرف یہ ہوتا —— "آپ مصروف تو نہیں ؟" اس کا جواب سننے کی ضرورت نہ سمجھتے، کرسی کھینچ کر براجمان ہو جاتے اور جیسا کہ مثل مشہور ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ آپ بھی کسی کی معیت میں ورود فرماتے۔ پھر انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرماتے —— "اِن سے ملئے۔ یہ ہمارے جیلانی بھائی ہیں امروہہ والے، آج ہی ملنے آئے تھے۔ سوچا آپ سے ملا لاؤں" اس ضمن میں وہ ہمیشہ باہر سے آنے والے ہی کا تعارف کرانا مناسب سمجھتے —— اور ہمیں تو گویا دودھ میں مکھی کی طرح نکال باہر کرتے تھے۔ ہم بظاہر مہمان سے گرم جوشی اور خوش خلقی کا اظہار کرتے مگر پروفیسر صاحب اِسی پر بس نہ کرتے، بات کا آغاز گویا وہ انگلی پکڑنے ہی کی صورت میں کرتے تھے مگر آخر آخر گلے آپڑتے تھے —— "ہاں تو جیلانی بھائی کہنے لگے، سنا ہے یہاں کڑھائی گوشت بہت اچھا بنتا ہے کیوں نہ آج ہو جائے، اور ہم نے کہا، لو یہ بھی ایک رہی۔ ہمارے یہ مخلص دوست بھی کچھ ایسے ہی خوش خوراک واقع ہوئے ہیں —— ان کا اشارہ عفی عنہٗ کی طرف ہوتا اور فدوی کو پروفیسر صاحب کے اخلاص کا جواب ہمیشہ اخلاق سے دینا پڑتا ——

کڑھائی گوشت اور مٹھائی، پروفیسر صاحب کی کمزوریاں تھیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ کڑھائی گوشت کے تو دشمن تھے، کچا کھا جانے سے بھی پرہیز نہ تھا۔ مگر کھلاتے اسی یک طرفہ ذریعے سے تھے جس سے تعارف کراتے تھے گویا اللہ نے ان کی تخلیق کا مقصد ہی یہی تعارف کا سلسلہ رکھا تھا۔ ان کے سکول اور محلّے میں مشہور تھا کہ فارغ اوقات میں ان کے تعارف کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹتا۔ طالب علموں کو استادوں سے، استادوں کو دوستوں سے، دوستوں کو پرنسپل صاحب سے اور پرنسپل صاحب کو بچوں سے متعارف کروانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ گھر پر چائے کے بہانے دوستوں کو بلا کر بچوں سے غلط سلط اے بی۔ سی سنواتے تھے اور پھر نہایت فخریہ لہجے میں فرماتے کہ جب تک بچوں کی تربیت میں خود والدین دلچسپی نہ لیں، بچوں کی ذہنی نشو ونما ممکن نہیں۔ میزبان ہوتے ہوئے بھی گھر میں بنی ہوئی چیزیں اکثر خود کھا جاتے اور مہمان کو فقط چائے پر رکھتے اور وہ چیزیں بھی ان کی نیک بخت زوجہ کی وجہ سے بن جاتی ہیں جبکہ آپ کا اصول یہ تھا کہ دوسروں کے ہاں بچوں سے بھی ایسا سلوک روا رکھنا، ان سے بعید نہ تھا۔ مثلاً کہیں مٹھائی کی ڈش دیکھی اور پل پڑے۔ بلکہ پوری ڈش ہی اٹھالی اور میزبان بیچارہ دوسرے مہمانوں کو دیکھتا اور مہمان میزبان کو اور موصوف اسے اپنی بے تکلفی پر محمول کرتے ہوئے انتہائی تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے رہتے۔

گالی اور ڈانٹ ڈپٹ کا استعمال موصوف انگریزی میں کرتے تھے جو کسی کے پلّے نہیں پڑتی تھی اور خود اُن کے اپنے لختِ ہائے جگر کھسیانی ہنسی ہنس کر باہر بھاگ جاتے۔ اس نوع کی گفتگو کا دائرہ فقط چپراسی، بچوں اور

پالتو جانوروں تک ہی محدود نہ تھا۔ کسی سے بھی ناراض ہوتے، انگریزی زد میں آتی۔ اپنی انہی خاص صلاحیتوں کی بنا پر ہم عمروں میں بیٹھنے کے قابل نہ رہے تھے۔ یوں نوجوانوں کو گھیرے رکھتے تھے۔ کوئی لفٹ نہ کراتا تو خود گھر جا پہنچتے اور پھر اکیلے نہیں، کوئی نہ کوئی مصیبت ان کے ہمراہ ہوتی۔ پہلے تو نوجوان ان کی عزت کرتے، خاطر مدارت کرتے، ان کی قدم رنجگی کو عزت افزائی پر محمول کرتے مگر دو چار دنوں کے بحث ہی سے مہمان کے بے زبان ہونے کا اندازہ ہو جاتا اور معاملہ بے تکلفی تک آ پہنچتا بلکہ اس ضمن میں بھی پروفیسر صاحب خود پہل کرتے اور مذاق کی آخری حدوں پر آ جاتے مگر خود بزرگی کی رعایت بھی چاہتے۔ نوجوانوں میں بیٹھ کر بزرگوں کو کوسا کرتے اور بزرگوں میں سے اگر کوئی چند لمحوں کو مہربان ہو جاتا تو ان کے سامنے نوجوانوں کے پوشیدہ امراض لے بیٹھتے۔ اکثر کہا کرتے کہ بس اور لڑکی کے پیچھے کبھی مت بھاگو، پھر آئے گی مگر ہوا یہ تھا کہ ان کی بس ایسی چھوٹی تھی کہ پھر نہ لوٹی تھی۔ یہ صدمہ انھیں بھکڑ بنا گیا تھا جسے وہ اپنے نوجوان مزاجی کا نام دیتے تھے۔ بس پروفیسر کیا تھے جامع الصفات تھے۔

جامع الصفات ہونے کے ناطے ہر فن مولا بھی تھے۔ دست شناسی پر اُتر آتے تو حضرت کیرو کی مونچھیں مونڈ لاتے رمل، جفر اور نجوم پر دست درازی کرتے تو ملک بھر میں شائع ہونے والی جنتریوں اور دیگر تمام جناتی زبانوں میں چھپنے والے فلکیاتی رسالوں کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیتے۔ کچھ دسترس امراض پوشیدہ وغیر پوشیدہ پر بھی تھی اور خاص طور پر نوجوانوں کو اس سلسلے میں ہدایات جاری کرنا، اپنا قومی فریضہ گردانتے تھے بلکہ یہ بھی ان کے حربوں میں سے ایک تھا۔ جس کے ذریعے وہ ہر نوجوان کو مریض ثابت کر کے "مشائی" کہلاتے تھے اور ادھر یہ حال تھا کہ کوئی چیز اور کوئی بات پیٹ میں لمحے بھر کو نہیں ٹکتی تھی لہٰذا فوراً اٹھ کے چل دیتے۔ غالباً ان کا نکتۂ نظر یہ تھا کہ کسی بھی شخص کو کبھی یہ موقع نہ دو کہ وہ بعد میں کہتا پھرے کہ تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی۔ میں اس کی ہڈیاں توڑ دیتا۔ گویا کسی کی آرزو پوری ہونے کا کوئی موقع نہ جانے دو۔

جیلانی بھائی، امروہہ والے اکثر ان کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ہم جب کبھی ان سے ملنے جاتے، ان کے جیلانی بھائی براجمان ہوتے اور اکثر ان سے کسی مقدمے کے سلسلے میں بات چیت رہتی مگر کوئی فیصلہ یا حتمی بات طے ہوتے نہ دیکھی گئی۔ ایک دن ایک دوست نے پوچھ لیا۔

"جناب یہ امروہہ والے بھائی، آپ کے کیا لگتے ہیں؟"

"کیا لگتے ہیں؟" انھوں نے از خود دہرایا اور "فارغ البال" سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔

"بھائی لگتے ہیں!" سوال کرنے والے نے پھر پوچھا ——— "میرا مطلب تھا، کیا رشتہ ہے؟"

"کیا رشتہ ہے؟" انھوں نے جملہ اور عمل مذکورہ کو بالترتیب دہرایا اور کچھ سوچ کر آواز دی۔

"بھائی جان! جیلانی بھائی ہمارے کیا لگتے ہیں؟" بھائی جان بھی اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکے اور گڑبڑا گئے مگر سنبھل کر بولے ——— "یہ اپنے اچھن میاں کے لڑکے ہیں نا!"

مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اچھن میاں کون تھے ــــ پروفیسر اعوذ باللہ تو اسی عرفانِ لطیف پر مطمئن ہوگئے مگر غالباً بھائی جان قناعت پسند طبیعت کے مالک نہ تھے۔ وہ اس ضمن میں مزید تحقیق کرنے اندر چلے گئے اور کافی دیر بعد بچے کھچے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ اچھن میاں، کاندھلے والے ماموں کے سسر کے بھائی تھے اور جے پور میں بڑے ابا کے پڑوسی تھے۔

پروفیسر صاحب اور جیلانی بھائی کی قانونی گھسر پھسر اور قریباً ہر ہفتے کچہری آمد و رفت کے ضمن میں معلوم ہوا کہ کسی جائداد کا جھگڑا ہے اور جیلانی بھائی چونکہ فارغ آدمی تھے لہٰذا وہ بے روزگار ہونے کے سبب اس مصروفیت میں صحیح طور پر کھپ سکتے تھے۔ اسی بناء پر وہ ان کی جگہ ہر ہفتے کچہری جاتے اور نئی "پیشی" لے کر لوٹ آتے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال تھا کہ پروفیسر اعوذ باللہ کے خاندان میں لوگوں کی جائداد ہو نہ ہو جائداد کا مقدمہ ضرور ہوتا ہے اور یہی باعث تھا کہ ان سب نے مل کر جیلانی بھائی کو برسرِ روزگار کر رکھا تھا۔

پروفیسر صاحب کو لطیفے سُنانے کا "ٹھرک" تھا اور یہ معاملہ ان کی رسوائی کا سبب بنا ہوا تھا۔ مگر خود لطیف سے لطیف تر جملے کو فارغ البال سر سے دو فٹ اوپر سے گزارتے تھے۔ استعاروں کی زبان میں یار لوگ چوٹ کر جاتے مگر ان کا کچھ نہ بگڑتا ۔ وہ دوسرے کے سنائے ہوئے لطیفے اگلی نشست میں اپنے نام سے سُنا دینا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔ خود بہت خوب ہزل کہتے تھے مگر اسی حساب سے دوسروں کے اشعار پر ہاتھ صاف کر لینا اور اپنے نام کے غلاف میں لپیٹ کر دکھانا بلکہ اس کی ریڑھ مار کر رکھ دینے میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اصل معاملہ وہی پیٹ والا تھا، سن کر فوراً چل دیتے تھے۔

عام طور پر گھروں میں ملنے جلنے والوں کی حماقتوں سے گھروں کے لوگ بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ ہاضمے کا مریض ہونے کی بناء پر کون بیسن کی بنی چیزیں نہیں کھاتا۔ کون زکام کا مستقل شکار رہنے کے سبب آئس کریم نہیں کھاتا کون دماغ کی خرابی کے باعث چائے نہیں پیتا۔ پروفیسر صاحب موصوف بھی جس گھر میں جاتے، وہاں سے چینی دانی بچوں کی ٹافیاں بلکہ "مرونڈے" (مُرمُرے) تک اٹھا لئے جاتے۔ میٹھے کے بے دریغ جذبۂ حصول میں پروفیسر صاحب کو مکھیوں کا مردِ مقابل دیکھا۔ چائے کے لئے اگر پوچھا جاتا "چینی کتنے چمچے ؟" تو فرماتے ــــ "بھئی ڈالتے جاؤ ہم تو پیتے ہی اس لئے ہیں کہ میٹھی ہوتی ہے۔!" کچھ عرصہ علی گڑھ میں بھی رہے۔ لہٰذا اب علی گڑھ کی یاد کو دل سے لگائے پھرتے تھے اور علی گڑھ کا نام اٹھتے بیٹھتے بطور سہارا استعمال کرتے تھے (جسے لوگ ان کی پچھلی زندگی کا استعارہ سمجھتے تھے) وہ یوں کہ بیٹھنے سے پہلے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر کہتے ــــ "ہائے علی گڑھ !" تھوڑا سا حالت مذکور میں توقف کرتے اور پھر بیٹھ جاتے جیسے علی گڑھ میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی ہو۔ پھر گفتگوئے طویل و بسیط کے بعد جب اٹھنے کا ارادہ کرتے تو بھی دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں کی بیساکھیوں پر ٹکاتے اور "وائے علی گڑھ" ! کا سہارا لے کر نیم رکوع میں آجاتے اور پھر اسی طرح "اگلی ٹانگیں" سیدھی رکھ کر توقف کرتے اور کھڑے ہو جاتے۔

علی گڑھ کا کوئی بھی مشہور ماہرِ تعلیم ایسا نہ بچا ہوگا جسے ان کے استاد ہونے کا شرف حاصل نہ رہا ہو۔

(اور شکر تو یہ ہے کہ یہ اعزاز شاگردی کا نہ تھا' ورنہ ان سے یہ بھی بعید نہ تھا) پچھلے چند مہینوں میں یکے بعد دیگرے دو تین "اولڈ بوائز فرام علی گڑھ" چل بسے تو آپ کئی دنوں تک احباب کے گھر جا جا کر پُرسہ لیتے رہے اور مٹھائی کھاتے رہے — واضح رہے کہ مٹھائی سے مراد کوئی بھی میٹھی چیز ہو سکتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی کوئی بھی معروف ادیبہ ایسی نہ ہوگی؛ جو کسی نہ کسی وقتی یا عصری دباؤ یا خاندانی حالات کی ناگفتہ بہ صورت میں ان کو زبردستی اپنا منہ بولا بھائی نہ بنا چکی ہو اور بالاصرار اپنے ہاتھوں بنا دال کا حلوہ' نرگسی کوفتے' ایرانی بریانی' زعفرانی زردہ' آصف خانی سویاں اور باقر خانی حلیم نہ کھلا چکی ہو۔

جہاں چار شریف آدمی کسی خاتون افسانہ نگار کے افسانوں سے ہوتے ہوئے' اس کی ذاتی زندگی پر عالمانہ بصیرت کا اظہار کرنا شروع کرتے' آپ کھنکھارتے ہوئے دخل در معقولات فرماتے اور یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دیتے کہ آنجناب میری ہمشیرہ ہوتی ہیں۔ ناچار شریف لوگوں کو اپنی رائے محفوظ رکھنی پڑتی۔ صرف شرِ انسانی سے بچنے کے لئے!

کچھ عرصہ قبل ایک نادرۂ روزگار افسانہ نگار پاکستان آرہی تھیں۔ پروفیسر صاحب نے بھی خبر پڑھی تو فوراً دالیں چاول منگوا کر رکھ لئے۔ ہر ایک سے کہتے پھرتے کہ۔

"بھئی آخر آپی آرہی ہیں' ایک آدھ وقت کا کھانا کرنا پڑے گا!"

مگر محترمہ موصوفہ جو دو ہفتوں کیلئے آئی تھیں' دو مہینے رہنے کے بعد بھی اس طرف کا رخ نہ کر سکیں۔ بالآخر مجبوراً پروفیسر صاحب کو پنڈی میں ایک اور منہ بولی افسانہ نگار بہن کے ہاں جا کر زبردستی ان کے ہاں کھانا کھانا پڑا (اور مٹھائی بھی) موصوف نے ہر دو مذکورہ بہنوں کے ہمراہ ایک تصویر بھی کھنچوائی جو بعد میں دہلی کے ایک ماہنامے کے خواتین نمبر میں چھپی۔

موصوف کے جامع الصفات ہونے کے اسباب ڈھیروں تھے۔ کتابیں اکٹھی کرنا بھی ان کے جنون کا حصّہ تھا (پڑھنا شرط نہ تھی)۔ خوبصورت اور نئی نئی کتابیں اکٹھی کرنے اور انہیں ڈرائنگ روم میں سجا کر رکھنے کا مشغلہ ہی آخر انہیں لے ڈوبا۔ موصوف نے بہت سی کتابیں سکول کی لائبریری اور لڑکوں سے چندہ اکٹھا کر کے خریدی تھیں۔ اور انکوائری ہو جانے پر ان کا تبادلہ ایک دور دراز اسکول میں کر دیا گیا —— اور وہ ہمارا محلہ بھی چھوڑ گئے —— !

جوہر سیوانی

"تیرے حسن کی لطافت کوئی لائیگا کہاں سے"

مجھے اے خدا بچا لے ' تو بلائے بے اماں سے
میری ساس کو اٹھا لے میرے اُن کے درمیاں سے

جسے سیکھنا ہو یہ فن ' چلے اُن سے چل کے سیکھے
کسی گز کا کام لینا ' سوا ایک کی زباں سے

کئی کیلو ناز نخرے ' کئی کیلو سرخی لب
یہی سودا دل کے بدلے کیا حسن کی دکاں سے

یہی شہر میں ہے چرچا کہ پولیس نے رات گھس کر
کئی بوتلیں نکالیں ' کسی شیخ کے مکاں سے

بڑی ہوگی مہربانی ' سر بزم یہ بتا دو
جو غزل سنا رہے ہو ' یہ ملی تمہیں کہاں سے

مرے گھر سے میرا ٹٹوہ ' اُڑا لے گیا جاتے جاتے
یہ نہ تھی امید مجھ کو کبھی اپنے میہماں سے

ہوئی نا دہند رندوں کی پٹائی میکدے میں
یہ خبر جناب زاہد کو مگر ملی کہاں سے

مرا تجربہ ہے یارو کہ حجام کی بھی قینچی
نہ زیادہ تیز ہوگی ' میری بیوی کی زباں سے

ہوئے نور چشم اپنے جو "مکمل انقلابی"
تو کبھی ہے ہم سے جھگڑا کبھی لڑ رہے ہیں ماں سے

اُنھیں چھوٹ نقل کرنے کی نہ دی جو ٹیچروں نے
تو خفا ہیں اسٹڈی سے تو چڑھے ہیں امتحاں سے

اگر اُڑ سکو تو تم بھی اُڑو چرخ فن کی جانب
ملا جوہر ظرافت مجھے فن کے آسماں سے

ابابیل الکیم پوری

غزل

پڑھ رہا ہوں میں

کرسی سے مت اُتار غزل پڑھ رہا ہوں میں
رہنے دے میرے یار غزل پڑھ رہا ہوں میں

تو قہقہہ نہ مار غزل پڑھ رہا ہوں میں
کر میرا اعتبار غزل پڑھ رہا ہوں میں

دل بھی دھڑک رہا ہے چلیں سانسیں بھی تیز تیز
محفل میں پہلی بار غزل پڑھ رہا ہوں میں

قربان اس گلے کے جہالت کے باوجود
پبلک ہے بے قرار غزل پڑھ رہا ہوں میں

ہوٹنگ کے ڈر سے بھاگنے والوں میں میں نہیں
مت کھانس مت کھنکار غزل پڑھ رہا ہوں میں

لکھوائی تو نے کیوں ہے ابابیل کی رپورٹ
اے شتر بے مہار غزل پڑھ رہا ہوں میں

چکڑ نظام آبادی

غزل

ناشتے کے لئے گر سیب و انجیر نہیں
میزباں کیا یہ میرے ذوق کی تحقیر نہیں

قتل کر دیتا عدو کو سر بازار مگر
پاس چاقو نہیں خنجر نہیں شمشیر نہیں

بھیج دیجئے مجھے تصویر کھنچا کر اپنی
دل کے البم میں میرے آپ کی تصویر نہیں

ان سے کمرے کے کرایہ کی وصولی کے لئے
ڈھول دھپے کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں

گھر کے باہر تو بڑے ٹھاٹ ہیں چکڑ کے مگر
گھر میں ڈیوٹی نہیں کچھ نہیں کفگیر نہیں

ظہیر الحق
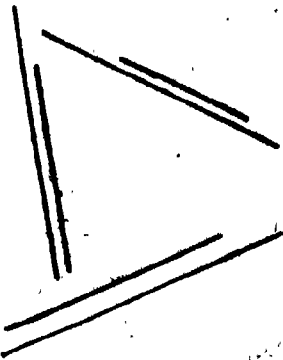
رکھیے غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

["لیڈی کلرکس" یعنی خواتین اہلکاروں کے بارے میں کچھ لکھنا جان بوجھ کر اپنے آپ کو خطرات کے حوالے کرنا ہے کیونکہ ان کی اکثریت تعلیم یافتہ اور باشعور ہوتی ہے اس لیے مردوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی توقع اب ان سے رکھی نہیں جاسکتی بلکہ ڈر ہے کہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ہماری ان تعمیری تنقیدوں کو تیر سمجھ کر اس کا جواب اگر وہ پتھر سے دینے لگیں تو اس غیر صحت مند طریقہ کار سے خود ہمارے سر کی سلامتی مشکل میں پڑ جائیگی۔ ہم چلتے جی اپنے "پوسٹ مارٹم" کے لیے بالکل تیار ہیں لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ اس مرتبہ شاید وہ ہماری تدفین ہی کا سامان کر دیں تاکہ ہم دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں]

ایک عام خیال یہ ہے کہ لیڈی کلرکس زیادہ محنت کی عادی نہیں ہوتیں۔ وہ کام کم اور آرام زیادہ کرتی ہیں۔ اگر ایسے سکشن میں "پوسٹنگ" (posting) دی جائے جس میں کام بہت کم ہو تو وہ بہت خوش ہو جاتی ہیں۔ ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور وہ سوچتی ہیں کہ کاش زندگی بھر وہ ایسے ہی سکشن میں رہیں تو کتنا اچھا ہو ایسے سکشن میں ہی تو کسی فلمی میگزین یا جاسوسی ناول کا مطالعہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ فائل کا مطالعہ تو ان کے لیے بڑا دوبھر کام ہے بلکہ فائیلوں کی اسٹڈی سے سنا ہے کہ ان کی دونوں کنپٹیاں دکھنے لگتی ہیں۔ ان کی ایک قابل لحاظ تعداد دفتری معلومات کی حد تک "کورا کاغذ" ہوتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی کی طرح آفس کی زندگی کی گاڑی بھی کسی نہ کسی کی مدد کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ بعض تو خود کچھ لکھ لیتی ہیں اور بعض کی عمدہ نوٹنگ اور ڈرافٹنگ دیکھ کر فوراً کسی شاعر کا یہ مصرعہ،

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یاد آجاتا ہے۔ سنا ہے کہ لیڈی کلرکس جب شیریں لب و لہجہ میں بات کرتی ہیں تو ساتھی کلرک "مجروح" ہو جاتا ہے اور جب شیریں لہجہ میں یہ اور زیادہ شکر گھول دیتی ہیں تو بے چارا آفیسر بھی کہیں کا نہیں رہتا۔ بس پھر کیا ہے ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوتا ہے۔ آفس کو دیر سے آیئے یا وقت سے پہلے چلے جایئے کوئی پوچھنے گا نہیں۔ آفس میں بیٹھ کر چاہے آفس کا کام کیجئے یا گنجائش کی آخری حد تک منہ کھول کر جماہیاں لیتے رہیے۔ کوئی کچھ کہے گا نہیں اور نہ کوئی آپ کی کارکردگی کے بارے میں بری رائے قائم کرے گا۔ بعض لیڈی کلرکس تو کچھ اس رنگ میں اور اس انداز سے آفس تشریف لاتی ہیں کہ معلوم ایسا ہوتا ہے جیسے پرانے باغ عام" میں چہل قدمی کے لیے جا رہی ہوں ——

دفتری معلومات کی طرح بعض خواتین اہلکاروں کی عام معلومات بھی بڑی محدود ہوتی ہیں یہ صرف چند مخصوص عنوانات پر ہی گفتگو کر سکتی ہیں مثلاً آفس کی دیگر سہیلیوں سے ان کی گفتگو عموماً حسب ذیل موضوعات پر ہی ہوتی ہے:۔

۱۔ لباس اور زیورات
۲۔ تازہ فلموں پر تبصرے
۳۔ شوہر صاحب تعطیل کے دن بھی گھر پر نہیں رہتے۔ دوستوں کو زیادہ وقت دیتے ہیں۔ بیوی بچوں سے زیادہ دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں۔
۴۔ ماما کے نہ آنے کا دکھڑا
۵۔ بچوں کی بیماری کے قصے۔
۶۔ کبھی ساس صاحبہ کا "ذکر خیر"
۷۔ کبھی نندوں کی نندلاور کبھی جیٹھ صاحب کے حسن سلوک کا تذکرہ۔
۸۔ کسی سہیلی کی "لو میرج" کی ناکامی کا ٹھنڈی آہوں کے ساتھ ذکر۔ وغیرہ وغیرہ

اکثر حضرات کا یہ خیال ہے کہ انھوں نے بہت کم کسی تعلیم یافتہ لیڈی کلرک کو کسی اعلیٰ، سنجیدہ یا بین الاقوامی موضوع پر گفتگو کرتے یا آپس میں بحث و مباحثہ کرتے سنا ہے۔

پوچھا جائے کہ "چراغ خانہ" بنی رہنے کی بجائے یہ "شمع محفل" کیوں بنتی ہیں تو اکثروں کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ملازمت کرنے کا مقصد گھر کی حالت سدھارنا اور اپنے شوہر کے ساتھ مالی تعاون کرنا ہوتا ہے لیکن ہمارے مشاہدے کے لحاظ سے یہ بات بھی کچھ زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اکثر صرف اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کے لیے ملازمت کرتی ہوں۔ شوہر کی اقتصادی مشکلات کو کم کرنے میں کسی خاتون محترم نے ہاتھ بٹایا ہے جو یہ بتائیں گی؟ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ کپڑوں، زیورات، سامان زیب و زینت کی خرید اور سہیلیوں کو تحفے تحائف دینے اور خرچ آمد و رفت اور ذوق سینما بینی کی تکمیل کے بعد باقی کیا رہ جاتا ہے جسے وہ گھر کے اخراجات میں لگائیں گی۔ عجب نہیں کہ مہینہ کے آخری ہفتہ میں وہ شوہر سے ہی کچھ طلب نہ کریں۔

ہمارے ایک دوست نے ہمت کرکے اپنی ملازم پیشہ بیوی سے ایک مرتبہ ان کی تنخواہ کا حساب کتاب پوچھا تو سنا ہے کہ پہلے تو وہ بہت برہم ہوئیں پھر سوٹ کیس اٹھا کر میکے چلی گئیں۔ جب آٹھ دس دن تک وہ واپس نہ لوٹیں ہمارے دوست نے انھیں اس وضع کا خط لکھا:

ڈیر ......

آپ کے اچانک میکے چلے جانے سے گھر کے روزمرہ کے انتظام میں دقت محسوس ہو رہی ہے اس لیے میں آپ سے خواہش کرتا ہوں کہ آپ جس قدر جلد ہو سکے گھر واپس آجائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کی تنخواہ کا حساب کتاب آپ سے ہرگز نہیں پوچھوں گا کیونکہ آپ کا اور ہمارا حساب "روزِ حساب" ہی ہوگا۔ بچّی کی تسمیہ خوانی اور چھوٹے بچے کے عقیقے کے اخراجات میں ہی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں، چاہے بچے کے ساتھ ساتھ خود میرے سر کی بھی مکمل حجامت کیوں نہ ہو جائے۔"

فقط
آپ کا پریشان حال شوہر

....

دنیا کے بعض کام ایسے ہیں جنھیں انجام دینا بڑا مشکل اور خطرناک ہوتا ہے جیسے رود بار انگلستان کو تیر کر عبور کرنا یا ہمالیہ کی آخری چوٹی سر کرنا وغیرہ وغیرہ ایک ایسا ہی مشکل کام اپنی ملازم پیشہ بیوی سے اس کی ماہانہ آمدنی کا حساب کتاب پوچھنا ہے۔ ہمارے خیال میں سمجھ دار کبھی اس قسم کی غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے اور کم سے کم ہی ایک "پائنٹ" پر وہ اپنی بیوی سے "تاشقند" معاہدہ کر لیتے ہیں ——

ہم اس شوہر کو بڑا ہی خوش نصیب سمجھتے ہیں جس کی ملازم پیشہ بیوی پہلی تاریخ کو اپنی پوری تنخواہ شوہر کے ہاتھ پر رکھتی ہے تاکہ گھر کا خرچ چلانے میں وہ بیوی کی آمدنی سے بھی استفادہ کر سکے۔ ورنہ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ "گھر کے اخراجات کے لیے جب بے چارے کچھ مانگتے ہیں تو بیویاں دور ہی سے انھیں انگوٹھا بتاتی ہیں ——

سادہ لباس پہن کر، غیر ضروری اخراجات کو کم کرکے آڑے وقت کے لیے اپنی فیملی کے لیے ماہانہ کچھ رقم پس انداز کرنے والی ملازم پیشہ خواتین کو ہم نے بہت کم دیکھا ہے۔ □□

نصیر جلال

چاندپاشاہ کے والد صاحب قبلہ نے گھر بھر میں اعلان کر دیا کہ اب چاندپاشاہ کی شادی ہونی ہی چاہیئے اور اپنے صاحب زادے کو اپنے نزدیک بٹھا کر پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا کہ دیکھو بیٹے ـــــ اب تم بڑے ہو گئے ہو ماشاءاللہ جوان اور تندرست بھی ہو شادی لائق ہو اس لیے ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ایک اچھے معزز گھرانے کی لڑکی جو خوب صورت اور پڑھی لکھی ہو جس کی حقیقی بہنیں اور بھائی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں تمہارے لیے پسند کی جائے۔

والد صاحب کے اس طرح کہنے کے بعد چاندپاشاہ سپنوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ انھیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے بڑے بڑے ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، کنٹراکٹر سالے بن کر آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں کبھی بڑے سالے گنتہ دار روپیہ کمانے کے گر بتلا رہے ہیں کبھی منجھلے سالے ڈاکٹر بنے " دریا تین تیس " کے عنوان پر لکچر دے رہے ہیں کبھی چھوٹے سالے کی کار میں بیٹھ کر گھوم رہے ہیں کبھی سبنس مکھ چنچل قسم کی سالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے شاپنگ کر رہے ہیں۔

اس طرح کے دل خوش کن خیالات میں کئی دن تک کھوئے رہنے کے بعد چاندپاشاہ کو ایک دن یہ بھی خیال آیا کہ کیوں نہ اخبار میں "رشتہ کے لیے ضرورت ہے" کا اشتہار دیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خوشی خوشی اپنے اس دوست کے پاس پہنچے جو رومانس اور شادی بیاہ و طلاق کے کاروبار میں دن بدن ترقی کر رہا تھا۔ چاندپاشاہ نے اُس سے کہا پیارے دوست والد صاحب قبلہ میری شادی کے لیے تیار ہو گئے ہیں اس لیے اب میں یہ چاہتا ہوں کہ "رشتہ مطلوب ہے" کا ایک بہترین اشتہار اخبار میں دیا جائے تاکہ ایک اچھی معیاری اور اعلیٰ لڑکی کا انتخاب ہو سکے۔

اخبار میں کس قسم کا اشتہار دیا جانا چاہیے۔ یہ سوچنے کے لیے اس دوست نے چاندپاشاہ کے سامنے

بہت سے اشتہارات کے نمونے پیش کیے جو مختلف قسم کے لڑکے اور لڑکی والوں کی طرف سے لکھے گئے تھے۔
پہلا اشتہار کچھ اس طرح کا تھا۔
"رشتہ کے لیے لڑکی کی ضرورت ہے"
ایک شریف گھرانے کا نوعمر ۲۱ سالہ خوب صورت اعلیٰ قابلیت والا لڑکا صاحب زر صاحب جائیداد ہونے کے علاوہ سرکاری ملازم بھی ہے جس کی ماہانہ آمدنی بہت ہی معقول ہے۔
لڑکے کی چار حقیقی بہنیں ہیں دو رشتہ کی بہنیں ہیں دو پھوپھو، چار چچا اور ان کی چار بیویاں اور ان کے بچے، دادا، دادی، ماں باپ اور نوکروں کو ملا کر اس طرح گھر کے کل ۲۵ افراد ہیں جو بالکل ان پڑھ جاہل ہونے کے علاوہ سست اور کاہل بھی ہیں۔ اس لیے ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو گریجویٹ ہونے کے علاوہ کسی اسکول میں دو سال تک پڑھانے کا تجربہ بھی رکھتی ہو۔
گھر کے تمام افراد کو روزانہ فرداً فرداً پڑھانا ہوگا۔ لڑکا چونکہ سال میں دو ماہ کی چھٹی پر گھر آتا ہے اس لیے ان دنوں میں لڑکی کو اس کام سے چھٹی دے دی جائے گی۔ خواہش مند خواتین ہم سے فوری ربط پیدا کریں۔

دوسرا اشتہار:

اللہ کے فضل و کرم سے میری دس لڑکیاں ہیں ماشاءاللہ سے پانچ کی شادیاں دھوم دھام سے ہو چکی ہیں اور پانچوں داماد پوری ہوشیاری سے اپنی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اب چھٹی لڑکی کے لیے ایک گھر داماد کی ضرورت ہے۔ لڑکے کی عمر پچیس سال کے اندر ہونی چاہیے۔ جو لڑکا سیکل چلانا جانتا ہو اور دور دراز مقامات پر رہنے کے لیے تیار ہو ہمارے پتہ پر ہم سے ربط پیدا کرے۔ ذاتی سیکل رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔
کھانے پکانے سے واقفیت لازمی ہے۔

تیسرا اشتہار

بیروزگار گریجویٹ متوجہ ہوں۔
ایک اعلیٰ خاندان کی خوب صورت لڑکی جو دینی و دنیاوی علوم کے زیور سے آراستہ ہے کے لیے ایک اچھے خاندان کے بے روزگار گریجویٹ لڑکے کی ضرورت ہے۔ لڑکے کی عمر ۲۲ سال سے کم اور ۲۶ سال سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ اور لڑکے کے پاس گریجویشن (کامرس سے) کرنے کے بعد دو سال تک بے روزگار رہنے کا صداقت نامہ ضروری ہے۔
لڑکی کے والد کے بہت وسیع کاروبار ہیں لڑکے کو نوکری دے کر گھر داماد کے لقب سے نوازا جائے گا۔
لڑکا پانچ وقت کا نمازی ہونا چاہیے۔ شرافت کی پوری گیارنٹی ملنے کے بعد شادی ہوگی اور شادی کے تین ماہ بعد "خاندانی منصوبہ بندی" کے تعلق سے تلگو زبان میں ایک ٹسٹ لیا جائے گا اس لیے تلگو زبان سے واقفیت لازمی ہے ورنہ نوکری اور گھر سے باہر نکال دیا جائے گا۔ باقی تفصیلات ہمارے پتہ پر لکھ کر معلوم کیجیے

جاسکتے ہیں۔

چوتھا اشتہار:

ایک باعزت خاندان کی خوب صورت کم عمر لڑکی جو مہذب و شائستہ علم کے زیور سے آراستہ سلیقہ شعار تربیت یافتہ ہے۔ لڑکی زیادہ تر گرہستی سے دل چسپی رکھتی ہے اور ہمہ اقسام کے پکوان میں ماہر ہے۔

انواع اقسام کے کھانے، بیگن کا سالن مرچیوں کا سالن، قورمہ، نرگسی کوفتہ۔ بہت ہی آسانی سے پکالیتی ہے۔ کئی قسم کے حلوے مثلاً بادام کا حلوہ، چنے کا حلوہ، سمرقند حلوہ، قلاقند، موتی چور لڈو، پکے ہوئے ثابت کدو ایرانی حلوہ، طورانی حلوہ، دم کا گوشت، مرغ مسلّم، مسلّم مچھلی، ترکاری اور ڈبل۔ گوشت کی بریانی، ہمہ اقسام کے پلاؤ مثلاً: چنبیلی پلاؤ، موتی پلاؤ، گلزار پلاؤ، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں پکانے میں ماہر ہے۔

اس لڑکی سے رشتہ کے لیے ایک قبول صورت ۲۴، ۲۵ سالہ لڑکے کی ضرورت ہے۔ خواہش مند حضرات ایک کیلو باریک چاول معہ بریانی مسالہ اپنے نام کے ساتھ ہمارے پتہ پر روانہ کریں۔

پانچواں اشتہار:

کمر ٹارو ئے حرم، آنکھیں بیت الصنم، ہر نقش قدم نسرین بنفشہ نسترن چلے تو ایسے جیسے باد صبا چلتی ہے، مسکرائے تو ایسے، جیسے بہار کے موسم میں پھول کھلتے ہیں۔ روئے تو یوں جیسے برسات کے موسم میں رم جھم پانی برستا ہے۔ ہنسے تو لگتا ہے جیسے ساری فضا میں ستار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ اور کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ لڑکی بس پھولوں کی ڈالی ہے جس محفل میں جاتی ہے خوشبو مہکاتی ہے۔ کشادہ پیشانی پر قسمت کے ستارے چمکتے ہیں۔ نظروں میں سورج کی کرنیں لیے ہوئے لڑکی ایک خوب صورت ناک کی مالک ہے یہ ناک سارے خاندان کی ناک ہے۔ خاندان میں کسی کو ایسی ناک نہیں ملی۔ ان کی ناک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی بڑھتی ہے تو کبھی گھٹتی ہے۔ کبھی موٹی ہوتی ہے تو کبھی لمبی ہو جاتی ہے۔ کبھی سکڑ جاتی ہے تو کبھی پھیل جاتی ہے۔ موسم کے لحاظ سے اس کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے ایک ایسے نوجوان سائنس داں سے رشتہ مطلوب ہے جو یہ ثابت کرسکے کہ لڑکی کی ناک کا بڑھنا اور گھٹنا چاند کے بڑھنے اور گھٹنے کے برابر ہے۔

صرف انڈین سائنس داں ہمارے پتے پر درخواست بھیج سکتے ہیں۔

چھٹا اشتہار

ایک لڑکا جو ایک اچھا شاعر اور ادیب بھی ہے۔ نظمیں غزلیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں بڑے بڑے افسانے لکھنے میں ماہر ہے وہ جب قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو کئی صفحے سیاہ کر دیتا ہے اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ کبھی نشتر بن کر دل میں چبھ جاتا ہے تو کبھی پھول بن کر دل کی وادیوں کو مہکاتا ہے۔ لڑکے کے والد بھی آزاد شاعر ہیں اور دادا جان عمر دراز خاں کم عمر صاحب بھی اپنے دور کے مانے ہوئے شاعر تھے۔

اس لڑکے سے رشتہ کے لیے ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جس کے سرپرست لڑکے کی تمام تخلیقات کو کتابی شکل میں شائع کروا کر انھیں فروخت کرنے کی ذمہ داری لیں اور شادی کے بعد جو تخلیقات بچوں کی شکل میں جنم لیں گی ان کی پرورش کی بھی پوری پوری ذمہ داری قبول کریں۔

لڑکی کا خوب صورت اور ادبی ذوق کا حامل ہونا ضروری ہے۔

ساتواں اشتہار

(ایک گاؤں کے رہنے والے صاحب جن کو پڑھنا لکھنا بالکل نہیں آتا تھا۔ دولت علم اور دولت اولاد کے علاوہ ان کے پاس سب کچھ تھا۔ ایک دن ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی ایک عزت دار آدمی ہیں۔ اس لیے ان کا نام بھی اخبار میں آنا چاہیے یہ سوچ کر انھوں نے اپنے ایک دوست سے جو بہت ہی کم لکھنا پڑھنا جانتا تھا یہ اشتہار لکھا دیا)

"لڑکی کی ضرورت ہے"

دیکھو جی۔ ہم کو لکھنا پڑھنا تو آتا نئیں مگر ہم کو اِتّا معلوم ہے کہ ہم کو ایک لڑکی شادی کرنے کے واسطے ہونا ہے اس واسطے ہم اخبار میں لکھ رئیں ہمارے پاس زمین ہے۔ کھیتی باڑی ہے۔ بیل گاڑی ہے۔ رہنے کے واسطے چار مکاناں ہے بنک میں روپیہ پیسہ بھی بہت جمع ہے۔

اگر آپ کے گھر میں بچے بہوت زیادہ ہوگئے ہیں تو ایک اچھے اُنکھ ناک والی خبصورت بچی ہمکو دے دیو۔ ہم اس کو پالیں گے پوسیں گے بڑی کرکے اس کی شادی کریں گے۔ پانچ تولے سونا دیں گے۔ دس تولے چاندی دیں گے۔ بہت سارا جہیز دیں گے اور جو بولے سب دیں گے۔

غزلیں

فیض الرحمٰن فیض

داد لیتا ہے تڑی دے کر غزل غیروں کی تو
میں غزل اپنی پڑھا تو کیوں تجھے مرچی لگے

مانگے تانگے سوٹ پر اتنی اکڑفوں کس لیے
گر کوئی طعنہ دیا تو کیوں تجھے مرچی لگے

جوتے گھوڑے کی رقم سے اپنے گھر کو بھر لیا
میں رقم تھوڑی لیا تو کیوں تجھے مرچی لگے

ولسیٹ بن کر شیخ تو داخل ہوا میخانہ میں
میں ادھر کا رخ کیا تو کیوں تجھے مرچی لگے

اپنی اپنی بولیوں میں شعر سب پڑھتے رہے
میں جو اردو میں پڑھا تو کیوں تجھے مرچی لگے

ان کی قربت ارے غیروں کو میسر ہی نہیں
پاس میں ان کے گیا تو کیوں تجھے مرچی لگے

تیرے تو اشعار سارے نذرِ ہوٹنگ ہو گئے
مجھ پہ جب ہو واہ وا تو کیوں تجھے مرچی لگے

ہنستے ہنستے جارہے تھے ہار ہاتھوں میں لیے
پھول مجھ پر آ گرا تو کیوں تجھے مرچی لگے

جمع ہیں تعداد غالب میں یہاں جب اہلِ ذوق
فیض جب آنے لگا تو کیوں تجھے مرچی لگے

★

محبوب راہی

وہ شاعر در حقیقت ماہرِ سُرتال لگتا ہے
غزل گاتا ہے تو بس ہو بہو قوّال لگتا ہے

تمہیں کس شہر میں لیجا کے آخر اب بساؤں میں
اگر میکہ بھی اپنا اب تمہیں سسرال لگتا ہے

جہاں ہر شخص ہے ہر وقت مصروفِ اداکاری
مجھے دنیا بڑا سا اک سنیما ہال لگتا ہے

سنا ہے بینک میں لاکھوں کا وہ بیلنس رکھتا ہے
جو بوڑھا شکل و صورت سے شکستہ حال لگتا ہے

ترے چہرے پہ بارہ ہر گھڑی بجتے ہیں کیوں پیارے
ترے جذبات میں کیوں ہر گھڑی بھونچال لگتا ہے

رقیب روسیہ پر کس لیے آخر فدا ہو تم
جو سر سے پاؤں تک پورا اگر و گھنٹال لگتا ہے

صلوٰۃ و صوم کے پابند ہیں اماں بھی ابا بھی
مگر بیٹا بڑا دل پھینک اور چونچال لگتا ہے

مزاجِ یار کا کیا ہے کبھی تولہ کبھی ماشہ
کبھی آکاش لگتا ہے کبھی پاتال لگتا ہے

اسے پہچان لینا اک نظر میں سخت مشکل ہے
کہ جب بھی دیکھئے پہنے نئی اک کھال لگتا ہے

سویرے روزدو گھنٹے لگا دیتا ہے میک اپ میں
تبھی تو وہ پری چہرہ پری تمثال لگتا ہے

یہاں جمتی ہیں جب شعر و سخن کی محفلیں راہی
اکولہ بھی مجھے اندر را دربھوپال لگتا ہے

انصاری اصغر جمیل
ناگپور

پبلسٹی میں مہیلاؤں کی اہمیت

پرانے زمانے میں پبلسٹی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ عوام پبلسٹی پر زیادہ دھیان نہیں دیا کرتے تھے
...پنیاں اعلیٰ سے اعلیٰ تر اشیا تیار کیا کرتی تھیں۔ اور بہترین اشیا تیار کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے
...کوشش کیا کرتی تھیں۔ آج کل ہر کمپنی صرف پبلسٹی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں مصروف
... گھٹیا سے گھٹیا کمپنی بھی پبلسٹی کی تیکنیک کو اپنائے ہوئے ہے وہ اپنی تیار کردہ ناقص اشیاء کی پبلسٹی
...نے اچھے انداز میں کرتی ہیں گویا محسوس ہوتا ہے کہ اس کمپنی سے بہتر کسی اور کمپنی کی اشیاء ہو ہی نہیں سکتیں غرض کہ
...نمبر سے لے کر کنیا کماری تک تمام کمپنیاں پبلسٹی کے اس موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ جس کمپنی یا جس شئے کی پبلسٹی سب
...ہی ہوگی۔ اس شئے کی کھپت اتنی ہی زیادہ ہوگی (یہ ضرور یاد رہے کہ جس شئے کی پبلسٹی سب سے زیادہ ہوگی وہ
...ے اتنی ہی ناقص ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں پبلسٹی کی تعریف یوں ہونی چاہیے۔

پبلسٹی: ناقص اشیاء کو عوام میں کھپانے کا واحد ذریعہ۔

جس شئے کی پبلسٹی جتنی زیادہ ہوگی اس کی نکاسی بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی اور دام بھی منہ مانگے ملیں گے اور پبلسٹی
...ہو تو بعض وقت ایک روپیے کی شئے چار روپے میں بھی بیچنی پڑتی ہے۔

جس طرح مال کی کھپت کے لیے پبلسٹی ضروری ہے اسی طرح پبلسٹی کے اشتہاروں میں کم از کم ایک مہیلا
(...تون) کا ہونا ضروری ہے۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ مہیلائیں صرف پبلسٹی کے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں۔ پبلسٹی
...مہیلاؤں کو خاص اہمیت حاصل ہے جس شئے کی پبلسٹی میں مہیلاؤں کی تصاویر ہوں گی وہ اتنی ہی پائیدار
...اعلیٰ سمجھی جائے گی اور اس کی کھپت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ جس شئے کی پبلسٹی میں مہیلا کی تصویر نہ ہو وہ
...ت ہی ناقص سمجھی جائے گی۔ اگر اپنی تیار کردہ شئے کی نکاسی آپ زیادہ سے زیادہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی پبلسٹی

اشتہار میں ایک عدد مہیلا کی تصویر بھی چھپوالیں پھر دیکھئے ..... اگر کسی فلمی اداکارہ کی تصویر ہو تو وہ سونے پر سہاگہ کا کام دے گی۔

مثلاً آپ نے ایک نیا دنت منجن تیار کیا ہے اور اسے مارکٹ میں لانا چاہتے ہیں چونکہ مارکٹ میں پہلے ہی سے ڈھیر سارے دنت منجن پڑے ہوئے ہیں اسلئے آپ کا تیار کردہ منجن بھی ان میں درمیتیم کی طرح شامل ہو جائے گا اپنے منجن کو ان سے علیحدہ رکھنے کے لیے آپ اس کی پیکنگ خوب صورت ڈبے میں کریں (دبلے بھی ان کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑے) اس ڈبہ پر ایک عدد مہیلا کی تصویر اس کی بتیسی کے ساتھ دکھائیے (یہ ضروری نہیں کہ مہیلا خوب صورت ہی ہو۔ کیمرہ کی مدد سے بد صورت کو بھی خوب صورت بنایا جاسکتا ہے) پھر دیکھئے آپ کے منجن کی کھپت، کھپت کے ساتھ اگر آپ منافع بھی زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتے ہیں تو کسی مہیلا کی بجائے نیتو سنگھ کی تصویر چھاپ دیں بلکہ ممکن ہو تو منجن کا نام بھی" نیتو سنگھ ٹوتھ پاؤڈر رکھ دیں (دنت منجن کی بجائے ٹوتھ پاؤڈر زیادہ مناسب رہے گا۔ اور سرمایہ دار طبقہ اسے خریدنے سے ہچکچائے گا بھی نہیں) پھر دیکھئے آپ کاٹن سے ٹیری کاٹ پر نہ آگئے تو ہمارا ذمہ۔

آپ ایک نئی بیڑی لیکر مارکٹ میں آئیے۔ اپنی بیڑی کا نام" ہیما مالینی" بیڑی رکھ دیں۔ اس کے پبلسٹی اشتہار میں ڈریم گرل ہیما مالینی کو بیڑی پیتے ہوئے دکھائیے (گھبرائیے نہیں اداکارائیں آپ پر کوئی قانونی کارروائی نہیں کریں گی۔ کیونکہ آج کل بیشتر اداکارائیں شہرت کے لیے مری جارہی ہیں) پھر دیکھئے کیا گل کھلاتی ہے آپ کی بیڑی۔ اگر مارکٹ میں آپ کی بیڑیوں کی شارٹیج (قلت) نہ ہو جائے تو ہمارا ذمہ۔ جس طرح سینما کی ٹکٹیں بلیک ہوتی ہیں بالکل اسی طرح عوام آپ کی بیڑیاں بھی بلیک میں خرید کر پئیں گے۔ انہیں بندر بیڑی، شیر چھاپ بیڑی یا پانچ نمبر بیڑی اتنی یاد نہیں رہے گی جتنی کہ ہیما مالنی بیڑی۔

آپ حجامت کی دوکان کھول لیں۔ دوکان کا نام رکھ دیجئے" زینت امان ہیر ڈریسنگ ہال" اور تشہیر کردیں کہ فلم ایکٹریس زینت امان اپنے بال آپ ہی کی دوکان پر اسیٹ کرواتی ہیں۔ اور ان کی خوب صورتی کا راز بھی یہی ہے۔ اس اشتہار میں ایک عدد تصویر کا بھی اضافہ کردیں جس میں زینت امان کو کرسی حجامت پر بیٹھے اور آپ اس کے بال کترتے ہوئے دکھائی دیں۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ جس طرح عوام راشن کے لیے کیو میں لگے دھوپ کی شدت میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں بالکل اسی طرح آپ کی دکان پر بھی ایک لا نبی کیو لگی رہے گی۔ عوام کئی یوم پیشتر سے کیو میں لگے اپنی باری کا انتظار کریں گے اور اس طرح سے وہ گاہک جن سے آپ کو ڈر لگا ہو کہ کٹنگ ادھاری میں بنائیں گے اور تقاضہ کرنے پر اپنی پیلی پیلی بتیسی دکھائیں گے وہ ادھار مانگ کر آپ کو شرمندہ نہ کرسکیں گے بلکہ اپنا پیسہ پیشگی جمع کروادیں گے

(دوکان پر لگی بھیڑ کو کنٹرول کرنے کے لیے آپ کو ایک عدد چوکیدار کا بھی انتظام کرنا ہوگا جسے رکھ کر آپ ایک حد تک امپلائمنٹ کا مسئلہ حل کرسکتے ہیں)

غرض یہ ہے کہ ہم ضروریاتِ زندگی کی کسی بھی شئے پر نظر ڈالیں ان کے ۹۴ ½ فیصد اشتہاروں میں ایک یا ایک سے زائد مہیلائیں ضرور نظر آئیں گی جو اشیاء کو خوب سے خوب تر ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہوں گی۔ جس طرح کم از کم ایک عدد بیوی کے بغیر ہر مرد کی زندگی نامکمل ہے بالکل اسی طرح ایک عدد مہیلا کے بغیر پبلسٹی نامکمل۔

ہماری زندگی میں کئی اشیاء ایسی بھی ہیں جو صرف مردوں کے ہی کام آسکتی ہیں اور مہیلاؤں کا اس سے کوسوں دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن آپ ان کے بھی پبلسٹی اشتہار اٹھا کر دیکھئے انشاء اللہ تعالیٰ مہیلائیں ان میں بھی براجمان ملیں گی خواہ وہ جوتوں کے اشتہار ہوں یا کسی ٹائر کمپنی کے۔ کسی سیاسی لیڈر کو تو تخت سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ لیکن مہیلاؤں کو پبلسٹی اشتہاروں سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔ یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے جو ایک زمانے سے چلا آرہا ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔

نوٹ: ہم نے آپ کو اپنا سمجھ کر دوکان چمکانے کے گر بتائے ہیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ یہ نسخے کسی اور کو نہ بتائیں صرف ہمارے اور آپ کے درمیان ہی رہے۔ ٭٭

کے بھگتہ وتسل راؤ
(یم یس سی)

اُستاد

استاد کا لفظ کافی پرانا ہے۔ شاید انسان کی تاریخ سے بھی اولاً تو خدا ہی اس کا استاد تھا۔ کوئی بھی پیشہ میں اس کے بغیر کام آگے نہیں بڑھتا ہے۔ یوگا سن سیکھنے جائیں تو چیلہ بننا ضروری ہے۔ اہنسا کے استاد مہاتما گاندھی مانے گئے ہیں۔ فلسفہ کے اُستاد رادھا کرشنن۔ علم سیاسیات کے تو کئی استاد ہیں۔ ارسطو سے لے کر مارکس تک، بنرجی سے لے کر پٹابھی تک، سٹالین سے لے کر لن پاؤ تک سب ہی استاد ہیں۔ چند استادوں کے نام سے جوش ابھرتا ہے مثلاً سوبھاش بوس، بھگت سنگھ جو آزادی کی جدوجہد کے معمار واستاد شمار کیے جاتے ہیں۔ بعض قومی یک جہتی، مذہبی رواداری کے علم بردار دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی چند لوگوں کے نام لیتے ٹھنڈی لہریں دل میں تھپیڑے مارتی ہیں جیسے مہاتما گاندھی، ونوبا، جے پرکاش نارائن جیسے چند لوگوں کی سوانح پڑھتے پڑھتے جذبہ غم گساری پیدا ہو جاتا ہے صبر و تحمل کی کیفیت آجاتی ہے۔

لیڈر ہو یا پلیڈر، چیلہ ہو یا شاگرد، ٹیچر ہو یا پروفیسر، چمار ہو یا معمار، پیشہ ور ہو یا محنت کش، چور ہو یا ڈاکو ہر ایک کا ضرور ایک اُستاد ہوتا ہے۔ تعلیم کے احاطہ میں معلم ہو سکتا ہے۔ دوسرے احاطوں میں افسر مجاز ہو سکتا ہے۔ تھوڑی بہت جمعداری کر لیجئے تمغہ استادی حاضر ہو جاتا ہے۔

سنا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے استاد برسوں پوجا پاٹ کرتے تھے۔ تپسیا کرتے تھے۔ ان کے غصہ سے آگ بھی لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ لوگ رقم، پھول، کھانے دانے لے جاتے تھے۔ داخلہ کا بھی امتحان، داخلہ ملنے کے بعد والدین

سے ملنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ناگارجنا کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ گرد ایک احاطہ میں بیٹھتا تھا۔ یہ مسند کے مانند تھا۔ اس کے اطراف دور دور حلقوں میں چیلے بیٹھ جاتے تھے۔ بغیر اشنان کے چیلہ احاطہ میں ہی میں نہیں آتا تھا۔ نلندا تکسلا کی حالت بھی تو ایسی تھی۔ استاد کی بھی اس زمانہ میں خواہشیں زیادہ نہیں تھیں کیونکہ گرانی نہیں تھی، کرایہ مکان نہیں تھا۔ تنخواہ کی فکر نہیں تھی، بچے تو تھے نہیں استاد کے۔ چیلے سب کام کر ڈالتے تھے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ استادوں میں بھی انقلاب آیا۔ کردارسازی میں محنت لگی۔ وقت کی کروٹوں میں کئی انسان گھلتے چلے گئے۔ خوشیاں کم مصیبتیں زیادہ ہوتی گئیں۔ سماج میں اگر کوئی مفت میں سہہ لیتا ہے تو وہ استاد ہی دکھائی دیتا ہے۔ خموشی سے سہہ لیتا ہے۔ دکھ کی دوا اگر کڑوی ہوتی ہے تو بھی گنے کے رس کے مانند پی لیتا ہے۔

آیئے کچھ استاد کی جھلکیاں دیکھیں۔ ابتدائی تعلیم میں تو استاد کو رعب دار ہونا پڑتا ہے کیونکہ بچوں پر مہر لگنا چاہیے ورنہ حصول حروف تہجی ندارد۔ چند سال پہلے تو ریت میں حروف لکھانے کا رواج تھا۔ زمانہ میں تبدیلی آ گئی اب تو سلیٹ پر لکھنا آ گیا ہے۔ شہر میں تو کاغذی سلیٹ آ گئے ہیں خود بہ خود حروف مٹتے ہیں املا لکھنے میں دیر ہو جائے تو آج کل مار بھی نہیں سکتے۔ سمجھا بجھا کر ٹھیک ٹھاک کر دینا چاہیے۔ اگر تھپیڑ بھی مار دے تو قصہ طولانی ہو جاتا ہے۔ پولس میں رپورٹ درج ہو جاتی ہے۔ کارروائی اسمبلی تک پہنچ جاتی ہے۔ استاد کا اضافہ سندریجی رک جاتا ہے۔ استاد کے بچوں کو فاقہ کرنے کی نوبت آ جاتی ہے۔ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ لہٰذا بغیر مارے حروف سکھانا ایک فن ہے استاد کا۔ کام تو کئی کرنے پڑتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے گاؤں اور شہر میں ہفتے منائے جاتے ہیں مثلاً منصوبہ بندی کا ہفتہ، ہفتہ اطفال، ہفتہ تحفظ جنگلی جانوران وغیرہ شعور پیدا کرنے کے لیے تو جلوس و جلسوں کی تو ضرورت ہے جلوس میں کون آتا ہے۔ ایک اعلان سے استاد بچوں کی سمت نکل پڑتے ہیں۔ ننھے منے اچھے اچھے پوشاک پہن کر بن ٹھن کر سڑک پر قطار باندھ کر چلے آتے ہیں۔ سرکاری مدارس کے بچے، خانگی مدارس کے بچے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ بچے جے جے کار کرتے ہیں۔ چاکلیٹ، شیرینی کھا لیتے ہیں۔ ڈرامے دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن گھر جاتے وقت بچوں کو تکلیف یکھنے کی رہتی ہے۔ استاد تو ٹھیکہ دار نہیں"۔ یوم استاد تو ہر سال کا مشاہدہ ہے۔ اس دن تو استاد سے زیادہ کوئی خوش نہیں۔ ہر لیڈر استاد کی تعریف کرتا ہے۔ یوم استاد کے ٹکٹ استاد بھی خرید لیتا ہے۔ قوم کے لیے وقف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہر ایک استاد کو والمیکی، گاندھی، ارسطو، راجندر پرشاد، رادھا کرشنن، ذاکر حسین کہا جاتا ہے۔ اچھے اوصاف پیدا کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ کم تنخواہ پر کام کرنے کا جذبہ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ "سماج کا ہر کام استاد ہی کر سکتا ہے"۔ کا نعرہ دیا جاتا ہے۔ "یوم ختم ہوا تو پلاٹ فارم غائب۔ دوسرے دن استاد اگر بازار سے بھی گزرے تو کوئی دیکھ نہیں پاتا۔ واہ کیا قدر ہے استاد کی سماج میں

استاد کے بھی اوصاف و عادات کچھ ہوتے ہیں۔ ہر ایک استاد کا تکیہ کلام ہوتا ہے۔ چند استاد تو "جو ہے" ہزار بار استعمال کر لیتے ہیں ایک ہفتہ میں۔" ارسطو ایک مضمون پر تقریر کر رہے ہیں تو چند استاد تو "جو ہے"

ہزار بار استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک ہفتہ میں از سر نو ایک مضمون پر تقریر کر رہے ہیں تو سو بار کہہ رہے ہیں "ہم دیکھتے ہیں" یہ تکرار لفظی بڑی گراں گزرتی ہے "یوسی" کا معمال تو انگریزی پڑھانے والے استاد کا ہوتا ہے۔ منی ماکیم نے تو استادی کی عجیب کیفیت بنائی ہے۔ بعض استاد جیب میں مونگ پھلی بھرے ہوئے سبق پڑھاتے ہوئے چٹ چٹ کرتے ہیں۔ مرنے بھی کھالیتے ہیں۔ اولاد کی بھی کمی نہیں۔ تعطیلات کی افراط سے اولاد کی افزائش ہو جاتی تو مہینے پڑھاتے ہیں تو گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ضبط نفس کا سبق پڑھا لیتے ہیں۔ لیکن یہ تو خاندانی منصوبہ بندی کا دور ہے۔

امتحان کا زمانہ بھی واقعی استاد کے لیے معرکہ آرائی کا وقت ہے۔ ان کے پاس کوئی اوزار نہیں ہتھیار نہیں۔ اخلاق ہی ان کا نگہبان ہے۔ امتحان گاہ میں مدبر کی طرح رہنا پڑتا ہے۔ طلبہ و بدبہ کے ساتھ امتحان کے کاغذات چھیننا پڑتا ہے۔ ذرا کمزوری دکھائی تو شام تک ٹولی سے پٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ پیشاب خانے کے لیے تو پولس کی نگرانی نہیں چل سکتی۔ کچھ غلطی اگر استاد کر جائے تو اس کے خلاف رپورٹ درج ہو جاتی ہے۔ تحقیق کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا ہے کہ شاگرد کو بھی خاصی نوکری مل جاتی ہے اور استاد کی کچھ رقم پنشن سے کٹ جاتی ہے۔ لیکن استاد کا فرض ہے کہ صبر و تحمل سے کام لے۔ دکھ کو خوشی سے سہہ لے۔

تہوار ہو یا عید استاد کو ہونٹوں پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اولاد زیادہ ہونے پر کوسنا نہیں چاہیے۔ پھٹے کپڑے پہننا ہے نہ قیمتی کپڑے۔ سیٹھ کے پاس سے ادھار لاتا بھی ہے تو ہر مہینے کچھ نہ کچھ جمع بھی کراتا ہے۔ ایک بچہ تو ہمیشہ شیر خوار رہتا ہے۔ تمثیلی استاد بننے کے لیے تندرست رہنا چاہیے۔ سرکاری دواخانہ کے کیوں میں کھڑے رہ کر اولاد اور بیوی کے لیے دوا لا لینا چاہیے۔ سماج میں عاقلانہ گفتگو کرنا چاہیے۔ محلہ میں کچھ ہو جائے، شہر میں یا دیش میں کوئی حادثہ ہو یا ترقی استاد منہ نہیں موڑ سکتا۔ اپنا پیام دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ شاگردوں کی پیڑھیاں اتنی ہو جاتی ہیں کہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ شناخت اگر نہ کر سکے تو نام پوچھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ ہنس مکھ چہرہ بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ استاد کو کوئی مغرور شاگرد سلام نہ بھی کرے تو فخر سے کہنا چاہیے کہ فلاں شاگرد ڈاکٹر ہے۔ انجینئر، گتہ دار، ماہر فلکیات ہے وغیرہ۔

استاد کے تقرر کے لیے تو کئی شرائط ہیں۔ قناعت پسندی، اعتدال، صبر و تحمل، عجز و انکساری، مدبری، سیاست میں غیر متعصبانہ ذہنیت، اقتصادی حالت بھی ٹھیک رہنا غرض تمام شرائط کی خانہ پری تو شاید کوئی کر سکے۔ لیکن تمام خواہشات پر تو قابو خدا ہی کا ہوتا ہے۔ تمام حادثات سے تو وہی واقف ہے تمام کے اوصاف کا تو وہی شناسا ہے۔ ایک بات تو سچ ہے کہ استاد کے شاگرد کم سے کم اس کے مرنے کے بعد بیوی بچوں کے لئے تو وظیفہ کی رقم دلواتے ہیں۔ چندہ جمع کر کے فنڈ اکٹھا کرتے ہیں۔ آسمان سے استاد غائبانہ طور پر اپنے شاگردوں کو، بیوی کو، بچوں کو خوش رہتے ہوئے دیکھ پاتا ہے۔

آر۔ یو۔ خان (اکولہ)

مکرمی

آداب قبول فرمائیے۔ یوں بھی آپ اداب قبول فرمالیتے کیونکہ "وعلیکم آداب" قسم کی کوئی ترکیب ابھی تک دریافت نہیں ہوئی اس لیے "راقم" قبیلہ کے لوگ "آداب" کی شاٹ مارنے لگے ہیں تاکہ یہ گیند فریق مخالف کی کورٹ ہی میں گر پڑی رہے۔ فریق مخالف اگر ایڈیٹر ہو تو وہ بڑی رعونت کے ساتھ "Now the ball is in my court" کہہ کر واقعی خوش ہوتا ہے اور قلم کار بغلیں بجاتا ہے۔

"چمکیلا اندھیرا" پابندی سے مل رہا ہے۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ اس دور میں جبکہ اُردو قارئین کی "قلت" اور لکھنے والوں کی "کثرت" ہے۔ آپ اندھیرے کو چمکیلا بنانے کی سعیِ ناکام کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ قارئین میں ایسے صاحب ذوق موجود ہیں کہ جو "بہ پاکٹ خود" رقم صرف کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یہی لوگ صحیح معنوں میں اردو زبان و ادب کی خدمت میں فراخ دلی، تن دہی اور کفایت شعاری" دکھلاتے ہیں۔ غرض ایک ہی رسالہ کئی افراد بلکہ کئی ارکان خاندان حتیٰ "پالنے میں کھیلنے والے" بھی "چاٹ" ڈالتے ہیں۔ ان پوتوں کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں (کیوں کہ یہی کل کے قاری بنیں گے) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ پرچہ اپنے مالک کے پاس اس صورت میں واپس آتا ہے کہ پرچہ کا اصلی مالک یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کہیں یہ موہن جوداڑو یا ہڑپا دور کی کوئی یادگار تو نہیں اور اس موضوع پر ریسرچ کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے شریف الطبع قسم کا خریدار آئندہ ماہ پھر ایک رسالہ خریدتا ہے اس لیے اردو رسائل کے تمام مدیران (جن میں آپ بھی شامل ہیں) کو ہم یہ مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے رسالوں کے سرِ ورق پر سب سے زیادہ کثیر الاشاعت کی بجائے انگریزی زبان میں "Largest circulated in India" تحریر کریں۔ اس کا دوہرا فائدہ ہے۔

اول تو یہ ہے کہ صحافت کے جھوٹ کے گناہ میں ایک فیصد تخفیف ہو جائے گی، دوم یہ کہ لوگ اردو والوں کی انگریزی دانی سے متاثر ہوں گے۔ کیونکہ انگریزی زبان کا اثر تو "ابھی تک" لوگوں پر پڑتا ہے۔

گذشتہ ماہ کے شمارے میں "فکر تونسوی" کا انشائیہ "صدر یا غدر" بے حد پسند آیا (اگر پسند نہ بھی آتا تو ہم کیا بگاڑ سکتے تھے، شائع تو ہو گیا تھا) اسی طرح "مرغا صنم کوئی" نئی نظم "مچھر کی کافی آنکھ" بے حد پسند آئی۔ اس نظم میں اتنی نفسیاتی پیچیدگیاں ہیں کہ تنقیدی جائزہ لینے والے کا "خارجیت اور داخلیت" کے چکر میں پڑ کر وزیر "خارجہ" اور وزیر "داخلہ" بن جانا یقینی ہے (یوں کسی "اہل خانہ" یا "اڑوس پڑوس" والے گھن چکر سمجھنے میں دیر نہیں کرتے) رسالہ کا سرورق تو بہت ہی دیدہ زیب ہے۔ جوں ہی میں نے رسالہ ہاتھ میں اٹھایا آنکھیں بغیر عینک ہی کے "چمک چمک" گئیں۔ اگلے شمارہ کا بڑی بے چینی سے انتظار رہے (بشرطیکہ اسی طرح روانہ کریں جیسا کہ آپ "خاکسار" کے لیے ہمیشہ سے روانہ کرتے ہیں یعنی بلا قیمت)

ارے ہاں بھئی میں تو بھول ہی گیا تھا۔ پچھلے دنوں آپ کا مکتوب بھی ملا تھا۔ مگر کیا بتاؤں ادھر کچھ ایسا مصروف رہا کہ جواب دینا یاد ہی نہ رہا۔ آپ نے فرمائش کی تھی آپ کے سالنامے کے لیے کوئی تازہ ترین تخلیق روانہ کروں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میں پروفیسر ہوں "پڑھنا اور پڑھانا" میرا مشغلہ ہے (پروفیسر پڑھاتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں) اس لیے لکھنے پر کوئی توجہ نہ دے سکا۔ اس کوتاہی کی تلافی اس طرح کر رہا ہوں کہ ایک "نومولود" ادیب کی تخلیق روانہ کر رہا ہوں۔ موصوف میرے شاگرد ہیں ۔ یہ میری ہی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجھے تعارفی خط کے ساتھ (جو درپردہ سفارشی خط ہے) روانہ کرنا پڑ رہا ہے۔ میرے یہ شاگرد اپنے ایام طالب علمی میں (جنہیں میں ہونہار بھی کہا کرتا تھا) پیشہ تعلیمی میں میرے مددگار بھی رہے ہیں۔ یہ راز کی بات ہے کسی سے تذکرہ مت کیجئے۔ یعنی جب کبھی مجھے پیریڈ نہ لینا ہوتا یا یہ الفاظ دیگر کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے کو طبیعت چاہتی تو (اور اکثر یہی ہوتا تھا) میں ان صاحب کو اپنی تازہ ترین تخلیق سنانے کے لیے کھڑا کر دیتا۔ پوری کلاس بظاہر "ہمہ تن گوش" نظر آتی تھی اور بہ باطن "بے ہوش" ہوتی تھی اور میں نے بھی کبھی اپنے آپ کو کلاس سے علیحدہ اکائی نہیں سمجھا۔ برا ہو گردش ایام کا کہ میرے برے دن اس سے دیکھے نہ گئے اور یہ حضرات امتحان کے سیل رواں میں خس و خاشاک کی طرح بہ نکلے اگر وہ تین سال اور کالج میں رہتے تو نہ صرف کالج میں میری زندگی آرام سے گزرتی بلکہ بازار میں جاکر" دال آٹے کے بھاؤ معلوم کرنے سے بچ جاتا۔ ان کے افسانے کی اشاعت کے لیے آپ کو اس لیے زحمت دے رہا ہوں کہ اب میری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بس بات اتنی ہوئی تھی کہ میری زبان سے کسی محفل میں نکل گیا تھا کہ مدیر "اندھیرا اجالا" میرے "حلقہ بگوشوں" میں سے ہیں اور جو مضمون یا افسانہ چاہوں اس رسالہ میں چھپوا سکتا ہوں۔ مجھے کیا علم تھا کہ حلقہ بگوشی کا یہ حلقہ میری عزت و ناموس کی گردن کے درپے ہو جائے گا۔ ویسے اس افسانہ کی اشاعت میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ کو معاوضہ دینا نہیں پڑے گا۔ آپ جو کاپی ان صاحب کو روانہ کریں گے وہ مجھے روانہ کر دیجئے۔ انہیں پہلے ہی معلوم ہو گا کہ افسانہ شائع ہونے والا ہے یہ اپنے شہر کے ایجنٹ کے پاس پانچ کاپیوں کا آرڈر لکھا چکے ہوں گے ایک اپنے لیے چار اپنے دوستوں کے لیے جو شہر کے مختلف کونوں میں رہتے ہیں تاکہ ان کا افسانہ کثیر تعداد میں احباب

پڑھ سکیں۔ اگر افسانہ نہ بھی پڑھ سکیں تو افسانہ کے ساتھ ان کا نام دیکھ کر افسانہ نگار تو تسلیم کر لیں۔ اس سے بھی رسالہ کا یعنی آپ کا ہی فائدہ ہے چاہے اس کی حیثیت ضمنی و عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی کہ "چمکیلا اندھیرا" کا سرکیولیشن بڑھ جائے گا۔ اس افسانہ کی اشاعت میں آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی (یعنی آپ کو پڑھنا نہیں پڑے گا' میرا سفارشی خط جو ہے) زحمت تو بے چارے کاتب کو ہوگی جو اسے پڑھے گا مگر آج کل کاتب بھی "سہل الحصول" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کتابت کے وہ جوہر دکھلاتے ہیں کہ "اصلاح" کا گمان ہوتا ہے اور فاضل افسانہ نگار کو "اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں" کا مزہ آجاتا ہے۔ پڑھنے والوں کا کلیجہ الٹ کر منہ کو آتا ہے۔

افسانہ کے تعلق سے اتنا مختصر سا تعارف میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اشتیاق دیدنہ بڑھا دے اور آپ کی تصویر کی فرمائش نہ کر بیٹھیں۔ اس لیے آپ کو اور بھی بتا دوں کہ آغازِ شباب کی کوئی تصویر اس نوجوان افسانہ نگار کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے اس سلسلے کو یہیں ختم کرتے ہوئے آپ کو قارئین اور قلم کاروں کے مابین چھوڑتا ہوں۔ بھابی جان (ایڈیٹر کی بیوی سب کی بھابی) کی خدمت میں سلام علیک ' بچوں کے لئے بجز دعا و پیار میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو موقع دیجیے۔ خدارا خریدار بڑھانے کے لیے مت لکھئے۔ کسی رسالے کے خریدار بڑھانا اور چندہ جمع کرنا یہ دونوں کام ذرا مشکل ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں لوگ اتنے سیریس (serious) ہو گئے ہیں کہ قطع کلامی کر کے بدکلامی پر اترآنے سے بھی نہیں ڈرتے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تعلقات منقطع کر لیتے ہیں اور اس سے ہمارے سوشیل کنٹاکس social contacts خراب ہوتے ہیں۔

ہاں آئندہ ماہ بھی ایک کاپی بھیجنا مت بھولیے! مجھے آپ کی ادب دوستی اور ادب پروری پر ناز ہے۔

فقط آپ کا خیر اندیش
گمنام آفاقی بھوپالی
مورخہ ۱۲ راگست ۱۹۷۹ء

شاہنواز اشر

تاریخ عالم سے جنگ کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ کا حلیہ بنانے اور بگاڑنے میں جنگ نے نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ جن میں قابل ذکر مہابھارت کی جنگ سکندر بمقابلہ پورس مغلوں اور تاتاریوں کے حملے سے لے کر جنگ آزادی، ہند چینی و ہند و پاک جنگیں ہیں۔

ان فوجی جنگوں کے علاوہ ہم وقتاً فوقتاً ہڑتالیں، بند، گھیراؤ۔ مظاہرے اور فرقہ وارانہ وغیر فرقہ وارانہ فسادات کر کے اپنی اکتاہٹ دور کرتے رہتے ہیں۔ انفرادی یا تھاپائی اور تو تو میں میں ان کے علاوہ ہے۔
جنگ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جیسے سرد جنگ، گرم جنگ، جنگ پخ پخ، جنگ دھم پیل، نٹھ بند لڑائی اور پتھراؤ وغیرہ۔

سرد جنگ:

اس جنگ میں عموماً ایک دوسرے کو گھور کر دیکھنے آنکھیں لال پیلی کرنے اور ناک بھوں چڑھانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ در پردہ دشمن کو نقصان پہونچانے کی بھی حسب توفیق کوشش کی جاتی ہے۔

گرم جنگ:

اس جنگ میں سرد جنگ کے برعکس دو چار بیچ بچاؤ کرانے والوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے بصورت دیگر فریقین ایک دوسرے سے اتنی زور سے چپٹ جاتے ہیں کہ گویا کہہ رہے ہوں "اب کے گر بچھڑیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں" ان سورماؤں کو الگ بھی کر دیا جائے تو ایک دوسرے کی طرف لپکنے میں اتنی بے تابی دکھاتے ہیں جتنی شاید لیلیٰ مجنوں نے بھی نہ دکھائی ہوگی۔

جنگ پخ پخ :

اس جنگ کا دارومدار زبان پر ہوتا ہے۔ اس میں طعنے نت نئے القاب اور دھمکیوں کا بڑی فیاضی سے استعمال ہوتا ہے۔

لٹھ، سوڈا واٹر اور پتھر پھینک جنگ :

جنگ کی یہ سب سے خطرناک شکل ہوتی ہے اور زمانہ قدیم کے طریقوں پر اکیلے یا اجتماعی طور سے لڑی جاتی ہے مقابلہ چونکہ دوبدو ہوتا ہے لہٰذا ہاتھ پاؤں ٹوٹنا یا سر پھوٹنا عام سی بات ہے۔ اگر خون کے فوارے نہ پھوٹیں تو بے کیف سمجھی جاتی ہے۔ اس میں حریفوں کے علاوہ کبھی کبھار کسی شامت کے مارے تماشائی کا بھی پوسٹ مارٹم ہوجاتا ہے اسی لیے شرفا اور دانا قسم کے لوگ موقعہ واردات پر ٹھہرنے سے گریز کرتے ہیں۔

جنگ کی ایک اور قسم ہوتی ہے جسے خانہ جنگی کہا جاتا ہے یہ عموماً الیکشن، لسانی مسائل مذہب اور قومیت کے معاملے پر لڑی جاتی ہے خانہ جنگی پر اکثر بلکہ بیشتر میاں بیوی بھی مشق کیا کرتے ہیں جس میں مشترکہ شاہکار یعنی بچوں کا حال زار قابل رحم ہوتا ہے۔ امی ابو میں گالیوں کے تبادلے اور دونوں خاندانوں کی ہسٹری کا حال بچوں کی جنرل نالج (عام معلومات) میں اضافہ کرتا ہے۔

جنگ کے موضوع پر عالمی تجربہ زر، زن اور زمین تک محدود ہے۔ ان میں دیوالیہ حکومتیں زر کے لیے اور جن حکومتوں میں فیملی پلاننگ کا پروگرام ناکام ہو جاتا ہے وہ زمین کے لیے جنگ کرتی ہیں۔ اس طرح آبادی بھی خاصی کم ہو جاتی ہے۔ گویا آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ باقی رہا زن کا مسئلہ تو خیر چھوڑیئے (ہم اپنی بیگم سے ڈرتے تو نہیں مگر اپنی عافیت کسے عزیز نہیں ہوتی) ہم آپ کو جنگ برائے زن کی بجائے جنگ زنزنی کے بارے میں بتلاتے ہیں۔

یہ جنگ متوسط اور نچلے طبقے کی ان پڑھ یا نیم تعلیم یافتہ بیبیوں کے مابین ہوا کرتی ہے۔ کبھی نل کے پانی کے لیے کبھی بچوں اور دیگر معاملوں میں ویسے اس جنگ کے لیے وجہ ضروری نہیں۔ کسی بھی بات کا بتنگڑ بنا کر بہ آسانی لڑا جا سکتا ہے۔

ایسی جنگوں میں فریقین پہلے پہل گھر کے مورچوں تک محدود رہ کر زبانی گولہ باری کرتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس بمباری میں شدت آجاتی ہے۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو کر منہ سے کف جاری ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی گھر کی چیزیں بڑی بیدردی سے ادھر ادھر پھینکی جاتی ہیں اس۔ اس شغل سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے تو گھر سے نکل کر دوبدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے گالیوں کا اسٹاک ختم ہو جانے کے بعد فحش الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔ کئی اسکینڈل ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض ہر ممکن طریقے سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی چوڑیاں چڑھائی جاتی ہیں (مردوں کی آستینوں کی طرح) تو کبھی بالوں کو کس کر باندھا جاتا ہے۔ ہاں تو جنگ "زنزنی" کے عروج پر کوئی سادہ لوح بی بی ثالث بن کر میدان میں اترے تو جنگ میں اور بھی شدت آجاتی ہے ویسے اکثر پڑوسنیں ایک دوسرے کے اسکینڈل غور سے سنتی ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔ رفتہ رفتہ گلا خشک ہونے پر جنگ میں سستی آنے لگتی ہے کچھ اور پڑوسنیں بھی یہ دیکھ کر بیچ بچاؤ کرانے لگتی کہ بس بہت ہو گیا آخر ہیں گھر کے مقدس کام بھی تو کرنے ہیں۔ فریقین کو گھر لا کر ٹھنڈا پانی پلایا جاتا ہے تاکہ انرجی کی کمی کا محنت پہ کوئی اثر نہ ہو۔

نظام الدین نظام۔ بمبئی

خوش رہنے کا فن

فراق کہتا ہے۔

میزانِ نشاط و غم میں صدیوں تل کر
ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

ہمارے چند دوستوں کو اس خیال سے صدفی صد اتفاق ہے۔ جبکہ ہم اس بات سے مصلحتاً بھی متفق نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حیات میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ غم نام کی کسی بے ہودہ شئے کا اس دھرتی پر وجود ہی نہیں بلکہ اس باغِ ارض میں تو قدم قدم پر انبساط و مسرت کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ اپنے ذہن کو فیصلوں کا اختیار دے دیں اور دل سے بغاوت کریں۔ کیونکہ بقول نریش کمار شاد۔

کچھ دماغوں میں غم بھی ہنستے ہیں
کچھ دلوں میں خوشی بھی روتی ہے

اگر یہاں " دماغ " اور " دل " پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ دماغ کے فیصلے خوشی کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو چند گر سکھائیں، خوش رہنے کے فن میں طاق ہونے کے لیے سب سے اول بات تو یہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہر شئے پر مثبت انداز سے نظر ڈالی جائے مثلاً:

اگر آپ کے دانت سڑنے لگے ہوں تو غم نہ کیجئے بلکہ خوشی منایئے کہ آپ گوشت جیسی قیمتی مد پر خرچ کرنے سے اور اب مٹھائیوں کے لیے آپ کی گرہ سے کبھی کچھ نہ جائے گا ــــــ یا اگر آپ کے گھر بن بلائے مہمان ٹپک پڑتے ہیں تو ہراساں نہ ہو کر اس تصور سے شاداں ہو جائیے کہ جب دو دو وقت کے کھانے کے بعد آپ کے گھر میں کچھ نہ بچے گا تو مہمان پہ کیا گذرے گی! ــــــ کبھی ایسا ہو کہ آپ کا کوئی بہت ہی قریبی دوست ناراض ہو جائے تو افسردگی کی بجائے

شادمانی کا احساس پیدا کیجئے یہ سوچ کر کہ اس دوست کی خاطر مدارات سے آپ ہمیشہ کے لیے چھٹکارہ پا گئے۔ یا کسی شام آپ کے سر میں درد ہونے لگے تو مضطرب نہ ہو کر پرسکون رہنے کی کوشش کیجئے۔ یہ سوچ کر کہ سر کے درد پر ہی بلا ٹلی ورنہ ہمارے دیش میں نہ جانے کتنے شاعر وادیب " درد دل" درد جگر اور نہ جانے کن کن دردوں میں مبتلا ہیں۔ یا کبھی ایسا ہو کہ آپ کا کوئی بھانجہ یا بھتیجہ آپ سے قرض لے کر ادا کرنا بھول جائے تو تاسف کیوں؟ یہ تو مقام مسرت ہے کہ آپ کے رشتہ داروں میں بھی لیڈروں جیسی صفات موجود ہیں۔ اسی طرح اگر کبھی آپ کا محبوب وعدہ کر کے مکر جائے تو غم زدہ مت ہو بلکہ خوشیاں منائیے کہ آپ کے محبوب میں بھی کلاسیکل شاعری کے محبوب جیسی تمام باتیں پائی جاتی ہیں ـــــ یا اگر آپ طالب علم ہیں اور امتحان میں ہر بار فیل ہونا آپ کا مقدر بن چکا ہے۔ (یا آپ نے بنالیا ہے) بہر کیف غم ہرگز نہ کیجئے۔ علم کی طلب آپ کو اسی درجے میں روکے ہوئے ہے۔ تعلیم سے متعلق آپ کی یہ دلچسپی مستقل مزاجی اور استقامت آپ کے لیے باعث مسرت ہونے چاہئیں ــ یا اگر آپ طالب علم نہ ہو کر تجارت پیشہ ہیں اور کسی بڑے نقصان سے ہمکنار ہو گئے ہیں تو دکھ کیوں؟ اب تو شکر ہی شکر ہے، بھلا آپ کے دیوالیہ ہو جانے کے بعد کون ہے جو آپ سے کسی قسم کے تقاضے کی جسارت بھی کر سکے گا؟　　اگر آپ ڈاکٹر ہیں اور آپ کی "پریکٹس" کی تاب نہ لا کر مریض چل بسا تو افسردگی بے کار ہے۔ خوش ہو جائیے اس خیال سے کہ اس انتشار وکرب کے دور میں آپ نے کسی کو سکون (بلکہ ابدی سکون) کا راستہ بتا کر گویا خدمت خلق کی ہے اور خدمت خلق سے زیادہ لائق تحسین کوئی عمل نہیں۔ اسی طرح ایک مثال سمجھتے چلئے کہ اگر آپ کار ڈرائیور یا لاری ڈرائیور ہیں اور کوئی شخص آپ کی گاڑی سے خواہ مخواہ ٹکرا گیا تو متفکر نہ ہو کر خوش مزاجی کا اظہار کیجئے کیونکہ آپ کی زندگی میں جمود نہیں، جمود جو موت کا دوسرا نام ہے　اگر آپ شاعر ہیں اور بدذوق سامعین" آپ کے اشعار پر داد نہ دیں تو دل چھوٹا نہ کیجئے۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے، دراصل آپ کے اشعار کو سمجھنے کی صلاحیت "عوام" میں نہیں جیسا کہ غالب کو ان کے دور میں عوام نے نہ سمجھا آپ کو لوگ نہیں سمجھتے ـــــ اگر آپ ادیب ہیں اور اپنے غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ بغل میں دبائے گھومتے رہتے ہیں مگر کوئی پبلشر انھیں پڑھنے تک کو تیار نہیں　" شائع کرنا تو کجا؟" اس عالم میں غمزدہ ہو کر آپ خود پر ظلم کریں گے۔ آپ کو تو بے حد نازاں اور شاداں ہونا چاہیئے اس تصور کے ساتھ کہ آج کل" بازاری ادب " کا زمانہ ہے" معیاری ادب کون پڑھتا ہے؟"

اتنی ڈھیر ساری مثالوں کے بعد اب تو آپ کی "سمجھ دانی" میں یہ بات اچھی طرح آگئی ہوگی کہ خوش رہنے کا فن کوئی ایسا مشکل کام نہیں، بس ذرا حوصلے کی ضرورت ہے، آپ اس فن میں طاق ہو جائیں گے اور غم پاس نہ پھٹکے گا۔

ستریپٹ حیدرآبادی

پھیپٹ جو ہے پیدائشی بے نام و نشاں ہے　　وہ قبل ازیں تھا نہ کہیں بعد ازاں ہے

تھا پہلے بھی گمنام، نہ اب نام و نشاں ہے　　میں ڈھونڈ رہا ہوں کہ مری قبر کہاں ہے

سمجھے نہ کوئی مجھ کو یہ بے نام و نشاں ہے　　تاجر ہوں، میری چوری کے جوتوں کی دکاں ہے

پوڈر کی، لپ اسٹک کی یہ تاثیر عیاں ہے　　معصوم و کنواری ہے جو چھ بچوں کی ماں ہے

جوتے نہیں کھاتے سبھی اظہارِ وفا پر　　ہر شخص کی قسمت میں یہ اعزاز کہاں ہے

وہ عشق ہے پہلا سا نہ وہ عشق کے قصے　　وہ آگ ہے پہلی سی نہ پہلا سا دھواں ہے

بنتا نہیں اب صید کوئی کبر سنی میں　　ہم خود ہیں وہ صیاد نہ وہ تیر و کماں ہے

اب حسن و محبت کا نہیں ذکر کہیں بھی　　مجنوں کا وہ باوا ہے نہ لیلیٰ کی وہ ماں ہے

ملتا ہے یہیں پینے کو کیوں جاؤں کلب تک　　گھر سے مرے نزدیک گڑمبے کی دکاں ہے

آتی ہے جوان بن کے یہ دنیا مرے آگے　　معلوم ہے مجھ کو یہ کئی بڈھوں کی ماں ہے

ستریپٹ مرے آگے کوئی اب ٹِک نہیں سکتا
بڈھا ہوں تو میں کیا، میری بیوی تو جواں ہے

غزل

اشرف مالوی

اب نہ شکوے نہ شکایات چلو سو جائیں　　وقت کم ہے نہ کرو بات چلو سو جائیں

جاگ کر ہم نے گذاری ہیں ہزاروں راتیں　　ہو گئی آج ملاقات چلو سو جائیں

صبح جی بھر کے جو کہنا ہے وہ کہنا لیکن　　کسمساتی ہے جواں رات چلو سو جائیں

چاٹے اک پل کے میں ہوٹل سے ابھی آیا ہوں　　سرد پڑ جائیں نہ جذبات چلو سو جائیں

سن رہے ہیں یہی ہم دیر سے چپکے چپکے　　کہہ رہی ہے یہ حسیں رات چلو سو جائیں

صرف وعدے پہ ابھی میرے بھروسہ کر لو　　بعد میں دیکھنا سوغات چلو سو جائیں

سازگار آج کے حالات گنوا دیں کیسے　　جانے کل کیسے ہوں حالات چلو سو جائیں

نیند غالب کو نہیں آتی تھی آتی ہے ہمیں　　اپنے اپنے ہیں خیالات چلو سو جائیں

یوں نہ تم جاگ کے اس رات کی توہین کرو　　ضد نہیں کرتے بڑی بات چلو سو جائیں

قیس فرہاد مہیوال نہ مل پائے کبھی　　ہو گی ان سب کو ابھی مات چلو سو جائیں

آج اشرف کے خیالات میں طغیانی ہے
روز ہوتی نہیں برسات چلو سو جائیں

ڈاکٹر عبدالمغنی
(پٹنہ)

ادب میں ظرافت کی اہمیت اور اس کے عناصر

عام طور پر ظریفانہ ادب کو غیر سنجیدہ اور تفریحی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال حقیقت کے خلاف ہے جس فن کار نے بھی سب سے پہلے ظریفانہ کلمات ادا کیے ہوں گے اس کا ایک تخلیقی مقصد ضرور رہا ہوگا۔ اور وہ اتنا ہی سنجیدہ ہوگا۔ جتنا کوئی سنجیدہ ادیب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ادب کو سنجیدہ اور ظریفانہ کے درمیان تقسیم کرنا صحیح نہ ہوگا۔ دونوں ہی قسم کی تخلیقات ادب ہیں اور سنجیدہ ادب ہیں، ان کے درمیان مقصد کا کوئی فرق نہیں، جو کچھ اختلاف ہے طریق کار اور اسلوب بیان کا ہے۔ ایک فن کار جب مظاہر حیات پر نظر ڈالتا ہے اور مسائل کائنات پر غور کرتا ہے تو اس کے ذہن میں جو تحقیقی تحریک ہوتی ہے وہ کبھی ظریفانہ رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی غیر ظریفانہ رنگ میں، اور رنگ کی یہ خصوصیت منحصر ہے ان مظاہر اور مسائل پر جو زیر نظر اور زیر غور آتے ہیں۔ ٹھیک جس طرح بعض مظاہر و مسائل المیہ اور بعض طربیہ ہوتے ہیں، اسی طرح بعض مزاحیہ بھی ہوتے ہیں، کسی واقعہ پر رنج و غم ہوتا ہے، کسی پر انبساط و نشاط اور کسی پر ہنسی آتی ہے۔ دنیا میں کچھ موضوعات ماتم کے لیے ہوتے ہیں، کچھ جشن کے لیے اور کچھ مذاق کے لیے۔ ایک بھونڈی اور بے ڈھب چیز یا احمقانہ حرکت پر مسکرانے اور قہقہہ لگانے کے سوا آدمی کر ہی کیا سکتا ہے؟

اس طرح دراصل یہ موضوع کا تقاضہ ہے جو بعض وقت اور بعض فن کاروں کو ظریفانہ ادب تخلیق کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس تقاضے کا اثر مختلف حالات میں مختلف فن کاروں پر مختلف طریقے سے ہوتا ہے۔ مضحکہ خیز یا بلا بے ہنسی مذاق کو تمام طور پر طنز و مزاح کا معیار سمجھا جاتا ہے، مگر ہجو ظرافت میں حماقتوں، خباثتوں اور شرارتوں کو

بھی لعن و طعن اور تنقید و ملامت کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ پھر ظریفانہ تخلیقات کا مقصد محض خوش وقتی نہیں ہے۔ ہجو و طنز کا مقصد احمقوں اور شریروں کی تنبیہ و اصلاح بھی ہے، جیسا کہ انگریزی ادب کے عظیم طنز نگاروں، ڈرائیڈن اور پوپ نے واضح کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب زندگی بے اعتدالیوں کا شکار ہونے لگتی ہے، سماج میں زیادتیاں بڑھنے لگتی ہیں، اور انسانیت کا وقار مجروح ہوتا نظر آتا ہے تو ادیب اور فن کار اس صورت حال کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں۔ احتجاج ہی کی شدت ادب و فن کی بعض ہیئتوں اور صنفوں میں کبھی تیر و نشتر اور کبھی کوڑا اور ہتھوڑا بن کر بے اعتدالیوں اور زیادتیوں پر برستی ہے۔ طنز و ظرافت کے اس مصلحانہ کردار کی بہترین مثال سوئفٹ کے افسانے اور برنارڈ شا کے ڈرامے ہیں جو عالمی ادب کے عظیم کلاسیکی اسی طرح تسلیم کیے گئے ہیں جس طرح شیکسپیر کی شاعری اور ٹالسٹائے کی ناول نگاری۔ اردو ادب میں بھی اکبرالہ آبادی کی اہمیت اسی طرح تسلیم شدہ ہے جس طرح اقبال کی عظمت۔ اس لیے کہ دونوں قسم کے فن کاروں نے اپنے اپنے وسیلۂ اظہار سے اپنے اپنے طور پر فنی تعمیری و تخلیقی کارنامے انجام دیئے اور دونوں نے اپنے مخصوص اسالیب فن کو زیادہ سے زیادہ حسین اور پر اثر شکل میں پیش کیا۔

اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ ظریفانہ ادب کے معیار تک پہنچنے کے لیے سوئفٹ، شا اور اکبر کی روشن کی ہوئی تخلیقی راہ پر چلنا ہوگا۔ لیکن غیر ظریفانہ ادب کے اعلیٰ معیار تک پہنچنے کے لیے شیکسپیر، ٹولسٹائے اور اقبال کے بنائے ہوئے فنی راستے پر قدم اٹھانا ہوگا۔ اعلیٰ معیار کے لیے صحیح منہاج ہر قسم کے ادب کے لیے ضروری ہے۔ درحقیقت یہ صحیح منہاج ہی ہے جو اعلیٰ ادب پیدا کرتا ہے، خواہ یہ منہاج ظریفانہ تخلیقات میں ملحوظ رکھا جائے یا غیر ظریفانہ تخلیقات میں۔ ایک تخلیق کا موضوع کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس کی ہیئت بھی کسی قسم کی ہو سکتی ہے، مگر ایک اعلیٰ فن پارہ بننے کے لیے تخلیق کو بلند فنی مقاصد کی تکمیل کرنی ہوگی جنہیں ایک فقرے میں تزئین حیات اور تشریح کائنات کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جو ادب زندگی کے ٹیڑھے میڑھے بھونڈے اور بے ڈھب گوشوں کو تراشنے کا کام کرتا ہے اسے تزئین ہی کا ایک عمل کہا جائے گا۔ یہی ادب اور زندگی دونوں میں ظرافت کا جواز، اعتبار اور استناد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی لفظ "وِٹ" (wit) اور اس کے عربی مترادف ظرافت کا مفہوم نکتہ سنجی بھی ہے خوش طبعی کے ساتھ ہی دانائی بھی ہے۔

ظریفانہ ادب کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس میں فنی معروضیت نہیں ہوتی، کچھ ادیب اور شاعر اس کے ذریعے صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کی ساری دل چسپی شخصی و ذاتی ہوتی ہے، وہ جن اشخاص سے خفا ہوتے ہیں انہیں اپنے کینے اور انتقام کا نشانہ بناتے ہیں، اسی لئے ان کے فن میں صرف تلخی و ترشی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک طناز ذرا سرکہ جبیں ہوتا ہے اور اس کی باتوں میں کڑواہٹ ہوتی ہے۔ لیکن کیا ادب صرف شیریں کلامی کا نام ہے، اس میں تلخ نوائی کی گنجائش بلکہ ضرورت نہیں؟ سفر حیات میں جہاں محمل کی گراں حُدی کی تیز خوانی کی متقاضی ہوتی ہے وہیں ذوقِ نغمہ کی کم یابی، تلخ نوائی کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ رہا اس تلخ نوائی میں تعصب کا سوال، تو کسی نہ کسی قسم کا تعصب ہر تخلیق میں ہوتا ہے۔ یہ تعصب (prejudice) دراصل

فن کار کا رویہ (attitude) ہے اپنے کسی بھی موضوعِ مطالعہ کے متعلق اب رویہ ہمیشہ موضوعی اور شخصی ہی ہوتا ہے۔ ایک فن کار کتنا ہی بڑا نظریہ اور اصول رکھتا ہو، موضوع کے متعلق اس کا مخصوص رویہ حالات وواقعات کے مقابلے میں اس کے انفرادی ردِ عمل ہی پر مبنی ہوتا ہے۔

ہاں یہ بات اپنی جگہ ہے کہ برخلاف غیر ظریفانہ ادب کے ظریفانہ ادب میں شخصیات ہی کو زیادہ تر اور خاص کر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ گرچہ افراد کی کردار نگاری، افسانہ، ناول اور ڈرامے کی بھی ایک خصوصیت ہے، لیکن طنز، ہجو، مزاح اور ظرافت کا موضوع بسا اوقات متعین اور مخصوص افراد ہی ہوتے ہیں۔ غیر ظریفانہ ادب کے کردار علامتی بھی ہوسکتے ہیں مگر ظریفانہ ادب کے کردار بالعموم واقعاتی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظریفانہ کردار ابتداً اور اصلاً فرد (individual) ہوتے ہیں اس کے بعد ہی ان کی حیثیت مثالی (type) کی بن پاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ظریفانہ شخصیت کے گوشے زیادہ ابھرے ہوئے ہوتے ہیں اور نتیجتہً ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ میاں آزاد، حاجی بغلول، چچا چھکن اور پیر کلو کی شہرت کا راز یہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک فنی نکتہ پر غور کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ کسی بھی فن کا مواد بہر حال گرد و پیش ہی سے ملتا ہے، موضوعات بنیادی طور پر ماحول ہی سے لیے جاتے ہیں۔ مزاح نگار بھی اپنے حلقۂ تعارف ہی کے لوگوں کو تختۂ مشق بنانے پر مجبور ہے، اور یہ لوگ کوئی ضروری نہیں کہ سراسر پرمذاق ہوں بلکہ نہایت سنجیدہ شخصیتوں کے بعض گوشے انتہائی پُر مذاق ہوتے ہیں۔ اگر اس طرح یا اس پڑوس کے شرفا پر حملہ ستم ہے تو اس میں ستم ظریفی کا پہلو بھی ہے، جس سے لطف لینے کے لیے ظاہر ہے کہ حسِ مزاح شرط ہے۔ جس کے بغیر تہذیب و شائستگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور ثقافت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اس حقیقت کا لحاظ ظریف کو بھی کرنا ہے، جسے مہذب سماج مشقِ ناز کی اجازت دیتا ہے، اور شریف کو بھی کرنا ہے، جس کی گردن پر خون دوعالم ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان مفاہمت کی بنیاد شائستگی ہے، جو فن اور تہذیب دونوں کا جواز اور معیار ہے۔

ظریفانہ ادب کے خلاف دوسرا بڑا الزام یہ ہے کہ یہ منفی اور تخریبی ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طنز و ہجو کا محرک منفی ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مقصود تو مثبت بھی ہوسکتا ہے۔ تخریب بلاشبہ بجائے خود کوئی پسندیدہ عمل نہیں، مگر یہ تعمیر کا پیش خیمہ بھی ہوسکتی ہے۔ کسی زمین پر کوئی کام کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کو صاف اور ہموار کیا جاتا ہے۔ کسی بھی اصلاح اور ترقی کا پہلا مرحلہ ایک قسم کی بت شکنی ہے، غلط تصورات اور غلط کار افراد پر تیرو تبر چلانے کی ضرورت بعض تعمیری مقاصد کے لیے بھی ہوتی ہے، زخم پر مرہم لگانے سے پہلے اس کے اندر سے فاسد مادّے کو نکالنا پڑتا ہے، اور یہ دونوں کام جرّاح ہی کرتا ہے۔ تزئینِ حیات تنقیدِ حیات کے بغیر ممکن نہیں۔ برنارڈ شا دنیائے ادب کا سب سے بڑا ظریف ہے اور بت شکن بھی اور سوئفٹ تو ایسا زبردست طناز ہے جو موجودہ انسانی حیاتیات ہی میں بنیادی انقلاب چاہتا ہے۔ لیکن یہ بہت بڑی جسارت ہوگی اگر ان دونوں کو تخریبی فن کار قرار دیا جائے۔ طنز و مزاح

کے پردے میں دونوں کی گہری متانت اور بصیرت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے ۔

اب تک میں طنز، مزاح، ظرافت اور ہجو کے الفاظ کسی خاص امتیاز کے بغیر استعمال کرتا رہا ہوں، اس لیے کہ عام طور پر اردو تنقید کی یہی روایت رہی ہے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے اور ہمارا ظریفانہ ادب بھی اتنا بالیدہ اور وسیع ہو چکا ہے کہ ادب میں ظرافت کے عناصر کا سراغ لگاتے ہوئے مذکورہ الفاظ کے اصطلاحی مضمرات کو واضح اور ان کے محل استعمال کو متعین کیا جائے۔ آج سے برسوں پہلے 'ہماری زبان' کے صفحات میں مذکورہ الفاظ کے مفہوم کی تعیین کے لیے ایک بحث چلی تھی جس میں راقم السطور نے بھی حصہ لیا تھا اور بالآخر اس وقت یہ بحث راقم ہی کے بیان پر ختم بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ پیشتر ملا ابن العرب مکّی کی طنز نگاری پر ایک مضمون میں بھی میں نے اس بحث کے کچھ اشارات درج کیے تھے۔ اب اس موقعے پر قدرے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ظریفانہ ادب کے خالق اور ناقد دونوں اپنی صنف ادب اور موضوع مطالعہ سے متعلق اصطلاحی الفاظ کا استعمال تعین اور قطعیت کے ساتھ کریں اور اس سلسلے میں ابہام و انتشار کی زیادہ گنجائش باقی نہ رہے۔

گرچہ ظریفانہ ادب کی روایت اردو نظم و نثر دونوں میں قدیم الایام سے قائم ہے۔ مگر اس ادب کی باضابطہ تنقید انگریزی کے زیر اثر شروع ہوئی۔ لہٰذا ظریفانہ ادب کے اولین ناقدوں نے اپنے بیانات میں بالعموم انگریزی ادب کی اصطلاحوں کے اردو ترجمے کیے۔ لیکن ان ترجموں اور ان کے محل استعمال میں کافی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف الفاظ کے معانی و مطالب ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لیے میں سب سے پہلے ظریفانہ ادب سے متعلق انگریزی کے اصطلاحی الفاظ اور لغوی اعتبار سے ان کے صحیح اردو مترادفات پیش کرتا ہوں:

ہجو Satire

مزاح Humour

طنز Irony

ظرافت Wit

عام طور پر اردو میں Satire کا ترجمہ طنز کیا گیا ہے اور مزاح و ظرافت کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے بلکہ اس معنی میں بسا اوقات طنز کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جبکہ ہجو کو بالعموم برے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا یہ کوئی حرکتِ ناشائستہ اور ایک غیر ادبی فعل ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ادب میں آئرنی اور وٹ، جن کا ترجمہ ہم طنز و ظرافت کرتے ہیں، کسی مستقل صنف کا نام نہیں ہے، اور یہ سیٹائر یعنی ہجو ہے جو اصل صنف ادب ہے، جب کہ ہیومر، آئرنی اور وٹ یعنی مزاح، طنز اور ظرافت سبھی

سیٹائر یعنی ہجو کے عناصر اور وسائل کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور مختلف ہجو نگاروں کے فن میں ان عناصر میں سے بالعموم کسی ایک اور بعض وقت چند کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ پھر مزاح، طنز ظرافت کے عناصر ہجو ہی تک محدود نہیں ہیں، غیر ہجو یہ ادب میں بھی وسائل اظہار کے طور پر کام کرتے ہیں شیکسپیر کے ڈراموں میں مزاحیہ کردار، چاسر کے قصوں میں مزاحیہ خاکے، کونگریو اور برنارڈ شا کے ڈراموں میں ظریفانہ مکالمے اور عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں طنزیہ جملے معلوم و معروف ہیں۔ جدید انگریزی تنقید میں کچھ لوگوں نے سیٹائر اور ہیومر کے درمیان تفریق کر کے ہجو و مزاح کو الگ الگ اصناف قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہلکی پھلکی چیزوں کو مزاح کہا جائے، جس میں لطیف اشارے اور شائستہ کنائے ہوں، جب کہ بھاری بھرکم چیزوں کو ہجو کہا جائے جس میں صریح حملے ہوں اور شدید مذمت کی گئی ہو۔ لیکن تاریخ ادب میں اب تک جامع صنفِ ادب ہجو ہی ہے۔

یہی کیفیت قدیم اور متوسط ادوار کے اردو ادب میں بھی پائی جاتی ہے۔ سب سے نمایاں مثال سودا کی ہجویات کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ تاریخی نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی شاعری کی اہم صنفیں تین ہی تھیں: ایک قصیدہ دوسرے مرثیہ، تیسرے ہجو۔ ہجو کی ہئیت کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح ہے کہ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ شعرا ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں وہیں جن شعرا کو اس مشہور فرمانِ خداوندی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے کہ شعرا کی پیروی ؛ ؛ گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں ان میں ایمان لانے والوں، عملِ صالح اور خدا کو بہت یاد کرنے والوں کے ساتھ اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد انتقام لینے والوں کو بھی شامل کیا گیا ہے:

وانتصروا من بعد ما ظلموا (الشعراء ۲۲۷)

یہ خاص ان ہجو نگار شعرا کی طرف اشارہ ہے جو اپنے دشمنوں، حریفوں اور مخالفوں کی مذمت میں دادِ سخن دیا کرتے تھے۔ قرآن نے صرف یہ کہا ہے کہ انہیں جارحیت اور ظلم و زیادتی سے روک دیا ہے، مگر ظلم و زیادتی کا پردہ چاک کرنے کے لیے ان کی انتہائی حوصلہ افزائی کی ہے، یہاں تک کہ انہیں انتشارِ فکر میں مبتلا ہونے والے بے عمل شعرا کی صف سے نکال کر ایمان و عمل اور ذکر و فکر کی دولت رکھنے والوں میں شامل ہونے کا اعزاز دیا ہے۔ ایک اور جگہ قرآن کریم نے ہجو نگاروں کے لیے خاص استثناء چھٹے پارے کی پہلی ہی آیت میں اس طرح کیا ہے:

لا یحب الجھر بالسوء من القول الا من ظلم

(اللہ تعالیٰ یہ آواز بلند کسی کی برائی کرنے کو پسند نہیں کرتا مگر جس شخص پر ظلم کیا گیا ہو اس کے لیے اجازت ہے)

قرآن حکیم کے ان بصیرت افروز بیانات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہجو اگر ظلم و زیادتی کے خلاف ایک صدائے احتجاج اور ناانصافیوں کے مقابلے میں دادرسی کے لیے فریاد ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ کوئی ناپسندیدہ فعل نہیں بلکہ ایک مستحسن عمل ہے۔

چنانچہ اگر سیٹائر کے لیے اردو میں ہجو کی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ لغوی معنی کے لحاظ سے تو صحیح اور موزوں ہوگا ہی، جمالیاتی اور اخلاقی لحاظ سے بھی اس استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، جب کہ سیٹائر کا ترجمہ طنز کرنے سے لغوی و معنوی ناموزونیت کے علاوہ یہ شکل بھی پیش آتی ہے کہ پھر آئرنی کا مترادف کیا ہوگا، جبکہ معنوی اعتبار سے یہی آئرنی کا موزوں ترین ترجمہ ہے۔ طنز اور آئرنی دونوں کا مطلب اشارے کنائے میں اس لطیف طریقے سے بات کرنا ہے کہ ظاہر میں تعریف ہو مگر باطن میں چھپی ہوئی چوٹ۔

اسی طرح وٹ اور ظرافت دونوں کے لغوی معنے میں دانائی اور نکتہ سنجی کے مضمرات موجود ہیں، جب کہ خوش طبعی کا مفہوم ظرافت میں لغوی طور پر مضمر ہے اور وٹ میں محل استعمال سے معنوی رابطے کے طور پر way of association پیدا ہو گیا ہے۔ غالب کو حالی نے حیوانِ ظریف جس معنی میں کہا ہو، یہ واقعہ ہے کہ غالب کے خطوط اور اشعار دونوں میں اصطلاحی ظرافت کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا ظرافت کا لفظ اصطلاحی طور پر خاص اسی مفہوم میں استعمال کیا جانا چاہیے جو وٹ کا ہے۔

ہیومر اور مزاح بالکل ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ دونوں کا مطلب ایک خندۂ لطیف، ایک مہذب مذاق ہے۔ مزاح دراصل ناگواریوں پر ناک بھوں چڑھانے کی بجائے مسکرانے کا نام ہے۔ مکروہات کے مقابلے میں مزاح کی حس ایک مہذب فرد اور سماج کا نشان تصور کیا جاتا ہے۔ اس حسِ مزاح سے ایک آسودہ و شگفتہ طبیعت اور شائستہ اخلاق کا پتہ ملتا ہے، جو ہر قسم کے حالات میں زندگی گذارنے اور زندگی کی ہر ادا سے لطف لینے کے لیے ضروری ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مزاح خود اعتمادی، ظرافت خوش طبعی، طنز دقتِ نظر اور ہجو شدتِ فریاد کی کیفیات پر مشتمل ہیں جو علی الترتیب مکروہات، قباحتوں، ابلہ فریبیوں اور مظالم کے مقابلے میں ابھرتی ہیں۔ فرد اور سماج دونوں کی صحت اور بشاشت کے لیے ان کیفیات کی اشد ضرورت ہے فن کے ذریعہ تطہیر کا روحانی عمل جس طرح المیہ کے ذریعے ظہور پذیر ہوتا ہے اس طرح مزاحیہ کے ذریعے۔ نفسِ انسانی کی گرہوں کی عقدہ کشائی دونوں ہی اسالیب فن اپنے اپنے طور پر کرتے ہیں۔

ضمیر الدین ساجد اکولوی

اک عمر ہوئی پھر بھی ہیں گلفام ابھی تک — دیتی ہے مجھے ملنے کا پیغام ابھی تک
ابا نے کہا تھا، مجھے لیکن نہیں مانا — میں اپنی محبت میں ہوں ناکام ابھی تک
اس دورِ حکومت میں ملی یہ مجھے ڈگری — "بی کام" ہوں پھرتا ہوں میں بے کام ابھی تک
دنیا تو کہاں سے کہاں پہنچی ہے مگر میں — دیکھا نہیں گھر چھوڑ کے رتلام ابھی تک
غلطی کی سزا، سات ہیں بچے مرے گھر میں — ہر سال یہ پاتا ہوں میں انعام ابھی تک
ممبر نہ بنے، یوں تو بہت بیلے ہیں پاپڑ
آخر رہے حجام کے حجام ابھی تک

مرزا الکلی (بلولی ناندیڑ)

غیروں سے تجھ کو الفت واہ وا رے تیری ہمت — ہم سے ہی اتنی نفرت واہ وا رے تیری ہمت
میرے ہی گھر میں رہ کر میرے ہی گھر کا کھا کر — مجھ پہ ہی یہ حکومت واہ وا رے تیری ہمت
قرضہ مجھے دلایا رشتہ تیسرا جمایا — ہم ہی کو دی نہ دعوت واہ وا رے تیری ہمت
اشعار بھی چرایا کہہ کر میرے سنایا — پھر بھی نہیں ندامت واہ وا رے تیری ہمت
دکھتا ہے پورا ہیرو نمبر لیا ہے زیرو
بیٹے تری لیاقت واہ وا رے تیری ہمت

علامہ سوٹا کرناٹکی

نمک مرچ

کہاں ان کے ڈیڈی نے تھا یوں ہی ڈانٹا
ممی آگئیں ورنہ پڑتا تھا چانٹا
مرے لو کی اب قدر کچھ بھی نہیں ہے
ہے ان کا کزن بیچ میں اپنے کانٹا
یہ واداگری اب نہیں چلنے والی
کہیں اس کو چھیڑا کہیں اس کو ڈانٹا
جو رم وسکی جن یا برانڈی تھے پیتے
پلاتی ہے کڑکی انہیں کولا فانٹا
چچا تایا پھوپا کہ خالو و ماموں
فرنگی زباں میں بنے سارے آنٹا
کسی بوڑ کے جھاڑ کی سی ہے حالت
نہ ہوں جس میں پتے نہ ڈالی نہ پھانٹا
ڈنر میں وہ کس طرح کھائیں گے جاکر
جو چھوتے نہیں ہیں چھری اور کانٹا
حکومت نہیں کوئی جاگیر سوٹا
کہ اندھے نے ادرانیوں میں بانٹا

عاشق نوادری (پٹنہ)

کیوں زمیں چکر میں ہے کیوں آسماں چکر میں ہے — فلسفی چکر میں ہے سائنسداں چکر میں ہے
آگیا گھر پہ اگر بیگانہ یا اپنا کوئی — کس طرح خاطر ہو اس کی میزباں چکر میں ہے
مل گئی جس کو وزارت بن گیا وہ بادشاہ — ہے یہی جمہوریت ہر نکتہ داں چکر میں ہے
عام ہے فتنہ گری مردم کشی اور رہزنی — امن و قانون رخصت حکمراں چکر میں ہے
دیکھ کر آشفتہ حالی آج سارے ملک کی
رات دن یہ عاشق شیریں بیاں چکر میں ہے

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد (حیات اور ادبی خدمات)

(تحقیقی مقالہ)

تبصرہ نگار:
اخلاق اختر حمیدی
(کراچی)

مصنف: ڈاکٹر حبیب ضیاء
صفحات: ۲۸۸ قیمت ۲۰ روپئے
ناشر: سید فہیم الدین ۳۶ . c آئی ڈی پی ال ٹاؤن شپ ۔ بالا نگر۔
ملنے کا پتہ: آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی حیدرآباد

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد حیدرآباد دکن کے سابق وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں، اردو کے عظیم مربّی اور کے طور پر بھی اردو دنیا کی ایک معروف ہستی ہیں۔ انھوں نے نواب میر محبوب علی خاں مرحوم اور نواب میر عثمان علی خاں مرحوم نظام دکن کے عہد اقتدار میں دکن میں اردو کے فروغ و اشاعت میں جس انہماک اور شوق و شغف سے خدمات انجام دیں، اس کی بدولت اردو قدر دانوں میں انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اگرچہ بذات خود کثیر التصانیف ادیب اور پرگو شاعر تھے مگر ان کو شہرت دوام اس علمی اور ادبی قدردانی کی بدولت حاصل ہوئی جس سے ان کے دور کے بیشتر باکمال اہل قلم، ادبا، شعراء اور فن کاروں نے فیض حاصل کیا۔ ان کی داد و دہش بے مثال تھی۔ جن باکمال ہستیوں نے ان سے فیض حاصل کیا ان میں امیر مینائی، سرشار، داغ، سید علی بلگرامی، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، شرر، نظم طباطبائی، ریاض، نصیر حسین خیال، علامہ اقبال، فانی جلیل مانک پوری، ظفر علی خاں، فرحت اللہ بیگ، سر شیخ عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی کیفی، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی اور ماہر القادری جیسے اہل قلم شامل ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے جو ادرنٹیل اردو کالج حمایت نگر حیدرآباد میں بطور لیکچرار خدمات انجام دے رہی ہیں، بڑی عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ مہاراجہ کے حالات زندگی، ان کی خدمات عالیہ اور ان کی شعری اور نثری تصانیف پر وافر مواد فراہم کیا ہے اور اسے "مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، حیات اور ادبی خدمات" کے عنوان سے کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔ یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔

اس مقالہ سے پہلے مہاراجہ کی نجی اور سرکاری زندگی پر ۱۹۰۵ء میں نواب مہدی نواز جنگ مرحوم کی نگرانی میں ایک کتاب مرتب کی گئی تھی۔ مگر ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنے مقالے میں تمام ممکنہ ماخذوں کی مدد سے مہاراجہ کی زندگی اور خدمات پر جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بلاشبہ بڑا کام ہے مہاراجہ سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو تشنہ رہ گیا ہو۔ ان کا سلسلۂ اجداد خانگی و سرکاری زندگی، مذہب، مشاغل، آخری ایام اور سیرت سے متعلق خاصا قیمتی مواد اس میں شامل ہے۔ مگر اس سے

دہ اہم وہ حصہ ہے جس میں ان کی ادبی کاوشوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔
جہاں تک شاعری کا تعلق ہے مہاراجہ موصوف نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ ان کی نثری تصانیف بھی مقالات، مضامین، ناول، سفرنامے، خطوط، خطبات وغیرہ شامل ہیں جن باکمال ہستیوں اور علمی ادبی انجمنوں ان سے فیض حاصل کیا ان کا بھی تذکرہ ہے۔ مہاراجہ کی فیاضی سے اقبال ایسی عظیم المرتبت شخصیت نے بھی استفادہ کیا اسے اپنے لیے سعادت سمجھا۔ یہی ایک بات مہاراجہ کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔
مقالے کے آخر میں فہرست ماخذات ہے جس سے ڈاکٹر حبیب ضیاء صاحب کی محنت و کاوش کی سند ملتی ہے۔ بلاشبہ دو کے ایک عظیم سرپرست اور محسن پر یہ تحقیقی مقالہ تحریر کر کے ڈاکٹر صاحبہ نے ایک بڑی کمی پوری کردی ہے۔ ❀❀

خرافات (مراسلے)

● اُردو ڈرامے سے متعلق دو کمیاں ہمیشہ موجود رہی ہیں اُردو اسٹیج کا نہ ہونا اور اسٹیج کے تقاضوں کے مطابق اردو ڈراموں کا نہ لکھا جانا۔ پارسی تھیئٹر کے زوال کے بعد اُردو میں زیادہ تر ڈرامے کتابی طرز کے لکھے گئے جس طرح کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ یعنی ڈرامہ لکھنے والوں کو اسٹیج کا بالکل شعور نہیں تھا کہ ایک سین کتنا لمبا ہونا چاہیے اور سین بدلنے کے لیے آرٹسٹوں کو کیسی کیسی دقتیں پیش آسکتی ہیں۔ اسٹیج پر اداکاروں کی آمد و رفت کے لیے بس کچھ ضوابط ہوتے ہیں یہ ساری ضروریات ہمارے ڈرامہ نگار اسٹیج کے قریب بیٹھ کر ہی سمجھ سکتے تھے۔ جس کا ایک مدت تک احساس نہ کیا گیا۔ اُردو ڈراموں پر جن دوسری زبانوں کے اثرات پڑ سکتے تھے ان کا بھی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ خصوصاً مراٹھی اور بنگالی ڈرامے کا جن کی اپنی اپنی traditions بن چکی ہیں۔ ریڈیو نے بھی ڈراموں کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ ریڈیو کے لیے لکھنے والوں نے ریڈیو ڈرامے کو ہی اردو ڈرامے کی معراج سمجھ لیا۔ اور قناعت بھی کرلی تھی۔ لیکن مقامِ شکر ہے کہ شگوفہ نے اس سلسلے میں یہ پہل کی ہے کہ جرمن، تلگو، مراٹھی اور بنگالی کے اعلیٰ درجے کے ڈراموں کو اُردو میں منتقل کرکے ایک خاص نمبر کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے عالمی ڈراموں کے بیش بہا ذخیرے کو پورے طور پر منتقل کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن شگوفہ کی اس قابلِ قدر پیشکش کی داد اس طرح دی جاسکتی ہے کہ نہ صرف ان ڈراموں کو اُردو والے اسٹیج کریں بلکہ دوسرے ادبی رسائل بھی ایسے ہی خاص نمبر شائع کرنے میں پیش رفت کریں اور ہمارے صوبوں میں جہاں جہاں اُردو اکیڈمیاں قائم ہیں وہاں اُردو ڈرامہ اکیڈمیاں بھی قائم کیجانی چاہئیں، جو اردو ڈرامہ پیش کرنے والوں کو مالی امداد دیا کریں۔

رام لعل لکھنؤ

● عرصہ سے شگوفہ کا مطالعہ کر رہا ہوں بیشک۔ فن اپنے طور کا ایک نہایت ہی دلچسپ جریدہ ہے۔ درحقیقت یہ مسکراہٹوں کا ایک آبشار ہے۔ کون ہے جو اس کے پڑھنے پر اپنی بتیسی کے مظاہرے پر کنٹرول کرسکتا ہے۔ ایس ایس زمان۔ گیا

● کہتے ہیں اُردو ادب میں طنز و مزاح کی کمی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ کسی بھی ادب کے سرمایہ میں طنز و مزاح کو ایک انفرادی شان اور نمایاں حیثیت میسّر ہوتی ہے گلشن ادب میں "شگوفہ" واقعی اپنی انفرادیت اور نمایاں حیثیت لیے ہوئے جلوہ افروز ہے۔

فضل احمد خاں۔ بمبئی

● شگوفہ کا تازہ شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے موجود ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کس کس مضمون کی تعریف کروں۔
یہ سب آپ کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔

انصاری اصغر جمیل۔ ناگپور

مضامین صفحہ کے ایک جانب اور خوش خط لکھے جانے چاہئیں

★

ناقابلِ اشاعت مضامین کسی صورت واپس نہیں کیے جاتے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

جلد ۱۲ | اکتوبر ۱۹۷۹ء | شمارہ ۱۰

ایڈیٹر

سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:

حمایت اللہ ★ منظور احمد ★ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:

راجندر سنگھ بیدی، بھارت چند کھنّہ، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل: سعادت علی خاں | جنرل منیجر ــــــ سمیع جلیل | منیجر: بشیر انور

سالانہ (۲۲) روپے | بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ | فی پرچہ (۲) روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد | بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی، حیدرآباد ملا

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ، ۳۱- عیدگاہ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

شگوفہ کا آئندہ شمارہ

سوونیر

ہوگا جو زندہ دلانِ حیدرآباد کی ۱۲ ویں سالانہ تقاریب
کے موقع پر شائع ہوگا

قیمت : تین روپے

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

نہیں آتی تو یاد .... یادِ رفتگان

مالِ مفت (انشائیے)

حق تو یہ ہے کہ ... (ترجمہ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چورن

ماہنامہ شگوفہ کا تاریخی و دستاویزی اہمیت کا حامل

ڈرامہ نمبر

مہمان مدیر : ساگر سرحدی

ممتاز آرٹسٹ سعادت علی خان کا بنایا ہوا خوب صورت سہ رنگی سرورق

ضخامت : ۴۵۶ صفحات

قیمت :

سالانہ خریداروں سے Rs. 15/-

عام خریداروں سے Rs. 20/-

لائبریری ایڈیشن Rs. 25/-

رقم بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر وصول ہونی چاہیئے

منیجر شگوفہ
۳۱ - مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

○ فن ڈرامہ پر مضامین ○ مراٹھی، بنگالی، سنسکرت، پنجابی، تلگو، اڑیا اور گجراتی ڈراموں کے تراجم۔

★ نتی سیتھی ★ ساگر سرحدی ★ فکر تونسوی ★ اظہر افسر ★ احمد جمال پاشا ★ غلام جیلانی ★ وجاہت علی سندیلوی ★ غلام یزدانی ★ بھارت چند کھنہ ★ خواجہ عبدالغفور ★ مقصود علی خان ★ ڈاکٹر سمیع الحق ★ پرویز یداللہ مہدی ★ شفیقہ فرحت ★ خالد عابدی ★ برق آشیانوی کے ڈرامے

"شگوفہ کے اس ڈرامہ نمبر کو کئی اعتبار سے امتیاز حاصل ہے.... ڈرامہ کو ایک فن کی حیثیت سے مطالعہ کرنے کا اور اسٹیج کرنے کا جن حضرات کو ولولہ اور شوق ہو ان کے لئے شگوفہ کا یہ خصوصی نمبر نہایت وقیع اور مفید ہے۔ اور اس کے مرتبین کی کوشش و کاوش ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے......"

ڈاکٹر عبدالاحد خان خلیل

تبصرہ مطبوعہ "خبر نامہ" اترپردیش اردو اکیڈمی

رضا نقوی واہی

بیچارہ مصوّر

میرے ایک دوست نے، جو ایک اچھے مصوّر بھی ہیں اور ایک اسکول میں ڈرائینگ ماسٹر بھی، خاصی عمر ڈھلنے کے بعد جب اپنی شادی کی تو ان کے معمولاتِ زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا ہوگیا۔ مصوری ختم ہوگئی، دوستوں سے ملنا جلنا ترک ہوگیا۔ اسکول میں جو وقت صرف ہوتا، اس کے علاوہ سارا وقت گھر کی چار دیواری میں بسر ہونے لگا۔ تفتیش کرنے پر اس انقلاب کا سبب جو کچھ معلوم ہوسکا، اس کی رپورٹ درج ذیل اشعار میں پیش کی جاتی ہے تاکہ قارئینِ شگوفہ عبرت حاصل کریں ــــ واہی

بیچارے مصوّر کی ہے ناگفتنی حالت
آتے ہی بنا دی ہے جو بیگم نے حجامت
پہلے تو یہ عالم تھا کہ پھرتے تھے بنے سانڈ
آج اس کی اُتاری گئی تصویرِ کل اس کی
لیکن وہ دھما چوکڑی اب بند ہے یکسر
احباب سے ملنے پہ بھی پابندی لگی ہے
اب اُٹھ کے دمِ صبح جلاتے ہیں وہ چولھا
اس فرض سے ہوتے ہیں سبکدوش تو جھٹ پٹ
پھر بیٹھ گئے سِل پہ رگڑنے کو مسالا
زنداں کی مصیبت میں بھی کہہ لیتے تھے اشعا
لیکن یہ بچارے کہ جو ہیں ایک مصوّر
جھڑکی ہے کبھی، ڈانٹ کبھی، مار کبھی ہے
وہ آرٹ کہ جو ماہ رخوں کے لئے سیکھا
چھٹی ہوئی چولھے سے تو پھر بیٹھ کے نل پر
بیگم نے بھی بھجوا دیئے شلوار و غرارے
اتنے میں ادھر بجتی ہے اسکول کی گھنٹی
ہے صبح سے تا شام غلامی کی مصیبت
مُنہ اُن کا لٹک آیا ہے انجور کی صورت
ہر سمت چرائی پہ نکل جاتے تھے حضرت
ہر قسم کے ماڈل پہ پھسلتی تھی طبیعت
جس وقت سے بیگم کی ہوئی گھر میں حکومت
دیوڑھی سے نکلنے کی نہیں اب تو اجازت
بیگم کو لڑکپن ہی سے بڈ ٹی کی ہے عادت
جھاڑو لئے کمروں میں پہنچ جاتے ہیں حضرت
چکی کی مشقت سے نہیں کم یہ مشقت
"اک طرفہ تماشہ" تھی جو حسرت کی طبیعت
ایزل پہ کھڑے ہونے کی ان کو کہاں مہلت
ہو جائے اگر کام میں تھوڑی سی بھی غفلت
اس آرٹ میں گھن لگ گیا بیگم کی بدولت
دھونے لگے اطفال کے پھلیوں کی غلاظت
اس کام سے دو گھنٹوں میں ہوتی ہے فراغت
سنتے ہی رواں ہوتے ہیں اس سمت بہ عجلت

مجرم کی طرح پھر وہ حوالات میں پہنچے
گھر آتے ہی بیگم کی غلامی میں جُٹے پھر
چولھا بھی جلانا ہے پکانا بھی ہے کھانا
بیگم کی مسہری کے قریں، ٹاٹ بچھا کر
اک ماہرِ امراضِ خبیثہ کی ہے تشخیص
یہ ساری مصیبت ہے، اسی ایک سبب سے
شوہر کے عوض گھر کے ملازم جو بنے ہیں
اک وَید نے کمزوری کا نسخہ یہ بتایا
جس طرح شفایاب ہوئے بھائی دیسائی

اسکول سے جب چار بجے ہو گئی فرصت
گو، لاکھ تھکن ہو، نہیں آرام کی مہلت
تفویض ہے بچوں کو بھی بہلانے کی خدمت
ملتی ہے انھیں شاذ ہی سونے کی اجازت
بیگم کو برتنے کی نہیں ان میں جو طاقت
پوری نہیں ہو پاتی بچاری کی ضرورت
گلبٹین نہ ہوتے، تو نہیں ہوتی یہ دُرگت
گر "آبِ حیات" آپ پئیں حسبِ ہدایت
ویسے ہی حضور، آپ بھی پا جائیں گے صحت

اعصاب میں آ جائے گا "ٹوٹل ریوولیوشن"
اور "ڈائی لیسس" کی نہیں ہوگی کوئی حاجت

"... ابھی میں نے صرف آدھی بوتل استعمال کی ہے!"

کرنل محمد خاں

بسلامت روی

یا جنٹلمین واقعی بلونڈ کو ترجیح دیتے ہیں؟

ہوائی سفر میں اکیلے مسافر کی قسمت کا یہ امتحان ہوتا ہے کہ اسے جہاز میں ہم نشیں کون ملتا ہے۔ آپ کو ہمارے
زشتہ سفروں کے کچھ ہم نشیں یاد ہوں گے: چک لالہ اور کراچی کے درمیان وہ تنگ پوش میم، بیروت اور جنیوا والی
ہ دلفروش مسز شی، اور پیرس فرینک فرٹ والا وہ عیش کوش سکائی لارک اور ہمارا آج کا ہم نشیں نکلا پرویز اعتمادی،
رویز ایک خوش رو اور خوش قامت ایرانی نوجوان تھا جو بات کرتا تو ننھے ننھے پھول جھڑتے ـــــ ہماری قسمت خراب
نھی۔ پرویز دس برس امریکہ میں رہنے کے بعد اقربا سے ملنے آ رہا تھا یا جیسا کہ تھوڑی سی بے تکلفی کے بعد معلوم
وا۔ اپنے ماں باپ کو سمجھانے آ رہا تھا کہ اپنی ایرانی منگیتر کی بجائے ایک امریکی بلونڈ° سے شادی کرنے پر کیوں
بور ہے۔ ہم نے پوچھا:

"کیا مجبوری ہے؟"

"دل کی بات ہے۔ اور کیا کہوں؟"

"دل کی بات ہے یا اس لئے کہ جنٹلمین● بلونڈ کو ترجیح دیتے ہیں۔

رویز ہنسا اور بولا: "کہاوت تو یہی کہتی ہے اور شاید جنٹلمین ترجیح بھی بلونڈ ہی کو دیتے ہیں مگر جس رنگ کی بھی
بستر آ جائے، لوٹاتے نہیں۔ میں وہ جنٹلمین نہیں ہوں۔"

"یعنی بالکل یکجائی ہو؟"

° بلونڈ BLONDE چاندی کے رنگ کے بالوں والی عورت　● ایک معروف انگریزی فقرہ GENTLEMEN PREFER BLONDES

"بالکل"

"تو اپنی ہم وطن منگیتر کا دل توڑ دو گے ؟"

"ایک دل کی بجائے دو دلوں کا ٹوٹنا زیادہ سنگین ہے۔"

"تم اپنے ماں باپ کے دل شمار نہیں کر رہے۔ وہ بھی تو ٹوٹ سکتے ہیں۔"

"انہی دو دلوں کی خاطر تو اتنی دور سے آ رہا ہوں۔ تم دُعا کرو۔"

اگر میں نے کسی کے لئے دُعا کی تو ان میں تمہاری منگیتر بھی شامل ہوگی۔ اللہ تمہارے دل میں اس بے کس دوشیزہ کے لئے بھی مہر ڈالے۔"

"آمین ـــ اور اللہ اس دوشیزہ کے دل میں اس بیکس کے لئے بھی کچھ مہر ڈالے اور چھٹّی دلوا دے ـــ اور ہاں، اس دوشیزہ کا نام بھی مہر ہے، مہر النساء۔"

تین گھنٹے کے ہوائی سفر میں پرویز سے دنیا جہان کی باتیں ہوئیں لیکن ہمارے ذہن سے یہ بات نہ نکل سکی کہ یہ بے چارہ تہران پہنچنے پر اس محبت کی مثلث بلکہ مخمس سے کس طرح سلامت نکلے گا اور پھر دفعتاً ایر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں مہر آباد کے ہوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں۔ جب چند لمحے بعد جہاز ایر پورٹ کی عمارت کے سامنے رُکا تو پرویز نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور جہاز کے دروازے کی طرف چلا۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

دروازے کی بلندی سے کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے عورتوں اور مردوں کی ایک پُوری قطار پھولوں کے ہار لئے کھڑی ہے پرویز نے کچھ صورتیں پہچان کر کہا: "یہ لوگ میرے استقبال کو آئے ہیں۔" اور پھر سیڑھی سے اُترا ہی تھا کہ ایک بزرگ نے بڑھ کر اس کے گلے میں ہار ڈالا اور پھر اس سے بغلگیر ہو کر اس کے گالوں اور آنکھوں کو چُوم لیا ـــ ایرانی ملاقات میں سب کچھ ڈال دیتے ہیں: دست و بازو، لب و چشم، جان و دل ـــ پرویز نے فارسی کے چند لفظوں میں ہمارا تعارف بھی کرا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ بزرگ نے جو پرویز کا باپ تھا، ہمارے رخسار و چشم پر بھی وہی عمل کیا اگرچہ کہ خوش قسمتی سے اس میں وہ پدرانہ شدّت نہ تھی۔ آگے پرویز کی بوڑھی ماں کھڑی تھی جو خوشی میں بیٹے کو پھولوں کا ہار پہنانا تو بھول گئی لیکن اُسے سینے سے لگا کر بوسوں کا ہار پہنا دیا۔ جب ماں سے مل کر پرویز آگے بڑھا تو اس پیاری پوپلی خاتون نے ازراہِ شفقت ہمارے گال بھی گُدگُدا دیئے۔ آگے پرویز کے چچے چچیاں، خالو خالائیں تھیں۔ انھوں نے بھی حسب دستور پرویز کو شش پہلو پیار کیا اور ہم سے بھی کسی نے ہاتھ ملایا اور کسی نے پیٹھ تھپکا دی۔ آگے مقطعے میں تھیں پرویز کی عم زادیاں اور خالہ زادیاں: ماڈرن، حسین، مہ جبین اور دل نشین۔ ہاتھوں میں ہار لیے، ہونٹوں میں پیار لئے اور آنکھوں میں خمار لئے۔ اور یہاں سخن گسترانہ بات آپڑی۔ پرویز سے تو وہ بھی اسی طرح لپٹیں جیسے ماڈرن کزنیں COUSINS لپٹا کرتی ہیں مگر ہمیں محض سر کے خم یا لبوں کے تبسم پر ٹال دیا بلکہ قطار کی آخری لڑکی نے تو ہمیں نہ صرف تبسم سے محروم رکھا بلکہ اس طرح گھورا جیسے کہتی ہو: "تو کیستی؟"

لیکن خیر مجموعی طور پر یہ تقریب ہمیں موافق ہی آئی۔ آخر ہمارے لئے یہ سب کچھ جھونگا° ہی تو تھا، بلکہ خاصا

° پنجابی لفظ ہے۔ وہ تھوڑی سی مقدار جو دوکاندار گاہک کو خریدے ہوئے مال کے ساتھ مفت دیتا ہے۔

خوشگوار جھونکا۔ حسینوں کے معاملے میں یہی فلاسفی وہی ہے جو فیض نے بیان کی ہے:

گر جیت گئے تو کیا کہنا ، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اور اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پرویز ایک ایسی لڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے جو کسی قدر ہٹ کر کھڑی ہے جیسے استقبال کنندوں میں شامل نہ ہو، بلکہ تماشائی ہو اور لڑکی کیا تھی، یک دختر آفتاب شمائل، سعدی کا سرو سیمیں اور حافظ کا غزال رعنا مگر اداس اداس جیسے پلکوں پہ آنسو آنے والے ہوں یا آکر گر چکے ہوں، پرویز اس کے قریب جاکر ایک لمحے کے لئے رُکا اور پھر بے تحاشا اس سے لپٹ گیا۔ ایک مدّت کے بعد پرویز نے ہماری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ہمارے پوچھے بغیر بولا:

"یہی مہر ہے؟"

اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گم ہوگیا ـــــ پرویز اب ہم ہی سے بےخبر نہ تھا، اسے امریکی بلونڈ بھی کچھ ایسی یاد نہ تھی۔ محبت کو اس قدر اچانک رُخ بدلتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ٹھیک ہے، چند لمحے پہلے ہم ہی نے اس مضمون کی دُعا کی تھی اور خود مہر کی آہوں کا منشا بھی یہی تھا، تاہم اس تیزی سے دعائیں یا آہیں کبھی قبول نہیں ہوئی تھیں۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے اللّٰہ میاں نے صرف دُعا ہی قبول نہیں کی بلکہ سپیشل کیس کے طور پر، پرویز کو گردن سے پکڑ کر مہر کے قدموں میں بھی ڈال دیا ہے چنانچہ وہی پرویز جو مہر سے پرہیز کرنا چاہتا تھا، اب اسی مہر کے دہن میں آبِ حیات ڈھونڈ رہا تھا۔ پرویز اور مہر کو اس عالمِ شوق میں دیکھ کر حاضرین پر ایک خاموشی سی چھا گئی۔ اتنے میں کہیں سے غالبؔ آنکلے اور ہمارے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگے:

دیکھا؟ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا!"

پرویز کو ہیلو کہنا بےکار تھا۔ ہم نے اس کی سمت میں فقط الوداعی ہاتھ لہرایا اور خود کسٹم سے سامان لینے چل پڑے۔

ایرانی کسٹم میں غالباً حاتم طائی کی اولاد ہی بھرتی ہوتی ہے: سخی داتے، سیرچشم، وسیع القلب! محال ہے جو آپ کے سامان کو میلی نگاہ سے دیکھیں یا اسے کھول کر تلاشی لینے کی گھٹیا حرکت کریں۔ ہم نے اپنا سوٹ کیس پیش کیا تو ابنِ حاتم نے ایک شانِ بے نیازی میں اس پر چاک سے نشان لگا دیا کہ "جا، لے جا جہاں تیرا جی چاہے" اور ہم نے ہزار افسوس کیا کہ کیوں نہ اسے چرس سے بھر لائے ـــــ جملہ یورپی ہپّی ایران ہی سے گزر کر آتے ہیں ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ اسی روز پچھلے پہر ایک چرس کے سمگلر کو سرِ بازار گولی سے اڑا دیا گیا۔ ہم نے یہ سُنا تو ہزار شکر کیا کہ ہمارے سُوٹ کیس میں پی آئی اے کی سونف سے زیادہ منشّی کوئی چیز نہیں تھی۔

ائیر پورٹ سے باہر نکلے تو ٹیکسی ڈرائیور یا "رانندہ تاکسی" سے واسطہ پڑا۔ یہ ذاتِ شریف جس خاندان سے بھی ہے، حاتم طائی نے ان کی کسی پُشت میں افزائشِ نسل کی نیّت سے حصّہ نہیں لیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم گولی کے خوف سے سمگلنگ کا کاروبار نہیں کرتے ہم سے وہی کرایہ مانگا جو ایک نامور بین الاقوامی سمگلر کی شان کے شایان ہو اور ناچار ہم نے بھی اپنی چھوٹی شان کو بٹّہ نہ لگنے دیا اور کرایہ ادا کر دیا۔

من یک کمرہ می خواہم

ہوٹل انٹرنیشنل یا "ہتل انترنیشنال" میں پہنچے تو دیکھا کہ ہر طرف فارسی کا دَور دورہ ہے۔ ایسے ماحول میں ہمیں انگریزی بولنا بے جا نظر آیا۔ چنانچہ ہم نے بھی فارسی بولنے کا فیصلہ کیا۔ آخر بی۔اے میں فارسی آنرز کیا تھا اور پچھلے دنوں اپنی پرانی فارسی کی "فارسی امروز" ○ سے "جھاڑ پونچھ" بھی کی تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ جدید فارسی میں ہوٹل کا کمرہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے منیجر صاحب سے ایک سنگل رُوم کی درخواست کی:

"جناب منتظم۔ من یک کمرہ برائے شخصِ واحد مے خواہم"

منیجر ہمارا منہ تکنے لگا، گویا ہم کوئی قدیم فارسی بول رہے ہوں۔ خیر، ہم نے تسک کا فائدہ منیجر کو دیتے ہوئے اپنا جملہ ذرا سلیس لہجے میں دُہرایا:

"جناب منتظم، (وقفہ) من یک کمرہ (وقفہ) برائے شخصِ واحد (وقفہ) مے خواہم (تبسّم)

منیجر زیر لب منمنانے لگا: "منتظم؟ کمرہ؟ یعنی چہ؟"

اب اگر باہمی افہام و تفہیم میں کہیں خرابی تھی تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری اس کُند ذہن منیجر پر بھی تھی۔ ہمیں ایک ہی فقرہ تیسری بار دُہرانے کا یارانہ تھا، چنانچہ کسی قدر جھنجھلا کر انگریزی میں کہا:

"MR. MANAGER, I WANT A SINGLE ROOM"

منیجر جھٹ بولا: — "THEN WHY DON'T YOU SAY SO?"

ہماری جھنجھلاہٹ فی الفور زائل ہوگئی کیونکہ یہ شخص ہم سے انگریزی بھی بہتر بولتا تھا اور اس خرابی کی ذمہ داری جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، بیشتر ہم پر ہی تھی۔ خواہ مخواہ تیزی میں ناپختہ فارسی بول کر سبکی کرالی تھی لیکن اب پچھتائے سے کیا ہوت؟ انگریزی کی معرفت کمرہ حاصل کر کے اوپر گئے۔ سامان رکھا۔ اور ذرا سوچنے کا موقع ملا تو دفعتہً ہمیں "فارسی امروز" کا سنگل کمرہ مانگنے کے لئے صحیح فقرہ یاد آگیا۔ ہمیں کہنا چاہئے تھا:

"آقائے مدیر۔ اطاقِ یک نفرے دارید؟"

ظاہر ہے کہ اس فارسی اور ہماری فارسی میں یک کے علاوہ کوئی لفظ مشترک نہیں تھا۔ بہر حال اب ڈاکٹر عرفانی کی کتاب کے چند مزید فقرے یاد آنے لگے تو جی چاہا کہ نیچے جا کر آقائے مدیر کے ساتھ از سرِ نو گفتگو کریں اور اپنی شکست کا بدلہ لیں لیکن کہیں سے ڈاکٹر عرفانی کی آواز آئی:

دیکھو میاں، محض تین چار کارتوسوں کے ساتھ حریف کو للکارنا عقلمندی نہیں، پھر شکست کھاؤ گے اور اس صورت میں اگر گھر لوٹے تو حسبِ دستور ہم تمہارا استقبال تو پیروں سے کریں گے۔ تمہاری فارسی گولیاں کچی ہیں۔ انہیں ابھی مت کھیلو اور "فارسی امروز" کو بھی رسوا نہ کرد۔ چندے اور مشق کرد"۔ ہم ڈاکٹر عرفانی کی فہمائش کا تجزیہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ذرا زیادہ شفقت آمیز لہجے میں حضرتِ علامہ نے بھی مشورہ دیا۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی　　　اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

(باقی آئندہ)

○ محترم ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کی تالیف۔

سلیمان خطیب

پشکولا

(اپنا پیشاب آپ پینے والوں کے نام)

ھائی ہوتا ہے ایک مُنہ بولا
دکوکولا کا بھائی پشکولا
س سے ناسُور کیور ہوتا ہے
زہ ٹانک ہے پیور ہوتا ہے
یسے گھٹیا بھی لوگ ہوتے ہیں
ورگھٹیا بھی دُور ہوتا ہے
د بھی حاکم حضور ہوتا ہے
جھ نہ سمجھ تو فتور ہوتا ہے
س کا بھیجہ خراب ہوتا ہے
ہ بھی اچھا ضرور ہوتا ہے
م بھی دیکھو نا چیز اچھی ہے
ہ تو آبِ حیات جیسی ہے

ن بدن میں کشید ہوتی ہے
پینے والے کی عید ہوتی ہے

وال یہ اردو زباں بھی آئی تھی
اور شکایت تھی ابنِ آدم سے

سر چڑھایا ہے مُوت کو تم نے
میں تو مر جاؤں گی اس غم سے
یہ تو پیشاب کی ترقی ہے
یہ نہ پوچھا کہ اُردو کیسی ہے
یہ نہ پوچھا کہ کیا گرانی ہے
یہ نہ پوچھا کہ کیا مسائل ہیں
روٹی روٹی کو لوگ مرتے ہیں
یہ نہ پوچھو کہ کیا دلائل ہیں

یاں تو بھاشن ہے اور میلا ہے
صرف پیشاب کا قصیدہ ہے

شری پیشاب چیخ کر بولے
ہاتھ دھو کر پڑی ہے کیوں پیچھے
تو تو رینگی نہ کان کے اُوپر
میں تو پہنچا حلق سے بھی نیچے
یہ ترقی کا دور ہے اُردو!
یہ تو قصّہ ہی اور ہے اُردو!

سلیمان خطیب

تنگ پتلون
(عید گاہ میں)

ایک صاحب نماز میں یارو
تنگ پتلون چڑھا کو آئے تھے
اُنوں کھڑ کو تھے بس اقامت میں
لوگاں سجدے میں سر جھکائے تھے

کابلی والا: تو جو سجدے میں جائے گا بابا
پھر تو اپنا نصیب پھوٹے گا
تیرا ٹوٹے گا ایک ہی ٹانکا
اپنا پورا نماز ٹوٹے گا
اَم تو ایک اِچ نماز پڑتے ہے
اس کو کیئکو کھراب کرتے ہے
کیا بگاڑا تھا تیرا اے ظالم
اَم کو تکلیف کیئکو دیتے ہے
پاک پروردگارِ عالم سے
ہم تو ڈر ڈر کے سُود لیتے ہے
ورنہ معلوم ہے خدا اَم کو
پانچ جوتے اٹھا کے مارے گا
خدا کا جوتا تو بھوت وزنی ہے

کون پڑھنے پڑھانے آیا تھا
اَم تو کپڑے دکھانے آیا تھا
اَم تو ملنے ملانے آیا تھا
گوں کی چکر لگانے آیا تھا

وہ حسینی تھے بھوکے پیاسے تھے
جن پہ حملے شدید ہوتے تھے
وضو کرتے تھے خون سے اپنے
روزہ رکھ کر شہید ہوتے تھے

ایک ویسے بھی وہ نمازی تھے
ایک ایسے بھی یہ نمازی ہیں

رؤف خوشتر
گلبرگہ

نہ کوئی خندہ رہا اور نہ کوئی خندہ نواز

ایک نقّاد کا قول ہے کہ " اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں زبان کے کس اسلوب کو مکمل سمجھتا ہوں تو میرا جواب یہ ہوگا کہ کسی فن کار کا وہی اندازِ بیان مکمل ہوگا جو اوسط لیکن متنوع صلاحیتوں کے کوئی پانچ سو افراد کے مجمع تک اپنی بات پہنچاتے اور احمقوں و پاگلوں کو چھوڑ کر باقی سب اس زبان کے اسلوب کو سمجھیں " اس قول کی روشنی میں سلیمان خطیب کے اسلوب زبان کو دیکھیں تو کون پاگل ہوگا جو اُن کا کلام نہ سمجھتا ہوگا۔

غالب کی طرح خطیبؔ مرحوم بھی بچپن سے ہی زندگی کی اس خاردار راہ پر چل پڑے تھے۔ جن پر عموماً دوسرے شاعر آگے بڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے ان پُر خار راستوں اور ذوقِ سفر انہیں دو حقیقتوں کے بیچ انھوں نے ظرافت کی ایک ایسی پگڈنڈی پر وہ گامزن ہو کر اہلِ دکن کو بھی ہمراہ کر لیا تھا۔

بچپن کی تلخیاں، محرومیاں اور اداسیاں جس میں ماں باپ کا انتقال، تنہائی کا احساس، زمانہ کی بیرخی و سرد مہری۔ یہ تمام باتیں ان کے حسّاس دل و دماغ پر اپنا دیرپا نقش کرتی رہیں۔ انہوں نے قدم قدم پر دُکھ، مصیبت نارسائی غم اور بے بسی کا دھواں اٹھتے دیکھا۔ بچپن کی درد و کسک کی لہروں میں جب یہ شاعر ڈوب کر ابھرتا تو ہمارے لیے ایسے ایسے موتی چن کر لاتا تھا جو آج دکنی شاعری کے شہ پارے کہلاتے ہیں۔ اوائل عمر سے ہی ایسے حالات رونما ہوے کہ وہ غمِ ذات سے دوچار ہوئے اور یہی غم ان کی زندگی کے ساتھ غمِ کائنات میں بدل گیا۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر رجائی پسند تھے۔ اس لیے اپنی محرومیوں، تلخیوں اور حسرتوں کو طنز و مزاح کا رنگ دے کر دکنی شاعری کو مالا مال کیا۔ ورنہ کم ظرف انسان یہاں ہمت ہار جاتا ہے اور قنوطیت اور یاسیت کا شکار ہو کر سارے معاشرے میں حزن و ملال بانٹتے پھرتا ہے۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہا کہ ان کی داخلی شخصیت زندگی کے خارجی مسائل سے پسپا نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے اپنی محرومیوں پر ہنسنے کی عادت ڈالی۔

یہ شاعرِ خندہ نواز اپنے ساتھ اپنے معصوم و مظلوم بچپن کو اپنے ساتھ رکھا۔ کسی وقت بھی اس کو اپنی شخصیت

سے جدا نہیں کیا۔ جو لوگ ان پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ خود ستائی و خودنمائی کے شکار تھے تو ان کے لیے عرض ہے کہ وہ شاعر کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کریں تو اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ جو شخص اپنی ابتدائی زندگی کے دس بارہ سال تک ٹوپی نہ پہنا ہو جس کے نازک پاؤں کو جوتا میسر نہ آیا ہو اور جو کسی کے کفن کا بچا ہوا کپڑا لے کر عید پر قمیص بنا لیا ہو۔ اگر بعد میں اس پر عزت وشہرت اور دولت کی دیوی مہربان ہوتی ہے تو اس کا بچپن اسے اکساتا ہے کہ وہ اپنی اس عزت وشہرت اور پذیرائی کی داستان ہر کسی کو بتا کر اپنے اس داخلی کرب کو مطمئن کرنے جو اس کے اندر ہمیشہ سے کروٹ لیتا رہا۔ جب یہ کرب کسی یتیم بچے کو دیکھتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

جب سے سایہ ترا اٹھا سر سے
کوئی سایہ نہیں ملا اماں
تیرے مرتے ہی مر گئی دنیا
کتنا جلدی بسر گئی دنیا

ان کے آبگینۂ کلام میں حیاتِ انسانی کا ہر پیچ وخم اور معاشرے کا ہر انداز نہ صرف تھرتھراتا بلکہ بولتا محسوس ہوتا ہے۔ خطیب نے دکنی شاعری کو کچھ اس والہانہ انداز سے ٹوٹ کر چاہا تھا جس طرح محمد قلی قطب شاہ معانی نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کو چاہا تھا۔ اور اس کی یاد میں بھاگ نگر بسایا تھا۔ تو خطیب نے اپنی محبوبہ یعنی دکنی شاعری کے لیے خون جگر سے سینچ کر کیوڑے کا بن مہکایا۔ خطیب نے اپنے مخصوص ومنفرد انداز میں تخیل کی اونچی اڑان، جذبہ کی گہرائی۔ احساسات کا اچھوتا خزانہ اور مشاہدہ فطر کا بڑا ذخیرہ دکنی زبان کو دیا۔ شہر سے دور افتادہ پانی محل میں سکونت پذیر رہنے کے باوجود سماج کے نچلے ومتوسط طبقے کی زبوں حالی معاشی استحصال کی نقاب کشائی کی۔ اور عوامی مسائل کو عوامی زبان کے ذریعہ اس خوبی سے اپنی شاعری میں سمو دیا کہ وہ لافانی بن گئے دکنی زبان میں ایسی رسیلی رنگیلی مہکتی گنگناتی شاعری بھلا کس نے کی ہے۔ ان کے یہاں مناظر کی عکاسی انسانی ہمدردی اور سماجی زندگی کے داد وغم کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کے لیے وہ اپنے بچپن کے مرہون منت ہیں۔ ان کا فن اس قدر کھلا آزاد اور نڈر تھا کہ سماج کے سفید پوش رہبر نما رہزن ڈر جاتے ہیں۔

تم سب بڑے مدبر ہو —
بولو کس کا اصول اچھا ہے ؟
ہم نے کانٹے بھی رکھ لیے دل میں۔
تم نے پھولوں پہ پاؤں رکھا ہے

قلی قطب شاہ معانی اور نظیر اکبر آبادی کے بعد اردو شاعری میں ہندوستان کے دیہات اس کے باشندے اپنے رسموں، رواجوں، تہواروں، پستیوں، بلندیوں اور یہاں کے رتوں کے ساتھ سلیمان خطیب کی شاعری میں زندہ ہوا ہے۔ خطیب اپنے دور کے تمام شعرا میں اس لیے محترم ومنفرد ہیں کہ طنز ومزاح تحریف زبان وبیان اسلوب، لہجہ، تکنک، نظریے، مواد معیار اور مقدار کے اعتبار سے لاثانی ولافانی ہیں۔ ان کی اس کھنکتی ہنسی، ان کے شوخ لہجے میں مخصوص انداز بیان کے ساتھ ان کے نظریے کی کھنک اور عقیدہ کی گونج ان کی ظرافت میں نہ صرف تہہ داری پیدا کرتی ہے بلکہ بامقصد ہونے کی وجہ سے اس میں صالح توانائی اور گہری مقصدیت بھی برقرار رکھتی ہے۔

دل کو بدلے تو ان کو بدلو جو۔
روز رستے بدلتے جاتے ہیں
مُنہ پو کہتے ہیں یہ بات پھولاں کی
سچے پاداں کھوندلتے جاتے ہیں

دکنی شاعری کا پیامبر سلیمان جس کے مداحوں کی رعیت میں وزراء، عکماء، افسران، شوہر، چور، اُچکے، تانگے والے، رکشہ راں، علیم یافتہ اور جاہل غرض ہر مکتب فکر اور ہر پیشہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ ان کی شہرت اور ان کے کلام کا بین ثبوت ہے۔

کچھ حلقوں میں یہ بات کہی جارہی ہے کہ سلیمان خطیب کے انتقال پر ملال سے دکنی شاعری ختم ہوگئی۔ لیکن یہ بات غلط ہے کیونکہ جب تک دکنی زبان میں کیوڑے کے بن کی خوشبو ہے دکنی شاعری کبھی ختم نہ ہوگی۔ ہمیں چاہیے کہ اس کیوڑے کے بن کو ہر خاص و عام تک پہنچائیں تاکہ اس پر کیف خوشبو سے سارے معاشرے کا ذہن صاف اور معطر ہو جاتے اور ہم ایک ایسے خوش آئند مستقبل کی تعمیر میں لگ جائیں جس کی آرزو خطیب اپنے کلام میں جابجا کرتے رہے۔

افسوس کہ ہماری ادبی، علمی، ثقافتی محفلوں کا روح رواں ہم سے ایسے وقت جدا ہوگیا جب اہل علم و فن کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ ان کی موت سے نہ صرف ان کے پسماندگان بلکہ سارا دکن رنج و غم میں ڈوب گیا۔

ہر ہر نظر اداس ہے ہر دل اداس ہے
گھر گھر سے جیسے کوئی جنازہ چلا گیا
ہم ہی بُرے تھے رہ گئے رونے کے واسطے
ہنستا ہوا پھول تھا وہ ہنستا چلا گیا

وہ ہنستے چلے گئے لیکن سب کو رلا گئے جو شخص زندگی بھر ساری مایوس زندگی میں قہقہے بکھیرتا رہا آج وہ سب کو شدت سے رلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں وہ جنت میں فرشتوں سے یوں ہم کلام ہوگا۔

میں شاعری کا راجا موتیاں لٹا کو آریوں
کتے اندھارے گھوپ میں بتیاں جلا کو آریوں
گمت ہنسی ہنسی میں رونے کے باتاں بولیوں
پتھر دلاں کو کاسے پانی بنا کو آریوں

واقعی وہ اس اندھیرے سماج میں ایک شمع کی مانند جل رہے تھے۔ جن کی روشنی میں نوجوان قلم کاروں کا قافلہ اپنی راہ ڈھونڈتا تھا۔ اب انہیں یہ روشنی ان کے مجموعۂ کلام کیوڑے کے بن میں ملے گی۔

حضرت خطیب شریف النفس، عالی ظرف، بذلہ سنج، انسان دوست تھے۔ ان کے چلے جانے سے ہماری ادبی محفلیں سونی سونی ہیں۔

نہ کوئی خندہ رہا اور نہ کوئی خندہ نواز

●○

طارق جامی
(جدہ)

وقتِ آشوب

ہے کہاں موجودگی، اور کیا پتہ ہے کھیر کا
پڑھ رہا ہوں میں نوشتہ وقت کی تقدیر کا
یارو کچھ عالم نہ پوچھو اس ستمگر دور کا
جس سے کچھ پوچھیں کہے یہ مسئلہ ہے اور کا
جس کو دیکھیں وہ ہے مالک کچھ نرالے طور کا
ہم پہ ہر اک پل ہے گویا لمحہ زیرِ غور کا
تنگ سے ہے تنگ تر حلقہ ہر اک زنجیر کا
"مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا"
میں بڑا بدبخت ہوں خوش قسمتی ہے زوج کی
جس کی کوشش سے ہیں میرے گھر قطاریں فوج کی
کیا کہوں جب ہو کہانی غلغلوں کے اوج کی
راوی بیچارہ تو لکھے گا کہ ہر دم موج کی
اک تقاضہ پورا کرنا لاڈلے تنویر کا
"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"
جینی کی قیمت ہر اک چہرے سے ہوتی ہے عیاں
مونچھوں کے یہ زاویے لگتے ہیں سوکھی مولیاں
گوشت کے بھاؤ نہ پوچھو، کر لو اک دو کلیاں
ہم تھکن سے چور ہیں اور تازہ دم ہیں بیویاں
ہے ابھی اک مرحلہ تنخواہ کی تفسیر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"
بلدیاتی موڑیں دیتی ہیں ننگی گالیاں
چار سو گلیاں یوں پھیلی ہیں جوں ٹوٹی ڈالیاں
اور ان کے درمیاں اُبلی ہوئی یہ نالیاں
ایسی بل کھاتی ہوئیں کہ جیسے دِلّی والیاں
"سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا"
"ایک پہلو یہ بھی ہے ملتان کی تصویر کا"

ھزل

عریانیت کا ایسا چلن عام ہو گیا
یہ دیش نہ ہوا کوئی حمام ہو گیا

دونوں کی خوفِ وصل سے حالت خراب ہے
ان کو بخارِ غیر کو سرسام ہو گیا

شاعر تھا مولوی بھی تھا، عاشق مزاج بھی
حافظ نہ بن سکا تو وہ خیام ہو گیا

لیں رہبرانِ قوم ذرا خود کا جائزہ
اتنا بھی ہو گیا تو بہت کام ہو گیا

ہر لفظ کے ہیں عشق میں معنی اُلٹ پلٹ
چھینا ہے جس نے دل، وہ دل آرام ہو گیا

مرحوم کا میں ایک ہی وارث تھا اس لئے
تھا ان پہ جو بھی قرض مرے نام ہو گیا

اعجاز ایسے مرغ پہ رحمت خدا کی ہو
دانے کے حرص میں جو تہِ دام ہو گیا

غنی اعجاز
(اکولہ)

عاتق شاہ

دیکھنا وہ سامنے بھینس کھڑی جگالی کر رہی ہے!

اہا! کیسا کالا اور چمکتا ہوا رنگ ہے۔ طبیعت کی بے حد خاموش اور بے ضرر ہے۔ قریب سے گذر جایئے کچھ نہیں کہے گی اور نہ پلٹ کر دیکھے گی۔ اس کے سر پر اُگی ہوئی ٹیڑھی میڑھی سینگیں صرف دیکھنے کی چیز ہیں۔ آج تک اسنے اپنی سینگوں سے کسی کو مارا نہیں۔ بچے بھی اس سے مذاق کرتے ہیں۔ لیکن وہ بُرا نہیں مانتی۔ بلکہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا وجود دوسروں کے لیے سامانِ تفریح ہے۔ اس لیے وہ بھی خوشی خوشی اس تفریح میں شریک ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی اپنا مذاق اڑانے لگے تو دوسروں کو موقع ہی کہاں رہتا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہے!

بھینس جب بھی کسی گلی کوچے اور سڑک سے گذرتی ہے تو لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور جب اپنے گھر یا کسی گھر کے دروازے میں قدم رکھتی ہے تو اللہ کی پناہ۔ لوگوں کا ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی شے خالی نہیں رہی!

بھینس کو اس کا اندازہ ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو ہنسانے کے لیے اور ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہے اور اس بے نیازانہ انداز میں یوں آگے بڑھ جاتی ہے جیسے اسے کوئی دیکھ ہی نہیں رہا ہے۔ البتہ جب وہ جگالی کے موڈ میں آتی ہے تو وہ بھینس نہیں رہتی بلکہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔

جگالی بھینس کی ہابی ہے اور جب کوئی بھینس اس ہابی میں منہمک ہو جاتی ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہے۔ اور زمین سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں سے بلند ہو کر نہ جانے کن کن آسمانوں کی سیر کرنے لگتی ہے!

ویسے کوئی بھینس خواب نہیں دیکھتی۔ لیکن آج کے سماج کا قریب قریب ہر شخص بھینس کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کہیں سے بھی اور کسی طرح بھی کوئی بھینس اس کے سونے آنگن میں چلی آئے۔ اور ـــــــ اور گھر میں دودھ کی

نہریں بہنے لگیں!

اور دودھ کی نہر کو پانی کے میٹھے تالاب کی طرف مکھن کو موڑ دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ پہلے دودھ میں پانی ملایا جاتا تھا۔ لیکن آج کل پانی میں دودھ ملایا جاتا ہے۔ بزنس کا بزنس اور سارا مکھن اپنا!

بھینس سو فیصد مفید جانور ہے۔ یہ صرف دودھ ہی نہیں دیتی بلکہ اس کے گوبر سے کئی گیاس پلانٹ چلتے ہیں۔ اور لاکھوں گھروں میں چولھے جلتے ہیں اور چولھا نہ جلے تو روٹی کیسے پکے!

بھینس مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچاتی ہے کہ اس کے چمڑے سے جوتے اور بیاگس بنتے ہیں اور سینگوں سے کنگھیاں!

بھینسوں کی کوئی قسم نہیں ہوتی۔ اچھی بھینس وہی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ دودھ دے اور کم کھائے بلکہ کھائے ہی نہیں۔ اور برابر دودھ دیتی رہے۔ روسی اور امریکی بھینسوں کا جواب نہیں ہوتا۔ جی چاہا تو دودھ کے چشمے بہا دیں گی اور موڈ آف ہو جائے تو سینگیں مار مار کر دودھ نچوڑنے والے کو ختم بھی کر دیں گی!

ہمارے ملک کی بھینسیں ابھی اتنی اڈوانس نہیں ہوئی ہیں۔ اس لیے اپنی سینگوں کا کبھی استعمال نہیں کرتیں۔ البتہ کبھی کبھی دودھ دھونے والے کو لات مار دیتی ہیں اور وہ خوش خوش اس لات کو قبول کر لیتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دودھ دینے والی یا پلانے والی کو اس بات کا قانونی اور اخلاقی حق پہنچتا ہے کہ لات مارے۔!

اور سچ پوچھیے تو اس لات میں برکت ہوتی ہے!!

پنجابی بھینس دنیا کی کسی بھی بھینس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مقابلہ کیا یہ سب سے آگے ہے۔ اتنی اونچی پوری اور شاندار ہوتی ہے کہ نظریں ٹک کر رہ جاتی ہیں۔ پیٹھ اتنی چکنی ہوتی ہے کہ ہاتھ پھیرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ لات ہی نہیں مارتی کبھی کبھی سینگ بھی مار دیتی ہے۔ اس لیے اس کی مرضی اور پسند کا ہر ایک خیال رکھتا ہے!

ویسے پہلے زمانے میں بھینس پالنا بے وقوفی کی ایک علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور عقلمند آدمی اسے کہا جاتا تھا جو بھینس نہیں پالتا تھا بلکہ دوسروں کی بھینسوں سے استفادہ کرتا تھا اور آج صورت حال مختلف ہے!

یہ دوسری بات ہے کہ پہلے بوڑھے بھینسوں کو پالتے تھے اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ لیکن آج کل بوڑھے بکریوں کو پال رہے ہیں اور نوجوان بھینسوں کے پیچھے پڑے ہیں جس کو دیکھو وہ کسی نہ کسی بھینس کی تلاش میں ہے۔ سنا کہ جتنی موٹی بھینس ہوگی وہ اتنا ہی زیادہ دودھ دے گی اور جس کے حصے میں بھینس آئے گی یا بھینس — بن جائے گا وہ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کا بڑا آدمی بن جائے گا۔ لکھ پتی —— کروڑ پتی ——

آسمان سے باتیں کرتا ہوا بنگلہ!!

دست بستہ کھڑے ہوئے خادم!!

اور دنیا اس کے مقدس قدموں میں!!

ڈِشم —— ڈِشم!!

ترقی اسے کہتے ہیں!

میرے دوست مسٹر عبداللطیف آرٹسٹ نے محمد خاں کی مثال دیتے ہوئے مجھے شرم دلائی اور کہا

کہ تم کہاں ہو؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اور ابھی تک تم سڑکوں پر پیدل گھوم رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔ اور تمہاری اس گونگی شرافت پر!

میں نے حیرت سے آنکھیں ملتے ہوئے اور منہ کھولتے ہوئے پوچھا کہ آخر محمد خاں راتوں رات کیسے لکھ پتی بن گیا۔ وہ مڈل پاس محمد خاں انتہائی نالائق، کاہل اور بے ایمان قسم کا آدمی تھا۔ کیا کوئی لاٹری اس کے نام آئی۔ یا ریس میں اس کا کوئی گھوڑا آگے نکل گیا!

عبداللطیف نے کہا، کوئی گھوڑا دوڑا نہیں بلکہ محمد خاں کی دانش مندی کام آئی۔ اور اس کی سچی محبت نے اسے یہ مقام عطا کیا!

واقعی حیرت کا مقام ہے! میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اور آخر کار اس کی ترقی کا قائل ہو گیا!

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ محمد خاں کی چالیس سالہ بیوی وہ دودھ دیتی بھینس ہے۔ جس نے اپنے بھائی بہنوں اور خاندان ہی کو نہیں نوازا بلکہ جس پر بھی کرم کی ایک نظر ڈالی وہ نہال ہو گیا!

محمد خاں ہندوستان میں رہتا ہے اور اس کی بیوی اس ملک میں رہتی ہے جہاں پیٹرول پانی کی طرح بہتا ہے۔ اور پانی پیٹرول کی قیمت پر بکتا ہے اور کھجور کے درختوں کی چھدری چھاؤں میں کوئی مسافر ایک لمحے کے لیے اپنی سانس کو درست کر کے آگے بڑھ جاتا ہے!

محمد خاں کی بیوی کسی سرکاری دواخانے میں ہیڈ نرس ہے۔ اور ہر ماہ ہزاروں روپیوں کا ڈرافٹ اپنے شوہر کو بھیجتی ہے اور ہر اس رشتہ دار کو بھیجتی ہے جو اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے ——

اور مسٹر سموئیل کی بیوی بھی وہ دودھ دیتی بھینس ہے جس نے اپنے شوہر کو لوور ڈیویژن کلرک کی کرسی سے اٹھا کر سمنٹ فیکٹری کا مینیجنگ ڈائرکٹر بنا دیا۔ کہاں ایک گھنٹی کی آواز پر فائل ہاتھ میں لیے دوڑ کر آنے والا ایک حقیر سا کلرک —— اور لمیٹڈ کمپنی کا مینیجنگ ڈائرکٹر جس کی ایک گھنٹی پر بڑے بڑے افسر دوڑ کر آتے ہیں معجزہ ہے معجزہ —— ! اور یہ معجزہ مسز پرمیلا سموئیل کی وجہ سے ظہور میں آیا!

لنچ کے ایک ٹیبل پر میرے ایک دوست نے میرا مسز پرمیلا سموئیل سے تعارف کروایا۔ اور میں نے محسوس کیا۔ دنیا کا مظلوم ترین انسان مسٹر سموئیل ہے!!

مسز پرمیلا سموئیل صرف کالی اور موٹی ہوتیں تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن انھیں دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ایسی جلی ہوئی روٹی ہیں جس کے جلنے کا کوئی اور چھور نہیں!

اس کے مقابلے میں مسٹر سموئیل اونچے پورے اور خوب صورت نوجوان ہیں۔ جب میں نے افسوس کا اظہار کیا تو ایک اور دوست نے مسز پرمیلا کی ایک اور خوب صورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جانتے ہو مسز پرمیلا دوسری کئی لمیٹڈ فیکٹریوں کی "شیر ہولڈر" ہے اور ان کا تیس فیصد سرمایہ وہاں کام کر رہا ہے اور جس کا مطلب ہے کہ ہر مہینہ لاکھوں روپیوں کا منافع —— یار! اپنے دوست سموئیل کے نصیب جاگ اٹھے!

اور مسٹر لیستہ والا تو پارسی تھا۔ اور خود شہر کے ایک بڑے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُسے بھی بھینس پالنے کا شوق چرایا۔ اور اس نے بھی اپنے آنگن میں ایک بھینس باندھ لی!

بھینس کا کوئی مذہب، کوئی زبان اور کوئی وطن نہیں ہوتا۔ بھینس، بھینس ہوتی ہے۔ بھینس کے رفیق حیات کو سانڈ کہتے ہیں اور سانڈ صاحب بھی اپنی جیون ساتھی بھینس کی طرح کھلے دل اور کھلے دماغ کے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوتا اور نہ کبھی ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں کو پوری پوری آزادی حاصل ہے کہ جہاں چاہے جائے اور جہاں چاہے رہ جائے۔ اگر ان سے کوئی کچھ کہہ دے تو اسے شخصی زندگی میں مداخلت سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی بات پر علٰحدگی کی نوبت آتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے!

بھینس اور سانڈ میں بنیادی طور پر ایک ہی فرق ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بھینس دودھ دیتی ہے اور سانڈ دودھ نہیں دیتا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ اسے شوق سے پالتے ہیں۔ پہلے زمانے میں شرفا اسے پالتے تھے اور اس کی خدمات صرف ڈیوڑھیوں اور کوٹھیوں کی حد تک محدود تھیں۔ لیکن جمہوریت میں اس کا حلقۂ اثر بڑھ گیا ہے اور وہ اپنے گاؤں اور شہر اور ملک کے لیے کام کرتا ہے۔ ایسے سانڈ میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور سانڈ ہوتا ہے جو آفاقی ہوتا ہے۔ اور جسے رنگ، نسل اور ملکی حدود میں محصور نہیں کیا جا سکتا، اور جو پوری دنیا کی خدمت کرتا ہے۔ آج یہاں تو کل امریکہ میں اور پرسوں روس اور چین کے دورے پر ——— ویزا ——— پاسپورٹ ——— ایرفلائٹ ——— ناشتہ یہاں تو لنچ لندن میں۔ اور ڈنر پیرس میں ڈشم با ڈشم!!

سانڈ کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اجتماعی مفادات کا خیال رکھتا ہے۔ اور سب کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرتا ہے۔ اور بھینس صرف دودھ دیتی ہے اور بچے پیدا کرتی ہے۔ بھینس کے بچے کو پاڑا یا بچھڑا کہتے ہیں جو بڑا ہو کر سانڈ کہلایا جاتا ہے۔ اور اپنے محلے یا شہر کا نام روشن کرتا ہے!

لیکن بھینس کی اہمیت اس سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ یہی تو ہے جو سانڈ کو جنم دیتی ہے!

ذرا دیکھنا! وہ سامنے فٹ پاتھ پر بس اسٹانڈ کے قریب کس شان سے بھینس کھڑی جگالی کر رہی ہے!

OO

لئیق صلاح

جاتے نہ تھے

یان کی ٹک کھٹ کھٹ کے ساتھ تیزی سے ان کی زبان بھی چلنے لگتی۔ وہ بھرکی ہے اسی لیے ستانے کے لیے
ید دیر خاموش ہو جاتی۔ اس لیے کہ اس کو اپنی بے جان زندگی عزیز ہے۔ لیکن پھوپھو ماں کی زبان الاماں کبھی
نے والی نہیں۔ خدانخواستہ وہ کیوں خاموش رہنے لگی۔ جس دن رُکی بس سمجھئے کہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

ہاں! تو ہم بچپن میں خوب باتیں کرنے پر اپنی دادی سے یہ طعنہ سنا کرتے تھے (اچھا ہوا زبان گوشت
ہے ورنہ اس رخ رخ سے کبھی کے رخصت ہو جاتی تو ہنتیں یہ مقولہ اپنے سے زیادہ پھوپھو ماں پر من و عن صادق نظر
۔ موضوعات کی کمی نہیں۔ الف لیلیٰ کی داستانیں بھی اس کے آگے ہار مان لیں۔ صبح سے شام تک عنوان
تلف ہوا کرتے ہیں۔

ان کے حسب نسب سے زیادہ واقفیت نہیں، بس اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک عرصے سے ہمارے
ں آیا جایا کرتی ہیں۔ جگ پھوپھی جسے موجودہ ترقی یافتہ زمانے میں انٹرنیشنل پھوپھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے
ے پیچھے کوئی نہیں۔ یگانہ و یکتا ہیں۔

سویرے جاگ جاتی ہیں ابھی پرندے بھی چہکنے نہ پاتے کہ ان کی بکواس شروع ہو جاتی۔ کبھی تو غسل خانے
ا ایک قطرہ پانی نہ ہونے کی شکایت سے حکایت کا آغاز ہوتا ہے تو کبھی فاضل پانی کے بے کار بہنے پر افسوس
شروع بحث رہتا۔ کمال یہ ہے کہ اس داستان سرائی کے لیے وہ کسی کی محتاج نہیں۔ مخاطبت اپنے آپ
ے سے رہتی ہے۔ غالباً MONOLOG (خود کلامیہ) اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

بہرحال! وضو بنا کر نماز شروع کر دیتیں۔ نماز اور تلاوت میں بھی زبان ہی چلتی ہے گو کہ اس اثنا میں دو سرد
قدرے سکون نصیب ہوتا ہے۔ مگر ان کی زبان حسب حال بحال۔ خصوصاً امتحانات کے زمانے میں
ان کی یہ عادت ہمارے لیے بڑی ہی اذیت کا باعث ہوا کرتی تھی۔ ہم جب اپنی پڑھی ہوئی چیزوں کا اعادہ کرنا
ہتے تو ٹھیک اسی وقت ان کی یہ لن ترانی شروع ہو جاتی۔

تمہید "محرومیٔ قسمت" ہوا کرتی۔ لیکن مرزا صاحب سے زیادہ باحوصلہ واقع ہوئی ہیں۔ وہ محرومیٔ قسمت سے تنگ آکر مرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تو struggle for existence پہ عمل پیرا ہیں۔ عموماً یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ گھر کا کوئی ملازم، انعام کی صورت میں کوئی شئے حاصل کرتا۔ خواہ آپ اس سے اچھی یا ویسی ہی چیز انہیں دیں۔ مگر قسمت جو کھوٹی ہے۔ تو وہ شئے ان کے لیے خراب ہی ثابت ہوتی۔ اب اپنے کارہائے نمایاں کا ذکر چھڑ جاتا کہ انھوں نے کس قدر دیانت داری، وفاداری سے ساتھ دیا۔ مگر افسوس کوئی قدر داں نہیں اور ساتھ ہی فریق ثانی کی شکایتیں کہ وہ ان کے آگے ہیچ ہے۔ نگاہیں بچا کر چیزیں غائب کر دیتا ہے۔ اپنے پورے خاندان کی سرپرستی ہمارے ہی لوٹتے ہوئے خزانے سے کر رہا ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ وقفہ صرف اسی وقت ملا کرتا جب وہ چائے کا ایک گھونٹ یا روٹی کا ایک لقمہ حلق سے اتارتیں۔ یہ بے پرکی باتیں، تو اسی وقت لطف دیتیں۔ جب ذہن میں دوسری باتیں نہ ہوں۔ واقعی میں نے یہ تمنا کی ہے کہ کبھی نہ کبھی ان کی چرب زبانی ٹیپ کروں" دی اگر فرصت زمانے نے" کا انتظار ہے۔ دیکھئے حسرت کب پوری ہوگی۔

سینے پرونے میں اپنے وقت کی ماہر فن مانی جاتی ہیں۔ ہم بھی ان کی مہارت کے قایل ہیں۔ مگر وہ "انا" ان میں بھی ہے جو عموماً ہر فن کار کو دوسروں پر اپنے آپ کو ترجیح دینے پر اکساتی ہے۔ اوروں کا سیون تو ان کی نظروں میں بھاتا ہی نہیں ایک ایک ٹانکے میں خامی نظر آتی ہے اور پھر مقابلہ اپنے آپ سے ہونے لگتا ہے۔ ہمارا سیون دیکھو کیسے نفاست اور مضبوطی سے کیا گیا تھا۔ تین پشت تک اس کا ایک بھی ٹانکا ادھڑ نہ سکا۔ گو کہ کپڑے نے بوسیدگی کے سبب ٹانکے سے وفاداری کا رشتہ استوار نہ رکھا"!

خیر گذرتی اگر بات اس پر ختم ہو جاتی۔ مگر یہاں تو وہی معاملہ ہے "بات پہنچی تری جوانی تک" اب یکے بعد دیگرے ان ٹانکوں کی ادھیڑبن میں اس کا پورا ماضی ان کی دماغی تہوں سے ابھرنے لگتا ہے۔ "اُنہہ" کون قدر کرنے والا، کام نکلا اور بھول گئے۔ سیتے سیتے ہاتھ چھلنی ہوگئے، بیٹھ تختہ ہوگئی۔ بینائی کمزور ہوگئی" وغیرہ

پکوان میں بھی انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ آدم نے انھیں لذائذ کی بنا، جنت کو چھوڑا تھا۔ لہٰذا حوا کی بیٹی کے حصے میں ساری لذت آگئی۔ کوئی اور ذکر اتنے پرلطف انداز میں بیان نہیں کرتیں۔ جتنا کہ کھانے پکانے کا۔ "کُلو واشربو" پر پورے حواس خمسہ سے ایمان لائی ہیں۔ ان کے اپنے عہد کی جو پکنک تھی وہ "آخری چہار شنبہ" یا کسی "درگاہ کی سیر" اس سلسلے میں تمام باتیں مختصر ہوتیں صرف پکوان کی تفصیل سنیے۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے، چٹخارے لیتے ہوئے ایک ایک چیز کا بیان شروع ہوتا۔ جزئیات تک فراموش نہیں ہوتیں۔ گھی ایسا کنی دار کہ اس کی سوندھی بوسست کر رہی تھی۔ میدہ ایسا سفید، دودھ کی طرح، شکر ایسی ..... بہرحال! جب اس سے ہٹ کر گوشت وغیرہ کا رخ کرتیں تو وہاں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیتیں۔ بکرے کی تاریخ بیان ہوتی۔ کب خریدا گیا۔ کیا کیا کھلائے، کیسا پٹھا نظر آتا تھا۔ سینگ کیسے تھے، کان کس طرح کھڑا کرتا تھا۔ اتنا موٹا تازہ، اونچا بتلاتیں کہ وہ "بکرا" تصور میں اونٹ کے مماثل نظر آتا۔ پھر کٹنے کے بعد کتنا گوشت نکلا۔ کلیجی کتنی بڑی تھی گویا گردے، کلیجی کے ہاتھ لگا تو پھر کلیجی کے متعلق آپ ہی قیاس آرائی کیجئے۔ اب اس گوشت سے

ہر قورمے تک کے تفصیلی نوٹس فراہم کرتیں۔ قربان جائیں۔ اس یادداشت کے کہ جوہر پکنک کے مینو، ایک دوسرے سے گڈمڈ ہونے نہیں دیتیں۔ اور ہوا، گے بھی کیسے؟ وہاں سوائے اس کے کوئی دوسری بات دماغ میں محفوظ ہی نہیں آج تک ہم نے کبھی کسی مقام کی تعریف کرتے ہوئے انہیں نہیں سُنا۔

ان تمام خوبیوں میں ایک سب سے اہم خوبی جو ہمارے لیے تفریح طبع کا باعث ہوا کرتی، وہ ہے ان کا "بزدل پن"۔ گو بظاہر وہ اپنے آپ کو رستم زماں ثابت کرتی ہیں مگر وہی بات ع

بوقت جنگ سب آگے تو پیچھے ہم
اگر وقت فراری ہو تو سب پیچھے اور آگے ہم

کئی بار ہم نے ان کی آزمائش کی اور جب یقین ہو گیا کہ ہمارے حربے آسانی سے چل سکتے ہیں تو موقع بہ موقع ان کو کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ بارش کا موسم شروع ہوا، خلاف توقع بارش زیادہ ہو گئی۔ بس وہ آنکھیں پھاڑے مصلے پر بیٹھی جان ہو گئیں۔ (اخبار وغیرہ تو پڑھنا نہیں آتا۔ اب گویا (golden chance) گولڈن چانس ہمارے ہاتھ آ جاتا۔ وہ سننا بھی نہیں چاہتیں لیکن ہم ان کو کیسے نظر انداز کر سکتے۔ اس لیے ان کو سنانے کے بہانے اور وہاں موجود ان کے آس پاس رہتے بڑھا چڑھا کر خبریں سناتے۔ کبھی تو یہ کہتے کہ اب گنڈی پیٹھ میں پانی کی سطح بالکل قریب آ گئی ہے اور اپنا گھر تو پہلے ہی لوٹ کے حوالے ہو جائے گا۔ بعض اوقات نہ جانتے صبر کی تلقین کوئی مینی طاقت کرتی ہو گی تو وہ کچھ دیر دم سادھے بیٹھی رہتیں۔ ہمیں ان کی خاموشی ایسے وقت بالکل ناگوار گزرتی۔ اس لیے زیب داستان کے لیے کچھ اور باتیں بڑھانی پڑتیں۔ بالآخر پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا۔ پھر "جوش اشک" کی اس منزل پر جس کا ذکر مرزا غالب نے کیا ہے وہاں لا کر چھوڑ دیتے۔ جب بھی ہم ان کو ایسے واقعات سنا کر زیادہ پریشان کر دیتے تو وہ اپنے "ملجا و ماویٰ" یعنی اپنے پیر و مرشد کے گھر تشریف لے جاتیں۔ اس عقیدہ سے کہ وہاں ایسی خبریں سننے میں نہیں آتیں۔ یہاں کے اخبارات جھوٹی خبریں چھاپتے ہیں۔ لیکن یہ مصیبت تو بہت جان لیوا ہوتی۔ کیونکہ بارش میں ایسے مقامات سے نہیں گذرتیں جہاں راستے میں پانی نظر آئے اور خدا کی کرنی دیکھئے کہ پیر و مرشد گھر ندی کے اس پار ہے۔ اس لیے وہ پہلے ہی یہ التجا کر آتیں کہ بارش کے ختم ہونے تک وہ ان کے دیدار کا شرف حاصل نہ کریں گی۔ اب تو بچنے کی کوئی امید نہیں۔ خوب دل کھول کر ہم اپنی ہوس نکال لیتے۔

توہمات بھی ان کے دل پر اپنا پورا قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ معمولی باتوں کو وہ آسان نہیں سمجھتیں، الٹے ہماری ہی مذاق اڑاتی ہیں کہ ہم ایسے کج فہم ہیں جو ان باتوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ ہندوستان میں جب گولڈ کنٹرول کا قانون نافذ ہوا تو اسی وقت کا یہ واقعہ ہے۔ کوئی امریکن لڑکی جو مسلم کلچر پر ریسرچ کر رہی تھی ہماری ایک لکچرار صاحبہ کے توسط سے ہمارے گھر آئیں۔ شادی بیاہ اور دیگر رسومات سے آگہی مقصود تھی۔ ہمیں مروجہ زیور اور ملبوسات وغیرہ سب اُسے دکھانے پڑے۔ اس نے بعضوں سے ٹیپ بھی لیا۔ گھر کے تمام افراد اس نمائش میں موجود تھے۔ سوائے موصوفہ کے وہ کمرہ بند کیے دل ہی دل میں کڑھ رہی تھیں۔ غالباً انھیں اس بات کا خدشہ تھا کہ حرف شکایت زبان پر لائیں تو وہ بھی ٹیپ ہو جائے گا۔ اس لیے جاری کے رخصت ہوتے ہی، آپ باہر تشریف لائیں اور کہنے لگیں۔

کہ وہ بھیدی ہے۔ معلوم کرنے آئی ہے کہ کس کے پاس کیا ہے۔ ابھی اپنی آواز بھی اس کو بھر کر دیتے۔ بچوں کے ساتھ بوڑھے بھی بہک گئے۔ افسوس صد افسوس۔

انسان تو انسان انھیں بعض اوقات جانوروں پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ خالی از مطلب نہیں مثلاً کوئی بھینس بندر اور کتا وغیرہ آجائیں تو صدقی صد لقین کے ساتھ کہیں گی کہ یہ دشمنوں کی بھیجی ہوئی ہیں یقین نہ کریں تو ناراض ہو جاتی ہیں اور اپنے تجربات دہرانے لگتی ہیں۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ خاموش رہ جائیں۔ ◻◻

اشفاق انجم ⌒ طالب خوندمیری

[مالیگاؤں کے ممتاز شاعر اشفاق انجم کے چند اشعار پر طالب خوندمیری کی پیروڈیاں]

ابھی شعور کو پہنچا نہیں ہے دلِ انجمؔ
کھلونے دیکھ کے اکثر مچلنے لگتا ہے

سنِ شعور کو پہنچا نہیں ابھی انجم
کھلونے دیکھ کے اکثر مچلنے لگتا ہے

★

پہلے خود اپنی ذات میں غوطہ لگائیے
پھر شوق سے جناب سمندر کھنگالئے

پہلے خود اپنے حوض میں غوطہ لگائیے
پھر شوق سے جناب سمندر کھنگالئے

★

وہی ہوا، وہی موسم، وہی فضا کب تک
نگاہِ شوق کوئی انقلاب مانگے ہے

وہی مکاں، وہی بیگم، وہی وفا کب تک
نگاہِ شیخ کوئی انقلاب مانگے ہے

★

انجمؔ سے نیکیوں کا بھی مانگا گیا حساب
محشر میں بھی غریب کو رسوا کیا گیا

انجم سے بیویوں کا بھی مانگا گیا حساب
محشر میں بھی غریب کو رسوا کیا گیا

★

آنے والوں کے لئے باعثِ عبرت ہوگی
اپنی تصویر کو البم میں سجاؤ یارو

آنے والوں کے لئے باعثِ نفرت ہوگی
اپنی تصویر نہ البم میں سجاؤ یارو

★

کر دیئے ہم نے ہی مسدود خلا کے رستے
آسماں سے کوئی اُترے گا فرشتہ کیسے

کر دیئے ہم نے ہی مسدود خدا سے رشتے
آسماں سے کوئی اترے گا فرشتہ کیسے

جوہر سیوانی

"خوشبو تو مسافر ہے کھو جائے گی راہوں میں"

اک شوخ پٹاخہ ہے، زاہد کی نگاہوں میں
ایمان سمٹ آیا کیوں کفر کی باہوں میں

ہر رات منسٹر کی ہے عیش کی باہوں میں
جنتا کی گذرتی ہے آہوں میں کراہوں میں

کالج تو وہ جاتی ہے پڑھنے کے لئے لیکن
ہر گام پہ ناگن سی لہراتی ہے راہوں میں

پہلے تو وزیروں میں تھی، عام جوا بازی
یہ عیب چلا آیا کیوں آج کے شاہوں میں

مسجد میں گذرتا ہے دن حضرتِ واعظ کا
اور رات گذرتی ہے دلگیر کی باہوں میں

مر کر جسے بننا ہو داروغہ جہنم کا
بے خوف گذارے وہ ہر لمحہ گناہوں میں

ہر شخص کو چرخہ جب جیون کا چلانا ہے
کیا فرق رہے باقی شیخوں میں جلاہوں میں

رومال معطر وہ سسرال چلے لے کر
خوشبو تو مسافر ہے کھو جائے گی راہوں میں

اس نے ہی نکلوایا فردوس سے آدم کو
زن زہر کی پڑیا ہے جوہر کی نگاہوں میں

عالم تاجپوری

غزل

معشوق کا چہرہ تو گھونگھٹ ہی کے اندر تھا
پھر کون سمجھ پاتا مادہ تھا کہ وہ نر تھا

اک یہ بھی زمانہ ہے بھیگی ہوئی بلی ہوں
اک وہ بھی زمانہ تھا فرعون کا لیڈر تھا

بندر تھے سبھی انساں انگریز کی تھیوری سے
لگتا ہے کہ یہ دادا اس کا کوئی بندر تھا

جیسے ہی کہا میں نے اب کتنا ستم ہوگا
اتنے میں ہی منہ اس کا بس لال چقندر تھا

مرتے ہی مرا لڑکا کہنے لگا تھانے میں
میری ہی طرح فادر اس شہر کا لوفر تھا

بال اس نے منڈایا جب تب راز کھلا مجھ پہ
دل جس کو دیا میں نے وہ مِس نہیں مسٹر تھا

وہ جس پہ بڑھاپے تک دل میرا نچھاور تھا
ماں اس کی مہترن تھی باپ اس کا کلکٹر تھا

نوید مسیح الدین

آخر ایک دن ہم اپنی بے روزگاری سے تنگ آ گئے۔

ہمیں اپنی بے روزگاری کا اور بھی شدت سے احساس اس وقت ہوا جب کہ ہماری گرل فرینڈ نے بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے بڑے ہی خوش گوار موڈ میں ہم سے مونگ پھلی کی فرمائش کی۔ اس وقت تو ہم بہت ہی خوش اسلوبی سے ٹال گئے لیکن ساتھ ہی ہماری بے مائیگی پر اس کے ارمان مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرح فٹ پاتھ پر بکھر گئے۔ اس دل خراش حادثہ کے بعد ہم کئی دنوں تک افسردہ خاطر اپنی تنگ دستی کے متعلق سوچتے رہے ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ ہم بچپن سے فطری طور پر نکمے اور حد درجہ کے کاہل تھے اور محنت سے جی چراتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہماری عقلِ سلیم نے یہ بات تسلیم کی کہ

ع بیکار مباش کچھ تو کیا کر

ماں باپ کی روٹیاں کب تک توڑتے چنانچہ روزگار کی تلاش میں نکل پڑے اور کسی رسیلے چارہ گر کو ڈھونڈنے لگے جس کی زنبیل میں نسخۂ کیمیا جیسے روزگاری سلے اور کچھ علاج مداوائے شکم پری بھی ہو لیکن خوبیٔ قسمت سے کافی دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی راہ نہ نکل سکی بالآخر صدق دل سے درس و تدریس کے پیشہ کو اپنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس کے باوجود بھی کوئی بھی اللہ کا نیک بندہ اپنے بچوں کو ہماری شاگردی میں دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ کیونکہ انھیں اپنے بچوں کا مستقبل ہمارے ہاتھوں میں محفوظ نظر نہ آتا تھا۔ مجبوراً ہم خوانچہ والوں کی طرح گلی گلی پھر کر اس طرح آواز لگانے پر تیار ہو گئے۔

ٹیوشن کرالو........!

انگلش، سائنس، حساب سکھالو.....!

لیکن افسوس کہ کسی نے اس جانب توجہ نہ دی۔ پھر بھی ہم نے دامن ہمت کو نہیں چھوڑا اس اثناء میں ہماری ملاقات ایک دیرینہ شفیق استاد سے ہوئی۔ ہم نے ان سے مشورہ چاہا وہ ہم سے آدھی کپ چائے پی کر ادھ بجھی بیڑی کو دوبارہ جلا کر ہمارے متعلق کافی دیر تک بڑی سنجیدگی سے غور کرتے رہے اور پھر اپنے نیک مشورہ سے ہمیں سرفراز فرمایا۔

کہنے لگے:" برخوردار تم ذرا اپنا حلیہ بدل لو، بھلا مجنوں سے کوئی پڑھتا ہے۔ اپنی صورت شریفوں جیسی اور حالت ماسٹروں جیسی بناؤ۔ پھر ہم سے ملنا نہ بھولو۔"

ہمیں بچپن سے ہی ماسٹروں کی حالت دیکھ کر کچھ ہول سی اُٹھتی تھی۔ اب ہمیں اسی حلیہ کو اختیار کرنا تھا۔ بالآخر ہم کسی ماڈل مدرس کی تلاش میں نکل پڑے، بڑی تلاش اور جستجو کے بعد ایک ایسی شخصیت مل ہی گئی جو صدفی صد مدرس ہی تھی۔ ہم نے ان کا بغور جائزہ لیا۔ چہرہ پر ویرانی، پچکے ہوئے گال، کھچڑی نما بال، شیو بڑھی ہوئی۔ ٹریکاٹ کا بوسیدہ بشرٹ جس میں سے پھٹی ہوئی بنین کے دائرے جھلکتے تھے۔ اور پتلون رفوگری کا شاہکار۔ ٹائر کی گھسی ہوئی چپل، جیب میں پرانی دستی جو کلاس میں ڈسٹر اور لنچ میں دسترخوان کا کام دیتی تھی۔ ایک عدد پن جس کا ٹوپ کسی دوسرے پن کا اور وہ بھی کلپ سے بے نیاز۔ یہ تھا کل اثاثہ ایک عدد ماسٹر کا۔ انھیں دیکھتے ہی منہ سے ایک آہ سرد نکلی۔ اے پروردگار کے خدا۔ یہ قوم کا معمار ہے یا کوئی مظلوم قیدی؟" اب ہم بھی اسی انجام کو پہنچنے والے تھے۔

بہرحال ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ملک پیٹھ ریلوے برج کے نیچے ٹاٹ پر بیٹھ کر ایک قدیم دیہاتی حجام سے حجامت بنوائی تاکہ حلیہ سے کوئی چھورا اُچکّے نہ معلوم ہوں۔ اور نازوں سے پلے لمبے بالوں کو "جلاوطن" کیا۔ پھر بڑی حد تک مدرس کا روپ اختیار کرنے اور طبیعت میں سنجیدگی لانے میں کامیاب ہوگئے۔ ہماری یہ حالت دیکھ کر وہ شفیق استاد بھی بہت خوش ہوئے اور ایک عدد ٹیوشن دلوائی۔ اس کے بعد خدا کا کرم ایسا ہوا کہ یکے بعد دیگرے ہمیں کئی اور ٹیوشن ملے۔ اب اس پیشہ کو خوب چمکانا تھا۔ لیکن ذرائع آمدورفت کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے ہماری یہ مجبوری روزگار کو وسعت دینے میں مانع تھی۔ ہمارے چند کرم فرماؤں کو جب ہماری اس لاچاری کا علم ہوا تو سبھوں نے رضاکارانہ طور پر ازراہ ہمدردی اپنی پرانی سیکلوں کے فالتو پرزے عطا کیے۔ ہم نے شبانہ روز کی محنت سے ان عطیات کو جوڑ کر ایک ایسی شے وجود میں لائی جو سیکل سے مشابہ تھی۔

ہم اس سیکل پر سوار ہو کر بڑی بے نیازی سے کوئے یار سے نکل کر سوئے شاگرد روانہ ہوتے۔ ٹائروں میں لگے گیا ٹروں کی وجہ سے سیکل سواری کی بجائے اونٹ کی سواری کا گمان ہوتا تھا۔ اور اس پر بھی یہی مثل صادق آتی تھی "اونٹ رے اُونٹ تیری کونسی کل سیدھی؟" غرض ہم اسی سیکل پر پڑھانے کے لیے جاتے تھے۔

ابتدا میں ہم اپنے ان شفیق اُستاد کی سفارش پر جناب حیدرحسین صاحب کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے یہ ٹیوشن ہمارے لیے بہت ہی اہم تھی کیونکہ یہیں سے ہمارا کیریر شروع ہوا تھا۔ یہاں ہمیں پورے چھے بچوں کو سنبھالنا پڑتا تھا۔ حالانکہ بیگم حیدرحسین خود کسی مدرسہ نسواں میں معلمہ تھیں لیکن ان کے بچوں کو پڑھانے کا اعزاز ہمیں ملا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم ان کے بچوں کو پڑھا یا نہیں کرتے تھے بلکہ شام کو جب وہ ملازمت سے لوٹتیں تو ان کے بچے کافی اُدھم مچاتے تھے اور گھریلو کام کاج میں خلل ڈالتے تھے۔ اس لیے ہمیں بچوں کو کھیل کھلانا اور دل بہلانا پڑتا تھا اور کبھی کبھی ان کے ننھے کو شیشی سے دودھ پلانا ضروری تھا۔ اس طرح بہ لحاظ خدمت معاوضہ بھی مل جاتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے ہم حیدرحسین صاحب کے بچوں کو سنبھالنے میں مصروف تھے۔ ان کے ایک دوست کسی کام کی غرض سے ان سے ملنے کے لیے آئے جب ہمیں بچوں کو پڑھاتا ہوا دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ایک قسم کی

چمک پیدا ہوئی۔ گویا انھیں برسوں سے ہماری تلاش تھی۔ پھر وہ ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے یوں مخاطب ہوئے۔
برخوردار! میں بھی اپنے لڑکے کے لیے ٹیوشن رکھنا چاہتا ہوں اور مجھے زمانے سے کسی شریف اور ایمان دار ٹیوٹر کی تلاش ہے۔ کیا آپ میرے بچّے کو پڑھانے کی زحمت کریں گے!

ہم نے کہا۔ "قبلہ! آپ کو کسی شریف اور ایمان دار ٹیوٹر کی تلاش ہے۔ بھلا میں اپنی شرافت اور ایمان داری کا صداقت نامہ کہاں سے لاؤں!"

وہ بولے۔ "آپ اس کی فکر نہ کریں میں تحقیق کرلوں گا۔"

اس کے بعد پتہ نہیں وہ کہاں کہاں ہمارے متعلق تحقیق کرتے رہے جب وہ خوب مطمئن ہو گئے تو ہم سے درخواست کی کہ ان کے بچّے کو پڑھانے آجائیں۔ "اندھا کیا چاہیے؟ دو آنکھ۔" اس لیے انکار کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اس گھر میں ہمارے ساتھ جو برتاؤ ہوتا تھا وہ کسی چور سے کم نہ تھا۔ ہر روز ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے دیوان خانہ کا تمام قیمتی سامان اندر منتقل کر دیا جاتا اور بچے کچھے سامان کی نگرانی کے لیے چلمن کی اوٹ سے آنکھیں ہماری موجودگی تک ہماری ہر ہر حرکت کا جائزہ لیتی رہتیں۔ غرض ہمیں کسی مجرم قیدی کی طرح کڑی نگرانی میں اپنا کام انجام دینا ہوتا۔ خدا کا احسان ہے ایک دن ہم اپنی جامہ تلاشی سے بال بال بچ گئے۔ ہمارا قصور صرف اتنا تھا کہ ہم نے ایک گلاس پانی لانے کے لیے لڑکے کو اندر بھیجا تھا۔ لیکن جب ہم یہاں سے فراغت پاکر باہر نکلے۔ دوبارہ اندر بلا لیے گئے۔ پھر ہماری موجودگی میں تمام چیزوں کی تنقیح کی گئی۔ تب کہیں ہمیں باعزت بری کیا گیا۔ اس واقعہ سے گھبرا کر جب پڑوسیوں سے پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ ہم سے قبل جو ٹیوٹر مقرر ہوئے تھے۔ وہ اپنا حق محنتانہ جنس کی شکل میں وصول کرلیا کرتے تھے۔ کیونکہ انھیں اس گھر سے کبھی اپنی فیس نہ مل سکی تھی۔

اب ہم ایک اور دلچسپ ٹیوشن کا انکشاف کرتے ہیں۔ یہ ایک انوکھی ٹیوشن تھی۔ ہم شاگرد کے گھر صبح صبح خدمت انجام دینے جاتے تھے۔ شاگرد موصوف کو کرکٹ کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے شام میں انھیں پڑھنے کو وقت نہیں ملتا تھا۔ اور ماں باپ کے بیجا لاڈ و پیار سے اس قدر بگڑ چکے تھے کہ نو بجے تک پڑے سوتے رہتے۔ اس کے بعد اگر کچھ موڈ ہوتا تو پڑھ لیتے ورنہ پھر وہی کرکٹ۔ لیکن یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ ہم صبح سویرے آخر کسے پڑھاتے تھے؟ بات دراصل یہ ہے کہ روز اول جب ہم یہاں پڑھانے کے لیے آئے تو بہت دیر تک لاڈلے شاگرد کے اٹھنے کا انتظار کرتے رہے۔ دوسرے تیسرے دن بھی یہی عالم رہا۔ مجبوراً ہم نے ان کے والد محترم سے کہا۔ "محترمی اس طرح بے کار بیٹھے رہنا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ آپ۔۔۔

۔۔۔" ہم نے ابھی اپنی بات مکمل ہی نہیں کی تھی۔ وہ بیچ میں بول پڑے۔ "یقیناً آپ بہت خوددار معلوم ہوتے ہیں۔ واقعی آپ کو اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا اچھا نہیں لگتا تو کیوں نہ آپ بچے کے بیدار ہونے تک ترکاری لادیں۔" پہلے تو جی میں آیا کہ الٹے پاؤں لوٹ جائیں اور پھر کبھی اس گھر کا رخ نہ کریں۔ لیکن بزرگوں کا قول ہے۔ "ملتی روٹی کو لات نہیں مارنا چاہیے۔"

سو ہم روزانہ سودا سلف لانے لگے۔ اس طرح ہماری "آمدنی" میں بھی کچھ اضافہ ہوا۔ جب سے ہم یہ کام کرنے لگے تھے۔ صاحب خانہ کو بڑھتی ہوئی گرانی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ اگر ہم کچھ دن اور اس کام پر مامور رہتے تو صاحب خانہ کا دیوالیہ یقینی تھا۔ لہٰذا وہ صبح سویرے ہی اپنے لاڈلے کو جگا کر ہماری خدمت میں حاضر کرنے لگے۔

ان ہی دنوں ہمیں مہمل مدراسی کے لڑکے کی استادی قبول کرنے کا پیش کش کیا گیا۔ ہمیں کوئی پس و پیش بھی ان کے نام سے گمان گزرا کہ وہ شاعر ہیں۔ لیکن یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ کسی دفتر میں منتظم ہیں۔
(کاش کہ ہمیں قبل از وقت معلوم ہوتا کہ موصوف کو شاعری کا بڑا شوق ہے اور گھر پر فالتو وقت میں طبع کرتے ہیں) تو ہم ہرگز ہرگز ان کے بچے کو پڑھانے راضی نہ ہوتے۔ یہاں پر بھی ہم پڑھائی لکھائی سے دور رہے۔ لیکن شاعر صاحب کی بے سر و پا غزلیں سننے کے لیے مجبور تھے۔ ہم ہر روز بلا تحمل اُن کی غزلیں سن سن کر داد دیا کرتے تھے۔ اور ہمیں ہر ماہ داد دینے کی فیس پیشگی مل جاتی۔ البتہ ان کی غیر معیاری اور مہمل غزلیں سن کر ہمارے ادبی کا معیار گر گیا۔ مگر کیا کرتے۔ فیس جو مل جایا کرتی تھی۔
اب سوچتے ہیں کہ اپنے اس مضمون کو اس شاگرد کے نام منسوب کردیں جس نے ہمیں روزمرہ کی دوڑ دھوپ اور صبح شام کی دماغ پاشی سے نجات دلائی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مہمل صاحب کے گھر پڑھانے کے لیے پہنچے۔ مہینہ تھا اور گرمی شباب پر تھی۔ ہماری سیکل دھوپ میں رکھی دیکھ کر ہمیں خدشہ ہوا کہ کہیں ٹیوب کی ہوا خارج نہ ہو۔ اپنے شاگرد سے کہا: "ذرا ہماری سیکل چھاؤں میں رکھ دینا۔ حکم کی تعمیل میں وہ اس طرح دوڑ پڑا جیسے خلیفہ ہارون کے دونوں لڑکے اپنے استاد کی جوتیاں اٹھانے دوڑ پڑے تھے۔ لیکن کافی انتظار کے بعد وہ نہ آیا اور نہ سیکل کا پتہ چل سکا۔ ہم بہت گھبرائے اور لڑکے کے والد کو اطلاع دی کہ "ہم نے لڑکے کو سیکل چھاؤں میں رکھنے کے لیے کہا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا۔ کیا بات ہے؟"
اس پر وہ آہِ سرد بھر کر کہنے لگے: "تو پھر یقیناً آپ کی سیکل چھاؤں میں رکھ دیا ہوگا۔"
ہم نے پریشانی کے عالم میں نظریں دوڑائیں۔ اور کہا: "چھاؤں تو چھاؤں ہماری سیکل دھوپ میں بھی نظر نہیں آتی" وہ کچھ افسردہ خاطر ہو کر معنی خیز انداز میں کہنے لگے۔ کم بخت نے حقیقی چھاؤں کو مجازی چھاؤں سمجھ کر سیکل مارواڑی کے ہاں گروی رکھ دی ہوگی۔ یہ بات بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ بس اسی دن سے ہماری سیکل "چھاؤں" ہی میں ہے اور ہم بھی چھاؤں تلے ہیں۔

دو غزلیں

کرگس سہوانی

چالاک ہے چتر ہے بہت ہوشیار ہے
میں جانتا ہوں خوب عدو نابکار ہے

اپنا یہ حال ہے کہ نہ گھر ہے نہ دوار ہے
اور لوگ کہہ رہے ہیں بڑا مالدار ہے

اس کشمکش میں آج دل بے قرار ہے
اتنا نہیں ہے مال کہ جتنا اُدھار ہے

یہ حسن، یہ ادا، یہ نزاکت، یہ شوخیاں
لیکن یہ صرف چند ہی دن کی بہار ہے

جس وقت سے سنا ہے وہ آئیں گے میرے گھر
اس وقت ہی سے ایکسو اور دو بخار ہے

اغیار کی تو سنتے ہو "اسٹوری" غور سے
میری ہر ایک بات تمہیں ناگوار ہے

آیا تھا کون بزم میں اور کون چل دیا
گنتی نہیں ہے اس کی نہ اس کا شمار ہے

شرم و حیا کی قید میں کاٹے جا زندگی
مانا ترقیوں پہ زمانہ ہزار ہے

اُن کی نقاب اٹھائی تھی نیت بُری نہ تھی
اتنی سی بات بھی تو انھیں ناگوار ہے

غیروں سے بوسہ بازی ہوئی تو ہے غالباً
کیوں ورنہ تیرے گالوں پہ اتنا نکھار ہے

پکڑا جو میں نے ہاتھ تو بولا بہانہ ساز
لِلّٰہ چھوڑ دیجئے مجھ کو بخار ہے

تو غیر سے تو مل مگر اتنا رہے خیال
کرگس غریب بھی ترا امیدوار ہے

○

عدو کو کھیر کھلوا دی ملا کر کیسٹر آئل میں
بڑی مشکل سے پھانسا ہے دنا دن میں ٹلاٹل میں

وہ جوتوں کی تڑا تڑ سے پھنسا ہے سخت مشکل میں
عدو کی ناچیوشی ہو رہی ہے ان کی محفل میں

کبھی کہتا ہوں یہ دل سے کبھی آتا ہے یہ دل میں
عدو کے چار چھ ڈنڈے لگا دوں ان کی محفل میں

سیاہی جابجا وہ خود رُخِ رنگیں پہ ملتے ہیں
نظر آئے ہیں ان کو داغ جب سے ماہِ کامل میں

مجھے بیڑی کا بنڈل اور عدو کو پانچسو پچپن
کہیں جوتا نہ چل جائے ستمگر تیری محفل میں

نظر میں آج کل کے نوجوانوں کی وہ بدھو ہے
نہیں دیکھی ہیں جس نے کم سے کم دو چار سو فلمیں

خدا کی شان ہم کو آج وہ آنکھیں دکھاتے ہیں
بھرا کرتے تھے جو کل تک ہماری رات دن چلمیں

رقیبِ روسیہ کو ایک دن لے ڈاکٹر صاحب
ذرا سی "اوبیم" دیدو ملا کر کیسٹر آئل میں

اُنھیں آتے ہوئے تکلیف سی محسوس ہوتی ہے
جو ممکن ہو تو اک جو کھٹ لگاؤں خانۂ دل میں

جو آنا ہے تو آجاؤ کہاں تک انتظار آخر
تمنائیں بڑا اودھم مچاتی ہیں مرے دل میں

پولیس کو دے کے جُل نکلا تو دیکھو شومیِ قسمت
پھنسایا میری گھر والی نے مجھ کو شادی ہال میں

نیازِ عاشقی کی شان تم کیا خاک دیکھو گے
نہ سرمہ ہے نہ کاجل ہے تمہارے دیدۂ دل میں

نہ کر کچھ فکر حفظِ ماتقدم کی ارے کرگس
تجھے تو جان ہی دینا ہے جاکر کوئے قاتل میں

نظریات

علی حمزہ خاں شعور

ایک لڑکے نے ایک مِس سے کہا | مجھ کو تجھ سے پریم ہے ڈارلنگ | Darling
جیسے دلکش سڈول تن میں ہے | حسن سازی کی لاجواب سٹنگ | Setting
زلف تیری گھٹا ہے ساون کی! | اور چہرہ ہے چاند کی میچنگ | Matching
ہے جوانی میں زورِ طغیانی | اور آنکھوں میں بجلیوں کی فٹنگ | Fitting
ہوش میرے اُڑائے دیتی ہے | تیرے سیمیں جمال کی شائننگ | Shining
جب سے دیکھا ترا رُخِ انور! | دل میں پیدا ہوا جنون لوِنگ | Loving
ہے تمنا کہ تیرے دل میں بھی | نظرِ التفات کی ہو وِشنگ | Wishing
کاش اتنا ہی رحم ہو جاتا | مجھ کو ملتی تیرے لبوں کی کِسنگ | Kissing
زیرِ لب مسکرائی رشکِ قمر! | سُن کے عاشق کی احمقانہ گِسنگ | Guessing
ہنس کے بولی کہ دورِ حاضر میں | عشقِ مفلس کا 'ریگ' پر ہے شپنگ | Shipping
کسی اوسر زمین پر تو نے! | کبھی دیکھی گلاب کی ہو بڈنگ؟ | Budding
کسی مفلس نے عشق بازی کی | کبھی جیتی نہیں ہے ایک اننگ | Inning
حُسن کی منقبت کے سِکّے سے | کہیں ہوتی ہے پیار کی شاپنگ | Shopping
میں تو کیا خود جنابِ کیوپڈ نے | کسی نادار کی نہ کی بیکنگ | Backing
لد گیا وہ زمانہ نحچیر پرا | جبکہ ہوتی تھی مفلسوں سے لوِنگ | Loving
مال و دولت کے ہنٹ سے ہوتی ہے | آجکل جسمِ دلبراں کی فشنگ | Fishing
دال روٹی پہ ہے بسر کرتا | تیرے کھانے میں بیف ہے نہ پڈنگ | Pudding
نام سے تیرے بنک کھاتوں میں | نہ ہے ڈالر، نہ پونڈ ہے نہ شلنگ | Shilling
مفلسی میں طلب محبت کی! | دل کا دھوکا ہے عقل کی ہے مسنگ | Missing
تیرے بس کا نہیں ہے یہ دھندا! | چھوڑ ناداں کوئے بتاں کی بگنگ | Begging

غزل

سراج نرملی

آج تک لفٹ کسی ماہ جبیں نے نہ دیا | "مجھ سے روٹھا ہوا، خود میرا مقدر نکلا"
بھاگ چلنے کو مرے ساتھ وہ نکلے جوں ہی | ہاتھ میں ڈنڈا لئے ان کا برادر نکلا
بار میں، پی کے، لگایا تھا میں تھپڑ جسکو | کیا کہوں، میری منگیتر کا وہ فادر نکلا
عید کو ہم کو سلامی میں ملا یہ جوڑا | ہم ٹری کاٹ اسے سمجھے تھے کھدر نکلا
سوٹ اور بوٹ میں رہتا تھا ہمیشہ ہی سراج | پر الیکشن کے دنوں پہنے وہ کھدر نکلا

نعیم انصاری
(پٹنہ)
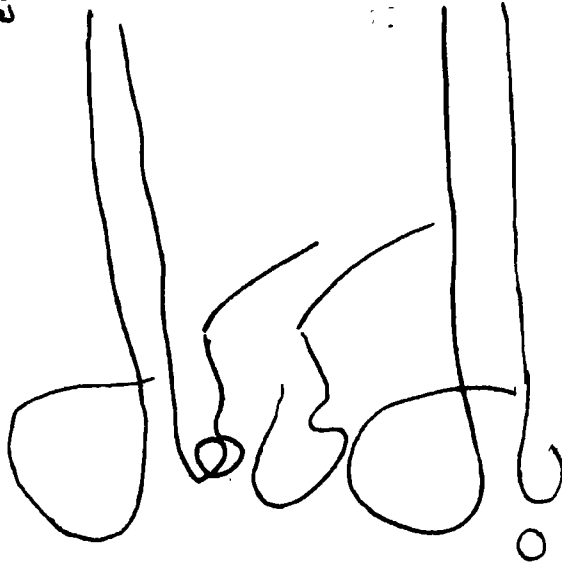
آدمی کی کھال نرم ہوتی ہے۔ پیڑ پودوں کی کھال اکثر سخت ہوتی ہے۔ مگر جانور کی نرم بھی ہوتی ہے اور سخت
ا۔ اور آپ مانیں یا نہ مانیں، میرے خیال میں جانوروں میں سب سے مضبوط گدھے کی کھال ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ بات آپ
ے مشاہدے میں بھی آئی ہوگی کہ اس عجیب الخلقت جانور کی کھال پر نہ تو بھاری بھاری چیزوں کا کچھ اثر ہوتا ہے نہ ہلکی
ی ہلکی چیز کا۔ مثلاً اس کی پیٹھ پر کتنا ہی بھاری بوجھ لاد دیجئے یا کتنے ہی ڈنڈے مار دیجئے، اس کی کھال گھسے گی نہ چھلے گی۔ اسی
رح اسے گدھا بھی کہہ دیجئے تو آواز کے دباؤ سے نہ اس کے کھڑے کان جھکیں گے نہ کان پر کوئی جوں ہی رینگے گی۔ وہ ان سنی
ردے گا۔ شاید یہ سمجھ کر کہ گدھے کو گدھا کہنے والا خود گدھا ہوتا ہے ـــ تعجب ہے ایسے آل پروف جانور کی پریشر پروف
(PRESSURE PROOF) کھال سے جوتا سازی کی صنعت میں اب تک مدد کیوں نہ لی گئی!

ایک اور طرح کی کھال ہوتی ہے ـــــ بال کی کھال ـــــ بال کی کھال نکالنا جتنا مشکل ہے اتنا ہی آسان بھی ہے۔
ا ورے کی رو سے۔ بات گھڑنا، بات میں سے بات نکالنا، باتیں بگھارنا، بے پر کی اڑانا، بات کا بتنگڑ بنانا۔ بال کی کھال
النا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے محاورے قریب قریب ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسے سچویشن
تصور فرمائیے جس میں کوئی باتونی شخص بے وجہ بات کئے جا رہا ہے۔ بے تکان بولے جا رہا ہے۔ بات کچھ بھی نہیں، پھر بھی بات
د معنی در معنی پہنائے جا رہا ہے۔ آپ اس کی چرچڑ سے بور ہو رہے ہیں مگر اس کا یہ حال ہے کہ ع

سنئے کہ نہ سنئے ہم حال دل سنائیں گے

بس ایسے ہی موقع پہ مذکورہ بالا محاورات کا اطلاق ہوتا ہے۔

کچھ لوگ بال کی کھال نکالنے پر فطرتاً مجبور ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ عادت شوقیہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کا

بھی کمی نہیں جو موقع پاتے ہی اس فطرت کی آنچ پر اپنی علمیت کی دال بگھارنے لگتے ہیں ۔

بال کی کھال نکالنا بھی بڑا دلچسپ مشغلہ ہے یہ ایک مستقل فن بھی ہے ۔ قصے کہانیوں کی ابتدا اسی بال کی کھال نکالنے سے ہوئی ۔ اس فن کے سہارے آج بھی بڑی بڑی کتابیں لکھی جاتی ہیں ــــ مگر لکھنے کا بھی کیا کہنا دیکھئے تو عنوان کچھ ہے اور پڑھیے تو مضمون کچھ ہے ۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ایسے لکھنے والے کو کوئی پڑھنے والا روکتا تو کجا ٹوکتا بھی نہیں ۔ مصنف یا شاعر کا قول ہے کہ تحریر کا پیرہن کاغذی ہے تو کیا ہوا، تحریر میں شوخی تو ہے ! ادھر قاری کا کہنا ہے کہ پڑھنے کی چیز تھی ۔ بس پڑھ لی ۔ اب کیا پڑھا کیا سمجھا ۔ اس دردسری میں جانے کی فرصت کہاں ! بے شک آج اردو ادب کو ایسے ہی قارئین کی ضرورت ہے ۔

مصنّف اور قاری کی بات نکلی تو یہ راز بھی آج فاش کر ہی دوں کہ میرے ہم نام کی یہ دل کی آرزو دل ہی میں رہ گئی کہ کاش وہ بھی ایک مصنف ہوتا ۔ ایک عمر تک ملک و قوم کی خدمت کرتا ۔ قوم کا ادیب بن کر قومی یکجہتی کی علمبرداری کرتا ۔ اور علمبرداری کرتا کرتا قوم ہی کے ہاتھوں قوم پر شہید ہو جاتا ــــ زکی انور کی طرح ــــ مگر کجا زکی انور اور کجا یہ ناچیز ! اپنی اپنی قسمت ہے ۔ کل وہ غازی تھا ۔ آج شہید ہے ۔ کل وہ زندہ تھا ۔ آج مر ہے ۔ کل بھی امر رہے گا ۔ زندۂ جاوید ہو گیا ہے وہ تو !

"تاہم غور طلب بات یہ ہے کہ زکی انور بے چارہ آخر "کُشی" کا شکار ہو ہی گیا ! یہ کُشی بھی بڑا معنی خیز لفظ ہے ۔ اس کی کئی قسمیں ہیں مثلاً خودکشی ، دل کشی ، دخترکُشی ، مردم کشی ، نسل کشی ، انسان کشی ، حیوان کشی ، گئو کشی وغیرہ ۔ یہ "گئوکشی" کا مسئلہ میرے لیے سدا چوں چوں کا مربّہ بنا رہا اور آج بھی یہ چیدہ چیدہ چیدہ کا مربع بنا ہوا ہے ۔ گئو ہندی لفظ ہے اس کا انگریزی مرادف کاؤ (COW) اور فارسی مرادف گاؤ ہے ۔ عربی میں بقر کہتے ہیں اور اردو میں یہ سیدھی سادی گائے ہے ۔ اب دیکھئے نا کہ ایک ہی لفظ مختلف زبانوں میں کتنی تبدیلی تلفظ کے ساتھ موجود ہے اور جب دنیا کی مختلف زبانوں میں گئو کا مرادف لفظ موجود ہے تو ظاہر ہے گئو ہر ملک میں پائی جاتی ہے ۔ لوگ اس کا دودھ پیتے ہیں اور اس کا گوشت کھاتے ہیں ۔ لیکن ہمیں اس سے کیا کہ دنیا میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے ۔ وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ہو رہا ہے ۔

مگر عقل مندی تو یہ ہے کہ دنیا کی بات کیا کیجئے ۔ دنیا تو تغیّر پذیر ہے ۔ ہر چیز بدل رہی ہے ۔ ذہنیت بدل رہی ہے ۔ اقدار بدل رہے ہیں ۔ اطلاب ۔ تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ انسان کے معنی بھی بدلتے جا رہے ہیں ۔ نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے ۔ نیا ادب پیش کیا جا رہا ہے ۔ نئی لغات مرتب کی جا رہی ہے مثلاً :

جانور ــــ کے معنی آدمی ، آدمی کے معنی جانور

چھرا ــــ جو پہلے جانور پر چلتا تھا ، اب آدمی پر چلتا ہے ۔

وغیرہ بے ــــ وغیرہ !

اب وہ زمانہ لد گیا جب لوگ جانور کی کھال ادھیڑ کر پیٹ بھرا کرتے تھے اور بال کی کھال نکال کر دل بہلایا کرتے تھے ۔ اب تو آدمی کی کھال ادھیڑنے ہی میں دل زیادہ بہلتا ہے ۔

... نجانے کدھر گئے

اسمٰعیل ظریف

میک اَپ سے کالے پیلے بھی چہرے نکھر گئے
"جو بھی تمہاری بزم میں آئے سنور گئے"

گھوڑے جو ریس کے ہیں نجانے کدھر گئے
صحرا میں سارے ٹٹّو ہری گھاس چر گئے"

پہرا پٹھان کا ہے میاں اُن کے گیٹ پر
حُلیہ بگاڑ آؤ گے اب کے اگر گئے

ہم ٹاپتے ہی رہ گئے کھانے کی میز پر
جو نقد مال تھا وہاں احباب چر گئے

ہم اُن سے ملنے جب گئے وہ گھر میں تھے مگر
آیا نے آکے کہدیا وہ کام پر گئے

انگلینڈ جانے والوں کا یہ ذوق دیکھئے
توشہ میں اپنے ساتھ وہ لے کر جگر گئے

چند روز ایسے ویسوں کی صحبت میں بیٹھ کر
بھائی میاں کے دونوں بھی سالے سدھر گئے

مرنے کا جس کو شوق ہے مرجائے گا مگر
پی کھا کے بعض لوگ تو بے موت مرگئے

کوئی کسی پہ اب یہاں مرتا نہیں ظریفؔ
جو اُن پہ مرنے والے تھے وہ لوگ مر گئے

ہزل

صابرؔ بہاری
(رانچی)

صابر میاں کچھ آپ بھی جدّت دکھایئے
مطلع سے پہلے بزم میں مقطع سنایئے

اِک اور بھی سدھار ہے محفل میں لازمی
ردِ عمل کا جلد ہی اس پر چلایئے

بدلے بس واہ واہ کے حضرات سامعین
لا حول پڑھ کے زور سے تالی بجایئے

محفل میں اس کے بعد بھی شاعر ڈٹے رہے
تو اٹھ کے آپ لوگ ہی خود بھاگ جایئے

○

منیجنگ ڈائریکٹر غزل ریپرنگ سنٹر
ادب نواز منزل، چوڑی ماراں، بھلیاں پورہ دروغ نگر

رفیق شاکر
(کھیم گاؤں)

غزل ریپرنگ سنٹر

اہلِ قلم حضرات کے لیے عموماً اور شائقین شعر و ادب کے لیے خصوصاً یہ بات مسرت بخش ثابت ہوگی کہ بزدل جنگ، حقیر الملک، قادر الکلام، شہنشاہ ترنم، شاعرِ تغزل، استاد الاساتذہ ہند و ایران، مصر و جاپان، چین دلونان حضرت جاہل سخن پوری ایم اے پی ایچ ڈی۔ جن کی کتب "کامیاب شاعری" "چھ ماہ میں شاعر بنو" "فنِ شعر و ادب" "دو روپے میں مکمل شاعر" وغیرہ شائع ہوکر شرف قبولیت اور دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آج انھیں کے زیرِ نگرانی "غزل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ" قائم کی گئی ہے جس میں "غزل کلینک" "غزل ٹریننگ" اور "غزل ریپرنگ" وغیرہ مختلف شعبے قائم کیے گئے ہیں۔ جہاں ......

(۱) عمدہ طور پر غزلیات کی ریپرنگ کی جاتی ہے۔

(۲) پرانی غزلیات کی اوورہالنگ (overhauling) کی جاتی ہے۔ بے ربط بے تکی اور کمزور غزلیات کو مناسب انجکشن لگاکر صحت یاب کیا جاتا ہے۔

(۳) غزلیات، قطعات، غزل کے پارٹس اور دیگر منظومات کرائے پر دی جاتی ہیں اور ضرورت مند "شعراء" کو مناسب داموں سے فروخت بھی کی جاتی ہیں۔

(۴) نئے قلمکاروں کو جدید ادبی گولیاں، عروضی انجکشن اور فنی ٹانک دیئے جاتے ہیں، سرقہ اندازی کے گر سکھائے جاتے ہیں۔

(۵) فلمی دھنوں پر گانا سکھایا جاتا ہے۔ نیز آدابِ مشاعرہ، ترنم، حلیہ، نشست و برخاست وغیرہ کی مشق کرائی جاتی ہے۔ بعدہٗ "ماسٹر آف شعر و سخن اینڈ بیچلر آف ادب و فن" کی سند دی جاتی ہے۔

مفصل معلومات کے لیے مندرجہ بالا پتہ پر لکھیے۔

امتیاز خالق کامٹوی

آپ شاید دنیا کے آٹھویں عجوبے سے واقف نہ ہوں۔ ہم بتاتے ہیں، وہ ہمارے ایک دوست، شاعر صاحب۔ مجھے حضور کا دوست ہونے پر فخر ہے۔ اگر آپ کبھی ان سے ملیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنے مزے کے آدمی ہیں۔ آپ جب ان سے مل کر لوٹ رہے ہوں گے تو آپ کا رخ سیدھا کسی میڈیکل اسٹور کی جانب ہوگا تاکہ آپ فوری طور پر سردرد کم کرنے کے لیے دو چار سردرد کی گولیاں خرید کر بغیر پانی کے ایک ساتھ نگل سکیں۔ اس کے بعد آپ کو کچھ آرام محسوس ہوگا۔

جناب کا حلیہ تو اتنا مضحکہ خیز ہے کہ دیکھتے ہی ہنسی چھوٹتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ پستہ قد دبلے پتلے، کوئل کی طرح کالا چہرہ، جس پر پاسنو کی دبیز تہہ، طوطے کی چونچ کے مانند چھوٹی سی ناک، بھینس کی طرح لمبوترے چہرے پر کشادہ ہونٹ، بگڑی جلیبی کی شکل کے کان، کالی شیروانی (جو کہ غالباً انہوں نے اپنے رنگ کی مناسبت سے سلوائی ہوگی) ٹخنوں سے اونچا لگدھ پاجاما، جس پر جا بجا سالن اور دال کے دھبے (جو شاید انہیں اپنے بچوں کو کھانا کھلاتے وقت لگے ہوں گے) سر پر لمبی ٹوپی جس پر کہ سرخاب کے پر کی جگہ پھندنا لگا ہوا۔ پیروں میں نوک دار لکھنوی طرز کے جوتے جنہیں انھوں نے اپنی شادی کے وقت خریدا تھا۔

شاعر صاحب چھپے رستم ہیں۔ ہر کوئی نہیں جانتا کہ جناب کو دردسری یعنی شاعری بھی آتی ہے یا نہیں؟ انھوں نے اپنا تخلص بھی خوب رکھا ہے "علامہ اُدھم چوکڑی" اور واقعی انہیں یہ تخلص زیب دیتا ہے۔ جب آپ کے مزاج شریف بخیر ہوتے ہیں تب آن کے آن میں پچاس پچاس شعر کہہ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے ایک مصرع بھی ان کا نہیں ہوتا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ چرائے ہوئے اشعار کا بھی کچومر نکال کر رکھ دیتے ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں ہی انھوں نے ایک شعر بطور بھرتہ یوں پیش کیا ؎

سُنا ہے کہ لکھنو میں مٹھو کے پٹھے ۔۔ رگ بل سے گلگل کے پیر باندھتے ہیں

اس پر ہم نے پوچھا کہ یہ "رگِ بُل سے گلگل کے پیر باندھتے ہیں" کیا مطلب ؟ شاید آپ کچھ بھول رہے ہوں... ہا! ہا! بس پھر کیا تھا وہ ہم پر پوری شدت سے برس پڑے۔ "کیا کھاک (خاک) نہیں سنا.... ! اور سنو گے بھی کیسے ؟ ذرا بڑی بڑی تکالیف (تصانیف) کا مطالعہ کرو تو جانو...... ہاں... کبھی دیوان گالب (دیوان غالب) کو پڑھا ہے ؟" اور جب ہم نے کہا کہ "نہیں بھائی! آپ ہی بتا دیجئے نا کہ کس دیوانے نے اسے لکھا ہے تاکہ ہم بھی اسے پڑھ کر "علامہ دھوم دھام" وغیرہ بن جائیں۔" تو وہ بڑے وقار سے کہنے لگے۔ "اُسے کسی گُلاب کھاں (گلاب خاں) نے لکھا ہے۔"

کیا آپ نے کبھی دیوان غالب کو پڑھا ہے ؟ ہم نے یونہی انہیں چھیڑنے کی خاطر پوچھا جواب ملا۔ "جی ہاں.... جی جی ہاں، میں نے اس کے ایک ایک مضامین بڑے غور سے پڑھے ہیں" اور پھر ہماری ہنسی ناقابل ضبط ہو گئی۔

جب وہ "محفل یاراں" (جہاں ہم تمام مخبوط الحواس دوست رات کھانے سے فارغ ہو کر وہیں رات گئے تک گپ شپ لڑاتے رہتے ہیں) ، میں آتے ہیں تو قبل از سلام دوستوں پر ایک گہری نظر ڈالتے ہیں اور زور دار آواز میں کہتے "السلام علیکم" اور ساری محفل مرحبا' مرحبا' کی آواز سے گونج اٹھتی ہے۔ اس گونج سے فائدہ اٹھا کر چند من چلے دوست مرحبا مرحبا بے حیا کہہ جاتے ہیں۔ اور وہ قہر آلود نظروں سے اس آواز کا تعاقب کرتے ہیں لیکن آواز پہچان نہیں پاتے۔

ایک روز خلاف معمول وہ "محفل یاراں" میں نہیں آئے تو ہم تمام دوست ان کی مزاج پرسی کی غرض سے جناب کے گھر پہونچے، دروازے پر ہی ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر یہ عبارت درج تھی "شیروانی برائے فروخت" ہم اپنی ہنسی روکے اندر داخل ہوئے، اُدھم چوکڑی نے بڑی سرد مہری سے ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے سامنے پڑی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھنے کے لیے کہا اور مجبوراً ہمیں بیٹھنا پڑا۔ بازو رکھی ایک باوا آدم کی کرسی (جو کہ صرف تین پاؤں کی تھی اور اور چوتھے پایہ کی جگہ پارلے گلوکوز کا ڈبہ رکھا ہوا تھا) پر خود بیٹھ گئے۔ پھر ہم نے بورڈ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے کہا "ابھی تک میں نے تقریجاً (تقریباً) ڈیڑھ ہزار شاعر (اُدھم چوکڑی ہمیشہ شعر کو شاعر ہی کہتے ہیں) لکھ ڈالے ہیں اب سوچتا ہوں کہ ان سب کو ایک مجبے (مجموعے) کی شکل میں شئے (شائع) کر ڈالوں لیکن پیسے گھٹ رہے تھے اس لیے سوچا کہ کیوں نہ شیروانی ہی بیچ ڈالوں" اس پر ہمارے ایک دوست نے پوچھا۔

"کیا رکھیئے گا حضور مجموعۂ کلام کا نام ؟ "دیوانِ دیوانہ" یا "سیاہ کار اُدھم چوکڑی" ؟

"اجی ابھی گھوڑے کا پتہ نہیں اور نال کی تلاس (تلاش) فی الحال تو مجھے یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ میں نے جو مرثیہ (وہ اتنے بلند پایہ شاعر ہیں کہ ہمیشہ قصیدے کو مرثیہ اور مرثیہ کو قصیدہ کہتے ہیں) وہ زیرے آدم (وزیر اعظم) کے لیے لکھا ہے اُسے کس طرح چھپایا جائے کوئی کم خبط (کم بخت) اسے چھاپنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ سب یہی کہتے ہیں کہ "کیا آپ کے گھر میں چلو بھر پانی نہیں ؟" اب آپ ہی بتائیے کیسی بے دقوفی کی بات کہی ہے انہوں نے! چلو بھر کیا میرے یہاں تو ٹنکی بھر پانی پڑا ہے۔" اور پھر ہماری ہنسی مشکل ہی سے رک سکی۔ اچھا جناب! یہ تو بتائیے کہ آج آپ وہاں آئے کیوں نہیں ؟" ایک دوست نے پوچھا۔" پھر تم نے جناب [illegible]

چاکہ "ج" سے جورو کا غلام ، "ن" سے ناکارہ " ا " سے احمق اور "ب" سے "بدکار"۔ لیکن تم نے منہ چھوٹتے ہی کہہ دیا جن ..
... ناب .... ناب ہینگ لگے نہ پھٹکری۔" وہ ہم پہ برس پڑے حالانکہ ان کا لال پیلا ہونا بےجا تھا کیونکہ ان میں وہ
چاروں صفات موجود تھیں۔ " اچھا میں معذرت چاہتا ہوں۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ آج کس لیے آنا نہ ہوا ؟"

ہمارے اس شاعر دوست نے اداکاری کرتے ہوئے ندامت سے کہا۔ " ذرا بیگم کی تبت (طبیعت) خراب تھی
اس لیے آ نہ سکا۔" انھوں نے جواب دیا۔

" تم تو ہمیشہ یہی چاہتے ہو کہ میں کب مروں .... ! صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں بازار گئی تھی تو تمہیں کھانا
پکانا تھا۔ اور کپڑے دھونا تھے۔"

پردے کے پیچھے سے ان کی بیگم نے کہا۔ ہم موقع کی نزاکت جان کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

جب دوسرے روز محفلِ یاراں میں جلوہ گر ہوئے تو ان کے ماتھے پر ایک میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے جب
ان سے پٹی باندھنے کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے " کچھ نہیں ہوا' نہاتے میں برش کے ریشے سے ذرا چھل گیا' اور پھر
ہمیں ان کی نازکی کا قائل ہونا پڑا۔ لیکن دوسرے روز ان کی بیگم کی زبانی معلوم ہوا کہ کل رات ہمارے واپس آنے کے بعد وہ
ان کے اسی خوش قسمت جوتے کو استعمال میں لائی تھیں جو کہ ادھم چوکڑی نے شادی کے وقت خریدا تھا۔ ○○

ظہیر ابن قدسی
(مالیگاؤں)

کھٹمل

اخبار کھول کر دیکھیے، سڑکوں پر نکلیے تو دیواروں پر دیکھیے۔ سینما ہال میں فلم شروع ہونے سے قبل دیکھیے بگ مار، ٹِک ٹوئنٹی، کھٹمل مار پاؤڈر، اور نہ جانے کیسے کیسے نام نظر آتے ہیں جو ایک ننھے جاندار کھٹمل کے لیے زہر قاتل ہیں۔ وہ جسے انسان نے اپنا دشمن تصور کر لیا ہے۔ بہت پہلے یہ دوائیں صرف کھٹملوں کے لیے تھیں۔ مگر اب انسان بھی زندگی سے چھٹکارا پانے کے لیے اس کا استعمال شروع کر چکا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اگر انسان خدا کی دی ہوئی عقل کو ذرا استعمال کرے تو معلوم ہوگا کہ کھٹمل کو پیدا کرنے میں خدا نے کیسی کیسی حکمت پوشیدہ رکھی ہے۔ تب آپ کو معلوم ہوگا کہ کھٹمل آپ کا دشمن نہیں۔ دوست ہمدرد اور خادم ہے ....

سوچیے آپ دنیا بھر کے تفکرات میں ڈوبے ہوئے حیران و پریشان رات گئے بستر پر جاتے ہیں اور دماغ میں لاتعداد الجھنیں لیے کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسے میں کھٹمل آکر آپ کے جسم کا بوسہ لیتا ہے اور آپ اپنی فکروں کو بھول کر سہلانے لگتے ہیں۔ پھر جب کھٹمل کے بوسے حد سے بڑھ جاتے ہیں تو آپ فوراً ہی قندیل یا بلب جلا کر اس کی تلاش میں لگ جاتے ہیں (فکریں غائب) اب اگر شامت اعمال کھٹمل مل گئے تو اسی کو اپنے تفکرات سمجھ کر چٹکی سے مسل دیتے ہیں۔ اس کے بعد یقیناً ایسی گہری نیند سوتے ہیں کہ بس..... معلوم ہوا کھٹمل نہ ہوئے تفکرات تھے جو چٹکی میں حل ہو گئے۔

اسی بات پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ سنئے . . . .

"ایک دفعہ ہم کو صبح ۴ بجے کی گاڑی سے پونہ جانا تھا۔ اسی فکر میں تھے کہ کس طرح آنکھ کھلے گی اور ہم کو گاڑی ملے گی؟ اسی فکر میں ہم بستر پر کروٹ بدل رہے تھے کہ پیروں میں کھجلی ہوئی۔ ہم نے دل ہی دل میں گالی دی اور بلب جلا کر کھٹمل کی کھوج میں لگ گئے۔ ادھر ادھر تلاش کیا کہیں کھٹمل نظر نہ آیا۔ ناگاہ چادر کے سرے پر ایک کم بخت بیٹھا نظر آیا۔ ہم نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا۔ لیکن وہ بھی ہوشیار تھا۔ فوراً چادر کی دوسری سمت چلا گیا۔ ہم نے چادر الٹ دی۔ اب وہ آگے آگے اور ہمارا ہاتھ اس کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگا اور چور پولس کا کھیل شروع ہو گیا، جب بھی ہم چٹکی دبا کر اٹھاتے

وہ بھاگنے لگا اور پھر تعاقب شروع ہوجاتا...... اچانک وہ بھاگ کر تکیے کے نیچے چلا گیا۔ ہم نے تکیہ الٹ دیا وہ فوراً تکیہ کی دوسری سمت چلا گیا۔ ہم نے پھر تکیہ پلٹ دیا۔ اب وہ تکیہ کے غلاف کے نیچے گھس گیا اور ہم ناکارہ پولس کی طرح بیٹھ کر بیڑی سے شوق فرمانے لگے۔ اب دو کش ہی لیے تھے کہ ایک دوسرا کھٹمل نظر آیا اور ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور پھر وہی آنکھ مچولی شروع ہوگئی۔ اس طرح کھیل کھیل میں وہ چار کھٹمل ہاتھ آئے لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ۲½ بج گئے اور ہم سفر کی تیاری میں لگ گئے۔

اسی طرح ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے.... محلے کی مسجد میں ایک بزرگ وارد ہوئے۔ ان کے متعلق یہ بات معلوم ہوئی کہ موصوف ۱۲ سال سے مسلسل جاگ رہے ہیں رات کو بھی ان کو نیند ہی نہیں آتی۔ بس وہ رات دن عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے بزرگ کے دیدار کے لیے ہم بھی وقت نکال کر ایک مسجد میں چلے گئے (کیونکہ آج کل کے جوانوں کی طرح ہمیں بھی مسجدوں میں جانے کا وقت نہیں ملتا۔ نماز کے بعد بزرگ کے عقیدت مندوں کا تانتا بندھ گیا.....

اور ہم تنہائی کے انتظار میں مسجد کے درودیوار اور نقش ونگار سے دل بہلانے لگے۔ خدا خدا کرکے ایک دو گھنٹے بعد ان کو تنہائی ملی۔ ہم فوراً آگے بڑھے اور علیک سلیک کے بعد قریب بیٹھ گئے۔ بزرگ نے دعاء کے آنے کا سبب پوچھا۔ ہم نے مسجد میں بھی جھوٹ سے کام چلایا کہ راتوں کو لاکھ کوشش پر بھی آنکھ نہیں کھلتی اور تہجد پڑھنے کی بہت طبیعت چاہتی ہے کیا کروں؟ کیا آپ اپنی شب بیداری کی ترکیب کا ذرا سا حصہ عنایت فرمائیں گے۔؟ انھوں نے کچھ دیر سوچا پھر لیٹے ہوئے بستر میں کچھ تلاش کرنے لگے۔ اور تھوڑی دیر بعد چٹکی میں کوئی چیز پکڑ کر بڑھا دی۔ ہم نے عقیدت سے ہاتھ بڑھایا اور انھوں نے ہماری ہتھیلی پر دو کھٹمل رکھ دیئے اور کہا اس سے انشاء اللہ تین چار بجے ضرور آنکھ کھل جایا کرے گی۔ ہم کو ان کی شب بیداری کا سبب معلوم ہوگیا اور ہم یہ سوچتے ہوئے مسجد سے نکل آئے کہ واہ رے تیری قدرت ایک ذراسی جان سے تو کیا کیا کام لیتا ہے اور کتنوں کو راہ راست بلکہ راہ عبادت بنا دیتا ہے۔ ان بزرگ کے علاوہ اسی طرح کھٹملوں سے اور نہ جانے کتنے ہی لوگ تہجد گذار اور ولی صفت بن گئے ہوں گے واللہ اعلم۔"

یہ تو چار فوائد ہیں جو تفصیل سے بتا دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کھٹمل کے بہت سے فوائد ہیں مثلاً رمضان میں سحری اور عبادت کے لیے بیدار کرنے میں سب سے زیادہ کارآمد یہی ہیں۔ اگر بیوی ناراض ہو تو یہی کھٹمل وصال کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ آپ نے وہ شعر تو سنا ہی ہوگا ؂

لپٹ جاتے ہیں وہ کھٹمل کے ڈر سے

الٰہی ختم کھٹمل ہوں نہ گھر سے

اس شعر کی شانِ نزول بھی کھٹمل ہی معلوم ہوتے ہیں.....

اور ہاں یہ جو عاشق کہتے ہیں کہ "پیاری رات بھر تمہارا خیال ستاتا رہا اور میں بستر پہ کروٹیں بدلتا رہ گیا یہاں تک کہ صبح ہوگئی" اس کی تہہ میں بھی یہی ذاتِ شریف معلوم ہوتے ہیں ورنہ خیال یار کے سبب روز رات بھر جاگتے رہیں۔ آج کے

درد میں تو نا ممکن ہے۔ کیونکہ آدمی چاہے عاشق ہو، چاہے گھر دار والا۔ زندگی کی دوڑ میں اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ خیال یار اس پریشانی میں گم ہو جاتا ہے (اسی لیے اب لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی جوڑی نہیں پیدا ہوتی) اور رات کو کھٹمل کے سبب ہی لوگ دل بہلانے کے لیے اپنی محبوبہ کو یاد کرتے ہیں اور تارے گنتے ہیں۔ ویسے اب تارے کی بجائے کھٹمل گنتے اور مارتے ہیں کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال جب سے ہم کو کھٹملوں کے فوائد کا علم ہوا ہے ہم نے خود بھی کھٹملوں کی افزائش شروع کر دی ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں بلکہ ہم تو گھر آئے ہوئے مہمان اور دوستوں کو کھٹمل ہی تحفہ میں دیتے ہیں۔ پھر کھٹمل اگر ذرا سا خون لیتے ہیں تو کیا ہوا؟ اک ذرا سا خون جانے سے سینکڑوں فائدے ہوں تو کیا نقصان ہے؟ کیونکہ فی زمانہ خون کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ قیمت ہے تو وقت کی وقت سے فائدہ اٹھانے والوں کی ..... امید ہے آپ بھی ہم سے متفق ہوں گے۔

ہاں ایک بات تو ہم بھول ہی گئے ..... یہ مضمون بھی کھٹمل کی وجہ سے شب بیداری کا ہی نتیجہ ہے۔ سچ!

شیخ رحمٰن اکولوی

ٹیچروں کے لیے سنڈے تہوار کے دن سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ ہفتہ کے چھ دن درس و تدریس میں سر کھپانے کے بعد اسی دن ہمیں موقعہ ملتا ہے کہ تھکے ہوئے ذہنوں کو تفریح کا سامان مہیا کرسکیں لیکن اسے ہماری بدقسمتی کہیے یا بیگم کی خوش قسمتی کہ سنڈے کو اکثر ایسے گھریلو کام نکل آتے ہیں جن کی انجام دہی بیگم کی دانست میں لازمی ہوتی ہے اور جنھیں نپٹاتے نپٹاتے سنڈے بڑی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ مثلاً بچوں کی حجامت بنواؤ، گیہوں پسواؤ، ہفتے کا سودا لاؤ۔ غور کیجیے کہ مذکورہ تمام کام ایسے ہیں جن کی تکمیل میں سنڈے کا انتقال پر ملال یقینی ہے۔ سنڈے کو یہ کام وقت طلب ہونے کی وجہ سے دقت طلب ہو جاتے ہیں کیونکہ ہماری بیگم کی طرح دوسری بیگمات بھی سنڈے کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لیے حجام کی دکان ہو یا گیہوں پسوانے کی چکی۔ بے چارے شوہروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اگر کبھی بیگم ہم پر ترس کھا کر گھریلو کاموں کو کسی اور دن پر ٹال دیتی ہیں تو ہیڈ ماسٹر کی طرف سے حکم ناگہانی نازل ہو جاتا ہے کہ سنڈے کو ایکسٹرا کلاس لی جائے۔ اس طرح سنڈے کے وہ سارے منصوبے یک لخت دم توڑ دیتے ہیں جن کی منصوبہ بندی میں ہفتے کے چھ دن ضائع ہوئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ایکسٹرا کلاس میں بچوں کے ساتھ شہر میں چلنے والی فلموں پر بہر پہلو سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے سنڈے کو با دل نخواستہ خیر باد اور منڈے کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

اس بار ہم بہت خوش تھے کہ سنڈے ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ بظاہر ایسا کوئی گھریلو کام نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو ہمارے سنڈے کے آڑے آتا۔ ہم نے خوشی خوشی ناشتہ کیا اور انگریزی فلم Taxi Driver دیکھنے کے لیے گھر سے نکلے تھے کہ بیگم نے آواز دی "کہاں کھسک رہے ہو۔ مٹی کا تیل ختم ہو گیا ہے لا کر دو پھر جہاں جانا ہے چلے جانا۔"

ہم نے سوچا فلم شروع ہونے کو ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے اس لیے مٹی کا تیل لا کر دے دینا مناسب رہے گا۔

اگر اس کام کو کل پر ٹالنے کی کوشش کی تو بیگم یقیناً الجھ پڑیں گی اور گھنٹہ منٹوں میں گزر جائے گا اور باقی رہ جائے گا لانا مٹی کے تیل کا۔ لہٰذا ہم نے مصلحت سے کام لے کر مصالحت کرنا مناسب سمجھا اور خاموشی سے تیل کا ڈبہ لے کر بنئے کی دکان کی طرف چل پڑے۔ جاتے جاتے ہم نے دیکھا کہ بیگم کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی ہے۔

ابھی ہم تھوڑی دور گئے تھے کہ ہماری ملاقات لکھنوی صاحب سے ہو گئی۔ لکھنوی صاحب راشن لینے کے لیے گھر سے نکلے تھے (نکالے گئے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ پڑوسی ہونے کے ناطے ہم جانتے تھے کہ ان کا بھی حال کچھ اپنا سا ہے) ہم نے سوچا اپنا دکھ درد دوسروں کو سنانے سے کچھ سکھ ملتا ہے۔ سنڈے اور مٹی کے تیل کا چکر لکھنوی صاحب کو سنایا۔ ہماری بات سن کر انھوں نے فرمایا۔

"شادی کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ شوہر کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جسے پہلے گھوڑ سواری اور بعد میں بار برداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ہمیں دیکھو دس سال سے ستمہائے بیگم سہتے چلے آ رہے ہیں لیکن کیا مجال کہ منہ سے اُف نکلی ہو اور ایک تم ہو کہ ایک ہی سال میں نڈھال ہو گئے ہو اور آہ و زاری کرنے لگے ہو۔ شرم کرو شرم۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری وجہ سے شوہر برادری کی ناک کٹ جائے۔" لکھنوی صاحب کی باتوں سے ہماری ہمت بندھی اور یہ کہہ کر ہمت بندھی اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ایک ہم ہی نہیں اور بھی ہیں بیگموں کے ستائے ہوئے۔

جب ہم بنئے کی دکان پر پہنچے وہاں ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ مٹی کے تیل کا فقدان ہونے کی وجہ سے یہ میلا لگا ہوا ہے۔ مٹی کے تیل کا بٹوارہ شروع ہوا تو لوگ اس پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے مٹی کا تیل نہ ہوا بتاشوں کا ڈھیر ہو گیا۔ دھکم پیل شروع ہوئی اور دو آدمی لالہ جی کے اوپر جا پڑے تو انھوں نے بٹوارہ روک دیا اور اعلان کر دیا کہ گاہک جب تک قطار بنا کر کھڑے نہیں ہوں گے بٹوارہ شروع نہیں کیا جائے گا۔ اعلان سنتے ہی پھر دھکم پیل شروع ہو گئی اور چند ہی لمحوں میں ایک لمبی قطار بن گئی اس قطار پر نظر ثانی کرنے سے ہمیں اندازہ ہوا کہ کایا پلٹ ہو گئی ہے جو لوگ قطار بننے سے پہلے پیش پیش تھے قطار کی دم بنے ہوئے ہیں اور ہم جو پہلے کافی پیچھے تھے دھکے کھاتے کھاتے خود بخود قطار کے درمیان پہنچ گئے تھے۔ دوسری بار بٹوارہ شروع ہوا تو یکے بعد دیگرے مٹی کا تیل لینے لگے اور قطار آگے کی طرف کھسکنے لگی جس طرح آرا مشین میں لکڑی کھسکتی ہے۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب مٹی کا تیل مل جائے گا اور فلم کا پروگرام ملتوی نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن چند منٹ گزرے تھے کہ ہم نے دیکھا آگے کی طرف کچھ فاصلے پر ایک پہلوان قسم کے آدمی نے لکھنوی صاحب کو گریبان پکڑ کر لائن سے باہر کھینچ لیا اور صلواتیں سنا رہا ہے۔ ہم نے سوچا، کہیں وہ چرب زبان، زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چلانا شروع نہ کر دے وہاں جا پہنچے لیکن ہم نے جیسے ہی مداخلت کرنے کی کوشش کی پہلوان نے ہمیں پیچھے کی طرف ڈھکیل دیا اور ہم زمین پر چاروں شانے چت گر گئے لوگوں نے قہقہہ لگا کر ہمارا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو ہم نے یہ کہہ کر اپنی پوزیشن سنبھالی کہ خاندانی پہلوان جب بھی گرتے ہیں چت ہی گرتے ہیں۔ گرتے وقت ڈبہ زمین کے اوپر اور ہم ڈبے کے اوپر جا پڑے تھے۔ لہٰذا جب ہم زمین سے اٹھے تو ڈبے کی بری سی حالت دیکھ کر ہماری حالت بھی خراب ہو گئی۔ ڈبہ اس قدر بری طرح پچک گیا تھا کہ اس میں مٹی کا تیل لے جانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اب ہمیں یہ خیال پریشان کیے ہوئے تھا کہ ڈبے کی بری حالت دیکھ کر

بیگم بگڑ جائیں گی اور وہ صلواتیں سُنا سُنا کر ہماری حالت خراب کردیں گی۔ کم از کم دو دن تو ہمارا کھانا پینا حرام ہو جائے گا۔ خیر صاحب جب ہم پہلوان کی انگلی اور سات پشتوں کو کوستے ہوئے زمین سے اُٹھے تو جھگڑا ختم ہو چکا تھا۔ لوگ لکھنوی صاحب اور ان کے حریفوں کو سمجھا بجھا کر الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہم نے پہلوان کی طرف غصّے سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا "عجیب احمق آدمی ہے۔ اگر اتنی جلدی جھگڑا ختم کر لینا تھا تو پھر جھگڑا کیا ہی کیوں؟ کیوں ہماری مٹی خراب کی؟

وہاں سے نکل کر ہم کمانے کی دکان پر جا پہنچے کہ نیا ڈبہ خریدیں ہم نے ایک ڈبہ پسند کیا اور ڈبے کی قیمت ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بینے کی دکان میں ہونے والی دھکم پیل کے دوران کسی نے ہماری جیب پر ہاتھ صاف کر دیا ہے۔ اب ہم جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتے ہوئے گھر پہنچے۔

معاف کیجئے جناب! آپ کی مونچھیں اس کے اصلی مقام پر نہیں ہیں!؟

رامیشور دیال دوبے
مترجم: کالیکا پرشاد

ڈبلیو۔ٹی

ہمارا ایک دوست ہے۔اس کا نام ظاہر کرنا ممکن نہیں۔ دوست تو ہے مگر ہے بڑا خطرناک آدمی۔جہاں بیٹھتا ہے کچھ نہ کچھ شرارت کرتا رہتا ہے۔کبھی کبھی تو ساتھی ہونے کے سبب مجھے بھی پریشانی میں پڑنا پڑتا ہے مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔

دیگر مقامات پر تو کسی طرح میں اس کا ساتھ نباہ لیتا ہوں مگر اس کے ساتھ ریل کا سفر کرنا گویا اپنی شامت کو بلانا ہے۔ ریل کے سفر میں اس کے جسم سے اس کی روح غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک شیطان لے لیتا ہے۔

کوئی چھ سال پہلے کی بات ہے۔میرے بھائی کے لڑکے کی شادی تھی۔ بارات ریل سے جا رہی تھی۔کوئی آٹھ گھنٹے کا سفر تھا۔میرے بھائی نے مختصر سی بارات ہی لے جانا مناسب سمجھا اسلئے دوستوں وغیرہ کو بارات میں چلنے کی دعوت نہیں دی گئی مگر میرے یہ دوست اُن حیاداروں میں نہ تھے جو بارات جانے سے پہلے دعوت کا انتظار کرتے۔

اچانک اپنے دوست کو بستر سمیت اسٹیشن پر دیکھ کر مجھے کچھ ندامت ہوئی، میں نے سوچا "جب یہ آنے والا ہی تھا تو دعوت دے دینا ہی مناسب تھا"

بارات کے لئے جو ٹکٹیں خریدی گئی تھیں ان میں اور ایک کا اضافہ کر لیا گیا۔ سب لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔سب ٹکٹیں ایک آدمی کے پاس نہ رکھ کر ہر ایک کو ایک، ایک ٹکٹ دے دیا گیا۔

گاڑی چلی جا رہی تھی۔اسٹیشن چھوٹتے جا رہے تھے۔آگے ایک چھوٹا جنکشن آیا۔گاڑی رُکتے ہی ٹکٹ چیکر گاڑی میں تشریف لائے۔

"ٹکٹ، ٹکٹ"

اور جیبوں سے، منی بیگوں سے ٹکٹیں نکلنے لگیں اور ٹکٹ چیکر صاحب جانچنے لگے۔

میرے دوست ایک طرف بیٹھے سگریٹ کے دھوئیں کے چھلّے بنا رہے تھے۔ اتنے سکون سے اور اتنی لاپروائی سے گویا وہاں نہ کوئی آیا ہے اور نہ کچھ ہوا ہے۔

ٹکٹ چیکر صاحب ان کی طرف بھی بڑھے اور ان سے ٹکٹ طلب کیا۔ میرے دوست ایسے انجان بیٹھے رہے گویا انھوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ چیکر صاحب نے پھر پوچھا " جناب ٹکٹ"

ہمارے دوست نے ٹکٹ چیکر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ہم سب حیران تھے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ ٹکٹ ہے لیکن دکھاتے کیوں نہیں؟ اتنے میں ٹکٹ چیکر صاحب نے ذرا غصہ سے کہا " جناب ٹکٹ دکھائیے"

ہمارے دوست کی آنکھیں غصّے سے لال ہوگئیں اور بولے ۔۔۔ "ٹکٹ؟ ٹکٹ؟" آپ ٹکٹ دیکھیں گے؟ اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنے بائیں پیر کے جوتے کا فیتہ کھولنے لگے کہ ہم سب خوفزدہ ہوگئے۔ ارے! اس بھلے آدمی کو کیا ہوا ۔ ؟"

ہم سب کو تو صرف حیرت تھی مگر ٹکٹ چیکر صاحب تو دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کچھ خوفزدہ بھی ہو گئے تھے۔ میں قریب جاکر اپنے دوست کو خاموش کیا تب ان کا ہاتھ جوتے کے فیتے پر سے ہٹا تاہم ہمارا دوست بڑبڑاتا رہا ۔ آپ ٹکٹ دیکھیں گے؟ ابھی دکھاتا ہوں۔"

اپنے وقار اور عہدہ کا خیال کرکے ٹکٹ چیکر نے کڑک کر کہا ۔۔۔ " جی آپ کو یا تو ٹکٹ دکھانا ہوگا یا پھر پنالٹی کے ساتھ کرایہ دینا ہوگا"

" پہلے ٹکٹ لیجئے پھر پنالٹی کی بات کرنا" اتنا کہہ کر انھوں نے پھر جلدی سے اپنے جوتے کا فیتہ کھولنا شروع کردیا میرے بڑے بھائی کو یہ سب پسند نہ آیا۔ پسند تو کسی کو بھی نہیں آیا لیکن کرتے کیا؟ میرے بڑے بھائی نے مجھ سے سرگوشی میں کہا ۔۔۔ "ان کو ساتھ لاکر ٹھیک نہیں کیا" میں کچھ جواب نہ دے سکا۔

چونکہ اگلا اسٹیشن قریب آرہا تھا اس لئے گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی جارہی تھی۔ اُدھر ٹکٹ چیکر صاحب کی جراءت اور آواز بڑھتی جارہی تھی مگر ہمارے دوست کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔

گاڑی رکی۔ ٹکٹ چیکر نے پولیس کانسٹبل کو بلایا۔ ادھر جناب ہمارے دوست بائیں ہاتھ میں جوتا اور دائیں ہاتھ میں اُسی جوتے کے اندر سے نکال کر ٹکٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "دیکھئے"

بے چارے ٹکٹ چیکر کو ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا " جوتا نیچے رکھئے" اب ہمارے دوست نے فلک شگاف قہقہہ لگایا " واہ صاحب! آپ تو ڈر گئے"

" ارے جناب، جب سے ٹکٹ کئی بار کھو چکا ہوں تب سے ٹکٹ کو جوتے میں رکھ لیتا ہوں۔ معاف کیجئے آپ تو میری اس حرکت سے کچھ ڈر گئے"

ٹکٹ بغیر دیکھے ہی چیکر صاحب گاڑی سے جلدی اُتر گئے کیونکہ ایک تو گاڑی چھوٹنے والی تھی اور دوسرے وہ بے حد کھسیا گئے تھے۔

گاڑی چلنے پر ہنستے ہنستے ہم لوگوں کا پیٹ پھول گیا۔

ریل کے سفر میں ٹکٹ چیکر لوگوں سے ہمارے اس دوست کی دوستی زیادہ ہے اور دشمنی — کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہی ہمارے دوست کا دماغ کام کرنے لگتا ہے۔

وہ ٹکٹ چیکر تو اسی جنکشن پر رہ گئے تھے۔ دو تین اسٹیشن پار ہو جانے کے بعد ایک دوسرے پستہ قد ٹکٹ چیکر ڈبے میں آئے۔ انھیں دیکھتے ہی میں نے اپنے دوست کو اشارہ کیا۔

"خبردار اب کوئی ایسی ویسی حرکت مت کر بیٹھنا!" دوست نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔

ٹکٹ چیکر نے اپنا کام شروع کیا۔ ہمارے دوست کی جانب بھی گیا — "ٹکٹ"

دوست انجان بنے بیٹھے رہے تو ٹکٹ چیکر کو دوبارہ کہنا پڑا — "ٹکٹ دکھائیے!"

اس مرتبہ دوست نے جو حرکت کی اسے دیکھ کر ہم سب دنگ رہ گئے۔ اپنے چہرہ کو جس قدر کراہیت آمیز بنا سکتے تھے بنا کر ایک جھٹکے کے ساتھ اچک کر اپنا چہرہ چیکر صاحب کے منہ کے بالکل نزدیک پہنچا دیا۔ اس پھرتی سے اُس نے یہ سب کیا کہ ہم حیرت زدہ تھے۔

کچھ سکینڈ تک اس حالت میں رہنے کے بعد اپنی پچھلی حالت میں آ گئے۔ چیکر صاحب کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ یہ کیسا آدمی ہے اور کیا کر رہا ہے؟ جرأت سے کام لیتے ہوئے انھوں نے کہا "جناب ٹکٹ دکھائیے"

یہ لو اور پھر وہی منظر دوہرایا گیا۔ ویسا ہی نفرت انگیز چہرہ 'وہی جھٹکا' وہی اچھل — ہاں اس مرتبہ کچھ زیادہ وقت تک ہمارے دوست نے اپنا چہرہ چیکر صاحب کے منہ کے سامنے رکھا۔

یہ کیا ہو رہا ہے — کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بے چارے چیکر صاحب متحیّر تھے۔

ہم سب کو پریشانی کے عالم میں دیکھ کر ہمارے دوست نے جھلاہٹ کے ساتھ چیکر صاحب سے کہا "تمہاری آنکھیں نہیں ہیں؟ تمہیں دکھائی نہیں دیتا ہے؟ میری زبان کھلا کر ہی تمہیں چین ملا۔ دھرم بھرشٹ کرا دیا۔ ضرورت سے فارغ ہو کر آیا ہوں۔ ہاتھ دھوے نہیں ہیں، کلّا بھی نہیں کیا پھر بھی بولنا پڑ گیا۔ آپ ٹکٹ ہی تو دیکھنا چاہتے ہیں دیکھ کیوں نہیں لیتے؟ آنکھیں نہیں ہیں؟

ٹکٹ چیکر نے دریافت کیا۔ ٹکٹ ہے کہاں؟"

"ہے کہاں؟" دوست نے جھلاہٹ کے ساتھ کہا اور داہنے ہاتھ کی انگلی سے اپنی ٹوپی کے نیچے دبے اُس ٹکٹ کی طرف اشارہ کیا جو ماتھے پر جھلک رہا تھا۔ ٹکٹ کا نمبر صاف دکھائی دیتا تھا۔ دوست نے پھر پوچھا "کیوں دکھائی دیا کہ اب بھی نہیں؟ ارے اسی لئے تو پہلے سے ٹوپی کے نیچے گھسیٹر رکھا تھا۔ دو بار تمہاری آنکھوں کے سامنے اچک کر گیا میں بے کار کھڑا ہوا تھا؟ ٹکٹ دیکھئے اور دیکھ کر وہیں رکھ دیجئے۔ نہ جانے ابھی کوئی دوسرا چیکر آتا ہو!"

ٹکٹ چیکر بے چارہ کھسیا گیا۔ ٹوپی میں گھسا ٹکٹ سامنے ہی تھا مگر اس کا ادھر دھیان ہی نہ گیا تھا۔ دھیان جاتا بھی کیسے؟ ٹکٹ رکھنے کا یہ کوئی مقام ہے؟ اور ٹکٹ دکھانے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟

ٹکٹ چیکر صاحب کو ٹکٹ دیکھنا تھا اس لئے انھوں نے ٹکٹ کھینچ لیا اور دیکھ کر وہیں رکھ دیا۔ ہمارے دوست نے خوش ہو کر وہ لمبا فرشی سلام کیا کہ ٹکٹ چیکر صاحب بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

ایسے ہیں ہمارے دوست! خدا ہی ان سے بچائے اور خصوصاً ریل کے سفر میں ایک واقعہ اور سناؤں گا۔
کوئی دو سال پہلے کی بات ہے۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ الہ آباد کے چوک بازار میں کچھ خرید رہا تھا۔ کسی نے آکر اچانک کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مڑ کر دیکھا تو وہی ہمارا دوست تھا۔
میں نے پوچھا — "تم یہاں کہاں ؟"
ایک ضروری کام سے کل یہاں آیا تھا۔ آج دوپہر کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔"
" واہ واہ تب تو تمہارا ساتھ ہوگا۔" ہمارے دوست نے کہا — "میں بھی اسی گاڑی سے کان پور چل رہا ہوں۔ اچھا تو پھر اسٹیشن پر ملیں گے۔ ایک صاحب سے ملنا ہے۔ ان سے مل کر ابھی اسٹیشن آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ہمارا دوست چلا گیا —
میں سوچنے لگا کہ یہ ایک قسم کی بدشگونی ہے۔ اس دوست کے ساتھ ریل کا سفر کرنا ہوگا۔ خیر دیکھا جائیگا۔
جب گاڑی چھوٹنے ہی والی تھی ہمارا دوست بھاگتے ہوئے، اسٹیشن پر آیا اور میرے ہی ڈبے میں سوار ہوگیا۔ اس نے مجھ سے میرا منی بیگ مانگا۔ اس میں سے کچھ پیسے قلی کو دے کر پیشاب خانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اور وقت گزر گیا اور کانپور قریب آگیا۔
پلیٹ فارم نمبر ایک پر جاکر گاڑی کھڑی ہوگئی۔ میں تیزی سے اتر گیا۔ مگر ہمارے دوست کو کوئی جلدی نہ تھی۔ مجھ سے کہا — " باہر جاکر انتظار کرنا۔ میں آتا ہوں۔"
میں نے پوچھا — "کیوں، ساتھ کیوں نہیں چلتے ؟"
"تم چلو بھی میں ابھی آتا ہوں" ہمارے دوست نے کہا۔ میں سوچنے لگا ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ٹکٹ نہیں لایا ہوگا۔ خیر — میں اترا۔ گیٹ پر ٹکٹ دے کر باہر آیا۔ سامان ایک طرف رکھ کر دوست کا انتظار کرنے لگا۔
دھیرے دھیرے بھیڑ کم ہوگئی۔ اب ایک دو آدمی ہی نکل رہے تھے۔ اتنے میں ہینڈ بیگ ہاتھ میں لئے میرا دوست گیٹ پر آیا اور ٹکٹ دیئے بغیر لاپرواہی سے آگے بڑھا۔
ٹکٹ چیکر نے کہا۔ "ٹکٹ"
بھائی فرصت نہیں ملی۔ اِدھر جا ہی نہ سکا، لے نہ پایا۔" کہتے ہوئے ہمارا دوست آگے بڑھا۔
چیکر نے کہا۔ " ٹھہریئے جناب! کیسی فرصت ؟ ٹکٹ دیجئے۔"
"بھائی میں سچ کہتا ہوں۔ دارا گنج سے گیا کٹرا اور کٹرا سے سیدھا اسٹیشن۔ چوک تو جا ہی نہ سکا۔ تم جانتے ہو اعلیٰ قسم کا مال تو چوک میں ہی ملتا ہے۔" دوست کا یہ لمبا جواب تھا۔ اتنے میں دوسرے دو چیکر ادھر اور آگئے۔
" آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں ؟" چیکر نے پوچھا — " سیدھی طرح ٹکٹ دیجئے، نہیں تو کرایہ۔"
دوست نے ہنستے ہوئے جواب دیا — "یار، کیا مذاق کر رہے ہو ؟ کہہ تو دیا کہ فرصت نہیں ملی ورنہ چار چھ آنے کی بات تھی۔ میں پرسوں پھر الہ آباد جاؤں گا۔ اب کی بار ضرور لاؤں گا۔"
سبھی ٹکٹ چیکر حیران تھے کہ یہ مسافر کیا کہنا چاہتا ہے۔ بڑا چالاک معلوم ہوتا ہے۔ دماغ تو خراب نہیں ہے۔

ٹکٹ چیکروں نے میرے دوست کو گھیر لیا۔ میں نے سوچا کہ بیٹا آج پھنس گئے۔ ایک چیکر نے کڑک کر کہا "آپ یہ سب کیا بک رہے ہیں ؟ سیدھے ہاتھ سے کرایہ نکالو۔"

دوست نے گمبھیر ہو کر کہا۔" دیکھئے صاحب ! بات سنبھل کر کیجئے۔ ارے جناب یہ چیکر صاحب میرے دوست ہیں ـــــ گہرے دوست ! پرسوں جب الہ آباد جانے لگا تو انھوں نے کہا تھا کہ وہاں سے امرود لیتے آنا۔ آپ جانتے ہی ہیں الہ آباد کے امرود مشہور ہیں۔ میں لے بھی آتا مگر بات یہ ہوئی کہ چلتے وقت مجھے دم مارنے کی بھی فرصت نہیں ملی ورنہ کونسی بڑی بات تھی ـــــ تو جناب ان کے لئے امرود نہیں لا سکا اور یہ سمجھتے ہیں کہ میرے اس ہینڈ بیگ میں امرود ہیں اور میں انھیں دیتا نہیں۔ چاہے تو آپ دیکھ لیجئے اس میں امرود کہاں ہیں ؟

بعد میں آئے ہوئے چیکروں نے پہلے والے ٹکٹ چیکر کے منہ کی طرف دیکھا۔ وہ حیران تھا ! " جی نہیں میں انھیں جانتا بھی نہیں، باتیں بنا رہا ہے۔" جھلا کر اس نے کہا۔

ٹکٹ چیکروں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا ـــ" اچھا صاحب آپ ہی کی بات ٹھیک۔ امرود نہیں لائے نہ سہی مگر جناب ٹکٹ کہاں ہے ؟"

"ٹکٹ کہاں ہے ! اجی ٹکٹ تو میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ انھیں کے پاس ہوگا۔"

چیکر صاحب بولے ۔"کس کو دیا تھا ؟" مجھے نہیں دیا۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

" جھوٹ بولتا ہوں ؟ واہ یار ! مذاق کرنے کا اچھا موقعہ ڈھونڈا "

پھر دوسرے چیکر کی جانب مخاطب ہو کر دوست نے کہا ۔" جناب اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ ٹکٹ کا نمبر بھی میری ڈائری میں نوٹ ہے۔" یہ کہتے ہوئے تپاک سے جیب سے ایک چھوٹی سی خوبصورت نوٹ بک نکالی اور اس کے اوراق ادھر ادھر پلٹتے ہوئے ایک جگہ رک کر بولے " ہاں صاحب دیکھئے میرے ٹکٹ کا نمبر ہے 63582"

ٹکٹ چیکروں میں سے ایک نے ٹکٹ کا بنڈل ہاتھ میں لے کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اور وہاں سچ مچ 63582 نمبر کا الہ آباد سے کانپور کا ٹکٹ موجود تھا۔

میں ایک تماشائی کی طرح یہ سب ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ 63582 میرے ٹکٹ کا نمبر تھا لیکن میں خاموش رہا میں حیران تھا کہ اسے میرے ٹکٹ کا نمبر کیسے معلوم ہوا اور اس نے اپنی ڈائری میں کب لکھا۔ میں تو برابر ساتھ رہا۔ سوچنے پر یاد آیا کہ جب اس نے منی بیگ دیکھا تھا تبھی ٹکٹ کا نمبر دیکھا ہوگا اور پیشاب خانے میں جا کر نوٹ کر لیا ہوگا۔

اتنے میں ریلوے ڈپارٹمنٹ کا بڑا افسر آنکلا جس کو دیکھ کر چیکر ادھر ادھر چل دیئے۔

ہم دونوں اسٹیشن سے باہر آئے۔ تنہائی میں، میں نے اس سے کہا " بھائی تم تو بڑے شیطان ہو ! لیکن تم نے تو الہ آباد اسٹیشن پر کہا تھا W.T. کمھ، چلا ہوں کر اب چلوں گا۔ یار مجھ سے بھی جھوٹ بولتے ہو !"

کیوں، جھوٹ کیوں ؟ میں نے تو ٹھیک ہی کہا تھا۔ لوگ W.T. کا مطلب سمجھتے ہیں۔ (WITHOUT TICKET) 'بغیر ٹکٹ کے' اور میں سمجھتا ہوں WITH TICKET ٹکٹ کے ساتھ۔ میں نے تو یہی کہا تھا کہ میں W.T کہیں نہیں چلتا اس زندگی میں اب تک تو W.T ٹکٹ کے ساتھ چلا نہیں۔ آگے خدا جانے

W.T. کی یہ نئی اصطلاح سن کر کون خوش نہ ہوگا ؟

●●

تبصرہ

آندھرا پردیش

مصنفہ: ایم باگا ریڈی

ناشر: اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

جناب ایم باگا ریڈی کی شخصیت سے اُردو والوں میں کون ہے جو واقف نہیں پچھلے تقریباً بیس سال سے وہ اردو کے محاذ پر اپنے خاص انداز میں بے لوث کام کیے جا رہے ہیں۔ برسرِ اقتدار جماعت سے تعلق ہونے کے باوجود اُردو کے کاز کے لیے بے باکانہ کام کرنا جناب ایم باگا ریڈی ہی کا حصہ ہے۔ ورنہ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ اردو مادری زبان والے لیجسلیچرز اور خاص طور پر برسرِ اقتدار جماعت سے تعلق رکھنے والے اراکین مقننہ نے کبھی بھی اپنی زبان کے تحفظ اور اس کی ترقی کے مسائل کے ضمن میں مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کے نمائندگی کرنے اور اس کو اپنا حق دلانے کی جسارت نہیں کی۔ لیکن اُردو کے اس مجاہد نے جب کبھی اس زبان سے ناانصافی ہوئی کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اور ہر قسم کی مصلحتوں سے آزاد ہو کر اربابِ حکومت کو جھنجھوڑا۔ خاص طور سے ۱۹۶۶ء میں جبکہ ریاست کی تمام جماعتیں لسانی بل میں اُردو کی شمولیت کے مسئلہ پر ناانصافی کے درپے تھیں۔ جناب ایم باگا ریڈی نے انجمن تحفظ اُردو کے صدر کی حیثیت سے موثر اور کامیاب نمائندگی کی۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کروا کے چھوڑا کہ ماضی میں اُردو کو جو خصوصی حیثیت حاصل تھی اس کے تسلسل کے طور پر بھی ریاست آندھرا پردیش میں اُردو کو ثانوی درجہ دیا جانا چاہیئے ـــــ

باگا ریڈی صاحب کی اردو تحریک سے وابستگی ان کی اس زبان اور اس کے ادب سے دلچسپی کا نتیجہ بھی ہے۔ انھوں نے مادر جامعہ، جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعہ تعلیم حاصل کی۔ جامعہ نظامیہ کے منشی فاضل بھی ہیں۔ اُردو لکھنا پڑھنا اور بولنا ان کی گھٹی میں ہے۔ "شگوفہ" میں ان کے بعض طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "شمع ہر رنگ میں . . ." چھپ چکا ہے۔ تلگو زبان و ادب پر بھی اردو میں ان کی ایک مختصر کتاب شائع ہو چکی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کی تیسری تصنیف ہے۔ آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد اس ریاست کے تعلق سے ایک معلوماتی کتاب کی شدید ضرورت تھی۔ ایم۔ باگا ریڈی کی اس کتاب سے اس ضرورت کی کسی حد تک تکمیل ہو جاتی ہے۔ اردو میں کتابوں کی رفتار تو تیزی سے بڑھتی گئی ہے۔ لیکن معلوماتی اور علمی کتابیں بہت کم چھپ رہی ہیں۔ ریاستوں کی تشکیل جدید کے بعد ہر ریاست کے تعلق سے الگ الگ معلوماتی

کتابیں چھپنی چاہیے تھیں۔ لیکن اس نوعیت کی بہت کم تصنیفات دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایم باگا ریڈی نے اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود بڑی ہی عام فہم اور شستہ زبان میں یہ کتاب لکھی ہے۔ اس سلاست کی وجہ سے بڑوں اور بچوں دونوں میں اس کے مطالعہ کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب کے آغاز پر آندھرا پردیش کے ماضی کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ ریاست کی تشکیل کے بعد اس کے حصے میں جو مقامات اور پہاڑ آئے۔ ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ نیز زراعت جنگلات، معدنیات، تعلیمات، تعمیرات اور دوسرے شعبوں میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں خصوصی طور پر آندھرا پردیش میں اُردو کا جو موقف ہے اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

—— اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آندھرا پردیش کی تہذیب و شرافت اور عظیم روایتوں کا جب بھی موقع ملا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ ثانوی مدارس کے نصاب میں شامل کی جائے ڈیمائی سائز کے ۹۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت آٹھ روپے ہے۔ اور اردو اکیڈیمی کے بک ڈپو واقع اے سی گارڈ حیدرآباد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

(م۔ک)

نوائے طالب (شعری مجموعہ)

طالب رزاقی

ناشر: اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

"نوائے طالب" طالب رزاقی مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے

طالب رزاقی حیدرآباد کے خوش گلو و خوش فکر شاعر تھے۔ مشاعروں میں اپنے خاص انداز میں شعر پڑھتے اور کافی پسند کیے جاتے تھے۔ یوں تو رنگ سخن روایتی تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ غزل سے انھیں خاص رغبت تھی ویسے ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ نمونۃً ایک غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

یہ دل ہے ہر اک کو دیا جائے نا
جسے دیدیا پھر لیا جائے نا

محبت میں ہے فرض مر مر کے جینا
وہ مر جائے جس سے جیا جائے نا

بغیر اذن ساقی پیا جائے نا
گنہ ہے تکلف کیا جائے نا

طالب رزاقی کے کلام کا یہ مجموعہ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ طباعت و کتابت اچھی ہے۔ صفحات ۱۰۸، اور قیمت آٹھ روپے۔

(م۔ک)

زندہ دلانِ حیدرآباد، بارھویں سالانہ تقاریب

شمارہ ۱۱
جلد ۱۲

نومبر ۱۹۷۹

سوونیر

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت:
ظور احمد ٭ حمایت اللہ ٭ مسیح انجم

مجلس مشاورت:
مہندر سنگھ بیدی
راجہ عبدالغفور
یندر لوتھر
رت چند کھنہ
بی حسین

ٹائیٹل: طالب خوندمیری

مطبوعہ:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد

بائنڈنگ:
محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس
روبرو دربار حسینی، پرانی حویلی، حیدرآباد

ٹائیٹل پرنٹنگ:
اسٹینڈرڈ اکوئپمنٹ
شانتی نگر، حیدرآباد

منیجر:
بشیر انور

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
شگوفہ
۳۱، مجسٹریٹ
معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون: 57716
جنرل منیجر
سمیع جلیل

شگوفہ

کا

جنوری ۱۹۸۰ء کا شمارہ

سالنامہ ہوگا

مُلک کے تمام اہم طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات سے مُزیّن

خوبصورت سہ رنگی ٹائٹل سے آراستہ

قیمت : تین روپے

(فہرست)

چورن

زندہ دلانِ حیدرآباد کا بارہواں سالانہ اجتماع

۸، ۹، ۱۰، نومبر ۷۹ء
نمائش میدان و گاندھی بھون

مجلس استقبالیہ:

صدر استقبالیہ:

ایم بالیا - صدرنشین حڈا

نائب صدر استقبالیہ:

پی۔ کرشنا پارلیمنٹری سکریٹری

شیو پرشاد ایم ایل۔اے

سی رام داس ایم ایل۔اے

جناردھن ریڈی ایم ایل۔اے

معتمد عمومی:

طالب خوندمیری

کنوینر ادبی اجلاس:

پرویز یداللہ مہدی

کنوینر شام لطیفہ:

مرزا مصطفٰے علی بیگ

کنوینر ساونیر:

سید مصطفٰے کمال

کنوینر بکنگ:

محمد سلیمان

کنوینر انتظامی:

گرد بر حیدرآبادی

کنوینر رابطہ:

بوگس حیدرآبادی

کنوینر پبلسٹی:

حفیظ خان مذاق

کنوینر ڈرائنگ:

سعادت علی خاں

کنوینر پرنٹنگ:

وہاب قیصر

کنوینر شعبۂ خواتین:

طاہرہ نکہت

ارکان:

رشید قریشی - مسیح انجم - سمیع جلیل

صبغۃ اللہ تمیاث - قادر علی بیگ

زندہ دلانِ حیدرآباد

صدر: مجارت چند کھنہ آئی اے ایس (ریٹائرڈ)

نائب صدور: ہاشم علی اختر آئی اے ایس

رشید قریشی

محمد حمایت اللہ

معتمد عمومی: طالب خوندمیری

نائب معتمدین: مسیح انجم

بوگس حیدرآبادی

خازن: مرزا مصطفٰے علی بیگ

اراکان : سید مصطفیٰ کمال
ناظم مرزائی گڑبڑ
رشید سمیع جلیل
قادر علی بیگ
محمد سلیمان
صبغۃ اللہ بمباٹ

شام لطیفہ

جمعرات ۸ نومبر ۵ بجے شام ۔ نمائش کلب

صدارت :
بی رام دیو ، عزت مآب وزیر اینمل ہسبنڈری

لطیفہ گو :
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۔ فکر تونسوی ، اظہار افسر ،
محمد حمایت اللہ ۔ شریف اسلم ۔ حاجی بشیر احمد
شعیب ۔ رشید قریشی ، حفیظ خان مذاق ،
طالب خوندمیری ۔ ایس اے واسع ۔ خیرات ندیم
منور علی ۔ شاہد جلیل ۔ افشاں جبیں ۔ اسلم فرشوری
دولت رام ۔ بوگس حیدرآبادی ۔

کنوینر :
مصطفیٰ علی بیگ

ادبی اجلاس :

جمعہ ۹ نومبر ۵ بجے شام
گاندھی بھون تھیٹر

مہمان خصوصی :
جناب پی گنگا ریڈی عزت مآب منسٹر سیول سپلائز

صدارت :
جناب نریندر لوتھر آئی ۔ اے ۔ ایس

مزاح نگار :
فکر تونسوی ۔ مجتبیٰ حسین رشید قریشی ،
مسیح انجم ، برق حسین ، ڈاکٹر حبیب ضیاء
ارشد علی خاں

کنوینر :
پرویز یداللہ مہدی

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

ہفتہ ۱۰ نومبر ۸ بجے شب
نمائش میدان

صدارت :
جناب ایم باگا ریڈی عزت مآب وزیر پنچایت راج

مہمان خصوصی :
شریمتی سروجنی پلا ریڈی عزت مآب وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ

شعرائے کرام :
ہلال سیوہاروی ، شہباز امروہوی ، نرگس
سہسوانی ۔ ظہیر ابن قدسی ، کامل خواہ مخواہ
عظمت بھلاواں ، گلی نلگنڈوی ۔ پاگل
عادل آبادی ، سراج نزلی ، محمد حمایت اللہ
مصطفیٰ علی بیگ ۔ سرپٹ حیدرآبادی اسمعیل
ظریف ، گرگٹ حیدرآبادی ۔ قادر حیدرآبادی
بوگس حیدرآبادی ، اشرف خوندمیری ، کلیم عبدالکلیم
رشید سمیع جلیل ، محمود نشتر ، حفیظ خان مذاق ،
صبغۃ اللہ بمباٹ ۔ ان پڑھ جہانگیری ، منور علی تیغ

کنوینر : طالب خوندمیری

جناب ایم۔ بالیا

صدر حیدرآباد سٹی کانگریس کمیٹی (آئی) و صدر نشین حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی جناب ایم۔ بالیا ۱۹۳۷ء میں قدیم شہر کے محلہ علی آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق منورو کا پو طبقہ سے ہے۔ یہ اپنے شہر سے پیدائشی تعلق اور پسماندہ فرقے کے فرد ہونے کی وجہ سے وہ غریبوں اور پسماندہ طبقات کی غربت، دکھ درد اور ان کے معاشی مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ چونکہ زمانۂ طالب علمی ہی سے ان میں حرکیاتی قیادت کی صلاحیتیں رہی ہیں و نیز ایک دردمند دل، سیکولر ذہن اور جذبۂ خدمت کے بھی مالک ہیں، اسی لئے وہ سارے شہر حیدرآباد و سکندرآباد اور خاص طور پر یہ اپنے شہر میں اپنی دیرینہ عوامی خدمات کا شاندار ریکارڈ رکھتے ہیں۔

جناب بالیا صاحب رفاہ عام ہائی اسکول، ہری باؤلی کی اسٹوڈنٹس یونین کے جنرل سکریٹری رہ چکے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں طلباء کی "غیر ملکی تحریک" میں امن و شائستگی کی برقراری میں انھوں نے اہم رول ادا کیا۔ "منا نور ایجنسی" میں انھوں نے پسماندہ طبقات کے تعلیمی اور فلاحی کاموں جاپان، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور دیگر بیرونی ملکوں کے نمائندوں کی معیت میں اہم خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۷ء میں انھیں عادل آباد بھارت سیوک سماج کا آرگنائزر نامزد کیا گیا۔ انھوں نے فوجی ٹریننگ بھی حاصل کی اور مختلف مدارس میں کچھ عرصے تک اعزازی طور پر تدریسی فرائض بھی انجام دیئے۔

سیاسی میدان میں جناب بالیا صاحب تقریباً تین دہوں سے کانگریس پارٹی سے وابستگی رکھتے ہیں۔ اسی جماعت کے ٹکٹ پر وہ ۱۹۶۴ء میں جنگم میٹ کے حلقے سے مجلس بلدیہ کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ انتخاب اس بات کی دلیل تھا کہ وہ اس حلقے کے ہندو اور مسلم دونوں طبقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ پچھلے اسمبلی انتخابات میں بھی انھوں نے حیدر رائن گڈہ اسمبلی حلقے سے کافی مسلم ووٹ حاصل کئے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۴ء تک بالیا صاحب حیدرآباد سٹی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۷۵ء میں نائب صدر اور پھر سٹی کانگریس کی صدارت پر فائز ہوئے۔ اس دوران انھوں نے قومی یکجہتی اور غریب طبقات کی فلاحی خدمات کے لئے پارٹی اور عوام میں رابطہ کا کام انجام دیا۔ ان خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں یونائٹیڈ ہندو مسلم فرنٹ حیدرآباد کی جانب سے مسلسل دو سال کے لئے "یونٹی ایوارڈ" دیا گیا۔ گزشتہ سال حکومت آندھرا پردیش نے ایم بالیا صاحب کو حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی (حڈا) کا صدرنشین مقرر کیا۔

جناب ایم بالیا صاحب کی شخصیت، حیدرآبادی روایات و تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ وہ سادگی، انکساری، محبت اور خلوص کا پیکر ہیں۔ وہ سیاسی اور سماجی امور سے ازحد وابستگی کے باوجود علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بالیا صاحب کئی زبانوں مثلاً تلگو، ہندی، اردو اور انگریزی میں خاصہ عبور رکھتے ہیں۔ اردو زبان سے انھیں خاص شغف ہے۔ اسی لئے اردو کی ترویج، ترقی اور اس زبان کے تعلیمی مسائل سے انھیں بے حد دلچسپی ہے۔ بالیا صاحب بڑے خوش مزاج، خوش گو آدمی ہیں۔ وہ مزاح کا بڑا لطیف ذوق رکھتے ہیں۔ ظرافت و مزاح اس باغ و بہار شخصیت کی رفتار و گفتار سے عیاں ہوتی ہے ان کی ان ہی خوبیوں کے پیش نظر زندہ دلان حیدرآباد کی مجلس عاملہ نے ان سے بارہویں سالانہ تقاریب کی استقبالیہ کمیٹی کا صدرنشین بننے کی خواہش کی۔

جناب یم باگا ریڈی

عزت مآب وزیر پنچایت راج و صدر اُردو اکیڈمی

شریمتی سروجنی پلا ریڈی

عزت مآب وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ و بلدی نظم و نسق

جناب پی گنگا ریڈی
عزت مآب وزیر سیول سپلائز
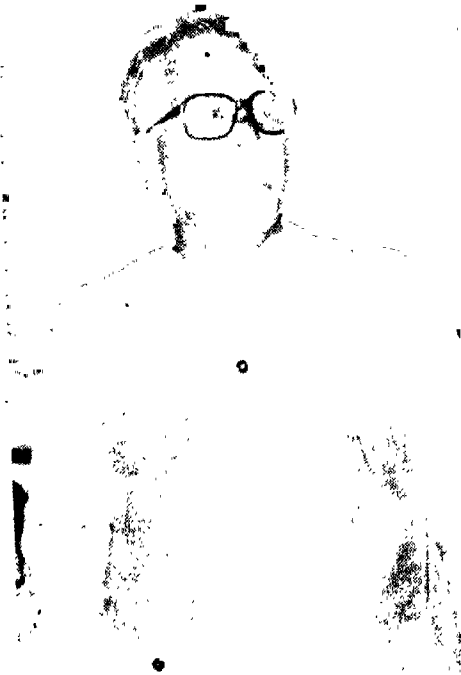
جناب بی رام دیو
عزت مآب وزیر انیمل ہسبنڈری

یم بالیا
صدر نشین استقبالیہ

پروفیسر یداللہ مہدی کنوینر ادبی اجلاس

طالب خوندمیری معتمد عمومی و کنوینر مشاعرہ

نریندر لوتھر

فکر تونسوی
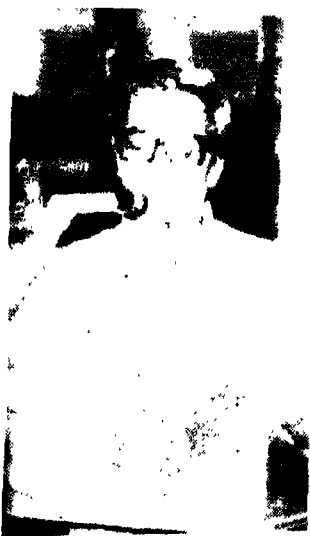
رشید قریشی نائب صدر

مجتبیٰ حسین

ہلال سیوہاروی
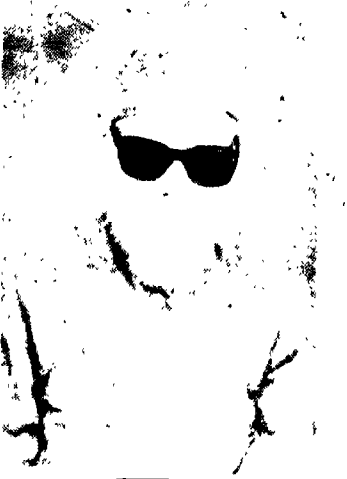
شہباز صدیقی امروہوی

حمایت اللہ نائب صدر

مسیح انجم نائب معتمد

بوگس حیدرآبادی نائب معتمد

مصطفیٰ علی بیگ خازن و کنوینر شامِ لطیفہ
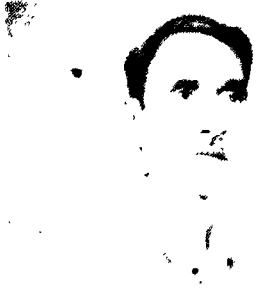
کرگس سہسوانی

سمیع جلیل رکن

گڑبڑ حیدرآبادی رکن

سرپٹ حیدرآبادی

اسمٰعیل ظریف

حفیظ خاں مذاق

برہان حسین

صبغۃ اللہ بمباٹ رکن

عظمت بھلاداں

پاگل عادل آبادی

اشرف خوندمیری

من موہن تلخ

مجتبیٰ حسین

ایک بڑی آواز کی آہٹ

جُملہ بازی اور لطیفہ گوئی اردو ادب کا ایک طرّہ امتیاز رہی ہے۔ ہمارے کلاسیکی ادب میں معرکۂ چکبست و شرر اور میاں خوجی کا کردار اس ضمن کی عمدہ مثالیں ہیں لیکن میں اگر یہ کہوں کہ طنز یا مزاح کے اس عنصر کو ایک باقاعدہ صنفِ سخن بنانے کا سہرا ہمارے کلاسیکی اساتذہ کے سر نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ قریب قریب پطرس اور کنہیا لال کپور کے عہد سے شروع ہوتا ہے تو میں اُمید کروں گا کہ ہمارے کلاسیکی، نیم کلاسیکی یا جدید طنز و مزاح نگار میری گردن ناپنے پر نہ آمادہ ہوں گے۔

درحقیقت ہمارے یہاں طنز و مزاح کو پھبتی کسنے تک زیادہ استعمال کیا گیا اور بطور فن کم اور یہ رواج بھی شاعری میں زیادہ رہا نثر میں کم۔ پھر رفتہ رفتہ صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی کہ جُملہ بازی شاعروں کی ذہانت اور مقبولیت کی کسوٹی بنتی گئی اور طنز و مزاح کو ایک باقاعدہ فن کی شکل میں نثر نگاروں نے پروان چڑھایا لیکن پھر یہ ٹریجڈی بھی اُردو ادب ہی کے حصہ میں آئی کہ ذہین اور لاڈلے شعراء جملہ بازی کی معراج کو تو پہنچ گئے لیکن بطور شاعر اُن کے تخلیقی سوتے سُوکھ گئے، ادھر طنز نگاری کے تخلیقی عمل میں بھی کچھ بے راہ روی آئی یعنی طنز اور مزاح آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے کہ اس وقت اُردو ادب میں یہ امتیاز کرنا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے کہ ہمارے یہاں طنز نگار کون ہے اور مزاح نگار کون؟ بلکہ ہر شخص اپنی اپنی سہل پسندی کے حساب سے جس کو چاہے طنز نگار یا مزاح نگار کہنے لگ گیا۔

میں نے اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو یہ کہتے سُنا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

اور مجھے ایسے ردِّ عمل پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے ۔ اُردو ادب تو خیر اتنا چھوٹا ادب ہے کہ ہر کوئی بڑا ادیب ہونے کا دعویٰ کئے بیٹھا ہے ۔"بڑے ادیبوں" کے اس چھوٹے ادب سے قطع نظر اگر ہم عالمی ادب پر نظر ڈالیں تو تمام تر عالمی ادب میں انگریزی مزاح (ENGLISH WIT) کو جو فضیلت و برتری حاصل ہے وہ پوری دُنیا کے ادب میں طنز (SATIRE) کو حاصل نہیں ہے ۔ اس فرق کی اس سے زیادہ وضاحت ممکن نہیں کہ شیکسپیئر کے یہاں WIT ہے جارج برنارڈشا کے یہاں SATIRE ہے اور شیکسپیئر نیز شا کے مقام و مرتبے میں جو فرق ہے اُس پر کوئی بھی بحث لاحاصل ہے اور خاص طور پر اُردو ادب میں ۔

ہمارے یہاں میاں خوجی میں مزاح ہے ۔معرکۂ چکبست و شرر میں طنز ہے ۔ پھر ہمیں مزاح 'پطرس' میں ملا ۔ بھرپور مزاح جس میں طنز کا عنصر کسی طرح بھی شامل نہیں ۔ کنہیا لال کپور سے مزاح اور طنز کی حدیں گڈمڈ ہونا شروع ہوئیں اور پھر یہ ٹھٹھے کا ایک ایسا سمندر بن گیا کہ فکرؔ تونسوی بہ مشکل غرق ہوتے ہوتے بچا ۔

یہ ہے وہ ادبی ورثہ جسے دامن میں سمیٹے ہوئے مجتبیٰ حسین آہستہ آہستہ لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ ہمارے سامنے آئے ۔ بقول مجتبیٰ حسین "مجھے تو زبردستی طنز نگار بنادیا گیا تھا ۔ بس دے دیا گیا ایک روزانہ اخبار کا کالم کہ ہر روز ایک عدد طنزیہ (یا مزاحیہ) کالم لکھو" یہاں سے اُردو ادب میں طنز و مزاح نگاری کی ٹریجڈی کی ایک اور دھارا بہہ نکلتی ہے ۔ اُردو اخبارات نے اس نوعیت کی خامہ فرسائی کو صحافت کا ایک لازمی جُزو بنا رکھا ہے ۔اب جہاں ایک طرف طنزیہ کالم ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے وہاں دوسری طرف اُردو کے ذہین ادیبوں کو بھی اُردو ادب ، ادبی رسائل اور ناشر روٹی نہ دے رہا تھا (نہ دے رہا ہے) لہٰذا یہ اخبارات ان ادیبوں کے لئے ذریعہ معاش بن گئے اور مولانا ظفر علی سے لے کر مجتبیٰ حسین تک بڑے بڑے دھانسو نام اُردو اخبارات کی زینت بنے ۔لیکن ان روزانہ اُردو اخبارات کے طنزیہ کالموں کا مقصد ہوتا ہی کیا ہے ؟ اخبار کی پالیسی کے مطابق کسی سیاسی لیڈر یا سیاسی پارٹی پر چوٹ اور بحیثیتِ مجموعی اس دلدل میں پھنسا ادیب عام طور پر اخبار کی پستیوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے ۔ اب اگر مجتبیٰ حسین کو زبردستی بھی اخباری طنز نگار بنایا گیا تو اس کے اندر کوئی ایک لَو تھی ، کوئی چنگاری تھی کہ وہ عامیانہ قسم کے کالم لکھنے بیٹھا اور آج ملک کا ایک ممتاز مزاح نگار ہے ۔

فکرؔ تونسوی تو خیر ملاپ میں ملازمت کرنے سے پہلے ہی مہا رتی تھا ۔ اب شاید مہا رتی کرن بن گیا ہے ۔ مجتبیٰ کے دل میں فکرؔ تونسوی کے لئے کس قدر عزت ہے ۔ میں یہاں اس کے لئے کوئی توقیر نامہ قلمبند نہیں کروں گا لیکن میرا اندازہ ہے کہ حیدرآباد کے روزنامہ سیاست سے وابستہ ہونے کے بعد ہی مجتبیٰ حسین بطور صحافی ملاپ کے طنز نگار فکرؔ تونسوی سے متاثر و مرعوب ہوا ہوگا ۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ تعلق خط و کتابت کی شکل اختیار کرگیا جو خود مجتبیٰ کے الفاظ میں "خط فکرؔ صاحب لکھتے تھے ، کتابت میں کرتا تھا " یہ تھی میرے لئے مزاح نویس مجتبیٰ حسین کی پہلی جھلک اور اس جملے کی ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ فکرؔ تونسوی ادیب بننے سے پہلے خود ایک کاتب تھا ۔

میں نے مجتبیٰ کو اتنا ہی پڑھا ہے جتنا کہ مجتبیٰ نے لکھا ہے ۔ اور جانا بہت ہی کم ہے کہ خود کو ـــ یا کسی اپنے

کو جان لینا یوں بھی دانشوری کی معراج ہوتی ہے۔ ویسے میری مجتبیٰ کی ملاقات بھی ابھی چار ماہ پُرانی ہے "تعلق نوائدہ ادیب دوست" چاہیں تو ابھی سے طبع آزمائی شروع کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ میں یہاں اپنی تمام تر ادبی ذمہ داری اور ایمانداری کے ساتھ یہ اعتراف واعلان کر رہا ہوں کہ مجتبیٰ کو میں آج کا صفِ اوّل کا مزاح نگار تسلیم کرتا ہوں اور مزید یہ کہ میں مزاح کو طنز سے اعلیٰ وارفع ادب قرار دیتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اوپر طنز اور مزاح کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت کی ہے جو شاید کچھ حضرات کو گراں گذری ہو۔

مزاح کے ڈانڈے طنز ہی سے شروع ہوتے ہیں کہ قہقہہ ہی دونوں کا مقصد ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ کسی پر چوٹ کر کے دوسروں کو ہنسا دینا الگ بات ہے اور بنا کسی کا دل دُکھائے سب کو ہنسا کے رکھ دینا ایک بلند فنی تخلیق اور اعلیٰ انسانی مرتبہ ہے۔ مجتبیٰ کے مزاحیہ مضامین اسی بلند فنی تخلیق اور اعلیٰ انسانی مرتبے سے عبارت ہیں۔ مجتبیٰ کے سینے میں نہایت حساس اور دردمند دل ہے نہ صرف بطور انسان بلکہ بطور ادیب بھی۔ مجھے مجتبیٰ کی تحریروں میں کہیں کہیں ایک عجب PATHOS کی کیفیت ملی ہے۔ سارے مضمون میں ہنساتے ہنساتے یہ شخص دفعتاً آخری پیرے میں دو سطریں لکھ کر رُلا کے رکھ دیتا ہے جیسے "یہ رکشا والے" (قطع کلام ـــ مجتبیٰ کا دوسرا مجموعۂ مضامین) یا جیسے خاکہ "سلیمان اریب" (تصہ مختصر ـــ مجتبیٰ کا تیسرا مجموعہ مضامین) ان دو مضامین کا مجتبیٰ حسین تو اس قدر پیکرِ جذبات ہے گویا زندگی میں غم اور خوشی کے رمز و کنایہ سے پوری طرح آشنا ہو۔ مزاح نگاری وہ صنفِ سخن ہے کہ اچھے سے اچھا ادیب کبھی نہ کبھی تخلیق کی کسی نہ کسی منزل پر انمول سے انمول انسانی قدروں کو بھی قہقہے کی نذر کر دیتا ہے۔ محض ضرورت تخلیق یا اپنے رنگِ سخن کے پیشِ نظر ـــ اور یہیں اچھے مزاح نگار اور بلند مزاح نگار کی حدیں الگ ہوجاتی ہیں۔ اگر ہم صرف انہی دو مضامین کی بناء پر مجتبیٰ حسین کو بلند مزاح نگار تسلیم کر لیں تو میری رائے میں ہم اُردو والوں کی جاگیر کوئی بٹے نہ جائے گی۔ لیکن ہمارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے میرا خیال یہ نہیں کہ مجتبیٰ حسین کی تخلیقی توفیق پر کوئی اثر پڑے گا کہ آخر اس نے یہ دو مضامین بھی تسلیم کئے جانے یا نہ کئے جانے پر قلمبند نہ کئے تھے۔ میں یہاں مجتبیٰ کے بارے میں لکھتے ہوئے ایک عام بات اور کہہ دوں کہ اگر ہم اُردو والے بہت اچھے کو اچھا نہیں بلکہ بہت اچھا کہنا سیکھ لیں تو شاید ہم آج کے دور کے اس اپنے چھوٹے پن سے نجات پالیں۔

ایک مرتبہ مجتبیٰ حسین اپنے پہلے مجموعۂ مضامین قطع کلام پر بات کرتے ہوئے بولے: "وہ میرا بہت کمزور مجموعہ ہے میں اُسے DISOWN کرنے کی سوچ رہا ہوں۔"

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "میں اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتا۔ ہاں آج کے مجتبیٰ کو دیکھتے ہوئے وہ کتاب بس ایڈیٹنگ چاہتی ہے۔"

مجتبیٰ میری بات سن کر خاموش ہو گئے۔ پھر کبھی اس ضمن میں مجتبیٰ سے بات نہ ہوئی۔ لیکن میں اندر ہی اندر اس سوال میں اُلجھ گیا کہ مجتبیٰ کو 'قطع کلام' بہت کمزور کیوں لگا؟ یہ مضمون لکھتے ہوئے مجھے اس کا جواب مل گیا کہ وہ تخلیق چونکہ مجتبیٰ کے اخبار نویسی کے زمانے کی ہے۔ اس میں مزاح کی وہ بلند سطح نہیں جو ـــ "گھر کا

ٹیلی فون" "سردی کی گرما گرمی" (قصہ مختصر) "قصہ داڑھ کے درد کا" "جناب صدر" "شاعروں کی حکومت"
"خدا بچائے فلم دیکھنے سے" اور "آٹو رکشا" (بہرحال ـــ چوتھا مجموعہ مضامین) میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اہلِ قلم اسے مجتبیٰ کے شعوری بلوغ سے تعبیر کریں لیکن میں ابھی سے مجتبیٰ کو ایسے کسی بھی فکری رجحان سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسا سوچنا غلط ہے۔ ابھی ابھی تو مجتبیٰ اچھے مزاح نگار سے بلند مرتبہ مزاح نگار کی حدوں میں آئے ہیں۔ "کالونی والے" سے بھی آگے وہ اپنے خاکوں میں نکل گئے ہیں ـــ "بلراج ورما نے تناظر نکالا" "باقی۔ نو آدمیوں کا آدمی" اور "کمار پاشی، یہ بھی ہے آدمی" ان خاکوں میں مجتبیٰ ENGLISH WIT کی جھلک جگہ بہ جگہ دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مجتبیٰ کو نظر نہ لگے ـــ لیکن ـــ

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

بلند مرتبہ مزاح نگار سے بھی آگے مجتبیٰ حسین اُن سرحدوں کو چھونے کے کافی قریب ہیں جہاں سے ہم ان سے بڑا ادب ـــ تخلیق کرنے کی امید کر رہے ہیں تو کیا اُن حدوں میں جاکر مجتبیٰ یہ موجودہ ادب پارے ـــ 'DISOWN' کردیں گے ؟ اس سوال کا جواب دینا مجتبیٰ کا فرض ہے، میرا نہیں ـــ ہاں ایک سوال کا جواب دینا یقیناً میرا فرض ہے جو شاید اب تک آپ کے دماغوں میں کلبلا رہا ہو کہ میں نے مجتبیٰ کے مضامین سے مزاح کے شاہکاروں کے چیدہ چیدہ حوالے کیوں نہیں دیئے محض مضامین کے عنوانات درج کرنے پر بس کیوں کی؟ پہلے تو اس لئے کہ اقتباس کہاں سے پیش کروں اور کتنا کروں؟ کیوں نہ یہ مضامین مکمل صورت میں پڑھے جائیں؟ میں نے اپنی طرف سے مجتبیٰ کے کچھ معرکہ آرا مضامین کے عنوانات درج کر دیئے ہیں۔ ادب کے پرستار وہ مضامین پڑھیں اور اگر میں غلط ہوں تو مجھے غلط ثابت کریں اور دوسرے اس لئے کہ مجھے مجتبیٰ کا ایک اور روپ نظر آرہا ہے ان کی انہی تخلیقات کی روشنی میں ایک حساس، درد مند اور بڑا ادیب جس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ میں اوپر دو مضامین "یہ رکشا والے" اور "سلیمان اریب" کے سلسلے میں کرچکا ہوں اور مجتبیٰ کی نہ صرف اب تک کی تخلیقات ان سے متوقع اس بڑے ادب کی آئینہ دار ہیں بلکہ خود مجتبیٰ بھی ان قہقہوں کی اوٹ میں بھیگی آنکھوں سے اس منزل کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔ "قصہ مختصر" میں مجتبیٰ "میں اور میرا مزاح" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں۔

" دوستوں کی محفل میں جی بھر کے ہنس لینے، دن بھر قدم قدم پر سماج کی پستیوں سے ہنستے ہنستے مفاہمت کر لینے اور اپنی حقیر سی زندگی کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے بعد جب رات کے پچھلے پہر اپنے بستر پر پہنچتا ہوں اور جب سارا ماحول سوجاتا ہے تو میں جاگنے لگتا ہوں، تب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری کائنات قدرت کی مزاح نگاری کا ایک شاہکار ہے اور اس شاہکار کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ مجھے یہ وہم سا ہوتا ہے کہ یہ آنسو میری آنکھوں سے نہیں بہہ رہے ہیں بلکہ یہ آنسو اس انسان کی آنکھوں سے میری آنکھوں میں بس یوں ہی چلے آئے ہیں جس نے شاید آج سے دو ہزار سال پہلے یا اس سے بھی کئی ہزار سال پہلے اپنی آنکھوں سے بہایا ہوگا۔ میں انہیں اپنی تاریخ اور ثقافت کی امانت سمجھ کر اپنی آنکھوں میں چھپا لیتا ہوں . . . . .

فراقؔ کا ایک مصرعہ ہے ۔

ہاں دھیان سے سننا، یہ صدی بول رہی ہے

ایک بڑا ادیب آہستہ آہستہ عالم وجود میں آرہا ہے ۔ کیا باقی کے چھوٹے اس کا سواگت کر پائیں گے جب وہ اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ سب کے سامنے رُونما ہوگا ؟ اقتباس میں نے اوپر پیش کر دیا ہے ۔ ایک بڑی آواز اپنی رُوپ ریکھا صاف طور پر جھلکا رہی ہے ۔ کیا یہ آواز واقعی ایک دن بڑی بن پائے گی ؟ کیونکہ بقول مرزا یگانہ ؎ بلند ہو تو کھلے تجھ پر زور پستی کا

بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

اس کے لئے کچھ تو مجتبیٰ کو جواب دینا ہے کہ وہ کس حد تک آواز کی دیوی کی تپسیا کر رہے ہیں اور کچھ خود ہمیں کہ کہاں تک مجتبیٰ کو خود سے بھی بلند ہونے کے لئے اپنی رفاقتوں کے جکڑتے ہوئے ذات کے بندھنوں سے رہا کر دیں گے!

۲۷

رضا نقوی واہی

ہوٹنگ

ہوں غیر جو زد میں تو مزے دار ہے ہوٹنگ
اپنے پہ پڑے جب تو دل آزار ہے ہوٹنگ

مومن کی نہ غالب کی طرفدار ہے ہوٹنگ
اربابِ ستم پیشہ کا ہتھیار ہے ہوٹنگ

ناکامیٔ ترسیلِ سخن پر سرِ محفل
پبلک کے پروٹسٹ کا اظہار ہے ہوٹنگ

ہوجاتا ہے شاعر کا سرِ بزم سوپڑ آف
بجلی کا وہ لہراتا ہوا تار ہے ہوٹنگ

بیچارے کی آواز میں لگ جاتا ہے پھندا
پروانۂ پسپائیٔ فنکار ہے ہوٹنگ

مطلع پہ جو ٹوٹا تو گرا بر سرِ مقطع!
بیداد کی وہ شاخِ لچکدار ہے ہوٹنگ

شاعر کی سیہ بختی سے ہے اس کا کنکشن
تفریح کا اک آلۂ خودکار ہے ہوٹنگ

چلتی ہے ادب میں جو حریفانہ سیاست
اس کا عملاً بزم میں اظہار ہے ہوٹنگ

ہر کارکن و منتظمِ بزم کے سر پر
جلاد کی اٹھتی ہوئی تلوار ہے ہوٹنگ

بے منتِ مقراض بناتے ہیں حجامت
ہڑبونگ پسندوں کا وہ اوزار ہے ہوٹنگ

واقف نہیں خود اپنی زباں سے جو نئی نسل
محفل میں اس احساس کا اظہار ہے ہوٹنگ

جب ذہن سے ٹکرا کے گزر جائے سخن، تو
کم مایگیٔ فہم کا اقرار ہے ہوٹنگ

اُردو کا جنازہ ہے، نہ کیوں دھوم سے نکلے
موقع ہے غنیمت تو دھواں دھار ہے ہوٹنگ

ٹوٹل ریوولیوشن کا ریہرسل اسے سمجھو
عکاسِ گل افشانیٔ گفتار ہے ہوٹنگ

فکر تونسوی

آؤ ہم بھی سیر کریں...

گذشتہ تین چار ہفتے جب متواتر یہ خبریں آتی رہیں کہ:

۱۔ فلاں صاحب صبح کی سیر کر رہے تھے کہ اُن کے سینے میں خنجر اُتار دیا گیا۔

۲۔ فلاں خاتون صبح سویرے آکسیجن کھانے نکلیں تو انھیں پستول کی گولی کھلا دی گئی۔

۳۔ ایک ریٹائرڈ آدمی سیر کر رہے تھے کہ چھرا کھا کر ہسپتال جا پہنچے۔

۴۔ ایک امیر و کبیر عورت منہ اندھیرے کی مٹر گشت میں قتل کر دی گئیں۔ مجرم بھاگ گئے۔ صرف محترمہ کا کُتّا بطور چشم دید گواہ پیچھے رہ گیا۔

ہاں، جب ایسی بظاہر لرزہ خیز خبریں برابر آنے لگیں تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ قتل و غارت پر نہیں بلکہ اس بات پر کہ میں بھی کتنا غیر ضروری انسان ہوں کہ صبح کی سیر پر میرے نصیب میں کوئی قاتل ہی نہیں اور وہ بھی ایسے زمانے میں جب ہر صبح قاتلوں کی گنگا بہہ رہی ہو۔

اطلاعاً عرض ہے کہ کچھ عرصے سے مجھے بھی صبح کی سیر سے عشق ہو گیا ہے۔ جب بیوی سے انسان کے تعلقات رسمی رہ جائیں (غیر رسمی تعلقات کی تو اب صرف یادیں اور آہیں باقی رہ گئی ہیں) تو خواہ مخواہ صبح کی سیر کی طرف قدم اُٹھ جاتے ہیں اور یا پھر لوگ خدا سے تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔

میرے بھی صبح کی سیر کے ایجنڈے میں دو پروگرام ہوتے ہیں۔ آکسیجن کھانا اور خدا کی تلاش کرنا۔

یہ چھرے اور پستول کھانے کا پروگرام تو بعد شامل کر لیا گیا۔ جیسے کانسٹی ٹیوشن کو بہتر ڈھنگ سے چلانے کے لئے ترمیم و اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح صبح کے پروگرام کو بھی زیادہ بہتر اور موثر بنانے کے لئے چھرے اور پستول کا اضافہ کر دیا گیا۔

اور ویسے بھی پروگرام کی پہلی آئٹم قریب قریب بے نتیجہ ثابت ہوتی تھی۔ آکسیجن وہ ٹرک کھا جاتے تھے جو

روڑی، اینٹوں اور سمنٹ سے بھرے ہوئے صبح سویرے چلا کرتے تھے اور میری آنکھوں میں آکسیجن کی بجائے دھول جھونک جاتے ہیں۔

اور دوسری آئیٹم ـــــ خدا کی تلاش ؛ وہ مجھے صبح کی سیر پر کبھی دکھائی نہیں دیا اور دکھائی بھی کیسے دیتا جبکہ اُس نے اپنے بارے میں زور وشور سے یہ پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ ؎

ہر جگہ موجود ہے، لیکن نظــر آتا نہیں

چنانچہ اہلِ ذوق نے اس میں تیسری آئیٹم کا اضافہ کردیا۔ چھرا اور پستول ـــــ یہ ایٹم زیادہ جاندار اور موثر ثابت ہوئی۔ تین ہفتوں میں چار کیس ہو گئے مجھے افسوس اس بات پر ہوا کہ میں بھی صبح کی سیر کرتا ہوں مگر ایک پستول باز بھی میری طرف نگاہِ التفات سے نہیں دیکھا اور میں سرد آہ بھر کر یہ شعر پڑھتا رہ جاتا ہوں کہ ؎

گُل پھینکے ہے، اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھــر بھی

آخر تنگ آمد، بجنگ آمد۔ پرسوں منہ اندھیرے میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج خدا کی بجائے قاتل کی تلاش کرونگا احتیاطاً کچھ زادِ راہ بھی اپنے ساتھ لے لیا کیونکہ سُنا تھا پستول داں حضرات نقدی، سونا، گھڑی وغیرہ چھین لینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ اُن کے پروگرام میں قتل شامل نہیں ہوتا مگر پستول وہ اس لئے چلا دیتے ہیں کہ سیر کا دلدادہ چیخ مارنے کے قابل نہ رہے ـــــ ڈکیت حضرات شور وغل کے قائل نہیں ہوتے۔ شور وغل سے خاموشی بھلی، موت بھلی

چنانچہ میں نے کلائی پر ایک گھڑی باندھ لی جو اُدھار پینے پر اپنے ایک گھڑی ساز دوست بھگوان داس اسیر سے مانگ لی تھی کہ مرنے سے پہلے اِسے ضرور واپس کردوں گا۔ کچھ ریزگاری کچھ پھٹے پرانے گلے سڑے نوٹ (ایسے نوٹ بے ضرر ہوتے ہیں) جیب میں ڈال لئے۔ بیوی کے گلے سے سوتے میں طلائی ہار اُتار لیا۔ ڈاکو لے جائے یا خاوند۔ اُس کی بلا سے ہار تو اُتار ہی لیا جائے گا۔ نظام حیدرآباد کے ہیرے ہوں یا بیوی کا ہار۔ ڈاکو دونوں کے لئے سڑکوں پر بولیاں دیتے پھرتے ہیں

جب میں سر پہ کفن باندھ کر صبح کی سیر کے لئے گھر سے باہر نکلا تو اس بات پر بڑا اطمینان تھا کہ قاتل اگر مجھے مل بھی گیا تو مجھے گھائل وغیرہ کر کے بھاگ جائے گا اور پولیس اُسے گرفتار نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ ملزم اور خدا دونوں کی تلاش ناممکن ہو گئی ہے۔ پولیس زیادہ سے زیادہ اپنا سراغ رساں کُتا چھوڑ دے گی۔ جرم وسزا کی ساری فلاسفی اب سراغ رساں کُتے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے اور چونکہ کتا پولیس کا تربیت یافتہ ہے اس لئے وہ بھی ملزم کی نشاندہی نہیں کرسکے گا۔ پولیس کی برسوں سے قائم شدہ روایت کو کیوں توڑے گا۔

اور پھر یوں ہوگا کہ مجرم بھی بھاگ جائے گا اور کتا بھی بھاگ جائے گا۔

اور میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ پولیس میرے قاتل کو پکڑے اور ایسے جرم میں پکڑے جو اس بیوروکریسی میں ناروا نہیں رہا۔

گھر سے آدھے فرلانگ پر اینٹوں سے بھرا ایک ٹرک مِلا۔ حالانکہ اس کا ڈرائیور بھی میرا مال ومتاع چھین سکتا تھا اور مجھے ٹرک کے پہیئے تلے کچل کر بھاگ سکتا تھا لیکن وہ بدستور میری آنکھوں میں دھول جھونک کر گذر گیا۔ وہ صرف میری آکسیجن کو قتل کر سکتا تھا، مجھے نہیں۔

ایک بڑھیا ملی۔ وہ ایک نالی کے پاس بیٹھی کھانس رہی تھی ـــــ فضول ہے۔ اس محترمہ سے کوئی توقع نہیں کی

جاسکتی ۔ یہ تو پہلے ہی بے زر اور بے ضرر ہوچکی ہے ۔

اس کے بعد میں اُس سڑک کے سرے پر پہنچا جو گذشتہ دو مہینوں سے کھودی جارہی تھی ۔ اُس پر کولتار نہیں ڈالی گئی تھی کیونکہ میونسپل کارپوریشن کا دعویٰ تھا کہ اس کے اسٹور میں کولتار کی قلت ہے لہٰذا یہ سڑک ابھی دو مہینے مزید انتظار کرے ۔ یہ اور بات ہے کہ ایک جن سنگھی کو بلا کر سڑک (جو بنی نہیں تھی) کا اُدگھاٹن کرادیا گیا تھا ۔

سڑک کے سرے پر ایک آدمی کھڑا تھا ۔ میں نے پوچھا "کیا آپ ڈاکو ہیں اور کسی صبح کی سیر کرنے والے کا انتظار کر رہے ہیں ؟"

اس نے ڈنڈا کھڑکھڑایا "نہیں میں پولیس کا سپاہی ہوں ۔ یہاں میری ڈیوٹی لگادی گئی ہے ۔ اس علاقے میں صبح کی سیر پر ڈاکہ زنی کے کیس زیادہ ہونے لگے ہیں نا ۔"

میں نے پوچھا "آپ کی ڈیوٹی میں کیا شامل ہے ؟ مجرم کو پکڑنا یا مجرم کو بھگا دینا ۔"

شاید اس کے وقار کو ٹھیس پہونچی بولا "آپ ایسے سوال کیوں کررہے ہیں ؟"

"مجھے بھی ایسے ڈاکو کی تلاش ہے جو مجھ پر ہاتھ صاف کرجائے ۔"

اور یہ کہہ کر میں اُسکا ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہولیا ۔ سپاہی میرے پیچھے بھاگا ۔ ادھر مت جائیے ۔ اس سڑک پر زیادہ حادثے ہورہے ہیں ۔

مگر میں زور سے بھاگا ۔ سپاہی اور بھی زور سے بھاگا ۔ چند منٹ کے تعاقب کے بعد مجھے گرفتار کرلیا گیا اور پھر میں حوالات میں بیٹھا صبح کے اخباروں میں یہ خبر پڑھ رہا تھا ۔

پولیس نے آج صبح ایک غنڈے کو رنگے ہاتھوں پکڑا جو صبح کی سیر پر جانے والے ایک شخص سے طلائی ہار ، گھڑی اور کچھ نقدی چھین کر بھاگے جارہا تھا ۔

خبر پڑھ کر بے ساختہ میرے لب پر غالب کا یہ شعر آگیا ؎

لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ظہیر ابن قدسی
(مالیگاؤں)

جشنِ شاعر

جشنِ ادیب کی مجھے جس دم خبر ملی
سینے میں جو دبی تھی وہ خواہش ابھر گئی

میں اپنی خواہشات پہ لہرا کے رہ گیا
شاگردوں پہ نظر ذرا دوڑا کے رہ گیا

اصلاح مجھ سے غزلوں کی جو لے کے جاتے ہیں
اور وہ جو ایک چاٹے پہ اُلّو بناتے ہیں

آیا نہیں کسی کو بھی ایسا کوئی خیال
میرے بھی جشن کے لئے پھیلائے کوئی جال

شاگرد میرے شہر میں ہیں گرچہ بے شمار
لیکن نہیں ہے کوئی بھی ہمدرد و جاں نثار

ہیں سب کے سب مشاعرے اور داد میں مگن
کچھ دھوم سے چلاتے ہیں شعرا کی انجمن

گو میں ہوں اپنے شہر کا اک شاعرِ عظیم
لیکن ہوں ایسا تنہا کہ جیسے کوئی یتیم

ہاں کچھ عزیز، جشن پہ تیار ہو گئے
مجھ کو سمجھ کے مرغ چڑی مار ہو گئے

کہنے لگے کہ جشن منائیں گے آپ کا
نوٹوں کے ساتھ غم بھی اٹھائیں گے آپ کا

بس اتنی بات ہے کہ ذرا خرچ کیجئے
تھوڑے سے روپیوں کا ابھی منہ نہ دیکھئے

لائیں گے سیمنار میں چوٹی کے کچھ ادیب،
"پڑھ دیں گے تھوڑا تھوڑا سا" وہ آپ پر غریب

چندہ کریں گے شہر میں نو دس ہزار کا
پیش آپ کو کریں گے مگر صرف شکریہ

یوں جشن کا منافع ہم آپس میں بانٹ لیں
شہرت ملے گی آپ کو اور روپیہ ہمیں

سن کر یہ بات جشن کی خواہش ہی مر گئی
اُردو کے شاعروں کی یہی ہے ٹریجڈی

ہے اختتام جشن کا، دل دوز سانحہ
احباب خود ہی پڑھتے ہیں شاعر پہ فاتحہ

نرگس سہسوانی

سن رسیدہ ڈاکٹر

ہیں ہمارے شہر میں اک سن رسیدہ ڈاکٹر
دیکھ کر روگی کو کہتے ہیں اسے ہے کینسر

طبِ یونانی کی ملکہ، ایلوپیتھک میں گرو
ایم بی بی ایس کہلانے لگے ہیں چار سو

یہ بھی دعویٰ ہے کہ اتنی قابلیّت ہے انھیں
شاعری کے ہر مرض سے واقفیّت ہے انھیں

وہ تو یہ کہیئے کہ قسمت ان کو لے آئی یہاں
ورنہ ان کی قابلیّت اور مفلس سہسواں

چار چھ دن جس نے لگ کر کر لیا اُن کا علاج
پھر سِول سرجن بھی کہدے گا کہ ہے یہ لاعلاج

ایک دن اُن کے مطب میں میں بھی پہنچا الغرض
میں نے پوچھا واقعی مجھ کو بھی ہے کوئی مرض؟

نبض میری دیکھ کر یوں مسکرائے زیرِ لب
صاف ظاہر ہے تمہارے "لو پریشر" کا سبب

پھر یہ بولے آپ تیرہ سال سے بیمار ہیں
پیٹ کی ہر آنت میں اٹکے ہوئے اشعار ہیں

جس کے باعث رات دن رہتی ہے سینے پہ جلن
ڈر ہے لے ڈوبے نہ اک دن آپ کو مشقِ سخن

وزن ہے کچھ کا غلط اور کچھ کی ہے صورت قبیح
مصرعۂ اولیٰ میں سستی مصرعۂ ثانی فصیح

کچھ ہیں خارج بحر سے اور کچھ کی ہے بھونڈی ردیف
کچھ کی تو اِملا غلط ہے کچھ کے ہیں مضموں ضعیف

فارسی اشعار میں بھی ہے اضافت کی کمی!!
کچھ میں ایطائے خفی ہے کچھ میں ایطائے جلی

کچھ توارد ہو گئے ہیں اور کچھ چوری کے ہیں
کچھ ہیں اصغر گونڈوی کے اور کچھ فانی کے ہیں

شاعری کرتے ہو تو گانے کا فن بھی سیکھ لو
ورنہ بہتر ہے کہ یہ ذوقِ سخن ہی چھوڑ دو

صبح اُٹھ کر روغنِ بادام بھی سر پہ مَلو
آمدِ اشعار میں جس سے گرانی دور ہو

حلق میں پھر ڈال کر اُنگلی غرارے بھی کرو
تاکہ کچھ آواز میں پیدا لچک ہو، لوچ ہو

پھر کرو ہندی کی کویتاؤں میں بھی کچھ اُنتی
تب ملے گی عقل کے کیٹاڑوں کو کچھ بلی

ہوگا اس پہ کار ہندی اور اُردو کا مِلن
اس پہ نربھر ہے ہماری سنستھاؤں کا چلن

الغرض میں اپنے سر کو پیٹ کر چلنے لگا
تاکہ مجھ کو مل سکے کچھ سوچنے کا حوصلہ

شہباز صدیقی
امروہہ

چیرہ ہے دزدِ تیرہ رواں، جاگتے رہو   تیرہ ہے راہِ امن واماں، جاگتے رہو
خیرہ ہے چشمِ ہر نگراں، جاگتے رہو   اے خفتگانِ خواب گراں، جاگتے رہو
خطرے میں ہیں مکان و دکاں جاگتے رہو

ہنگامِ شب جو رہتے تھے پبلک کے پاسباں   سوتے ہیں اب دکانوں کے تختوں پہ وہ جواں
چوروں سے چاہتے ہو، بچانا اگر مکاں   تدبیر اس کی یہ ہے کہ بن کر وظیفہ خواں
جب تک نہ ہو سحر کی اذاں جاگتے رہو

وہ دن گئے کہ رہتے تھے مصروفِ خوابِ ناز   واجب ہے آج نام سے بھی اس کے احتراز
ہوجاؤ فرشِ نرم سے مخمل کے بے نیاز   کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹو شبِ دراز
سونے کا بھاؤ اب ہے گراں جاگتے رہو

چکلوں کا جب سے مٹ گیا بازار سے نشاں   اڈوں کا جلوہ زار ہوا کوبکو عیاں
اغوا کی روز سنتا ہوں اک تازہ داستاں   دیووں کی زد سے اب نہیں محفوظ دیویاں
بابائے دخترانِ جواں جاگتے رہو

طوطے کی طرح ایک دن آنکھیں بدل نہ جائے   تلووں سے اپنے قلب تمہارا مسل نہ جائے
زوجہ اس پہ اہلِ زر کا کسی روز چل نہ جائے   سونے کے پیچھے رات میں گھر سے نکل نہ جائے
بیوی عزیز ہے تو میاں جاگتے رہو

شعلہ بجاں ہیں آتشِ فاقہ سے شیخ وشاب   جورِ شکم سے روح پہ دوزخ کا ہے عذاب
قلت رہی اناج کی یوں ہی جو اے جناب   یہ خوف ہے کہ جان نہ دیدے کہیں جواب
ارزاں ہے موت، غلّہ گراں جاگتے رہو

بھاشن جو حق میں اردو کے دیتے ہیں ایں وآں   باتیں سنو تم ان کی لگا کر نہ گوشِ جاں
ان گولیوں میں نشّہ ہے افیون کا نہاں   انشا غفیل تم کو نہ کر دیں یہ ناگہاں
خفتہ نصیب اہلِ زباں جاگتے رہو

خاموش کیوں چمن میں ہو مرغانِ نغمہ خواں   کیوں سِل گئی ہے دہشتِ صیاد سے زباں
برقِ بلا کو سونپ کے اب شاخِ آشیاں   رکھ دو ہلا کے نعروں سے بنیادِ گلستاں
شہباز کی صدا ہے کہ ہاں جاگتے رہو

سید نصرت
آرکیٹکٹ

امر سنگیت دھارا...

ہندستانی فلموں میں موسیقی اور گانوں کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی یہ تو ہم نہیں جانتے البتہ اگلے وقتوں کے گائیکوں کے یل سہگل۔ امیر بائی کرناٹکی، ملکہ پکھراج اور... کے سی ڈے سے لے کر آج کل کے پلے بیک سنگروں' لتا' رفیع، کشور، اور یسوداس کے گانے سن سن کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ فلمی گانوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ فلموں کی تیاری کی تاریخ ہے اور بہت ممکن ہے کہ اگلے وقتوں کی خاموش فلموں میں بھی گانوں اور موسیقی کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہوگا۔

ہماری فلموں میں ایک عدد کہانی، ایک اچھا ہیرو' ایک اچھی ہیروئین اور ایک بُرے آدمی کے علاوہ دس بارہ گانوں کا ہونا یوں ضروری ہے جیسے کسی دولہے کی بارات کے ساتھ باجا — اور اگر کسی فلم میں گانے بالکل ہی نہ ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی دولہا میاں باجے کے بغیر اپنے گلے میں صرف ایک پھول کا ہار ڈالے شرعی شادی رچانے جا رہے ہوں۔

فلمی گانوں کی تخلیق میں یوں تو اُردو ہندی کے بہت سارے نامور شعراء نے اپنے اپنے فن کے جوہر دکھلائے ہیں اور فلموں میں ایسے ایسے معرکتہ الآرا گیت لکھے ہیں کہ ان پہ بلا شبہ اُردو ہندی شاعری فخر کر سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ 'ٹاٹ میں مخمل کا پیوند' کے مصداق کچھ گیت اور گانے ایسے بھی ہیں جن کو سُن کر سر دُھننے کے بجائے سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

فلم میں ہر موقعہ و محل اور ہر کیریکٹر (کردار) کے لئے گانوں کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کو دو چار پیار بھرے گیت اور ایک آدھ جدائی کا گیت گانا نہ صرف لازمی اور ضروری ہوتا ہے بلکہ گلنے کے ساتھ ساتھ رقص کرنا، ہاتھ پاؤں ہلانا، لڑنا جھگڑنا، اچھلنا کودنا، قلانچیں بھرنا اور گرمی دسردی یا برسات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے برف پر پھسلنا یا بارش میں بھیگنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہیرو ہیروئن کے علاوہ دوسرے اور کیریکٹروں میں ہیروئن کا چھوٹا بھائی (سڑکوں پر بھیک مانگنے کے سین میں) ہیرو یا ہیروئن کا اوباش بھائی (نائٹ کلبوں میں رقص کرتے ہوئے، ویلن (ویمپ کے ساتھ گلچھرے اڑاتے) ہیرو کا باپ (اپنے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے) ہیروئن کی ماں، ہیروئن کو سلاتے ہوئے (جبکہ وہ بچی ہوتی ہے) یا میلے، بازار محلے میں کوئی فقیر، سادھو یا سنت گا نا گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت ساری سچویشنس ہیں جہاں گیت کا ہونا ضروری گردانا جاتا ہے۔

اب آیئے ان شہرۂ آفاق گیتوں یا گانوں کا ایک سرسری جائزہ لیں۔ ایک موقعہ پر ہیروئن کو رجھانے اور اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے سلسلے میں ہیرو صاحب فرمارہے ہیں۔

ع　باہوش و حواس میں دیوانہ یہ آج وصیت کرتا ہوں
یہ دل یہ جاں ملیں تم کو، میں تم سے محبت کرتا ہوں

یا پھر یہ سچویشن دیکھئے کہ ہیرو صاحب ہیروئن سے گھگھیائے ہوئے انداز میں سوال کر رہے ہیں۔

میں اس معصوم سے چہرے کو اگر چھولوں تو کیا ہوگا۔

جس کے جواب میں کائیاں ہیروئن فرمارہی ہیں۔

ارے پاگل وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔

اسی طرح ایک باغ کا منظر ہے جس میں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ہیروئن خواہ مخواہ بھیگ رہی ہے۔ اس دوران فلم کے ہیرو صاحب جو ضرورت سے زیادہ شریف آدمی ہیں اور ہیروئن کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے ہیں دور کھڑے اس منظر سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ اب ہیروئن اپنے بھیگے بدن کو جومیٹری کے پورے زاویوں سے بل دے دے کر یوں گاتی ہے۔

ارے ہائے ہائے یہ مجبوری　　یہ موسم اور یہ دوری
مجھے پل پل ہے تڑپائے　　تیری دو ٹکیا کی نوکری
رے میرا لاکھوں کا ساون جائے ۔۔۔۔ ڈِنگ لالہ ڈِنگ لالہ

ایک دوسرے منظر میں ہیرو اور ہیروئن جب خوب جی بھر کر پیار کر چکے ہیں تو پیار کی مستی سے اُن پر نشہ سا چڑھنے لگتا ہے اور ان میں یہ تجسس جاگنے لگتا ہے کہ ان کے اطراف جو قدرت نے بے شمار رنگینیاں بکھیر رکھی ہیں وہ کس طرح وجود میں آئیں۔ چنانچہ ہیرو پوچھتا ہے ـــــ "باغ میں پھول کس نے اُگائے ہیں"

جواب میں ہیروئن ناز وادا کی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ساتھ کسر نفسی سے جواب دیتی ہے

"میں نے تو نہیں ـ میں نے تو نہیں"

پھر سوال و جواب کا یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا ہے کہ دو اور دو چار کس نے بنائے ہیں، پھول کون، تارے

کس نے بنائے ہیں وغیرہ وغیرہ اور اس کے جواب میں ہیرو یا ہیروئن برابر نفی میں جواب دیتے جاتے ہیں۔
میں نے تو نہیں، میں نے تو نہیں"

بعض اوقات پیار و محبت کے اظہار کے لئے موزوں شاعری کے علاوہ عجیب و غریب آوازوں کا سہارا بھی لیا جاتا ہے اور یہ آوازیں گانوں میں بالکل اسی طرح کا رول ادا کرتی ہیں جیسے الیکشن کے زمانے میں کسی لیڈر کی سبز باغ دکھلانے والی تقریر کے دوران تالیاں۔
ملاحظہ فرمایئے:

ہیرو صاحب نغمہ سرا ہیں — "ٹوڑو ٹو ڑوڑو رُوڑو رُو.رُو تیرا میرا پیار شروع"
اور ایک دوسرے سین میں ہیرو کہتا ہے "ہم کو ہونے لگا ہے پیار تم سے پریتماں پریتماں"
جواب میں ہیروئن فرماتی ہیں — "دل کو آنے لگا قرار تم سے اوئی اماں اوئی اماں

ہیرو ہیروئن اگر نئی نسل کے نمائندے ہوئے تو ان کے گانوں میں جدید شاعری کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی ہے جیسے یہ گانا گاپوچی گاپوچی گم گم کشی کی کشی کی کم کم

یا یہ گیت لارا لپّا لارا لپّا لائی رے خدا
اڈی ڈپّا اڈی ڈپّا آئی رے خدا

ان گانوں کے بعد ذرا اس گانے میں ابہام ملاحظہ فرمایئے کہ
لڑکا: ایک چیز مانگتے ہیں ہم تم سے پہلی بار
لڑکی: پہلے چیز کا نام بتاؤ
لڑکا: دیکھو ہم پر شک نہ لاؤ اس کے بعد لڑکا گانے کے دوران کہتا ہے
رات کو کھڑکی کھول کے رکھنا وغیرہ وغیرہ

بعض اوقات گانے کے دوران ہیرو ہیروئن ایک دوسرے کو درس و تدریس بھی دیتے جاتے ہیں تاکہ ان دونوں کے ساتھ ساتھ سینما ہال میں بیٹھے ہوئے بچے بھی یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ تعلیم اور عاشقی دراصل ایک ہی نظام کے دو نام ہیں۔ درس و تدریس کے اسباق عموماً انگریزی، اردو یا ہندی زبانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جیسے یہ گانا

سی اے ٹی کیاٹ۔ کیاٹ معنی بلّی
آر اے ٹی ریاٹ۔ ریاٹ معنی چوہا

اور یہ گانا:

الف زبر آ۔ الف زیر اے الف پیش او
الف سے ابجد ابجد ہوز حطی ابن الوقت وغیرہ

اکثر گانوں میں ہیرو ہیروئن ایسی ایسی زبردست خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں کہ تو یہ ہی بھلی مثلاً یہ

شہرۂ آفاق گانا ——— ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے
اب شاعر صاحب کو یہ کون سمجھائے کہ اگر واقعی یوں ہو جائے تو کمرہ کھولنے کے لئے یا تو دروازہ توڑنا پڑے گا یا ہیروئن کے غیرت مند ماں باپ کو کمرے کے سامنے مارے شرم کے خودکشی کرنی پڑے گی۔ اسی طرح ایک دوسری فلم میں ہیرو جب خوب جی بھر کر ہیروئن سے پیار کر چکا تو اس سے اجازت لے رہا ہے کہ جانم اب مجھے جانے دو کافی دیر ہو چکی ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے دیر سے آفس جانے پر دفتر والے مجھے ملازمت سے جواب دیدیں اس کے جواب میں ہیروئن اپنی ڈبڈباتی آنکھوں سے ہیرو کی طرف حسرت سے دیکھتی ہے اور کچھ دیر بعد اچانک ہی ناچتے ہوئے یوں گویا ہوتی ہے۔

نہ جا راجہ دل توڑ کے مجھے اکیلا چھوڑ کے
نوکری سے چھٹی لے لے چھٹی نہ ملے تو نوکری چھوڑ دے

اب سے تیس ۳۰ سال قبل کی فلموں میں ہیرو یا ہیروئن کی آواز میں آواز ملا کر بعض پالتو جانور بھی گانا گایا کرتے تھے لیکن آج کل صورتِ حال ذرا مختلف ہے اور آج کل کے بعض گانوں میں مختلف جانوروں کی آوازوں سے کما حقہ فائدہ اٹھایا جانے لگا ہے۔

مثلاً ایک موقعہ پر ہیرو صاحب فرماتے ہیں دھڑکنے لگتا ہے میرا دل تیرے نام سے
ایسا لگتا ہے کہ بس ہم گئے کام سے
دھ ... دھ ... دھ

اس دھ ... دھ ... دھ کی تکرار کے بعد پس منظر میں کتے کی آواز آتی ہے بھوں ... بھوں ... بھوں
اسی طرح ایک فلم میں رات کے وقت ہیروئن جب چوری چھپے اپنے محبوب سے ملاقات کر لیتی ہے تو صبح صبح گھر کے طوطے کو مخاطب کر کے یہ گانا گاتی ہے۔

آج میں جوان ہو گئی ہوں گُل سے گلستان ہو گئی ہوں
یہ دن یہ سال یہ مہینہ ہو مٹھو میاں بھولے گا مجھ کو کبھی نا

ہیروئن کے اس اعلان پر مٹھو میاں فرماتے ہیں ٹرٹر ... ٹیں ٹیں ... جیسے کہہ رہے ہوں' گل سے گلستان بننے پر اس قدر نہ اکڑ لے نادان ابھی کچھ دیر بعد فلم کا ویلن آئے گا اور تیرے گلستاں کو خاردار جنگل میں تبدیل کر دے گا۔

اکثر شعراء حضرات سیدھی سادھی اور عام بول چال کی زبان میں فلمی گانوں کی تخلیق کرتے ہیں اور ان کی شاعری عموماً فریقین کے درمیان عام بات چیت، ایک دوسرے کا حال چال پوچھنے، موسم کی کیفیت بیان کرنے اور دنیا کی بے ثباتی کا گلہ کرنے کے انداز میں ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حال کیسا ہے جناب کا کیا خیال ہے آپ کا
ہم تو پھسل گئے او او او یوں ہی پھسل گئے آ آ آ

(موسم برسات کا ہوگا)

(۲) اچھا تو ہم چلتے ہیں
پھر کب ملو گے ؟
آدھی رات کو ! نہیں جمعرات کو
کہاں ؟ جہاں کوئی آتا جاتا نہیں (اس سے مراد جزائر انڈومان و نکوبار یا پھر روس کا ریگستان ہوگا)

اب ان گانوں میں زبان و بیان کی بے ساختگی اور سادگی ملاحظہ کیجئے۔

(۱) بیٹھ جاؤ بیٹھ گئی
اٹھ جاؤ اٹھ گئی
اب جو پوچھوں بتلاؤگی بتلاؤں گی

(۲) آنے والے کو آنا ہوگا جانے والے کو جانا ہوگا
کھانے والے کو کھانا ہوگا مرنے والے کو مرنا ہوگا (سلسلہ دراز ہے)

محبت کرنے والے اکثر حضرات اللہ یا بھگوان کو گواہ بنا کر ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتے ہیں اور محبت کے عہد و پیمان کرتے ہیں جس کی لاتعداد مثالیں ہماری شاعری میں موجود ہیں مگر فلمی شاعری میں اللہ یا بھگوان کو قسموں کے ساتھ ساتھ دوسری اور مناسب و نامناسب جگہوں پر بھی بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہیروئن ہیرو کا دل چرا کر لے بھاگی ہے اور ہیرو صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں۔

جھومتا موسم مست مہینہ یا اللہ یا اللہ دل لے گئی

اسی طرح ایک اور فلم میں ہیروئن کی چاندی کی انگوٹھی کو ہیرو نے اُچک لیا ہے اور ہیروئن اپنی تمام سہیلیوں کے ساتھ ناچ ناچ کر اور اللہ سے مخاطب ہوکر سارے جہاں سے یوں کہہ رہی ہے۔

اللہ اللہ اللہ وہ لے گیا چاندی کا چھلّہ
میں بھی اس کا دل لے لوں گی کل کو انشاءاللہ (استغفراللہ)

ایک اور منظر میں ہیرو صاحب عشق میں رات بھر تارے گننے کے بعد سخت متوحش ہیں اور یوں اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں۔ کہ ابتدائے عشق میں ہم ساری رات جاگے
اللہ جانے کیا ہوگا آگے ، مولا جانے کیا ہوگا آگے

اسی طرح ایک دوسرے منظر میں فلم کی ہیروئن بن سنور کر نخرے دکھاتی ہوتی ہیرو کے سامنے سے بظاہر انجان بنی چلی جارہی ہے اور ہیرو صاحب یوں گویا ہیں۔

نکلا نہ کرو تم سج دھج کر بھگوان کی نیت ٹھیک نہیں

نعوذ باللہ گویا بھگوان نہ ہوا فلم کا ویلن ہوا جو ہیروئن کے بننے سنورنے پر اُسے بھگا کر لے جائے گا۔
بعض شعراء حضرات نے اپنی فلمی شاعری سے اس بات کو ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ

زبانِ اُردو ایک ایسی ہمہ گیر زبان ہے جس میں دنیا کی دوسری اور زبانوں کے الفاظ کو ضم کر لینے اور سمو لینے کا سلیقہ بدرجۂ اتم موجود ہے چنانچہ ایسے شعرائے کرام نے کئی معرکتہ الآرا گیت اس ضمن میں فلموں کو دیئے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے (۱) راما یا وستا وَیّا راما یا وَستا وَیّا
میں نے دل تجھ کو دیا، میں نے دل تجھ کو دیا

(۲) اینکماں اینکماں ایکڑ پوتا وا ایکڑ ایکڑ را
او بد کماں بدکماں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ

(۳) سنڈے کو پیار ہوا منڈے کو اقرار
ون ڈے نہ جانے اب کیا ہو۔

(۴) ناگ دیوتا جاگ دیوتا ۔ ۔ ۔ جھینگا لالہ جھینگا لالہ
یا یہ گانا ڈم ڈم ڈیگا ڈیگا ۔ ۔ موسم بھیگا بھیگا ۔ ۔ ۔

جنوبی ہند میں رہنے والے شعراء نے دکنی زبان کو بھی نہیں بخشا اور دکنی لوگ گیتوں یا کھیلوں کے بولوں سے فائدہ اٹھا کر کئی گیت لکھ مارے مثلاً آم چھو تام چھو کالا ے بنگالہ چھو
اور بھئی بھتور بھئی بھتور اب جُبئیں گے کتنی دور

اس کے بعد شاید کوئی شاعر یوں ایک فلمی گانا لکھے : ایڑی کی تیڑی بوتی کے پان
بجڑو ممانی جوگی کے کان

طوفان اور ایکسپریس قسم کے ہیرو حضرات جو سرکس کے قلا بازوں کی طرح اُچھلتے کودتے ہیروئن سے عشق فرماتے ہیں۔ وہ گانے بھی کچھ اسی انداز میں گاتے ہیں۔ جیسے ایک سین میں ہیروئن، ہیرو کے خیال کو اپنے من میں بسائے باغ سے گذر رہی ہے کہ اچانک دھڑام سے ہیرو کسی درخت سے چھلانگ لگاتا ہے۔ ہیروئن ڈر کر درخت سے چمٹ جاتی ہے جس پہ ہیرو ایسی دھماکو سچویشن پر لکھا ہوا گانا گاتا ہے

دیکھا نہ کیسا ڈرا دیا ۔ ڈرا دیا
جیا دھڑکا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی طرح ایک اور فلم میں ہیرو، ہیروئن کو ویلن کے ظلم وستم سے نجات دلاتا ہے اور اپنی روایتی بہادری کا مظاہرہ کرتا ہوا ہنٹر سے ویلن کی پٹائی کرتا ہے اور دوران پٹائی یہ گانا گاتا ہے۔

جیسے کو تیسا ملا کیسا مزہ آیا ۔ ۔ ۔ (ہنٹر کی آواز)
ماروں کہ چھوڑ دوں تیری ٹانگ توڑ دوں
بتا تیری مرضی ہے کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب آخر میں وہ شہرہ آفاق گیت بھی سن لیجئے جو ہماری دانست میں اُردو شاعری میں فکر و فن کے اعتبار سے حرفِ آخر کہلائے جانے کا مستحق ہے اور وہ گیت ہے

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
پیار کیا کوئی چوری نہیں کی
چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا ۔ ۔ ۔ ۔

شمع زیدی
(بمبئی)

○

سرجن ساہتیہ سمیتی نے سیہور (مدھیہ پردیش) میں حضرت علی عباس امید کی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں عوامی استقبال کا انعقاد کیا۔ اس موقع پر ایک آل انڈیا کوی سمیلن اور مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ رات کے دو بجے اناؤنسر نے نرمل ورما کو شعرخوانی کی دعوت دی وہ مائیک پر پہنچے۔ اسی درمیان، کچھ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ اناؤنسر نے نرمل جی سے نظم شروع کرنے کی درخواست کی تو وہ بولے "لوگ چلے جائیں تو سناؤں۔" یہ سنتے ہی امید صاحب نے کہا —

"اس کی فکر نہ کیجئے، آپ شروع تو ہوں، لوگ خود ہی چلے جائیں گے۔"

○

ان دنوں امید صاحب آدرش ڈگری کالج بھوپال کے پرنسپل تھے۔ ایک پری چہرہ معاشیات میں ایم۔ اے کر رہی تھی۔ امتحان سے ایک دن قبل وہ امید صاحب کے پاس پہنچی اور بولی:

"سر، کل سے میرے پیپر ہیں۔ آپ میری مدد کیجئے، میں پاس ہونے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

امید صاحب نے خوش ہو کر کہا "حقیقتاً مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ پاس ہونے کے لئے تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔ یہ بتاؤ آج کی رات تم کیا کر رہی ہو —؟"

وہ فوراً بولی "کچھ بھی نہیں سر، میں بالکل فری ہوں"

اس پر امید صاحب نے آہستہ سے کہا "یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ اب میری صلاح ہے کہ آج کی رات تم میرے بتائے ہوئے سوالات دل لگا کر پڑھ لو۔" اور لڑکی کا چہرہ اتر گیا۔

○

ایک جشن میں رجن سریواستو نے امید صاحب سے شکایت کی "کہاں رہتے ہیں ان دنوں آپ، ملاقات ہی نہیں ہوتی۔" انھوں نے بتایا "بھائی بیوی آج کل یہیں ہے اس لئے کچھ پابندی لگ گئی ہے۔" سریواستو صاحب نے بگڑ کر کہا "کیا مطلب، کیا ہماری بیوی نہیں ہے جو ہم گھومتے پھرتے رہتے ہیں؟" جب اور کئی دوستوں نے بھی رجن صاحب کی موافقت کی تو امید صاحب نے صفائی دی "دوستو! میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کا اکلوتا ہوں۔"

اسماعیل ظریفؔ

... کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

جو ہرجائی ہے یارو آپ اس کو دلربا سمجھے
بگڑ کر جب کہا شاعر نے تم شاعر کو کیا سمجھے

جو ہے جانِ غزل گھر میں اُسے کیوں بے وفا سمجھے
کوئی چیخا کہ ہم تو آپ کو خالی گھڑا سمجھے

گلی میں روک کر ناقد کو شاعر نے کہا ٹھیرو
سمجھنے والے ایسے بھی ادب میں ہو گئے پیدا

یہاں سمجھاؤ میری شاعری کو آپ کیا سمجھے
رباعی کو غزل سمجھے غزل کو مرثیا سمجھے

جواں شاعر نئے انداز سے جب ڈائس پر آیا
جو اپنے باپ کے بھائی کو خاطر میں نہیں لاتا

غلط فہمی میں اس کو دور سے ہم شاعرا سمجھے
کہاں ہے وہ بھتیجہ جو پڑوسی کو چچا سمجھے

وہ کھڑکی سامنے والی ہوتی ہے بند جس دن سے
مذاقاً جیب میں جس کو اٹھا کر رکھ لیا تھا کل

جو صدمے بھائی پر گذرے ہیں اس کو آپ کیا سمجھے
وہ مولانا کا چشمہ تھا جسے ہم آپ کا سمجھے

ردیف و قافیہ کا اس غزل میں یوں گلا گھونٹا
بُلایا جا رہا ہوں آجکل ہر ایک محفل میں

جہاں سمجھا کا پہلو تھا وہاں بھی کہہ گیا سمجھے
مجھے یہ لوگ بے کاری کا شاید داروغا سمجھے

ظریفؔ اِس بے سر و پا بے تُکی بکواس کو تیری
"کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے"

O

قطعہ

اُڑا رہے ہیں ڈنر پر ڈنر جو مولانا
اب اس کو روز کی پکنک نہیں تو کیا کہیئے
سلام خود نہیں کرتے سلام لیتے ہیں
اب اس کو ون وے ٹرافک نہیں تو کیا کہیئے

ڈاکٹر حبیب ضیاء

بچّہ باہر گیا ہے

اگر آپ کسی کے گھر جائیں اور صدر خاندان کے ہاتھ میں چارمینار سگریٹ کی بجائے 'ڈن ہل' کی قیمتی ڈبیا دیکھیں تو کھٹ سے یقین کر لیجئے کہ اُس گھر کا کم از کم ایک بچہ ضرور باہر گیا ہے۔ یہ تو صرف پہلی علامت ہے۔ دوسری اور بہت سی علامتیں ہیں جن سے اس متعدی مرض کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ ایک جگہ ہم کافی عرصہ کے بعد ملاقات کے لئے گئے۔ دروازہ کھولنے جو لڑکی آئی وہ زمانۂ گذشتہ میں چھینٹ کا کُرتا اور سفید پاجامہ پہنا کرتی تھی اب جو دیکھا تو چمک والی میکسی زیب تن کئے' ہاتھ میں "ٹو اِن ون" لئے کھڑی تھی۔ رونا لیلیٰ کی ٹیپ کی ہوئی غزل کا کباڑہ کرتے ہوئے خود بھی بے سُری آواز میں ساتھ گا رہی تھی۔ آیئے کہتے ہوئے اس نے ہمیں اندر لے جا کر صاف ستھرے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پانچ منٹ بعد اُس نے ایک رنگین تصویر تھما دی جو اتفاق سے ہماری ہی تھی اور اُسی وقت لی گئی تھی۔ وضاحت طلب کرنے پر جواب ملا "جی! یہ آٹومیٹک کیمرے کا کمال ہے میرے چھوٹے بھائی دہران سے لائے ہیں۔" ابھی ہم آٹومیٹک کیمرے کے کمالات کو دیکھ کر دنگ ہونے والے ہی تھے کہ صاحبِ خانہ میلے بلاؤز پہ اُجلی جاپانی سلک کی ساڑی پہنے برآمد ہوئیں۔ ہم سے چند منٹ گفتگو کر کے وہ بچّی کو اشاراتی زبان میں کچھ کہتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی لڑکی دوسرے کمرے میں گئی اور اِٹھلاتی ہوئی گرائنڈر لے کر واپس ہوئی۔ ہم نے پوچھا "اِسے کیا کہتے ہیں؟" لڑکی تعجب سے بولی "آپ کو اِتنا بھی نہیں معلوم! یہ مسالہ پیسنے کی مشین ہے۔ بڑے بھائی دوبئی سے لائے ہیں۔" اتنے میں ماں نے پکارا' بیٹی! گرائنڈر جلدی سے لے کر آؤ مجھے دو الائچیاں پیسنی

ہیں ۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے دو الائچیاں گرائنڈر کے منہ میں ڈالیں اور ایک منٹ میں الائچی کا پاؤڈر ہتھیلی میں ڈال کر ہمیں دکھانے لگیں " دیکھئے ! کس قدر باریک ہوگیا ہے ۔" الائچی کا پاؤڈر واقعی بہت باریک تھا ..... ہمیں نظر ہی نہ آیا ۔ !

ایک جگہ ہمیں کھانے پر مدعو کیا گیا تھا ۔ جاتے ہی حسب عادت ہم باورچی خانے میں گھس گئے ۔ سِل بٹّے کے پاس خلاف توقع گھر کی چکی کے بجائے "میڈ اِن جاپان" کی نقلی مہر لگی ہے ۔ وولی کی ساڑی پہنے ایک کافر ادا ماما مسالہ پیس رہی تھی ۔ قریب جاکر دیکھا تو مسالہ ایک دم سفید تھا ۔ ہم نے مالکن کو رائے دی کہ پھلی ٹھیک سے بھُونی نہیں گئی ۔ بگھارے بیگن کا سالن لذیذ نہ ہوگا ۔ اس پر وہ پہلے تو صرف مسکرائیں ، پھر ہماری بیٹھ پر پوری طاقت سے مارتے ہوئے بڑی سائز کا قہقہہ لگایا ، پان کی پیک ہمارے کپڑوں پر اُچھالی ۔ جب اطمینان ہوگیا کہ کافی چھینٹے پڑچکے ہیں تب قہقہہ کو بریک لگاکر انھوں نے حقارت سے ہماری طرف دیکھا اور بولیں ۔

نادان ! یہ پھلی نہیں بادام ہیں بادام ! میرے مجھلے لڑکے نے جدّہ سے بھیجے ہیں ۔" بگھارے بیگن میں بادام سُن کر ہم ان کی قسمت پر رشک اور اپنی آنکھوں میں اشک لاکر سوچنے لگے ۔

اللہ اللہ ! کیا انتر ہے ' ہمارے اور ان کے معیارِ زندگی میں یہاں بیگن کو بادام کا پرہیز ہونے کے باوجود اس کے پیٹ میں پسے ہوئے بادام ٹھونس ٹھونس کر بھرے جارہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ڈاکٹر کی سختی سے تاکید پر بھی بادام کھانے کی بجائے بادام کا "ایسنس" سونگھا کرتے ہیں ۔

غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں آپ نے کبھی نہ کبھی سُنا ہوگا کہ جب کوئی دیارِ غیر میں مرجاتا ہے تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے ۔ ہم بھی اس اصطلاح سے واقف ہیں لیکن "غائبانہ ختنہ کے پھول" یا ــــ "غائبانہ چھلّہ چھٹّی" کا دعوت نامہ دیکھ کر ہم انگشت بہ دندان رہ گئے ۔ 'ریاض' میں نواسے کی ختنہ ہوئی ، حیدرآباد میں ارمان نکال لے گئے ۔ نانا پھول پہنے حریرہ روٹی کھاتے ہوئے روپیے سمیٹ رہے تھے ۔

کویت میں کسی کے گھر لڑکا ہوا ، حیدرآباد میں دھوم سے کھیر چٹائی کی گئی ۔ دادا لیٹے کھیر چاٹ رہے تھے ۔

باہر جاکر آنے والوں کو دکاندار بھی خوب پہچاننے لگے ہیں ۔ وہ ان کی دولت کی افراط اور خرچ کرنے کے ڈھنگ کو اچھی طرح پرکھنے کے عادی ہوگئے ہیں ۔ لاڈ بازار کے کڑے والے اور گلزار حوض کے جوہری ان لوگوں کو عربی سلام کرنا اور خوش آمدید کہنا سیکھ گئے ہیں ۔ ایک دن ہم کڑے لینے کے لئے لاڈ بازار کی ایک دکان پر گئے ۔ باہر سے آنے والا ایک خاندان چارسو روپے کے کڑے آٹھ سو روپیوں میں خرید کر واپس ہورہا تھا ۔ جگمگاتے خوبصورت کڑے شوکیس کے اوپر ہی رکھے ہوئے تھے ۔ جوں ہی ہم نے کڑے دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ۔ دکاندار نے جھپٹ کر کڑے اٹھا لئے اور شوکیس میں رکھ کر دوسرے معمولی کڑے ہمارے سامنے رکھ دیئے ۔ ہم نے کہا کہ ہمیں اصلی نگوں کے کڑے چاہیئں ۔ اس پر وہ حقارت سے بولا ۔ " آپ نے اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں !" ہم نے کہا " ابھی دیکھ کر تو نکلے ہیں ۔ اتنے میں کڑے والے کی چچی یعنی چوڑیاں پہنانے والی نے ہمیں دھکا دے کر سیڑھیوں سے نیچے اتارتے ہوئے کہا جاؤ اماں ! آگے جاؤ یہ بیوپار کا وقت ہے ۔"

بچے باہر جا رہے ہیں، شیخوں کی طرح خوب کما رہے ہیں، خود کھا رہے ہیں، ماں باپ، بہن بھائیوں کا سہارا بن گئے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ بعض بچے شیخوں کی سی عادتوں میں مبتلا ہو گئے ہیں یعنی وہی . . .
. . ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا، دو سے زیادہ بچے پیدا کرنا، ٹی وی کی طرح بیوی ذرا پرانی ہوتی اُسے پھینک دینا اور پھر خوب سے خوب تر مال کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔ ایک صاحب خیر سے ایک بیوی کے شوہر اور ڈھائی بچوں کے باپ ہیں۔ اچانک انھوں نے اعلان کر دیا۔ "میں دو شادیاں اور کروں گا"۔ اس اعلان پر ابتداء میں تو ماں باپ بیوی بچے، اڑوس پڑوس سبھی ہنسنے لگے کہ بیوی پر جان چھڑکنے والا اور بچوں سے والہانہ پیار کرنے والا یہ آدمی مذاق کر رہا ہے۔ لیکن جب اس مرض کے پورے آثار نمودار ہو گئے تو کسی نے اُن سے پوچھا "یہ ادھیڑ عمر میں آپ کو دوسری شادی کی کیا سوجھی ؟" جواب ملا "میرے پاس روپیہ بہت ہو گیا ہے۔ ایک بیوی اور اس کے گنتی کے چند بچے اس دولت کو خرچ نہیں کر سکتے"۔ چالیس سال کی عمر میں انھوں نے دوسری مرتبہ سہرا باندھا، دھوم سے دوسری شادی رچائی۔ پُرانی بیوی کو حیدرآباد میں چھوڑ کر نئی نویلی دلہن کو لے کر سعودی عرب چلے گئے۔ چند دن اس نے فرماں برداری کا ثبوت دیا۔ پھر وہاں کے شیخوں کی دولت پر جو نظر پڑی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ خود ساختہ شیخ اس کی نظروں سے اُتر گئے۔ سابقہ بیوی بچوں کی مکمل "ہائے ہائے" لگ گئی۔ ایک ماہ بعد اطلاع آئی کہ نئی بیوی رسّی تڑوا کر جو بھاگی تو پھر اصلی شیخ کے پاس جا کر ہی اس نے دم لیا۔

لیکن ایسے واقعات شاذ و نادر ہی سُننے میں آئے ہیں۔ عموماً بے شمار خاندان آسودہ حال ہو گئے ہیں۔ ماں باپ، بیوی بچوں اور سکون کے سوا انھیں سب کچھ میسّر ہے۔ کالی کلوٹی، نکٹی چپٹی، بہت موٹی، بہت دُبلی، غرض کہ ہر قسم کی بہنوں کے لئے منہ مانگے دام بہنوئی خریدنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ جن گھروں میں بکرعید میں مرغی بھی نہیں کٹتی تھی وہاں اب نام بہ نام بشمول نوکرانی چھ بکرے کاٹے جا رہے ہیں۔ لوگ یوں بھی کاج کرنے کا حیلہ ڈھونڈتے لگے ہیں۔ چھوٹے موٹے کاج بھی ہوں تو گھر کی آہک پاشی کی جاتی ہے۔ گھر کے باہر لگے رنگ برنگی برقی قمقمے جھلمل کرتے ہیں گویا سڑک پر سے گزرنے والوں کو اپنی زبان میں چلّا چلّا کر کہہ رہے ہیں۔

"دیکھو تو یہ شان! اس گھر کا ایک بچہ باہر گیا ہے"۔

باہر کے یہ کرشمے دیکھ کر ہمارے بھی منہ میں پانی بھر آیا۔ ہمارا تیرہ سالہ لڑکا جو ابھی تک ہمارے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے اس سے ہم نے کہا "بیٹا! تو کب باہر جائے گا، لاکھوں کمائے گا، ماں بابا کے لئے بلڈنگ ٹھوکے گا . . . ." ہماری بات کاٹتے ہوئے اس نے بگڑے لہجے میں کہا "زیادہ گڑبڑ نہیں کرنا ماں۔ باہر بھجوانے کا نام لئے تو آج سے اسکول جانا بند، لائیے نوالہ"۔۔۔ نوالہ پورا کر کے وہ خدا حافظ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ہمارے کچھ رشتہ دار سعودی عرب سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا "آپ کا بچہ کہاں ہے؟" ہم نے سر اونچا کر کے فخریہ انداز میں کہا۔۔۔

"بچہ باہر گیا ہے . . . . گلی ڈنڈا کھیلنے!!"

●●

پُرانی سیکل

رشید عبدالسمیع جلیلؔ

لڑکپن، بڑھاپا ہو یا نوجوانی — متاعِ دل و جاں ہے سیکل پُرانی
وہی لطف جانے کرے جو سواری — کہ ہے چال اس کی ہمیشہ زنانی
یہ مانندِ منکوحۂ اوّلیں ہے — کیا جس نے ہم سے مگر عقدِ ثانی
اسے ہم نے پایا ہے ترکہ بہ ترکہ — یہی باپ دادا نے چھوڑی نشانی
کبھی اس پہ نکلی تھی چاچا کی بارات — بھتیجے کی ہو جائے بسم اللہ خوانی
نہ سیٹ اس کی باقی نہ ٹیوب اس کا سالم — نہ چھرّے سلامت مگر ہے روانی
اگر تھامیں ہینڈل اکڑ جائے گی وہ — رکھیں پا بہ پینڈل تو یاد آئے نانی
یہ گلیوں میں نخرے دکھاتی ہے اپنے — ٹھمکتی ہے یوں جیسے الھڑ جوانی
چند آوارگانِ ادب کے لئے بھی — غزل سے زیادہ ہے اس میں روانی
معاشی سکون اس سے حاصل ہے ہم کو — نہ پیٹرول کا غم نہ خوفِ گرانی
یہ کم خرچ و بالا نشیں ہے کہ جس کی — ہمارے فرشتوں نے کی قدر دانی
یہ کیچڑ میں پانی میں برسوں پلی ہے — ادا چلبلی ہے وفا خاندانی
حسینوں کا رکشا ہو جب اس کے آگے — سُناتی ہے پہیتوں سے آکاش وانی
کبھی اس پہ بجتی ہے عاشق کی گھنٹی — رقیبوں کو راس آئے شیر رسانی
اگر اس پہ لیلیٰ نے محمل سجایا — تو مجنوں کو مل جائے حکم روانی
یہ چلتی ہے تھم تھم کے منزل بہ منزل — پلاتی ہوئی سات رستوں کا پانی
یہ پھرتی ہے پولس کی آنکھوں میں دن بھر — کہ اب اس سے ہوتی نہیں آمدانی
پہنچ کر یہ سسرال ہوتی ہے پنکچر — جہاں منتظر آفتِ ناگہانی
پڑوسی کے بھی کام آتی ہے اکثر — نہ پوچھو ہے کیا اس میں رازِ نہانی
سرِ راہ جنّت کی دے کر بشارت — کسی دن نہ کر دے ہمیں آنجہانی

کٹی عمر ساری سفر پھر بھی جاری
ہے سیکل کی ہم پہ بڑی مہربانی

ارشد علیخاں

خدا یہ سلسلہ دراز کرے

خلیل الزماں لودھی کی یہ مزمن عادت ہے کہ وہ جب کبھی اس دنیائے رنگ و بو میں کسی عجوبہ روزگار کو دیکھ لیتے ہیں تو اس کو دوسروں کے سر منڈھنے نکل جاتے ہیں۔ اس طرح تجربہ دوسروں سے کرواتے ہیں اور خود تجربہ کار کہلاتے ہیں۔ تجربہ کامیاب ہو جائے تو سر دھنتے ہیں اور پورے شہر میں ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں اور اگر ناکامی سے دوچار ہو جائیں تو فوری آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ دو سال پہلے دوران نمائش انھوں نے پروفیسر جیلانی کو ورغلا یا کر وہ روٹیاں تیار کرنے والی آٹو میٹک مشین خرید لیں۔ اس پر پروفیسر موصوف کی سائنٹیفک کھوپڑی ناچ کر رہ گئی۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔

"کمال ہو گیا یار، کیا واقعی ایسی کوئی مشین نکل آئی ہے؟"

اس پر لودھی نے ان کی بے حد شفاف اور پودی کھوپڑی کی قوی قسم کھا کر فرمایا۔

"اگر یقین نہ ہو تو نمائش ساتھ ہی چلو اور اپنی ننگی آنکھوں (NAKED EYE) سے اس کی کرامت دیکھ لو!"

پروفیسر نے جوش میں آکر انھیں رقم دے دی اور کہا "جب تم دیکھ چکے ہو تو کافی ہے۔ آج ہی خرید لاؤ!"

چنانچہ وہ اس آٹومیٹک مشین کو خرید کر ہمارے گھر آدھمکے۔ سب سے پہلے دنیا کی سائینسی ترقی پر کوئی پندرہ منٹ لیکچر جھاڑے، اس کے بعد آشفتہ بیانی کو بریک لگا کر پیکٹ دو دیہ ناس چڑھائی۔ ہم نے جھجکتے ہوئے پوچھا

"اس کاغذ کے پلندے میں کیا دھرا ہے؟" وہ سینہ پھلا کر بولے "اس صدی کی نایاب ایجاد! بلکہ سرچشمۂ آبِ حیات سمجھ یعنی انسان جس کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور گھنٹوں پاپڑ بیلتا ہے!"

"تو کیا پاپڑ بیلنے کی کوئی مشین ہے؟"

"یار تم بھی الہامی آدمی ہو! اگر چاہو تو جھوٹی پیغمبری کا دعویٰ بہ آسانی کرسکتے ہو!"

اس کے بعد انھوں نے کاغذ کھول کر دو آہنی وضع کے پاٹوں کا نظارہ کرایا۔ پھر سنجیدگی سے بولے۔

"اس سے روٹیاں تیار کی جاتی ہیں .... دراصل پروفیسر جیلانی نے آرڈر دے کر تیار کروایا ہے؟

"ترکیب استعمال فرمایئے"

"بہت سیدھا سادھا طریقہ ہے ... آٹے کا گولہ بنا کر ان دو پاٹوں کے درمیان رکھ کر ہینڈل دبا دو۔ بس ایک سکنڈ میں روٹی تیار .... کہو کیسی آٹومیٹک مشین لے آیا ہوں!

"ٹھیک ہے! ویسے کمپنی والے یقیناً ہیوی ویٹ کی خدمات مفت سربراہ کرتے ہوں گے؟

"وہ کیوں؟"

"جہاں تک پروفیسر کا تعلق ہے وہ اگر معہ اپنی فیملی کے اس کے ہینڈل پر لٹک بھی جائیں تو ایک روٹی بھی تیار نہیں ہوسکتی!"

"لیکن سوچو اس طرح رفتہ رفتہ ان کی صحت کتنی بہتر ہو جائے گی۔

"ہاں، امکان اس بات کا ہے کہ وہ نمائش میں ہیوی ویٹ کا مقابلہ ضرور جیت جائیں گے۔"!

ہیوی ویٹ چیمپین تو پروفیسر نہ بن سکے البتہ لودھی نے جب اس وزنی مشین کو انھیں اس طرح پیش کیا جس طرح عموماً کوئی وزیر کتاب کی رسم اجرا کے وقت، مصنف کو اس کی کتاب عطا کرتا ہے۔ پروفیسر بھی غلطی سے اسے کتاب ہی سمجھ بیٹھے اور جب ہاتھوں میں لیا ایک بیس پچیس کیلو کا وزن جو آپڑا تو ہاتھ کانپ کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ لودھی مدد کرتے، مشین ہاتھوں سے چھوٹ کر ان کے پاؤں پر گری اور فوری تین عدد انگلیوں سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے —— ان کی دلخراش چیخ کے بلند ہوتے ہی گھر کے اعلیٰ و ادنیٰ لوگوں نے ان پر جھپٹا مارا اصلاح و اضافہ

اس حادثے کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد ہمیں ٹیلیفون موصول ہوا دوسری طرف پروفیسر ہی تھے کہنے لگے۔

"بھائی لودھی کا کچھ اتا پتہ ہے؟ ہم نے کہا" اس آٹومیٹک مشین کے بعد سے ندارد ہیں۔!

"ارے تو کیا تمہیں بھی دلا دیا ہے؟ پروفیسر کی تحیر آمیز چیخ سنائی دی۔

"جی نہیں! صرف آپ ہی کی مشین کی زیارت کرائی تھی!

"عجیب واہیات .....

"جی ہاں بالکل واہیات آدمی واقع ہوئے ہیں! ہم نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں مشین کے تعلق سے کہہ رہا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ ڈاکٹروں نے لاتعداد پنسلین اور ٹیٹارنیوں (Pencilian and Tetarnions) کے انجکشن لگا کر میرا پاؤں بچا لیا .... خیر یہ بتاؤ کہ کیا تم کسی ماہر جراح کو جانتے ہو؟

"کیوں اب کیا بات ہوئی؟"

"یہی دراصل اس مشین کی نحوست چھپی ہوئی ہے۔ کل میں نے خانساماں کو ہدایت دی تھی کہ اس آٹو میٹک سے روٹیاں تیار کرے، بس پہلی روٹی ہی میں لوٹ لگانے لگا، غالباً اس کا کندھا اتر گیا!"

"کسی سرجن کو کیوں نہیں بتا دیتے؟"

"یہی تو مشکل ہے،" کہتا ہے "میں جرّاح کے ہاتھوں شہادت کی موت مروں گا۔ لیکن آج کل کے اناڑی ڈاکٹروں کے ہاتھوں حرام موت ہرگز نہیں مروں گا!

ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہم کسی نامور جرّاح کو نہیں جانتے ہیں تو انھوں نے انگریزی میں لودھی کو بالکل جدید ترین گالیوں سے نوازا پھر روئے سخن مشین کے موجد کی طرف موڑ دیا۔ لہٰذا ہم نے سلسلہ خود ہی منقطع کر لیا۔۔۔

اس کے بعد لودھی گذشتہ نمائش میں آلو اور پیاز کے ٹکڑے کرنے والی مشین کے اسٹال پر اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہمراہ ہم اور اشفاق حسین تھے۔

کہنے لگے "خدا کی قسم اس مشین کو دیکھ کر انگریزوں کا مقولہ بے اختیار یاد آ رہا ہے۔ وہی یعنی "وقت کی قدر کرو، وقت ہی دولت ہے"!

ہم لاپرواہی برتتے تو انھیں اور جوش آ گیا۔ اشفاق حسین کا کندھا پکڑ کر بولے۔

"یار نادر موقع ہے، میں سمجھتا ہوں اس صدی کی یہ سب سے اہم ایجاد ہے!"

اشفاق حسین کی بے بسی پر ترس کھا کر ہم نے کہا۔ "لیکن اس مشین پر سکّے مارنے کی طاقت کون لائے؟

ہشت! کم ہمتی کی بات مت کرو! ارے یہ تو اچھی خاصی ورزشی شے ہے!

"پھر تو خود خرید لو!" ہم نے گولی داغی، جھکائی دے کر بچ گئے اور سینہ تان کر بولے۔

بندہ نہ آلو کھاتا ہے نہ پیاز!"

"گھر والے تو کھاتے ہوں گے؟

"پتہ نہیں ویسے میں دوسروں کی ٹوہ میں رہنا پسند نہیں کرتا!

اس بحث سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اشفاق حسین نے ایک آلہ خرید لیا۔ اس پر لودھی خوشی سے اچھل پڑے۔ کہنے لگے۔ "تم دیکھو گے، نوکر چاکر کتنے خوش ہو جائیں گے اور کام میں کیسے چاق و چوبند ہو جائیں گے، اسی لیے تو کہتا ہوں کہ پہلے سہولتیں مہیا کرو۔ فارن میں یہی ہوتا ہے اور پہلے کے آقا وَں کو دیکھو ان کے زرخرید غلام جان دے دیتے تھے۔ لیکن وفاداری کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ بہر حال تم دیکھو گے کہ اس آلہ سے آلو اور پیاز کٹ کر لتھ پتھ ہو جائیں گے کہ سکنڈوں میں گل کر مسکہ ہو جائیں گے۔۔۔

ہم نے بریک لگایا "آغا میر کی داڑھی سب سیکھی سکھائی"

بس آگ ہی تو لگ گئی، کف اگلتے ہوئے بولے "غالباً عمر کا بیشتر حصہ عورتوں ہی میں گزرا ہے جب ہی تو عورتوں کے محاورے بکتے ہو!

"اچھا مردوں کے سنو" ہم نے جلتی آگ پر تیل چھڑکا "آنکھ نہ دیدہ کاڑھے کشیدہ"

"یہ تو اس سے بھی بدتر ہے" بے تحاشہ ناس ناک میں جھونکتے چلے گئے۔ بہرحال یہ سرد جنگ وا یسی کمک چلتی رہی۔ البتہ دوسرے دن لودھی حیران و پریشان آفس وارد ہوئے اور یہ وحشت ناک خبر سنائی کہ اشفاق صاحب کی اہلیہ شفاخانے میں داخل کردی گئی ہیں۔ ہم نے وجہ دریافت کی تو فرمایا "بس لاپرواہی برتی گئی یعنی ہوا یہ کہ اس آلے کا اوپری بتی یکایک نکل گیا اور نوک دار حصہ تو ایک جھٹکے سے نکل کر ان کی اہلیہ کی ہتھیلی میں گھس گیا۔

ہم نے کہا: "واقعی یہ تو غیر معمولی حادثہ ہے!"

نیچے گردن جھکا کر بولے۔ "ہاں' میں دواخانے ہی سے آرہا ہوں' ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر کچھ اور دیر ہو جاتی تو پورا ہاتھ ہی کاٹ دینا پڑتا کیونکہ زہر چڑھنا شروع ہو گیا تھا ——

پروفیسر نے اپنا پاؤں بچایا اور اشفاق حسین کی اہلیہ نے اپنا ہاتھ' لہٰذا ہم چوکنے ہو گئے کہ پتہ نہیں لودھی کب اپنا داؤ چلا کر ہمارا سر قلم کرا دیں۔ لاکھ احتیاط کے باوجود آخر کار ہم ان کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس ہی گئے —— ایک دن گھر تشریف لائے اور کمرے پر تھر آلود نگاہیں گاڑھ کر جلے کٹے لہجے میں بولے۔

"نفاست پسندی تو تم کو چھو کر نہیں گئی —— ارے بھئی اگر کوئی غیر ملک کا فرد یہاں آجائے تو یقیناً اسے باورچی خانہ سمجھ بیٹھے گا!

ہم نے ان کے باطن کے ترکش کا جائزہ لینا چاہا! تو کچھ پلے نہ پڑا۔ لہٰذا نڈھال ہو کر بولے "آخر کیوں؟"

"آخر کیوں؟ وہ ہماری نقل اتار کر لپکے۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ جناب کی بینائی بھی خدا حافظ کہہ گئی ہے"!

"آکھاین برخاست کرو اور برسر مطلب آجاؤ!" ہم نے کہا۔

"ان دیواروں پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ دھوئیں نے کس طرح آغشتہ کر دیا ہے' میں کہتا ہوں آخر یہ اسٹون ایج (stone age) والا چولھا کب تک استعمال کرو گے۔

"تمہارا مطلب لکڑیاں ......" بات کاٹ کر بولے "اور نہیں تو کیا؟"

"لیکن ہم تو بتیوں والا گیاس کا چولھا ......

پھر بات کاٹ کر بولے۔" وہ بھی ایک دم ناقص ہے تیل پینا اس کی ہابی ہے، ارے یار' ہوش کے ناخن لو' نئے قسم کا چولھا نکل آیا ہے' تھوڑا سا پمپ کر لو اور ہوا پر ہر چیز پکا لو' نہ دھواں نہ بتی کا جھنجھٹ بلکہ بعض اوقات تیل ڈالنے کی بھی نوبت نہیں آتی —— ان آنکھوں نے اس چولھے کی وجہ سے ایسے ایسے گھر گرتے دیکھے ہیں جنھیں آخری وقت تک ماچس کی تیلی کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی تھی۔"

"کیوں؟ کیا چولھا پھٹ پڑا تھا؟ ہم نے معصومیت سے پوچھا۔"؟

"تمھیں سمجھانے کے لیے پورے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھی کافی نہیں ہوں گے۔" وہ جلال میں آگئے۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ نہ دھواں پھیلے گا اور نہ دیوان خانہ اتنا سیاہ ہو گا!" ناس چڑھا کر ہم پر پھر چڑھ دوڑے۔ "کبھی انگریزوں کا

یا ورچی خانہ اور قبرستان دیکھا ہے ؟

"خاکسار نہ کبھی خانساماں رہا ہے اور نہ ہی گورکن !"

"زہر کی تاثیر جاننے کے لیے اسے کھانا ضروری نہیں ہوتا"

"لیکن محض لفظ زہر کہنے سے آدمی مر بھی تو نہیں سکتا۔"

"خیر! وہ بات اڑا کر بولے" مجھے انگریزوں کا صاف اور پرسکون قبرستان بہت پسند آتا ہے۔ صرف تابوت سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ جنازے بھی بھلے لگتے ۔اس کے بعد موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے ۔" اگر تم کہو تو کل چولھا لادوں !"

ابھی ہم کسی فیصلے پر پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ وہ دیوانخانہ چھوڑ گئے ـــــ دوسرے دن چولھے کے ہمراہ آئے ہم نے اس کی طرف بغور دیکھا اور پوچھا" کیا دبابے کا نیا ماڈل لے آئے ہو؟"

" غیر ترقی یافتہ ممالک کے باشندے واقعی اس کو یہی سمجھیں گے ..... وہ اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بولے ۔ "یہ رہا دو سال کی گیارنٹی کا کارڈ، اور یہ دیکھو ادھر جو گول گول تنے بائیں طرف ہے یہ دراصل چولھے کی ٹانکی ہے۔ اس پر لگے ہوئے بٹن کو ہٹا کر تیل بھرا جا سکتا ہے ۔ اور اس ٹانکی سے لگے ہوئے پمپ کو حسب دستور دس پندرہ مرتبہ مارنا کافی ہو جاتا ہے ۔ اچھا اب دائیں طرف دیکھو، ادھر نیچے ایک پھرکی نظر آرہی ہے نا، یہی دراصل شعلے کو کنٹرول کرنے والی ہستی ہے ۔ اور ہاں یہ رہی پن اس کی مدد سے تم کچرا وغیرہ صاف کر سکتے ہو ۔ میرا مطلب جہاں سے شعلہ نکلتا ہے وہاں موہوم سا سوراخ ہوتا ہے۔ تمہیں کیا سمجھاؤں اس معاملے میں تم خود کافی تجربہ کار ہو ... اچھا کل حاضر ہوں گا ۔کیونکہ مجھے پروفیسر جیلانی کے ہاں ایک ضروری کام سے جانا ہے"ـــــ ان کے جانے کے بعد ہم نے شکور کو بلا کر دری آموختہ یعنی ترکیب استعمال دُہرا دی ۔ وہ دیر تک وحشت میں مبتلا رہا۔ پھر طوعاً وکرہاً اسے اٹھا کر چلتا بنا ۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد ہمیں زنانہ میں طلب کیا گیا ۔ وہاں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ چولھے کو جلانے کے لیے کئی بزرگ حضرات مع نوکروں کے مصروف ہیں اہلیہ محترمہ نے فرمایا" اب تک آدھی درجن جیبی فائٹ ڈبیاں خالی ہو چکی ہیں لیکن یہ بدستور ٹھنڈا پڑا ہے !"

" غالباً پمپ برابر نہیں کیا ہوگا! ہم نے سٹ پٹا کر کہا ۔

" کیا کہا برخوردار ! " چچا محترم چولھے سے پہلے بھڑکے" جناب تقریباً گیارہ سو مرتبہ پمپ مار چکا ہوں۔ اگر اتنی محنت جوانی میں کر لیا ہوتا تو یلا نیا لغراً حجو پہلوان محلہ چھوڑ کر کب کا بھاگا ہوتا !"

ارے ہاں ... ہمیں یاد آیا ... ارے ہاں اس کو پن بھی کرنا پڑتا ہے ؟ " ہم نے چچا کا غصّہ کافور کرنے کی خاطر کہا ـــــ

" کہاں کرنا پڑتا ہے ؟ "

" جہاں سے شعلہ نکلتا ہے ! " ہم بغلیں بجا کر بولے ۔

" اور شعلہ کہاں سے نکلتا ہے ؟ " خالو جان اپنی داڑھی پر غضب کا ہاتھ پھیرتے ہوئے پھنکارے ۔

اب تو ہماری کھوپڑی ناچ کر رہ گئی۔ لہٰذا ہم نے چولہا سنبھالا اور پن سے بائیلر کے اطراف اندھا دھند کچوکے لگانے لگے۔ جب تھک گئے تو دیا سلائی سے آگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی بجلی سی کوندی اور گز گز بھر شعلے لپکے۔ سب نے مل کر کورس نما دہشت ناک چیخ ماری اور شگوفہ نے ہمیں گھسیٹ کر دور پھینک دیا ورنہ ان جہنمی شعلوں نے ہمارا کام تمام کر دیا ہوتا ـــــ افراد خاندان نے بڑی مستعدی سے بالٹیوں سے پانی لا لا کر چولہے پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ حفظ ما تقدم کے تحت ہم پر بھی دو چار بالٹیاں ڈال دی گئیں۔ خالو صاحب نے احتیاط کے طور پر نہ صرف فائر بریگیڈ والوں کو رنگ کیا بلکہ سرکاری دوا خانہ والوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں ایمبولینس کا آرڈر دے دیا ـــــ چنانچہ پندرہ منٹ بعد جب ہم کے حواس بحال ہوئے تو فائر بریگیڈ اور ایمبولنس کے عملہ نے آکر از سر نو حواس باختہ کر دیا ـــــ دوسری طرف اہلیان محلہ الگ ٹوٹ پڑے۔ رشتہ داروں اور دوست احباب کا تانتا لگ گیا سوائے خلیل الزماں نودمی کے ـــــ

OO

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعہ کلام	۳/۵۰
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
مزاج شریف	رشید قریشی	"	۳/۵۰
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/-
فقط	" "	"	۶/-
دریدہ	مسیح انجم	"	۶/-
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-
چوٹی کے غلام	" "	مضامین	۷/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	۸/-
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/-
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-
بہر حال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/-
شوشے	ارشد علی خاں	"	۸/-

قطعہ

ایک چالیس سال کی دوشیزۂ شب رنگ سے
کر رہا ہوں عقد میں امریکہ جانے کے لیئے
پیاری بیگم تجھ کو بھیجوں گا میں ڈالر ماہوار
اُس کو جھوٹے کارڈ امریکہ بلانے کے لیے

رُباعی

محفل کا پتہ جو پا گیا ہے بوگس
مدعو تو نہ تھا پر آ گیا ہے بوگس
ڈائس پہ بھی آ گیا ہے جرأت کر کے
بکواس سنا کے چھا گیا ہے بوگس

ادھی غزل

(غالب اور بوگس مشترکہ)

"تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں" اور ہم اس کو گدھا باندھتے ہیں
وہ اڑاتے ہیں اگر بے پر کی "ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں"
اسد اللہ بھی ہوا باندھیں گے "ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں"
دل کھلا رکھتے ہیں پیاروں کے لیے "مست کب بند قبا باندھتے ہیں"

بند نالی میں سمجھتا ہوں اُسے لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
پاؤں جلنے پہ بھی نخرے نہ گئے آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
بوگس اب ان کو چکھائیں گے مزہ
"ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں"

بوگس حیدرآبادی

غزل

دنیا کے سو رنگاں ہیں اُن کا بھی رنگ نرالا
صورت چھپا لیئیں کیوں کچھ دال میں ہے کالا

بھائیوں کو دیکھ روں تو ہپی بنے ہوئے ہیں
اماں بھی فیشن ایبل بہناں بھی اور خالہ

بیوی سے بڑ کو کرریں بیوی کے بھایاں گمت
میں تل کو بیٹھ جا روں سالوں کا بول بالا

بڑ بڑ کو باتاں نکو رکھ دیوں گا مُنہ پو تالا
جتّا ہے مُنہ تمارا اُتّیچ کھاؤ نوالہ

دلّی کو کئیکو جاتیں گھر میچ دیکھ لیونا
کھیتاں اُجاڑرے نالہ گھر کو بگاڑرے سالہ

کیسی گذر رہی ہے ان میں مذاق تیری
اک بھولے بھالے دل کا کیا ہو گیا دِوالہ

حفیظ خاں مذاق

غزل

میکپ کا ہوا رخ پہ عمل ۹۰%
نیّت میں پڑا اپنی خلل ۹۰%

ہو جاؤں منسٹر تو بنا دوں تری خاطر
موسیٰ پہ بھی اک تاج محل ۹۰%

سو فیصدی مُنّے مفت کی پی تو نے مگر شیخ
کس نے کہا تے کرکے اُگل ۹۰%

دریائے محبت میں لگاتا ہے جو غوطہ
آتی ہے وہیں اس کو اجل ۹۰%

کھل کر جو مرے شعر کی تعریف کرے آج
میں چائے پلاؤں اُسے کل ۹۰%

کچھ شعر اِدھر کے ہیں تو کچھ شعر اُدھر کے
یوں ہو گئی نشتر کی غزل ۹۰%

محمود نشتر

ڈی۔کے کنول

عوام زندہ باد
عوام مُردہ باد

میرا نام خیراتی لعل عرف خیرو ہے۔ایم۔پی۔بننے
ںپہلے میں بغیر مہر کا سکہ تھا جو نہ گھر میں چلتا ہے اور نہ بازار
ا۔الیکشن میں عوام نے مجھے ووٹ دے کر ایم۔پی۔جو بنا دیا تو
پر عزت اور شرافت کی مہر لگ گئی اور اس طرح میں کھوٹے
کےسے کھرا بن گیا۔

آپ سے کیا چھپاؤں صاحب۔الیکشن سے پہلے
ری حالت بڑی خستہ تھی۔جب دن خراب ہوں تو سونا بھی
ی بن جاتا ہے۔میں نے مرغیاں پالنے کا فارم کھولا تو سر منڈاتے
ی اولے پڑ گئے۔چار رنگین مزاج مرغیاں پڑوس کے عاشق
راج مرغوں کے ساتھ بھاگ گئیں اور باقی جو مرغیاں تھیں وہ
اعون کا شکار ہو گئیں۔شیخ چلی کی طرح میں نے جاگتے میں
خواب دیکھا تھا وہ کم بخت اس طرح چکنا چور ہو جائے گا۔
یسا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ابھی میں اس دھچکے سے سنبھلنے
بھی نہ پایا تھا کہ مجھے ایک اور جھٹکا لگ گیا۔میری اکلوتی بیوی
دھن وتی، فاقہ کشی سے تنگ آکر، چار مرغیوں کی دیکھا دیکھی
ایک نائی کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔یہ صدمہ پہلے کے مقابلے
میں کہیں زیادہ جگر خراش اور تکلیف دہ تھا۔۔۔۔ میرا کمزور اور
ناتواں دل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا اور میں نے خودکشی کرنے کی ٹھانی۔
رات کو جب میں نیلا تھوتھا اس امید پر کھا کر سو گیا کہ
یہ نیند ابدی ہوگی۔مگر برا ہو ملاوٹ کرنے والوں کا کہ میں مرا نہیں
بلکہ زندہ رہا۔۔ اور اس تکلیف دہ سچائی کا علم مجھے اس وقت
ہوا جب میرے پڑوسی رام دھن نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا
اور میں نے اپنے آپ کو جیتا جاگتا پا لیا۔۔۔۔ موت کے اس بیہودہ
مذاق پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور تاؤ بھی آ گیا۔۔۔ بعد میں تحقیقات
کرنے پر پتہ چلا کہ میں جو نیلا تھوتھا کھا گیا تھا وہ اصلی نہیں ملاوٹی
تھا۔۔۔

میں نے اسی روز ملاوٹی نیلا تھوتھا بیچنے والوں کے خلاف
اندولن چلانا چاہا۔جو اس وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکا کہ منہ بند
رکھنے کے لیے مجھے منہ مانگا معاوضہ مل گیا تھا۔

میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ موت جس کے نام سے ہی بڑے
بڑوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت
ہوئی تھی۔اس دن کے بعد مجھے موت سے ایک طرح کا عشق ہو گیا

اور میں نے اس کے بغلگیر ہونے کا پروگرام بنالیا یعنی دوبارہ خودکشی کرنے کی ٹھانی ـــــ مگر دوسری مرتبہ بھی مجھے مرنے نہیں دیا گیا ـــــ میری یہ کوشش گاؤں والوں نے ناکام بنا دی ۔ انھوں نے مجھے خودکشی کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے الیکشن میں کھڑا کر دیا ۔ میں نے سوچا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے ۔

کہ الیکشن لڑا جائے کیونکہ خودکشی کرنا سیاست میں آجانا ایک ہی جیسا ہے ۔

میں ووٹوں کی بھاری تعداد سے کامیاب ہوا اور میرا حریف چندمی داس اپنی ضمانت ضبط کروا بیٹھا ۔

اپنی کامیابی کی خبر سن کر مجھ پر شادمرگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور بے ساختہ میرے منہ سے "عوام زندہ باد" کا نعرہ نکل گیا ـــــ

اب میں ایم پی تھا ـــــ الیکشن سے پہلے سیاست کی ناہموار زمین پر قدم رکھتے ہی مجھے اس کے داؤ پیچ معلوم ہونے لگے تھے ۔ سیاست میں جھوٹ کا زیادہ چلن ہوتا ہے ۔ جھوٹ بولنے میں، تو میں کافی ماہر تھا باتوں کی طومار باندھنے میں میرا کوئی ثانی نہ تھا ۔ ـــ میں رائی کو پربت اور پربت کو رائی بنا سکتا تھا ـــــ

بس میرا یہی فن میرے کام آیا اور میں چند ہی مہینوں کے اندر بہت بڑا سیاست داں بن گیا ۔

سیاست میں آکر پہلی بار مجھ پر یہ بھید کھلا کہ عوام کے ہاتھ میں سوائے ایک ووٹ کی پرچی کے اور کچھ نہیں ہے ۔ وہ جو کہتے ہیں کہ عوام سب سے بڑی طاقت ہے ۔ غلط ہے وہ بہت بڑا جھوٹ بولتے ہیں ۔ اصلی طاقت تو لیڈر اور سیاست داں کے پاس ہوتی ہے ۔ وہ عوام کو جدھر موڑنا چاہے موڑ سکتا ہے ۔ عوام بے بس ہے ۔ نادان ہے ـــــ لچھے دار باتوں میں بہت جلد آجاتی ہے ـــ

لیڈر بننے کے بعد میری سماجی پوزیشن میں تبدیلی آچکی تھی ـــــ ہم اب سماج سے بھی برتر تھے ـــــ ہماری عادتیں، ہماری بوالعجبی، ہماری خرافاتیں سماجی حدبندیوں سے آزاد تھیں ـــــ ہم پارٹیاں بدل سکتے تھے اور بعد میں طلاق لے سکتے تھے یا دے سکتے تھے ـــــ لڑکیاں اغوا کر سکتے تھے اور رپورٹ کرنے والے کو اندر کروا سکتے تھے ـــ واہ کیا ٹھاٹھ تھے ۔ کیا زندگی تھی ـــــ !!

ہم عوام سے وعدہ کر کے چلے تھے کہ ہم ایم ۔ پی بنتے ہی ملک میں سوشلزم لائیں گے ۔ امیر اور غریب کو ایک ہی سطح پر لائیں گے ۔ ہم ایم پی بنے تو سب سے پہلے ہم نے اپنے آپ پر سوشلزم کا تجربہ کیا یعنی ہم نچلی سطح سے اٹھ کر امیروں کے ہم پلہ ہوگئے ـــــ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا تھا ۔ ہمیں خوشی ہو رہی تھی کہ ہم اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں ۔ بعد میں ہم نے یہ تجربہ اپنے رشتہ داروں پر آزمایا ۔ ہمارا تجربہ سو فیصد کامیاب رہا تھا ۔

ہم پانچ برس تک اتنے مصروف رہے کہ اپنے گاؤں والوں سے بھی ملنے کی فرصت نصیب نہ ہوسکی ۔ حالانکہ کتنی بار ہمارا دل چاہا کہ ہم اپنی جنتا کو یہ بشارت سنا ڈالیں کہ ہم سوشلزم پر دھڑا دھڑ تجربے کرنے لگے ہیں جن کے نتائج بڑے ہی خوش گوار نکل رہے ہیں ۔ ہم گاؤں والوں کے پاس گئے بھی تو کب جب ہمارے پانچ برس مکمل ہو چکے تھے ۔ جنتا نے ہمیں ووٹ نہیں دیئے ۔ ہم الیکشن ہار گئے ۔

عوام کی اس بے وفائی پر ہمارا خون کھول اٹھا اور ہم نے کھلے عام عوام مردہ باد کا نعرہ لگا دیا ـــ بعد میں جس طرح ہمارا سواگت کیا گیا ـــــ آج بھی اسے یاد کرتے ہیں تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ یہ کہیے صاحب کہ ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم جنتا جناردھن کے قہر کا شکار ہونے کے باوجود بھی زندہ رہے ۔ ـــــ کوئی دوسرا ہوتا تو کب کا رام نام ستیہ ہوا ہوتا

55

اے نوٹ میری جان تجھے دیکھنے کے بعد
بوڑھا بھی ہے جوان تجھے دیکھنے کے بعد
کھینچی ہے ایسی تان تجھے دیکھنے کے بعد
بگڑے گدھوں نے کان تجھے دیکھنے کے بعد
اُستاد تجھ کو مان کے شاگرد بن گئے
لُچے دبے ایمان تجھے دیکھنے کے بعد
لٹھ لے کے پھر رہے ہیں وہ تیری تلاش میں
مُردوں کے خاندان تجھے دیکھنے کے بعد
چوبیس گھنٹے تیری جوانی کے تذکرے
بڈھوں کے درمیان تجھے دیکھنے کے بعد
لنگوٹ چھوڑ چھاڑ کے سب ہوگئے فرار
غنڈے وپہلوان تجھے دیکھنے کے بعد
سُنتے ہیں ہوگئی ہے شروع بھونکنے کی جنگ
کتوں کے درمیان تجھے دیکھنے کے بعد
حد یہ کہ تیرے عشق میں یہ تک نہیں بچا
جورو کا پاندان تجھے دیکھنے کے بعد
ٹپکے ہیں میرے عشق میں بن کر رقیب وہ
خود میرے ناناجان تجھے دیکھنے کے بعد
پردے کا احترام بھی میری نظر میں ہے
کھولوں کہاں دکان تجھے دیکھنے کے بعد

کیوں یاد آگئی تیرے پاگل کو ایک دم
قصاب کی دکان تجھے دیکھنے کے بعد

پاگل عادل آبادی

سراج منزملی

جب مخالف پیار کے اہلِ جہاں بن جائیں گے
اپنے ہلپیر ڈار لنگ! اللہ میاں بن جائیں گے
ہم سول میریج کر کے گر ترے میکے گئے
تیرے فادر ایک دم چنگیز خاں بن جائیں گے
گھوڑے جوڑے کے لئے تکرار یوں کرتے رہیں
بعد پنشن کے ہی ہم دلہا میاں بن جائیں گے
جنس کی تبدیلیاں یوں ہی اگر ہوتی رہیں
ہٹے کٹے مرد نازک لڑکیاں بن جائیں گے
ایک جوگی کی عطا کردہ جڑی بوٹی ہے یہ
سن رسیدہ لوگ کھا کر تو جواں بن جائیں گے
مفلسی یوں ہی اگر بڑھتی رہی اپنی سراج
آگ میں ہم بھوک کی، جل کر دھواں بن جائیں گے

غزلیں

عظمت بھلاوان

مُنہ پہ توے کا نور ہے اُترا
کتنی کالی سرنگ ہے باوا
مار دیتی ہے زور سے جھٹکا
میوزیم کی تفنگ ہے باوا
گھگھرن لگ گیا ہے لوہے کو
کیا خطرناک زنگ ہے باوا
میں زمانے کے ساتھ کیا بھاگوں
ایک پاؤں میں لنگ ہے باوا
ہڈی ٹوٹی نہ کھوپڑی پھوٹی
خوب چھکوں کی جنگ ہے باوا
نہ کرو اس پہ ناروا حرکت
بزرگوں کا پلنگ ہے باوا
جا کے پھیکا پڑا ہے بھٹی میں
کیا بھلاویں کا رنگ ہے باوا

بلکل اَپوٹ ہے

اُنچی ہے اس کی ناک تو چکلی ہے پیشانی   کتیں بزرگاں اس کو شرافت کی نشانی
باوا بی خد کو بولتائے میسور کا راجہ   اماں سمجتیں اپنے کو جے پور کی رانی
اس کے جسم میں لہو ہے سو بلکل اَپوٹ ہے
پن کی ہمارا چھوکرا کتا لپوٹ ہے

کانوں پو بیرلسی رک کو یوں پیدا ہوئے اُنے   سوجی چھینئے عقل کی تو مُیدا ہوئے اُنے
دکتائے دِوانہ پن کی ہے مطلب کا دوانہ   مطلب کی ہراک چیز پو شیدا ہوئے اُنے
دُنیا کے گھامڑوں سے بی رشتہ اَٹوٹ ہے
پن کی ہمارا چھوکرا کتا لپوٹ ہے

ہوکو سلیپ عقل پھسلتائے کبھی کبھی   دورے پو بن بریک نکلتائے کبھی کبھی
ہیرو اُنے بی فلموں کا بننے کے شوق میں   گھر سے چھٹیا تو بمبئی کو چلتائے کبھی کبھی
اُس کی بی رُوٹ دَن وے ٹرافک کی روٹ ہے
پن کی ہمارا چھوکرا کتا لپوٹ ہے

سیٹیاں بجا بجا کو یوں اسٹائیل مارتائے   ہر روز امیتابھ کے پوزاں اُتارتائے
جیسے میں پھٹی کوڑی بی نئیں ہے کتے مگر   جاکو جگن جگا اُنے شیخیاں بگارتائے
اس کے جسم پو فٹ ہے سو کس کا کی سوٹ ہے
پن کی ہمارا چھوکرا کتا لپوٹ ہے

اُس پو بی سارے ذات شریفوں کی چھوں پڑیئے   سب کا خیال رکتیں سو لوگوں کی چھوں پڑیئے
ہر سائز نما کا ٹوک اس کے پوں میں فٹ ہوئے   قسمت سے اُس کے پوں پو ہراک پوں کی چھوں پڑیئے
مجد سے تڑی دے کو بکایا سو بوٹ ہے
پن کی ہمارا چھوکرا کتا لپوٹ ہے

کس کا بی دَرد دیک کو کلتائے کتے اُنے   سوب کے سنگات پیار سے ملتائے کتے اُنے
ہولی کو دیرے کو دِوالی کو عید کو   مل مل کو گلے جیباں چھلتائے کتے اُنے
اِس کو سلام ہے کبی اُس کو سلیوٹ ہے
پن کی ہمارا چھوکرا کتا لپوٹ ہے

اشرف خوندمیری

کرنل محمد خان

اُڑتے خاکے (ایران)

آپ جیکب ملک ہیں یا آدم ملک ؟

چنانچہ نالہ تمام کر کہ ہم نے پہلے غسل کیا پھر اطاقِ ناہار میں جاکر ناشتہ کیا اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے آپ کو سیر تہران کے لیے تیار اور مشتاق پایا۔ لیکن ہمیں تہران سے آشنائی تھی نہ کسی تہرانی سے اور یوں منہ اٹھا کر گھر سے گلی میں نکل پڑنے کو سیر نہیں کہتے۔ چنانچہ چاہا کہ کوئی ایسا رہنما مل جائے جو تہران کی راہوں کا رازداں ہو۔ سوچا کہ پاکستانی سفارت خانے میں کوئی ملٹری اتاشی تو ہوگا جو ممکن ہے ہمارا واقف نکل آئے اور ناواقف بھی ہو تو فوجی رشتہ تو بہرحال ہے ہی۔ اگر خود نہ آسکا تو شاید ایک کار اور ڈرائیور ہی بھیج دے۔ چنانچہ پاکستانی سفارت خانے کو فون کیا۔ جواب میں ایک صاحب بولے جو اپنے آپ کو ملک کہتے تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور پوچھا:

"میں ملٹری اتاشی سے بات کر سکتا ہوں ؟"

جواب آیا: "وہ تو موجود نہیں۔ لیکن آپ نے مجھے نہیں پہچانا ؟"

اب جو ملک فوری طور پہ ہمارے ذہن میں آئے ان میں سے فتح محمد ملک کے علاوہ دو تین جنرل ملک تھے، پانچ سات کرنل اور میجر ملک سو اگر ہم دو چار وزیر خارجہ قسم کے ملکوں مثلاً آدم ملک، جیکب ملک کو حساب میں نہ بھی لیتے، جب بھی یہ کہنا آسان نہ تھا کہ ہمارے مخاطب کون سے ملک ہیں۔ اور اگر وہ ان گنے چنے ملکوں کے زمرے سے باہر تھے تو ظاہر ہے کہ ان کو پہچاننا اور مشکل تھا کہ وطن عزیز میں وہ آدمی بھی جو گھر کی چار دیواری کے اندر ملک نہیں، اس کے باہر ضرور ملک ہے اور ایسے ملوک کی تعداد شمار اور شناخت سے باہر ہے۔ چنانچہ عرض کیا:

"معاف کرنا۔ آپ کون سے ملک ہیں ؟"

بولے: جب آپ میٹنگ پر کراچی آیا کرتے تھے تو میں آپ کا ٹی اے بل بنایا کرتا تھا۔ یاد آیا؟"
ہمیں ٹی اے بل کی خوشگوار یاد کے باوجود اُس کے خالق کی یاد نہ آسکی لیکن کس مُنہ سے کہتے کہ بھلا دی ہے چنانچہ نہایت خندہ پیشانی سے ایک مصلحت سے بھرپور جھوٹ بولا:

"اچھا اچھا۔ یاد آگیا۔ آپ ان دنوں ٹی اے کلرک تھے نا؟"

"جی ہاں، تھا مگر آپ کی دعا سے افسر ہوں۔"

"سوچا، جو شخص افسر بن جانے کے بعد بھی اپنی کلرکی کو نہ بھولا ہو، کوئی باکردار آدمی ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے دلی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"مبارکباد ملک صاحب مبارک باد۔"

بولے: "شکریہ۔ اور اب فرمائیں، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

کہا: "ملٹری اتاشی صاحب سے تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر مجھے ایک کار اور ڈرائیور عنایت کر سکیں تو میں، تھوڑی سی تہران کی سیر کر لوں۔ میں ابھی ابھی تہران پہنچا ہوں اور کل صبح وطن جا رہا ہوں۔"

"آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟"

"ہوٹل انٹرنیشنل میں۔"

"آپ ایک گھنٹہ اور انتظار کر سکتے ہیں؟"

"کس کا؟"

"اس خادم کا۔ میں پونے گیارہ بجے کار لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ میری کار ذرا چھوٹی سی ہے مگر دو آدمیوں کو سیر کرا سکتی ہے۔"

میں نے کہا:

"آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں؟"

ملک ہنسا اور بولا:

"میں کار کے ساتھ شکریہ کی ترکیب بھی لیتا آؤں گا۔"

میں تنہا نہیں، صرف بچھڑا ہوں

بے شک یہ کوئی اصلی ملک تھا بطور افسر تو شاید ابھی بہت جونیر تھا مگر سفیر ہونے کے قابل تھا۔ پاکستانی مسافروں کے لیے پاکستانی سفارت خانوں کی طرف ایسی تواضع خاصی کم یاب نعمت ہے ـــــ لیکن ہم نے رسیور رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے اُردو میں آواز آئی۔

" اگر آپ کو سفارت خانے کی کار کی بجائے غریب خانے کی کار میں سیر کرنے پر اعتراض نہ ہو تو خاکسار مع کار

حاضر ہے۔"

اور پھر اس آواز کا مالک جو ایک تپائی کے سامنے بیٹھا کافی پی رہا تھا، اٹھا اور بڑھ کر ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا:
"مجھے جمال حسین شاہ کہتے ہیں، معاف کرنا میں اتنا قریب بیٹھا تھا کہ آپ کی ٹیلی فون کی گفتگو سُنے بغیر چارہ نہ تھا۔"
ہمارے سامنے ایک سرخ و سپید خوب رو نوجوان کھڑا تھا۔ تعارف کا کیا انوکھا مگر دل ربا انداز تھا! ہم نے اس کا ہاتھ مزید دباتے ہوئے کہا:

"بھئی، دل تو آپ نے دو لفظوں میں ہی موہ لیا ہے۔ لیکن کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ غالب کون ہے؟"

بولا: "غالب جو کچھ بھی ہے میرے لیے اتنا کافی ہے کہ میرا ہم وطن ہے۔ ٹیکسلا کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ایران ایروینہ میں تین سال سے انجینئر ہوں۔ اسی ہوٹل میں رہتا ہوں۔ اکیلا ہوں۔ آج چھٹی ہے اور یہ ہے میری کار۔ اب کہیے یہ کار یا وہ کار؟"

ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس نہایت ہی پیارے اجنبی کو گلے سے لگا کر اتنا بھینچتے کہ اجنبیت کا آخری خطرہ نچڑ جاتا اور جب نچڑ چکا تو ہم نے جمال کی سپورٹس کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ کار!"

لیکن کار میں بیٹھنے سے پہلے ملک سے معذرت کرنا لازم تھا اور اس ان دیکھے محسن کو یوں جواب دینا بھی آسان نہ تھا لیکن جب اسے یقین دلایا کہ ہم خود نہیں بھاگ رہے بلکہ ایک سیلِ محبت ہمیں کہیں بہائے لیے جا رہا ہے اور یہ کہ یہ سیل ایک شخص مسمی جمال حسین شاہ کا لایا ہوا ہے تو ملک ایک بڑا اطمینان لہجے میں بولے:

"اگر آپ جمال کے ہاتھوں میں ہیں تو بخدا مجھ سے بہتر ہاتھوں میں ہیں۔"

معلوم ہوا کہ جمال کی شہرت سے خود سفارت خانہ اکتسابِ فخر کرتا ہے۔ بہر حال ملک سے فارغ ہوئے تو جمال بولے:

"آئیے۔ اب ذرا سکون سے ایک پیالی کافی پئیں اور پھر سیر کو نکلتے ہیں۔"

کافی کی میز پر بیٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر آتا جاتا اور خصوصاً ہر آتی جاتی میز کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک دو یا دس لمحوں کے لیے رُکتی ہے اور ایک شوق بھرے انداز میں، کبھی ہاتھوں سے، کبھی آنکھوں سے، اور کبھی باتوں سے جمال کے مزاج پوچھتی ہے اور بجھواتی ہے، مذاق کرتی ہے کراتی ہے اور ہر چند کہ بلائے جان ہے غالب ان کی ہر بات "تاہم جمال ہر ایک سے علیٰ قدرِ مراتب معاملہ کیے چلا جا رہا ہے۔ بہر یہ طرفہ اشارات و شرارت اس قدر مسلسل ہے کہ ہم جمال کے کمال سے تو محظوظ ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے کلام کا وقفہ نہیں ڈھونڈ پاتے ــــــ بالآخر کافی ختم ہوئی اور جمال اپنی آخری قدرداں کی جنبشِ چشم کا جواب جنبشِ لب سے دے کر اٹھا اور ہم کار میں جا بیٹھے۔ کتنی دیر سے ہمارے ذہن میں ایک سوال کسمسا رہا تھا۔ اب موقع ملا تو پوچھا:

"جمال تم نے تو کہا تھا کہ یہاں تین سال سے ہو اور اکیلے ہو؟"

"کہا تو یہی تھا۔ کیا اس میں کوئی قانونی سقم ہے؟"

"شاید وہ بھی ہو، لیکن غلط بیانی ضرور ہے، جس شخص پر اتنے قلیل وقت میں اتنی کثیر چھوکریاں اس حد تک مہربان ہو جائیں، کیا وہ اکیلا کہلا سکتا ہے؟"

"جناب میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ بے یارومددگار ہوں۔ فقط یہ کہ بے زوجہ ہوں۔ دراصل مجھ سے ٹیکنیکل غلطی ہوئی ہے۔ میں اکیلا نہیں چھڑا ہوں۔"
"لیکن اس بہتات کے ہوتے ہوئے تمہارے چھڑا رہنے کا بھی کوئی جواز نظر نہیں آتا۔"
"یہ بہتات ہی تو جوانہ ہے۔ اگر ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کرلی تو باقی سب سے کٹ جاؤں گا۔"
"لیکن وہ ایک جس سے جڑ جاؤ گے بڑی خاص شئے ہوگی۔ شریک حیات، جانِ تمنا، رفیق زندگی، حاصل کائنات ......"
"جناب ابھی تک اس شہر میں شریک حیات قسم کی لڑکی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔"
"وہ کیوں؟ تہران میں تو اس جنس کی کمی نہیں ہونا چاہیے۔ اس گل اندامون اور شیریں کلاموں کے شہر میں۔"
"یہ لڑکیاں بے شک بڑی میٹھی چیزیں ہیں لیکن ان کی مٹھاس کو دوام نہیں۔"
"یعنی۔"
"یعنی بڑی پیاری رفیق حیات ہیں بشرطیکہ حیات کی توقع دو تین سال سے زیادہ نہ رکھی جائے۔"
"ان حالات میں تمہارا چھڑا رہنے کا خطرہ بالکل حقیقی ہے۔"
"نہیں نہیں۔ صحیح وقت پر مجھے نہایت صحیح بیوی ملے گی ـــــ میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں۔"
"میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے صحیح بیوی کے لیے رحمت سے کیا کیا اُمیدیں باندھ رکھی ہیں؟"
"جی ہاں۔ ایک ایسی لڑکی جو دیدار میں فرنگن ہو، گفتار میں ایرانی اور کردار میں پاکستانی۔"
"گویا یہ تین عناصر ہوں تو بنتی ہے جمالو؟"
"بالکل ـــــ مگر جمالو کی بجائے میں جمیلہ کو ترجیح دوں گا۔"
"لیکن تمہاری جمیلہ کا نسخہ ہے ذرا ٹیڑھا سا۔ اس کی تیاری میں تو رحمت کو تین ملکوں کا دورہ کرنا پڑے گا۔"
"رحمت سے کچھ بھی بعید نہیں۔ وہ جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب۔"
ہمیں اس خوش فہمی سے اتفاق تو نہ تھا لیکن دوست کی دلجوئی کے لیے کہہ دیا:
"اللہ کرے، اگلی دفعہ حباب کی جگہ جمیلہ اُٹھے۔○"
جمال نے بآواز بلند کہا: "آمین" اور مضمون بدلتے ہوئے بولا:
"اب ہم خیابانِ سعدی سے گذر رہے ہیں۔"

سردار جی، آپ اس جنگل میں کہاں ہیں؟

ہمیں اس خیابان میں شیخ سعدیؒ یا ان سے ملتے جلتے بزرگ تو نظر نہ آئے لیکن کچھ ان سے بھی بھاری پگڑیوں اور لمبی داڑھیوں والے سکھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے۔ ہمیں یاد آیا کہ پاکستان بننے سے پہلے ہمارے گاؤں پل کسمر کے بیشتر

□ چھڑا پنجابی میں اس مرد کو کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو۔ ○ یہ ایک سال بعد کی بات ہے کہ جمال مجھے راولپنڈی میں ملنے آئے ...

سکھ ایران میں تجارت کرتے تھے اور ان کے لڑکے ہمارے ساتھ گاؤں کے سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی حافظے کے پردے پر تیجا سنگھ، سردول سنگھ، کرپال سنگھ اور دوسرے ہم جماعت نمودار ہوئے ہم نے سوچا: کیا عجب کہ یہ لوگ اب یہاں ہوں۔ چنانچہ ہم کار سے باہر نکلے اور ایک پاس سے گزرتے ہوئے بھاری بھرکم دراز ریش سکھ کو ٹھہرا کر پوچھا:

"سردار جی، یہاں کوئی بلکسر کے سکھ بھی ہیں؟"

بولا: "آپ نے کس کو ملنا ہے؟"

"کوئی ہو مگر بلکسر کا ہو۔"

"ایک تو میں ہوں۔"

اور پھر ذرا غور سے دیکھنے کے بعد ہمیں کہنے لگا:

"اوئے توں تے محمد خاں ایں۔ اوسو ہنیو، تسیں کیہڑے پاسیوں[۱]؟"

لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اپنی آمد کی سمت کا نام لے سکتے سردار جی نے ہمیں بازوؤں میں لپیٹ لیا۔ یوں جیسے روسی ریچھ نے گلے لگا لیا ہو۔ اس کی ہمکناری کے دوران ہم نے کسی نہ کسی طرح سانس لینے کا بندوبست کیا اور جب گرفت ڈھیلی ہوئی تو پورا سانس لے کر بے تکلف ہم جماعت کو پہچاننے کی کوشش کی اور کہا: تم تیجا سنگھ ہونا؟"

ہنس کر بولا: "نہیں۔ اک واری فیر بجھ[۲]"

میں نے سردار جی کی داڑھی کے پھیلاؤ اور مونچھوں کے گھیراؤ سے گذر کر بائیس سال پیچھے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن روشنی نظر نہ آئی ــــ توکل پر کہا: سردول سنگھ؟

بولا: "چھوڑ یار[۳] ــــ تینوں ساریاں جیلاں یاد نیں تے اپنے گوانڈھی نوں بھل گیا ایں ــــ میں کرپال آں۔"

معاً مجھے وہ گورے گلابی گالوں والا سکھ لونڈا یاد آیا جس کے ساتھ میں اپنی گلی میں پہر ولا چینیچی[۴] کھیلا کرتا کرتا تھا۔ میں نے اس کی موجودہ داڑھی کا سروے کرتے ہوئے کہا:

"کرپال معاف رکھنا اب تمہاری آواز میں نے پہچان لی ہے مگر بتا سکتے ہو کہ تم خود اس جنگل میں کہاں ہو؟"

کرپال نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا:

(سلسلہ حاشیہ) تو ساتھ اپنی حسین و جمیل دلہن کو بھی ساتھ لائے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ آپ سوئٹزرلینڈ کی رہنے والی ہیں فارسی بولتی ہیں۔ اور پاکستانی طرز زندگی کی دلدادہ ہیں۔ نام ویرا (VERA) لیکن جمال کہنے لگا تمہارے لیے جمیلہ ہے (مصنف) [۱] ارے تو تو محمد خاں ہے پیارے کس طرف سے؟ [۲] ایک بار اور پوچھو [۳] چھوڑ یار۔ تمہیں سارے جغرافیے یاد ہیں اور اپنے ہمسائے کو بھول گئے۔ میں کرپال ہوں۔ [۴] ایک ٹانگ پر کودنے کا کھیل۔

"میں بالکل وہی ہوں جہاں نائی سے تیس سال دور رہ کر تم بھی ہو سکتے تھے۔"

کرپال کو اپنے حلیے پر اختیار نہ تھا۔ لیکن اس کی ظرافت میں وہی سکھوں کی سی توانائی تھی۔ جمال سے تعارف کرایا تو ہم دونوں کو کھینچ کر اپنی سپیئر پارٹس کی خوب صورت دکان میں لے گیا۔ اور اپنے ایرانی نوکر کو بڑی تیز فارسی میں چائے لانے کا حکم دیا۔ کرپال کے منہ سے فارسی سنی تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ خود بھی مسکرا پڑا اور بولا:

"بھئی میں نے چائے کا آرڈر دیا ہے، کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا؟"

"لطیفہ تم نے نہیں، تمہاری فارسی نے سنایا ہے اور اس پر ضمیر کے دو مصرعے یاد آگئے ہیں۔"

"اوے ضمیر کی کہندا اے؟"

"سردار جی، او کہندے نیں:

فارسی پنجاب کے کھیتوں میں دوڑائی گئی[1]
شیخ سعدی کی غزل درگا میں درگائی گئی"

بولا: "او شیخ سعدی کے مارے ہوئے میں نے فارسی زبان، گرامر کے زور سے تھوڑی ہی سیکھی ہے۔"

کہا: "خدا نہ کرے آپ گرامر کے محتاج ہوں۔ اور یہ تہمت میں گھڑ بھی کیسے سکتا ہوں؟ مجھے معلوم ہے خالصہ سکھ شاہی کے زور سے فارسی سیکھتا ہے۔"

بولا: "دیکھ بات اتنی ہے کہ میں سالم موٹر نہیں بیچتا۔ موٹر کے سپیئر پارٹس بیچتا ہوں اور سالم فارسی بھی نہیں بولتا۔ فارسی کے سپیئر پارٹس ہی بولتا ہوں اور گرد کی کرپاسے کاروبار ٹاپ پر ہیں۔"

اتنے میں چائے آگئی۔ چائے مع تکلفات دیکھی تو معلوم ہوا کہ کرپال نے چائے کا آرڈر سالم فارسی میں دیا تھا۔

چائے پی لی تو اگلا مرحلہ کرپال سے رخصت کا تھا۔ کہا:-

کرپال۔ اب اجازت! پورے تیس منٹ ہو چکے ہیں۔

بولا: میں تمہیں پورے تیس دن یہاں رکھوں گا۔"

"اگر میں تیس دن کی غیر حاضری کے بعد وطن لوٹا تو آگے کورٹ مارشل میرے انتظام میں ہوگا۔"

"تو مت جانا۔ تمہیں یہیں نوکری دلا دیں گے۔"

"پاکستان میں نوکری کے علاوہ بیوی بچے بھی ہیں۔"

"چلو بیوی کا بھی یہیں بندوبست کر دیں گے۔" یہ سن کر جمال نے نفی میں سر ہلایا اور ہم نے باآواز بلند کہا:

"نامنظور ـــــ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

---

[1] سید ضمیر جعفری کی مشہور نظم والی سے پورا بند یوں ہے:-

اک دوپٹی "دو پٹی" سو بار دہرائی گئی ؛ لے کبھی چھوڑی کبھی پکڑی کبھی کھائی گئی
فارسی پنجاب کے کھیتوں میں دوڑائی گئی ؛ شیخ سعدی کی غزل درگا میں درگائی گئی
سوہنی جس مہرج میں ڈوبی وہ جوئے شیر تھی ؛ محمل لیلیٰ کو الٹایا تو اندر ہیر تھی

پرویز یداللہ مہدی

(خاتمہ بالخیر قسط)

طیارے کو زمین چھوڑے ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ آس پاس کے تقریباً تمام مسافروں پر غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ آنکھیں تو ہماری بھی مندی ہوئی تھیں۔ لیکن ذہن پوری طرح نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ پچھلے مختصر سے عرصے میں پیش آنے والے تحیر خیز واقعات کو کسی مربوط فلم کی طرح یادداشت کے پردے پر دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس قسم کا پہلا منظر وہاں سے شروع ہوا تھا جہاں بے دھڑک کی زندگی کی فلم پر "ختم شد" کی مہر لیس لگنے ہی والی تھی ——— بے دھڑک کی دم توڑتی ہوئی اکھڑی اکھڑی سانسیں جیسے ہم سے کوئی وعدہ لینا چاہتی تھیں ——— ایک منصوبہ جسے شاید اپنی زندگی میں عملی جامہ نہ پہنا سکنے کا بے دھڑک کو یقین تھا تب ہی تو دم توڑتے توڑتے اس منصوبے کے "کاغذی روپ" کو اس نے ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ جو لفافہ مرتے مرتے اس نے ہمارے حوالے کیا تھا۔ اس میں سے نادرہ مرحومہ کی بیمہ پالیسی کے مکمل کاغذات کے ساتھ وہ نقشہ بھی برآمد ہوا تھا جو غالباً نادرہ کی موت کے بعد لطاہر ایک خواب کی صورت بے دھڑک کے تخیل میں ابھرا تھا لیکن جس کی تعبیر کی خاطر بے دھڑک نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی تھی ——— اپنے اس خواب کا ذکر بے دھڑک نے شاید صرف ہمارے ہی آگے کیا تھا۔ نادرہ کی یاد میں ایک ویلفیر سنٹر کے وسیع پیمانے پر قیام کا خواب ——— ایک ایسی پناہ گاہ کا خواب، جہاں سماج کی ستائی ہوئی ہر اس عورت کو ایسی باعزت پناہ مل سکے کہ پھر کوئی عورت بدلے اور انتقام کی آگ میں نادرہ کی طرح نہ تو غلط راستہ اپنائے اور نہ ہی نادرہ کا انجام ہر ایسی عورت کا مقدر بن سکے ——— پولیس والوں کے جائے واردات پر پہنچنے تک بے دھڑک کے جسد خاکی میں پھڑپھڑانے والا پنچھی ہمیشہ کے لیے پرواز کر چکا تھا ——— طوطا پری نے پولیس والوں کو دیکھتے ہی ایک آفیسر سے جھنجھلا کر پوچھا تھا۔ "اوپری منزل سے نیچے آنے میں لوگوں کو اتنی دیر لگ گئی ——— ؟"

"مجرم بہت چالاک تھا فولادی صاحب!" ——— آفیسر نے بے دھڑک کے بے روح جسد خاکی کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا تھا۔

"اس نے یقیناً ہماری موجودگی کی بُو سونگھ لی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم پلان کے مطابق کارروائی کا آغاز کرتے، اس نے بے خبری میں نیند لانے والی گیس ہم پر چھوڑ کر ہمیں بے بس و مجبور کر دیا ——"

"اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ لوگ مجرم کا اقبالی بیان بھی ریکارڈ نہیں کر سکے ——" طوطا یری ہاتھ ملتے ہوئے بولا تھا۔"

"اس سلسلہ میں ہم خوش قسمت رہے ہیں مسٹر فولادی ——" آفیسر نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ کہا تھا۔ اتفاق سے ہمارا ایک جوان گیس کے زیر اثر جھونک میں آکر اس طرح لڑھکا کہ ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ اس کے ہاتھ کے دھکّے سے آن ہو گیا —— اتنا کہہ کر آفیسر نے ایک جوان کے ہاتھ میں تھمے اسپول (Spool) کو اپنے ہاتھ میں منتقل کر دیا تھا اور یوں بات ختم کی تھی۔ "اس اسپول میں مجرم کا اقبالی بیان محفوظ ہے ——"

● اس منظر کے فیڈ ہوتے ہی اگلا منظر ابھرتا ہے —— شہر خموشاں کا وسیع و عریض میدان، چاروں طرف پھیلی ہوی ٹوٹی پھوٹی کچی پکی قبریں —— اور ان قبروں کے بیچ ابھی ابھی تازہ کھودا ہوا گڑھا —— جیسے زمین کسی کو اپنے ممتا بھرے سینے میں چھپا لینے کے لیے اپنی آغوش وا کر دی ہو —— اچانک خاموش منظر میں ہلچل سی پیدا ہوتی ہے، چند نفوس ایک جنازے کو اٹھائے ہوئے شہر خموشاں میں داخل ہوتے ہیں —— اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے زمین کی امانت زمین کے حوالے کر دی جاتی ہے اور پھر انگلیوں پر گنی جانے والی لوگوں کی تعداد چھٹ جاتی ہے۔ گڑھا بھر چکا ہے، شہر خموشاں کی بے شمار قبروں میں ایک قبر کا اضافہ ہو چکا ہے۔

● پہلے نادرہ مرحومہ کی پراسرار موت، پھر بے دھڑک کا ڈرامائی انجام، ساری بستی کو جیسے ان دونوں اموات نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، شبّو اور قبلہ چہ خوب کے ملنے جلنے والے بھی دو گروپ میں بٹ گئے ہیں، ایک گروپ ان سانحوں کو مقدرات کے کھیل سے تعبیر کرتا ہے اور خود کو شبو و قبلہ چہ خوب کے غم میں برابر کا شریک سمجھتا ہے، اور دوسرا گروپ بظاہر ہمدردی جتاتا ہے لیکن در پردہ، قبلہ چہ خوب کی بنی بنائی عزت اور ساکھ پر کیچڑ اچھال کر اپنی سفلانہ فطرت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ قبلہ چہ خوب جو پہلے ہی ٹوٹ چکے ہیں لوگوں کی چہ میگوئیوں اور بہتان طرازیوں کو سہنے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں پا رہے ہیں۔ اور انہیں یوں گم سم، چپ چاپ اندر ہی اندر گھٹتا، گھلتا، لمحہ بہ لمحہ بجھتا دیکھ کر شبّو کا فکر مند ہونا فطری بات ہے۔ ایسے میں ان دونوں کو اس ناسازگار ماحول اس گھٹی گھٹی فضا سے کچھ دنوں کے لیے ہی سہی دور ہٹانا ضروری ہے۔ ہم نے قبلہ چہ خوب کے قانونی مشیر سے مل کر نادرہ مرحومہ کی بیمہ پالیسی کے کاغذات ان کے حوالے کیے، متعلقہ ایجنٹ کو پکڑا۔ بھاگ دوڑ کی تو معلوم ہوا کہ بیمہ کی رقم ملنے میں کم از کم دو مہینے کا عرصہ لگے گا —— اس بیچ ہمارے قیام کی مدت بھی قریب الختم ہو چکی تھی۔ مزید یہاں ٹھہرنے پہ طبیعت کسی طرح مائل نہیں ہوی چنانچہ واپسی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی ——

● اگلا منظر ——— روانگی کا دن

صبح ہی سے ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ جب تک جدائی کا لمحہ سر پر آن پہنچا نہیں تھا یہ احساس نہیں ہو سکا تھا کہ دل اس قدر بوجھل بھی ہو جائے گا۔ چند دل شکن حادثات کے نتیجے میں جس جگہ جس ماحول سے بھاگ جانے ہی میں عافیت نظر آتی تھی۔ آج الوداعی گھڑیوں میں ملنے جلنے والوں کا ان مٹ خلوص ان کے بجھے ہوئے دل اور نم آلود آنکھیں دیکھ کر آج پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جدائی بھی کسی تیز دو دھاری تلوار سے کم نہیں ——— جو دوست دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔ جو بھی اس کی زد میں آتا ہے ایسا بھرپور وار کرتی ہے کہ زد میں آنے والا نہ تو پھر چین سے جی سکتا ہے نہ پوری طرح مرتا ہے ——— شبو کی تمام سہیلیاں ایک ایک کر کے آ چکی ہیں بلکہ حیرت کی بات ہے تقریباً تمام دوست احباب موجود ہیں۔ روانگی کا وقت لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا ہے، اور اتنی ساری پُرخلوص بھیڑ میں ہمیں صرف ایک شخص کا انتظار ہے ——— خان فولادی عرف طوطا پری ——— وہ شخص جس کی دشمنی میں بھی ایک انوکھا مزا آیا ہے۔ نکلنے کی ساری تیاریاں ہو چکی ہیں بلکہ سامان بھی کار میں لادا جا چکا ہے۔ اور ہم کار میں بیٹھنے ہی والے ہیں کہ سامنے سے طوطا پری کی کار تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ——— پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہم اسی کی کار میں اس کی پُرخلوص درخواست پر منتقل ہو چکے ہیں۔ بقیہ سارا قافلہ دوسری گاڑیوں کے ذریعہ ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی کار سڑک پر پہنچتی ہے طوطا پری اپنی جیب میں سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہتا ہے۔ "یہ لفافہ آج دوپہر میں میرے ہاتھ لگا ——— نادرہ مرحومہ اپنی موت کے وقت جو قلوپطرہ والا کاسٹیوم پہنے ہوئے تھیں اس لباس کی اندرونی تہہ میں سے یہ لفافہ برآمد ہوا ہے۔ جسے میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر چاک کر دیا اور جب مرحومہ کی آخری تحریر پڑھی تو بیان نہیں کر سکتا مجھ پر قیامت گذر گئی۔ میرے دل و دماغ پر ایک ایسی بجلی گری کہ ابھی تک میرے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے ہیں ——— "

طوطا پری کے اس انکشاف پر چاک شدہ لفافے میں سے چند کاغذ نکال لینا فطری عمل ہے۔ کار سڑک پر دھیمی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ ہماری متجسس نظریں تحریر پر تیزی سے دوڑنے لگتی ہیں۔

ڈیر شہزادے!

خدا کرے کہ میری یہ آخری تحریر کسی طرح تم تک پہنچ جائے ——— جس وقت یہ تحریر تمہاری نظروں سے گذر رہی ہوں گی۔ مجھے یقین ہے۔ میں اس بے وفا دنیا سے گذر چکی ہوں گی۔ اپنی موت کے بارے میں اس قدر یقین کے ساتھ وہی انسان کہہ سکتا ہے جو اپنے تک موت کے پہنچنے سے پہلے خود چل کر موت تک پہنچتا ہے ——— میں نے جان بوجھ کر موت کو گلے سے کیوں لگایا ——— ؟ ہو سکتا ہے یہ بات تمہارے لیے ابھی تک ایک راز ہو۔ ——— یا پھر ہو سکتا ہے یہ راز تم پر کھل چکا ہو۔ زندگی جب نفرت و انتقام کا دہکتا الاؤ بن جاتی ہے تو پھر موت کی آغوش ممتا بھری نرم ٹھنڈی گود محسوس ہوتی ہے ———

ہو سکتا ہے اس تحریر کے تم تک پہنچتے پہنچتے تمہیں انہونی بات بھی معلوم ہو چکی ہو کہ یکے بعد دیگرے تین

بوڑھے شوہروں کی جوان بیوی کہلانے کے ساتھ ایک عدد مستقل شوہر رکھنے کی قیمت بھی میرے سر جاتی ہے ——— کتنی عجیب بات ہے نا یہ کہ ایک عورت کا سب سے پہلا شوہر ——— اپنی ہی عورت کے دیگر شوہروں سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ اپنی ہی عورت کے کزن کی حیثیت سے ——— اس میں بے دھڑک کا کوئی دوش نہیں میں یہ خوشی سارا الزام اپنے سر لیتی ہوں ——— ایک عورت، ایک بیوی کے ناطے مجھ سے بے دھڑک کو کبھی کوئی سکھ نہیں ملا بلکہ الٹا اپنے انتقام کی آگ میں میں نے اس کے تمام جذبوں کو ہمیشہ کے لیے جھلسا دیا۔ اپنا سب کچھ میرے انتقام کی آگ میں جھونک کر بھی اس نے مجھ سے نہ کبھی کوئی شکوا کیا نہ شکایت بلکہ ہر موڑ پر اسی نے میرا ساتھ دیا ——— جن بدنصیبوں کے نصیب میں دوسروں کو صرف دکھ پہنچانا ہی لکھا ہوتا ہے۔ انہیں پروردگار پیدا ہی کیوں کرتا ہے؟

——— ان آخری لمحات میں خدا سے میری یہی التجا ہے کہ وہ مجھ جیسے بدنصیبوں کو پیدا کرنا بند کر دے۔ یہ دنیا پہلے ہی بڑی بے رحم ہے۔ اسے تو میرے شہزادے تم جیسے باظرف خوش مزاج، انسان دوست دوسروں کے دکھوں کو سمیٹ لینے والے فراخ دل انسان ہی جنت نشان بنا سکتے ہیں۔ کاش تم جیسا کوئی باکمال نوجوان میری زندگی میں آیا ہوتا ——— جس کے مزاج میں رد و قبول کا تناسب تم جیسا ہوتا جو انسان کی برائیوں کو رد کرتا لیکن انسان کو قبول کرتا ——— انسانی تصور کا یہ رخ کتنا زندگی بخش ہے ——— لیکن انسانی زندگی کا دوسرا رخ کتنا بھیانک ہے۔ شاید میری موت بھی دنیا کے لیے اتنی بھیانک ثابت نہیں ہوگی۔ میری زندگی شاید تصویر کے اس بھیانک رخ سے عبارت ہے۔ کہتے ہیں خوب صورتی صرف ظاہری ہی نہیں باطنی بھی ہوتی ہے۔ لیکن میری باطنی خوب صورتی کو انتقام کی آگ نے مسخ کر دیا ——— انتقام کا یہ جذبہ بھی کتنا عجیب ہے ——— جو میں نے اپنی ماں سے ورثے میں پایا ہے۔ مردوں کی اس دنیا میں جب تک عصمت کے خریدار موجود رہیں گے۔ پتہ نہیں کتنی نادراؤں میں اپنی ماؤں سے ورثے میں انتقام کی آگ منتقل ہوتی رہے گی ——— اور نہ جانے کتنی نادراؤں کا یہی انجام ہوتا رہے گا ——— کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ غلط بنیادوں پر کھڑا ہوا معاشرہ سنبھل سکے۔ یہ سارا ڈھانچہ صحیح محور پر آ جائے تاکہ مجبور و بے بس عورتوں کے سودے بند ہو جائیں۔ عصمت کے خریداروں، عصمت کے ٹھیکہ داروں اور دلالوں کے کاروبار ہمیشہ کے لیے ٹھپ ہو جائیں ——— پھر کوئی نادرہ بری طرح اپنے نام کے ایک ایک حرف کی تشریح اس طرح نہ کرے ن ——— ا ——— د ——— ر ——— ہ۔ ن سے نفرت ——— ا ——— سے انتقام ——— د سے دغا ——— ر سے ریا ——— اور ہ ——— سے ہرجائی ——— بلکہ آئندہ ہر نادرہ اپنے نام کے ایک ایک حرف کو یہ معنی بتائے ——— ن ——— سے نرمی ——— ا ——— سے الفت ——— د ——— سے دوستی ——— ر ——— سے رواداری ——— اور ہ ——— سے ہمدردی ———

آہ ——— شاید تم بھی میری یہ بڑ پڑھ کر سوچ رہے ہوں گے کہ مرتے مرتے بھی کم بخت کیسے عجیب خواب دیکھ رہی ہے جس کی تعبیر کم از کم اس دنیا کے خاتمے تک ممکن نہیں۔ شاید جب اس دنیا کے خاتمے کے بعد اللہ تعالیٰ کو ایک بار پھر دنیا کو تشکیل دینے کا خیال آئے تو میرا یہ خواب، شرمندۂ تعبیر ہو جائے اور تب تک نہ جانے کتنی نادرائیں

یسے خواب دیکھ دیکھ کر جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے اپنی معتوب زندگی پر شرمندہ ہوتی رہیں گی۔

کہتے ہیں انسان نہ تو اپنی مرضی سے پیدا ہوتا ہے نہ مرضی سے مرتا ہے۔ ہاں اسے اپنی پسندیدہ زندگی چننے کا حق ضرور حاصل ہے۔ لیکن یہ حق بھی صرف چند خوش نصیبوں ہی کو ملتا ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں کبھی ایسے خوش نصیبوں میں شامل نہیں ہو سکی۔ لیکن مجھے اس بات کا اب ذرا سا بھی دکھ نہیں ہے مجھے اپنی پسند کی زندگی نہیں ملی تو کیا ہوا۔ موت مجھے یقیناً وہی ملے گی جس کی تمنا اب سے پہلے صرف قلوپطرہ نے کی تھی اور جو پوری بھی ہو گئی تھی۔ میری بھی یہ تمنا مجھے پورا بھروسہ ہے ضرور پوری ہو گی۔ اس مرتبہ تاریخ ضرور اپنے آپ کو دہرائے گی ـــــ ہاں فرق صرف اتنا ہو گا۔ کہ اس بار قلوپطرہ نقلی ہو گی۔ لیکن مجھے اس بے وفا زندگی سے نجات دلانے والا نجات دہندہ اصلی ہو گا ـــــ یہ زہریلا سانپ میں نے بڑی ہشیاری سے خان فولادی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر حاصل کیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی کچھ دیر قبل خان فولادی نے بتلایا ہے کہ اس سانپ کا شمار دنیا کے ان چند سانپوں میں ہوتا ہے جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا ـــــ

اور میری زندگی شرم اور ندامت کے شدید احساس سے اندر ہی اندر اس قدر پانی پانی ہو چکی ہے کہ اب مزید پانی کی ضرورت نہیں ـــــ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا۔ اگرچہ کہ میرے گرد ہمیشہ مردوں کی بھیڑ لگی رہی۔ تاہم خان فولادی کے بارے میں اپنی زندگی کے ان آخری لمحات میں اپنی رائے بدل رہی ہوں۔ بوالہوس مردوں کی اس بھیڑ میں یہی ایک مرد ایسا ہے جو میرے تعلق سے کچھ نرم گوشے اپنے دل میں رکھتا ہے۔ مطلبی دوستوں کی بہتات اور بے فیض دوستی کے اس دور میں خان فولادی کی دوستی کم از کم اس اعتبار سے لائق تحسین ہے کہ اپنی پسند کی موت کا انتخاب کرنے میں اس دوستی نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ میں خان فولادی کی دوستی کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔

پیارے شہزادے! تم نہ تو کبھی میرے نام نہاد دوستوں کی بھیڑ میں شامل ہوئے اور نہ ہی تم نے کبھی جھوٹ موٹ اپنی دوستی کا دم بھرا۔ پھر بھی تم میرے لیے ایک مسیحا بن کر آئے۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے میں جس ہمت، جس حوصلے کی منتظر تھی وہ مجھے تم ہی سے ملا۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑی اور کڑی کوئی سزا نہیں کہ اسے صرف عورت سمجھا جائے۔ ایک ایسی عورت جس پر جس نے نگاہ ڈالی بری نگاہ ڈالی۔ میری بدبختی نے مجھے کبھی ماں بننے نہیں دیا۔ اور مردوں کی اس بھیڑ میں کسی نے مجھے بہن نہیں سمجھا۔ چنانچہ میں نے انتقاماً خود کو آج کی قلوپطرہ سمجھ لیا اور بوالہوس مردوں کی ہولناک آندھی میں تنکے کی مانند بہہ نکلی ـــــ لیکن ابھی کچھ دیر پہلے میرے شہزادے! تم نے آج کی اس نام نہاد قلوپطرہ کو جسے ساری دنیا صرف ایک عورت سمجھتی ہے ایک ایسے سرور سے روشناس کرایا کہ اس عورت پر چڑھا قلوپطرہ کا جھوٹا ملمع پگھل گیا۔ تم نے اپنی بھابی سے میرا موازنہ کر کے میرے اندر برسوں سے سوئے ہوئے ممتا کے جذبے کو جگا دیا۔ تم نہیں جانتے۔ تم نے مجھے ذلالت اور ہوس کی کی پستیوں سے تقدس کی کن بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اب ان بلندیوں سے نیچے آنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں اس مقدس مقام کو پا کر اب کھونا نہیں چاہتی، اس مقام کو پانے کے لیے میں ایک زندگی تو کیا ہزاروں زندگیاں اگر میرے اختیار

میں ہوتیں تو انہیں بھی قربان کر دیتی - یہ احساس ہی میرے لیے حد فرحت بخش ہے کہ میں کم از کم تمہارے تصوّر میں ایک بھائی کے مقدس روپ میں محفوظ رہوں گی۔ آخر میں میرے شہزادے تم سے یہی التجا ہے کہ نادانستہ طور پر تم نے مجھے جن بلندیوں پر پہنچایا ہے مجھے وہیں رہنے دینا ــــــ

خدا کرے میری یہ آخری تحریر کسی طرح تم تک پہنچ جائے۔

اچھا میرے شہزادے الوداع

(مرحومہ) نادرہ

نوٹ: شاید میں دنیا کی پہلی عورت کہلاؤں گی جس نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے نام کے ساتھ مرحومہ کا لفظ لکھا ہے۔

...... خط کی تحریر ختم ہو چکنے کے بعد بھی ہم اس طرح ساکت و جامد بیٹھے رہ جاتے ہیں جیسے فرشتۂ اجل نے اچانک ہمارے جسد خاکی میں سے روح سلب کر لی ہو ــــــ ہماری یہ زندہ بدست مردہ والی کیفیت اس وقت ختم ہوتی ہے جب طوطا پری کی آواز ہماری مردہ سماعت سے ٹکرا کر ہمیں جھنجوڑتی ہے۔ "شہزاد صاحب خط پڑھ کر میرا بھی بالکل یہی حال ہوا تھا - یوں لگا تھا جیسے کسی غیبی طاقت نے سانس کی نلی پر اپنا آہنی ہاتھ رکھ دیا ہو۔ تحریر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرحومہ نے موت سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ قبل اسے قلم بند کیا ہے ــــــ

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ــــــ" ہم اتنا ہی کہہ کر کہیں کسی خیال میں گم ہو جاتے ہیں۔

"کاش مرحومہ کا یہ خط بہت پہلے میرے ہاتھ لگا ہوتا! کم از کم ایک اور جان تو بچ جاتی ــــــ"

اس بار طوطا پری کی گمبھیر آواز میں ایک کپکپاہٹ سی شامل ہو جاتی ہے ــــــ

"خودکشی" نادرہ مرحومہ اور بے دھڑک مرحوم کی تقدیر بن چکی تھی ــــــ" ہم مرحومہ کے آخری خط کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہتے ہیں ــــــ البتہ بے دھڑک کی قربانی کم از کم ہم دونوں کے ذہنوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی ــــــ

"میں بے دھڑک کی اس قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا شہزاد صاحب!" طوطا پری بڑے ہی بلند حوصلے سے کہتا ہے ــــــ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بے دھڑک کے اس نیک منصوبے کو جس کا مرحوم نے صرف خواب دیکھا تھا اور جس کی تعبیر کے سلسلے میں آپ پہلا تعمیری قدم اٹھا چکے ہیں اس کی تکمیل تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میرے دن رات میری ساری توانائیاں یوں سمجھئے۔ اب اس مقصد کی تکمیل کے لیے وقف ہو چکی ہیں ــــــ" طوطا پری کے اس عزم مصمم پر ہم اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہیں ــــــ یہ شخص آج ہمیں ہمیشہ سے بہت بلند بہت پُر وقار دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی بلندی کے آگے طیران گاہ کی بلند و بالا عمارت بھی ہمیں ٹھٹھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہماری کار طیران گاہ کے ملازموں والے پارکنگ سیکشن میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں الوداعی قافلے کے تمام ممبر پہلے ہی سے منتظر ملتے ہیں

پھر ضابطے کی تمام کارروائیاں انجام باقی ہیں۔ اور پھر جدائی کے اذیت ناک مرحلے کا آخری لمحہ آن پہنچتا ہے ـــــ ایک بھیڑ ہے جس سے مصافحہ و معانقہ کرتے کرتے ہم آخر میں ایک بار پھر طوطا پری سے وداع لینے پہنچتے ہیں، مصافحہ و معانقہ کے دوران ہماری آنکھیں ملتی ہیں طوطا پری کی آنکھوں میں ابھی کچھ دیر پہلے ہم سے کیا ہوا وعدہ کچھ اور مستحکم نظر آتا ہے۔ اور اس استحکام کو مضبوطی عطا کرتا ہے ہمارا باہمی مصافحہ ـــــ!

● اچانک ایک نرم، ملائم دست نازک ہماری انگلیوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھنسا کر پیار سے ہاتھ کو بھینچ دیتا ہے ـــــ ہمارا ذہن تصوّرات کی آماجگاہ سے دوبارہ حال کی طرف لوٹ آتا ہے ـــــ شبو جو ہماری بغل والی سیٹ پر اب تک نیند میں گم تھیں بیدار ہو چکی ہیں۔ اور اب ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر ہمارے کندھے سے سر ٹکائی ہوئی ہیں۔ ہم گردن گھما کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہیں قبلہ چچا جو جب اب تک آنکھیں موندے غالباً یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے جاگ چکے ہیں اور اس وقت ان کے چہرے پر اطمینان کا ہلکا سا رنگ محسوس ہوتا ہے۔ بھیانک یادیں پیچھے رہ گئیں۔ ساتھ آگئے پرانے دوستوں، بچھڑے ہوئے رشتہ داروں سے۔ برسوں بعد ملنے کا دل خوش کن احساس ان کے سکون اور اطمینان میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ اسی پل ایئر ہوسٹس کی آواز ابھرتی ہے ـــــ تمام مسافروں سے گذارش ہے کہ اپنے اپنے fasten belts باندھ لیں۔ طیارہ چند ہی لمحوں میں بھارت کے سا نتا کروز ایرپورٹ پر اترنے والا ہے۔ شکریہ ـــــ!

شباب للت

میری جانِ محبت! جانِ عشرت اب اجازت دو
ملیں گے اِنشاء اللہ پھر سنیچر کو
ادھر آؤ تمہارے عارضِ رنگیں پہ کر دوں ثبت
میں اک رُخصتی بوسہ
اجازت دو
چلوں گا اب
ڈنر کا ہو چلا ہے وقت
"ایسے میں تمہارے شوہر نامی نہ آجائیں"
اجی ٹھہرو (مرے پیارے)
بھلا اتنی بھی کیا عجلت؟ چلے جانا
ابھی دس ہی بجے ہیں
اور وہ ایسے کہاں کے ہیں
کہ آدھی رات سے پہلے وہ گھر کو لوٹ آئیں گے
یہ سچ ہے جانِ من!
لوٹیں بھی وہ کیونکر ؟
سُنا ہے ان دنوں
ان کی مسز کوزی سے گاڑھی چھن رہی ہے
اور وہ دونوں
بہم شیر و شکر ہوکر
کلب میں پارکوں میں قہوہ خانوں میں
اکٹھے گھومتے دیکھے گئے ہیں
"کیا کہا تم نے؟ میرے پیارے
مسز کوزی ؟
ارے ہاں خوب یاد آیا مرے جانی،
میرے دلبر!
سُنہرے گیسوؤں والی
وہ ہرجائی حسینہ
جانِ من سچّی
بڑی بے شرم، بڑی بے شرم عورت ہے"

گڑبڑ حیدرآبادی

ہے ضرورت وزیرِ اعظم کی

مثلِ شیطان جس کی شہرت ہے
ہاتھ دینے کی جس کو عادت ہے
عیش و مستی سے جس کو رغبت ہے
جس کو جنتا سے سخت نفرت ہے
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

کالا دھندا ہی کام ہو جس کا
درج پولس میں نام ہو جس کا
مشغلہ ظلم عام ہو جس کا
نازی ہٹلر امام ہو جس کا
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

غنڈہ گردی کے فن میں ماہر ہو
قتل و غارت گری میں شاطر ہو
جس کا ہر ظلم، ظلم نادر ہو
وہ ہلاکو کی طرح جابر ہو
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

سرغنہ ہو وہ سارے غنڈوں کا
یار و دلدار شر پسندوں کا
اختیار اس کو چور دھندوں کا
دشمنِ جاں ہو نیک بندوں کا
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

وہ جو طاقتا کے گھر کا خادم ہو
برملا در اصل جس کا حاکم ہو
بے عمل ہو، اگرچہ عالم ہو
جو نہ اپنی خطا پہ نادم ہو
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

جو فسادات بھی کراتا ہو
ہندو مسلم کو جو لڑاتا ہو
بے گناہوں کے سر کٹاتا ہو
اور قاتل کو پھر بچاتا ہو
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

جس کو گھیرے ہوں روز و شب چمچے
چاپلوسی سے با ادب چمچے
جس کو کہتے ہوں اپنا رب چمچے
جس کے وزراء ہوں سب کے سب چمچے
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

آنکھ روشن مگر وہ اندھا ہو
کان سنتے ہوں پر وہ بہرا ہو
بول سکتا ہو پھر بھی گونگا ہو
چلتے پرزوں میں چلتا پرزا ہو
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

بات اُردو زباں کی جب آئے
برسرِ بزم اس کے گُن گائے
وقت، موقع اگر کوئی لائے
اس کی تائید سے مُکر جائے
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

کوئی بہرا تو کوئی نابینا
منہدم ایک گھر کا چوبینہ
چُن کے ایسی بنائے کابینہ
گندے انڈوں کا جیسے خاگینہ
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

چور ایسا کہ جو کفن بیچے
تن ہے کیا چیز اپنا من بیچے
ایسا مالی کہ جو چمن بیچے
تاجر ایسا کہ جو وطن بیچے
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

ابراہیم یوسف

ضرورت ہے ایک مُردے کی

['الف' اور 'لام' صوفوں پر ادب سے بیٹھے ہیں - ایک کونے میں 'عین' آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے - 'میم' بے حد پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے ہیں - کمرے پر مکمل سکوت طاری ہے - میم کمرے کے ایک دروازے کے پاس رُک کر بلند آواز سے]

میم : مسٹر 'سین' (دوسرے کمرے سے آواز "یس سر") ذرا یہاں آئیے (سین کمرے میں آتا ہے) ابھی ان لوگوں کا کچھ پتہ ہے۔

سین : کن لوگوں کا سر

میم : (کسی قدر برہم انداز میں) گویا آپ کو ہمارے پروگرام کا بھی پتہ نہیں ۔

سین : (ہاتھ میں لی ہوئی نوٹ بُک کے ورق پلٹتا ہے پھر ایک صفحہ کو غور سے دیکھ کر) جی آج تو کوئی انگیج منٹ نہیں ہے ۔

میم : اور تین دن پہلے کیا پروگرام تھا۔

سین : (پھر نوٹ بک کے ورق الٹ کر دیکھتے ہوئے) سر۔ آپ کو ایک قبرستان کا افتتاح کرنا تھا۔

میم : کیا ہم نے افتتاح کر دیا ؟

سین : جی نہیں ۔

میم : (بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر) ملاحظہ فرمایا آپ نے ۔ کس قدر غیر ذمہ داری ہے ۔ ہم تین دن سے اپنی مصروفیات چھوڑے ان کا انتظار کر رہے ہیں کہ اب آتے ہیں ' اب آتے ہیں اور ان کا پتہ نہیں آخر ہم ذمہ دار انسان ہیں ۔ ہماری کچھ ذمہ داریاں ہیں مصروفیات ہیں مگر جانے لوگوں کو کیوں احساس نہیں ہوتا (سین کی طرف دیکھ کر) جائیے اور ان کو اطلاع کر دیجیے کہ اب ہم مصروف ہیں ۔ قبرستان کا افتتاح نہ کر سکیں گے ۔

سین : یس سر

(دوسرے کمرے میں جاتا ہے)

میم : (ان لوگوں کی طرف دیکھ کر) کہیے آپ حضرات نے کیسے تکلیف فرمائی۔

الف : ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ ـــــ

میم : (بات کاٹ کر) تمہید کی ضرورت نہیں جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ دیجیے۔ میں آج کل بے حد مصروف ہوں۔

الف : میں عرض کر رہا تھا کہ

میم : جلدی عرض کر دیجیے (دروازے کے پاس جا کر) مسٹر سین اور کوئی وزیر تو نہیں ہے ۔

سین : دو حضرات اور انتظار کر رہے ہیں۔

میم : کہہ دیجیے کہ آج ملاقات نہ ہو سکے گی ۔ میں بے حد مصروف ہوں (پھر ان لوگوں کی طرف دیکھ کر) ہاں تو کیا فرما رہے تھے ۔

لام : ہم محلہ حجام پورہ کے رہنے والے ہیں ۔

میم : اچھا اچھا ۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ بڑا اچھا محلہ ہے۔

الف : ہم اپنی ایک تکلیف عرض کرنے حاضر ہوئے ہیں ۔

میم : تکلیف! کیسی تکلیف ؟ آپ کا محلہ تو ماسٹر پلان میں نہیں آیا۔

لام : فی الحال تو نہیں آیا ۔

میم : تو پھر قبل از وقت واویلا مچانے سے کیا فائدہ

الف : لیکن ہم ماسٹر پلان کے سلسلے میں حاضر نہیں ہوئے ہیں۔

میم : پھر کس سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔

سین : (کمرے میں آکر) سر میں نے انہیں فون کیا تھا۔ وہ لوگ آپ سے ملنے آرہے ہیں۔

میم : (غصے سے) آپ نے کہہ دیا ہوتا کہ ہم ان سے ملنا نہیں چاہتے ۔

سین : لیکن سر

میم : اچھا اچھا جائیے ۔ جونہی آئیں فوراً ہمارے پاس بھیجئے گا۔

سین : یس سر

(سین دوسرے کمرے میں جاتا ہے۔ میم پھر ان لوگوں کی طرف دیکھ کر)

میم : ہاں تو آپ حضرات فرما رہے تھے ۔

الف : (جس کے چہرے سے اکتاہٹ ظاہر ہو رہی ہے) محلے کی ڈیڑھ ہزار آبادی ہے ۔ اور اس میں صرف دو پبلک نل ہیں ۔

میم : بہت ہیں۔ اب حکومت ہر شخص کے لیے ایک ایک نل تو فراہم نہیں کر سکتی۔

الف : جی ہاں۔ صحیح ہے لیکن کم از کم اتنا تو ہو کہ ہر شخص کو ضرورت کے مطابق پانی مل سکے۔

میم : ضرورت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ ہر شخص کو اپنی ضرورتیں محدود کرنا چاہئے اور دوسروں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

لام : لیکن پانی کی ضرورت کوئی ایسی ضرورت تو نہیں ہے کہ

میم : دیکھیے یہ خالص معاشرتی مسئلہ ہے۔

الف : معاشرتی !

میم : آپ چاہیں تو ثقافتی کہہ سکتے ہیں۔

الف : ثقافتی !

میم : (کسی قدر برہم ہو کر) نہ یہ معاشرتی مسئلہ ہے اور نہ ثقافتی تو کیا یہ کوئی سیاسی مسئلہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسئلہ کو سیاسی کیوں بنا دیا جاتا ہے

الف : سر یہ نہ معاشرتی مسئلہ ہے اور نہ ثقافتی اور سیاسی ۔ بلکہ پانی کا مسئلہ ہے اور صرف پانی کا۔

سین : (کمرے میں آکر) سر۔ قبرستان کمیٹی کے چند

ارکان تشریف لے آئے ہیں اندر بھیج دوں۔

(میم گردن ہلا کر اجازت دیتے ہیں۔ سٹر سین کمرے سے چلا جاتا ہے۔ دو تین حضرات کمرے میں آکر میم کو سلام کرتے ہیں)

قاف : سر۔ ہم بے حد شرمندہ ہیں۔

میم : آپ تو ضرور شرمندہ ہیں۔ لیکن آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ ہم کس کرب میں مبتلا ہیں۔ ہم تین دن سے اپنے تمام انگیج منٹ منسوخ کرکے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

جیم : لیکن سر ہماری مجبوری پر بھی غور فرمائیے۔

میم : آپ بھی اپنی مجبوری بیان فرما دیجیے۔

قاف : بجا سر۔ ہر ہر اسپتال اور ہر ہر محلے میں کمیٹی کے ارکان مارے مارے پھر رہے ہیں مگر۔۔۔۔۔

میم : مگر کیا۔

جیم : اس سات لاکھ کی آبادی میں تین دن سے کوئی موت ہی واقع نہیں ہوئی۔ کوئی مردہ ہی نہیں ملا۔

میم : گویا پورے سات لاکھ انسانوں نے آب حیات پی رکھا ہے۔

جیم : جی اب کیا عرض کیا جا سکتا ہے۔

میم : جی ہاں آپ کیا عرض کریں گے۔ اگر یہی حالت رہی تو حکومت کا جو روپیہ اس قبرستان کو بنانے اور سنوارنے پر صرف ہوا ہے کیا بیکار نہیں جائے گا۔ پہلے تو قبرستان، قبرستان کی رٹ لگائی جا رہی تھی جب قبرستان تیار ہو گیا تو مردہ نہیں ملتا

(سب خاموش رہتے ہیں) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قبرستان کو آباد کرنے کے لیے مردے بھی امپورٹ کئے جائیں گے۔

قاف : جی نہیں۔ بھلا حکومت کیا کیا امپورٹ کرے گی اور پھر مردے۔ ان پر زر مبادلہ کیسے صرف کیا جا سکتا ہے۔

(صاد کمرے میں بے حد تیزی سے داخل ہوتا ہے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی ہے۔ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان قاف کی طرف دیکھ کر)

صاد : بھائی صاحب۔ بھائی صاحب۔ کریم میاں مر گئے۔ مبارک ہو۔

قاف : خدا کا شکر و احسان ہے کہ کم بخت تین دن سے سانسیں گن رہے تھے۔ آخر سانس آنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

الف : (کسی قدر نفرت سے) آپ لوگ انسان ہیں یا۔

قاف : (اس بات پر دھیان نہ دے کر) قبر تین دن پہلے سے تیار ہے۔

جیم : میں تو سوچ رہا تھا کہ دیکھیں یہ قبر کس خوش قسمت کے نصیب میں لکھی ہے۔ نئے قبرستان کا پہلا مکیں ہونے کا شرف کسے حاصل ہوتا ہے۔

میم : خدا کس کو کس حد تک نوازتا ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا (قاف کی طرف دیکھ کر) ہاں صاحب تو اب آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔

قاف : قبرستان کے شایان شان دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا جائے گا۔۔۔۔

عمائدین شہر کو دعوت نامے بھیجے جا چکے ہیں۔

غسال اور گورکن کو پہلا مردہ دفن کرنے پر جوڑے آپ کے دست مبارک سے تقسیم کیے جائیں گے۔

میم: ٹھیک ہے۔ اس مبارک موقع پر ان بے چاروں کو بھی کچھ ہونا چاہیے۔

قاف: (صاد کی طرف دیکھ کر) اب آپ تشریف لے جائیے قبرستان میں ٹینٹ اور لاؤڈ اسپیکر نصب کرائیے (صاد دروازے کی طرف جاتا ہے) اور ہاں ذرا ٹینٹ وغیرہ دیکھ لیجیے گا۔ بعض لوگ بیہودہ قسم کا جونا پرانا ٹینٹ لاکر لگا دیتے ہیں اور ہار پھول کا تو انتظام ہو گیا ہوگا۔ (صاد گردن ہلاتا ہوا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ قاف میم کی طرف دیکھ کر) پہلے آپ قبرستان کا سنگ افتتاح جی نصب فرمائیے جس پر آپ کا اسم گرامی کندہ ہے۔ پھر آپ کی قبرستان کی افادیت پر ایک مختصر تقریر ہوگی۔ غسال اور گورکن کو جوڑے تقسیم کیے جائیں گے اور تدفین عمل میں آئے گی اور ہاں ایک سنگ مزار بھی تیار ہے جس پر تحریر ہے "یہ اس شخص کی قبر ہے جسے خوش قسمتی سے اس خوب صورت قبرستان کا پہلا مکیں ہونے کا شرف حاصل ہوا۔"

میم: مکمل اور جامع پروگرام ہی نہیں بلکہ آپ نے جزدیات یک کا خیال رکھا۔

جیم: قاضیٔ شہر نماز جنازہ پڑھائیں گے۔ قبرستان کمیٹی کے صدر اور آپ قبر میں اتر کر۔ . .

میم: (گھبرا کر) جی میں قبر میں . . . .

جیم: جی ہاں ارکان کمیٹی کی دلی تمنا ہے کہ پہلے آپ قبر میں اتریں۔ اس سے قبر کا وقار بڑھ جائے گا۔

میم: (گھبرا کر) دیکھیے میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ مجھ پر دورہ پڑ سکتا ہے اور ویسے بھی رقیق القلب ہوں

الف: (جو بور ہو رہا ہے) سر آپ کو قبر میں ضرور اترنا چاہیئے۔ اس سے قبر کا افتتاح بھی ہو جائے گا اور قبر میں اتر کر پاکیزگی نفس کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔ (میم بہت غصے سے الف کو دیکھتا ہے اور برا سا منہ بناتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ الف جیم کی طرف دیکھ کر) کیوں صاحب وہاں پانی کا بھی کچھ انتظام ہے۔

جیم: جی ہاں کیوں نہیں۔ ایک بڑا سا حوض وضو وغیرہ کے لیے تعمیر کیا گیا ہے —— قبرستان میں گیارہ نل لگائے گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ناکافی ہیں۔

لام: ناکافی!

جیم: جی ہاں۔ شاید اتنے ہی نلوں کی اور ضرورت پڑے روشوں کے دونوں جانب پھلواری لگوائی جائے گی ہر قبر پر گلابوں کا جھنڈ ہوگا ان سب کے لیے پانی کی ضرورت ہوگی۔ ہمارا ارادہ قبرستان کو جنت کا نمونہ بنا دینے کا ہے۔

الف: اسکیم تو قابل تعریف ہے۔ خدا یہ قبرستان آپ کو مبارک کرے۔

میم: (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) اپنی بیگم سے کہہ دوں گا کہ مردہ مل گیا ہے وہ بھی تیار رہیں۔

الف: جی تیار رہیں۔ کیا وہ بھی اس قبرستان میں ——

میم: جی ہاں —— جی کیا فرمایا آپ نے۔ اجی صاحب وہ بھی اس خوب صورت فنکشن میں شرکت کرنا چاہتی ہیں۔

الف: اُوہ میں سمجھا تھا شاید —— جی ہاں ضرور شرکت کریں۔ قبرستان کی رونق بڑھ جائے گی۔

(میم دوسرے کمرے میں جاتے ہیں۔ قاف جیم کی

طرف دیکھ کر)

قاف : عجیب اتفاق ہے تین دن سے شہر میں کوئی موت ہی واقع نہیں ہوئی۔

جیم : ہوئی کیوں نہ ہوگی۔ اپنے ارکان کمیٹی بھی تو ایک نمبر کے کاہل ہیں۔ بس ہوٹلوں بیٹھ کر آجاتے ہیں۔ اور کہہ دیتے ہیں کہ کوئی نہیں مرا۔

قاف : جی ہاں ہو سکتا ہے مگر پھر بھی دیکھئے کل میں نے اپنے ٹرک ڈرائیور کو شراب پلا کر ٹرک حوالے کر دیا۔

جیم : شراب پلا کر!

قاف : جی ہاں سوچا تھا کوئی ایکسیڈینٹ کر دے گا۔ مگر کم بخت صاف بچا تا ہوا نکال لے گیا۔

جیم : آپ کا ڈرائیور ایک نمبر کا پیکڑ ہے گھونٹ دو گھونٹ سے کیا ہوتا ہے۔

قاف : گھونٹ دو گھونٹ کیا معنی صاحب۔ بھرے کی دو بوتلیں مگر شیر مادر کی طرح ہضم کر گیا یہ کم بخت پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

جیم : یہ بھی اتفاق ہے مگر جناب یہ ماننا پڑے گا کہ صاحب ہیں بڑے نیک اور سادہ لوح۔

الف : جی ہاں جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ اب دیکھئے نا تین دن سے بیٹھے مردے کا انتظار کر رہے ہیں۔

جیم : جی ہاں۔ ابھی میونسپل کے نو تعمیر پیشاب گھر کا افتتاح کیا تھا۔ حاجت نہ ہوتے ہوئے بھی پبلک کے اصرار پر دو چار قطرے ٹپکا ہی دیئے۔ خدمت خلق کا بے حد جذبہ ہے۔

الف : جی ہاں واہ پیشاب کے دو چار قطرے۔ کمال ہے اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت خلق ہو سکتی ہے۔

جیم : (کسی قدر گھبرا کر) صاحب آپ بھی عجیب ہیں میں اتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ (صاد ایک نوجوان کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ جیم صاد کی طرف دیکھ کر) کیسے انتظام ہو گیا (نوجوان کی طرف اشارہ کر کے) آپ کی تعریف

صاد : آپ کریم میاں کے بڑے صاحبزادے ہیں۔

جیم : (پرجوش انداز میں مصافحہ کر کے) بڑی خوشی ہوئی۔ آپ سے مل کر ——— بخدا آپ بہت خوش قسمت ہیں۔

نوجوان : (جیم کو غور سے دیکھ کر) جی ہاں باپ کے مرنے سے بڑھ کر اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔

جیم : میاں صاحب زادے باپ سب کے مرتے ہیں مگر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

نوجوان : وہ تو میں کر لوں گا مگر اس قبرستان میں اپنے باپ کو دفن کرنا نہیں چاہتا۔

قاف : ارے کیا فرما رہے ہیں آپ۔ بخدا میت کی عزت دوبالا ہو جائے گی۔ ہم نے وہ شاندار انتظام کیا ہے کہ لوگ برسوں یاد رکھیں گے بلکہ مرنے کی تمنا کریں گے۔ اور آپ انکار فرما رہے ہیں۔

نوجوان : والد صاحب کی وصیت تھی کہ ان کو آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے۔

جیم : لاحول ولا قوۃ۔ بڑی واہیات وصیت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ وصیت کیوں کرتے ہیں اور وہ بھی اس قدر واہیات وصیت۔

قاف : میاں صاحبزادے یہ وصیتیں آوٹ ڈیٹڈ چیزیں ہیں۔

نوجوان : دیکھئے صاحب میں ہمیشہ اپنے باپ کی نافرمان اولاد رہا ہوں۔ اور ———

قاف : بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہر نوجوان کو ہونا چاہیئے۔ آپ قطعی ان کی وصیت پر عمل نہ کیجئے۔

نوجوان : لیکن ان کے مرنے کے بعد میں فرماں بردار ہو جانا چاہتا ہوں۔

جیم : مرنے کے بعد فرماں بردار! اجی صاحبزادے کیا فرما رہے ہیں آپ؟ یہ وضعداری کے خلاف ہے کہ آپ اپنی آن چھوڑ دیں۔

نوجوان : وضعداری، مضعداری آپ کی لغت کے الفاظ ہیں۔ میں تو وہی کرتا ہوں جو میرا جی چاہتا ہے (غصہ سے) آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔

جیم (کمرے میں آتے ہوئے) کیا بات ہے۔

قاف : (نوجوان کی طرف اشارہ کرکے) ان کے والد کا انتقال ہوگیا ہے اور یہ نوتعمیر قبرستان میں انہیں دفن کرنے کو تیار نہیں۔

نوجوان : جی ہاں قطعی تیار نہیں اگر آپ کو قبرستان آباد کرنے کی اتنی ہی فکر ہے تو خود شوق فرما لیجیے۔ جینڈ باجا میں لے آؤں گا۔

میم : آپ نوجوان ہیں آپ کو تو ترقی پسند خیالات رکھنا چاہیے۔

نوجوان : واہ صاحب۔ خوب۔ میرے باپ کی میت گھر میں پڑی ہے اور آپ مجھے ترقی پسند ہونے کی تلقین فرما رہے ہیں ——— میں جا رہا ہوں۔ (تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ صاد بھی جاتا ہے۔ میم بے حد ناامیدی اور مایوسی کے لہجے میں)

میم : ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یہ ہماری نوجوان نسل۔ حکومت سے تو تعاون کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ حکومت ان کے آرام و آسائش کا کتنا ہی خیال کیوں نہ رکھے مگر ان کا مزاج ہی دوسرا ہے۔ ہنہہ انہیں وہی ادبڑ کھابڑ تاریک اور گندہ قبرستان پسند ہے جہاں ایک ایک قبر میں ستر ستر نہیں ستر ستر ہزار مُردے کلبلا رہے ہیں۔ اور وہ قبرستان پسند نہیں جہاں روشنی ہے۔ پانی ہے روشیں اور پھول ہیں۔ سایہ دار درختوں کا انتظام ہو رہا ہے۔

الف : بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ زندوں کو چاہے رہنے کو مکان نہ ہوں مگر کم از کم شاندار قبرستان تو حاضر ہیں۔ اس قبرستان کی تعریف سن کر میرا جی بھی مرنے کو چاہنے لگا ہے اور بھی پانی کے گیا رہ نل۔ واہ واہ

قاف : آپ خاموش رہیے۔ آپ کی باتیں ناقابلِ فہم ہیں

میم : (سوچتے ہوئے۔ یہ قوم کی بدنصیبی ہے کہ۔

الف : قطعی بدنصیبی ہے کہ اسے قبرستان بلکہ شاندار قبرستان بھی پسند نہیں۔ بھلا اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہوگی۔

میم : (غصہ سے) مسٹر

الف : (اس کے غصہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے) میری ایک تجویز ہے۔

میم : (طنزیہ) وہ تجویز بھی ارشاد فرما دیجئے۔

الف : حجام پورہ کے دونوں نل بھی غائب کرا دیجئے۔ آپ کا شاندار قبرستان شاندار طور پر آباد ہو جائے گا بلکہ اس سے بھی شاندار قبرستان کی

ضرورت پڑ جائے گی۔

میم : (بے حد برہم انداز میں) فی الحال آپ تشریف لے جائیے ۔ آپ کو ذرا بھی احساس نہیں کہ میں کس قدر پریشان اور مصروف ہوں۔

الف : مگر حمام پورہ میں پانی۔

میم : آپ کو پانی کی فکر پڑی ہے اور مجھے مردے اور قبرستان کی۔ پھر کبھی تشریف لائیے گا۔

(الف اور لام اٹھکر چلے جاتے ہیں (میم غصہ سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے) لاحظہ فرمایا آپ نے ان حضرت کو۔ انہیں پانی کی تو فکر ہے مگر تالابوں اور کنوؤں سے پانی نہیں لا سکتے ۔ یہ لوگ اس قدر کاہل ہیں کہ چاہتے ہیں پانی کا نل ان کے منہ سے لگا دیا جائے اور انہیں ہاتھ پاؤں نہ ہلانا پڑے ۔ قوم کی یہ کاہلی جانے اسے کس گڑھے میں گرا سے گی۔ اونہہ ـــ پانی ـــ

(نظر ایک دم عین پر پڑتی ہے جو آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے) محترم بزرگ آپ تشریف نہیں لے گئے۔

عین : (چونک کر) جی میں دھوبی پورہ کا رہنے والا ہوں۔

میم : بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ مطالبہ فرمائیے کہ آپ کے محلے میں دھوبی گھاٹ بنوا دیا جائے قوم کے پاس مطالبوں کے علاوہ رہ ہی کیا گیا ہے

عین : میں دھوبی گھاٹ کے لیے حاضر نہیں ہوا ہوں۔

میم : پھر کس لیے حاضر ہوئے ہیں وہ بھی فرما دیجئے۔

عین : ہمارے محلے میں کوئی ڈسپنسری نہیں ہے ۔ معمولی معمولی بیماریوں کے لیے سول لائن کی چار ڈسپنسریوں میں سے کسی ایک میں جانا پڑتا ہے جو ڈھائی میل دور ہیں۔

میم : (طنزیہ) آپ کے محلے میں بھی ڈسپنسری قائم کردی جائے کہ آپ ڈھائی میل جانے سے بچ جائیں۔

عین : جی ہاں ۔ اس سے وقت بھی بچے گا اور ـــ

میم : (بات کاٹ کر) کیوں نہ ہر گھر میں ایک ڈسپنسری قائم کردی جائے کہ آپ کو شطرنج کھیلنے کا پورا وقت مل جائے ۔

عین : جی نہیں کم از کم ـــ

صاد : (دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوکر) ہوگیا ۔ ہوگیا۔

قاف : (خوش ہوکر) کیا نوجوان راضی ہوگیا۔

صاد : جی نہیں ـــ بلکہ ایکسیڈینٹ ہوگیا۔

جیم : بخدا

صاد : میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ اسکوٹر اور بس کی ٹکر۔ اسکوٹر والے کا ایک ہاتھ اور پاؤں غائب ۔

(ٹیلیفون سے گھنٹی بجتی ہے ۔ میم رسیور اٹھاکر)

میم : ہو ـــ بیگم صاحب بات کرنا چاہتی ہیں ۔ اچھا کہئے ـــ نہیں نہیں بھئی لڑکی کا قبرستان میں جانا ٹھیک نہیں ۔ اس پر کوئی خوش گوار اثر نہیں پڑے گا ـــ اب بچے تو ضد کرتے ہی ہیں ـــ آپ کون سی ساڑی ـــ نہیں نہیں سیاہ نہیں وہ آپ کے رنگ سے میچ نہیں کرتی ـــ غم کا مرقع ہے ـــ اچھا اچھا وہی پہن لیجئے ـــ (رسیور رکھتا ہے ۔ پھر اسے اٹھاکر) ہلو مسٹر سین ۔ اسپتال سے معلوم کیجئے کہ جس شخص کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اس کے بچنے کی تو کوئی امید نہیں ۔

(ریسیور رکھ دیتا ہے۔)

صاد : بچے کی اِسرین نے اپنی آنکھ سے ایکسیڈنٹ ہوتے دیکھا ہے۔ بیس منٹ تک بس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا تھا۔

قاف : ارے صاحب اس کا خیال نہ کیجیے یہ کم بخت اس قدر سخت جان ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔

سین : (کمرے میں آکر) سر آپریشن ہو رہا ہے ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

میم : ہر پانچ منٹ کے بعد تازہ معلومات حاصل کیجیے۔

سین : (کمرے سے جاتے ہوئے) بہت اچھا۔

میم : (صاد کی طرف دیکھ کر) جی آپ کیا فرما رہے تھے۔

صاد : میں عرض کر رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ اس قدر سخت تھا کہ بچنا تو بچنا مرنے کے بعد اس کے بھوت بننے تک کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔

میم : بھوت! جناب جو سڑکوں پہ ایسے ایکسیڈنٹ کریں وہ زندگی ہی میں بھوت ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد کون سے بھوت ہوں گے۔

سین : (کمرے میں آکر) سر اس کا ایک ہاتھ اور پاؤں بدن سے جدا کر دیا گیا ہے۔

میم : کیوں۔ ہاتھ پاؤں کاٹ کر بھی اسے زندہ رکھنے کا ارادہ ہے ـــــ (سین واپس جاتا ہے) یہ ڈاکٹر بھی اپنی واہ واہی کے لیے ایسے ناکارہ لوگوں کو بچا لیتے ہیں۔

قاف : بالکل بجا فرمایا اور اچھے خاصے موٹے تازے انسانوں کو مار کر کہہ دیتے ہیں۔ ہارٹ اٹیک ہو گیا۔

صاد : میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسے بچا نہیں سکتے۔ ہاتھ پاؤں تو کیا اس کی گردن ہی کیوں نہ کاٹ ڈالیں۔

صاد : (گھبرا کر) میرا مطلب ہے وہ اسے بچا نہیں سکتے۔

جیم : کاش وہ اس کی گردن ہی کاٹ ڈالتے۔

سین : (کمرے میں آکر) سر رپورٹ ہے کہ اس کی نبض نارمل ہوتی جا رہی ہے مگر ابھی خطرہ دور نہیں ہوا۔

میم : تو یہ خطرہ جلد قریب تر کیوں نہیں ہو جاتا۔ اس قدر سخت جانی کی کیا ضرورت ہے۔

(سین دوسرے کمرے میں جاتا ہے)

قاف : سنبھالا لے رہا ہوگا۔ موت سے پہلے عام طور پر زندگی کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

میم : یہ سنبھالا زندگی کا بہانہ بھی بن سکتا ہے۔ (عین کی طرف دیکھتا ہے جو دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہا ہے) حضور آپ کس کی موت کی دعا فرما رہے ہیں (عین میم کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ میم برہم ہو کر) میں آپ سے مخاطب ہوں۔ (عین آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتا ہے) آپ کس کی موت کی دعا مانگ رہے ہیں۔

عین : میں موت کی نہیں زندگی کی دعا مانگ رہا ہوں۔

میم : آپ کی عمر اسی برس سے کم نہیں آپ کو اب اور زندگی کی تمنا ہے۔

عین : میں اپنے لیے دعا نہیں مانگ رہا۔

میم : تو پھر کس لیے دعا فرما رہے ہیں۔

عین : اس نوجوان کے لیے جس کا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالا گیا ہے۔

میم : عجیب نامعقول ہیں آپ بھی۔ ایک اپاہج کی زندگی

کے لیے دعا۔

عین : زندگی موت سے بہرصورت بہتر ہے۔ اس دنیا کا چمکتا ہوا سورج قبر کی تاریکی سے بدرجہا خوب صورت ہے۔

(عین اس طرح آنکھیں بند کرلیتا ہے جیسے مراقبہ کررہا ہو۔)

میم : حضرت۔حضرت۔(عین آنکھیں نہیں کھولتا۔ میم غصّے سے) اے مسٹر میرا گھر خانقاہ نہیں ہے کہ جہاں آپ مراقبہ فرمائیں (عین آنکھیں بند رکھتا ہے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھ کر) ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ ایسے لوگ اپنی دعاؤں سے دنیا کو اپاہجوں کی بستی بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

صاد : یہ لاکھ خدا کے سامنے گڑگڑائیں اب خدا ان کا فرماں بردار ہے نہیں کہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔

سین : (کمرے میں آکر) رپورٹ ہے کہ ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔

قاف : (گھبراکر) ففٹی ففٹی۔کیا مطلب؟

سین : وہ مر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

(سین دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے)

عین : (آنکھیں کھول کر) زندگی موت سے لڑ رہی ہے، روشنی تاریکی پر غالب آکر رہے گی۔

میم : اے مسٹر۔اے مسٹر۔ (غصہ اور طنز سے) اے خدا کے برگزیدہ بندے اپنی چونچ بند رکھو۔

جیم : یہ حضرت یہاں کیوں پڑے ہیں۔ جمالی ہیں صورت سے قبر کے مردے معلوم ہوتے ہیں اور باتیں زندگی کی کررہے ہیں۔

قاف : خود کو ولی اللہ ظاہر فرمارہے ہیں۔ بخدا ایسے رنگے سیاروں نے ہی دنیا کو جہنم بنادیا ہے۔

(سین کمرے میں آکر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے)

سین : سر۔ وہ شخص ــــ وہ شخص ــــ

میم : مرگیا۔ بولتے کیوں نہیں۔

سین : اب خطرے سے باہر ہے۔

میم : لاحول ولاقوۃ۔ (سین سے) ہیلتھ منسٹر کو فون ملاؤ میں ان اپاہجوں کی قوم بنانے والے ڈاکٹروں کو سسپینڈ کراکے رہوں گا۔

سین : (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) یس سر

عین : (آنکھیں کھول کر) کیا ہمارے محلے میں ڈسپنسری

میم : جی کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ ہر ہر گھر میں ڈسپنسری قائم کی جائے گی تاکہ اپاہجوں اور موت کی ہچکیاں لیتے ہوئے ایک قوم موجود رہے۔ قبر میں لوگ پاؤں لٹکائے بیٹھے رہیں اور نیچے اُترنے کا نام نہ لیں۔

سین : (کمرے میں آکر) سر! ہیلتھ منسٹر ٹور پر گئے ہیں۔

میم : میں ماہانہ میٹنگ میں یہ مسئلہ اٹھاؤں گا کہ ڈاکٹروں کو سخت سزائیں دیں جو ایسے ناکارہ اور اپاہج لوگوں کی جانیں بچاتے ہیں۔ اور صحت مند لوگوں کے راشن میں حصہ دار بناتے ہیں۔

قاف : یقینی یہ مسئلہ اٹھایا جانا چاہیے۔

میم : اور پی ڈبلیو ڈی منسٹر سے کہوں گا کہ وہ ملٹی اسٹوری بلڈنگ کی تعمیر بند کرکے اپاہج خانے تعمیر کریں۔ (قاف کی طرف دیکھ کر) جائیے جلدی سے کوئی مردہ تلاش کیجیے۔

قاف : بہت بہتر۔ (میم لڑکھڑاکر پہلے قاف کو پھر صوفے کی پشت کو پکڑنا چاہتا ہے) سر۔ سر کسی کے سہارا دینے سے پہلے فرش پر گر جاتا

ہے۔ شتاق سین کی طرف دیکھ کر) شاندار ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ جلدی ڈاکٹر کو فون کیجئے۔
(سین دوڑ کر دوسرے کمرے میں جاتا ہے۔ میم بیٹھی بیٹھی
ھوں سے چاروں طرف دیکھتی ہے۔ ہاتھ پاؤں اکڑتے ہیں اور پھر ایک دم ڈھیلے پڑجاتے ہیں)
(پردہ)

تیارکشا

صبغۃ اللہ بھاٹ

◉

مارکیٹ پر کھڑے ہوئے تھے ہم
اور کوٹھی ہمیں پہنچنا تھا

ایسی جلدی میں دُور سے ہم کو
ایک رکشہ نظر پڑا جس کو

ہم نے ٹھہرایا اور پوچھا بھئی
کوٹھی چلنا ہے بولو کیا لوگے

رکشہ راں نے کہا مرے سرکار
ہم تو ہیں آپ کے ہی خدمت گار

لیکن اک بات پوچھنی ہے ضرور
کون سے درجے میں چلیں گے حضور

کونسے درجے میں ہے بات عجب
رکشہ میں درجہ بندی کیا مطلب

اتنا جلدی خفا نہ ہو سرکار
سُن تو لیجے گا عرض خدمت گار

ریل میں ہیں حضور درجے تین
رکشہ میں بھی وہی ہیں کیجے یقین

پہلے درجے میں گر چلیں گے آپ
میں چڑھاؤں گا سب سے پہلے ٹاپ

سیٹ کو کپڑے سے کروں گا صاف
تاکہ میں خود سے کرسکوں انصاف

تب سواری کو میں بٹھاؤں گا
پھول کی طرح لے کے جاؤں گا

ہو سڑک کھردری تو آہستہ
تیز تر صاف ہو اگر رستہ

دل لگے آپ کا تو گاؤں گا
فلمی گانے بھی میں سناؤں گا

راستے میں کوئی حسینہ ملے
رکشہ بس اس کے ساتھ ساتھ چلے

جیسے قدموں سے جڑ گیا رکشہ
وہ مڑی اور مڑ گیا رکشہ

دوسرے درجہ میں چلیں گر آپ
آپ کو خود چڑھانا ہوگا ٹاپ

سیٹ کو صاف کرنا ناممکن
خود سے انصاف کرنا ناممکن

ٹاپ ہو بند یا کھلی چلیے
سڑک اچھی ہو یا بری چلیے

اپنی ہی دھن میں چلتا جاؤں گا
گنگناؤں گا میں نہ گاؤں گا

لاکھ آئیں حسین رستے میں
تو کہیں بھی مہ جبین رستے میں

رکشہ میرا نہیں رکے گا جناب
چاہے رک جائیں راوی اور چناب

تیسرے درجہ میں ہو قصد سفر
آئیے بیٹھئے اگر نہ مگر

بیٹھتا ہوں چڑھا کے میں خود ٹاپ
رکشہ لیکن چلائیں گے اب آپ

سرّیٹ حیدرآبادی

غزل

بھٹکتے ہیں جہاں آکر مسافر، میں وہ منزل ہوں
سفینے غرق ہوتے ہیں جہاں آکر وہ ساحل ہوں

جہاں جاہل ہیں جاہل ہوں، جہاں قابل ہیں قابل ہوں
میں گویا بیچ ادھر بہتے ہوئے دونوں میں شامل ہوں

حقیقت ہے کہ کل سونا تھا لیکن آج کتھل ہوں
جو میرے در کے سائل تھے میں ان کے در کا سائل ہوں

میری تنویر پھیلاتی ہے تاریکی زمانے میں
فلک پہ مہملاتِ زندگی کا ماہ کامل ہوں

کیا ہے حُسن نے بھی ناز اکثر میری اُلفت پر
مگر اب درمیانِ حُسن و اُلفت حدِ فاصل ہوں

میں کارآمد ہوں لیکن کہتے ہیں وہ مجھ کو ناکارہ
وہاں جاؤں تو میں کیوں جاؤں جس محفل میں کینسل ہوں

یہاں چلتے ہیں روز و شب میرے احکام فُل پاور
میں اپنی محفلِ خود ساختہ کا صدرِ محفل ہوں

میں کب تک یوں ہی ٹالوں گا سمجھ میں کچھ نہیں آتا
میرے قابل ہے آخر کون، میں خود کس کے قابل ہوں

جہاں میں دوستوں کے واسطے ہوں چورن ہاضم
وہیں میں دشمنوں کے واسطے معجونِ مسہل ہوں

کئی شاعر [illegible] میرے ادھمڑے پن پہ عاشق ہیں
بہت ایسے ہیں، میں جن کے لئے تحصیلِ حاصل ہوں

جہاں بھی دوڑ ہوتی ہے نظر آتا ہوں وِن سرّیٹ
جدھر بھی دیکھتا ہوں میں ہی خود اپنے مقابل ہوں

اَن پڑھ بھونگیری

دو چوّے ---- ایک غزل

کرتے تھے باپ دادا ترے، استعمال کر
گانجے کے کش میں موڈ کو اپنے بحال کر
جورو کی گھر میں جھڑکیاں، دفتر میں باس کی
اچھا ہے ایسے جینے سے اب انتقال کر

O

مصروف ہے میک اَپ میں ہر اک شخص الٰہی
فیشن کی ہوا کیسی زمانے میں چلی ہے
سمجھا تھا جسے دُور سے بھرمار کا کندہ
نزدیک سے دیکھا تو تھری ناٹ تھری ہے

نقد ہو یا اُدھار ہے کہ نہیں
میری قسمت میں کار ہے کہ نہیں

شاعری کر تو بعد میں پہلے
دیکھ گھر میں جوار ہے کہ نہیں

لطف آتا نہیں ہے پینے میں
دیکھ چیڑوے میں کھار ہے کہ نہیں

گھر میں بیٹی جوان ہے جس کی
اُس کے سینے پہ بار ہے کہ نہیں

بعد شادی کے چل دیئے فادر
ان کا دل بے قرار ہے کہ نہیں

مجی کمال صاحب تسلیم۔

شگوفہ، باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ ممنون ہوں۔ اتنی
ت سے مل رہا ہے اور پڑھ رہا ہوں کہ گویا روزمرہ کی زندگی
جز بن گیا ہے۔ محمد خاں کی سرگزشت / سفرنامے کا سلسلہ چھاپ
آپ نے شگوفہ کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ مزاح نگار
یا کر کوئی مزاحیہ لکھ بھیجوں سوائے داد و ستائش کے آپ کے
ہجم خاص کا کیا بدل ہو جو آپ برابر شگوفہ ارسال فرمایا کرتے
(اس بار یوسف ناظم کا نذلیہ مقالہ بہت ہی خوب صورت ہے)
جی چاہتا ہے کہ شگوفہ اور بھی دلچسپ اور دل نواز ہو
ئے۔ اس کے لیے کچھ تجاویز لکھ رہا ہوں:

(۱) ہندوستان اور پاکستان کے جرائد سے منتخب مزاحیہ تحریریں، بالخصوص روزناموں کے مزاحیہ کالم
(۲) ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے اردو مزاحیہ پروگراموں کا انتخاب۔
(۳) مہینے بھر کے بہترین کارٹونوں کا انتخاب
(۴) انگریزی اور دوسری زبانوں کے مزاحیہ ادب کے دو چار منتخب نمونے۔ پرانے بھی نئے بھی مثلاً تحریر وغیرہ۔
(۵) مزاح نگاروں میں ہر شمارے میں کسی ایک مزاح نگار
مضمون اور ان کی تحریروں کا انتخاب ۔۔۔ شوکت تھانوی
شفیق الرحمٰن صدیقی، فرحت اللہ بیگ، مخلص۔ سندباد جہازی
یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، محمد خاں، ابن انشاء
وغیرہ کی تصویریں بھی ضرور شائع کریں۔
(۶) دوسری زبانوں کے مزاح نگاروں کا تعارف
مثلاً تامل سے چو کا تعارف
(۷) حیدرآباد اور اہم ادبی مراکز کے واقعات اور شخصیات کا مزاحیہ احوال۔

(ڈاکٹر) محمد حسن پالی

پرسوں اخبار سیاست کے ذریعہ جب یہ اطلاع
ملی کہ ماہ نومبر میں بارہویں جشن سالانہ کی تیاریاں پورے
زور و شور سے شروع ہو چکی ہیں تو دل نے کہا کہ کاش میں
بھی اس جشن میں شرکت کر سکتا اور اپنے دامن میں ہزاروں
زندہ دلی سے بھرپور قہقہے سمیٹ لاتا۔ لیکن حیدرآباد سے
واپس ہونے کے صرف دو ماہ بعد ہی پھر سے وہاں پہنچنا
ممکن نہیں ہے۔

ویسے ایک تازہ مضمون "امر سنگیت دھارا" "سووینر"
کے لیے ارسال کر رہا ہوں تاکہ اس طرح میں بھی بہ نفس نفیس
نہ سہی اپنی تحریر کے ساتھ زندہ دلوں کی محفل میں شریک
رہ سکوں۔

جشن کی کامیابی کے لیے نیک دعاؤں کے ساتھ۔

سید نصرت
کویت

شگوفہ ملا۔ مطالعہ کیا۔ خوشی کی انتہا نہ رہی یا یوں سمجھیے کہ
میری جوانی لوٹ گئی جو گرانی کی وجہ بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

محترم۔ واقعی پرچہ قابل تحسین اور لائق مبارک باد ہیں
جس نے اپنی کاوشوں سے خشک کھیتی کو سیراب کرنے کی
انتھک کوششیں کی ہیں۔

عالم تاج پوری
ضلع غازی پور یوپی
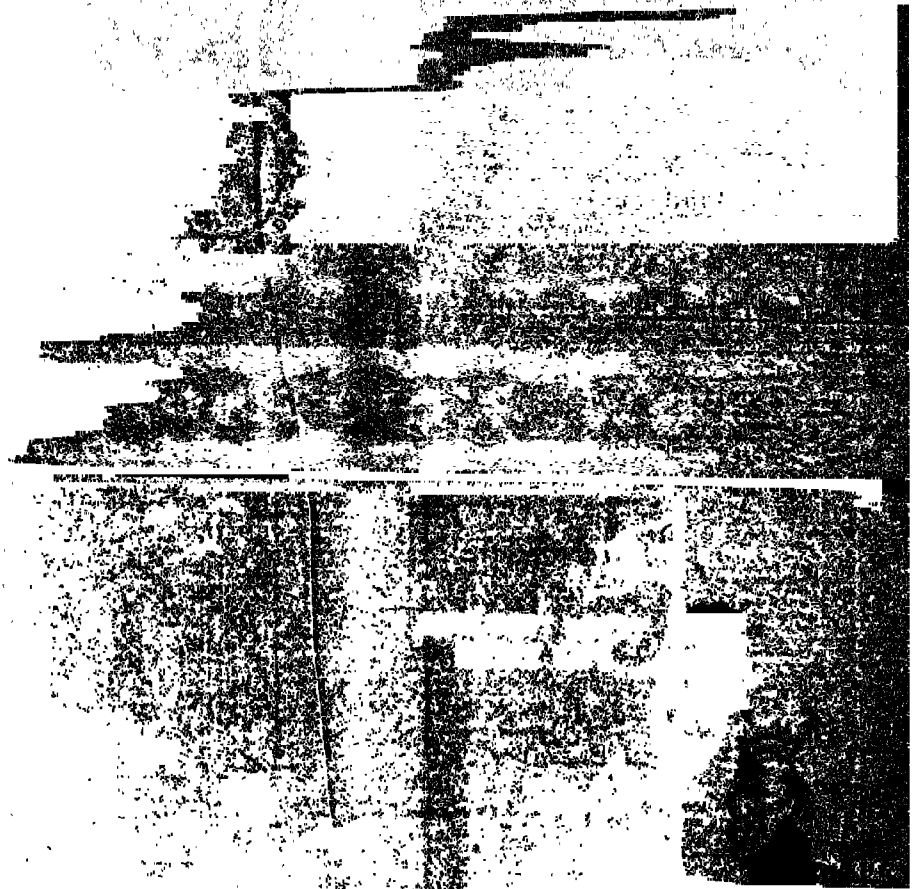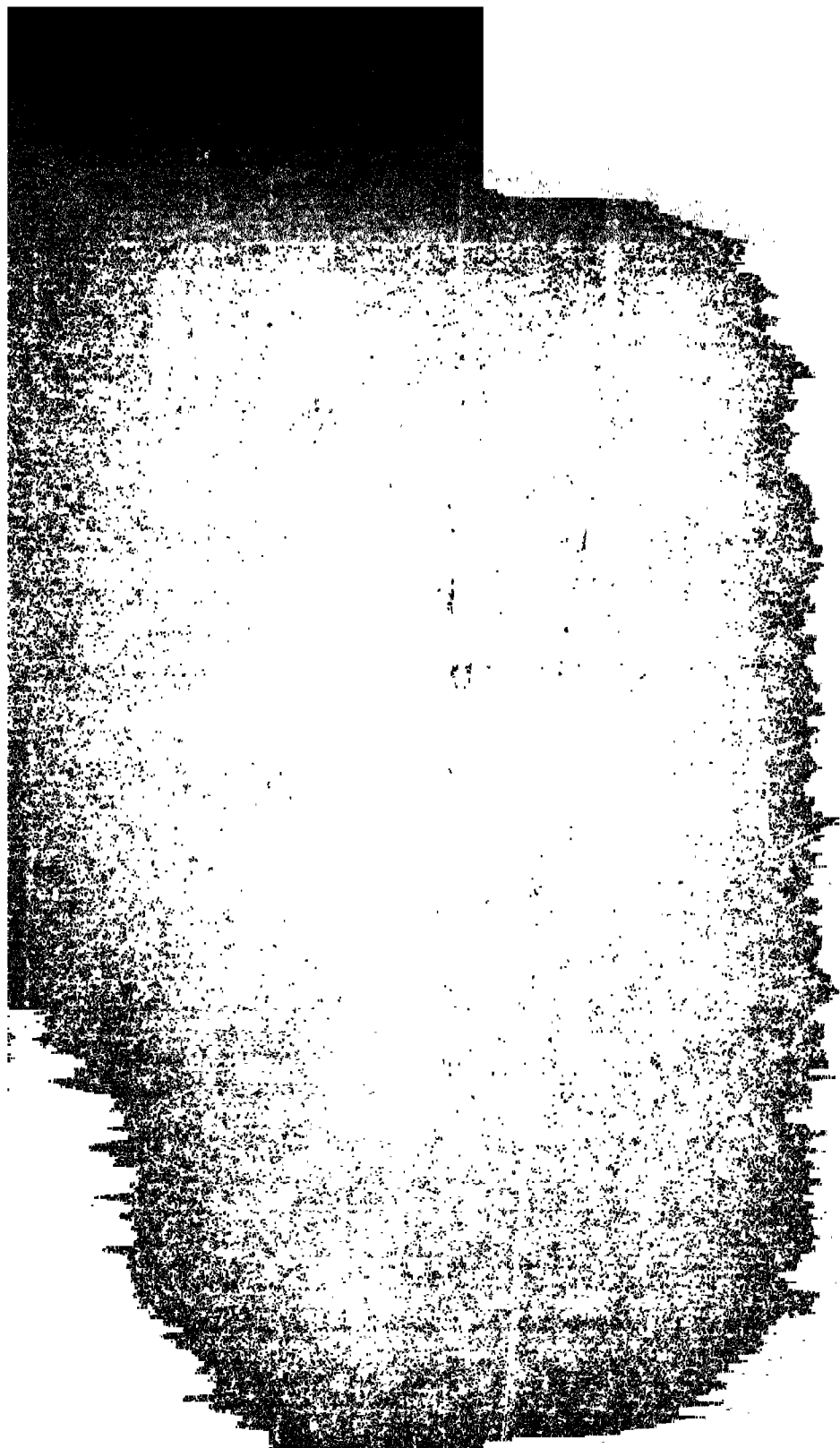
ایڈیٹر :
سید مصطفیٰ کمال
مجلس ادارت :
حمایت اللہ
مسیح انجم ، منظور احمد
مجلس مشاورت :
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبد الغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
تاشیل : شعیب

شگوفہ

دسمبر ۱۹۷۹ء
جلد : ۱۲
شمارہ : ۱۲
طباعت : سمیع جلیل ، جنرل منیجر : بشیر انور ، منیجر
سینڈیکیٹ پریس چھتہ بازار
برائے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
بائنڈنگ :
محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد

سالانہ :
۲۲ روپے
بیرون ہند سے
۳۵ شلنگ
فی پرچہ
۲ روپے

خط و کتابت کا پتہ :
۱۱ مجرد گاہ ،
معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون : 57716

RANCHHODDAS & SONS
INDIA
کشمیری قوام

اس تھالی کے چٹے بٹے

(فہرست)

وسط مدتی انتخاب

پھر اک نئے الکشن کا زمانہ آ گیا — پھر لیڈروں کے لب پہ جنتا کا ہے ترانہ
تقدیر کے جواری عشرت کدوں سے نکلے — کھلنے لگا سیاست کا پھر قمار خانہ
جلسے، جلوس، بھاشن، ہڑتال اور سلوگن — ہر فعل ابلہانہ ہر قول شاطرانہ
نیلام ہو رہی ہے جنتا کی پھر لنگوٹی — دن رات کھل رہا ہے چندوں کا کارخانہ
پھر نرم ہو رہا ہے نیتاؤں کا رویہ — پھر گرم ہو رہا ہے باتوں کا چانڈو خانہ
پھر مکر و زور اپنے جادو جگا رہے ہیں — افسونِ خوش مزاجی بنتا ہے پھر فسانہ
پھر بن رہا ہے کھٹے انگور کا مربہ — گڑ ڈالتی ہے اس میں شان مربیانہ
بھوکوں کو بل رہی ہے وعدوں کی گرم روٹی — حلوے سے کم نہیں ہیں الفاظ مشفقانہ
جتنے بلیکئے تھے بگلا بھگت بنے ہیں — ملتے ہیں ووٹروں سے جا جا کے فدویانہ
کوئی مٹا رہا ہے تقدیر سے غریبی — کرتا ہے کوئی جو کر حرکاتِ ابلہانہ
"آبِ حیات" پی کر دیتا ہے کوئی بھاشن — موضوع ہے "ضعیفی اور شربتِ مثانہ"

صیاد و صید دونوں ہیں اپنی اپنی دھن میں
بنتا ہے جال کوئی چنتا ہے کوئی دانہ

رضا نقوی واہی

○

الکشن کا احترام کرو

الکشن آ گیا یارو تم اپنا کام کرو — جلوس و جلسہ و بھاشن کا اہتمام کرو
پھر ایک بار "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ — لگا کے سے کام غریبوں کا تم تمام کرو
ہزار جان سے قربان ان پہ ہو ہو کر — زبانی جتنی بھی ہو خدمتِ عوام کرو
ملو ہر ایک سے جھک جھک کے احمقوں کی طرح — پریم پیار کا کچھ زور "فیضِ عام" کرو
حقیر ہوں کہ پھیچر سب اپنے بھائی ہیں — بڑے تپاک سے مل کر انھیں سلام کرو
کھڑے ہیں راہ میں محتاج ہاتھ پھیلائے — ہر ایک کو وعدۂ رنگیں سے شاد کام کرو
کرائے پر کرو حاصل "جلوس سازوں" کو — ہوا کے دوش پہ نعروں کی دھوم دھام کرو
"کسان ریلی" کا ہر جا پروگرام بنے — عوام کے لئے لاری کا انتظام کرو
مچا کے غلغلۂ "انقلاب زندہ باد" — ہماری نیند پھر اک بار تم حرام کرو
جو تھک کے بیٹھے کوئی انقلاب کا مارا — پلا کے "آبِ حیات" اس کو شاد کام کرو

مصیبتیں تو اٹھانی ہیں بس الکشن تک
پھر اس کے بعد کمانے کا انتظام کرو

اسمٰعیل آذر

زندہ دلانِ حیدرآباد ـــــ بارھویں سالانہ تقاریب

استقبالیہ تقریر ـــــ از جناب یم مبالیا

محترم صدر جلسہ، مہمان خصوصی جناب گنگا ریڈی صاحب وزیر سیول سپلائز
اور زندہ دل دوستو!

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آج یہاں قہقہوں کی دولت تقسیم کرنے والے ملک کے سب سے بڑے ادارے زندہ دلانِ حیدرآباد کی بارھویں سالانہ تقاریب کے ادبی اجلاس میں آپ سب کا خیر مقدم کر رہا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ ملک کے تمام مزاح نگار، ادیبوں اور شاعروں کی سب سے بڑی غذا ہم سیاسی لوگ ہیں۔ ہمارا ہی وہ خوش قسمت طبقہ ہے جو سب سے زیادہ طنز و مزاح کا نشانہ بنتا ہے۔ میں خوش قسمت اس لئے کہتا ہوں کہ ہم بڑے ظرف کے ساتھ اِس تنقید کو سنتے ہیں۔ لطیف و حسین باتیں کرنے والوں کے اگر ہم معشوق کہلاتے ہیں اور ان کی زبان پر شب و روز ہمارا ذکر رہتا ہے اور ہمارے تذکرے کے بغیر اگر مزاح لکھنے والے ایک نوالہ بھی نہیں توڑتے تو یہ بات ہمارے لئے باعث فخر ہے۔

یوں بھی میں شخصی طور پر اس کا قائل ہوں کہ اپنی خامیوں۔ کمی اور کوتاہیوں سے واقفیت حاصل کروں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھ سے زندہ دلان کی تقاریب کے لئے صدر نشین استقبالیہ کا پیش کش کیا گیا تو میں فوری تیار ہو گیا۔ مگر ایک بات میں یہ بھی کہوں گا کہ سیاست دانوں میں بھی کچھ کم زندہ دل نہیں ہوتے۔ زندہ دلی کی سب سے بڑی مثال ان کی "دل بدلی" ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عملی ثبوت شاید ہی کوئی دے سکے۔

زندہ دل لیڈر کا وہ لطیفہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ ایک بار ایک لیڈر کسی جلسہ میں تقریر کر رہے تھے اور بور کئے جا رہے تھے۔ سامعین بیزار ہو کر پرچیاں پھینکنے لگے۔ ایک پرچی ان پر جا گری۔ پڑھا تو لکھا تھا "گدھا"۔ لیڈر موصوف نے مائک پر سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "ایک صاحب نے اپنا نام تو لکھ دیا لیکن وہ پوچھنا کیا چاہتے ہیں، نہیں لکھا۔

خواتین و حضرات!

میں زندہ دلانِ حیدرآباد سے عرصہ دراز سے واقف ہوں۔ اس کے کارکنوں سے میری دوستی ہے۔ میں ہر سال ان کے جلسوں میں شریک ہوتا ہوں اور ہنسی کے کچھ پھول سمیٹ کے لے جاتا ہوں۔

اس ادارے نے اور ماہنامہ شگوفہ نے طنز و مزاح کا ماحول بنایا ہے اس سے کون واقف نہیں۔

میں آپ تمام خواتین و حضرات کا ممنون ہوں کہ آپ نے زندہ دلانِ کی تقاریب کو کامیاب بنانے میں تعاون کیا۔ میں آپ سب کا مہمان ادیبوں کا اور خاص طور سے مہمان خصوصی شریمان گنگاریڈی صاحب کا خیر مقدم کرتا ہوں صدر جلسہ جناب نریندر لوتھر کا جو کل تک زندہ دلان کے نائب صدر تھے اور اب زندہ دلی کے سفیر بنے دلی میں بیٹھے ہیں خاص طور سے شکریہ اس لئے ادا نہیں کروں گا کہ انہیں کا کام ہے جس میں میں مدد کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اس محفل میں ملک کے تمام نامور مزاح نگار جمع ہیں۔ فکر تونسوی، جنھوں نے طنز و مزاح کو ڈھیر ساری کتابیں دیں اور ہر روز طنز کے تیر چلاتے ہوئے قومی اصلاح کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ہماری درخواست پر خرابئ صحت کے باوجود تشریف لائے ہیں۔ زندہ دلان کی تحریک کے بانی فساد مجتبیٰ حسین بھی ہیں جو بڑی تیزی کے ساتھ اُردو کے صف اوّل کے مزاح نگار بن گئے ہیں۔ اور دوسرے اہم مزاح نگار بھی موجود ہیں اس لئے ان کے درمیان زیادہ دیر تک کھڑا رہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اس میں میرا نقصان بھی ہے۔ کیونکہ آپ ہی کی طرح میں بھی قہقہوں کے وٹامن حاصل کر کے اپنی کمزور صحت کو بہتر بنانے آیا ہوں اس لئے ایک بار پھر آپ سب کا خیر مقدم کرتے ہوئے رخصت چاہتا ہوں۔

[illegible] حیدرآباد کا [illegible] مشاعرہ

ان پڑھ مجھگیری

قہقہہ ساز انجمن زندہ دلان حیدرآباد ہر سال اپنے دامن ظرافت میں ہزاروں قہقہوں اور مسکراہٹوں کے سیلاب لیے گنگا جمنی تہذیب کے مالک شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے قلب میں واقع وسیع و عریض میدان پر سال بھر کے تھکے ہوئے ذہنوں کو پھر سے تازگی بخشنے اور ان کی زندگی کے لمحات کو خوشگوار بنانے مزاحیہ مشاعرہ برپا کرتی ہے ۱۰ر نومبر کی شب قہقہوں کی بہار لیے اپنے ۲۹ پسندیدہ میزبان د مہمان ستاروں کی کہکشاں اسٹیج پر سجائے ہزاروں زندہ دل سامعین کے لیے دل جوئی اور دلبستگی کے سامان کے ساتھ دعوتِ قہقہہ دیتے ہوئے جلوہ گر ہوئی۔ ہر دلعزیز وزیر زندہ دلان جناب پی گنگا ریڈی صاحب (جو ریاستی فذیز سیول سپلائیز ہیں) نے اس عظیم شب قہقہہ کی صدارت فرائض انجام دیئے۔ شریمتی سروجنی پلا ریڈی وزیر اطلاعات نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جناب ایم بالیا صاحب صدر نشین مجلس استقبالیہ نے مہمانوں کی اور صدر مشاعرہ نے جناب بالیا صاحب کی گلپوشی کی۔ اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ کنوینر مشاعرہ جناب طالب خوندمیری مشاعرہ کی بسم اللہ کر چکے ہیں۔ تب ہی [illegible] ۔ [illegible] اب ہنگامہ عاشقانہ شعر سنئے اور دل کھول کر داد دیجئے

بے دھڑک مدراسی

ناکام چوری پر شاعر کا ماتم

نا میں کوئی قُود منسٹر گورنر ہوں نہ لیڈر رے
رشوت کھا کو جینے والا افسر ہوں نا مائیر رے
صورت سے تو جان لے منجے میں اک مفلس شاعر رے
جا جا کے تو میرے گھر میں چوری کرنے آیا ارے
آیا نا رے آیا ناں تو میرے بھی گھر پو آیا ناں
میری گھر ڈسی میں ہے کتی کچھ غزلیں کچھ افسانے
کھٹّے انبا ڑے کی چٹنی موٹے چاول کے دانے
ٹوٹا صندوق پھٹے کپڑے جیب میں کھوٹے چار آنے
چکن آملیٹ چھوڑ کو رامپر پھیکے لونڈے کھایا ارے
آیا نا رے آیا ناں . . . .
ڈاکہ ڈالو بنگلوں میں جہاں لوٹ کی کالی دولت ہے
اک اک رات میں بسنے والی شدادوں کی جنت ہے
اُجلے اُجلے تن کے اندر کالی جن کی چاہت ہے
ایسے ایسے کو تو چھوڑ کے تر خنے کو ترخایا ارے
آیا نا رے آیا ناں . . . .
پنجہ مارو ان مرغوں پہ جو جھوٹے بانگاں دیتے ہیں
بھانتی والے خواب دکھا کو سر کے دعنقاں دیتے ہیں
میٹھے میٹھے باتاں کر کو سر پو ٹھونگاں دیتے ہیں
ایسے تگڑے مرغے چھوڑ کے چوزے پہ منڈلایا ارے
آیا نا رے آیا ناں . . . .
مال چپیٹ ان چوروں کا جن کی ہے شہروں میں عزت
دن دہاڑے جو لوٹ رہے ہیں ایسے جیبوں میں عزت
شہرت ان کی بڑے بڑوں میں پولس والوں میں عزت
ایسے کھدر والے چھوڑ کو بھنتے پو منڈلایا
آیا نا رے آیا ناں . . . .
محنت کی یاں بیلک کھڑی ہے رشوت کا نئیں غلہ رے
کام ملا تو سوکھی روٹی نئیں تو اللہ اللہ رے
ہے تو ہنڈی بھر کو کھچڑی نئیں تو ٹھنڈا چولا رے
گرتی سو دیوار توڑا نے سیتل پھوڑا لا
آیا نا رے آیا ناں . . . .
رحمت بن کے آیا ہے تو کر کو میرا رستہ جا
دھندا تیرا اور بڑھیگا چندہ کچھ تو دیتا جا
چندے سے بھی ہے معذور تو بیڑی اک پلاتا جا
بیڑی بھی نئیں دے سکتا تو شعراں میرے سنتا جا
اچھے موقع پو تو تا رے شعراں سننے آ
آیا نا رے آیا ناں . . . .
معافی چاہتوں چور میاں کچھ نئیں ہے میرے کونے میں
سوتی سو جھگڑا لو جورو وہ بھی پھٹے بچھونے میں
در جن بھر ہیں جاہل بچے میری بھیٹ کے کھاتے ہیں
سنگ تو بے دھڑک لیے جا بیچ ہے سرا
آیا نا رے آیا ناں . . . .

۲- سراج زرملی

لگتی بیک اپ میں بھاہ پارہ ہے
ورنہ صورت سے جھاڑو تارہ ہے
جب سے آئی ہے گھر میں تو بیگم
تیس تیرہ ہے تو اٹھارہ ہے

●

کوئی جھگڑا نہیں فساد نہیں
جن کے رستے میں جائیداد نہیں

سر پہ گنجوں کے بال اُگ آئیں
ایسی کوئی بھی یار نہ کھا دہنیں

●

جو کچھ بھی باپ دادا نے کمایا
وہ میں نے رم میں رمّی میں گنوایا
تو لا سے کانی مرغی سکا لاتا گا
ہوا ہے تجھ کو بھاری جن کا سایا

لگی ہے آگ میرے تن بدن میں
سر، انکل - کہہ کے ظالم نے بلایا
ریڈی ہے اب پراٹھا لقمی روٹی
کلیجہ، بھیجہ، قیمہ اور پایا
بڑے غصّے سے اس نے دانت پیسے
نکل کر چوکیدار باھر کو آیا
اُدھر پنشن کے دن بھی آرہے ہیں
اِدھر ہر سال گھر آتی ہے دایا
منسٹر بن گیا ہے تب سے اس کا
کوئی چاچا نہ خالو اور نہ تایا
ہو کیونکر ختم لعنت یہ جہیز کی
"بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا"
غزل ہے یہ سراج اچھی بہت ہی
بتادے کس سے ہے لکھا کے لایا

۳- منور علی مختصر

ہوں مختصر مگر مری عادت بری نہیں
شرمندگی کسی سے بھی مل کر ہوئی نہیں
جو بھی ملا ہے وہ مرے قد سے بڑا ملا
اللہ کا فضل ہے مری گردن جھکی نہیں

حسین ہو تم بہت پر عاشقی مجھ سے نہیں ہوگی
نکاح کرلوں گا لیکن شاعری مجھ سے نہیں ہوگی
یہ شام وصل ہے گھونگھٹ تم اپنا خود ہی الٹا دو
شریف انسان ہوں داداگری مجھ سے نہیں ہوگی

●

کیا سناؤں حال غم تجھ کو میں اپنا ماجرہ
چار لفظوں میں ہے میری زندگی کا ماجرا
فکر تھی ماں باپ کو میری مگر پیسہ نہ تھا
مفت کی بیٹی تو تھی داماد بھی سستا نہ تھا
شیخ کا ہر نوجوان تو لالچی خود غرض ہے
لڑکیوں کے باپ کو تو قرض لینا فرض ہے
اتنے میں پردیس سے میرا مقدر آگیا
میکسیاں، سینٹ، گھڑیاں، کپڑے ٹیپ ریکارڈر آگیا
قرض تھا ماں باپ کا مجھ کو چکانا ہی پڑا
سامنے مجبوریوں کے سر جھکانا ہی پڑا
چودھویں شعبان کو شادی مقرر ہوگئی
تھی سہانی رات لیکن روزِ محشر ہوگئی
وہ تو تھے پردیسی سیّاں اُن سے میں کیا بولتی
وہ سمجھ لیتے اگر اردو تو میں منہ کھولتی
وصل کی سب ان کے میرے بس اشارے ہی چلے
چھوڑ کر طوفان میں مجھ کو وہ کنارے ہی چلے
سامنے منزل تھی مارے شوق کے دم چڑھ گیا
تھی ملن کی رات ان پر دل کا دورہ پڑ گیا
جب دواخانہ گئے لیکر انہیں ہم لوگ سب
ڈاکٹر کہنے لگا" ان کا تو پتہ جھڑ گیا!

●

محمد رشید سمیع جلیل

نہ تو بات کا بھروسہ نہ زباں پہ کوئی قابو
رہے یار ہم تو چپ ہو، رہے یار ہم تو چپ ہو
نہ بنی کبھی حجامت نہ کٹے کبھی یہ ناخن
کریں غسل بھی تو کیسے کہ ہے تولیہ نہ صابن
یہ بدن ہے یا چمن ہے کہ مہک اٹھی گلابو
نہ ہوا پہ اپنی قابو
رہے یار ہم تو چپ ہو
ہوے ہم کوئی منسٹر کہ وزیر بے قلمداں
چلے ساتھ سارے چمچے کہ ہے جنمیں دو پہلواں
کوئی معتمد نہ ناظم کوئی سنتری نہ بابو
نہ منسٹری پہ قابو
رہے یار ......
یہ سنا ہی ہیں بیگم ابھی کھچڑی پک رہی ہے
نہ اچار ہے نہ پاپڑ کہ نگاہ تک رہی ہے
وہ بدل چکا ہے دفتر تھا جو اپنا گھی کا بابو
نہ ہی ڈالڈوں پہ قابو
رہے یار ......
ہے یہ بات آج مشکل جو دکھائیں اپنا جوہر
تھی وہ جیت اتفاقی کہ ہے آخری وہ ٹھوکر
لڑے کیسے پھر الیکشن یہ تو وقت کا ہے جادو
نہیں ووٹروں پہ قابو رہے یار ......
یہ کمال سرکس نہ یہ عطائے جو کرانہ
ہیں ہم سدا سلامت ہے لبوں پہ یہ ترانہ
نہ تو موت کا بھروسہ نہ تو زندگی پہ قابو
رہے یار ہم تو چپ ہو ......

●

۵ - ان پڑھ بھونگیری

پان کی واں کو لگائے جیسا ہے
دانتوں گلے کسٹائے جیسا ہے
مُنہ پہ چھائی ہے مردنی کیوں جی
جورو جوتے لگائے جیسا ہے

●

ڈبارہ پہلوانوں کی پلٹن بناتے ہیں
اور خود کو اپنی فوج کا کیپٹن بنائے ہیں
کچھ لوگ شوق شوق میں ان پڑھ اب آج کل
بچوں کو پیدا کرنا بھی فیشن بنائے ہیں

●

میں کیا بتاؤں کیسا ان کا حال ہوگیا
دنیا میں شرافت کا میاں کال ہوگیا
بیک اپ میں روز پھر رہی ہیں نانی روڈ پر
نانا کا میرے جب سے انتقال ہوگیا

●

دولہن تڑپتی رہ گئی بے چارگی کے ساتھ
دولہے میاں تو چل بسے دُدبئی خوشی کے ساتھ
مردہ بھی ہڑبڑا کے اٹھا بے کلی کے ساتھ
آیا ہے جب جنازے میں تو چیٹ پٹی کے ساتھ

پڑھتے ہی میرا تو لیبیٹری فوراً جواب میں
خود آگئے ہیں گھر وہ میرے فیملی کے ساتھ
جو تھا بہادری کا کیلنڈر وہ مشہور تھا
بہلا رہا ہے دل وہ کسی جنتری کے ساتھ

ہر وقت کاٹنے کے لیے دوڑتی ہے وہ
کیسے نبھے گی زندگی اس مینڈری کے ساتھ

لالچ میں جھیز کی کبھی دھندے کے واسطے
لنگڑی بھی ہوتی ہے شادی پری کے ساتھ

آئیلنگ کراکے اپنے کھٹارے کی دوستو
کرتے ہیں وہ مقابلہ اپنا پری کے ساتھ
دشمن کو مرغ انڈے پراٹھے دہی بڑے
لیکن مری تواضع ہے باسی کڑی کے ساتھ

لوگوں کا ہے خیال کہ ان پڑھ ہے پارسا
پر پی رہا تھا بیٹھ کے کل کمپنی کے ساتھ

۶۔ عظمت بھلاواں

چار چھ شعراں کی چیمنی کترنے
ایک غزل نکلی گئی دیوان سے
اور جب نکلا نو رنگ بھلاویں کا رنگ
پھاڑ ڈالا اس نے کپڑا شان سے

★

بیمار شب بھر کتنا پکارا
آلو بخارا، آلو بخارا
سوشلزم کا دیکھو نظارا
کوئی ہے تماشہ، کوئی لقارا
چالو ہوئی تو رکنا ہے مشکل
باڈی پرانی، انجن کھٹارا
اک لوٹا بھر کر نکلا تھا پانی
گلی تھی اُن کی یا تھا غرارا
نانا نے کھایا پارے کا کشتہ
پیری میں لاتے اک ماہ پارا

جی بھر کے مارا غنڈوں کو میں نے
فکروں نے مجھ کو بے موت مارا
کیسے میں اُس کا دودھو نچوڑوں
کل سے نہیں ہے بکری کو چارا
شادی میں جا کر لایا بھلاواں
بادام مصری سوکھا چھوارا

۷۔ سرپٹ حیدرآبادی

کچھ نہ پوچھے کوئی کہاں ہوں میں
حُسن کے دل میں مہماں ہوں میں
مضمحل ہو چکے ہیں گو اعضاء
اس پہ بھی شکر ہے جواں ہوں میں

جوتے کھاتا، گالیاں سنتا مچل جاتا ہے دل
چکنی صورت دیکھتا ہے جب پھسل جاتا ہے دل
نوجوانی اس کی فطرت میں ہے گو خود ہے مُسن
لاکھ روکو پھر بھی قابو سے نکل جاتا ہے دل

قدم قدم پہ نئے گل کھلا رہا ہوں میں
جہاں کو رنگ جہاں کے دکھا رہا ہوں میں
کیا کبھی نہ کسی نیک مشورے پہ عمل
خدا کے فضل سے چکنا گھڑا رہا ہوں میں

ہم ایسے عالی ظرف جہاں میں کہاں رہے
دن رات کھا کے جوتیاں جو شادماں رہے
پھرتے رہے حسینوں کے رکشوں کے ساتھ ساتھ
ستر برس کی عمر میں بھی ہم جواں رہے

نہ کرو کچھ تو کم از کم معاشقہ تو کرو
اگر جواں ہو جوانی کا حق ادا تو کرو
یہ کونے کھدرے میں چھپ چھپ کے عاشقی کب تک
جتا کے عشق کبھی راہ میں پٹا تو کرو

کوئی تو کام دکھائے اکڑ جوانی کی
کبھی رقیب کا بھیجا بھی پلپلا تو کرو
کرو نہ بھول کے بھی ترک میکشی کا خیال
گراں ہے مے تو گڑ مبیہ ہی پیا تو کرو

ثبوت چاہیے دنیا کو بادہ نوشی کا
کبھی کبھی ہی نالی میں گرا تو کرو
مشاعروں میں ہو گر اتفاق شرکت کا
چرا کے اوروں کی غزلیں سنا دیا تو کرو

جہاں جہاں بھی گیا ہوں سویرے میں سرِ شٹ
کسی نے بھی نہ کہا ٹھہرو ناشتہ تو کرو

۸۔ محمود نشتر:

شاعروں کا حق مقرر ہے خدارا دیجئے
وقت پر اچھا کھانا اور کرایہ دیجئے
دیکھنا مقصود اگر ہو ان کو اصلی روپ میں
چائے، وسکی، بیئر راسی اور گڑ مبیہ دیجئے

□

نام جن کا ہے مرے لب پہ وظیفے کی طرح
وہ شرافت میں ہے مقبول لطیفے کی طرح
داغ چیچک کے ہیں چہرے پہ طبیعت ستریں
مجھ کو نظر آتے ہیں شریفے کی طرح

□

خدا کے واسطے سن لو ذرا میرا سجیشن تم
اگر چاہو بڑھا لو اس جنم میں پاپلیشن تم
مگر اگلے جنم میں ایک بھی بچہ نہ پیدا ہو
کرو ہر مرنے کی نسوں کا آپریشن تم

□

میک اپ کا ہوا رخ پہ عمل 90%
نیت میں پڑا اپنی خلل 90%
ہو جاؤں منسٹر تو بنا دوں تری خاطر
موسی پہ بھی اک تاج محل 90%
سو فیصدی مے مفت کی پی تھی مگر شیخ
کس نے کہا قے کر کے اُگل 90%
دریائے محبت میں لگاتا ہے جو غوطہ
آتی ہے وہیں اس کو اجل 90%
کھل کر جو مرے شعر کی تعریف کرے آج
میں چائے پلاؤں اُسے کل 90%
کچھ شعر اِدھر کے ہیں تو کچھ شعر اُدھر کے
یوں ہو گئی نشتر کی غزل 90%

۹۔ گلیم میسدکی:

گھر سے نکلا ہوں یہ بیوی کو دلاسہ دے کے
شام کے کھانے پہ آؤں گا سحر ہونے تک

عمر سولہ سال سے ان کی تو سولہ سال ہے
اب خدا جانے بہت دن ہو گئے کیا حال ہے
ایک صاحب کہہ رہے تھے مجھ سے کل ہوٹل میں یوں
دانت تو منہ میں نہیں پر سر میں کالا بال ہے

رو کے لو کر دہ پریشان نظر آتا ہے
جانے کیوں بے سر و سامان نظر آتا ہے

پہلے ہفتہ میں نظر آتی ہے عید قرباں
آخری ہفتہ میں رمضان نظر آتا ہے

سرقہ جو مرے جیب میں کل رات ہوا ہے
بچوں سے زیادہ مجھے بیگم پہ شبہ ہے
خلاق ازل سے انہیں وہ حسن ملا ہے
کوا بھی جسے دیکھ کے شرمندہ ہوا ہے

یوں کہ جہیز میں مری ہر چیز دیا ہوں
بھولے سے میں سمدھی کا کفن بھول گیا ہوں
سمدھن کا تقاضہ ہے کہ کھر بیٹے نیا رو
موزوں کسی برقعہ میں جلد ڈھونڈ رہا ہوں
جوڑے کی رقم مجھ سے وہ یوں مانگ رہے ہیں
جیسے کہ قرض ان کے میں باوا سے لیا ہوں

اِی اُجڑے یہ منہ کالا یرغشلا کدھر کا کی
نکو مجھے بی خالہ ——— یرغشلا کدھر کا کی
لکھا نہ پڑھا لالہ یرغشلا کدھر کا کی
بولا الف کو بھالا یرغشلا کدھر کا کی

انگلش کی محبت میں انگریز بنا بٹلر
اردو کو بھلا ڈالا یرغشلا کدھر کا کی
انگلش ہے پس پردہ دشمن جو ہیں اردو کے
یہ اُن کا ہے ہم پیالہ یرغشلا کدھر کا کی

موسم میں بہاروں کے بیگن بھی بدلتا ہے
گرگٹ ہے بڑا کالا یرغشلا کدھر کا کی
شادی سے مسلسل وہ سسرال کو سمجھا ہے
باوا کا دھرم شالہ یرغشلا کدھر کا کی

سمجھے نہ کلیم اب تک اس تھالی کے بیگن کو
چمچہ ہے کبھی تھالہ یرغشلا کدھر کا کی

۱۰۔ صبغۃ اللہ بمباٹ :

قارورہ

اک مطلب میں روز آتا تھا مریض بے نوا
سیدھی جانب جیب میں رکھتا تھا وہ اپنی دوا
جیب میں بائیں طرف ہوتا تھا قارورہ سدا
اور لیتا تھا حکیم بے بدل سے مشورہ
لیکن اک دن بے خیالی میں مگر ایسا ہوا
سیدھی جانب کی بجائے بائیں میں رکھی دوا
پھر ہمیشہ کی طرح سیدھے مطلب میں آگیا
اور استفسار قارورہ پہ بائیں جیب میں
جو رکھا شیشہ دوا کا تھا، وہ آگے رکھ دیا
جس پہ جھلا کر حکیم بے بدل نے یہ کہا
میرا قارورہ نہیں تو اپنا قارورہ بتا

۱۱۔ خواہ مخواہ (بمبئی)

حوادث لاکھ آئیں مجھ کو گھبرانا نہیں آتا
مرے دامِ تمنا کو ٹھہر جانا نہیں آتا
تغیر تو رہی ہے خواہ مخواہ فطرت زمانے کی
مگر میں کیا کروں مجھ کو بدل جانا نہیں آتا

محنت میری نام ہے ان کا، ان کی شرافت کیا بولوں
کیا بولوں کیا نئیں بولوں میں اپنی حماقت کیا بولوں
کل کلکو بولے بوچھا تو بولے میرا دل بدلا
زیر زبر کے پھیر میں ہوگئی گندی سیاست کیا بولوں
ہنڈی رکھکو دیگ اٹھاریں دکھتے کو ہولے دکھریں
بیر بیتا کو گٹھلیاں دے ریئں ان کی شرافت کیا بولوں
نئیں بولے تو ہو رئیں بچے، کیسا زمانہ آیا ہے
بچے نئیں سو لوگاں کرلئیں کیسی ریاضت کیا بولوں
گاؤں کے لوگوں کو سمجھا رئیں جمہوریت کے باماں
بھینس کے آگے بین بجا رئیں ان کی ذہانت کیا بولوں
نام کی خاطر کیا نئیں کرتے شہرت کے بھوکے لوگاں
دونے کو دو سو کا پکارا، ان کی سخاوت، کیا بولوں
جمعہ جمعہ نہانے والے عید کو عید غسل کرریں
پانی نئیں سو بمبئی میں اب کا نکی نفاست کیا بولوں
نیت میں خطرہ آیا تو جھولی میں پتھرے آئیں
اتی بات سمجھتے نئیں پن کرریں عبادت کیا بولوں
کانچ کے گھر میں رہ کو پتھر دوسروں کو نکو مارو
آیا اُدھر سے پتھر تو کیا ہوئینگی حالت کیا بولوں
پچپن سال کا ہو تیج میں پنشن لے کو ہٹ جانا کتے
اسّی سال کے بوڑھے کھوسٹ کرریں حکومت کیا بولوں
راج گھاٹ پو قسماں کھا کو وعدوں سے پھرنے والے
ہوئینگی الیکشن میں کس کس کی ضبط ضمانت کیا بولوں

کس کی لاٹھی بھینس اسی کی آج کا بس قانون ہے یہ
کس کی شکایت کیسا مقدمہ کا نکی عدالت کیا بولوں
عمر کی ڈھلتی چھاؤں میں ان کی اب بھی گرمی باقی ہے
کھنڈر ہونے سے پہلے یہ کیا تھی عمارت کیا بولوں
بیس برس سے اوپر ہوگئے بمبئی میں رہتے رہتے
حیدرآبادی لہجہ کی جاتی نئیں عادت کیا بولوں
شادی کا ارماں ہے جس کو دیکھو مجھے حیرت لگتے
خط جاکو اب ہوں میں لفافہ میری حالت کیا بولوں
صاف مکر گئے لیکو مرا دل اب میں کروں کیا خواہ مخواہ
رکھو لیتے نئیں دیتے بھی نئیں میری امانت کیا بولوں

۱۲۔ حفیظ خاں مذاق:

دور آیا ہے نرالا
کیا سناؤں تمہیں حالہ
لیڈروں میں تھی چٹاپٹ
حکومت ہوگئی چوپٹ
بدلا روز نیا سٹ
پیشا باں پی کو ہے سب غٹ
پڑا پشکولوں سے پالا
کیا سناؤں ....
جے پی کی تھی یہی آشا
ہلکو رہنے سبھی پاشا
دیکھو لالچ کا لاشا
بجا کو آپس میں تاشا
نیتا کا منہ کریں کالا
کیا سناؤں ....
نیتا کا دور وہ آیا
اردو کو پھر سے رجھلایا

روز داری بھی دلا یا
دھرے سب اپنے نبھا یا
مجھے پینڈنگ میں ہے ڈالا
کیا سناؤں ....
عیش میں پوٹیاں آترے
مُنہ چڑھ کپڑے ہیں سُتھرے
بنانے پوٹّوں کو بکرے
دکھا رئیں چٹ پٹے نخرے
نخروں میں گرم مسالہ
کیا سناؤں ....
دُوبئی سے آ گیا دُولہا
سونے کا مل گیا جھُولا
آدھا لنگڑا آدھا لُولا
مل گئی اس کو ممولا
دولت کا کھل گیا نالا
کیا بتاؤں ....
مسجداں خالی پڑیں سب
مندراں سُونے پڑیں اب
سینمایاں ہیں لبا لب
پوٹّے پوٹّیاں ہوئیں بے ڈھب
ہے یہ مذہب کا دیوالا
کیا ....
چمکینگا بولکو مقدر
ملکو سب کر دیئے اندر
جورو بھی سوکھا چقندر
سالی ہٹراج کا ٹنڈر
سالا بھی واچسلا بلالا
کیا سناؤں ....

خالہ ماں کیا جی یہ چالے
ماموں بھی پاوال نکالے
دال کو کس پو کی جالے
پولس کے ہو گئے حوالے
پی کو ٹھرّے کا پیالہ
کیا سناؤں ....
عورتاں صوفے پو سوریں
مرداں دروانے پو رورئیں
بیویاں شوہراں ہورئیں
شوہراں برتناں دھورئیں
بہن کو گلے میں مالا
کیا سناؤں ....

۱۴۳۔ بوگس حیدرآبادی

(بوگس + غالب ، مشترکہ غزل)

روز دارو پیا کرے کوئی
"میرے دکھ کی دوا کرے کوئی"
خود طبیبوں کو ہے شکایت قبض
"کس کی حاجت روا کرے کوئی"
بنت مریم کی ہے تلاش مجھے
"ابن مریم ہوا کرے کوئی"
میرے خط دیکھئے رقیبوں کو
"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"
ووٹ لیتے ہیں چوٹ دیتے ہیں
"اب کسے رہنما کرے کوئی"
میں بھی بوگس دولہن بھی ہے بدشکل
"کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی"

۱۴۔ پاگل عادل آبادی

ایک لیڈر گا رہا تھا پارٹی لیڈر کے گن
کہہ رہا تھا پارٹی لیڈر ہمارا ٹاپ ہے
ہم سبھی بچے ہیں اس کے وہ ہمارا باپ ہے
سن کے ڈینگیں دل جلا ایک چیخ کر کہنے لگا
کہہ رہے ہو واقعی سچ ٹاپ کے سچے ہو تم
وہ تمہاری دیگ ہے اس دیگ کے چمچے ہو تم

عین موقع پہ عدو کی ناف ٹل جانا کتے
دم اٹک جانا کتے ہتھی نکل جانا کتے
بیٹھ کر چھلہ و منت کر رہے ہیں دوستو
یہ بڑھاپا پھر جوانی میں بدل جانا کتے
شرط ان کے باپ کی ہے اُن سے شادی کیلئے
سوئی کے ناکے میں سے سیتل نکل جانا کتے
جو دیا نانا ں مجھکو سسرے نے جہیز میں دوستو
اس کا وہ بنگلہ خدا قدرت سے جل جانا کتے
آج ہر چھوٹے بڑے لیڈر کی ہے یہ آرزو
بن کے پی ایم انڈیا ثابت نکل جانا کتے
نانی ان کی قبر پہ اک تاج بنواتیں کتے
لاٹری نانا کو قسمت سے نکل جانا کتے
شکل اُن کے بیٹے کی مونکس کی ہو تو ہو مگر
لائیں گے اُن ایسی بہو بیلک اچھل جانا کتے
ہے تمنا آخری یہ ان کے باوا جان کی
سیٹ پہ ہی سنیما کی دم نکل جانا کتے
بڈھوں کا اصرار ہے یہ ان کی اپنی بوڑھیاں
کر کے میک اپ روپ میں سیلن کے ڈھل جانا کتے
چھ کے چھ بیٹے ہیں اُن کے ڈاکٹر انجینئر
ساتواں بیٹا تو بھی نعمر نکل جانا کتے
سُن کے پاگل کی غزل وہ دے رہے ہیں یہ دعا
سات پشتاں تک میری گنجی نکل جانا کتے

۱۵۔ گرگس سہسوانی

مجھے بھوگٹ میں خواہش داد کی ہے
وراثت یہ میرے اجداد کی ہے
گلے بازی کی کرلی ہے ریہرسل
غزل میری نہیں استاد کی ہے

پہلے الفاظ تولتا ہوں میں
بعد کو چوریخ کھولتا ہوں میں
لوگ کہتے ہیں حضرت گرگس
ٹو دی پوائنٹ بولتا ہوں میں

میں نے اک لڑکی سے پوچھا یہ بتا اے مہ لقا
وہ جو ٹخنوں تک تیرا پردہ تھا اسے اب کیا ہوا
وہ بہ صد ناز و ادا کہنے لگی اسے بے خبر
مرد عورت بن گئے پھر کاہے کا پردہ رہا

بنتِ حوا نے چھوڑ کر پردہ
نو جوانوں کو مار ڈالا ہے
جس کو دیکھو وہی ہے ایٹم بم
آج فیشن کا بول بالا ہے

کل رات ان کے گھر پہ جو مہمان ہوگیا
کھٹمل تھے اس قدر کہ پریشان ہوگیا
کیسا وصال، کیسی تمنا، کہاں کا عشق
کاٹا وہ موذیوں نے کہ ہلکان ہوگیا

پی کے بھٹی سے جو اک رند بلا نوش چلا
جب ہوا ہوش سے بے ہوش تو نالی میں گرا
منہ میں کتے نے جو پیشاب کیا تو بولا
ساقیا اور پلا اور پلا اور پلا

۱۶- اسمٰعیل ظریف :

○

کسی مولوی سے نہ شیخ سے مرا آپ سے یہ سوال ہے
اگر آئے مُرغی پڑوس کی تو حرام ہے کہ حلال ہے
مجھے ایسا موقع تو دیجیے کہ تواضع آپ کی کر سکوں
کبھی تعطیلات میں آئیے مرے گھر کے بازو کلال ہے

○

ریل کے ایک حادثے میں اک مسافر مر گیا
دیکھیے انسانیت بھی کس قدر پستی میں ہے
اس کی بیوی کو ملی نقدی رقم لیکن ظریف
ہے ابھی مرحوم زندہ اور اسی بستی میں ہے

○

اڑا رہے ہیں ڈنر پہ ڈنر جو یہ لیڈر
اب اس کو روز کی پکنک نہیں تو کیا کہیے
سلام خود نہیں کرتے سلام لیتے ہیں
اب اس کو وَن وے ٹرافک نہیں تو کیا کہیے

○

پکچر کو جا رہا ہے یہ چھوٹا سا کارواں
ہمراہ اک عذاب کا دریا لیے ہوئے
بے بی جو ہوشمند ہیں ممّا کے ساتھ ہیں
ننھی مصیبتوں کو ہے پپّا لیے ہوئے

چار مینار

قطب مینار کو گر چار سے دی جائے ضرب
حاصل ضرب جو آئے گا وہ ہے چار مینار
دل کشی تاج محل میں بھی بہت ہے لیکن
حسن مردانہ میں اس کا نہیں ثانی کوئی
کمپنی والوں نے سگریٹ کا سہارا لیکر
اس کی تصویر کی عظمت کا اڑایا ہے مذاق
اس کے ہر سمت ہے نصب نرالی گھڑیاں
دورے پڑتے ہیں تو بے ہوش بھی ہو جاتی ہیں
بعد مدت انہیں پھر ہوش میں لاتا ہے کوئی
مشرقی وقت بتاتی ہے وہ مشرق کی گھڑی
مغربی ٹائم کی پابند ہے مغرب کی گھڑی
آئیے اب ذرا اوپر کی طرف چلتے ہیں
چل کے مینار پہ اوپر کی طرف نظارہ کرتے ہیں
اب ذرا دیکھیے نیچے کی طرف
گاڑیاں رینگ رہی ہیں ایسے جیسے بچوں کے کھلونے ہوں
ہاں ذرا خود کو سنبھالو ورنہ
ایک ہی جست میں منزل کو پہنچ جاؤگے !!
جاتے جاتے کسی رہرو کو بھی لے ڈوبوگے
دیکھیے اس عجیب لاری کو
چار شوفر چلا رہے ہیں جسے
اس میں لیٹا ہے ایک
وہ رہا بس اسٹاپ
دھوپ میں لوگ پریشان ہیں ڈبل بس کے لیے
ان میں سٹر فار کے سوا
چار سو بیس ہے کوئی تو کوئی پاکٹ مار
ایک ہی کیو میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
بس کے اڈے پہ جو پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
دیکھیے وہ کوئی آٹو سے اتر آیا ہے .
کیو میں اک دوست کھڑا ہے اس کا
آنے والے نے کہا
"یار اک مشورہ کرنا ہے ضروری تجھ سے
تین بجنے کو ہیں چھ بجے لوٹ کے آؤں گا
کہو گھر ہی پہ ملوگے یا کسی اور جگہ"
یہ دیا اس نے جواب

بس کے آنے میں ابھی دیر ہے اتنی باقی
لوٹ کے بھی اسی کیو میں یہیں پاؤ گے مجھے"
پھر یہ پوچھا اس نے میاں صاحبزادے
وہ جو آ کے ہیں ترے ساتھ بیٹھا ہے کوئی
آج بھی پھر نیا الّو تو نہیں پھانسا

یہ دیا اس نے جواب
ارے پاگل وہ مرے فادر ہیں
"بالغوں کے لیے پکچر جو لگی ہے انگلش وہ دکھانا ہے انہیں"

لاڈ بازار کا منظر بھی بہت دلکش ہے
پائی جاتی ہے یہاں چاندنی چوک کی ہلکی سی جھلک
چوڑی والوں کی یہاں بھیڑ بہت ہے لیکن
یہاں پردے کی کوئی قید نہیں
یوں تو دو کانوں میں شوروم ہیں لیڈیز مگر
salesmen gents ہوا کرتے ہیں
چوڑیاں پہنے ہوئے ہیں شاید یہ لوگ

وہ رہی سامنے مکہ مسجد
جہاں ہر ملک کے سیاح بطور تفریح
گھومتے پھرتے ہیں ہر روز نمائش کی طرح!
اس طرف دیکھیے یونانی شفاخانہ ہے
کئی بیمار یہاں آ کے شفا پاتے ہیں
کئی بیماروں کے یاں فیوز بھی اڑ جاتے ہیں۔
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
کیا پڑی ہے تمہیں اب سارے نظاروں سے ظریف
تم کوئی شہر کے افسر تو نہیں ہو لیکن
سننے والوں کے لیے باعث سماعت نہ ہو
اب ذرا مائیک سے ہٹ جاؤ ہوا آنے دو

۱۷۔ محمد حمایت اللہ:

مرار جی بھئی تمیں لنگڑے سیٹی
ایک ناری پو حملہ تھو تھو تھو
بڑا ئیں پیتا سا مسئلہ تھو تھو تھو
ایک عورت سے بدلہ تھو تھو تھو
ناک پو انگلی رکھ کو بولو جی دودی
مرار جی بھئی تمیں ....
کیا وہ پورس کا قصہ یاد نئیں ہے
وہ سکندر کا بدلہ یاد نئیں ہے
کون تھی اپنی اندرا یاد نئیں ہے
ہاتھ میں بنگڑیاں پینو، ناچو تھئی تھئی
مرار جی بھئی ....
تمیں غنڈوں سے دوستی کر ڈالے
تمیں یاں واں فسادات کر ڈالے
تمیں کتے سروں کو کٹا ڈالے
پرائم منسٹر جا کو بن گئیں قصئی
مرار جی بھئی تمیں ....
پاس عہدے کے اپنے ہونا تھا
تھک گئیں تم تمیں اب سونا تھا
تم بڑے ہیں بڑا دل ہونا تھا
بڑا ایمز سمجھا تو نکلے تیئی
مرار جی بھئی تمیں ....
اپنی کرنی کے بدلے پہنچ سے ملے
تمیں پیرے سو چپل بھی پہنچ سے ملے
راوناں کو ہنومان پہنچ سے ملے
چرن سنگھ چیا لگا تیئی پیئی
مرار جی بھئی تمیں لنگڑے سیٹی

☉

۱۸۔ زبیدہ لوتھر:

تاج محل

دیکھ کر تاج کو ایک عورت ہوئی دیوانی
بڑے نخرے سے اپنے کروڑپتی خاوند سے ہوئی گویا
"ہونھ! کہتے ہو تمہیں بہت چاہتا ہوں

بنوا سکتے ہو میرے لیے بھی اک ایسی نشانی؟"
خاوند کے چہرے پر ایکدم اک چمک آئی
اس نے دھیرے سے جواب دیا
"یاد رہے ایک ملکہ کو بھی مرنے کے بعد ملا یہ تاج محل
تم پہلے اگر یہ شرط پوری کردو!
تو میں ایک دن پھر کسی اور کے ساتھ دیکھنے آؤں گا تاج محل!!

چمڑے کا کارخانہ

کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا
چمڑے کے بیوپاری میں جسم ڈھالا
ہر کام کی اپنی اپنی بو ہوتی ہے
خام چمڑے کی سڑاند عجیب سی ہوتی ہے
(شاید آپ نے سونگھی ہوگی)
آج کل میں چمڑے کے انباروں میں گھومتا ہوں
ہر مرے ہوئے جانور کی چمڑی کو سونگھتا ہوں
اتنا کہ خام چمڑے کی بو میرے بدن میں رچ بس گئی ہے
اب جب کبھی بھی میں اپنی بیوی کے پاس جاتا ہوں
تو وہ چھوئی موئی ہو کے
ناک سکیڑ کے
غادرے میں کہتی ہے
"تو سے نہیں بولوں، پہلے بتیو کس کے پاس سے آوت ہو!
مو پاس کس نگوڑی کا لاوت ہو!!"
لیکن اگر میں عورتوں کے کسی جھرمٹ میں چلا جاؤں
تو سنا ہے میں آیا ہے کہ اکثر کا کہنا ہے۔
واؤ عجب ہے اس کی باڈی کی اوڈیبلی
"یہ شخص تو بڑا ہی سیکسی ہے"

۱۹۔ مصطفٰی علی بیگ:

دشمنِ جاں ہے جانِ جاں ٹیک اٹ ایزی
کہاں چھپوں اے آسماں ٹیک اٹ ایزی

انگلش میں ہو پیار کی گٹ پٹ
اردو زباں میں گالیاں ٹیک اٹ ایزی

لیڈر تو انسٹری پہ چلے ہے
ون وے پہ ہے کارواں ٹیک اٹ ایزی

ان کی سالی بیوٹی نقلی
پیار کا اب ہے امتحاں ٹیک اٹ ایزی

اولڈ ایج میں یاد آئیں جب
رنگ برنگی تتلیاں ٹیک اٹ ایزی

۲۰۔ کامل حیدرآبادی (مہاراشٹرا)

رُخ زندگی کا اپنی پیچھے میں موڑ دیونگا
خاطر تمہاری سن لیو دنیا کو چھوڑ دیونگا
میں پوچھ رہوں محبت مجھ سے بھی ہے کہ نئیں ہے
تم نئیں بولے تو دل کے دروازے توڑ دیونگا

نہ پہلے کی الفت اور اب بھی نہیں ہے۔
ضرورت تمہاری مجھے کب بھی نہیں ہے

خیالوں میں آکو مرا دل نہ جا توڑ
مرا دل بھی کوئی جلبی نہیں ہے

٥

غصّے میں ان کا چہرہ اک دم سے پھول گیا نا
سوراخ کیا رکشے والے لکڑی کا پُل گیا نا

کھڑکی سے مجھ پہ پھینکے پانی بکیٹ بھر کو
نکلا تھا گھر سے نہا کو پھر رنگ دھل گیا نا

کیا ڈال کو بنائے معلوم ہے یہ ان کچھ
بن کو گلابی جامن جھینگہ بھی گھل گیا نا

تالی کے ساتھ آئی آواز "ہاں جی ہاں جی"
اپنے شہر میں آکو رستہ میں بھول گیا نا

شادی میں اپنی آگئی اک ہور بیوی کا مل
"جلوے" کے وقت اپنا سب بھول کھل گیا نا

۲۱۔ قادر حیدرآبادی :

کیوں نہ ہو چاروں طرف اپنا پکارا یارب
چار مینار سے اونچا ہے ادھارا یارب
اس ستارے کو میرے فلمی ستارہ کردے
اک زمانہ سے ہے گردش میں ستارہ یارب

٥

یہ ہے یقین مرحلہ وہم و گماں کے بعد
موسم ایک اور بھی ہے بہار و خزاں کے بعد
اک آسماں کے نیچے تو یہ حال ہو گیا
چھ آسمان اور ہیں اس آسماں کے بعد

٥

متاعِ بے حیائی پا گئے ہیں
ترے کوچے میں پھر ہم آ گئے ہیں
روش بدلی نہیں ہے آج تک بھی
ہزاروں بار جوتے کھا گئے ہیں

غزل

جو کرتے ہیں مے نوشی سے انکار ہمیشہ
ذمّہ کے رہا کرتے ہیں بیمار ہمیشہ

بارش سے چمک جاتا ہے کتنوں کا مقدّر
حالی بھی نظر آتا ہے گلدار ہمیشہ

تھی بھیڑ بسوں ہی میں حسینانِ جہاں کی
ہم کار میں پھرتے رہے بے کار ہمیشہ

ایسا نہ ہو آجائے کوئی خواب میں ان کے
وہ نیند میں بھی رہتے ہیں بیدار ہمیشہ

ہر چیز عطا کرتے ہیں وہ اپنے کرم سے
رکھتے ہیں فقط مجھ کو قرضدار ہمیشہ

مقروض تھا میں تو مری شان بڑی تھی
پھرتے رہے گھر پہ میرے سردار ہمیشہ

ہر روز جو گھر کو اٹھا لیتے ہیں سر پہ
بات اتنی ہے رہتا ہوں میں بے کار ہمیشہ

تن تن کے برستے ہیں وہ مے خواروں پہ لیکن
چھپ چھپ کے پیا کرتے ہیں سرکار ہمیشہ

کیا بات ہے ہر طرح کے سہہ لیتے ہیں صدمے
مرتے ہی نہیں ہجر کے بیمار ہمیشہ

مطلع بڑی آسانی سے کہہ لیتے ہیں قادر
مقطع میں اٹک جاتے ہیں سرکار ہمیشہ

۲۲۔ گگی تلنگ ڈوی:

کون سی غزل پہ رُک کے بہت دل جلے ملے
تن کے ملتے تھے کبھی اب جھکے ہوئے وہ ملے
وظیفہ لینے کو کل ڈی ٹی او گیا تھا میں
وظیفہ خواروں کی کیو میں کھڑے ہوئے وہ ملے

o

کام مندا ہے مرا بندا بھی بیوپار نہیں
زندہ دل جلکت گھڑا ٹوٹنے تیار نہیں
مرتے مرتے بھی غزل کہہ کے مروں گا گگی
میں ہوں بیمار مگر شاعری بیمار نہیں

o

ٹیوب لائٹاں ہیں کئی بجلی کے گولے کے سوا
بھوت ناٹاں ہیں وزن گگی کے ڈنڈے کے سوا
صرف پینا ہی نہیں ہے مرا مطلب گگی
اور بھی غم ہیں زمانے میں گڑمبے کے سوا

دُمدار ستارہ

موجودہ سیاست کا ہے دمدار ستارہ
جس جھنڈے پہ اس طرح بھی اک چھاؤں پڑی ہے
اس جھنڈے کے اطراف مصیبت بھی کھڑی ہے
پیدائشی منحوس ہے منحوس بچارہ
موجودہ سیاست کا ہے دمدار ستارہ

آئی کانگریس سے یم پی ہوا چھایا اندھیرا
جنتا میں گھسا جنتا کو ایک دم پہ ڈبویا
بن پلیندرے کے لوٹنے کو کرے کون گوارا
موجودہ سیاست . . . .

ایم پی جو ہوا بنگلہ لیا کار خریدا
بیمار سیاست نے پیا خوب ہریرہ
صورت سے مگر پھر بھی رہا آلو بخارا
موجودہ سیاست . . . .

بننے کو منسٹر بہت زور لگایا
جب کچھ نہ بنا چپ نہ رہا طیش میں آیا
راجاؤں شہنشاہوں کو دم جھاڑ کے مارا
موجودہ سیاست . . . .

میدانِ سیاست میں سفر راس نہ آیا
گگی بھی گیا تاج محل پاس نہ آیا
گنگا کی طرف مڑ گیا جمنا کا کنارہ
موجودہ سیاست . . . .

جب تک رہا ڈنر پہ کوئی یاد نہ آیا
ہر روز صبح قوم کا بکرا ایک اڑایا
جب جم کے پڑا ڈنڈا تو گگی کو پکارا
موجودہ سیاست . . . .

۲۳۔ شہباز صدیقی (امروہہ)

رونقِ صورت کا کہیں ملتا نہیں اس میں نشاں
اللہ اللہ کس قدر ہنس مکھ ہے یہ بزمِ سخن
مُردۂ صد سالہ بھی آئے تو خنداں ہے یہاں
قہقہہ انگیز ہے زندہ دلوں کی انجمن

عیاں ہے سازِ ظرافت سے سوزِ دل میرا
یہاں ہے دل کی لگی دل لگی کے پردے میں
یہ قہقہے نہیں شہباز میرے نالے ہیں
بہا رہا ہوں میں آنسو ہنسی کے پردے میں

خدا کی ضرورت

جاتا ہوں نہ مسجد میں نہ بت خانے میں
جی لگتا ہے پوجا میں نہ دوگانے میں
رٹ رکھا ہے صرف اس لیے اللہ کا نام
کام آتا ہے یہ نام قسم کھانے میں

ریکارڈ ننگ

فرزند ہوا خانۂ مومن میں تولد
ریکارڈ بجے دھوم سے ہر ساز و صدا کے
کانوں میں کہے اب کوئی تکبیر و اذاں کیوں
کافی ہیں ترانے ہی ثریا و لتا کے

٥

گم نام ہوں یا رب مجھے شہرت دیدے
حسرت ہے بڑی جس کی وہ عزت دیدے
جنت میں جو مسند نہیں کوئی ، نہ سہی
دوزخ ہی میں کرسئ صدارت دیدے

٥

چکر میں سیاست کے خطابت بھی گئی
حاصل تھی جو منبر پہ وہ عظمت بھی گئی
کونسل کی صدارت تو انہیں کیا ملتی
مولانا سے مسجد کی امامت بھی گئی

—

عجب نادان ہیں وہ لوگ جو ہیں معترض اس پر
کہ میں روزانہ اپنے بچوں کو سینما کیوں دکھاتا ہوں

ضرورت ہے وطن کو اس زمانے میں جوانوں کی
لہذا وقت سے پہلے انہیں بالغ بناتا ہوں

٥

پہونچے جو ایک رات سینما میں شیخ جی
بیٹھے تمام لوگوں کے پیچھے وہ نیک نام
میں نے کہا یہ دیکھ کے ان کو کہ مرحبا
مسجد میں پیش امام سینما میں پس امام
چلے تو ہیں جناب شیخ میدان ترقی میں
مگر حضرت کہیں اس راہ میں حد سے نہ بڑھ جائیں
سینما ہال کی سیڑھی پہ پائے ارتقا رکھ کر
مجھے یہ خوف ہے بام ثریا تک نہ چڑھ جائیں

مکان کی تلاش

رہنے کو جب جہاں میں کوئی جگہ نہ پائی
دنیا کے رکھ کے سر پہ میں اپنی کھاٹ نکلا
دوزخ کو جا کے دیکھا آخر کو وہ مکاں بھی
شیطان روسیہ کے حق میں الاٹ نکلا

٥

ممبر جو اسمبلی میں ہر جائی ہیں
روز اک نئی پارٹی کے شیدائی ہیں
عہدوں کے لیے الٹ پلٹ ہے ان کی
آپس میں بھی سب کرسی بدل بھائی ہیں

٥

بھارت سے نحوست کی نشانی نہ گئی
فقر و فاقہ کی حکمرانی نہ گئی
کیا لے لیا جنتا نے بدل کر سرکار
رانی تو گئی مگر گرانی نہ گئی

—

○

آتے ہی فصلِ الیکشن ملک میں چاروں طرف
لیڈرانِ قوم کی چھل بل نظر آنے لگی
دیکھ کر یہ حال بولا باغ کا اک باغباں
آم پر مور آ گیا کوئل نظر آنے لگی

○

شری صندی سے جب چھینی گئی کرسی صدارت کی
یہ کہتے ہوئے ایوان سے باچشمِ نم نکلے
نکلنا خلا سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

۲۵۔ اشرف خوندمیری :

کیسا چھپانے

ایک جنے ماتنے تھے دوسرے تولے
ذرّی سی پی کو انوں ہو رہی ڈولے
ہندیے میں اِدر اُدر کھا کو جھکولے
شیر خاں کو جا تو دکھا کو انوں بولے
جان کو جوکھم میں تمیں نکو ڈالو
جلدی کرو جنگل سے مال نکالو
ہوئیں سر سے پوں تک انوں آگ بگولے
بھڑکیں اُن کے آنکھیوں سے غضب کے شعلے
مُوں میں چبا نکو یوں انگار کے کولے
مچھیوں پو تاؤ دے کو شیر خاں بولے
بچّہ لوگ پیلا اپنا گرڈی سنبالو
پھر شیر کا اولاد پو ہاتو نکالو
چٹا دیں گا اپن تم کو سونٹ کا چھانا
دلا دیں گا یاد تم کو اپنا چٹانا
پیلا بولو کدر کو تم مانگتا جانا
دکھا دیں گا تم کو ایک اپنا ٹھکانا
کھا دیں گے مُوں پو ڈادیں ہات کا پانا
تم سالا بھول جائینگا ناچنا گانا
چنا لوگ اپنا پھٹا نا کھیوں بتاتا
خالی پیلی کیکو اپنا داتاں پچڑاتا
لوگوں کا ہنڈی میں تم دال گلاتا
ٹیر و ابی ہم تمارا تالو سہیلاتا
انوں بولیں ہم نکلیں مال کمانے
کیا بی کرو نیں دیں گے ہم تمیں جانے
گلا کو گھنگنیاں کر دیں گا اوسے بٹانے
آدا مرد کا پیٹا آدا زنانے
سُن کو لگیں دونوں جنے تالیاں بجانے
مُوں پو انگلی رکھ کو لگیں کمر ہلانے
کیسا چھپانے جی تمیں کیسا چھپانے؟
اِتّے ہنر میرے میں ہیں کیسا چھپانے؟

۲۶۔ ہلال سیوہاروی

جاڑوں کی سرد رات میں کیا چیز ہے لحاف
واللہ اس اصول کے قربان جایئے
بستر سے رات کو نہ نکلئے گا بار بار
بھیّا مرارجی کا کہا مان جائیے

○

چودھری نے جو بڑھ کے مارا گول
رات بھر اس کا شہر میں غل تھا
جب ہوئی صبح تو یہ راز کھلا
گول بالکل نہیں تھا فاؤل تھا

راج نارائن کے عطر لگانے پر

عطر کے شوقین اس دنیا میں لاکھوں ہیں مگر
کام کرتا ہے تمہارا عطر جادو کی طرح

بس خدا محفوظ ہی رکھے تمہارے عطر سے
جس کے لگ جاتا ہے اڑ جاتا ہے خوشبو کی طرح

○

کوئی رستہ ہے نہ منزل نہ مسافر نہ سفر
لے کے اب گردشِ حالات کہاں جائیگی
اب اسی فکر میں دن رات ہیں بھارت کے عوام
دولہا غائب ہے یہ بارات کہاں جائے گی

○

قصہ کرسی کا ہے جس رخ سے لپٹ کر دیکھو
ایک ہی بات کے گھڑ رکھے ہیں افسانے دو
چودھری اب بھی صلح کرو مسز گاندھی سے
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

○

ہمارے چودھری آخر خدا کے ہو گئے قائل
خدا پھر بھی خدا نکلا، صنم پھر بھی صنم نکلے
وہ اب غالب کے اس مصرعہ کو اکثر گنگناتے ہیں
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

○

کہیں چوبیس مہینے تو کہیں چوبیس دن
کیسی کرسی ہے کہ بالو پہ کھڑی ہوتی ہے
پھر بھی ہر روز فسادات کرانے کے لیے
چاہے تھوڑی سی ہو یہ عمر بڑی ہوتی ہے

○

صدر کے اس فیصلہ سے خوش ہوئے سارے عوام
اک الکشن اپنے بھارت میں دوبارہ اور ہو
بلکہ یوں تعمیر ہو گاندھی کے سپنوں کا محل
اب کے الیکشن اور پھر اور گا رہ اور ہو

مسز گاندھی کو سلام

سنہ اکہتر میں سنا تھا لکشمی بائی ہے تو
ٹھیک کہلائی اگر درگا بھی کہلائی ہے تو
اپنی کشتی کتنے طوفانوں سے کھیل آئی ہے تو
کس نئے انداز سے میدان میں آئی ہے تو
میں سمجھتا ہوں جو نسبت ہے تجھے اس دیس سے
ورنہ عورت رونے لگتی ہے ذرا سی ٹھیس سے
ملک میں پھیلا ہوا تھا جس گھڑی نفرت کا جال
واسطے تیرے سیاست بن گئی تھی اک سوال
تیرے چہرے پر مگر دیکھی نہیں گردِ ملال
وہ تو اک کرکٹ تھا یا شطرنج کے مہروں کی چال
سنچری تو نے بنائی جب کہ چکمگلور میں
اور رن آؤٹ ہوئی آ کے سمستی پور میں
وقت کے لمحات پھر سے تجھ کو راس آنے لگے
وہ جو تجھ سے دور تھے اب تیرے پاس آنے لگے
پر بنائے مصلحت موقع شناس آنے لگے
جانے کتنے ہیں جو ہو کے بدحواس آنے لگے
شہسوارانِ سیاست کے پیام آنے لگے
تجھ کو اب تیرے حریفوں کے سلام آنے لگے
تجھ کو دلّی کے سیاسی پہلوانوں کا سلام
تجھ کو نس بندی کے مارے نوجوانوں کا سلام
تجھ کو بلڈوزر کی زد میں ان مکانوں کا سلام
جامع مسجد کی سبھی اجڑی دوکانوں کا سلام
مولوی صاحب کا آنند مارگیوں کا سلام
لکھنؤ کے سنّیوں کا اور شیعوں کا سلام
اُتّری بھارت کا پنجاب و ہماچل کا سلام
جارج فرنانڈس کا پرکاش بادل کا سلام

جموں وکشمیر اور کنیا کماری کا سلام
واجپائی جی کا عبداللہ بخاری کا سلام

سب کو حیرت ہے تو کیسے آ گئی میدان میں
ہم تو تجھ کو دفن کر آئے تھے قبرستان میں
اصل میں بڑھتی گرانی نے تجھے زندہ کیا
ہر طرف رشوت ستانی نے تجھے زندہ کیا
لیڈروں کی مہربانی نے تجھے زندہ کیا
کرسیوں کی کھینچا تانی نے تجھے زندہ کیا
اب دوبارہ تیسرا چرچا شورش حالات تھی
ورنہ تیسرا لوٹ آنا خواب کی سی بات تھی

۲۷۔ گڈبڑ حیدرآبادی

ہے ضرورت وزیر اعظم کی
مثل شیطان جس کی شہرت ہے
ہاتھ دینے کی جس کو عادت ہے
عیش ومستی سے جس کو رغبت ہے
جس کو جنتا سے سخت نفرت ہے
ایسے "پی یم" کی اب ضرورت ہے
کالا دھندا ہی کام ہو جس کا
درج پولس میں نام ہو جس کا
مشغلہ ظلم عام ہو جس کا
نازی ہٹلر امام ہو جس کا
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے
غنڈہ گردی کے فن میں ماہر ہو
قتل وغارت گری میں شاطر ہو
جس کا ہر ظلم نادر ہو
وہ ہلاکو کی طرح جابر ہو
ایسے پی ایم کی اب ضرورت ہے

سرغنہ ہو وہ سارے غنڈوں کا
یار و دلدار شر پسندوں کا
اختیار اس کو چند دھندوں کا
دشمن جاں ہو نیک بندوں کا
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے
وہ جو ٹاٹا کے گھر کا خادم ہو
برلا در اصل جس کا حاکم ہو
بے عمل ہو اگرچہ عالم ہو
جو نہ اپنی خطا پہ نادم ہو
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے
جو فسادات بھی کراتا ہے
ہندو مسلم کو جو لڑاتا ہے
بے گناہوں کے سر کٹاتا ہے
اور قاتل کو پھر بچاتا ہے
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے
جس کو گھیرے ہوں روز و شب چمچے
چاپلوسی سے باادب چمچے
جس کے وزرا بھی ہوں سب چمچے
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے
آنکھ روشن مگر وہ اندھا ہو
کان سنتے ہوں پر وہ بہرا ہو
بول سکتا ہو پھر بھی گونگا ہو
چلتے پرزوں میں چلتا پرزا ہو
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے
بات اردو زباں کی جب آئے
بر سر بزم اس کے گن گائے
وقت موقع اگر کوئی لائے
اس کی تائید میں مکر جائے

ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

کوئی بہرا تو کوئی نابینا
منہدم ایک گھر کا جو بینہ
جن کے ایسی بنائے کا بیڑہ
گندے انڈوں کا جیسے خاگینہ

ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے
چور ایسا کہ جو کفن بیچے
تو ہے کیا چیز اپنا من بیچے
ایسا مالی کہ جو چمن بیچے
تاجر ایسا کہ جو وطن بیچے
ایسے "پی ایم" کی اب ضرورت ہے

۲۸۔ ظہیر ابن قدسی :

بن گیا آج شاعر خدا کا غضب
کل تلک جو تھا اچھا بھلا آدمی

کبھی جو رات میں گنجا دکھائی دیتا ہے
زمیں پہ چاند سا اترا دکھائی دیتا ہے
میں جس کے ہاتھ سے ورمالا کی امید میں تھا
اسی کے ہاتھ میں جوتا دکھائی دیتا ہے
ضرور ہوگا وہ چھ سات فٹ سے بھی اونچا
جورو کے سامنے تنہا دکھائی دیتا ہے

دشمن بنا نہ فوج

میں گھر پہونچا تو بیگم نے سنائی مجھ کو خوش خبری
وطن کے واسطے میں بھی ہوئی ہوں فوج میں بھرتی
کہا میں نے یہ دل میں شکریہ اے ذاتِ زبانی
طبیلے کی بلا اچھا ہوا بندر کے سر لوٹی

وہ بولیں پھر، ٹریننگ ہو سکے تو دیکھئے آکر
یہ جنگی مشقیں دیکھیں گے تو رہ جائیں گے چکرا کر
میں پہنچا دوسرے دن تربیت گاہِ زنانہ پر
جہاں موجود تھے مجھ جیسے ان فٹ سینکڑوں شوہر
وہ جن کی خامشی سب سے بڑا ہے جھوٹ دنیا کا
تعجب یہ کہ ان کی بھیڑ میں بے حد تھا سناٹا
اچانک گونجی سناٹے میں آواز اک اٹنشن کی
جسے سنتے ہی گھر یہ گم ہو جاتی ہے کبھی سٹی
اٹنشن کی صدا سن کر ہوئی تیار ہر ناری
لگی کاندھوں سے رائفل اور ہوئی حملے کی تیاری
کبھی دائیں چلی گولی کبھی بائیں چلی گولی
نگاہ نانہ سے قتل کرنا جن کی عادت ہے
خطا ہوتا تھا ان کا ہر نشانہ کیا قیامت ہے
یہ سوچا میں نے ان کے واسطے بندوقیں ایسی ہوں
کہ جن سے دائیں بائیں گولیاں چھچھ نکلتی ہوں
نشانہ بازی سے ہٹ کر جو تھی رجمنٹ لے چاری
تھا ان کے ٹینکوں پہ بے طرح مشق ستم جاری

۲۹ ۔ طالب خوندمیری :

سبک اتنی کہ مثلِ ہائیڈروجن ہو گئی ہو تم
ضروری اس قدر کہ نائٹروجن ہو گئی ہو تم
نہ ہو تم تو ہماری سانس بھی مشکل سے چلتی ہے
ہمارے حق میں گویا آکسیجن ہو گئی ہو تم

روایتی شاعر سے

تمہاری شاعری میں عشق کا رونا ضروری ہے
کم از کم اک رقیب روسیہ ہونا ضروری ہے
شبِ فرقت میں دل کا چین بھی کھونا ضروری ہے
پھر اس کے بعد دن میں دیر تک سونا ضروری ہے

تمہاری ہر غزل راتوں کو میخانے میں ہوتی ہے
تمہاری فکر گھر سے دور ویرانے میں سوتی ہے

زمین شعر ملتی ہے تمہیں اکثر بیاباں میں
ردیفیں تم کو مل جاتی ہیں حیروں کوئے جاناں میں
پھنسے ملتے ہیں بیٹھے قافیے بھی زلف پیچاں میں
معانی میں نت نئے ملتے ہیں غیروں کے گریباں میں
تمہاری شاعری ذہنی تعیش کے سوا کیا ہے
بھلا قومی مسائل سے تمہارا واسطہ کیا ہے

عدو کا ہر غزل میں جلوہ فرمانا بھی لازم ہے
کسی مصرعہ میں لفظِ نامہ بر آنا بھی لازم ہے
سفینے کا کسی ساحل سے ٹکرانا بھی لازم ہے
ذرا مقطعے سے پہلے برق لہرانا بھی لازم ہے
کم از کم ایک مصرعہ آشیاں پر بھی ضروری ہے
گل و بلبل نہ آئے جس غزل میں وہ ادھوری ہے

تمہارے لب و رخسار سے فرصت نہیں تم کو
خیالی غم زبانی پیار سے فرصت نہیں تم کو
تصور میں وصالِ یار سے فرصت نہیں تم کو
سر[illegible] ترے ہوتے اشعار سے فرصت نہیں تم کو
کبھی پوچھا نہیں تم نے کہ میرا حال کیسا ہے
مری چاروں طرف دیدۂ مصلحت کا جال کیسا ہے

ترقی پسند شاعر سے ،
سیاسی خون ٹپکتا ہے تمہاری سرخ نظموں سے
کمیونزم بھی اکثر جھانکتا رہتا ہے مصرعوں سے
کبھی تو صرف بوئے دہریت آتی ہے شعروں سے
وہ اتنی کاٹتی رہتی ہے رشتہ میرا اپنوں سے

تمہاری شاعری تحریک کی صورت میں آئی ہے
مگر میرے لیے تو صور اسرافیل لائی ہے

جدید شاعر سے
سمندر کی تہوں میں بھی تمہیں صحرا نظر آیا
زمیں کی کوکھ زخمی ، آسماں پیاسا نظر آیا
کبھی دھوپوں کی چادر اوڑھ کر سایا نظر آیا
کبھی سورج تمہیں پیدائشی اندھا نظر آیا

مگر تم کو نظر آئی نہیں بے چارگی میری
تمہیں کیا فکر کہ کس حال میں ہے زندگی میری

یہ مانا کہ نئے انداز بھی پیدا کیے تم نے
غزل کو بھی نئے لہجے ، نئے تیور دیے تم نے
قبائے شعر کے چاک گریباں بھی سیے تم نے
مگر آدابِ اصنافِ سخن کے چھین لیے تم نے

میرے لفظوں میں معنی کا نیا چورن جو بھر ڈالا
محبت سے مجھے ، عوام کی محروم کر ڈالا

زندہ دل شاعر سے ،
میرے زندہ دلو تم سے بھی کچھ باتیں ہیں کرنے کی
یہ باتیں بھی تمہارے دل میں شاید ہوں اترنے کی
مجھے عادت نہیں ہے بے سبب الزام دھرنے کی
مگر تم پر بھی تہمت ہے ذرا حد سے گزرنے کی

ظرافت ٹھیک ہے لیکن پھوہڑ پن نہیں اچھا
اگر معیار گھٹیا ہو تو ایسا فن نہیں اچھا

شکیل اعجاز (اکولہ)
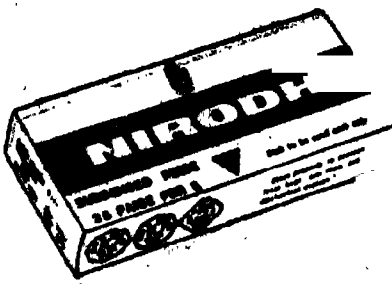
چغد کہیں کا!

میں ایک عرصہ سے چوہے کی طرح بھاگا جا رہا ہوں اور وہ تینوں بلّیوں کی طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ قصّہ دراصل یوں ہے کہ دوستوں میں سے ایک کی شادی ہو چکی ہے، باقی دو کے رشتے طے ہو چکے ہیں۔ صرف میں اکیلا ہوں جو اب تک ان تینوں کے چٹ پٹے قصے سن کر دل کو بہلا لیا کرتا ہوں۔ لیکن جس طرح اُلّوؤں کو رات میں سُلانا ممکن نہیں، گدھوں کے سر پر سینگ اور گنجوں کے سر پہ بال اُگانا ممکن نہیں اسی طرح دوستوں کی نازل کردہ آفت کو ٹالنا بھی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اس دن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

اُس شام ہم حسبِ معمول رات کے ۱۰ بجے شہر سے دور ریلوے اسٹیشن کی خوبصورت اور پُرسکون سڑک کے کنارے جگالی کرتے بیٹھے تھے کہ مسرور نے یہ مسئلہ دوستوں کی پارلیمنٹ میں رکھ ہی دیا۔ ادھر وہ تینوں ادھر میں اکیلا خوب زور لگایا کہ کسی طرح یہ بل (BILL) کچھ عرصہ کے لئے ملتوی ہو جائے لیکن میری ایک نہ چلی اور دوستوں کی سرکار سے باقاعدہ نوٹس دے دی گئی کہ ایک ہفتہ کے اندر تم کو لڑکی تلاش کر لینا ہے۔ ہم اور انتظار نہیں کر سکتے (پتہ نہیں اس جملے سے اُن کا کیا مطلب تھا میں نے اس پر سوچنا مناسب نہ سمجھا) دوستوں کا قطعی فیصلہ سن کر میں دم سادھ کر بیٹھ گیا (وہ تینوں شاید مسکرا رہے تھے) ۱۵ منٹ تک قبرستان کی سی خاموشی رہی پھر میں نے رندھی ہوئی آواز میں ایک سوال کیا اور اپنی دانست میں دوستوں پر احسان کیا۔ "لڑکی ورڑکی تو اپنے کو آج تک کوئی پسند نہیں آئی۔ تم نے کہیں پسند کی ہو تو بتا دو میں جا کر دیکھ لوں گا۔ (میں یہ جان بوجھ کر گول کر گیا کہ لڑکیوں نے آج تک مجھے کبھی پسند نہیں کیا) میں سوالیہ نشان بن کر مسرور کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی نامعقول نے تو یہ چنگاری لگائی تھی۔ یہ تذکرہ نہ کرتا اور بیٹھے بٹھائے یہ آفت گلے نہ پڑتی۔ لیکن وہ بھی تیار بیٹھا تھا۔ فوراً بولا "ہاں دیکھ رکھی ہے میں نے"۔ اس کے بعد وہ چھ، سات، منٹ تک اس کی ذہانت، حسن و سیرت، اخلاق و آداب اور آخر میں اس کے خاندان کی شرافت اور ایسی ہی دوسری خوبیوں پر درغلانے کے انداز میں بولتا رہا (شیطان کہیں کا!)

جب وہ بول چکا تو نعیم نے اپنی ہی طرح موٹی آواز میں کہا "لڑکی کا نام پتہ تو بتا دو"

مسرور میری طرف دیکھ کر بولا " بتا دوں ؟" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اس اُمید پر آنکھیں بند کرلیں کہ کھلنے تک وہ بول چکا ہوگا لیکن وہ مسکراتے ہوئے بولا " بتا دوں ؟"

میں نے کہا " ہاں ہاں بتاؤ نا ۔"

وہ پھر بولا " سچی بتاؤں ؟"

میں نے کہا " ابے اب بتائے گا بھی یا یونہی ترساتا رہے گا ۔ مردود کہیں کا !"

پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ مار کر لڑکی کا نام پتہ بتا دیا (معاف کیجئے گا میں کسی اور کو نہیں بتا سکتا)

" میں کب اور کہاں اس کو دیکھ سکتا ہوں ؟"

میرے اس سوال کے جواب میں مسرور نے جو کچھ کہا اُسے سنکر لگا کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ، بلکہ جاسوسی ناول کا کردار کیپٹن حمید ہوں اور کرنل فریدی مجھے خاص کام پر معمور کر رہا ہے ۔ تفصیل کچھ اس طرح تھی :

" وہ صبح ۸ بج کر ۵ منٹ پر کالج پہونچتی ہے لیکن وہاں بہت سارے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں ، دیکھنا ممکن نہیں (کالج کے لڑکے البتہ لڑکیوں کو دیکھ سکتے ہیں گویا کالج کا ایڈمیشن کارڈ ، لڑکیوں کو کھلے عام دیکھنے کا اجازت نامہ ہوتا ہے) اس کا بھائی اپنا ہم عمر نہیں کہ خواہ مخواہ دوستی گانٹھ لی جائے (اُف ! رومانس میں لڑکی کے بھائی کا کتنا اہم رول ہوتا ہے)

گھر پہ صرف اس کے والد ہوتے ہیں جو دوسروں کا گھر تک آنا پسند نہیں کرتے (تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ایک دن کوئی شخص ان کے گنجے سر پر دوچار چپت رسید کرکے گھر سے فرار ہوگیا ۔ اسی دن سے انھوں نے باقاعدہ ورزش شروع کی بندوق خریدی اور لوگوں کا گھر تک آنا جانا ممنوع قرار دے دیا) تفصیلات نے اسے دیکھنے کی آرزو کو اور بھی شدید کر دیا ۔

یہ تینوں تو رات گئے اپنے اپنے گھروں میں اطمینان سے سو گئے (میرے دوستوں میں اتنی عادت تو اچھی ہے کہ وہ اپنے ہی گھروں میں سوتے ہیں) خیر تو میں الوؤں کی طرح رات بھر جاگ کر ، اس کیس پر جاسوسوں کی طرح غور کرتا رہا ۔ اپنے آپ پر حیرت بھی ہوئی کہ میں اتنے اچھے منصوبے کیسے بنا لیتا ہوں ، میں اپنے آپ کو ماہر جاسوسیات سمجھنے لگا ۔ بلکہ جب رات کے ۴ بجے ذہنی حد ذرا بہک گئی تو دس پندرہ منٹ کے لیے یہی سوچتا رہا کہ اگر کہیں نوکری نہ ملی تو سی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ ڈیپارٹمنٹ میں چلا جاؤں گا ۔ اس خیال نے چونکہ میرا ایک معاشی مسئلہ بھی حل کر دیا تھا ۔ اس لیے آسانی سے نیند لگ گئی ۔

صبح اٹھا تو ۹ بج کر ۲ منٹ اور ۲۸ سکینڈ ہو رہے تھے (اس دن زندگی میں پہلی مرتبہ سکینڈ سکینڈ کا حساب رکھا) خوب زور لگا کر دانت گھسے (اس دن جو دانت کمزور ہوئے تھے آج تک ہلتے ہیں) زور زور سے جسم کو گھس گھس کر نہایا ۔ خاص موقعوں کے کپڑے پہنے ۔ ان فٹ کیا ۔ بیلٹ لگایا ، چھ سات منٹ تک بال سنوارے (جو اس وقت آئینے میں سڑک کے برابر تھے اب تو صرف آثار ہی رہ گیا ہے) جوتوں پر پالش کروا کے منگایا ۔ آج خوشی میں چھوٹے بھائی سے باقی پیسے بھی واپس نہ لیے ۔ وہ حیرت سے منہ تکنے لگا ۔ پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا ۔

ہر طرح سے تیار ہو کر دھڑکتے دل سے گھر کے باہر قدم رکھا ۔ آس پاس کے کئی لوگ مجھے غور سے دیکھنے لگے دروازوں اور کھڑکیوں میں لڑکیوں کی ہلکی ہلکی ہنسی کا بھی احساس ہوا ۔ دل نے کہا " تیرا مذاق اڑا رہی ہیں ؟

میں نے کہا " نہیں تجھے اس حالت میں دیکھ کر خوش ہورہی ہیں۔"

دل کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن میں ناگوار باتیں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کالج کے تمام اسٹوڈنٹس جس سڑک سے واپس ہوتے تھے وہاں ایک ٹوٹے ہوئے ٹرک کی اوٹ میں چھپ گیا۔ کچھ دیر بعد پوری سڑک چھپ گئی۔ کچھ سائیکلوں پر، کچھ کاروں میں کچھ پیدل۔ لیکن میں ان سب سے بے نیاز صرف رکشہ کی تلاش میں تھا۔ جس کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میں ڈٹا رہا۔ دھیرے، دھیرے اسٹوڈنٹس کی تعداد کم ہونے لگی اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ اچانک دور کہیں رکشہ کی آواز آئی۔ لپک کر دیکھا تو ایک بیل کے بچے کو رکشہ میں لاد کر شاید دوا خانہ لیجایا جارہا تھا۔ میں ناامید ہو کر سیدھا مسرور کے گھر پہونچا اور کہا کہ اب تم گھر کا پتہ بتاؤ کیونکہ کالج کے چکر میں تو سارا دن نکل گیا۔ پھر ہم دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ شادی شدہ زندگی کے روشن پہلوؤں پر بولتا رہا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا کہ لڑکی کے والد کل شام، آموں کی تلاش میں تھے۔

اس جملے پر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ کیونکہ

ع تقریب کچھ تو بہر ملاقات مل گئی

میں وہاں سے نکل کر آم والے کے پاس گیا۔ ۳۰، ۴۰ عمدہ آم خریدے اور اپنے خاص کمرے میں اس ترکیب سے چھپا دیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس رات جلدی سو گیا۔ دوسرے دن صبح اندھیرے میں ویسی ہی تیاری کی اور چپکے سے تھیلی اٹھا کر باہر نکل گیا (کھڑکیوں اور دروازوں پر احتیاطاً نظر ڈالی۔ لیکن سارا محلہ سورہا تھا) مسرور نے بتایا تھا کہ اس کے والد کا نام بہادر جنگ عرف تصور ہے۔ راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ ایک خوب صورت رنگت والے اور صحت مند شخص ہوں گے۔ ان کی آواز.......

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں سوچتا ہوا ان کے گھر پہونچا (سورج طلوع ہو چکا تھا)

کال بیل دبائی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔

بیل دبانے کے ۵ منٹ بعد ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور قدآور، صحت مند بالکل پکے کلر کا آدمی، بنیان اور خم سفید نیکر پہنے سیدھے ہاتھ میں سفید کبوترا اور بائیں ہاتھ میں دونالی بندوق لیے نمودار ہوا۔ دور کہیں سے آواز آتی ہوئی "کیا حکم ہے میرے آقا؟" ان کی بڑی بڑی مونچھیں اوپر کی طرف مڑی ہوئی تھیں۔

کون چاہیے؟ انھوں نے پہلی بار کہا اور مجھے لگا کہ بہت ہی وزنی پتھر پہاڑ سے لڑھکتا ہوا چلا آرہا ہے اور سارا جنگل سہما ہوا ہے۔

"جی مجھے بہادر جنگ تصور صاحب سے ملنا ہے" میں آج تک فیصلہ نہ کرسکا کہ یہ آواز میرے ہی حلق سے نکلی تھی۔ یا کسی اور کے! بالکل چڑیوں جیسی آواز تھی۔

"میں ہی ہوں" دل نے کہا آپ ہی ہیں۔ آپ کا نام تو درہ خیبر، کنچن جنگا، بحر اوقیانوس جیسا کچھ ہونا چاہیے تھا۔

وہ پھر بولے "تم کون ہو؟"

وہ تمام مکالمے ذہن سے نکل گئے جو کل رات سے یاد کرتا رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔

وہ پھر گرجے "ارے کون ہو تم؟"

"جی میں آم ہوں ——— ج ج ج جی نہیں آپ آم ہیں . . . . ."

"کیا بکتے ہو"

"آپ کل آموں کی تلاش میں تھے - میں آم لایا ہوں" تھیلی ان کی طرف بڑھادی۔

انھوں نے ایک دو آم اٹھا کر اوپر نیچے سے، آزو بازو سے دیکھا پھر بڑی بُری صورت بنائی "کس نے بھیجے ہیں؟"

"وہ آموں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ میں ان کا لڑکا ہوں"

انھوں نے جو سوال نہیں پوچھا تھا اس کا جواب دے دیا۔

"بیوپاری کے لڑکے ہو! انھوں نے "لڑکے" پر اس طرح زور دیا کہ میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ پر نظر دوڑائی کہیں اندھیرے میں شلوار قمیص پہن کر تو نہیں آگیا (جی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں تھی) انھوں نے بے نیازی سے ایک دو ہاتھ بندوق کی نال پر مارے، نال کے اندر ایک زوردار پھونک ماری، پھر میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

آموں کا دھندا ابھی ابھی شروع کیا ہے کیا؟ کیریوں کو آم کہتے ہو"

وہ پیچھے مڑ گئے اور زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ دماغ ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے کوئی نکال لے گیا ہو اور کھوپڑی میں صرف ہوا رہ گئی ہو۔

مطلب یہ کہ ع

بہت بے آبرو ہو کر اس کے کوچے سے میں نکلا

۸ بجنے میں ۱۳ منٹ باقی تھے سٹرک کے بیان کردہ حلیہ والی حسین دوشیزہ میرے ذہن و دل کو گدگدانے لگی میں نے اپنے دل کو سنبھالا اور اس سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا کیونکہ رکشہ یہیں سے ہو کر گذرے گا۔ ۸ بج کر ۱۵ منٹ ہوگئے تو کہیں تشویش ہوئی کہیں اب بھی قسمت دھوکا نہ دے جائے پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے شروع کے ایک دو پیریڈ آف ہوں گے اس لیے محترمہ اطمینان سے نکلیں گی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو تسلیاں دیتا رہا اور وہیں جما رہا۔ نظریں سڑک پر صرف ایسے رکشہ کی تلاش میں تھیں جس میں لڑکی بیٹھی ہو۔

تھوڑی دیر بعد ایک رکشہ، لڑکی سمیت تیزی سے آتا دکھائی دیا۔ سب سے پہلے اس کی چپلیں نظر آئیں۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے گنجے سر پر گھوم گیا) چپّل کے بعد پیر نظر آئے: دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر گھٹنے کے اوپر کا حصہ

پھر اور اوپر کا حصہ۔

دل کی دھڑکن ریلوے انجن کے مقابلہ پر تلی ہوئی تھی۔

پھر گردن نظر آئی اور اب امید تھی کہ صورت نظر آئے گی جس کے لیے دو دن اور دو راتوں سے پریشان تھا، کہ اچانک ایک زوردار ہاتھ میرے کندھے پر پڑا۔ دیکھا تو بھائی جان کے ایک قریبی دوست تھے "ارے کیوں میاں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جی کچھ نہیں ——— ایسے ہی ——— میں ذرا ———" ان کا لحاظ بالائے طاق رکھ کر سڑک پر بڑی پھرتی سے نظر دوڑائی تو رکشہ غائب تھا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو لڑکی کی پشت نظر آ رہی تھی۔ رکشہ کے پیچھے "گدھا" لکھا تھا اور ایک

قہقہہ بردوش آدمی کی تصویر تھی۔

رکشہ کے پیچھے پیچھے کالج پہونچا کہ آج اس بات کا فیصلہ ہوجانا ہی چاہیئے۔ میں اسی ٹرک کے پاس گیارہ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ کسی شناسا کو آتے جاتے دیکھ کر وقتاً فوقتاً ٹرک کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ صبح سے اب تک کی مسلسل پریشانی نے حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئیں۔ قمیص کا اگلا دامن "اِن" اور پچھلا دامن باہر لٹک رہا تھا۔ شوز کی لیس کھلی ہوئی تھی۔ ایک آستین چڑھی ہوئی اور دوسری کا بٹن لگا ہوا تھا۔ لیکن اب ان سب باتوں کی کسے پرواہ تھی۔

اسٹوڈنٹس دھیرے دھیرے باہر آنے لگے۔ تھوڑی دیر میں وہی لڑکی دو لڑکوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آرہی تھی۔ میں ٹرک کے نیچے چھپ گیا۔ پھر جیسے ہی وہ میرے بالکل سامنے آئی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ لڑکی تو سو فیصد وہی تھی جسے میں صبح دیکھ چکا تھا۔

لیکن اب مجھے مسٹر ور پر غصہ آرہا تھا۔ یہ صاف اس کی شرارت تھی۔ کیونکہ یہ اس کے بیان کردہ حلیہ سے بالکل الگ تھی۔ موٹا، بھدا جسم، فولاد کی طرح پکا کلر، بڑی بدتمیزی سے باتیں کررہی تھی اور علاؤالدین کے جن کی طرح قہقہہ لگا رہی تھی۔ میں دبلا پتلا چھوٹا سا منحنی آدمی، ڈر کے مارے ٹرک کے نیچے سے نکلا اور بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہونچ کر رونا شروع کردیا۔

شام میں ۱۰ بجے ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے لگا تو دل و دماغ میں زلزلہ آیا ہوا تھا۔ وہ تینوں اسی جگہ بیٹھے ہوتے تھے، میں جوں جوں ان کے قریب پہنچتا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں آنے لگیں پھر ایک دم سے فلک شگاف قہقہہ سنائی دیا۔

یہ قہقہہ سوائے مسٹر ور کے اور کس کا ہوسکتا ہے۔

چقندر کہیں کا ! چلغوزہ کہیں کا !!

گھر آئے مہمان ہمارے

غوث دیوسہ ملنی (بوچھم)

خدا جانے وہ کیسا زمانہ تھا جب مہمانوں کو لوگ خدا کی رحمت سمجھتے تھے اور انہیں سر ماتھے پر بٹھایا جاتا تھا۔ آج کے دور میں یہ سر ماتھے والی بات تو ٹکنیکل وجوہات پر رد ہو چکی ہے کیونکہ وہ سر جس کا تصور بالوں سے ہوا کرتا تھا۔ دیسی گھی کی طرح دھیرے دھیرے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو ماتھا ہی ماتھا رہ گیا ہے جس کے حدودِ اربعہ سر سے ہوتے ہوئے گردن تک جا پہنچے ہیں۔ اس طرح بے چارے مہمانوں کو سر پر بٹھانے والی بات تو اگلے وقتوں کا قصہ سمجھیے، ہاں، انہیں ماتھوں پر ضرور بٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان گول گول ماتھوں پر اتنی پھسلن اور چکناہٹ ہوتی ہے کہ صاحب وہاں تو وہی بیٹھے جو اپنی بیگم سے عاجز آ چکا ہو ——— !

جس طرح دنیا میں شاعروں، عاشقوں بلکہ چوروں اور بدمعاشوں کی کئی قسمیں ہوا کرتی ہیں ٹھیک اسی طرح مہمان بھی کئی قسموں کے ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ہم مہمانوں کی صرف تین قسموں کے بارے میں بات کریں گے باقی کئی قسموں کے بارے میں آپ خود سوچیے اور اپنی ذہانت میں اضافہ کیجیے اور جناب یہ ہم پہلے بتا دیتے ہیں کہ مہمانوں کی اس خاص قسم کے بارے میں تو ہم زبان بھی نہ کھولیں گے، جس کا تعلق ہماری بیگم کے رشتہ داروں سے ہے۔ کیوں کہ یہاں تو آپ کی واہ واہ ہو جائے گی۔ لیکن گھر میں ہماری بیگم کی جوتی ابھی نئی ہے اور ہمارے سر کے بال پہلے ہی جھڑتے جا رہے ہیں۔

تو صاحب مہمانوں کی پہلی قسم من چاہے مہمان کہلاتی ہے۔ اس قسم سے تعلق رکھنے والے مہمان گھر میں آنے کی بجائے عموماً دل میں آیا کرتے ہیں اور ان کے بیٹھنے بٹھانے کا انتظام مہمان خانوں کی بجائے آنکھوں اور پلکوں پر کیا جاتا ہے۔ اس طبقے کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ ان لوگوں میں منہ کے بجائے آنکھوں سے باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے اور ان میں کانوں کی بجائے دلوں سے باتیں سننے کا رواج پایا جاتا ہے۔ اس قسم کے مہمان اگر مرد ہے تو اس کا تیز و طرار، جاذبِ نظر اور آوارہ گرد ہونا لازمی ہوتا ہے۔ دوسری جانب اگر اس کا تعلق صنفِ نازک سے ہے تو چہرہ کتابی، آنکھیں

شرابی، خانہ خرابی کے سے آثار اس کی طبیعت سے جھلکتے نظر آئیں گے۔ ان مہمانوں کی ایک اور پہچان ہے کہ ان کی دعوتیں ویران علاقوں، اُجاڑ جگہوں اور آثار قدیمہ کے کھنڈروں میں ہوا کرتی ہیں اور پھر وہ رنگ جمتا ہے کہ اکثر بے چاروں کے رنگ میں بھنگ پڑ جایا کرتی ہے۔ کیونکہ ویران جگہوں اور اجاڑ کھنڈروں میں بھنگ کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔

مہمانوں کی دوسری بڑی قسم "خود بلائے مہمانوں" کے طور پر مشہور بلکہ بدنام ہے۔ اس قسم کے مہمان شادی بیاہوں کے موقعوں کے لیے ریزرو رکھے جاتے ہیں۔ اس طبقے کا یہ دعویٰ "قریب قریب" سچ دکھائی دیتا ہے کہ آج تک ان کے بغیر کوئی بھی شادی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچی۔ اور جو شادیاں ان کی عدم موجودگی میں تکمیل تک پہنچتی ہیں۔ ان کے پائے ہمیشہ کمزور رہے ہیں۔ ان مہمانوں کا یہ فرمان بھی حقیقت پر مبنی لگتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو شادیاں ہی نہ ہوتیں اور صاحب اگر شادیاں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا، اس کا احساس وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شادی شدہ ہیں۔ ہم تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاید اسی ڈر کے مارے لوگ اس قسم سے تعلق رکھنے والے مہمانوں کو بلانے کے لیے کارڈ چھپواتے اور مہورت نکلواتے ہیں۔

ان مہمانوں کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ان کی اکثریت کو میزبان جانتا تک نہیں بلکہ ان حضرات کو تو محض اس لیے دعوت دی جاتی ہے کہ ان کے اسم گرامی ذات برادری کی اس پرانی فہرست میں شامل ہوتے ہیں جو اگلے وقتوں کے لوگ ایسے موقعوں کے لیے بنا کے چھوڑ جاتے ہیں۔ اب جناب بیاہ والے گھر کی طرف ذرا نظر دوڑا لیجئے۔ پورا گھر کا رہ، ناکارہ مہمانوں سے بھرا رہتا ہے۔ اور بے چارے گھر والے دربدر بلکہ خاکستر پھر رہے ہیں۔ پھر یہ منظر محکمہ حیوانات کے میلے کی شکل اختیار کر لیتا ہے کیونکہ جس طرح محکمہ حیوانات کے میلے میں اڑیل، مریل، خوب صورت اور خستہ قسم کی گائیں، بھینسیں، بھیڑ بکریاں اور مرغیاں اور جوزوں تک کا شامل ہونا ان کا بنیادی فرض سمجھا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح شادی بیاہوں کے موقعوں پر بڈھے، جوان، خوش رنگ، ملنسار، چڑچڑے، بدمعاش اور جیب کترے تک شامل ہو کر وہ دھاچوکڑی مچاتے ہیں کہ شادی کے بعد بے چارے میزبان کے آدھے برتن غائب پائے جاتے ہیں۔ لیکن کسی کی مجال کہ مہمانوں کے اس طبقے پر اُنگلی اٹھا سکے، کیونکہ یہ خود بلائے مہمان جو ٹھہرے۔

مہمانوں کی تیسری قسم "آپ آئے مہمانوں" کے طور سے جانی بلکہ پہچانی جاتی ہے۔ اس قسم سے تعلق رکھنے والے مہمان کبھی بلانے کا موقع نہیں دیتے اور نہ صرف میزبان کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہیں بلکہ میزبان کی قمیصوں، پینٹوں، بوٹوں اور جرابوں تک کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اس طبقے کے حدود اربعہ بہت لانبے چوڑے ہیں۔ اس لیے ہم ان کے جغرافیے کے بجائے تاریخ بیان کریں گے اور وہ روداد سنائیں گے جن کا احساس صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو "آپ آئے مہمانوں" کی آمد کی زد میں آچکے ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہماری شادی کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہم بیگم کو ابھی محبوبہ ہی تصور کرتے تھے اور ہمارے تعلقات محض عاشقانہ اور تعارفانہ دور سے گذر رہے تھے۔ ان دنوں ہم پر حضرت عشق کا بھوت بری طرح سوار تھا اور ہمارا جی بس یہی چاہا کرتا تھا کہ سارا سارا دن اپنی جانِ من کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ان کے چہرے کا مطالعہ کرتے رہیں۔ شاید اسی لیے شادی کے دوسرے ہی روز ہم اپنی اہلیہ محترمہ کو لے کر گاؤں سے شہر لوٹ آئے تھے کہ یہ مزے اکیلے ہی لوٹنا مناسب ہے۔ لیکن جناب قسمت نے ہمارا ایسا پیچھا کیا کہ سر منڈاتے ہی اولوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ بھائیوں کا بھی بہانہ مہندی بھی نہیں اتری تھی کہ نہ جانے حضرت اچھن میاں لپنے دو چھوٹے چھوٹے صاحبزادوں سمیت اُتر آئے چونکہ آں جناب

کا تعلق ہماری بیگم کے رشتہ داروں سے تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ہماری بیگم کے رشتہ داروں میں وہ پہلی مخلوق تھے جنہوں نے اپنے قدم مبارک سے ہمارے گھر کو پاک کیا تھا۔ اس لیے ہم نے ان کی خاطر داری اور مہمان نوازی کے مظاہرے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ویسے خدا جھوٹ نہ بلوائے جب سے بیگم تشریف لائی تھیں ہمارا خرچ ہماری آمدنی سے دوگنا بلکہ سہ گنا ہو چلا تھا اور چند ہی دنوں میں ہمارے خزانوں کے برتن خالی ہونے کو تھے کہ حضرت اچھن میاں ہماری وفاداری کو آزمانے آن پہنچے، اب ایک طرف تو حضرت نے ہماری اقتصادیات پر شب خون مارنا شروع کر دیا تھا اور پیسے ہمارے اور ہماری بیگم کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ آتے ہی کمینے نے ایسا پہرہ بٹھایا کہ بیگم سے بات کرنا تو درکنار، آنکھ ملانا بھی دشوار ہو گیا۔ دوسری جانب ہم تھے کہ بیگم کے حسن کی چاٹ کھائے جا رہی تھی۔ اس لیے چھپتے چھپاتے رسوئی گھر میں بیگم سے جو ذرا لگائی کی بات شروع کی تو عین موقع پر شیطان کے دونوں پلّے نہ جانے کہاں سے جھانک رہے تھے کہ بدمعاشوں نے رسوئی کا دروازہ زور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا، پھر قہقہے لگاتے ہوئے والد محترم کے پاس جا کر سرگوشیاں کرنے لگے۔ اب جو ہمارا سامنا اچھن میاں سے ہوا تو حضرت نے اس مشکوک انداز میں ہمیں دیکھا کہ ہم سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئے۔ اس کے بعد جب تک حضرت ہمارے یہاں رہے ہم بیگم کی طرف آنکھ بھر کے دیکھ بھی نہ سکے۔

خیر صاحب خدا خدا کر کے دن بیتا، شام گزری اور سونے کی گھڑی آئی۔ اب چونکہ ہم نئے نئے شہر آئے تھے اس لیے ہمارے پاس رہائش کا مختصر سا سامان تھا اور صرف ''دو'' چارپائیاں تھیں۔ مجبوراً ایک چارپائی پر ہماری بیگم اچھن میاں کے دونوں صاحبزادوں کو لے کر لیٹ گئیں اور دوسری چارپائی ہمارے اور اچھن میاں کے لیے رکھی گئی۔ ہم حضرت کے دامن کی طرف لیٹنے جا ہی رہے تھے کہ حضرت نے انکشاف کیا کہ جناب غضب کے شاعر ہیں "اجاڑ" تخلص کرتے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہم نے ماتھا پیٹ لیا کہ اب دوسری شامت آئی۔

اب دیکھیے نا کہ ظالم خود تو سرہانوں کا تکیہ لگا کر اور رضائی اوڑھے بڑے ٹھسّے کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئے اور داد دینے کے لیے بے رحم نے ہم پر اس سردی کے موسم میں سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا حکم صادر فرمایا۔ جیسے ہم نہ ہوں لکڑی کے کھلونے ہوں۔ اب حضرت نے اپنا ٹوٹا ہوا چشمہ ناک کی گھوڑی پر فٹ کیا، ڈبیہ سے پان کی گلوریاں نکال کر گالوں میں ٹھونسیں، پھر پیلی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بغل سے بیاض یوں نکال لی جیسے ذبح کے وقت قصائی چھرا نکالتا ہے۔ پھر ہماری طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے شعر پر شعر پڑھنے بلکہ گانے لگے۔ ادھر ہم کچھ تو بیگم کے ڈر سے اور کچھ آداب مہمان داری سے مجبور ہو کر، گھٹیا اور بے سر پیر کے شعروں پر داد پہ داد دیئے جا رہے تھے۔ اور ادھر وہ پان کی پیک جگہ جگہ پھینکتے ہوئے غزل پر غزل داغتے جا رہے تھے۔ یہ سلسلہ کہیں ختم ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی، حضرت زیادہ ہی زیادہ جوش اور جلال میں آتے جا رہے تھے۔ ظالم کو ہم سے نہ جانے کہاں کا بیر تھا کہ اس نے اپنی پوری بیاض ہم ہی کو سنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک طرف تو واہ، واہ کر کے ہمارا گلا بیٹھ گیا تھا اور دوسری جانب ان کے بے ہودہ شعر سن سن کر ہمیں کانوں میں کیڑے چلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یا تو ہم رو پڑتے یا خفقان کے عالم میں پاگلوں کی طرح ہا ہا، ہو ہو پکارتے ہوئے کمرے میں ناچنے لگتے کہ بھلا ہو بجلی والوں کا جنھوں نے رات کے ڈھائی بجے مین سوئچ آف کیا اور ہمیں جعلی شاعر سے نجات ملی۔ ہم نے شکر کا سانس لیا

اور سو جا کر چلو ویسے دو ڈھائی گھنٹے رات باقی ہے۔ آرام کر لیں۔

ہمیں اچھن میاں کے دامن کی طرف لیٹے ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہم پر ایک اور انکشاف ہوا۔ اس نامراد کو سوتے میں ہاتھ اور لات چلانے کی عادت تھی۔ کم بخت نے وہ لاتیں جھاڑنی شروع کیں کہ میونسپلٹی کے گدھوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ ایک بار تو نابنجار نے ایسی دولتی ہماری ناک کی ہڈی پہ جمائی کہ ہمیں ناک کی گھوڑی کا رخ مڑتا ہوا محسوس ہوا اور ہماری بند آنکھوں میں تارے چمکنے لگے۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ اس بے رحم کے پاس اگر چند لمحے اور لیٹے رہے تو کوئی نہ کوئی ہڈی توڑ ڈالے گا۔ اسی لیے ہم ناک کو پکڑے ہوئے کمرے سے باہر اٹھ دوڑے اور آنگن میں کیکر کے درخت تلے جا بیٹھے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے ابھی چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ ہماری بیگم بھی حواس باختہ وہاں آ پہنچیں۔ انھوں نے اپنی روداد یوں بیان کی کہ حضرت اچھن میاں کے دونوں صاحب زادوں نے بستر پہ پیشاب کر کر کے اسے گندے نالے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور وہاں تو وہی لیٹے جیسے ہسپتال میں داخل ہونے کا شوق چرایا ہو۔

اس طرح ہم اور ہماری بیگم ساری رات اپنے کوارٹر کے باہر کیکر کے درخت کے نیچے کڑاکے کی سردی میں ٹھٹھرتے رہے اور حضرت اچھن میاں اونچے اونچے خراٹے بھرتے ہوئے مہمان نوازی کے مزے اٹھاتے رہے وہ تو خیر ہوی کہ دوسرے دن انھیں اگلے شہر میں کسی برات میں شریک ہونا تھا۔ ورنہ اگر وہ ایک رات اور ٹھہر جاتے، یا تو ہم اپنا سر پیٹ لیتے یا اُن کا منہ نوچ ڈالتے۔

تو جناب آپ تو اپنے ہی ہیں۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ لیجیے وہ تیئس جنوری والا قصہ بھی سن لیجیے۔ ہوا یوں کہ ایک تو مہینے کی آخری تاریخ تھی اوپر سے اتوار یعنی ایک کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔ ہم ابھی صبح کا اخبار پڑھتے ہوئے چائے کی چسکیاں ہی لے رہے تھے کہ بیگم نے رسوئی گھر کے خلاص ہونے کا طبل خالی گھی کا ڈبہ پیٹ کر بجا دیا۔ اور ہماری اطلاع کے لیے فرمانے لگیں کہ پچھلے تین دنوں سے پڑوسیوں سے اُدھار مانگ کے کام چلایا ہے جو آٹا بچ رہا تھا وہ بھی اب آخری دموں پہ ہے۔ اور چینی (شکر) کے مرتبان کو کھرچ کھرچ کر آخری تریاں جو صبح کی چائے میں ڈالی گئیں تب کہیں چائے گلابی ہوی تھی۔ اُدھر ہماری جیب کا یہ عالم تھا کہ آخری کوڑی بھی دوکان دار کی ترازو پہ اپنا مول ادا کر چکی تھی۔

اس وقت ہمیں جو چاروں سو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا اور پانی سر سے اوپر ہوتا ہوا محسوس ہوا تو قدرتی ایک شاندار ترکیب سوجھی جیسے ہی ہمارے چہرے پہ رونق عود کر آئی، ہم نے بیگم سے کہا۔ کیوں نہ آج کا دن ملہوترا صاحب کے ہاں گذارا جائے۔ خود انھوں نے بھی کئی بار مدعو کیا ہے ایک تو چھٹی کا دن ہے خوش گپیوں میں گذر رہے گا اوپر سے کھانے والنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائیگا۔

یہ ترکیب ہماری بیگم کو اور بھی پسند آئی کہ چولہے میں سر دھننے سے فراغت تو ملی۔ ہم جلدی جلدی تیار ہو گئے تاکہ کھانے سے پہلے ہی ملہوترا صاحب کے ہاں جا پہنچ سکیں گے۔ لیکن ہم دروازہ بند کر کے ڈیوڑھی پہ پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے ملہوترہ صاحب آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جو اپنی اہلیہ محترمہ اور تین بچوں سمیت وارد ہوئے تھے۔ چھوٹتے ہی فرمانے لگے۔

کہو بھائی کیا حال ہے۔ تم روز بلایا کرتے تھے نا آج ہم نے سوچا کہ چھٹی کا دن ہے۔ تمہارے ہاں خوش گپیاں بھی لگائیں گے اور دعوت بھی کھا ئیں گے۔

تو جناب اس کو کہتے ہیں ظالم مارے اور رونے بھی نہ دے۔ اس طبقے کی خطرناکی کا اندازہ تو آپ کو ہو گیا ہوگا۔ ہم

تو یہ کہیں گے کہ یہ طبیعت اتنا خطرناک ہے کہ ہمیشہ بے چارے میزبان کی ناک کاٹنے کو تیار رہتا ہے اور جو لوگ اپنی ناک بچا لیتے ہیں ان کی جیب کٹ جایا کرتی ہے۔

آپ کو یہ مضمون سنانے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ اگر آپ کے پاس اس موذی مرض کا کوئی نسخہ ہو تو ہمیں بھی بتا دیجیے کہ زندگی کے باقی دن آرام سے کٹ سکیں۔

اقبال اور میں

تمنّا مظفرپوری

اقبال صدی کے موقع پر مجھے بھی لکھنے کو کہا گیا ہے۔ اقبال پر لکھنے والے ایک سے ایک ماہر اقبالیات موجود ہیں۔ آخر میں کیا لکھوں۔ پھر میں نے سوچا اگر مجھے ایسی کسی بات کا پتہ چل جائے جو اقبال میں بھی موجود ہے تو اس موضوع پہ میں کچھ لکھ سکتا ہوں اور جب اس پر سوچنا شروع کیا تو میں نے پایا کہ:

اقبال لاہور میں پیدا ہوئے اور میں مظفرپور میں ہوا۔

اقبال پنجاب کے تھے اور میں شمالی بہار کا ہوں۔

اقبال کی زبان اور تلفظ پر جغرافیائی (آب و ہوا کا) اثر تھا اور میں بھی جغرافیائی اثر کا مارا ہوں۔

وہ "ق" کو "کاف" بولتے تھے اور میں "ڑ" کو "ر" بولتا ہوں۔

وہ گفتگو کرتے وقت مخاطب سے "ہاں جی، ہاں جی" کہا کرتے تھے اور میں "جی ہاں جی ہاں" کرتا ہوں۔

وہ شاعر تھے اور میں نثر نگار ہوں۔

وہ مفکر تھے اور متفکر ہوں۔

وہ مر کر بھی زندہ ہیں اور میں زندہ ہو کر بھی مردہ ہوں۔

غرض کہ اقبال اور مجھ میں ہر پہلو، ہر موڑ پر تضاد ہے لہذا اقبال پر لکھنا بڑا مشکل کام تھا لیکن مجھے فوراً ہی بچپن میں رٹائی گئی نظم یاد آگئی

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

لفظ "تمنا" ہونے کی وجہ سے میں نے بڑے ذوق و شوق سے یہ نظم یاد کرلی تھی اور خوب لہک لہک کر پڑھا کرتا تھا بچپن کا زمانہ بھی خوب ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے اس کا کچھ پتہ نہ تھا کہ جو نظم میں پڑھا کرتا ہوں وہ ایک بہت بڑے شاعر اقبال

کی ہے بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب میرے دل کی کیفیت ہے اور میں خود کہہ رہا ہوں۔

بچپن کا زمانہ بیت گیا پھر میں ہائی اسکول میں پڑھنے لگا جہاں مجھے ہمارے ہیڈ مولوی صاحب ہندوستانی بچوں کا قومی گیت یاد کروایا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری حالت شعر کے متعلق جو آج ہے وہی اس زمانے میں بھی تھی یعنی شعر اپنی صحیح صورت میں مجھے یاد نہیں رہتا تھا۔ لہٰذا مولوی صاحب غلط سنانے پر کھجور کی چھڑی تبرکاً دو چار بار برسا دیا کرتے تھے کہ میاں ہندوستان میں عربی کھجور کھانے کے لیے ملنے کو نہیں چنانچہ دیسی کھجور کی چھڑی ہی کھایا کرو۔ ان کا کہنا تھا کہ مار کھانا بھی علم میں داخل ہے۔ لہٰذا موصوف وقت بے وقت اونگھتے ہوئے اٹھتے اور چھڑی اٹھا کر ہم طالب علموں پر ناحق برسا دیتے اور کہتے، جا مردود، گھنٹی ہو گئی، اب دوسری کلاس کے لڑکے آئیں گے۔ اس طرح انھوں نے میرے دماغ میں علم بھر دیا۔ اسی زمانے کی بات ہے میں اکثر سوچا کرتا کہ آخر یہ کیسا شاعر ہے جس نے اپنے ترانے میں ہندوستان کی خوب خوب تعریف کی ہے اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا کہا ہے لیکن خود پاکستان میں رہ گیا۔ اگر اسے ہندوستان اتنا ہی پیارا لگتا تھا وہ ہندوستان میں کیوں نہ رہا۔ اس لئے جب کبھی ہمارے مولوی صاحب بیوی سے جھگڑ کر آتے اور ہم لوگوں پہ اپنا غصہ اتارتے تو میں بھی سوچتا کہ یہ شاعر صرف بات بناتا جانتا ہے اس کی اس لن ترانی پہ غصہ بھی آتا تھا۔ لیکن اب میں جب یہ غور کرتا ہوں تو بچپن کے خیالات پر خود ہنسی آتی ہے کیونکہ بچپن کا یہ نظریہ اب بدل چکا ہے۔ اقبال جیسے بڑے شاعر مشرق کہتے تھے میری نظر میں اب آفاقی شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک جگہ ہندوستان کی تعریف کی ہے تو دوسری جگہ پاکستان میں رہ کر مرنا پسند کیا ہے اور اپنی آواز سارے جہاں میں پہنچانے کے لیے مسجد قرطبہ کی گنبد کا سہارا لیا ہے اور کیا پتہ ہو سکتا ہے انہیں جس قبر میں لٹایا گیا تھا وہ اب نور سے معمور ہو گی۔

اقبال! اقبال!! اقبال!!! اقبال صدی میں میں نے جب سوچنا شروع کیا تو مجھے ان کا ایک شعر یاد آیا۔

اذاں بوقت ولادت نماز بعد وفات
بس اتنی دیر کا جھگڑا تھا زندگی کیا تھی

زندگی کے متعلق میں ابھی اس شعر کی گہرائی اور گیرائی پہ غور ہی کر رہا تھا کہ ان کے اور ایک شعر نے میرے ذہن میں قلابازی کھانا شروع کر دیا ع

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

اس شعر کے یاد آتے ہی میری رگ ظرافت پیروڈی کہنے پھڑکنے لگی اور شعر یوں ہو گیا ع

آنچل کے سائے میں ہم برسوں جواں رہے ہیں
خنجر ہے ابروؤں کا قومی نشاں ہمارا

اچھے شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی پیروڈی بھی آسانی سے ہو جاتی ہے مگر پتہ نہیں اقبال طنز و مزاح نگاروں کی زد سے کس طرح بچ گئے۔ اس معاملے میں بچارے چچا غالب ہی تختۂ مشق بنتے رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ اقبال کی طنزیہ شاعری ہو جس کی وجہ سے طنز و مزاح نگاران کی طرف دھیان دینا مناسب نہ سمجھا ہو۔ ہاں مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی

مرحوم نے اقبال کے مومن کی خوب پیروڈی کی ہے۔

ملاحظہ ہو، پیروڈی مومن (دنیا میں)

کمزور مقابل ہو تو فولاد ہے مومن
انگریز ہو سرکار تو اولاد ہے مومن

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن

مومن (جنت میں)

شکوہ ہے فرشتوں کو کم آمیز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کہ بہت تیز ہے مومن

اقبال پر ہاتھ صاف کرنے میں ساحر لدھیانوی نے بھی کمال کیا ہے۔ انھوں نے ترانۂ ہندی کی خوب پیروڈی کی۔ پیروڈی کی بات پر مجھ میں بھی خواہش ہونے لگی کہ اقبال کے کچھ اشعار کی پیروڈی کہوں۔ مگر مجھے فی الحال ان کا کوئی شعر یاد نہیں آرہا ہے۔ سوائے اس کے کہ ؎

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اس شعر کے یاد آتے ہی میں نے یہ سوچا کہ فی الحال مجھے بھی خاموش ہو جانا چاہیے۔ ●●

بھگوڑے شوہر سے

رفیق شاکر
(کھیم گاؤں)

اے میرے پیارے شوہر اور گیارہ بیٹیوں اور پانچ بیٹوں کے "پیارے ابّا جان" یقین ہے کہ آپ کسی ہوٹل میں بیٹھے بلّی کی طرح آنکھیں بند کیے چائے کے گھونٹ پی رہے ہوں گے، سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے اخبار چاٹ رہے ہوں گے یا منہ میں پان دبائے بکری کی طرح جگالی کرنے میں مصروف ہوں گے یا پھر گدھے کی طرح کسی کام میں جتے ہوئے ہوں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ گھر کا سکھ آپ کو کہیں نہیں مل سکتا۔ میں نے آپ کی عادتیں کچھ ایسی بگاڑ رکھی ہیں کہ آپ کو گھر کے باہر ویسی چیزیں مل ہی نہیں سکتیں (اپنے خاوند کو گھر سے باندھ رکھنے کا یہی تو کامیاب نسخہ ہے) بھلا آپ کو حیدرآبادی طرز کی ملائی دار چائے اور لکھنوی انداز کی میرے ہاتھوں کی گلوری کہاں میسر آ سکتی ہوگی؟

جب سے آپ گئے ہیں پاندان اجڑ چکا ہے، چائے کی کیتلی بیوہ ہوگئی ہے، آپ کے کتب خانے کی آہ وزاریاں پڑوسن بڑی آسانی سے سن سکتی ہے، آپ کے نکھٹو اور مفت خور دوست آپ کے ہاتھوں سگار کھانے ترس گئے ہیں۔ (بشیر کی یاد کرتے ہیں)

آپ کے فرار ہونے کے بعد اتنے ٹرک پر سو دینے کو آئے کہ مجھے سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ آپ میرے شوہر نہیں، (کالو شکر اللہ گئی ان مفت خوروں کی چائے ہیں) لہٰذا میرے بیلے نہ سہی اپنے عزیز دوستوں کے لیے ہی آجائیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ:

1. کبھی آپ کی محبوبہ کا ذکر طنزیہ طور پر نہیں کروں گی۔
2. آپ کے بوسیدہ اخبارات، پھٹے پرانے رسائل و البم اور دیگر "تاریخی" اشیاء کو اتنا ہی مقدس اور متبرک سمجھوں گی جتنا کہ میرے میکے کے خطوط۔

(۳) آپ کے دوستوں کی قدر اپنے میکے والوں سے زیادہ کروں گی۔
(۴) آپ سے نہ تو آمدنی کا حساب پوچھا جائے گا اور نہ ہی آپ کی جیب سے رقم نکالی جائے گی
(۵) کھڑکیوں اور دروازوں کے پردوں میں جو سوراخ تاک جھانک کے لیے میں نے بنائے تھے وہ بند کر دیئے ہیں۔
(۶) زنانخانہ کی آواز آپ کی بیٹھک تک کبھی نہیں آئے گی۔
(۷) آپ کے فرار ہوتے ہی میں نے نماز پنجگانہ، تلاوت، درود و وظائف شروع کر دیئے ہیں۔
(۸) آپ کا لڑکا جو کالج چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اپنے گناہوں سے توبہ کر کے شام کو گھر لوٹ آیا ہے (اور آپ کے آجانے کے بعد پھر بھاگ جائے گا)

● لہٰذا آپ فوراً چلے آیئے ہم سب آپ کے لیے بہت پریشان ہیں کیونکہ آپ کے چلے جانے سے آپ کی تنخواہ ملنی بند ہو گئی ہے۔

آپ کی شدت سے منتظر
آپ کی کنیز

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں

نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعہ	۳/۵۰
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
مزاج شریف	رشید قریشی	″	۱۲/۵۰
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	″	۹/-
فقط	″	″	۹/-
در پردہ	مسیح انجم	″	۹/-
تو تو میں میں	پرویز ید اللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-
چوٹی کے غلام	″	مضامین	۷/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	″	۸/-
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	″	۸/-
دھر گھسیٹ	سرچپ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-
بہر حال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/-
شگوفے	ارشد علی خاں	″	۸/-

طاہرہ صدیقی ایم اے

کچھ لیڈی کلرکس کے بارے میں

(تصویر کا دوسرا رخ)

[شگوفہ کے اکتوبر کے شمارہ میں لیڈی کلرکس پر ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس کے جواب میں ہمیں یہ مضمون وصول ہوا۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ یہ شائع نہ ہو تو ہم پر جانب داری کا لیبل لگا دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ہم کوئی بھی سنجیدہ اور مراسلاتی انداز کے مضمون کی اشاعت کو جانب داری کے الزام پر ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔ مدیر]

کسی کرم فرما نے لیڈی کلرکس کے خلاف لکھ کر سکھ کی سانس بھی نہ لی ہوگی کہ ہماری سہیلیوں نے ہم پہ دھاوا بول دیا کہ ہم اس مضمون کا جواب دیں۔ اور واقعی پھر ہم نے بھی ٹھان لی کہ ضرور ان حقائق کی طرف توجہ دلائیں گے جن سے کہ فاضل مصنف نے دانستہ چشم پوشی کی ہے اور مزاح نگاری کے جوش میں صنف مخالف کے احساسات کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ کئی جگہ بڑی شائستگی کے ساتھ ان کی ذات پر حملے کیے ہیں۔

سب سے پہلا ریمارک یہ تھا کہ لیڈی کلرکس محنت کی عادی نہیں ہوتیں اس لیے سہل پسند سکشن میں کام کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

ذرا سوچیے صاحبان —— ! عورت جیسی مخلوق اور اس پر تن آسان مرد "سہل پسندی" کا الزام لگائیں۔ یہ سراسر غلط بیانی ہے۔
اتفاق سے اگر وہ کلرک بن جائے تو پھر پوچھیے نہیں کہ اس کی شخصیت کتنے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ گھر میں وہ ایک بیوی کے، ماں کے اور [illegible] نبھانے والی کے فرائض انجام دیتی ہے۔ اس کے بعد اسے آفس کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے۔

آفس —— یہ وہ مقام ہے جہاں اس کا سابقہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑتا ہے۔ کوئی صاحب بڑے ہی اسٹائل سے کالر ٹھیک کر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے (اگر وہ چار باقی رہ گئے ہوں) سیکشن میں داخل ہوتے ہیں۔ متوقع نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر لیڈی کلرکس کے قریب دیوار میں کرسی پسند کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ دل ہی دل میں انھیں اس حرکت پر گالیاں دے رہی ہوگی پھر بڑے ہی اسٹائل سے کسی ذہنی کام کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی ہے وہ ان پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتی اور بڑی بے رخی سے دوسری جانب متوجہ ہو جاتی ہے۔ کسی کو خواہ مخواہ ڈسٹرب کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ دن بھر میں کئی سلام کر جائیں گے لیکن جیسے ہی دکھائی دیں ان کا ہاتھ ماتھے سے چھو جاتا ہے۔ کوئی بے وقوف اس حد تک ڈھٹائی سے کام لیتے ہیں کہ

سامنے آکر بیٹھ جاتے ہیں پھر بڑے ہی اسٹائل میں سموکنگ شروع ہوتی ہے۔ بیچ بیچ میں وہ لیڈی کلرکس کی جانب بغور دیکھتے جاتے ہیں۔ یا پھر انھیں اس بے ہودہ پن سے گھورتا ہوا پاکر لیڈی کلرک کو غصہ آجاتا ہے اور وہ جیسے ہی اپنی خشمگیں نظریں ان پر ڈالتی ہے وہ اپنی عافیت خطرے میں سمجھ کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اس آزمائش سے گزر کر وہ اپنے کام کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔ وہ سہل سکشن خود نہیں مانگتی بلکہ ہر آفس کا انتظامیہ اسے صنف نازک سمجھ کر ایسے سکشن دیتا ہے۔ لیکن دفتروں کی تاریخ گواہ ہے کہ انتظامیہ صیغوں میں بھی جہاں عورتوں نے کام کیا۔ اپنا کام مردوں سے بہتر طور پر اور جلد انجام دیا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بار بار چائے پینے اور پان کھانے دفتروں سے باہر نہیں جاتیں اور نہ اس کے کوئی ملاقاتی آکر ڈسٹرب (خلل اندازی) کرتے ہیں، وہ ہیرا پھیری اور بلا وجہ تاخیر کے گر سے بھی واقف نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر کام جلد انجام پاتا ہے۔ ہم نے اپنی دفتری زندگی میں ویسے تو کئی بار جائزہ لیا اور دیا لیکن ہم ایک موقعہ کو کبھی نہیں بھلا سکے کہ اتفاق سے ہم نے (Male clerk) سے جائزہ حاصل کیا تو ہماری عقل یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ موصوف نے اپنے میز کے دونوں خانوں میں ردی کی طرح ضروری کاغذات بھر رکھے تھے کچھ تو جی او تک ان میں پڑے پڑے تھے اور وہ یوں بے نیاز تھے جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ یہ صاحب بڑے موڈی واقع ہوئے تھے۔ جی میں آیا تو تھوڑا سا کام کر لیا ورنہ (Urgent) فائل لکھ مارے اور سپرنٹنڈنٹ کی ٹیبل پر رکھ دی جیسے اس کی سات پشتوں پر کوئی بڑا احسان کر دیا ہو۔ پھر سائیکل نکال کر وہ گیارہ بجے رفو چکر ہو جاتے اور کوئی مارننگ شو دیکھ آتے۔ کبھی کبھی شام کے وقت وہ چہرہ دکھانے کا احسان کرتے ورنہ وہ تکلیف بھی انھیں گوارا نہ تھی۔

لیڈی کلرکس بہر حال کام ہی کرتی ہیں، خالی اوقات میں چونکہ آس پاس کے لوگوں سے گپ شپ نہیں کر سکتیں (کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر آدمی خواتین سے بات کرنے کے لائق ہو) اس لیے کوئی میگزین یا ناول پڑھا کرتی ہیں تاکہ وہ ان فضولیات اور خرافات سے بچ رہیں۔ یہ کوئی بری عادت تو نہیں۔

موصوف کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ گھر کی طرح آفس میں بھی وہ کسی نہ کسی کی مدد سے چلتی ہیں۔ گھر کا ذکر چھوڑیئے وہاں تو زندگی میں جب تک دونوں پہیئے برابر نہ ہوں گاڑی نہیں چلتی لیکن کبھی کبھی ایک پہیہ بھی بہت سارا بوجھ اٹھائے چل جاتا ہے۔ لیکن آفس میں لیڈی کلرکس کا کسی کے ذریعہ چلنا سراسر غلط ہے۔ کیونکہ یہاں یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی بھی کلرک اپنی خدمات اخلاقاً ذرا کم ہی پیش کرتا ہے۔ اگر کرتا بھی ہے تو اس کے پس پردہ لیڈی کلرکس سے تعارف اور دوستی کی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔ اس لئے لیڈی کلرکس عموماً اس kind approach سے اجتناب ہی کرتی ہیں اور حتی الامکان حالات کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ ان کے لہجے کی شیرینی سے (بقول صاحب موصوف) ساتھی کلرک مجروح ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ شیرینی اور نرمی عورت کی گفتار کی دو خاص خصوصیات ہیں لیکن اگر وہ ساتھی کلرک سے اس لہجہ میں بات کرتی ہے تو اس کے مجروح ہونے کی ذمہ داری کلرک کی بے وقوفی پر عائد ہوتی ہے نہ کہ لیڈی کلرک پر!

دوسری بات پہلے تو لیڈی کلرکس آفیسرس کو Approach ہی نہیں کرتیں کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ پھر کبھی کبھی اگر غلطی ہو جائے تو گھنٹوں کا کام منٹوں میں نمٹا کر اس جو کھم سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں۔

رہا آفس کو دیر سے آنا اور جلد جانا اس کے تعلق سے ہمیں صرف یہ عرض پیش کرنا ہے کہ قدرت نے جہاں مرد کی فطرت میں انا اور خود داری کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہیں عورت کی فطرت میں وفا، ایثار، قربانی جیسے جذبات پائے ہیں۔ لیڈی کلرک بھی ایک عورت ہے اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہے کہ وہ مرد کے دوش بدوش اس کی معاشی پریشانیوں میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی اس کو دفتر سے چھٹی ملتی ہے وہ گھر کا رخ کرتی ہے جبکہ مرد اکثر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتے، پان چباتے ہوئے بلا وجہ دفتر کے باہر گھومتے

تضییع اوقات کرتے ہیں یا پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرکے ہر شام، کچھ کی فرسطی شو میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لیڈی کلرکس کو ان خرافات کی پیروی کرنے کی فرصت نہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے نونہالوں کی خبر لینے جلد گھر جاتی ہیں تو کوئی گناہ تو نہیں کرتیں۔

لیڈی کلرکس اگر اپنے ہم جلسوں سے شوہروں، ساسوں، بچوں وغیرہ کے تعلق سے باتیں کرتی ہیں تو صرف عورتوں پر ہی نجی باتیں کرنے کا لیبل کیوں چسپاں کیا جائے۔ جہاں مرد جمع ہو جائیں وہاں کیا نجی باتیں نہیں ہوتیں؟

یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ تعلیم یافتہ لیڈی کلرکس بین الاقوامی موضوعات پر نہیں بول سکتیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر ایسا کون سا موضوع ہے جس پر وہ طبع آزمائی نہ کرسکتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی دلچسپی پالٹکس (سیاسیات) میں کم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی مخاطب پر موقوف ہے کہ وہ کسی بھی خاتون کی ذہنی بلندی کا معیار دیکھ کر گفتگو کا آغاز کرے۔ جس طرح ہر مرد کی معلومات ایک سی نہیں ہوتیں اسی طرح ہر خاتون یا ہر لیڈی کلرک کی معلومات کو محدود بتانا قرین انصاف نہیں۔

موصوف کا آخری اعتراض یہ ہے کہ لیڈی کلرکس صرف اپنے لیے یعنی اپنے ذاتی اخراجات کی پابجائی کے لیے نوکری کرتی ہیں تو صاحب ہم نے کتنے ہی ایسے جنٹلمین دیکھے ہیں جو پہلی تاریخ کو بیوی سے زبردستی تنخواہ حاصل کر لیتے ہیں (خدا کا شکر ہے کہ ہمارا شمار ان بیویوں میں نہیں) لیکن ہم سمجھتے ہیں بلکہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ کوئی عورت اتنی خود غرض ہرگز نہیں کہ اپنے گھر کی، شوہر کی، بچوں کی سب کی ذمہ داری بھلا کر اپنی ذات پر سارا روپیہ خرچ کر ڈالے۔ اس کے برعکس وہ قابل رحم ہے کیونکہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ اسے کبھی روپیوں کی ضرورت ہی نہیں پڑ سکتی شوہر صاحب بھلے ہی تنخواہ کا حساب نہ پوچھیں لیکن وہ گھر کی ہر فکر اور ذمہ داری سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہ کی فکر، دال بھاجی کا انتظام، بچوں کی ٹیوشن فیس، رکشا کے اخراجات، یونیفارمس، عیدین کے موقعہ پر ملبوسات، مہمانوں کا خیال، الغرض ان ساری چیزوں کا بوجھ کمانے والی بیوی ہی کے کاندھوں پر ہوتا ہے اس کے بعد کہیں کاسمٹکس وغیرہ کی باری آتی ہے۔ شوہر نامدار ہر فکر سے بے نیاز ہوتے ہیں کچھ اس قماش کے ہوتے ہیں کہ انھیں اس کی بھی فکر نہیں ہوتی کہ ان کے گھر میں پہننے کے چپل پرانے ہو گئے ہیں یا ان کے استعمال کے رومال بوسیدہ ہو گئے ہیں۔ یہ شوپنگ بھی کمانے والی بیوی ہی کرے۔ بچوں کی شوپنگ، گھر کی شوپنگ، ترکاری بھاجی کی خرید و فروخت، شوہر کی شوپنگ، یہاں تک کہ بچے اگر بیمار پڑ جائیں تو انھیں دوا خانے لے جانے کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد ہوتی ہے

ویسے ہمارا ذاتی خیال ہے کہ گھریلو خواتین لیڈی کلرکس کے مقابلے میں کہیں زیادہ آرام دہ اور پرسکون زندگی گزارتی ہیں۔ وہ کم از کم اس لحاظ سے تو خوش نصیب ہیں کہ شوہروں سے دھڑلے کے ساتھ اپنے "پاندان خرچ" یا (Pocket money) وصول کرتی ہیں۔ لیکن بے چاری ملازم پیشہ خواتین "پان کھانے کی فرصت" کو ترس جاتی ہیں

اگر لیڈی کلرکس اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اپنی ڈریسنگ پر اور ذاتی اخراجات پر صرف کرتی ہیں تو اس کے لیے شوہروں کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ کم از کم وہ اپنا بوجھ تو شوہروں پر نہیں ڈال رہی ہیں۔

موصوف کا یہ خیال ہے کہ شوہر کبھی بیوی کی تنخواہ کا حساب نہیں مانگتے بلکہ شوہران نامدار یہ نیک فریضہ کی انجام دہی مہینے کے شروع دنوں میں شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ بیوی اگر حساب دینے میں تاخیر کرے تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے اور بے چاری کمانے والی گھر کا سکون بنائے رکھنے کی خاطر جلد حساب دے کر اپنی جان چھڑاتی ہے کیونکہ اسے بہر حال گھر کی فضا ہی ایسی چاہیے اگر سکون ہو چاہے تو وہ شوہر کی طرح اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر تو نہیں گزار سکتی۔

بہر حال لیڈی کلرک شوہر کے لیے ایک نعمت " غیر مترقبہ" سے کم نہیں اور جب تک وہ اپنی تنخواہ گھر میں لگاکر شوہر کی نصف سے زائد ذمہ داریاں پوری کرتی رہے گی شوہر کو اس نعمت کی قدر کرنے کا خیال نہیں آئے گا۔ یہ صرف اسی وقت قائل ہوں گے جب وہ اپنا گھر کا، بچوں کا، سب کا بوجھ شوہر پر ڈال کر پھر سے اپنا پاندان سنبھال کر تخت پر براجمان ہو جائے اور ساری دنیا کی فکروں سے بے نیاز پان چباتی ہوئی پڑوسنوں سے ادھر اُدھر کی باتیں کرے۔

∞

[illegible] پرشاد

ٹیلی فون سے چھٹکارا

اگر بات چیت کے ختم پر کوئی مجھ سے کہے کہ جیسے ہی مجھے اس بات کا پتہ چل جائے گا میں آپ کو فون پر مطلع کر دوں گا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے تعلق سے خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ وہ ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش میں ہے۔ اس لئے مجھے کہنا پڑتا ہے مجھے خوف ہے آپ ایسا نہیں کر سکتے کیوں کہ میرے پاس ٹیلی فون نہیں ہے۔

میں ٹیلی فون کیوں نہیں رکھتا! اس لئے نہیں کہ میں اپنے آپ کو دانشمند ہونے کا ڈھونگ رچاتا ہوں اور اپنے آپ کو ایک غیر معمولی انسان ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے دو اہم اسباب ہیں کیوں کہ میں حقیقت میں ٹیلی فون پسند نہیں کرتا کیوں کہ اس کے بغیر بھی میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ کھانا کھا سکتا ہوں۔ لکھ سکتا ہوں۔ سو سکتا ہوں۔ میں اس لئے ٹیلی فون پسند نہیں کرتا کہ اس کا ہونا مرض متعدی کے مترادف اور تضیع اوقات ہے۔ یہ آپ کو غیر ضروری شک اور گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے کیوں کہ آپ کو جب کسی کے پاس سے ٹیلی فون پر اطلاع ملنے کی امید ہوتی ہے تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی نہیں اور جب آپ ٹیلی فون کرنا چاہیں تو جواب ملتا ہے ٹیلی فون انگیج ہونے کی اطلاع ملتی ہے پبلک ٹیلی فون سے بات کرنا بے حد تکلیف دہ ہے۔ پبلک ٹیلی فون کا استعمال آپ اس وقت کرتے ہیں جب نہایت ضروری ہو اور چونکہ آپ جلدی میں ہوتے ہیں اس لئے آپ اپنے سے پہلے دوسروں کو پبلک ٹیلی فون کے پاس کھڑا پاتے ہیں جب آپ ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو بے حد گھٹن محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہاں کی ہوا صاف نہیں اور پان مسالہ سگریٹ بیڑی کے دھوئیں کے بادل اٹھتے ہیں۔ آپ کے گفتگو شروع کرنے سے پہلے ہی آپ کی پیٹھ اس آدمی کی نظروں کا ہدف ہو جاتی ہے جو آپ کی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

آپ کے مکان میں اگر ٹیلی فون ہو تو آپ کو یہ [illegible] کہ آپ جب ٹیلی فون پر بات کرنے کے [illegible] آپ کو ٹیلی فون کے پاس کھڑا رہنا پڑتا ہے جب [illegible]

ان یا آپ کسی کام سے باہر نکل رہے ہوں یا آپ غسل خانے میں ہوں تو ٹیلی فون ضرور بجتا ہے گا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ٹیلی فون
پر آپ کے لئے کوئی اہم خبر یا پیام ہے۔ کیا؟ کبھی غسل کے فوراً بعد بھیگے جسم سے فون کی طرف نہیں لپکے یا کبھی نیند سے
ہوئے نہیں گئے یا گہری نیند سے اٹھ کر اونگھتے ہوئے یہ سننے کے لئے نہیں گئے کہ معاف کرنا غلط نمبر ہے آپ کو کو
سے آگاہ کیا گیا میرے خیال میں سب ہی ٹیلی فون کے نمبر غلط ہوتے ہیں۔ اگر واقعی آپ کا ٹیلی فون بجتا رہتا ہے اور آپ نے
جواب نہ دینے کا ارادہ کر چکے ہیں تو آپ کو ایک مسلسل بیہودہ گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دے گی جو آپ کی زندگی اور فکر کا
راز ہے۔ اس کی بجائے آپ سیکل کی گھنٹی خرید کر خود بجا سکتے ہیں۔

مان لو کہ آپ نے ٹیلی فون کال کو نظر انداز کر دیا جب کہ اس کی گھنٹی بجتی ہے اور مان لو کہ کوئی صاحب آپ کو ضرور
اہم پیام پہنچانا چاہتے ہوں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کوئی پیام اہم اور ضروری ہو تو وہ آپ کے پاس جلد یا بدیر
پہنچ ہی جائے گا۔ "بری خبریں بہت جلد پھیل جاتی ہیں" اس ضرب المثل کو یاد رکھو۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ خوش خبری بھی اتنا
تا سے پھیلتی ہے۔ اس ضرب المثل پر غور کیجئے "سچائی ظاہر ہو کر رہے گی"۔

مان لو کہ آپ ٹیلی فون کال کا جواب دیتے ہیں اور ریسیور کو اٹھا کر "ہلو" کہتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے یہ کس قدر بے
ہے آپ ایک بالکل اجنبی کو "ہلو" کیوں کہیں۔ اگر آپ واقعی انگریز ہیں تو ایسا کرنے سے پہلے دو مرتبہ سوچ لیں گے۔

جب آپ ریسیور اٹھاتے ہیں تو اپنا نمبر اور نام بتاتے ہیں۔ لیکن آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ یہ چیزیں کسے بتا
رہے ہیں۔ شاید آپ نے اپنے نام اور ٹیلی فون نمبر کو ٹیلی فون ڈائری میں طبع کرانے پر کافی غور کیا ہو۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی اشاعت
تعداد ہے اور جو کسی بھی مصنف کے لیے باعث رشک ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو بائبل اور شیکسپیئر سے زیادہ ثبوت کے
طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اور ہر قسم کے سرکاری و خانگی مقامات پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی مدد سے آپ کسی بھی اجنبی شخص کو
فون کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کہیں گے کہ آپ اپنا نام ٹیلی فون ڈائرکٹری میں شائع نہیں کرائیں گے اور گھر پر ٹیلی فون رکھیں گے جو وقت
ضرورت ہی کام میں لایا جائے گا۔ اس کے علاوہ آپ کہیں گے کیا حادثات اتفاقی ——— جیسے بیماری، حادثہ اور آگ
لگ جانے کے موقع پر ٹیلی فون کا ہونا ضروری نہیں ہے؟ یقیناً آپ نے بجا فرمایا لیکن انگلینڈ جیسے آباد ملک میں شاذ و
نادر ہی کوئی بہ وقت اشد ضرورت ٹیلی فون سے بے رہتا ہو۔ تاہم مجھے اس مشہور ایکٹر سے کامل ہمدردی ہے جس کا بیان
میں نے ریڈیو پر سنا تھا۔ اس سے پوچھا گیا ——— مان لو کہ آپ کو ویران جزیرہ میں رکھا جائے اور صرف ایک عیش و آرام
کی چیز رکھنے کے لیے کہا جائے تو آپ کس کا انتخاب کریں گے۔ "میں ایک ٹیلی فون لے لوں گا۔" اس نے کہا "اور میں تار کو بیت میں
دبا دوں گا اور میری سب سے بڑی خوشی ہو گی کہ بیٹھا رہوں اور اس کو بجتا دیکھا کروں اور سوچوں۔ یہ اب کبھی نہیں بجے گا اور مجھے
کبھی اس کا جواب دینا پڑے گا۔"

اگر کوئی شخص میری طرح ٹیلی فون نہ رکھنا چاہے تو وہ کہے گا۔ "آہ آپ کو تو ڈھیر سارے خطوط لکھنے پڑتے ہوں گے۔ ایسا
اور وہ ان لوگوں کی طرح ... خطوط لکھنے پڑتے ... ہیں ... پاس کیا جاتا ہے۔" ٹھیک ہے اگر آپ
کے پاس ... کیا آپ ... ہونا چاہیے؟" اور اس کا ... ہے۔" نہیں"
"کیا آپ کے پاس ٹیلی فون نہیں اور ٹائپ رائٹر بھی نہیں! براہ کرم ... نہیں۔"
... اور مصنف ہوں جب میں ... ٹائپ رائٹر ... کا باعث

ہوگا میں نے یہاں تک سمجھا کہ یہ ضروری ہے اور ایڈیٹر اور ناشر ہر مضمون کو ٹائپ شدہ ہی چاہتے ہیں۔ لہٰذا میں نے ٹائپ رائٹر خریدا اور ٹائپ کرنا سیکھ لیا اور کئی سال تک ٹائپ کرتا رہا۔ لیکن میں اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ میں لکھنے کے کام سے لطف اٹھایا قلم سے الفاظ اور جملے بنانا مجھے بے حد پسند ہے اور میں نے کبھی ٹائپ رائٹر کی Keys پر انگلیاں دوڑاتے ہوئے لطف محسوس نہیں کیا۔ وہاں بھی ایک گھنٹی تھی صرف ایک چھوٹی سی گھنٹی جو ہر سطر کے ختم پر بجتی تھی پھر بھی وہ گھنٹی ہی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میرا دماغ میکانکل نہیں ہے اور ٹائپ رائٹر ایک مشین ہے۔ کبھی بھی میں مشینوں کی طرف راغب نہ ہو سکا۔ مجھے ان کا صاف کرنا، آئیل کرنا اور ان کی درستگی کرنا قطعاً پسند نہیں۔ مجھے ان کو چالو کر کے خوشی نہیں ہوتی۔ ان کو قابو میں رکھنا اپنے بس کی بات نہیں۔ مشینیں بھی مجھے پسند نہیں کرتیں۔ جب میں انھیں چھوتا ہوں تو وہ یا تو ٹوٹ جاتی ہیں یا پھر ان میں آگ لگ جاتی ہے۔

جو حال ٹیلی فون اور ٹائپ رائٹر کا ہے وہی حال کاروں کا بھی۔ میں نے اپنا پہلا ڈرائیونگ لائسنس سترہ سال کی عمر میں جنوبی آفریقہ میں حاصل کیا تھا۔ مجھے ٹریفک کے اوقات میں جوہانسبرگ کی مصروف ترین سڑک میں ڈرائیونگ سکھلائی گئی تھی۔ مجھے آفریقہ کے دوسرے مقام پر کار کے استعمال کی ضرورت پیش آئی جہاں برائے نام ان دنوں موٹر کی ٹرافک تھی۔ ڈرائیونگ کا فعل (automatic) بن گیا اور میرا واحد ارادہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچنا تھا جتنی جلدی ہو سکے لہٰذا میں تیزی سے موٹر چلایا اور اندرون ایک یا دو ہفتے Speedometer ٹوٹ گیا۔ میں نے اسے درست نہیں کرایا۔ میں لاپرواہی سے ڈرائیونگ نہیں کیا تھا۔ کار پر میں نے اپنا قابو کبھی نہیں کھویا، چٹانوں اور ریتلی سڑکوں پر بھی ایسا نہیں ہوا۔ میں نے کسی کو مار ڈالا تھا اور نہ ہی زخمی کیا تھا۔ لیکن میں بور ہو چکا تھا۔ اگر حالات نے اجازت دی ہوتی تو میں پیدل چلنے کو ترجیح دیا ہوتا۔ آج کل گنجان آبادی والے ملکوں میں رہتے ہوئے جہاں ٹرافک دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور جہاں ڈرائیونگ پر کئی سخت قانون اور قاعدوں کے تحت کنٹرول میں رکھا جاتا ہے۔ میں نے کار چلاتے ہوئے کوئی دلچسپی محسوس نہیں کی۔

لیکن آپ کہیں گے کیا میں اس بات سے باخبر نہیں ہوں کہ ہم مشینی دور میں رہتے ہیں؟ کیا میں گھڑی کو الٹی یا پیچھے رکھنے کے درپے ہوں؟ کیا میں فرار چاہنے والا، نیم پاگل یا بے حد سادہ زندگی گذارنے والا ہوں؟ بالکل نہیں۔ یہ تو صرف ترجیح کا سوال ہے۔ اصولوں کا نہیں کہ میں حتی الامکان ان چیزوں کے بغیر ہی کام چلانا چاہتا ہوں۔ ٹیلی فون، ٹائپ رائٹر اور موٹر کار۔ اگر دوسرے لوگ چاہتے ہیں ــــــ اور وہ بالکل چاہتے ہیں اور یہ چلن ہیں۔ ان چیزوں کا استعمال اپنے فائدے کے لیے کریں تو میں بھی چاہتا ہوں کہ انھیں اس سے کیوں باز رکھوں۔ میں ریل گاڑیوں، کاروں، اور ہوائی جہازوں میں سفر کرنے پر اس کا کرایہ دینے تیار ہوں۔ بجائے زینہ چڑھنے کے میں لفٹ کا استعمال پسند کرتا ہوں۔ اور غیر متحرک staircase کے عوض متحرک اسٹیرکیس پسند کرتا ہوں، لیکن مشینوں سے زیر ہونا میرا مدعا نہیں۔ میں ان کی صفائی، درستگی کرنا اور ان کو صاف ستھرا رکھنا نہیں چاہتا۔ میں ٹائپ رائٹر کو کھٹا کھٹ کھٹانا نہیں چاہتا، کار میں سدا سفر کر کے اپنے پیروں کا استعمال ختم کرنا نہیں چاہتا اور ٹیلی فون پر وارننگ کے ساتھ یا بلا وارننگ بلایا جانا پسند نہیں کرتا

کیا میری اس سرکشی اور ضد اور فراریت سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ میں اپنی صفائی پیش کر دوں۔ یہ ثابت کر کے میں جو میں پسند کرتا ہوں وہ "اچھا" ہے۔ کم از کم اتنا تو میں نے اپنے آپ کو ثابت کر دیا ہے کہ جس چیز کو کئی ایک لوگ ضروری سمجھتے ہیں وہ بالکل ضروری نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مختلف حالات میں اگر میں دولت مند ہوتا یا فرش پر ہوتا۔ اس وقت ٹیلی فون میرے لیے انتہا ضروری ہے اگر میں سکریٹری یا ٹیکسی ڈرائیور ہوں تو میرے لیے ٹائپ رائٹر اور کار نہایت ضروری

دو چیزیں ایسی ہیں جن کے انگریز بہت شوقین ہیں میکانیکل ایجادات اور دوسرا ادب، میرا اپنا ذاتی کاروبار الفاظ کا استعمال ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اب الفاظ کا استعمال روک دینا پڑے گا۔ ابھی ابھی مجھے ایک پرچی دی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ٹیلی فون پر آپ سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ٹیلی فون پر بات کر ہی لینا بہتر رہے گا۔ کیا پتہ کہ شاید کوئی ضروری اطلاع یا پیام ہو۔

خاکہ

انصاری اصغر جمیل
(ناگپور)

شاہد کبیر
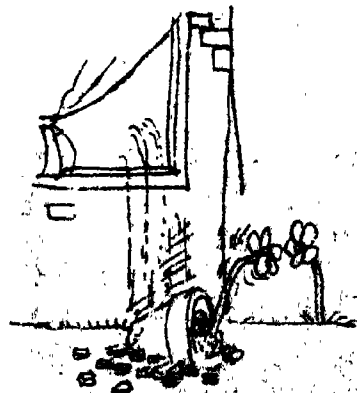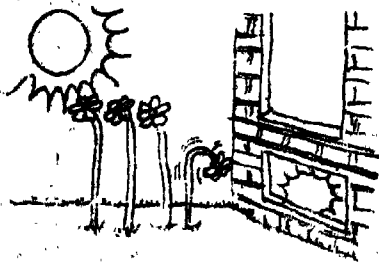
(یہ خاکہ شاہد کبیر کے مجموعہ کلام "مٹی کا مکان" کی رسم اجراء کے لیے لکھا گیا تھا لیکن اس تقریب میں شاہد کبیر مع اہل و عیال موجود تھے۔ اس لیے یہ خاکہ پڑھا نہیں گیا کہ کہیں شاہد کبیر مجھ پر حملہ آور نہ ہوں)

اگر آپ کبھی ناگ پور تشریف لائیں تو مومن پورہ ضرور آئیے اور یاس و الم میں ڈوبے ہوئے ایک شخص سے ضرور ملاقات کیجئے جو ہر وقت کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا یہ شخص آپ سے رخصت ہوتے ہوئے یہ ضرور کہے گا ؎

اس درجہ بھی مایوس نہ ہو کوئی کسی سے
تم یاد بھی آجاؤ تو اب بات بڑی ہے

شاہد کبیر ناگ پور کے وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے روایتی شاعری سے جھگڑا کر کے جدید شاعری کو گلے لگایا۔ یہ بات اہل ناگپور کے لیے آج تک سمجھ میں نہ آئی کہ شاہد بھائی کا جھگڑا روایتی شاعری سے کس بنا پر ہوا۔ دنیا میں جھگڑا صرف تین چیزوں کے لیے ہوا کرتا ہے، زر، زن اور زمین، لیکن میرے خیال میں شاہد بھائی ان تینوں میں سے کسی ایک میں بھی ملوث نہیں تھے۔ انہیں پہچاننے میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ اپنے اس شعر کے مصداق ہیں ؎

وہ سرو قد ہیں دیوار بھی نہیں چھپتا
ہزار جھک کے چلے سر دکھائی دیتا ہے

مومن پورہ میں، میرے خیال میں صرف مومن پورہ ہی کیوں بلکہ شہر ناگ پور میں جو شخص سب سے دراز قد نظر آئے سمجھ لیجئے وہ شاہد بھائی ہیں۔ انہیں پہچاننے کی ایک نشانی اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاہد بھائی دیگر لوگوں کے برخلاف رات میں بھی دھوپ کے چشمہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ شاہد بھائی لوگ تو دھوپ کے چشمہ کا استعمال دن میں کیا کرتے ہیں لیکن آپ رات میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا [illegible]

ہوں اور سب کو کالا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں واقعی ان کے جواب سے مرعوب ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ شاہد بھائی پہلے دراز قد نہیں تھے بلکہ بہت ہی پستہ قد تھے اور ایک ایک فرد کو پکڑ پکڑ کر اپنے پستہ قد ہونے کا سبب دریافت کرتے تھے۔ ان کی اس حرکت سے لوگ پریشان ہو گئے اور ایک دن انھیں بھرے چوک میں لٹکا کر چھوڑ گئے اور اسی دن سے یہ پستہ قد سے دراز قد میں تبدیل ہو گئے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

گھیر کر مجھ کو بھی لٹکایا مصلوب کے ساتھ
میں نے لوگوں سے یہ پوچھا تھا کہ قصہ کیا ہے

ان کے پستہ قد ہونے کا سبب تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن دراز قد ہونے کا ہر خاص و عام واقف ہے۔ دیگر شعرا کی طرح شاہد بھائی صرف لنگی بنیان پر اپنے مکان سے باہر قدم نہیں نکالتے بلکہ ہمیشہ اپنی ہی طرح لمبی پتلون اور شرٹ میں نظر آتے ہیں بلکہ کبھی کبھی کرتے کا استعمال بھی کر لیا کرتے ہیں۔ ان کا لمبی لمبی ٹانگوں کو پھیلنے کا اپنا الگ انداز ہے۔ وہ جب راستے سے گذرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پہلوان چلا آ رہا ہے۔ لیکن انہیں دیکھ کر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ عرصہ ہوا انھوں نے پہلوانی کو طلاق دے دی ہے۔ اور آج کل مارکٹنگ آفس میں ملازمت کر رہے ہیں۔

شاہد بھائی شادی شدہ ہیں جس کی سند وہ اپنے چھ سات بچوں کی صورت میں دیا کرتے ہیں۔ اگر وہ بچوں کے والد نہیں ہوتے تو شادی شدہ ضرور ہوتے۔ دنیا میں ایسے بے شمار افراد موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں شاہد بھائی یقیناً خوش قسمت ہیں جو شادی بھی ہیں اور چند بچوں کے والد ماجد بھی۔ شاہد بھائی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ بچپن ہی میں انھیں کبیرا بھیا کے نام سے جانتا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو پتہ چلا کہ یہی کبیرا بھیا دراصل ملک گیر شہرت کے مالک شاہد کبیر ہیں۔

اس سے پہلے کہ آپ شاہد بھائی سے ملاقات کریں۔ ان کی ایک خاص عادت سے آپ کو مطلع کر دینا میرا اخلاقی فرض ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ چائے نوش فرما رہے ہوں اور اچانک شاہد بھائی نظر آ جائیں تو از راہ کرم ان کی جانب دیکھیے بھی نہیں۔ اگر آپ نے چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر ان کی جانب دیکھا تو وہ آپ کو اپنا فین (Fan) سمجھ کر کپ آپ کے ہاتھوں سے چھین لیں گے اور آپ بقیہ چائے سے محروم رہ جائیں گے۔ شاہد بھائی یہ حرکت کچھ اتنی برق رفتاری سے کریں گے کہ آپ کو ان پر غصہ کرنے کا موقع بھی نہ مل سکے گا۔ اور آپ صرف (formality) نبھاتے ہوئے مسکرا کر اس حملے کا خیر مقدم کریں گے۔ بات یہ نہیں کہ شاہد بھائی کو چائے کبھی میسر نہیں آتی بلکہ ایسا کرنا ان کی hobby ہے۔ کچھ لوگ ان کی اس حرکت کا غلط مطلب نکالتے ہیں جو درست نہیں۔ میں خود شاہد ہوں کہ شاہد بھائی نے مجھے بارہا چائے پلائی ہے اور وہ بھی اپنے پیسوں سے۔ میں آپ کو اس لیے خبردار کر رہا ہوں کہ خدانخواستہ اگر آپ نازک مزاج واقع ہوں تو ان کی اس حرکت کو برداشت کرنے کی عادت ڈال لیں۔

کہنے کو تو شاہد بھائی شاعر ہیں اور وہ بھی جدید شاعر۔ لیکن شاعروں کی خصلت ان میں نہیں پائی جاتی نہ تو یہ ہوٹل میں بیٹھ کر لوگوں کو اپنے اشعار سناتے ہیں اور نہ ہی کسی شاعر کے اشعار کو برداشت کرنے کی قوت ان میں ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی ان کے شاعر ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس وہ محفل میں جب بھی بیٹھتے ہیں اپنے مخصوص انداز میں لطیفے چھوڑنے لگتے ہیں اور دوسروں کو ہنستا ہوا چھوڑ کر خود کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ناگ پور شہر میں کتنے شعرا بستے ہیں محفل میں جب دیگر شعرا کسی شاعر کا نام لیتے ہیں تو شاہد بھائی بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ وہ خود کو ہر محفل کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور محسوس بھی نہیں ہوتا کہ شاہد بھائی کچھ الگ فرد ہیں۔

دسمبر ۱۹۷۹

شاہد بھائی نہایت با اخلاق آدمی ہیں۔ جب بھی ملتے ہیں اپنے خلوص سے مد مقابل کو مار ڈالتے ہیں۔ بھابی صاحبہ شکلاً بھی کرن بھائی جان سے بے انتہا پیار کر رہی ہیں۔ واقعی شاہد بھائی ہیں ہی پیار کیے جانے کے قابل۔ دفتر کے بعد یہ آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن شام ہوتے ہی انہیں اپنے مٹی کے مکان کی یاد آتی ہے۔ جس کی کچی دیواریں انہیں ہر شام ہی اپنی جانب راغب کرتی ہیں۔ میرے خیال میں انہیں مکان کی یاد نہیں آتی بلکہ یہ بھابی صاحبہ سے ڈرتے ہیں۔ ان کے کانوں میں بھابی صاحبہ کے یہ الفاظ گونجتے رہتے ہیں ؂

دن کے ہنگاموں میں ہی بھر کے بھٹک لو شاہد
رات ہوتے ہی تمہیں لوٹ کے گھر جانا ہے

بھابی جان کو شاہد بھائی پر بھروسہ نہیں ہے اس لیے وہ انہیں رات میں گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ صورت سے تو شاہد بھائی شریف نظر آتے ہیں۔ لیکن غیب کی باتیں خدا ہی جانے۔ شاہد بھائی کے ساتھ ایک ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ یہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اپنے ناول "کچی دیواریں" سے کیا۔
کہنے کو تو شاہد بھائی جدید شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں اوٹ پٹانگ اشعار نہیں ہوتے۔ شاہد بھائی کے پڑھنے کا اپنا الگ انداز ہے۔ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں۔ لیکن اپنی رعب دار آواز سے ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ سامعین ان کی آواز میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں کاغذ میں قید کر لیتے ہیں۔ ان کے اشعار دور حاضر کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔
چند دن پیشتر شاہد بھائی سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ وہ کافی کمزور ہو گئے ہیں اور داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور کچھ پریشان سے تھے۔ میں نے پوچھا کہ شاہد بھائی کیا بات ہے۔ آپ نے اپنی حالت مجنوں کی سی کیوں بنا رکھی ہے۔ کیا بھابی جان میکے گئی ہوئی ہیں؟ نہایت خفیف آواز میں فرمایا کہ کیا بتاؤں میرا دیوان شائع ہو رہا ہے۔ اس کے لیے دوڑ بھاگ کر رہا ہوں، کاتب صاحب بہت ستا رہے ہیں۔ پلیٹیں وقت پر نہیں دے رہے ہیں۔ یقین مانیے اس وقت شاہد بھائی کی جو حالت تھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا بالکل یتیم دکھائی دے رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ان کا شعری مجموعہ "مٹی کا مکان" منظر عام پر آ گیا ہے اور شاہد بھائی کی پریشانی کسی حد تک ضرور کم ہوگئی ہے۔ لیکن ختم نہیں ہوئی۔ کیونکہ اب مسئلہ ان کی فروخت کا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اردو کی کتابیں لوگ عموماً خرید کر نہیں پڑھا کرتے بلکہ اپنے احباب سے اُدھار مانگ کر یا کسی لائبریری سے اڑا کر پڑھتے ہیں۔
شاہد بھائی نے جان بوجھ کر اپنا مکان مٹی کا بنایا ہے۔ مکان مٹی کا ہے تو اس کی دیواریں لامحالہ کچی ہوں گی۔ پھر نہ جانے کیوں وہ یہ گلہ کر رہے ہیں ؂

اندر کا سکون کہہ رہا ہے
مٹی کا مکان بہہ رہا ہے

ہندوستان میں عموماً کسی شاعر یا ادیب کی عزت اس کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔ اس کے مجموعے بعد ہی میں چھپتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس شاہد بھائی خوش قسمت ہیں کہ ان کا مجموعہ ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا۔
شاہد بھائی بذات خود اتنے خوب صورت نہیں جتنے کہ وہ اپنے شعری مجموعے کے سرورق کی پشت پر چسپاں فوٹو میں نظر آتے ہیں۔ آپ کو انہیں پہچاننے میں اور بھی آسانی ہوگی۔ اگر آپ ان کا مجموعہ کلام "مٹی کا مکان" صرف پندرہ روپیوں (سکہ رائج الوقت) میں خرید کر ان کی خوب صورت فوٹو کو ایک نظر دیکھ لیں۔

خرافات

(مراسلے)

پیارے شگوفہ باز!

واپسی میں ایرپورٹ پر تم موجود نہیں تھے۔ تمہاری روح موجود تھی۔ یعنی خوند میری۔ روح خاصی تھی۔ جسم خوب صورت تھا۔ تم سے کہیں زیادہ۔ میں وہاں حسیناؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حسینائیں خوند میری کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بہر کیف میں روح سے گذارا کرتا رہا حسینائیں جسم سے گذارا کرتی رہیں۔

خوند میری صاحب اس بات پر پریشان تھے کہ میری جیب میں ماچس نہیں تھی کس منہ سے سگریٹ پیوں گا۔ جہاز پر سوار ہوا تو سالی ماچس میری جیب سے نکل آئی۔ پس ثابت ہوا کہ جیب پہ کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اچھے بھلے معقول خوند میری کو پریشان کرتی رہی۔

تم لوگوں نے قیام حیدرآباد میں جس مدارات سے کام لیا اس پہ میں خوش اور شرمندہ دونوں ہوتا ہوں۔

مسیح انجم کو میری طرف سے ایک بوسہ عنایت کر دینا اس کی داڑھی کو نظر انداز کرکے بھی بوسہ ادا کر دینا کہ اس کی داڑھی نے نیچے تنکا نہیں ہے۔

جواب چاہے تو دیا نہ دو۔ میں انتظار کروں گا کیونکہ ع
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

فکر تونسوی (دہلی)

محترم سید مصطفیٰ کمال صاحب۔ آداب۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہمیں آج تک آپ کے رسالے کا علم تھا۔ پچھلے دنوں سرینگر میں جہاں چند ادیب دوستوں نے آپ کے رسالے کا ذکر کیا پھر ایک پرچہ انہیں سے میں نے حاصل کیا۔ رسالہ پڑھ کر بہت مسرت ہوئی کہ اتنا ادبی اور معیاری طنز و مزاح کا رسالہ چھپ رہا ہے۔

خوش دیو مینی (پونچھ)

ماہ ستمبر ۹۷ کا شگوفہ بہت لذیذ رہا۔

شگوفہ، اداس اور دکھ بھرے جیون کو زندگی کی چہل پہل میں تبدیل کر دینے والا رسالہ ہے۔

طنز و ظرافت کے لیے پورے ہندوستان میں قابل تعریف ہے، دل بہلانے کے لیے ایسے رسالے زندگی کا کام کرتے ہیں۔

بہترین اشاعت کے لیے مبارک باد قبول فرمائیے۔

محمود الغفار (ناگپور)

کچھ ہی دن ہوئے آپ نے "شگوفہ" کے حالیہ شمارے میں "کچھ لیڈی کلرکس کے بارے میں" اس عنوان کے تحت جناب ظہیر الحق کا ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اسے پڑھ کر لیڈی کلرکس کے ایک بڑے طبقے نے برا مانا کہ صاحب موصوف نے لیڈی کلرکس کے بارے میں کافی مبالغہ آرائی سے کام لے کر اس کی ایک مسخ شدہ تصویر پیش کی تھی۔

تمام لیڈی کلرکس کی جانب سے میں اپنا یہ فرض سمجھتی ہوں کہ تصویر کا دوسرا رخ پیش کروں۔ اور امید ہے آپ جانب داری سے کام لیتے ہوئے اسے بھی اپنی اگلی اشاعت میں شائع کرکے ممنون ہونے کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ طاہرہ سیدہ (حیدرآباد)

(اداریہ)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

حکومت آندھرا پردیش کو سارے ملک میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ چھوٹے اخبارات و رسائل کی سب سے بڑی تعداد کو حکومت ہر مہینہ اشتہار دیا کرتی تھی۔ لیکن اگست کے مہینہ میں جبکہ سارے ملک میں خصوصی اشتہارات جاری ہو رہے تھے محکمہ اطلاعات عامہ نے تمام چھوٹے اخبارات و رسائل کے اشتہارات یک لخت بند کر دیئے۔ حتیٰ کہ ۱۵ر اگست کے موقع پر بھی ان کے لیے اشتہار جاری نہیں کیا گیا۔ ایک مہینہ گزرنے کے بعد ۱ر ستمبر ۹۰ء کو ڈائرکٹر انفارمیشن کی جانب سے ایک مراسلہ ملا کہ دو مہینے کے لیے اشتہارات بند کیے گئے ہیں اور اشتہارات کے سلسلہ میں ایک پالیسی بنائی جا رہی ہے۔ (انفارمیشن کے دو مہینے پتہ نہیں کتنے دن کے ہوتے ہیں؟) اس درمیان چیف منسٹر آندھرا پردیش نے یہ یقین دلایا کہ بہت جلد نئی پالیسی کا اعلان ہوگا۔ چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے اردو اکیڈیمی کے ایک جلسہ کے علاوہ بعض دوسرے موقعوں پر بھی اس بات کی شکایت کی کہ ایک ہی گھر سے ایک سے زائد پرچے نکلتے ہیں۔ ان سب کو حکومت کے اشتہارات حاصل ہوتے ہیں۔ پرچے محض انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے لیے چھپتے ہیں اور ان کا نہ کوئی معیار ہے اور نہ سرکولیشن، ان خرابیوں کو دور کرنے کو چیف منسٹر نے ایک سے زائد بار اعلان کیا۔ لیکن اب پانچ مہینے گزرنے کے بعد یہ کہا جا رہا ہے کہ انتخابات کی وجہ سے ڈسپلے اشتہارات پر الکشن کمشنر نے پابندی لگا دی ہے جبکہ مرکزی حکومت کے ڈسپلے اشتہارات بلا پابندی کے ساتھ چھپ رہے ہیں۔ بالفرض محال یہ پابندی ہو بھی تو رسائل و جرائد کے لیے کلاسیفائیڈ اشتہار جاری ہو سکتے ہیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو محکمہ اطلاعات کی نااہلی، اقربا پروری، اور بدعنوانیوں کی سزا رسائل و جرائد کو دی جا رہی ہے۔ ہم چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ رسائل و جرائد کو اشتہارات کی اجرائی کے تعلق سے فوری کسی پالیسی کا اعلان کریں۔ اشتہارات کی مسدودی کا یہ سلسلہ جاری رہا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ بہت سے اچھے اور معیاری رسالے بھی دم توڑ دیں گے۔

ماہنامہ شگوفہ کا آئندہ شمارہ (جنوری) سالنامہ ہوگا